McGill University Library
3 102 830 989 J

سید امداد امام اثرؔ مرحوم

مکتبہ معین الادب اردو بازار، لاہور

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

از زمین تا بہ آسمان سخن است

کاشف الحقایق

معروف بہ

بہارستان سخن

مشتمل بر شاعری ہائے مختلف اقوام جہان

و اخلاق و مذہب و معاشرت ایشان وغیرہ وغیرہ

از تصانیف

جناب حکیم مولوی سیّد امداد امام صاحب متوطن نیورہ ضلع پٹنہ
مخاطب بہ شمس العلما بحکم گورنمنٹ ہند دام فیضہ مصنف کتاب
مرآۃ الحکما و کتاب الاثمار و کتاب الزراعت و ہدیہ قیصریہ و معیار الحق و دیوان اثر وغیرہ

جلد اوّل

در بیان شاعری مصر و یونان و ایطالیہ و عرب

مکتبہ معین الادب - اُردو بازار - لاہور

طبع دوم   جنوری ۱۹۵۶ء   ۱۰۰۰

فہرست مطالب

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ۝

صَلِّ علیٰ احسن و آل کریم

مقدم بعد ذکر اللہ ذکرہم   فی کلّ بدءٍ و مختوم بہ الکلم

امابعد راقم الحروف بندہ سیّد امداد امام متخلص بہ اثر خدمت حضرات باصدق و صفا میں عرض پرداز ہے کہ یہ ہیچمدان ابتدا سے سن شعور میں بھی شاعری کی طرف میلان طبعی رکھتا تھا ہر چند اسے شاعری کی قوت نہ تب حاصل تھی اور نہ اب ہے تو بھی شاعری کی پُر تاثیری کا اس وقت بھی ویسا ہی معترف تھا جیسا کہ اس وقت ہے۔ اسی میلان طبعی کے تقاضے سے یہ فقیر عہد طالب العلمی میں شعرائے یورپ و ایشیا کی تصانیف کو استادوں سے برغبت تمام پڑھا کرتا تھا اور بعد منقضی ہونے اس عہد کے بھی حتی الامکان کتب بینی کے ذریعے سے اپنی

واقفیت شاعری کو بڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ کسی قدر شعرائے یورپ و ایشیا کے طرز کلام اور انداز مذاق سے آشنا ہوگیا۔ یورپ کے اکثر شعرا کی تصنیف سے مطلع ہونے کی یہ صورت ہوئی کہ اس فقیر کو سالہا سال اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے کا مشغلہ رہا جس کے ذریعے سے علوم جدیدہ کے علاوہ یورپ کے بہت سے شعرائے نامی کی تصانیف کے درس لینے کا موقع ملا۔ اس سلسلہ و از تعلیم کے بعد کتب بینی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مختصر یہ ہے کہ اسی طور سے فقیر کو یورپ کی شاعری سے از وقت ہوش بر درس تا عہد پیرانہ سالی کم و بیش طور پر اطلاع کی شکل پیدا ہوگئی۔ اس انگریزی تعلیم کے ساتھ ایشیائی شعرا کی تصانیف سے بھی مطلع ہونے کے سامان میسّر آئے اس کا یہ طور ہوا کہ جناب والد ماجد شمس العلما سیّد وحید الدین خان بہادر اعلی اللہ مقامہ فی الجنہ خوشحالی کے ساتھ علوم یورپ و ایشیا سے بہرۂ وافر رکھتے تھے۔ حضرت غفران مآب نے حتی المقدور اس ناچیز کی تعلیم میں کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔ خود بہت سی عربی و فارسی کی کتابیں پڑھائیں اور جب ہجوم کار سے عدیم الفرصت رہنے لگے تو باوقات مختلف چند معلم یکے بعد دیگرے مقرر فرماتے گئے جنسے علاوہ معقولات و منقولات کی تحصیل کے فقیر کو اکثر شعرائے عرب کی تصانیف کے درس لینے کا بھی موقع ملا۔ پھر کتب بینی اور صحبت علمائے با مذاق سے بھی منتفع ہوتا رہا۔ تعلیم عربی کے ساتھ فارسی کی بھی تعلیم ہوتی رہی اور اکثر شعرائے عجم کے دواوین وغیرہ نظر سے گزرے۔ عربی اور فارسی کی تحصیل کے زمانے میں بعض اردو کے شعرا کے بھی کلاموں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بعد ازاں اکثر دواوین اخذ کرنے سے رفتہ رفتہ اطلاع ہوتی گئی

عہد طالب العلمی کے منقضی ہونے کے بعد فقیر کو بذریعہ ترجمہ وغیرہ کے قدیم شعرائے ہند کی تصانیف کو دیکھنے کا اتفاق ہؤا اور بعدازاں اہل جاپان و برہما و چین کے شعرا کے مذاق بھی دریافت میں آنے لگے۔ بالمختصر اس فقیر کو آج تک شاعری کی طرف میلان سابق باقی ہے۔ اب بھی جب احباب بامذاق کی صحبت نصیب ہو جاتی ہے تو کچھ نہ کچھ شعر شاعری کا ذکر چھڑ ہی جاتا ہے۔ وقت تحریر فقیر کی آنکھوں میں بہت سی ایسی صحبتیں پھر رہی ہیں جن میں یورپ اور ایشیا کے شعرا کا مذکور گھنٹوں رہا ہے۔ کبھی زبان دانان فرنگ کی صحبتوں میں ہومر، ورجل، ہارس، شیکسپیر، ملٹن، بائرن، شیلی، ٹینسن وغیرہ کے کلام پڑھے گئے ہیں۔ کبھی حضرات علمائے بامذاق کے جلسوں میں حماسہ، سبعہ معلقہ دیوان زہیر وغیرہ سے اشعار خوانیاں ہوئی ہیں۔ اور کبھی مجالس احباب باخبر و بامذاق میں فردوسی ظہیر، خاقانی، سنائی، انوری، مولوی۔ رومی، سعدی، حافظ، جامی، صائب، قاآنی، مرزا نوشہ، عمر خیام، ابن یمین وغیرہ کی طباعیوں سے روح کو حظ وافر نصیب ہؤا ہے۔ اور کبھی مجمع سخن سنجان میں میر تقی، میر درد، مرزا سودا، میر حسن ذوق مومن خان، خواجہ آتش، نواب سید محمد خان۔ رند، صبا، بحر، قلق، سحر کے کلاموں سے جان کو تازگی بخشی ہے۔ یہ سب صحبتیں خواب سی معلوم ہوتی ہیں۔ اکثر احباب بامذاق جن کی صحبتیں ذریعۂ لذت روحانی تھیں راہی ملک بقا ہو گئے۔ خدا ہی جانے کہ برسوں کا ساتھ چھوڑ کر کہاں گئے اور کیا ہوئے

ع

شکوہ ہے رفتگان مقام بعید کا
ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا

اسی قسم کی صحبتوں میں جب کبھی فقیر کو اپنے اُن خیالات کو جو فن شاعری سے متعلق ہیں بعض احباب سے عرض کرنے کا اتفاق ہوا۔ تو اُن حضرات نے اُن کے مدون کرنے کی ہدایت فرمائی بہت روز وں تک تو ارادہ ہی کرتا رہا اور حقیقت یہ ہے کہ کثرت مشاغل سے اس کام کے انجام کی فرصت بھی نہیں ملی۔ حتیٰ کہ آخر کار جناب برادر معظم و محترم حکیم السیّد محمد لقمان حیدرؔ صاحب دام مجدہ نے اُن خیالات کی تدوین پر اصرار بلیغ فرمایا ناچار بجاآوری ارشاد میں کوشاں ہوا جس کا نتیجہ یہ رسالہ عجالہ ہے۔ حضرات ناظرین بالتمکین اس قلم فرسائی سے یہ زنہار خیال نہ فرمائیں کہ فقیر اپنے کو شاعری کا محقق سمجھتا ہے۔ شاعری کا محقق وہی ہو سکتا ہے جو استعداد کافی اور قابلیت وافی کے ساتھ اپنی تمام عمر عزیز کو تحقیق و تدقیق فن شاعری میں بسر کر ڈالے فقیر کو تو باطمینان اس فن کے ساتھ ہشتم حصہ زندگانی کے صرف کرنے کا بھی موقع نہیں ملا ہے۔ پس دعوئ تحقیق و تدقیق سے اس فن سے فقیر کو کیا علاقہ۔ ایسی حالت میں حضرات ناظرین کاملین سے امید ہے کہ صفت ستاری کے تقاضے سے فقیر کی عیوب پوشی فرمائیں گے اور اس کی خطاؤں سے بمصداق اذا مروا باللغو مروا کراما درگزر فرمائیں گے والعذر عند کرام النّاس مقبول

غرض تصنیف ہذا

یہ رسالہ نہ بسبیل تذکرہ لکھا جاتا ہے اور نہ علم عروض سے اس کو کسی طرح کا تعلق ہے اس رسالے کے ملاحظے سے حضرات ناظرین پر روشن ہو گا کہ شاعری کیا شے ہے۔ اس کی کتنی قسمیں ہیں ہر قسم کا کیا تقاضا ہے۔ فطری غیر فطری شاعری میں کیا فرق ہے۔ اور دونوں سے کیا نتائج مترتب ہوتے ہیں قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، مراثی وغیرہ کا کیا انداز ہونا چاہیے یہ بھی اس رسالے کے ملاحظے سے ہویدا ہو گا کہ ہر نظم حکم شاعری کا نہیں رکھتی بلکہ شاعری کے لیے نظم کی پابندی کچھ ضرور نہیں یعنی یہ بخوبی ممکن ہے کہ ایک کتاب منظوم ہو اور لطف شاعری سے بالکل معرّا ہو۔ اور دوسری ایسی ہو جو نثر ہو مگر مذاق شاعری سے تمام تر مملو ہو۔ فقیر جو شاعری کے اصول قائم کرتا گیا ہے ان سے حضرات حق بین کو شعرا کی وہبی اور کسبی قابلیتوں کے موازنے کا بھی موقع ملے گا۔ اور اُن کی تصانیف کے حسن و قبح آسانی کے ساتھ درک میں آئیں گے۔ مگر ضرور ہے کہ پہلے فقیر کے قائم کردہ اصول صحیح مان لیے جائیں ظاہرا یہ اصول بعد استقراو تصفح بلیغ کے قائم ہوئے ہیں۔ اور بنا ان کی محض فطرت پر واقع ہوئی ہے اگر فقیر سے قوانین فطرت کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے یا استقرا و تصفح میں خطا لاحق ہوئی ہے تو البتہ ایسی حالت میں وہ اصول قائم کردہ بھی غلط ہوں گے۔ بہر حال حضرات اہل انصاف سے امید ہے کہ طرف داری حق میں کوشاں ہوں گے اور اگر ان اصول کو قرین حق ملاحظہ فرمائیں گے تو اُن سے جو جو

مسائل مستخرج ہوں گے اُن کو بھی دیدۂ حق بین سے معاینہ فرمائیں گے ۔

شاعری کی تعریف آئندہ آتی ہے مگر یہاں چند امور جو شاعری سے متعلق ہیں اندراج پاتے ہیں ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شاعری کا احاطہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے اندر مضامین اللہ و ماسوائے اللہ سب کی گنجائش دیکھی جاتی ہے۔ اسی سے شاعری کی عظمت اور بلند پائیگی عیاں و آشکارا ہے شاعری کو ایسے ایسے مضامین سے جیسے توحید، عدل، ذات، صفات، وجود، عدم، قدم، حدوث، کون، فساد، جبر، اختیار، تقدیر، تدبیر، بقا، فنا، جزا، سزا، حشر، نشر، جعل، خلق، زمان، مکان، صورت، ہیولیٰ، جوہر، عرض، روح، جسم، ثواب، عذاب، دنیا، عقبیٰ، حافظہ، خیال، وہم، عقل، ہوش، ایمان، خلوص، حیا، وفا، قہر، غضب، حلم، صبر، رضا، شکر، ہمت، شجاعت، سخاوت، مروت، حسد، بغض، جبن، بخل، حرص، طمع، ہوا، ہوس، حسرت، عشق، جنون، رنج، ملال، رغبت، نفرت، رشک، غرور، شمس، قمر، کواکب، ثوابت، سیار، قوس قزح، بروج، قطب، ہوا، برق، باران، جبال، بحور، سبزہ زار، دشت، ہامون، صحرا، وحوش، طیور، حجر، شجر وغیرہ وغیرہ ہیں۔ کافی طور پر مطلع رہنا چاہیے۔ پس جب اس طرح کے مختلف انداز کے مضامین احاطۂ شاعری میں داخل ہیں تو ضرور ہے کہ ایسے مضامین کی تقسیم کوئی علمی طور پر عمل میں لائی جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اگر کسی شاعر نے کسی مضمون کو باندھا ہے تو وہ ازروی تقسیم کے کس قسمت میں داخل ہوتا ہے۔ اور جب مختلف اقسام کی شاعری کا مختلف تقاضا ہے تو اسی قسم کی رو سے یہ امر بھی دریافت میں آسکے گا کہ آیا وہ مضمون اس قسم شاعری کے تقاضے کے

مطابق اپنے محل پر بندھا ہے یا نہیں - اس تقسیم کے سمجھنے کے لیے ضرور ہے
کہ ماسوائے اللہ یعنی مخلوقات خداوندی پر ہم لوگ غور کریں اور دیکھیں کہ ماسوائے
اللہ کی خلقت کس نہج پر واقع ہوئی ہے - چنانچہ جب ہم فلسفی کی آنکھ سے ماسوائے
اللہ کو دیکھتے ہیں تو مخلوقات خداوندی کو دو نہج پر واقع پاتے ہیں - ایک نہج میں صفت
ابعادِ ثلثہ یعنی طول، عرض، عمق کو داخل پاتے ہیں، اور دوسری قسم میں اس صفت
کو بالکل مفقود دیکھتے ہیں - اوّل عبارت عالم مادّی سے ہے جس سے صفت
ابعادِ ثلثہ کی کسی حال میں منفک نہیں ہو سکتی - دوم سے مراد عالم غیر مادّی ہے جسے
اس صفت سے کوئی علاقہ نہیں ہے - مثلاً جب ہم کسی شئے فی الخارج جیسے
انگور کی طرف اشارہ کریں تو انگور کو کسی حال میں ابعادِ ثلثہ سے خالی نہیں پائیں گے
برخلاف اس کے اگر ہم حلم و قہر و محبت و عداوت وغیرہ کا جو واردات
قلبیہ ہیں ذکر کریں تو اُن کو ہر حال میں ابعادِ ثلاثہ سے بری پائیں گے - مختصر یہ ہے
کہ مخلوقات خداوندی پر لحاظ کرنے سے عالم مادّی اور غیر مادّی کا فرق دریافت
میں آجاتا ہے اور اس فرق کو سمجھنے سے اُن مضامین کا فرق بھی جو اُن سے متعلق ہیں -
آسانی کے ساتھ ذہن میں در آتا ہے اس تقسیم کے مطلع رہنے سے ہر شخص فوراً سمجھ
سکتا ہے کہ کس شاعر نے اپنے کلام میں کس قسم کے مضامین کو دخل دیا ہے - یعنی
آیا اُس نے امور عالم خارج کو یا امور فی الذہن کو حوالۂ قلم کیا ہے اس اطلاع سے
شاعر کے کلام کی حقیقت آسانی کے ساتھ منکشف ہو جا سکتی ہے صاف معلوم
ہو جائے گا کہ اُس کا کلام موقع اور محل سے درست ہے یا نہیں - یعنی جس قسم کی
شاعری اُس شاعر نے اختیار کی ہے اس کا کلام اُس شاعری تقاضے کے مطابق ہے

یا نہیں۔ ار باب اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ بعض شاعری کا یہ تقاضا ہے۔ کہ
اس میں معاملات خارجیہ کو داخل ہونا چاہیے اور بعض شاعری متقاضی اس کی ہے۔ کہ
اس میں امور ذہنیہ جگہ پائیں۔ اور بعض میں دونوں کی آمیزش درکار ہوتی ہے۔ پس تقسیم
مضامین سے واقف رہنے سے ہر شخص شاعر کی مناسبت و موزونی طبیعت کا اندازہ
آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ یعنی مجوز آسانی کے ساتھ تجویز کر لے سکتا ہے کہ آیا
وہ شاعر معاملات خارجیہ کے بیان کی قدرت زیادہ رکھتا ہے یا امور ذہنیہ کے
بیان پر زیادہ قادر ہے یا دونوں کے بیان کی اسے یکساں قدرت حاصل ہے
آئندہ معلوم ہوتا جائے گا کہ بعض شعرا ایسے ہیں کہ معاملات خارجیہ کے بیان کی زیادہ
صلاحیّت رکھتے ہیں اور بعض نے اس کے برعکس طبیعت پائی ہے۔ اس اختلاف
صلاحیّت کو تمیز کرنے سے اُن کی شاعری کا رنگ بخوبی سمجھ میں آجائے گا اور یہ
بات بھی بآسانی ذہن میں در آئے گی کہ اُن کا رنگ بہ تقاضائے موقع و محل
حسب مراد ہے یا نہیں۔ تقسیم بالا کو ملحوظ رکھنے سے جب شعرا کی صلاحیّتوں کا
اندازہ معلوم ہوتا جائے گا۔ تو بین طور پر یہ بات بھی تحقیق کو پہنچے گی کہ بہت کم
ایسے شاعر گزرے ہیں کہ معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ دونوں کے بیان پر یکساں
قدرت رکھتے تھے۔ لیکن جن کو ایسی صلاحیّت مودع تھی وہ لاریب شاعر کامل العیار
اور نادر روزگار تھے۔ علاوہ امور بالا کے اس کتاب کے مطالعہ سے اُن حضرات کو
جنھیں وسعت اطلاع کی حاجت ہے۔ مختلف مسائل علمیہ کی دانست کی شکل
پیدا ہوگی۔ واضح ہو کہ اس کتاب میں جن ملکوں کی شاعری کا ذکر آیا ہے۔ وہاں
کے حالات بھی جو وہاں کے جغرافیہ، تاریخ، تمدن، اخلاق، مذہب و معاشرت

وغیرہ سے متعلق ہیں حوالۂ قلم کیسے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کے نہیں جاننے سے کوئی شخص کسی ملک خاص کی شاعری کے حسن و قبح کو بخوبی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ لاریب تقاضلے ملک و قوم سے ناواقف رہ کر کوئی شخص کسی ملک کی شاعری سے حظ کامل اُٹھا نہیں سکتا۔ بلاشبہ اُفتادِ ملک و قوم کو شاعری میں بڑا دخل ہے۔ اس واسطے راقم نے جن ملکوں کی شاعریوں کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے وہاں کی مُلکی اور قومی حالتوں کے بیان کو بھی بقدرِ ضرورت بسبیل التزام ملحوظ رکھا ہے تاکہ مختلف اقوام کے شاعرانہ مذاق اور ان کے اسباب ہویدا ہو جائیں۔

تعریف شاعری و مجانست شاعری با موسیقی و مصوّری

واضح ہو کہ شاعری حسب خیال راقم رضائے الٰہی کی ایسی نقل صحیح ہے جو الفاظ بامعنی کے ذریعے سے ظہور میں آتی ہے۔ رضائے الٰہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہ قوانین قدرت ہیں جنھوں نے حسب مرضی الٰہی نفاذ پایا ہے۔ اور جن کے مطابق عالم درونی و بیرونی نشو و نما پاتے گئے ہیں۔ پس جاننا چاہیے کہ اسی عالم درونی و بیرونی کی نقل صحیح جو الفاظ بامعنی کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے شاعری ہے۔ جب شاعری کا ایسا تقاضا ہے تو ضرور ہے کہ جو شاعر ہو وہ رضائے الٰہی کی نقل پوری صورت کے ساتھ الفاظ بامعنی کے ذریعے سے اُتارے ورنہ اُس کی شاعری فطرت اللہ کے مطابق نہ ہوگی جو شاعری کے لیے ایک بہت بڑا عیب ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ وضاحت کے ساتھ شاعری کی بحث آئندہ حوالۂ قلم ہوگی۔ مگر

قبل اس کے مناسب ہے کہ کچھ حالات اُن دو فنون کے بھی اندراج پائیں جو شاعری سے
مجانست رکھتے ہیں اور جو درحقیقت شاعری کی قسمیں ہیں ۔ اوّل اُن سے علمِ موسیقی ہے
جو رضائے الٰہی کی نقل صحیح بذریعہ اصوات موزون کے ہے دوم مصوّری ہے ۔ جو
رضائے الٰہی کی نقل صحیح بذریعہ نقوش اور قلم کاریوں کے ہے ۔ الغرض شاعری و موسیقی
و مصوری یہ تینوں شریف اور نفیس فن رضائے الٰہی کی نقل صحیح ہیں اور دارومدار ان تینوں فنون کا
بتعیبت فطرت اللہ پر ہے پس جو شخص قوانین فطرت کی خوبیوں اور باریکیوں کو درک نہیں کر
سکتا ہے اور مشاہدات عالم درونی و برونی کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے اور بعد مشاہدات
صحیح کے رضائے الٰہی کی نقل صحیح الفاظ بامعنی یا اصوات موزون یا نقوش و قلم کاریوں کے
وسائل سے نہیں کرسکتا ہے تو ایسا شخص نہ شاعر نہ ماہر موسیقی نہ مصوّر کہلا سکتا ہے ۔

موسیقی

موزونی و ناموزونی اصوات

راقم کو اس رسالے میں پورے طور پر اس فن کو حوالۂ قلم کرنے کا موقع نہیں
ہے ۔ لیکن جس قدر امور متعلق موسیقی ہیں اور جو اس رسالے کے مباحث
سے تعلق رکھتے ہیں بسبیل اختصار عرض کرتا ہے ۔ جاننا چاہیے ۔ کہ
خدا تعالیٰ نے اپنے کمال حکمت سے اصوات کو کیفیتیں موزونی اور غیر موزونی کی بخشی
ہیں اور انسان بلکہ بعض حیوانات کی قوت سمع کو بھی اس موزونی اور غیر موزونی کی قوت
تمیز علیٰ قدر مراتب عطا فرمائی ہے ۔ پھر یہ قوت تمیز مختلف بنی آدم میں مختلف
درجہ کی پائی جاتی ہے ۔ اصوات کی موزونی اور غیر موزونی کی پوری تمیز بہت کم اشخاص کو

وہبب ہوتی ہے۔ بہرحال جس قدر انسان میں یہ قوت زیادہ حاصل رہتی ہے اُسی حساب سے اُس میں مذاق موسیقی بھی موجود رہتا ہے۔ جیساکہ بحث بالا سے ظاہر ہوا ہوگا۔ موسیقی بھی ایک قسم شاعری کی ہے یہ شاعری ان قوانین فطرت کی تبعیت ہے جن پر موزونی اصوات کا مدار ہے جو شخص اصواتی قانون فطرت سے واقف ہے اور اس سے بھی باخبر ہے کہ کیا کیا کوائف مطبوع اس کے ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہیں وہ علم موسیقی کا عالم کہا جاسکتا ہے۔ پھر وہ شخص جو اصواتی قانون فطرت سے مطلع ہوکر اور اصوات کی کوائف سے باخبر ہوکر اصوات موزون کو طرح طرح پر طباعی کے ساتھ برت سکتا ہے اور اجتہادات کی قوت بھی رکھتا ہے تو ایسا ماہر موسیقی درحقیقت شاعر موسیقی ہے۔ موسیقی علم الاصوات کا ایک جزو ہے مگر اس فن سے وہی اصوات متعلق ہیں جو قوانین فطرت کے مطابق موزونیت کا حکم رکھتی ہیں اور بھی جو قانون فطرت کے رُو سے سامع باخبر کے امور اندرونی اور واردات قلبیہ اور قوائے داخلیہ پر ایک خاص حسب مراد اثر پہنچا سکتی ہیں۔

موسیقی کا کیونکر اثر انسان پر پیدا ہوتا ہے۔ موسیقی کا کیونکر اور کیا اثر انسان اور بھی بعض حیوانات پر پیدا ہوتا ہے ایک بیان وسیع کا طالب ہے جس کی گنجائش پورے طور پر اس رسالے میں نہیں ہے لیکن بسبیل اختصار یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ انسان میں چند قوتیں ایسی مودعہ ہیں۔ جو انسان کے وسائل مسرت و غم ہوا کرتی ہیں اور اُن قوتوں پر امور خارجیہ کا اثر پیدا ہوا کرتا ہے۔ منجملہ امور خارجیہ کے اصوات بھی ہیں۔ اگر اصوات قانون فطرت کی مطابقت کے ساتھ موزونیت سے خالی نہیں ہوتی ہیں تو جو کچھ اُن اصوات کا تقاضا ہوتا ہے۔ اُس کے مطابق

ان قواے اندرونی پر اثر پیدا ہوتا ہے اور اسی درجۂ اثر کے اعتبار سے انسان کیفیت سرور و غم کو حاصل کرتا ہے اسی پر اُن حیوانات کو بھی جو کن رس ہوتے ہیں قیاس کرنا چاہیے سامع میں سرور و غم کی کیفیت پیدا کرنے کے واسطے اصوات کے فطرتی تقاضوں سے واقفیت رکھنا ضروری ہے کوئی آواز از روئے فطرت سرور پیدا کرنے کی اور کوئی غم پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے عالم موسیقی کو آوازوں کے برتنے کے وقت اُن کی کیفیتوں پر لحاظ رکھنا واجبات سے ہے ورنہ نتائج حسب مراد پیدا نہ ہوں گے۔ مثلاً اگر کوئی گویا کسی خوشی کی تقریب میں شہانہ کے عوض بروے کے سروں میں کسی گیت کو گانا اختیار کرے تو سرور کے عوض سامعین کے دلوں میں غم کے انداز پیدا ہوں گے اور اسی طرح جہاں بروا کے گانے کا موقع ہو وہاں شہانہ گانے لگے تو سامعین حسب مراد متکیف نہ ہوں گے یہ عالم موسیقی کا فرض منصبی ہے کہ علاوہ اصوات غم و سرور کے ہر کیفیت کی آواز سے اطلاع رکھے اور ان کے برتنے پر پورے طور سے قادر ہو۔ ورنہ لطفِ موسیقی کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ میرے ایک دوست سید عالی نسب والاحسب نے جو فن موسیقی میں کمال رکھتے تھے بلکہ اس فن کے امام تھے۔ آواز پر ایسی قدرت بہم پہنچائی تھی کہ آواز سے سرور، غم، رنج، راحت، محبت، عداوت، دلیری، بُزدلی، وفاداری، بے وفائی، امید، بیم، عشرت، عسرت، رحم، قہر، درشتی، نرمی وغیرہ وغیرہ کی کیفیتیں سامعین کے دلوں پر پیدا کر دیتے تھے۔ پس جس طرح شاعر الفاظ بامعنی سے اور مصوّر نقوش اور قلم کاریوں سے جو کام لیتا ہے میرے دوست مبرور و مغفور اصوات کے ذریعے سے کام لیتے تھے اور اپنے زور کمال سے موسیقی کو شاعری اور مصوّری کے ہم رتبہ

کر کے دکھا دیتے تھے۔ واضح ہو کہ یہ امر بعید از عقل نہیں۔ جب کہ درحقیقت موسیقی
ایک قسم شاعری اور مصوّری کی ہے اور جب صرف فرق اس قدر ہے کہ موسیقی رضائے الٰہی
کی نقل صحیح بذریعۂ اصوات موزون کے ہے۔ اور شاعری و مصوری ویسی ہی نقلیں بذریعہ
الفاظ بامعنی اور نقوش اور قلم کاریوں کے ہیں۔ اب رہا کہ کیا اثر موسیقی کا انسان اور بعض
حیوانات پر پیدا ہوتا ہے اس کا بھی کسی قدر بیان ضروری ہے یہ حکیم باذاق کا کام ہے
کہ شرح و بسط کے ساتھ ان اثروں کو بیان کرے جنھیں موسیقی انسان میں پیدا کر دے
سکتی ہے۔ راقم کو اتنی اطلاع حاصل نہیں کہ حکیمانہ طور پر موسیقی کی تاثیری کیفیتوں کو
حوالۂ قلم کرے البتہ حسی طور پر موسیقی کا جو اثر مزاج انسان پر پیدا ہوتے دیکھا
جاتا ہے۔ اُسے کسی قدر عرض کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سنگ دلی اس سے دور
ہوتی ہے مزاج میں رحیمی آتی ہے

موسیقی کا کیا اثر پیدا ہوتا ہے

صبر و رضا کی صفتیں پیدا ہوتی ہیں۔ خیال ایذا رسانی اور
حق تلفی کا دور ہوتا ہے اپنی بے حقیقتی، بے چارگی،
بے مائگی ہویدا ہو جاتی ہے میلان شر و فساد جاتا رہتا ہے۔ انکسار، تحمل، فروتنی،
عجز، مروت، حق پسندی، وفاداری، بے غرضی، سیر چشمی، شجاعت، مردانگی، محبت،
دردمندی، خلوص اور بھی دیگر صفات حمیدہ دل میں جگہ کرتے ہیں۔ خشونت، رعونت،
عداوت، خودستائی، خودغرضی، تکبر، تشنیع وغیرہ وغیرہ جو رذیل کیفیات بشریہ ہیں
اُن کی اصلاح ممیز طور سے ظہور میں آتی ہے۔ لیکن وہ شے جسے عوام موسیقی کہتے
ہیں اور جس سے نفس حرام کاری، فسق و فجور، رندی، اوباشی وغیرہ کی طرف مائل ہو
جاتا ہے وہ زنہار موسیقی نہیں ہے۔ وہ درحقیقت غنا ہے اور یہ وہی شے ہے

کہ جیسے اہل تقویٰ اشد من الزنا سمجھتے ہیں بجنسہ یہی حالت شاعری کی بھی ہے کہ

موسیقی اور غنا کا فرق

جو شے درحقیقت حکم شاعری کا رکھتی ہے وہ بجائے خود عبادت ہے جیسے قصائد حمد و نعت و محامد اہلبیت و ائمہ معصومین علیہ الصلوٰۃ والسلام یا وسیلہ تہذیب نفسی و تزکیہ روحی ہے مگر وہ شے جسے عوام شاعری کہتے ہیں اور جس کا تقاضا یہ ہے کہ قوائے شہوانیہ کو حرکت میں لائے۔ نفس کو بدی کی طرف مائل کرے اور انسان کو ارتکاب معصیت پر آمادگی دلاتے وہ زنہار شاعری نہیں ہے۔ ایسی شاعری وہی ہے جیسے شیطان خبیث مزاجوں کے دلوں میں القا کرتا ہے اور جس کی مثال شعرائے ایام جاہلیت میں بہت دیکھی جاتی ہے۔ علیہم ما علیہم

موسیقی کے لیے وفور قابلیت کی حاجت

واضح ہو کہ سچی موسیقی جو ایک قسم شاعری کی ہے نہایت پُر تاثیر شے ہے اور بغیر پُر مادگی کے اس میں انسان دستگاہ نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے حصول کمال کے لیے نہایت اعلیٰ درجہ کی استعداد درکار ہے یہی حال شعر گوئی کا بھی ہے کہ بغیر پُر مادگی اور وفور استعداد کے کوئی شخص شاعر نہیں ہو سکتا ہے۔ موسیقی کا اثر تب ہی حسب مراد پیدا ہوتا ہے جب انسان فطرتی قوانین اصوات سے بہرۂ وافر رکھتا ہے۔ قوانین اصوات سے اطلاع کافی رکھنے کے لیے بہت سے علموں میں ماہر ہونا درکار ہے

موسیقی اور ریاضی

حق یہ ہے کہ بے عالم ریاضی اور حکیم دانا دل ہوئے کوئی شخص ماہر علم الاصوات نہیں ہو سکتا۔ المختصر موسیقی کا مدار بڑی قابلیت علمی پر ہے اور یہی سبب ہے کہ فن موسیقی کسی انسان کی بربادی کا سبب نہیں۔

ہوتا ہے بخلاف غنا کے کہ جس کے ذریعہ سے سیکڑوں امیرزادے بدحال بداوقات

امیرزادوں کا مذاق غنا

پریشان روزگار افلاس زدہ مبتلائے نکبت ہوجاتے ہیں۔ یہ
امیرزادے ناز پروردہ اتنی معیبت کب گوارا کرسکتے ہیں۔ کہ
تحصیل صرف ونحو وادب ومعقولات وریاضی کے بعد علم الاصوات کی طرف توجہ
فرمائیں اور اس علم کے دشوار مسائل کو ذہن نشین کرنے میں دل ودماغ کو ایذائیں پہنچائیں
راقم کو آج تک اپنے وطن کے کسی ایسے امیرزادہ صاحب سے شرف نیاز کے
حصول کی صورت نہ ہوئی جو اتنا بھی واقف ہوتے کہ صوت کیا شے ہے تموج ہوا کا
کیا طور ہوتا ہے کس طرح ہوائے متموج صماخ گوش میں داخل ہو کر طبل گوش پر ضرب لگاتی
ہے اندرونی گوش کی ساخت کس وضع پر واقع ہوئی ہے۔ حس سمع کا فعل کس طرح ہوتا
ہے اصوات بسیطہ کیا ہیں اور ان بسائط سے مرکبات کیونکر شکل پکڑتے ہیں۔ علم موسیقی
کی کتابیں یوروپین زبانوں کے علاوہ عربی میں بھی ہیں۔ شیخ الرئیس کی تصنیف علم الاصوات
اور فن موسیقی میں موجود ہیں۔ شفا کی جلد رابع اسی علم میں ہے مگر حضرات عیش مزاج
عیش طلب کو ان سرزنشوں سے کیا علاقہ۔ ان بے چاروں نے موسیقی اسی لایعنی
شے کو سمجھ لیا ہے کہ بی فلاں بی فلاں برتا کرتی ہیں اگر کاش ان امیرزادوں میں موسیقی
کا سچا مذاق موجود رہتا تو زنان بازاری کی غنا پردازیوں پر جان ومال نثار نہ کرتے اور
خسران دنیا وعاقبت کے مصداق نہ بنتے۔ صحیح مذاق موسیقی کا رکھ کر کب کوئی بد
اوقاتی اختیار کرسکتا ہے مگر اس صحیح مذاق کے پیدا کرنے کے لیے بڑی کد وکاوش
درکار ہے اور یہ ناعاقبت اندیش حضرات سے ظہور میں آنا معلوم۔ پس بہ تقاضائے
بے ہنری لہو ولعب میں عمر ضائع کرڈالتے ہیں اور اکثر بے زری بدحالی بدوضعی

میں مبتلا ہو کر انواع طرح کی تکالیف جسمانی و روحانی اٹھاتے رہتے ہیں۔ اللھم احفظنا من ذٰلک۔ اگر ایسے حضرات موسیقی کا صحیح مذاق پیدا کیے ہوتے تو لاریب یہ روز سیاہ ان کو دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ کس واسطے کہ موسیقی کے مذاق صحیح کا یہی تقاضا ہے کہ ارباب غنا اور ارباب لہو و لعب سے تنفر پیدا کرے۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ موسیقی کا مذاق صحیح قوانین فطرت پر مبنی ہے۔ فطرتی قوانین کی دانست یا پیروی سے انسان تباہ و خراب نہیں ہو سکتا ہے۔ میرے دوست مرحوم جن کا ذکر سابق میں آچکا ہے اکثر مجھ سے فرماتے تھے کہ موسیقی اور غنا دو شے ہیں اور موسیقی زنہار محتاج غنا نہیں ہے۔ موسیقی کی لطافت تک غنا کی رسائی ناممکن ہے۔ ایک بار موسیقی اور غنا کے فرق ثابت کرنے کا جناب میر صاحب کو ایک خوبصورت موقع ملا۔ اتفاق وقت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایران کے ایک حضرت مجتہد صاحب مجلس سوزخوانی کی شرکت سے اس بنیاد پر انکار فرماتے ہیں کہ ہندیوں کی مجلس سوزخوانی غنا کا حکم رکھتی ہے۔ اس پر مرحوم نے وعدہ فرمایا کہ مجلس سوزخوانی اس انداز پر انجام پائے گی کہ غنا کا کچھ لگاؤ نہ ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جناب مجتہد صاحب کو عندالتجربہ اقرار کرنا پڑا کہ ایسی سوزخوانی زنہار غنا کا حکم نہیں رکھتی ہے بعد ازاں ارباب تمیز سے یہ بات دریافت میں آئی کہ میر صاحب نے غنا سے علحدہ رہنے کے لیے موسیقی کی دشوار راہیں اختیار کی تھیں اور تمام ترکٹکری اور تان وغیرہ سے احتیاط فرماتے گئے تھے۔

موسیقی قانون فطرت پر مبنی ہے۔ فقیر نے بھی چند بار اس ماہر علم موسیقی کو اسی طور پر سوزخوانی کرتے دیکھا تھا۔ واقعی مرحوم کی

سوز خوانی غنا سے الگ ہو کر ایک عجیب پاکیزگی پیدا کرتی تھی کہ جس کے سُننے سے خدا یاد آجاتا تھا اور تمام نامشروع نغمے قابلِ تنفر معلوم ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بے کمالِ موسیقی کے کوئی شخص ایسا اثر دل سامعین پر پیدا نہیں کر سکتا ہے جو میر صاحب کرتے تھے وہ اعلیٰ درجے کے علم الاصوات کے اصول سے متعلق تھے اور تمام تر قوانین فطرت کے ساتھ تطابق رکھتے تھے اسی باعث سے سامعین پر ایک اثر خاص پیدا ہوتا تھا۔ جناب مرحوم یہ فرماتے تھے کہ اگر موسیقی کا علم قوانین فطرت پر مبنی نہ ہوتا تو رُوح انسانی کو اس سے زنہار حظ نہیں ملتا اور واقعی امر یہ ہے کہ موسیقی کو لذائذ حسّی سے کوئی تعلق نہیں ہے برخلاف غنا کہ سراپا لذت حسی سے متعلق ہے اور ہرگز شایان رُوح پاکبازاں نہیں ہے ارباب الملاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ عموماً جو گانا گوییّے وغیرہ گایا کرتے ہیں وہ علمِ موسیقی کے احاطے سے گزر کر غنا کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ فن موسیقی زنہار محتاج ان ترکیبوں کا نہیں ہے۔ جس کے خوگر عوام مُغنّی دیکھے جاتے ہیں۔ مثلاً ماہران موسیقی گٹکری اور جبڑے کی تان وغیرہ کو داخل فن موسیقی نہیں جانتے اور بالکل ایسی چیزوں سے احتیاط کرتے ہیں چونکہ موسیقی رضائے الٰہی کی نقل صحیح ہے۔ ماہر موسیقی کو فطرت اللہ کی تبعیت کرنا واجبات سے ہے فطرت اللہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فطرتی اصول موسیقی کیا ہیں۔ مرغان نوا سنج میں خلقی خوبیاں موسیقی کی موجود ہیں۔ فطرت کے گوییّے یہی طیور نغمہ سرا ہیں آدمی نوا سنج پیدا نہیں ہُوا ہے۔ مگر نوا سنجی کے کسب کی صلاحیّت رکھتا ہے۔ پس ان فطرتی گویّوں کی تبعیت سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے اور جو ان سے حاصل کرے گا اسی کو لب لباب موسیقی سمجھنا چاہیے اور

چونکہ یہ حاصل کردہ انسان کا تمام تر مطابق قانون فطرت کے ہوگا تو ضرور ہے کہ جو شے مطابق قانون فطرت ہو وہ سبب انشراح روح بھی ہو۔

طیور نواسنج فطرتی ماہر موسیقی ہیں

اسی غرض سے میر صاحب مرحوم بہت سے طیور خوش نوا از اقسام شاما، پدّا، بوکو تھا، کویل، پپیہا، بلبل وغیرہ اپنے پاس رکھتے تھے اور اُن کی نواسنجیوں کو عالم موسیقی کے کانوں سے سُنا کرتے تھے۔ میرے بہشت نصیب دوست تو بڑے ماہر موسیقی تھے۔ اور خدا جانے کیا کیا نکات موسیقی کے نغمہ ہائے طیور سے نکالتے تھے۔ لیکن کیا کہیے اُن کی تھوڑی صحبت سے فقیر کو بھی فطرتی نغموں سے متلذذ ہونے کا مذاق پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ آخر شب کو اکثر بیدار ہو کر مرغان سحر کی خوش آوازیوں سے ایک خاص طرح کی لذت روحی اٹھاتا ہے۔ سوا ان مرغان سحر کے اور بھی نواسنج طیور ہیں جن کے نغمے سرمایۂ مدہوشی ہیں۔ اس عاجز کی ایک دن کی سرگذشت یہ ہے کہ حسب عادات ایک جنگل میں مصروف شکار تھا اتفاق وقت سے سابروں کی تلاش میں ایک طرف کو جا نکلا۔ ایک اور بھی شکاری دوست ساتھ تھے۔ اِدھر اُدھر نظر ڈال رہا تھا کہ اتنے میں کسی طائر نغمہ زن کی ایسی صدائے دلکش کانوں میں پہنچی کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا ہمہ تن گوش ہو گیا۔ رفل ہاتھ سے جدا ہو گئی۔ جب تک وہ صدائے ہوش رُبا کانوں تک پہنچا کی دنیا و ما فیہا کی کچھ خبر نہیں رہی میرے ساتھی دوست کی بھی وہی حالت ہوئی جو میری ہوئی۔ خدا جانے چند منٹ تک ہم دونوں کس عالم میں رہے آج تک بھی جو اس فطرتی نغمے کے تلذذ روحی کو یاد کرتے ہیں تو طبیعت ہاتھ سے جانے لگتی ہے اسی طرح کوہی جھاڑیوں میں

بہت سے چھوٹے چھوٹے طیور پلائے جاتے ہیں جن کے نغمے نہایت دردناک ہوتے ہیں بہت مرتبہ ان خُرد مقدار فطرتی مطربوں نے ایسے نغمہ ہائے دلکش سُنائے ہیں کہ اپنے شغل صید افگنی میں کچھ نہ کچھ خلل لاحق ہوتے گئے ہیں۔

سوا انسان کے بعض حیوانات پر بھی موسیقی کا اثر ممیز طور سے پیدا ہوتا ہے۔ سانپ کو تلذذ خاص موسیقی سے حاصل ہوتا ہے خوش آئند آواز کا اثر اس موذی جانور پر بہت ہوتا ہے اور جب تک خوش آئند آواز سے مست رہتا ہے مائل ایذا وہی نہیں ہوتا کبھی یہ جانور شب کے وقت پازیب کی جھنکار سن کر پایۂ صبر سے درگزرتا ہے یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

بعض حیوانات پر بھی موسیقی کا اثر پیدا ہوتا ہے

صوت خوش آئند سے موذی کا دل بھی بھر آتا ہے اونٹوں پر حُدی خوانی کا اثر جیسا ہوتا ہے زائرین اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے جو فرمایا ہے۔ کہ "اشتر بہ شعر عرب در حالت است و طرب" ایک امر واقعی ہے اسی طرح آہوان وحشی بھی مست نغمہ ہو جاتے ہیں اور اثر نغمہ سے اُن کی ساری وحشت بھی ہرن ہو جاتی ہے مصنف مثنوی سحر البیان یعنی میر حسن غیب لسان نے جو لکھا ہے کہ ؎

جہاں بیٹھ کر وہ بجاتی تھی بین ! — تو سُننے کو آتے تھے آہوے چین

ہوا بندھ گئی اُس گھڑی اس اصول — بسیرا گئے جانور اپنا بھول

زنہار قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ سوا ان جانوروں کے مؤلف کی اطلاع ذاتی میں اور بھی جانور ہیں جن پر موسیقی کا اثر واضح طور پر ہوتا ہے۔ مثلاً خرگوش صحرائی وغیرہ اور حتٰی کہ عنکبوت کہ ستار اور بین کی آواز سے دیوار پر مضطربانہ

دوڑنے لگتا ہے اور کبھی مطربوں کے پاس مشتاقانہ پہنچ بھی جاتا ہے۔ نغمۂ خوش آئند سے مرغان نوا سنج کا مست ہو کر چہکنا ہر شخص کو معلوم ہے محتاج بیان نہیں ہے۔ کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوران سباعی پر بھی موسیقی کا اثر نمایاں طور سے ظاہر ہوتا ہے چنانچہ محققین نے لکھا ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں بھیڑیوں کی کثرت رہا کرتی تھی اتفاقاً ایک بوڑھا گویا شب کے وقت کسی گانوں کی طرف بغرض شریک ہونے کسی جلسے کے چلا جاتا تھا رات زیادہ آگئی تھی اور راہ بسبب بھیڑیوں کے مخدوش ہو رہی تھی۔ نصف راہ جب طے کر چکا تھا کہ اُس نے بھیڑیوں کی آواز سنی اور سمجھا کہ وہ سب اُس کی طرف آرہے ہیں خوف جان سے بھاگ نکلا۔ مگر جب مفر کی صورت نظر نہ آئی۔ تب ایک شکستہ مکان کے چھپر پر چڑھ گیا اتنے میں بھیڑیے آپہنچے اور وہ سب بھی اُس چھپر پر چڑھنے کی مستعدی ظاہر کرنے لگے۔ جب اُس گویئے نے یہ دیکھا کہ اُن موذیوں سے وہاں بھی جان بچتی نظر نہیں آتی ہے۔ تب اُس نے فوراً بغل سے سارنگی نکال کر بجانا شروع کی جتنے بھیڑیے تھے اُس ساز کی خوش آئند صدا سن کر محو و سہو ہو گئے اور جو جہاں تھے وہیں رہ گئے امتحاناً جب گویا سارنگی بجانا موقوف کرتا تو پھر اُن کی درندگی عود کر آتی اور وہ سب اُس کے پکڑنے کا قصد کرتے لیکن وہ فی الفور اُن کو جادوے نغمہ سے بے حس کر دیتا۔ اسی طرح دو گھنٹہ کامل گذر گئے اتنے میں کچھ لوگ اُس طرف کو آپہنچے اور بھیڑیے اُن کو دیکھ کر فرار ہو گئے۔

موسیقی اور غنا پر مذہبی پہلو سے نظر واضح ہو کہ اہل اسلام عموماً موسیقی کو حرام جانتے ہیں اور علمائے اہل اسلام کے فتاویٰ بھی اس کی

حرمت میں دیکھے جاتے ہیں راقم کو فتاویٰ سے یہ نہیں ثابت ہوُا کہ حکم علمائے اعلام کا موسیقی کی نسبت ہے یا غنا کی نسبت اگر غنا کی نسبت ہے تو بہت بجا ہے بدیں وجہ کہ غنا اکثر معاصی کا سبب ہوتا ہے۔ خاص کر ایسے لوگوں کو جو بداوقات ناعاقبت اندیش اور نفس پرست ہوتے ہیں لیکن اگر موسیقی کی نسبت بھی وہی حکم ہے تو اُس کی حرمت کا کوئی سبب معقول بھی حضرات علمانے ضرور سمجھ لیا ہوگا۔ ورنہ بے سمجھے بوجھے ایسے حکم شرعی کا جاری کرنا چہ معنی دارد۔ اب سوال یہ ہے کہ وقت استفتا حضرات علما کو موسیقی اور غنا کا فرق سمجھایا گیا تھا یا نہیں۔ یا یہ کہ حضرات علما خود موسیقی اور غنا کے مفہوم سے خبر رکھتے تھے یا نہیں۔ دونوں شکلوں میں اگر حضرت مفتی یا حضرت مجتہد کو موسیقی اور غنا کے فرق سے لاعلمی تھی تو عقلاً کوئی حکم مفتی زمان یا مجتہد عصر کا جو ایسی لاعلمی کے ساتھ نفاذ پایا ہو دل میں جگہ نہیں کر سکتا بہ تکلف اس حکم کی نسبت مرد عاقل اقرار باللسان کر سکتا ہے۔ مگر بالقلب ایسے حکم کی پابندی طاقت انسانی سے باہر معلوم ہوتی ہے۔ فقیر کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرات علمانے جو حرمت موسیقی کا فتویٰ صادر فرمایا ہے زنہار موسیقی اور غنا کے فرق کو ملحوظ رکھ کر نہیں فرمایا ہے جیسا مستفتی کا سوال تھا ویسا ہی اس کا جواب ملا۔ ظاہرا موسیقی کے حرام ہونے کی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے اسلام ایسے عقلی مذہب میں علم موسیقی حرام سمجھا جائے محض تعجب ہی تعجب ہے اسلام بالیقین معین ومؤید ومحافظ علوم ہے ایک اتنا بڑا علم جس کا مدار بہت سے علوم پر ہو ایسے سرسری طور سے بلاوجہ کافی حرام کر دیا جائے۔ اہل عقل کی سمجھ سے بہت بعید ہے علم موسیقی ایک جزو علم الاصوات کا ہے۔

اور علم الاصوات کے اصول علم طبعیات و علم ریاضی پر مبنی ہیں ۔ عالم موسیقی ہونے
کے لیے بہت بڑا شخص مُحصّل ہونا چاہیے ۔ پس ایسے علم کو جس کے حصول کے لیے
ایک بھاری تحصیل علمی کی حاجت ہو اسلام کا حرام کر دینا تمام تر عقل انسانی سے
باہر ہے عقلاً اگر دیکھئے تو موسیقی کا حرام کر دیا جانا عجب حیرت خیز معلوم ہوتا
ہے ۔ جن چیزوں کو اسلام نے حرام کیا ہے ان کی حرمت کی وجہیں نہایت
کافی اور وافی نظر آتی ہیں اُنھیں عقل کہے دیتی ہے کہ حرام ہونا چاہیے چنانچہ بعض
غیر اہل اسلام جو اپنے کو پابند عقل سمجھتے ہیں وہ بھی ان کی حرمت کو قابل پسندیدگی
سمجھتے ہیں برخلاف حرمت موسیقی کے کہ جس کے واسطے کوئی وجہ کافی کسی پہلو سے
نظر نہیں آتی ہے اور واقعی نہایت تعجب خیز امر یہ ہے کہ موسیقی ایسا علم ہے کہ
جس پر علم کی تعریف پورے طور پر صادق آتی ہے اور جس کو سوا مرد عاقل
فلسفی یا حکیم کے اور کوئی شخص حاصل نہیں کر سکتا ہے ۔ بڑے شد و مد کے ساتھ
حرام سمجھا جائے ضرور ہے کہ ہمارے حضرات علما کو حقیقت موسیقی سے اطلاع
نہیں ہوئی ہے ورنہ ایسی شدت کا حکم اس علم کی نسبت صادر نہ فرماتے ۔ ظاہرا
مذہب اسلام ایسا مذہب نہیں ہے کہ اس کا پیرو نعمتہائے الٰہی سے محروم کیا جائے
اگر اسلام کی وسعت تمتع پر لحاظ کیجیے تو اس قدر وسیع ہے کہ اس سے اس کا دائرہ
تب ہی وسیع تر ہو سکتا ہے کہ جب اشیائے ضارہ اس کے احاطۂ تمتع میں در
آئیں مگر جہاں تک تمتع بلا ضرر کا احاطہ ہے وہاں تک اسلام کی پوری اجازت
دیکھی جاتی ہے اسلام نے زبان کے ذریعے سے متمتع ہونے کو منع نہیں فرمایا ۔ جو
لطیف و خوش گوار لذیذ طیب غیر ضار چیزیں کہ انسان ذائقہ کر سکتا ہے ۔ سب

اس دین نے حلال کر دیں۔ حرام اُسی کو کر دیا ہے کہ جس سے صحت بدنی میں فرق آسکے جیسا کہ سُؤر شراب یا اور اشیائے ضارّہ و ناپاک جن سے خرابی جسمانی یا روحانی مترتب ہو اسی طرح اسلام نے قوّت بصر سے متمتع ہونے میں کوئی امتناعی حکم صادر نہیں فرمایا۔ آدمی پابندی اسلام کے ساتھ تمام رنگ برنگ کی مخلوقات خداوندی کو جو احاطۂ بصر میں آسکتی ہیں بلاخوف معصیت دیکھ سکتا ہے۔ البتّہ اسلام نے اُنھیں چیزوں کے دیکھنے کو منع فرمایا ہے کہ جن کا دیکھنا بے حیائی سے خالی نہیں ہے یا جن کے دیکھنے کا حق دیکھنے والے کو نہیں ہے اگر اسلام نے ایسی چیزوں کے دیکھنے کی ممانعت فرمائی تو کیا بے جا کیا عاقل آدمی اسلام کی ایسی ہدایت کو ضرور تسلیم کرے گا پھر اگر قوّتِ شم سے متمتع ہونے کو خیال میں لائے تو پوری وسعت تمتع اسلام کے رو سے اس کے پیرو کو حاصل ہے البتّہ اسلام ایسے سم قاتل کو شم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا ہے۔ جس سے قتل نفس منتج ہو سکے یا جس کے شم کرنے کا شم کرنے والے کو حق حاصل نہ ہو۔ اسی پر قوّت لمس کے تمتع کو بھی خیال کرنا چاہیے۔ پیرو اسلام جائز طور سے ہر شے کو مس کر سکتا ہے البتہ اس قوت کو ایسے طور پر استعمال نہیں کر سکتا ہے۔ کہ جو طور منافی عقل و شرم ہو۔ اسلام کا حکم تمتعات حسّی کی نسبت بہت وسیع ہے اور عجب انداز اعتدال رکھا ہے اسلام نے جو رہبانیت کو حرام کر دیا۔ وہ بھی اسی وسعت تمتع کے اصول پر مبنی ہے یہ عقل کے بہت خلاف ہے کہ انسان جائز طور پر لذت مواصلت سے محروم رہے۔ پس جب تمتع کا دائرہ اس قدر وسیع ہے تو نہایت عجیب انگیز یہ امر ہے کہ انسان اُس

صورت میں کہ فحش و بے حیائی و مضرات جسمانی سے پرہیز کر کے حسِ سمع سے شکل تمتع
پیدا کرے تو یہ تمتع اُس کا فعل حرام سمجھا جائے حسِ سمع ایک نہایت شریف
انسان کو دیا گیا ہے یہ قوت انسان کے لیے تشرّف بالمعرفت کا ذریعہ ہے
اگر یہ قوت مودعہ نہ ہوتی تو انسان کسی حال سے صاحب علم و دانش نہ ہوتا یہ وہ قوت
ہے کہ جس پر تمام تعلیمات روحانی کا مدار ہے پس ایسی قوت سے اُس چیز کا تمتع
کہ جس کو علوم مختلفہ سے تعلق عظیم ہو کیونکہ ایک ایسے عقلی مذہب کے رو سے (جیسا
کہ فی الواقع اسلام ہے) حرام مانا جا سکتا ہے موسیقی کو فحش بے حیائی مضرات
جسمانی و روحانی سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔

موسیقی مصلح اخلاق ہے

نہ موسیقی کسی طور سے محرک شہوات نفسانی ہے۔ بلکہ
برخلاف اس کے مصلح اخلاق و مفید صحت جسمانی و معین
لذات روحانی ہے ان خوبیوں کے ساتھ ایسی شے جیسی کہ موسیقی ہے اسلام
ایسے عقلی مذہب کے رو سے حرام سمجھی جائے خالی از حیرت نہیں ہے ان سب
باتوں کو خیال کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حضرات علما نے موسیقی پر بحیثیت
موسیقی توجہ مبذول نہیں فرمائی ہے ورنہ ایسا حکم موسیقی کی نسبت صادر نہ فرماتے
علما سے کسی شے کی نسبت حکم مناسب حاصل کرنے کے لیے ضرور ہے کہ
یا خود علما شے استفتا طلب سے مطلع ہوں یا واضح طور پر کسی اہل اطلاع سے
واقف فرمائے جائیں جب دونوں میں ایک شکل بھی موجود نہ ہو تو حکم صحیح کے
صدور کی کیا توقع ہو سکتی ہے ۔ بخیال راقم حضرات علما سے جس قدر استفتا
اس مادے میں ہوتا گیا ہے وہ اس طور پر ہوتا گیا ہے کہ فرق موسیقی اور

غنا کا خدمت حضرات علما میں نہیں عرض کر دیا گیا ہے اگر موسیقی اور غنا کا فرق اتنا بھی عرض کر دیا جاتا کہ موسیقی ایک علم ہے کہ علم الاصوات کا ایک جزو ہے اور بحیثیت علمی نہایت دشوار اور قابل توجہ ہے اور چند ایسے قوانین اصوات پر مبنی ہے کہ جو تمام تر فطرتی انداز رکھتے ہیں جن سے قوت سمع کو فطرتی تلذذ حاصل ہوتا ہے جن سے قوائے اخلاقیہ خراب نہیں ہوتے ہیں جن سے خواہشات نفسانیہ کو ہیجان نہیں ہوتا ہے جن سے انسان کو پست خیالی و پست حوصلگی مترتب نہیں ہوتی ہے اور جن سے صحت جسمانی کو نقصان کی صورت نہیں پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کے عوض انسان میں صفتیں وردمندی، ہمدردی، خلوص، انکسار، فروتنی، تعبد وغیرہ وغیرہ کے پیدا ہوتی ہیں اور غنا وہ شے ہے کہ مخرب اخلاق اور سراپا لہو و لعب ہے اس سے قوائے شہوانیہ حرکت میں آتے ہیں۔ اور انسان مرتکب معاصی ہوتا ہے اور آخر کار بدحال و بداوقات ہو کر خسر الدنیا والعاقبت کا مصداق ہو جاتا ہے تو راقم کو اس کا یقین کامل ہے کہ ہمارے علمائے دین کوئی حکم سخت موسیقی کی نسبت صادر نہ فرماتے موسیقی موزونی اصوات کا دوسرا نام ہے موزونی اصوات سے خرابی جسمانی و روحانی منتج ہو اس کا اور راک احاطۂ عقل سے باہر ہے۔ محقق حضرات نے فقیر سے حرمت موسیقی کے مادے میں یہ تقریر فرمائی ہے کہ چونکہ موسیقی ذریعۂ ہیجان قوائے شہوانیہ ہے اور اس سے ارتکاب معاصی کا ظہور میں آنا قرین قیاس ہے اس واسطے ایسی شے کو جو ایسا ہیجان پیدا کرے ضرور حرام ہونا چاہیے۔ اوّل تو یہ دلیل ہی غلط ہے۔ اگر یہ دلیل حرمت غنا کے لیے پیش ہوتی تو درست تھا

دوم یہ کہ موسیقی کو مجرد ذریعہ ہیجان قوائے شہوانیہ قرار دے کر حرام کہنا کوئی قوی دلیل حرمت نہیں معلوم ہوتی بہت سی چیزیں حلال ایسی ہیں کہ جن کے استعمال سے قوائے شہوانیہ کو موسیقی کے اعتبار سے زیادہ ہیجان ہوتا ہے جیسے دماغ عصفور دگوشت مرغ وگوشت تیتر و حلوائے مصطگی وشہد خالص وورق طلا وغیرہ وغیرہ تو کیا یہ سب اشیا جن کی فہرست ایک کتاب مبسوط بن جا سکتی ہے حرام قرار دی جائیں گی عقلاً ایسی ایسی دلیلیں کوئی وزن نہیں رکھتی ہیں۔ ہاں اگر کوئی نص قرآنی یا حدیث نبوی صلعم موسیقی کے بارے میں موجود ہے تو اس کے رو سے موسیقی کی حرمت ایک امر مقبول متصور رہے مگر باطلاع فقیر موسیقی کی نسبت کوئی حکم خداوندی معلوم نہیں ہوتا ہے۔ اگر کوئی حکم خداوندی خلاف بن ہے تو غنا کے خلاف میں ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ قول زور کی قدح فرماتا ہے۔ قول زور سے اگر مراد کوئی شے۔ لی جائے تو یہی غنا ہے مگر چونکہ موسیقی اور غنا کا فرق عموماً نہیں کیا جاتا ہے پس جو حکم غنا کے لیے پایا جاتا ہے وہی حکم موسیقی کے لیے بھی قرار دیا گیا ہے یہ امر ویسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص ناواقفیت کے باعث سرکہ اور شراب کے فرق کو امتیاز نہیں کر کے شراب کے حکم میں سرکہ کو بھی داخل سمجھے۔ بہرحال قول زور کا مقدوح ہونا ایک امر نہایت قرین حق ہے۔ فقیر نے اس قول کی اصلیت کو یوں سمجھا ہے کہ کفار عرب جو بڑے بُت پرست تھے بتوں کے سامنے شراب پی پی کر ہلاحل بجاتے تھے۔ اور بتوں کے مناقب گاتے تھے اور اسی طرح واہیات گیتوں سے نفس کو شاد کرتے تھے خدائے تعالیٰ نے اُن کے ایسے گانے بجانے کو قول زور

قرار دیا اور واقعی خوب ہی قول زور قرار دیا کس واسطے کہ اُنھوں نے خدائے تعالیٰ
کی جگہ پر بتوں کو قائم کیا تھا یہ امر ایک امر زور تھا پس جو مناقب وہ لوگ اس
زور کی نسبت گا کر پڑھتے تھے سوائے قول زور کے اور کیا ہو سکتا تھا اب حضرات
ناظرین انصاف فرمائیں کہ موسیقی کیونکر قول زور کہی جا سکتی ہے عالم موسیقی نہ خدا
کی جگہ بتوں کو قائم کرتا ہے نہ ان کے مناقب چلا چل کے ساتھ گاتا ہے عالم
دماہر موسیقی کو تو صرف چند اصوات موزوں سے تعلق ہے جنھیں وہ بشکل بسیط
ومرکب برتتا ہے۔ اگر اصوات موزوں کا برتنا حرام قرار دیا جائے تو اسلام
کے مذہب عقلی ہونے میں گفتگو لاحق ہوتی ہے۔ یہ بات عجیب نظر آئے گی کہ
حسِ ذائقہ کے لیے کھانا جو پکائے تو اُس میں نمک، مرچ، گھی، دھنیا، پیاز،
ادرک، دالی، دودھ، مصری ایک وزن مناسب کے ساتھ داخل کریں تو یہ
موزونی کسی طرح پر سبب حرمت نہ قرار دی جائے۔ لیکن اگر حسِ سمع کے
لیے اصوات کی موزونی کو ملحوظ رکھیے تو یہ فعل حرام سمجھا جائے۔ حسِ ذائقہ
کو حسِ سمع پر کیا تفوق حاصل ہے دریافت طلب امر ہے۔ ظاہراً تو حسِ سمع حسِ
ذائقہ سے اشرف معلوم ہوتا ہے۔ کس واسطے کہ حسِ ذائقہ کا فعل محض لذائذ
جسمیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ برخلاف حسِ سمع کے کہ ایک بہت شریف ہے۔
اور ذریعہ تشریف بالمعرفت ہے اور معاملات روحانیہ سے بہت تعلق رکھتا
ہے پس کیا سبب ہے کہ ایک ارذل حس کی خاطرداری تو اس قدر کی جائے
کہ جو جو اُس کے تلذذ کے عقلی امور ہوں۔ اُن میں کوئی قید نہیں لگائی جائے
اور حسِ سمع جو اشرف ہے اُس سے متمتع ہونا تقاضائے عقل کے خلاف حرام

قرار دیا جائے۔ فقیر کو اس مسئلہ موسیقی میں بہت شکوک لاحق ہیں اور خاص کر اُس روز سے اس کی نسبت فقیر کے خیالات بہت انقلاب پذیر ہو گئے جس روز فقیر کو حضور میں جناب مجتہد قبلہ و کعبہ حضرت شمس العلما مولانا مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنہ کے ایک قصیدے کے سننے کا اتفاق ہوا۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک روز فقیر خدمت ممدوح میں حاضر تھا۔ جناب ممدوح نے فقیر کی طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ تو نے میرے اُس قصیدے کو جسے میں نے منقبت حضرت امیر المومنین علیہ السلام میں لکھا ہے سنا ہے فقیر اُس قصیدے کو چند روز ہوئے تھے کہ سُن چکا تھا مگر جناب ممدوح نے اُسے ایک صاحب کو جو قریب بیٹھے ہوئے تھے پڑھنے کے لیے اشارہ فرمایا اُنھوں نے حسب ایمائے ممدوح اُسے پڑھنا شروع کیا جب تک وہ پڑھتے رہے سامعین محو حیرت رہے حق یہ ہے کہ اُنھوں نے خوب پڑھا اور ایسا پڑھا کہ اس وقت بھی اس کی لذت دل میں موجود ہے اور پھر جس سمع اُس کے سُننے کا طالب ہے خدا پھر ویسا سننا نصیب فرمائے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ پڑھنے والے صاحب نے اُس قصیدے کو حضور میں جناب حضرت مجتہد صاحب کے پیرایۂ غنا میں نہیں پڑھا تھا اگر غنا کے طور پر پڑھتے تو حضرت ممدوح کب اس کو گوارا فرما سکتے تھے اور بھی دیگر حضار مجلس جو صاحب ورع و تقویٰ تھے کب اُس کو سُن سکتے تھے اور خود پڑھنے والے صاحب جو ارباب احتیاط سے تھے کب غنا پردازی کے مرتکب ہو سکتے تھے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ ان کا پڑھنا غنا سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا۔ بہر حال جس رنگ سے اُنھوں نے پڑھا وہ ضرور کوئی ایسا رنگ تھا کہ

حکم فقہ کے خلاف نہ تھا جب حکم فقہ کے خلاف نہ تھا تو معلوم ہوا کہ ایسا پڑھنا
اسلام میں مجاز ہے۔ اب اُس پڑھنے کی کیفیت فقیر سے پوچھیے کہ کیا تھی حضرات
ناظرین با تمکین کیفیت یہ تھی کہ تمام قصیدے کو پڑھنے والے صاحب نے سِندا؟
کانی کی دُھن میں نہایت پختگی کے ساتھ پڑھا البتہ تان یا گٹکری کہیں بھی انھوں نے
نہ لی مگر سُر، لے، تال میں کہیں بھی سرِ مو جھول نہ آیا ہر لفظ کو پورے طور پہ ادا فرمایا
مخارج الفاظ میں کہیں نقصان لاحق ہونے نہ دیا نام کو بھی کوئی لفظ کہیں سے نہ کٹا
چونکہ پڑھنے والے صاحب آدمی خوش آواز بھی تھے۔ اُن کی پختگی اور موزونی
اُن کی خوش آوازی کو بڑا جلوہ دے گئی اگر سروں پر اُن کو ایسا اختیار نہ ہوتا تو
مجرد خوش آوازی ایسا اثر مطبوع سامعین پر پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ مختصر یہ ہے کہ
جو سچی موسیقی کا تقاضا ہے اُس کے مطابق بلاشبہ وہ قصیدہ پڑھا گیا۔ اشخاص ناواقف
اُس پڑھنے کو لحن وغیرہ سے تعبیر کریں تو کریں۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ جس
طور سے وہ قصیدہ پڑھا گیا تھا وہ اہلِ اطلاع کے نزدیک سچّی موسیقی کا حکم رکھتا
ہے حقیقت حال یہ ہے کہ اُن صاحب کے پڑھنے کا وہی طور تھا جس کو
ہزار درجہ اور بھی زیادہ عمدگی کے ساتھ جناب میر بندہ حسین صاحب غفران مآب
سوز خوانی میں برتا کرتے تھے اور یہ طور وہی ہے کہ ماہران موسیقی دُھرپت کے
گانے میں ملحوظ رکھتے ہیں اور برخلاف غنا کے صرف سُر، لے، تال سے کام لیتے
ہیں۔ الفاظ کو تان گٹکری سے خراب نہیں کرتے۔ مخارج الفاظ کا پورا لحاظ رکھتے
ہیں اور جو فطرتی تقاضے اصوات کے ہیں اُن کے مطابق کاربند ہوتے ہیں بالمختصر
اس روز کی قصیدہ خوانی سے فقیر کے دل پر یہ بات جم گئی کہ موسیقی ممنوعات

شرعی سے نہیں ہے یعنی اگر کوئی قصیدہ بشرطیکہ فحش اور بدآموز نہ ہو سندرہ کافی
میں بطرز بالا پڑھا جاسکتا ہے تو پیلو جنگلا بروا وغیرہ میں بھی اُس کا یا اُس کے ایسے
اور قصائد کا پڑھنا حرام نہ ہوگا۔ واضح ہو کہ فقیر کو حلت موسیقی پر اصرار نہیں ہے
اگر حضرات علما اس کو حرام سمجھتے ہیں تو بسم اللہ اقتدیت بھن الامام ہم بھی
حرام سمجھتے ہیں مگر اپنی تشفی اور تسکین کے لیے دلیل کافی ڈھونڈتے ہیں۔ اگر یہ کہا
جائے کہ موسیقی کے استعمال بد سے ضرر جسمانی و روحانی کا پیدا ہونا متصوّر ہے تو
ہزاروں چیزیں حلال ایسی ہیں کہ ان کا استعمال بد سبب ضرر دنیا و دین ہو سکتا ہے
تو یہ کوئی دلیل حرمت موسیقی کے لیے کافی نہیں ہو سکتی ہے اگر ایسی دلیلوں پر بھروسا
کیا جائے تو زندگی کرنا انسان کے لیے دشوار ہو جائے ایسی صورت میں تو پھر
کا ہے کو کوئی مسلمان شیرہ انگور پی سکتا ہے کس واسطے کہ اُس کا استعمال بد شراب
کی شکل پیدا کر سکتا ہے اگر کوئی شخص بدعقلی سے موسیقی کا استعمال بد کرے تو
اُس میں موسیقی کا کیا قصور ہے۔ موسیقی سے تو بہت عمدہ عمدہ کام لیے جا سکتے
ہیں سوز خوانی منقبت خوانی نہایت عمدہ کام ہیں ان کی پُر تاثیری اور عمدگی میں
کیا گفتگو ہو سکتی ہے۔ وہی سلام، مرثیہ یا قصیدہ کوئی غیر پابندی موسیقی کے
ساتھ پڑھے اور انھیں چیزوں کو بقاعدۂ موسیقی پڑھے دونوں کا فرق محتاج بیان
نہیں ہے تعجب ہے کہ فن موسیقی جو ایک عمدہ ذریعہ گداختگی طبیعت و نرمی
دل کا ہے بلا وجہ معقول حرام سمجھا گیا ہے وہ سوز خوانی یا منقبت خوانی جو غنا سے
علیحدہ ہو کیوں حرام سمجھی جا سکتی ہے البتہ اگر موسیقی بتوں کے مناقب و مدائح
میں استعمال کی جائے تو یہ اس کا استعمال بد قیاس کیا جائے گا مگر اس سے

بنفسہ اُس کی حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ تلوار کا استعمال نیک یہ ہے۔ کہ قصاص کے لیے قاتل کی گردن کاٹے لیکن اگر اُسی تلوار سے کوئی شخص کسی بے گناہ کا سر اُتار دے تو وہ تلوار سور شراب کی طرح حرام نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ یہی کیفیت شاعری کی بھی ہے کہ شاعری کا استعمال بدامر مقدوح ہے اور اگر شاعری سے بُت پرستی کی اشاعت غرض ہے تو یہ اس کا استعمال بد یقیناً حرام ہے لیکن اس سے شاعری کا بنفسہ حرام ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے۔ کس واسطے کہ اگر شاعری بنفسہ ایک شے مقدوح یا حرام ہوتی تو پیغمبر خدا صلعم حسان ابن ثابت کی اس قدر توقیر نہ فرماتے اور یوم غدیر پر حسان کا قطعہ مبارک باد جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔

ینادیہم یوم الغدیر نبیہم

پڑھنے نہ پاتے۔ مصوّری کی نسبت بھی بہت باتیں حسب حال معلوم ہوتی ہیں مصوّری کا استعمال بد تو سوا حرام کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ مثلاً بتوں کی تصویریں پرستش کے لیے بنانا لیکن اگر اس سے علم حیوانات وغیرہ کی ترقی مراد ہے تو اسلام ایسا مذہب نظر نہیں آتا ہے کہ کسی طور پہ مانع ترقی علوم ہو۔ آئندہ جو رائے حضرات علمائے اعلام فقیر کو آرائے حضرات علمائین کوئی مجال گفتگو نہیں ہے۔

مصوّری

یہ بھی ایک قسم شاعری کی ہے اور جیسا کہ راقم اس کی تعریف لکھ چکا ہے یہ فن بھی رضائے الٰہی کی نقل صحیح ہے صرف فرق یہ ہے کہ یہ نقل نقوش اور قلم کاریوں کے ذریعے سے ظہور میں آتی ہے۔ صفحہ کاغذ کے یا کاغذ کے ایسے مسطح اشیا پر جو اظہار اس فن کا کیا جاتا ہے اُسے مصوری کہتے ہیں اور سنگ و آہن و چوب و گل وغیرہ کے ذریعہ سے جو نقل فطرت اللہ کی کی جاتی ہے وہ بت سازی ہے۔ مؤلف دونوں قسم کی دستکاریوں کے لیے اس رسالے میں مصوّری کے لفظ کو استعمال کرے گا۔

مصوّر کے لیے علوم کی ضرورت مصوّری کی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے مناسب ہے کہ کچھ ایسے امور اندراج پائیں کہ جن سے معلوم ہو جائے کہ مصوّر کو کن کن صفات سے متصف ہونا چاہیے۔ واضح ہو کہ علاوہ اُس اعلیٰ درجے کی استعداد خلقی اور طباعی کے جن کی حاجت شاعر اور ماہر موسیقی کو بھی ہے مصوّر کو پورے طور پر ایسے علوم سے جو عالم برونی اور عالم درونی سے متعلّق ہیں حسب مراد واقف ہونا چاہیے۔ علم حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس، علم مثلث، کمسٹری علوم معدنیات، نباتات و علم حیوانات، علم ہیئت، علم مرایا و مناظرہ وغیرہ وغیرہ اور بھی جغرافیہ، تاریخ، سیر حکایات قصص، تمدن، معاشرت، ادب اور جمیع علوم متعلّق آداب مجلس میں اُسے کافی دستگاہ رکھنا واجبات سے ہے۔ علاوہ

ان کے علوم ذہنیہ میں بھی اُسے پوری مہارت درکار ہے۔ اگر کسی مصوّر کو یہ علوم نصیب نہیں ہُوئے ہیں تو وہ مصوّر نہیں ہے رنگ ساز یا چتیرا ہے گو کیسا ہی طباع اور کہنہ مشق ہو۔ ان علموں کی کیا ضرورت مصوّر کو ہے عوام اس کو بخوبی نہیں سمجھ سکتے مگر تفہیم عوام کی نظر سے ہم چند مثالیں عرض کرتے ہیں جن سے بعض ان علوم کی ضرورت ظاہر ہوگی۔

ضرورت علوم کی مثالیں

فرض کیجیے کہ ایک ایسا مصوّر ہے جو کمسٹری نہیں جانتا ہے۔ ایسا مصوّر الوان کو حسب ضرورت کیونکر مرکّب کر سکتا ہے یا رنگوں کی ترکیبوں کو کیونکر بیان سکتا ہے یا رنگوں پر جو اسباب خارجی از قسم شعاع شمسی وغیرہ سے اثر کیمیائی پیدا ہوتے ہیں کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ خود اصول کمسٹری کے جاننے کے لیے حساب و جبر و مقابلہ و طبعیات وغیرہ میں دستگاہ ایک ضروری امر ہے اسی طرح اگر کوئی مصوّر جغرافیہ سے ناواقف ہے اور اس سے یہ فرمائش کی جائے کہ کوہ لبنان کی ایک تصویر کھینچ لاؤ تو ناواقفیت جغرافیہ سے وہ بیچارہ سخت پریشان ہوگا۔ اس لیے کہ اسے کیا معلوم کہ وہ کوہ کس ملک میں واقع ہے اور وہ ملک آیا سرد ہے یا کہ گرم۔ اُس کوہ پر برف باری ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر گرم ہے تو خط استوا سے کس فاصلے پر ہے اُس کا مزاج بلدان کیا ہے۔ نباتات کی روئیدگی کا اس پر کیا طور ہے کس طرح کے جانور اُس میں مسکن گزیں ہیں ترکیب اُس کی آتش فشاں ہے یا کیا ہے آیا کسی وقت میں خود آتش فشاں تھا یا نہیں اگر اب بھی آتش فشاں ہے تو اُس کی آتش فشانی کس انداز کی ہے۔ اگر اس کی آتش فشانی موقوف ہوگئی ہے تو اُس موقوفی کو کتنے

روزگزرے۔ اوراس موقونی سے ہیئت موجودہ اُس کی کیا ہے۔ خلقت اُس کے
تپھروں کی طبقی ہے یا غیر طبقی ہے اوراسی طرح کی بہت باتیں ہیں جن کا یہاں
ذکر خالی از تطویل کلام نہ ہوگا۔ بہرحال اگران موٹی باتوں سے بھی کوئی مصوّر بے خبر
ہے تو کیا مصوّری کی داد دے سکے گا عدم اطلاع تاریخی سے جو نقص مصوّر متصوّر
ہے۔ اُس کی مثال یہ ہے کہ اگر اُس سے یہ فرمائش کی جائے کہ قیصر اوّل کی
تصویر کھینچ دو تو لاریب یہ بیچارہ سخت مبتلائے پریشانی ہوگا۔ جب اس جاہل
کو یہ نہیں معلوم کہ قیصر اوّل کس قوم کا بادشاہ تھا اور اُس کی قوم کس ہیکل اور قویٰ اور شکل
وشمائل کی تھی۔ اُس کی قوم کے بادشاہوں کا لباس کیا تھا اور اُس کے خاص لباس کا
کیا طور تھا۔ سرپر وہ تاج رکھتا تھا یا دستار کمر میں خنجر باندھتا تھا یا تلوار۔ تو ایسے
لاعلم مصوّر سے کیا صنائی کی امید ہوسکتی ہے اسی طرح اگر اُس جاہل سے یہ کہا جائے
کہ تم اُس جنگ کی تصویر جو سو برس بعد حضرت مسیح کے قسطنطین اور مخالفین مذہب عیسائی
کے درمیان واقع ہوئی ہے اور جس کا تاریخی نام پُل والی لڑائی ہے کھینچو تو وہ مصوّر
فرط جہالت سے ممکن ہے کہ ایک ایسی خیالی تصویر کھینچ دے کہ جو اُس پانی پت
کی لڑائی سے جس میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی تھی مشابہ معلوم ہو
علوم سیر و تمدن و معاشرت و آداب مجلس کی عدم اطلاع سے جو نقصانات مصوّر
کی مصوّری میں لاحق ہوسکتے ہیں۔ اُن کی کچھ مثالیں ذیل میں عرض کی جاتی ہیں:۔

فرض کیجیے کہ ایک مصوّر علم سیر سے واقف نہیں ہے اور اُس سے یہ
کہا جائے کہ تم قوم ثمود اور عاد کے انداز معاشرت کو بذریعہ مصوّری کے دکھلاؤ۔
یا فرعون و قوم فرعون کی حرکات اور بے عنوانیوں کا نقشہ کھینچو یا غیبت حضرت

موسٰی میں جو بنی اسرائیل نے حضرت ہارون سے نافرمانی کر کے گاؤ سالہ بنایا تھا اور اُس کی پرستش شروع کی تھی اُس کی تصویر بناؤ تو ظاہر ہے کہ وہ مصوّر جاہل تعمیل فرمائش نہیں کر سکے گا اسی طرح اگر ناتعلیم یافتہ مصوّر سے کہا جائے کہ تم ایران کے صدر اعظم کے کسی جلسۂ تمدنی کی تصویر کھینچو یا انگلستان کی پارلیمنٹ کی تصویر بناؤ یا چین کے شاہنشاہ کے دربار کا نقشہ تیار کرو تو وہ عدم اطلاع کے سبب سے بجا آوری حکم میں قاصر رہے گا ممکن ہے کہ ایسا لاعلم مصوّر ایران کے صدر اعظم کی شکل اکبر شاہ کے رفیق بیربر کیسی اپنی سُنی سُنائی اطلاع کے مطابق کھینچ دے اور انگلستان کے ممبران پارلیمنٹ کے مُنہ سے بڑے بڑے جواہر نگار حقے لگا دے اسی طرح چین کے بادشاہ کو بھی کسی شیخ عرب کی طرح اونٹ پر سوار دکھلا دے۔ جاہل مصوّر سے ایسی غلطیوں کا سرزد ہونا بعید از قیاس نہیں ہے مختصر یہ ہے کہ مصوّر کے لیے نہایت اعلیٰ درجے کی اطلاع علمی اور تعلیم یافتگی درکار ہے بلکہ مصوّر کو شاعر اور ماہر موسیقی کی طرح رتبہ حکیم کا حاصل رہنا ضروریات سے ہے تاکہ وہ اپنے وفور دانست کے ذریعے سے فطرت اللہ کی نقل صحیح اتارنے میں کسی طرح عاجز نہ ہو۔ اسی طرح علم ذہنیات کے عدم واقفیت سے مصوّر جاہل واردات قلبیہ و دیگر امور تعفنیہ کی نقل صحیح اتارنے میں قاصر رہے گا۔ مصوّر کا فرض منصبی ہے کہ کیفیات اندرونی از قسم محبت، نفرت، عداوت، رحم، کرم، غضب، قہر، رشک، حسد، ضد، بغض، مروت، سخاوت شجاعت، انکسار، خاکساری، غرور، کبر، نخوت، فخر، بزدلی، ندامت، سفاہت حماقت، سرور، غم، الم، عشق، جنون، وحشت، لینت، خشونت، صبر، شکر، رضا، قناعت، حلم، راستبازی، حق پسندی، مکر، حیلہ، فریب،

دغا، وفا، جفا، خوف، تلون، استقلال، تحمل، زود رنجی، پشیمانی، حرص، ہوس طمع، صدق، کذب، حیا، بے حیائی، امید، بیم، یاس، بے تابی، حرمان، انتظار انتشار، اطمینان، خوش دلی، بے دلی، وہم، خیال، حافظہ، یقین، انکار، اصرار، عقیدت، اعتبار، بے اعتباری، زہد، تقویٰ، ایمان، کفر، توحید، عدل، شرک، الحاد، سفاکی، بے دردی، ہمدردی، الہام، علم، جہل، سیرچشمی، تنگ چشمی، جود، بخل، صفا، کدورت، عصمت، عفت، فسق، آلودگی، شرافت، نجابت، احتیاط وغیرہ وغیرہ کو علمی قواعد کے ساتھ جانے ورنہ داد مصوری نہیں دے سکے گا۔ ظاہر ہے کہ سوا ایسے حکیم دانا کے جس نے ایک اچھا حصہ عمر عزیز کا علم ذہنیات کی تحصیل میں بسر کیا ہوگا۔ دوسرا شخص ان امور ذہنیہ سے خبر نہیں رکھ سکتا ہے شاعر کو بھی اسی طرح ان سے باعلم ہونا چاہیے خواہ باعلمی اس کی ایک امر الہامی خواہ کسبی ہو بہر حال مصور کو بھی شاعر کی طرح علوم ذہنیہ سے باخبر ہونا واجبات سے ہے ورنہ اُس کی بے علمی اُس کے نقص فن کا سبب ہوگی۔ جاننا چاہیے کہ مصور کا کمال اسی میں ہے کہ جو شخص دلیر ہے اُس کی دلیری کو اور جو بزدل ہے اس کی بزدلی کو اور جو عاشق ہے اس کے عشق کو اور جو فاسق ہے اس کے فسق کو اور جو کاذب ہے اس کے کذب کو اور جو صادق ہے اس کے صدق کو اور جو حاسد ہے اس کے حسد کو اور جو قانع ہے اس کی قناعت کو اور جو حریص ہے اس کی حرص کو اور جو غصہ ور ہے اس کے غصے کو اور جو رحیم ہے اس کی رحیمی کو اور جو غضبناک ہے اس کی غضبناکی کو اور جو دوست ہے اس کی دوستی کو اور جو دشمن ہے اس کی دشمنی کو اور جو راست باز ہے اُس کی لکنت کو اور جو گویا ہے اس کی گویائی کو اور جو الکن ہے اُس کی لکنت کو اور جو صاحب شرم ہے اس کی شرمگینی کو اور جو بے حیا ہے اُس کی بے حیائی کو اور

جو بادہ پرست ہے اس کی بادہ پرستی کو اور جو حسن پرست ہے اُس کی حُسن پرستی کو
اور جو زر پرست ہے اس کی زر پرستی کو اور اسی طرح کی دیگر کیفیات اندرونی کو جو
مختلف بنی آدم میں پائی جاتی ہیں زور قلم کاری سے اس طور پر دکھادے کہ ذرہ بھر
بھی تقاضائے فطرت کے خلاف نہ ہو۔ راقم کو دم تحریر تین تصویریں یاد آ گئی ہیں
جو کمال مصوّری کا نمونہ تھیں اور جن کے بیان سے کسی قدر معلوم ہو جائے گا کہ مصوّر
کو علم ذہنیات سے واقف رہنے کی کیا ضرورت ہے۔

تینتیس ۳۳ برس کا عرصہ ہُوا ہوگا کہ فقیر ہم رکاب جناب والد ماجد اعلی اللہ
مقامہ فی الجنۃ کے کلکتہ گیا ہُوا تھا۔ اُس وقت راقم بھاگل پور کے سرکاری اسکول
میں کسی نیچے کے درجے میں پڑھتا تھا مگر میلان طبعی سے کسی قدر تصویر شناسی کی صلاحیت
رکھتا تھا۔

تین تصویریں جناب غفران مآب فقیر کے مذاق مصوّری سے خبر رکھتے تھے
اور خود بھی وفور علوم عربی و انگریزی و لاطینی وغیرہ کے ساتھ اس فن کے بھی بڑے
قدردان و جوہر شناس تھے۔ حین قیام کلکتہ ایک روز یہ ارشاد فرمایا کہ تین تصویریں ایک
جگہ قابلِ دید ہیں چلو دیکھو اور انسان کی قدرت صناعی کو مشاہدہ کر کے قدرت خداوندی
پر غور و فکر کرو۔ حسب ارشاد نجیف ہم رکاب حضرت نہایت مشتاقانہ وہاں پہنچا جہاں
وہ تینوں تصویریں تھیں مالک اُن تصویروں کا کوئی انگریز تھا جو نہایت تکلف کے
ساتھ ان تصویروں کو ایک وسیع اور محفوظ جگہ میں مقفل رکھتا تھا اور ان کے
دکھلانے کی اجرت فی شخص ایک روپیہ لیا کرتا تھا۔ یہ تصویریں بقرینہ غالب بارہ ۱۲
فٹ طول میں اور آٹھ فٹ عرض میں ہوں گی۔ یہ تصویریں مضامین کتب سیر کے مطابق

ور تبعیت فطرت سے جو تلذذ روحانی انسان کو میسّر آسکتا ہے اُس کی پوری کیفیت
ان کے ہر انداز سے ہویدا تھی۔ بشرۂ ابو البشر سے یہ امر ظاہر تھا کہ خداوند تعالیٰ نے
کوئی خوشی ان کے واسطے اٹھا نہیں رکھی ہے کسی شے کی اُن کو محتاجی باقی نہیں
رہی ہے طلب سے اُن کے دلوں کو استغنا حاصل ہے فکر و تردد جس سے ان کی
اولاد مبتلائے آلام ہو رہی ہے ان کے واسطے مخلوق ہی نہیں ہوئے تھے اس
آرام روحی کے میسّر آنے کی شکل مصوّر نے یوں دکھلائی تھی کہ ارد گرد حضرت آدمؑ
و حوّا کے تمام معاملات فطرت ہی کو جگہ دی تھی کہیں مصنوعیّت کی جھلک کو بھی
گزر ہونے نہیں دیا تھا۔ جاننا چاہیے کہ تبعیت فطرت ہی ذریعہ انشراح روحی ہے
جنّت میں اگر صنعت کو دخل ہو تو جنّت دنیا کی طرح دار المحن ہو جائے۔ روحی
تلذذ انسان کو فطرت ہی کی بدولت نصیب ہو سکتا ہے اگر کچھ بھی فطرت میں صنعت
کی شرکت لاحق ہو جائے تو کمال تلذذ روحی میں نقصان پیدا ہو جائے گا۔ ملٹن
(Milton) شاعر انگلستان نے اپنی کتاب پیریڈائز لاسٹ (Paradise
Lost) میں بڑی خوبصورتی اور قابلیت شاعرانہ کے ساتھ حضرت آدمؑ کے حالات
منظوم کیے ہیں۔ باغ عدن کے سب معاملات کو کہ محض اصول فطرت پر مبنی ہیں
دکھلایا ہے اُس حیرت خیز شاعر نے یہ لکھا ہے کہ بہشت عدن میں حضرت آدم و
حوّا کی معاشرت کا طور بالکل فطرتی طریق پر تھا آدم اور حوّا دعائے صبح و شام پڑھا
کرتے تھے اور اوقات معینہ پر تسبیح و تہلیل کا مشغلہ رکھتے تھے۔ اس یاد الٰہی
کے ذکر کرنے کی یہ ضرورت تھی کہ یاد الٰہی ذریعۂ انشراح روح ہے جو شخص یاد الٰہی
سے غافل ہوتا ہے یا متمرد یا ملحد ہوتا ہے زنہار ایسے کو روحی خوشی نصیب

نہیں ہو سکتی ہے روحی خوشی نصیب ہونے کے لیے انسان کو تعبد کی حاجت ہے
جب بندہ خدا کو یاد کرتا ہے تو خدا بھی اپنے یاد کرنے والے بندے کو یاد کرتا ہے
پس جب خدا کسی بندے کو یاد فرمائے تو پھر اس بندے کے واسطے اس سے
زیادہ اور کیا دوسری خوشی متصوّر ہو سکتی ہے عبادت کے اصول محض قانونِ فطرت
پر مبنی ہیں عقل کہتی ہے کہ مخلوق خالق کو مانے اور اُس کی عبادت نہ دل سے کرے
بالمختصر ملٹن نے کمال طباعی سے حضرت آدمؑ و حوّا کے لذائذ بہشت سے تمتع
اٹھانے کے وسائل میں مضمون نصیبہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ پھر اُس کے ساتھ معاشرت
کا طور ابوالبشر کے ایسا دکھلایا ہے کہ جس میں تصنع کو کسی طرح دخل نہیں دیا ہے
حضرت آدمؑ کے قیام کے واسطے نہ کسی ایوان کا ذکر کیا ہے نہ باورچی خانہ، غسل خانہ،
نوشتہ خانہ، مردی خانہ، شفا خانہ، اثمار خانہ، انبار خانہ، اصطبل، خیمہ، خرگاہ،
شہ نشین، نمگیرا، شامیانہ کی حاجت دکھلائی ہے۔ لشکر، سوار، پیادے، پالکی،
نالکی، ہاتھی، گھوڑے، فٹن، بروشس لینڈو آفس جان، بگھی، ٹمٹم، میز، کرسی،
آئینہ، چھپر کھٹ، مسہری، چھری، کانٹے، رکابی، گلاس، کٹورے، پیالے اور
دُنیا کے جتنے بکھیڑے جن سے راحت نصیب ہونے کے عوض اہلِ دنیا ہمیشہ
مبتلائے رنج و ادکار رہتے ہیں کہیں بھولے سے بھی حضرت آدمؑ کے لگاؤ سے
یاد نہیں کیے گئے ہیں حتیٰ کہ حضرت آدمؑ کے لیے ضرورت لباس کی بھی نہیں دکھائی
گئی ہے اسی طرح حضرت حوّا کے لیے بھی کوئی تکلف انگیز سامان کا نقشہ
نہیں کھینچا گیا ہے اگر حضرت حوّا کو مجرد لباس کا شوق دیا جاتا تو حضرت آدم
میلینر سس (Milliners) یعنی زنان لباس ساز کی بلیں ادا کرتے

کرتے اور حضرت حواؑ کی لباسی فرمائشوں کو بجا لاتے لاتے آخر کار گھبرا کر باغ عدن سے کسی اور طرف نکل جاتے جہاں ہوسناک تن پرور مسرف عورتوں کا گزر نہ ہو سکتا اور یہاں ایک طرف صرف لباس کی پابندی فیشن یعنی وضعداری سے تو عورت اپنے شوہر کی رُوح پر اس کی قبا سے جسم کو تنگ کر دے سکتی ہے۔ اگر کاش حضرت حواؑ کو پورا انداق اس زمانے کی خاتونان فرنگ (French) کا ہوتا۔ تو خدا جانے حضرت آدمؑ کس عذاب شدید میں مبتلا رہتے پس اس نظر سے کہ حضرت آدمؑ کو بہشت عدن میں تلذذ روحانی نصیب تھا اس کے دکھلانے کے لیے شاعر نے تمام ایسے امور کو جس میں صنعت انسانی کو دخل ہے۔ بہشت عدن کے بیان میں داخل ہونے نہیں دیا ہے اگر ذرہ بھی صنعت کو خلل انداز فطرت ہونے دیتا تو بہشت عدن کی صورت دوزخ سے مبدل ہو جاتی یعنی پھر وہی بکھیڑے جو خاص کر اس زمانہ کے ہیں اور علی الخصوص جس کے مبتلا اس زمانے کے زن و مرد ہو رہے ہیں۔ بہشت عدن میں دخل پاتے تو بہشت عدن دار العافیت ہونے کے عوض دار المحن ہو جاتا پس شاعر نے نہایت بامذاقی کے ساتھ حضرت آدمؑ کی معاشرت کا طور محض فطرت کے مطابق دکھایا ہے اُس کے شاعرانہ بیان کے مطابق حضرت آدمؑ نہایت آزادانہ طور پر زندگی بسر کرتے دیکھے جاتے ہیں جہاں چاہتے ہیں بیٹھتے ہیں جس طرف چاہتے ہیں ٹہلتے پھرتے ہیں۔ حسب خواہش چشموں سے پانی پیتے ہیں۔ درختوں سے پھل توڑ کر کھا لیتے ہیں۔ ہزاروں رنگ کے گلہائے خودرو کا تماشا دیکھتے ہیں نہ غم دزدِ نہ غم کالا ہر طرح سے اذکار دنیوی سے محفوظ نظر آتے ہیں صرف ایک مرتبہ تنہائی سے متوحش ہوئے تھے کہ اُن کی وحشت تنہائی کو

دور کرنے کے واسطے خدائے تعالیٰ نے اُن کے لیے حضرت حوّاؑ کو پیدا کر دیا اور اس قدر سامان فطرت میں جو نقصان رہ گیا تھا وہ بھی پورا کر دیا گیا۔ اس آزادی اور بے فکری کے ساتھ کسی محبوب موافق و دلکش کے ساتھ اوقات بسر کرنا اگر جنّت نہیں ہے تو پھر اور کس کو جنّت کہیں گے اگر ایسی جنّت کے علاوہ اور کوئی جنّت ہے تو کسی مُلاّ کی جنّت ہوگی یا مذاقوں کی تو نہ ہوگی ؎

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

واضح ہو کہ اس تصویر میں مصوّر نے قلم کاری کے ذریعے سے یہ سب کیفیتیں ایک جسم مسطح پر دکھلائی تھیں جنھیں ملٹن اور بھی دیگر ممیز مصنفین نے اپنی اپنی کتابوں میں حوالہ قلم کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصوّری بھی ایک قسم شاعری کی ہے اور دونوں میں جو فرق ہے وہ اسی قدر ہے کہ ایک رضائے الٰہی کی نقل نقوش اور قلم کاریوں کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے اور دوسری وہی رضائے الٰہی کی نقل الفاظ بامعنی کے ذریعے سے ظہور میں آتی ہے۔

دُوسری تصویر دُوسری تصویر یہ تھی کہ حضرت حوّاؑ قیام بہشت عدن کے زمانے میں حضرت آدمؑ کو گندم کھلانے کی ترغیب دے رہی ہیں۔ یہ تصویر بھی سراپا قلم کاری کی صنعتوں سے معمور تھی اور اگر پوری کیفیت اس کی خوبیوں کی لکھی جائے تو کلام طولانی ہو جائے گا۔ اس واسطے راقم اس تصویر کے عرق منشا کے بیان پر قناعت کرتا ہے اس تصویر میں مصوّر نے اپنا کمال قلم کاریوں کے ذریعے سے اس طرح دکھلایا تھا کہ جس سے ہویدا تھا کہ ترغیب کیا شے ہے

عورت کی ترغیب دہی کس درجے تک پہنچ سکتی ہے عورت کے ترغیب دینے
کا اثر مرد پر اور وہ بھی مرد عاقل اور مستقل مزاج پر کیا ہو سکتا ہے۔ ترغیب اور اصرار
کے وقت عورت کی آنکھوں کا عنوان کیا ہو جاتا ہے اور اس کے تمام حرکات جسمانی
اس کے عنوان چشم کی کیونکر مددگاری کرتے ہیں۔ محبوبہ کے اصرار و ترغیب کے وقت
مرد عاقل اور مستقل مزاج کی آنکھیں اندیشہ تفکر اور سوچ کے ساتھ کس طرح رفتہ رفتہ
پایۂ عقل و حزم و استقلال سے گزرنے لگتی ہیں۔ اس تیس برس کے عرصے کے بعد
بھی راقم کی آنکھوں میں حضرت حوّا اور حضرت آدمؑ کی آنکھیں پھر رہی ہیں باوجود اس
مدت مدید کے بھی مصوّر کی کمال صناعی کا اثر آج تک فقیر کے دل پر تازہ ہو رہا ہے
بلکہ مرورِ ایام اور افزائش اطلاع سے اُس اثر میں ترقی ہوتی جاتی ہے راقم اس
لطف تصویر کو بھول نہیں سکتا کہ حضرت حوّاؑ اپنی محبوبیت کے اعتماد پر کہ حضرت
آدمؑ اُن کا کہنا نہ اُٹھائیں گے مشغول اصرار و ترغیب ہو رہی ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے
یہ کیفیتیں ٹپک رہی ہیں ہاتھ میں جو گندم کے خوشے ہیں وہ اس انداز سے حضرت
حوّاؑ لیے ہوئی ہیں کہ بجائے خود گلدستۂ ترغیب ہو رہے ہیں۔ حضرت حوّاؑ کی
آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ یہ عورت کی آنکھیں ہیں جن کو عاقبت اندیشی سے کوئی سروکار
نہیں ہے۔ آنکھیں نہیں ہیں مجسم ترپاہٹ ہیں اسی کے برخلاف حضرت آدمؑ کی
آنکھیں اظہار تفکر و مآل اندیشی کر رہی ہیں اور عجب کشمکش کا عالم دکھا رہی ہیں خدا
کی نافرمانی کا خوف حوّا کی آزردگی کا خیال عجب مرکب کیفیتیں آنکھوں میں پیدا
کیے ہوئے ہیں پھر حوّاؑ کی سردست بیدلی کا اندیشہ آئندہ کی ناخوشنودی خُدا پر
غلبہ دکھلا رہا ہے۔ اے حضرات ناظرین باتمکین اس عاجز کو اس قدر اطلاع

علمی کمال ہے کہ اُس مصور عالم کی پوری تعریف رقم کرسکے جس نے کمال صناعی
کے ساتھ دشوار دشوار امور ذہنیہ کو اس طور پر حوالہ قلم کاری کیا تھا بلاشبہ وہ مصوّر
علاوہ علوم مختلفہ کے علوم ذہنیہ میں بھی مہارت تامّہ رکھتا تھا ورنہ ایسی عالمانہ
مصوّری کا جلوہ خاص و عام کو کس طرح دکھلا سکتا ہے۔ اس تصویر کے دیکھنے
سے شعر ذیل کی کوئی عظمت راقم کی آنکھوں میں باقی نہیں رہی ہے ؎

گر مصوّر صورتِ آں جان جاں خواہد کشید
حیرتم این ست نازش راچساں خواہد کشید

معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر اُس عہد کا ہے کہ جب فن مصوّری حال کے درجۂ کمال کو نہیں
پہنچا تھا ورنہ اس زمانے میں ناز معشوق کے کھینچنے والے بہت اہلِ فن موجود ہیں۔

تیسری تصویر - تیسری تصویر بھی دونوں تصویر ہائے بالا سے نفاست
اور صناعی میں کم نہ تھی اس تصویر کا منشا یہ تھا کہ گندم خوری سے حضرت آدمؑ پر کیا
گزری۔ اور ان کی حالت میں کیا انقلاب پیدا ہؤا معاملات خارجیہ کا جو کچھ نقشہ مصوّر
نے کھینچا تھا اُس کا بیان طوالت سے خالی نہیں ہے مگر اس نافرمانی خدا سے جو
پشیمانی بدحالی بے قراری بے چینی وغیرہ وغیرہ حضرت آدمؑ کو لاحق ہوئیں۔
اُن کی نسبت اتنا عرض کر دینا ضرور ہے کہ ان کے چہرے سے یہ کیفیتیں ایسی
نمایاں تھیں کہ ان کیفیتوں کا بیان زبان کے ذریعہ سے بھی خالی از دقّت نہیں ہے

مصوّر کو مشاہدۂ عالم کی حاجت علوم خارجیہ و ذہنیہ کی دانست کے علاوہ مصوّر
کو چاہیے کہ وسعت نظر کے ساتھ صحیح طور پر عالم کا
مشاہدہ کیے ہو ملک ملک پھرا ہو طرح طرح کے بیابان، صحرا، جنگل، بحر و جبال

کو اپنی آنکھوں سے دیکھے ہو ہر قسم کے جانوروں کو ان کی صحرائی اور پروردہ حالتوں
میں معائینہ کیے ہو اقوام مختلفہ کی اوضاع و عمارات کہن و حال کو ملاحظہ کیے ہو اور
جتنی چیزیں اس عالم میں فطرتی اور مصنوعی ہیں بحد طاقت بشریہ اُن سے ذاتی اطلاع
رکھتا ہو فطرتی اشیا میں قابل مشاہدہ ایسی ایسی چیزیں ہیں مثلاً ملک ملک کی شفق
رنگ آسمان فصل بہار فصل خزاں سمندروں کے جوش طوفان برف باری ژالہ باری
برق باراں قوس قزح ارورالوریالس (یعنی شفق شمالی) ریگستان۔ گردباد۔ بادسموم
نیستان۔ مرغزار۔ سبزہ زار۔ چراگاہیں۔ دشت۔ صحرا۔ کوہ آتش فشاں پہاڑوں کی
چوٹیاں دامان کوہ دریاؤں کا پہاڑوں سے نکلنا ان کا بلندیوں سے نشیب کی طرف
جست کرنا۔ اُن کا پہاڑوں سے گزار اُن کا پہاڑوں کو پھاڑ کر بہ نکلنا ان کا میدانی
حصّوں میں کج و پکاواک راہوں کا اختیار کرنا چشموں کا اُبلنا بڑی بڑی جھیلیں (جیسے
لیک کومو وغیرہ) اور طرح طرح کے اشجار و اثمار و ازہار و طیور و دواب وغیرہ وغیرہ
مصنوعی چیزوں میں قابل دید بڑے بڑے شہر بادشاہوں کے محل ان کے دیوانِ
عام و خاص قلعہ جات۔ سفارت خانے امرا کے ایوان۔ مساجد۔ مندر۔ گرجے
مقابر۔ روضے۔ خانقاہیں۔ مدارس۔ رصدیں۔ منارے۔ باغ۔ فوارے۔ مہمان
سرائیں، پیادے اور سواروں کی بارکیں۔ پرٹیں۔ توپ خانے۔ جہاز جنگی۔ جہاز
تجارتی۔ بندرگاہیں۔ تجارت گاہیں۔ تجارتی چیزوں کی کارگاہیں وغیرہ وغیرہ ہیں
بالمختصر جب علوم مختلفہ کے ساتھ معاملات عالم کا مشاہدہ صحیح بھی مصوّر کو حاصل
ہوگا تب اُس کی صنعت اہل اطلاع کے نزدیک قابل توجہ منظور ہوگی اس
زمانے میں مصوّری کا فن اس درجہ ترقی کر چکا ہے کہ اگر بہزاد و مانی قبر سے اُٹھ کر

آئیں تو سرجبشوا رنیلز۔ روبنس وینڈک اوران کے برابر کے مصوّروں کی صناعیاں دیکھ کر خود تصویرِ حیرت ہو جائیں۔ اب مصوّری اُس بلند پایگی کو پہنچ گئی ہے۔ کہ مصوّر حکم حکیم کا رکھتا ہے۔

اس عہد میں مصوّری کی ترقی

اس زمانے کے مصوروں کی صناعیوں کے سمجھنے کے لیے انسان کو خود بھی جامع علوم پُر مادّہ اور طباع ہونا چاہیے بے اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتگی کے مصوّری کے نکات سمجھ میں نہیں آ سکتے ایک ایک تصویر اس عہد کی ایسی ہے کہ برائی خود اہل نظر کی وسعت اطلاع، جہاں دیدگی، باریک بینی، صحیح مذاقی، مضمون رسی، خوش پسندی، قوت دماغی کی آزمائش ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس وقت کے مصوّران یورپ فن مصوّری کو خوب جانتے ہیں اور اُن کی صنعتوں کو ان کے ملک کے لوگ بھی خوب سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جس درجے کی تعلیم یافتگی یورپ کے مصوّرین رکھتے ہیں۔ ان کے ملک والے بھی اُسی درجے کی تعلیم یافتگی رکھتے ہیں۔

ہندوستانی مصوّری

اہل ہند کو مصوّری کا مذاق بہت کم ہے اور جن لوگوں کو ہے بھی تو اکثر ناتمام طور پر ہے اور جن کو اس کا تھوڑا بہت مذاق ہے بھی تو انھیں اہل یورپ کی بدولت ہے ایک وقت میں دہلی کے مصوّر مشہور دیار و امصار تھے اور اب بھی مصوّر پیشہ لوگ دہلی میں موجود ہیں فوٹوگرافی کے رواج پکڑنے کے پہلے دہلی کے مصوّروں کو اعتباری دوریوں یعنی پرسپکٹو کی تمیز مطلق نہ تھی عہد ظفر شاہ تک کی تصویریں جو فقیر نے دیکھی ہیں اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصوّران دہلی کو پرسپکٹو کے قاعدے کچھ نہیں معلوم تھے

مثلاً اگر کوئی تصویر ایسی ہے کہ جس کا منشا یہ ہے کہ بادشاہ تخت پر بیٹھے ہیں اور ارا کین دولت چپ و راست کھڑے ہیں اور تخت کی پشت کی جانب یعنی بیک گرونڈ (Back Ground) میں کوئی عمارت اور باغ ہے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تخت کا پایہ ہوا میں متعلّق ہے یا کسی رکن دولت کے سر پر قرار لیے ہے عمارت کا نیلپا یہ قریب ہے یا باغ کا سرو دور ہے۔ مختصر یہ ہے کہ تمام تصویریں پرسپکٹو کا لحاظ ہی نہیں رکھا گیا ہے۔ نزدیک کی چیز دور اور دور کی چیز نزدیک یا سب چیزیں برابر فاصلے پر نظر آتی ہیں مگر جب سے فوٹو گراف نے رواج پکڑا اور مصوّران دہلی فوٹو کی نقلیں اتارنے لگے تو ان کو پرسپکٹو کی طرف ناچار توجّہ کرنی پڑی جس سبب سے اعتباری دوریوں کا تصویروں میں لحاظ رکھنا آگیا اب مصوّران دہلی بلکہ تمام مصوران ہند جو فوٹو کی نقلیں اتارتے رہے ہیں۔ فوٹو کی مدد سے اچھّی تصویریں بسبیل نقالی کھینچتے ہیں اور ہندوستانی اور ولائتوں سے اس نقالی کے ذریعے سے خوب منتفع ہوتے ہیں۔

مصوری اور نقالی

واضح ہو کہ نقالی اور مصوّری دو شے ہیں مصوّر کو علوم مختلفہ سے بڑا بہرہ درکار ہے اور اُسے مشاہدۂ عالم نہایت وسعت اور صحت کے ساتھ حاصل رہنا چاہیے۔ علاوہ اس کے اُسے بڑا ہی طباع ذہین خلاق مضمون معنی رس اور صاحب اجتہاد ہونے کی حاجت ہے۔ نقالی کے لیے مشق اور فہم معمولی کے سوا اور کوئی قابلیّت نہیں درکار ہے۔ نقالی پر نقل راچہ عقل کا مضمون تمام تر صادق ہے۔ ایک ادنیٰ فرق مصوّر اور نقال کے درمیان یہ ہے کہ مصوّر اپنے وفور علم اور طبیعت اور قوت معنی رسی سے صحیح تصویریں

مخلوقات خداوندی کی کھینچ سکتا ہے۔ نقال سے ممکن نہیں کہ اس کام کو کر سکے اگر کیسا ہی کہن مشق بھی ہو گا تو بھی نقال نقال ہے ایسا شخص اصول فطرت کے مطابق اپنے ذہن کے زور سے معاملات خارجیہ یا امور ذہنیہ کا تماشا نقوش اور قلم کاریوں کے ذریعہ سے نہیں دکھلا سکتا ہے۔ نقال شاعر کی بلند پائیگی نہیں رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے مصوّر شاعر مصوّری ہوتا ہے اور شاعر کا ہم رتبہ متصوّر ہے تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مصوّران ہندوستان کو سچی مصوّری کی دانست مطلق حاصل نہ تھی۔ جتنی پُرانی پُرانی تصویریں فقیر کی نظر سے گزری ہیں کوئی بھی نقص پرسپکٹو سے خالی نہ تھیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصوّروں کو کسی قدر شبیہ کشی میں دخل تھا مگر اس شبیہ کشی کی بھی یہ حالت معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہان اور امرا کی بد مذاقی سے اکثر مصوّرین شبیہ کشی سے احتراز کرتے تھے اور کچھ نہ کچھ منعمون کی رضامندی کی نظر سے مبالغہ کو راہ دے جاتے تھے۔ شبیہ کشی کے لیے منعم اور مصوّر دونوں کو مذاق صحیح حاصل رہنا درکار ہے۔ لارڈ کرامول (Lord Cromwell) نے جب اپنی شبیہ کھینچنے کے لیے مصوّر کو حکم دیا تو مصوّر کو پُر زور لفظوں میں یہ فہمائش کی کہ میں جیسا ہوں میری تصویر ویسی ہی کھینچو۔ اگر میرے چہرے پر کے تلواروں کے داغوں کو جن سے میرا چہرہ بدنما ہو رہا ہے چھوڑ دو گے تو میں تمھیں ایک کوڑی نہ دوں گا۔

صحت و عدم صحت مذاق مصوّری

مگر اس مذاق کے خلاف کے لوگ اس وقت بھی دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ میرے صورت آشنا ایک حضرت ہیں جنھوں نے ایک مصوّر کو اپنی شبیہ کشی کا حکم دیا۔

مصور بے چارہ ان کے مذاق سے واقف تھا سمجھا کہ اگر حضرت کی تصویر میں آبلہ روئی بدلونی وغیرہ نے جگہ پائی تو ساری محنت رائگاں جائے گی اور ایک خر مہرہ نہیں ملے گا۔ پس اس نے ایک ایسی تصویر کھینچی جو بسبب وجاہت و جمال کے کبھی ان کی شبیہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ تصویر کو اس طور پر خوبصورت بنانے کے علاوہ مصور نے حضرت کے فرق اقدس پر خاندان تیموریہ کا ایک تاج بھی چڑھا دیا جس سے اُس تصویر میں دلّی کے شاہزادوں کا انداز پیدا ہو گیا۔ جائے لحاظ ہے کہ جب ہندوستان کے خوشحال عوام کا یہ مذاق ہے تو سابق کے مصوّر با اختیار بادشاہان و نوابان و عمائد کی پوری شبیہیں کھینچنے میں بہت سی حالتوں میں مضایقہ کرتے ہوں گے اس پر بھی اُن مصوّروں کی قلم کاریوں سے عیاں ہے کہ ان کو بلا شبہ کسی قدر شبیہ کشی میں دخل تھا اور اکثر سابق زمانے کے ممیز اشخاص اپنی شبیہ کھچوایا کرتے تھے۔ چنانچہ فقیر کے بھی بعض بزرگوں کی تصویریں اس وقت موجود ہیں جن سے سابق کے مصوروں کی صناعی کا اندازہ دریافت میں آتا ہے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ عہد سابق کے اکثر والیان ملک و اہل حکومت فن مصوّری کا مذاق صحیح نہیں رکھتے تھے۔ جس سبب سے مصوروں کا مذاق بھی خراب ہو جاتا تھا اور اس خرابیٔ مذاق کے باعث ان کو اپنے فن میں ترقی کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی تھی۔ یہی حال ایشیائی شعرا کا بھی دیکھا جاتا ہے کہ تقرب سلطانی اور تقاضائے سلطنت سے ان کو فطرت اللہ کی تبعیت کا خیال باقی نہیں رہتا تھا اور اپنے ممدوحین کی خوشامدوں سے اپنی شاعری کو بد مذاقی کا نمونہ کر ڈالتے تھے انشاء اللہ تعالیٰ شعرا کی بد مذاقی کی بحث آئندہ بسط کے ساتھ حوالۂ قلم ہو گی الغرض

اس وقت جو عہد مسلمانان کی مصوّری کے آثار پائے جاتے ہیں اُن سے مصوروں کی
خوش مذاقی کا کوئی پتا نہیں لگتا۔ اس عدم خوش مذاقی کی توجیہ بعض ناواقف اشخاص
نے یوں کی ہے کہ تصویر مسلمانوں کے مذہب کے رُو سے ایک ممنوع امر ہے۔
اس واسطے عہد مسلمانان کے مصوّروں میں بد مذاقی کا نقص دیکھا جاتا ہے۔ ظاہرا یہ
توجیہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اور غیر محصّل شخص کو دھوکے میں ڈال سکتی ہے۔
مگر جو حضرات واقفِ حقیقت ہیں وہ اس توجیہ کو سراپا غلط سمجھیں گے۔ کس
واسطے کہ اگر اسلام کے تقاضائے ممانعت سے مصوران ہند میں نقص بد مذاقی وغیرہ
پایا جاتا ہے تو ضرور تھا کہ عہد ہنود کے مصوّر بہ تقاضائے بت پرستی و صنم سازی
اسلامی مصوّروں سے بہتر ہوتے حالانکہ معاملہ برعکس دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ میرے
اس دعوے کے معین الفنسٹون صاحب مصنّف تاریخ ہند کی تحریر ہے جو
فرماتے ہیں کہ ہنود اگرچہ تقاضائے مذہب سے صنم پرست ہیں اس پر بھی اسلامی
مصوّروں پر ترجیح نہیں رکھتے۔ بہرحال عہد مسلمانان کی مصوّری کا جو نقص ہے اس کا
اعظم سبب فرماں روایوں کی بد مذاقی ہے۔ چنانچہ اہل سلطنت کی بد مذاقی کی مثال
ایک یہ ہے کہ صوبہ میسور میں ایک باغ ٹیپو صاحب کا آراستہ کیا ہوا ہے۔
اس کی حفاظت اور مرمّت آج تک سرکار انگلشیہ کی طرف سے ہوتی ہے
اُس باغ میں ایک پختہ مکان بھی ٹیپو صاحب کا تعمیر کردہ ہے۔ اس مکان کے
ایک کمرے کی دیوار پر ایک جنگ کی تصویر کھینچی ہوئی ہے۔ جو ٹیپو صاحب اور
انگریزوں کے درمیان واقع ہوئی تھی اور جس میں ٹیپو صاحب کی فوج چیرہ دست
رہی تھی۔ اُس دیواری تصویر کا منشا یہی ہے جو ابھی عرض ہوا۔ مگر اب مصوّر کی

صناعی پر غرور رکھا ہے۔ ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصوّر نے کبھی مضمون فطرت اللہ پر غور نہیں کیا تھا ساری تصویر تبعیت فطرت اللہ سے معرا پائی جاتی ہے۔ اوّل تو ٹیپو صاحب کے گھوڑے کا رنگ شہابی دکھلایا گیا ہے دوم یہ۔ کہ ٹیپو صاحب کا گھوڑا اُن کے لشکریوں کے گھوڑے سے بلا لحاظ پرسپکٹو سہ گونہ جسامت میں زیادہ معلوم ہوتا ہے اور خود ٹیپو صاحب اپنے لشکریوں سے بپابندی تناسب دو گونہ جسیم معلوم ہوتے ہیں علاوہ ٹیپو صاحب اور ٹیپو صاحب کے گھوڑے کے اُن کے سواروں کے گھوڑے کوئی آسمانی کوئی زنگاری کوئی کاسنی کوئی بینگنی، کوئی دھانی رنگ وغیرہ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ماشاء اللہ ہاتھیوں میں بھی عجب انقلاب نمایاں ہے کوئی ہاتھی عبیری کوئی گلابی کوئی نارنجی کوئی زعفرانی رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ اس تصویر میں انگریز میدان جنگ سے بھاگتے دکھلائے گئے ہیں مگر نہ ان کا رنگ نہ ان کا لباس نہ ان کی صورت کو اُن کے واقعی حالت سے کوئی علاقہ معلوم ہوتا ہے۔ انگریزوں کے ساتھ ان کے خانساماں خدمت گار بھی بھاگتے نظر پڑتے ہیں مگر ان خانساماں و خدمت گار کی شناخت صرف دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ یعنی ایک تو شراب کی بوتلیں اور دوسری چائے کی بڑی بڑی کیتلیاں۔ خدا جانے عین میدان جنگ میں یہ کمبخت خانساماں خدمت گار کیا کرتے تھے۔ اور ان کی وہاں ضرورت کیا تھی۔ اس قسم کی غیر فطرتی مصوّریوں کی اور بھی بہت مثالیں ہیں جن کے اعادے کی یہاں حاجت نہیں۔ یہی ایک مثال اظہار مطلب کے واسطے کافی ہے۔

واضح ہو کہ بالا میں بہت سے امور جو راقم نے مصوّری کے متعلق بیان

کیے ہیں اُن کو شاعری سے بھی تمام تر تعلّق ہے۔ جو جو امور صحیح مذاق شاعری کے لیے درکار ہیں وہی امور صحیح مذاق مصوّری کے لیے بھی درکار ہیں حقیقت یہ ہے کہ مصوّری اور شاعری میں اس قدر مجانست ہے کہ جب انسان کا مذاق مصوّری صحیح ہوتا ہے تو شاعری کا مذاق بھی درست ہوتا ہے یہ ناممکن ہے کہ مصوّری کا مذاق صحیح ہو اور شاعری کا مذاق غلط ہو جب ہوں گے تو دونوں فنوں کے مذاق صحیح ہوں گے یا دونوں کے غلط ہوں گے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک فن کا مذاق صحیح ہو۔ اور دُوسرے کا غلط ہو موسیقی کا بھی یہی حال ہے۔ اب فقیر شاعری کی حقیقت کی طرف حضرات با مذاق کی توجہ کا خواستگار ہوتا ہے۔

شاعری

راقم شاعری کی تعریف سابق میں عرض کر چکا ہے کہ یہ رضائے الٰہی کی ایسی نقل صحیح ہے جو الفاظ با معنی کے ذریعے سے ظہور میں آتی ہے۔ رضائے الٰہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہ قوانین فطرت ہیں جنھوں نے حسب مرضی الٰہی نفاذ پایا ہے اور جن کے مطابق عالم درونی و برونی نشو و نما پاتے گئے ہیں۔ پس جاننا چاہیے کہ اسی عالم درونی و برونی کی نقل صحیح جو الفاظ با معنی کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے شاعری ہے۔

بیان عالم مادی و غیر مادی واضح ہو کہ عالم دو نہج پہ واقع ہے ایک عالم خارج ہے اور دوسرا عالم باطن عالم خارج سے مراد وہ

عالم ہے کہ جس کی ترکیب میں مادہ داخل ہے۔ اور مادہ وہ شئے ہے کہ جس سے
صفت ابعاد ثلثہ کی منفک نہیں ہو سکتی۔ جیسے شجر، حجر، قمر وغیرہ جس سے طول و
عرض و عمق منفک نہیں ہو سکتے اور یہ عالم مادی وہی عالم ہے جس پر حواس خمس کا فعل
ہوا کرتا ہے۔ اس عالم کے وسائل درک یہی حواس خمس ہیں۔ اگر یہ قوائے ظاہر یہ ہم
لوگوں کو عطا نہیں ہوئے ہوتے تو ہم لوگ عالم خارج سے مطلع نہیں ہو سکتے تھے
اس عالم خارج کی وسعت پر غور کیجیے تو عجب حیرت دامنگیر ہوتی ہے تحقیق بلیغ
کے بعد بھی اس عالم کی ابتدا اور انتہا کوئی دریافت نہیں کر سکتا۔ اگر آسمان کی طرف
دن کو نظر اٹھا کر دیکھیے تو صرف ایک آفتاب دکھائی دیتا ہے اس آفتاب پر اگر
علمی نگاہ ڈالیے تو یہ دریافت میں آتا ہے کہ یہ آفتاب صاحب نظام ہے خود
مرکز ہے اور اس کے گرد قریب قریب تین سو سیارے گردش کرتے ہیں۔ بعض سیارے
کے ساتھ ایک قمر بعض کے ساتھ چار اور بعض کے ساتھ سات قمر بھی گرداں ہیں۔
اس نظام کے قوانین عجائب و غرائب ہیں ان کی تحقیق کسی تار علما کرتے گئے ہیں
یہ ہماری دنیا بھی اسی آفتاب کی فدویان سے ہے اور بمقابلہ مشتری و زحل کے
کہ ایک مختصر سیارہ ہے اور خود یہ مشتری و زحل جسامت و عظمت آفتاب کے
مقابلے میں مختصر اجرام ہیں مجرد اس نظام پر فکر و غور کرنے سے جب اس ارض کی
بے حقیقتی عیاں ہوتی ہے اور پھر ان اشیا کو جو اس کرے سے متعلق ہیں کیا وزن ہو
سکتا ہے۔ ان علمی مسائل کی دریافت سے کیا کیا حیرت نہیں پیدا ہوتی ہے
مجرد آفتاب کی عظمت جثہ اور اس کے گرد اس قدر سیاروں کی کثرت ایک حیرت خیز
بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب ان کروی اجسام کے نظام گردش کے لیے

کس قدر وسعت کی حاجت ہے اس کو خیال کیجیے تو ایک فضائے عظیم کا تصوّر دل میں جگہ کرتا ہے جس سے ایک سخت تحیر منتج ہوتا ہے یہ تو اُس آفتاب کا نظام ہے جس کو ہم لوگ دن کو تابان اور درخشاں دیکھتے ہیں اور جو دن کے ظہور کا سبب ہے رجب رات آتی ہے اور آسمان میں ہزاروں بظاہر خرد مقدار تابان کُروی اجسام جو ثوابت کہلاتے ہیں اور جو درحقیقت آفتاب ہیں اور ہمارے آفتاب سے جسامت میں بزرگ نزہیں نمایاں ہوتے ہیں تو بصورت حاصل رہنے علم فلکیات کے یہ تعجب گزرنے لگتا ہے کہ خداوند اُن کو تو صرف ایک آفتاب نظر آتا ہے۔ جس کو دیکھ کر حیرت دامنگیر ہوتی ہے اب تو ہزاروں آفتاب دکھائی دیتے ہیں اور کوئی بھی ان شموس سے ہمارے شمس سے چھوٹا نہیں ہے پس اس قدر شموس کے نظام در نظام کے لیے کس قدر وسعت فضا درکار ہو گی لاریب عقل مرد محقل کے ان خیالوں سے مبتلائے تحیر ہوتی ہے۔ اور بے اختیار چلّا اُٹھتی ہے کہ الٰہی یہ کارخانہ عالم مادی کا کیسا ہے کہ جس کی نہ ابتدا نہ انتہا معلوم ہوتی ہے اس وقت کوئی اس دنیا کو خیال میں لائے اور سوچے کہ یہ کُرہ غیر محدود عالم خارج کا کیا جزو بے مقدار ہے اسی طرح بتدریج دنیا کی چیزوں پر اگر غوض کرتے جائیے تو ایک سے چھوٹی دوسری چیز نظر آئیگی یہاں تک کہ اجسام خُرد مقدار کے حس کرنے کے لیے خردبین شیشوں کی ضرورت ہوگی۔ جاننا چاہیے کہ جس طرح دوربین و آلات رسد کے وسیلوں سے بڑے بڑے اجرام فلکیہ کے عجائبات سے کسی قدر اطلاع کی صورت پیدا ہوتی ہے اُسی طرح ان کلاں بینوں کے ذریعے سے اشیاء خرد مقدار کے عجائبات

دریافت میں آتے ہیں اور عقل ان خرد مقدار اجسام کے درک سے ویسی ہی حیرت زدہ ہوتی ہے جیسی کہ شموس و دیگر اجرام فلکیہ کی، دریافت سے متحیر ہوتی ہے المختصر عالم مادی برائے خود ایک ایسا تعجب انگیز عالم ہے کہ جس کے تصوّر سے انسان کا دماغ چکر میں آنے لگتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عقل انسانی ایک محدود شے ہے اور زنہار اس کو اتنی صلاحیت حاصل نہیں ہے کہ عالم مادی اور اس کے متعلق کے قوانین کا حسب مراد اندازہ کر سکے اس وقت تک جو کچھ محققین نے دریافت کیا ہے وہ بہت قلیل ہے ان کی تحقیقات سے صرف اُن کے عجز کا اظہار متصوّر ہے یہ تو حالت عالم مادی کی ہے اب عالم ذہن پر غور کیجیے ۔ تو اس کی دریافت حقیقت میں عقل انسانی اور بھی مجبور ہے یہ عالم بالکل ہی جداگانہ ہے ۔ عالم مادی سے اس کو کوئی مناسبت ہی نہیں ہے اس عالم میں تمام ایسے امور ذہنیہ داخل ہیں جن کو مادیت سے کوئی سروکار نہیں ہے اور جو ابعاد ثلثہ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے یہ عالم عالم اُلوہیت سے اقرب ہے اور اسی لیے عالم مادی سے اشرف ہے اس عالم کی برتری کے آگے تمام اجرام فلکیہ وغیرہ کی بزرگی ہوا ہو جاتی ہے اسی عالم کے ذریعے سے انسان کی رسائی خدا تک ہوتی ہے اور اسی عالم کو معرفت الٰہی کا ذریعہ قیاس کرنا چاہیے انسان کو اسی عالم کے تزکیہ اور تصفیے کی فکر لازم ہے افسوس ہے کہ اس عہد میں اس عالم کی طرف علمائے زمانہ نے توجہ یک قلم موقوف کر دی ہے ۔ خاص کر علمائے یورپ کہ بالکل میٹریلسٹک (Matenealistic) خیال اور مذاق کے ہو رہے ہیں اور جو کچھ ترقیاں کرتے ہیں عالم مادی کے متعلق کرتے ہیں ۔ کوئی

شک نہیں کہ علمائے یورپ نے مادیات میں بڑی ترقی کی ہے اور کرتے جاتے ہیں مگر عالم روحانی سے غفلت اختیار کرنا خالی از ضرر نہیں ہے اس عالم مادی کی ترقی نے اہل یورپ کو روحی معاملات میں شست بنا رکھا ہے مذہب بھی ایک جزو معاملات ذہنی کا ہے اور بہت کچھ قابل توجہ ہے افسوس ہے کہ مادی مذاق کے اہل یورپ مذہب کو توجہ کی آنکھ سے نہیں دیکھتے ہیں خیر جو کچھ اہل یورپ کی حالت ہو عالم ذہن ایک بہت قابل لحاظ امر ہے اس عالم ذہن کو جس طرح خاصان خدا نے سمجھا ہے اُس سے فقیر کو کوئی اطلاع نہیں ہے مگر جو کچھ تفحص کے ذریعہ سے اس عالم کے معاملات دریافت میں آئے ہیں اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں ایک شے غیر مادی ایسی ہے کہ جس کی طرف انا نحن کی نسبت کی جاتی ہے اور وہ شے جو منسوب بہ انا نحن ہے اُس کا چند طرح کے قویٰ فطرت نے بخشے ہیں اور یہ قویٰ مختلف کام کے لیے دیے گئے ہیں ان میں سے ایک کا کام یہ ہے کہ حواس خمس کے ذریعے سے عالم فی الخارج کو درک کرے دوسرے کا کام یہ ہے کہ جو اس سبیل سے اشیائے فی الخارج کے صُور فی الذہن قائم ہوں۔ اُن کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ تیسرے کا کام یہ ہے کہ ان محفوظ صُور کو آپس میں ترکیب دے اور ان سے صُور مرکبہ قائم کرے۔ چوتھے کا کام یہ ہے کہ اُن صُور کو ایک دُوسرے سے تمیز کرے۔ پانچویں کا کام یہ ہے کہ تمیز کے بعد ان میں تجویز کو دخل دے اسی طرح مختلف قویٰ کے متعلق مختلف خدمتیں ہیں سوا ایسے ایسے قوائے فاعلیہ کے قوائے اخلاقیہ ہیں اور یہ قوائے اخلاقیہ یا حمیدہ ہیں یا ذمیمہ علاوہ ان قوائے اخلاقیہ کے واردات قلبیہ ہیں۔ جن سے

قوائے دماغیہ کو کوئی تعلق نہیں ہے اور ان واردات قلبیہ سے اہم امور روحی متعلق
ہیں اور ان واردات قلبیہ کی وسعت اس قدر ہے کہ وحی والہام تک اس کے
احاطے کے اندر آتے ہیں اور دیگر معاملات الٰہی کو تمام تر اس سے تعلق ہے مثلاً
اقرار توحید وایمان جو کہ انھیں واردات قلبیہ میں داخل ہیں اور انھیں واردات قلبیہ
کی ترقی سے انسان رفتہ رفتہ مقرب ذات ایزدی ہو جاتا ہے اس تقرب سے
اسرار خداوندی اُس پر کشف ہوتے ہیں اور آخرکار یہی واردات قلبیہ عالم اکبر
دکھائی دیتے ہیں۔ جن میں عالم اصغر یعنی عالم فی الخارج مادیت سے بری ہو کر
شامل ہو جاتا ہے اور پھر وہی عالم اکبر محل وگزرگاہ ذات باری قرار پاتا ہے
یعنی ذات وصفات باری تعالیٰ کا جلوہ گاہ قرار پاکر عرش اللہ تعالیٰ ہو جاتا ہے

لمؤلفہ

کیوں کعبۂ دل میں نہ رکھیں تجھ سے صنم کو
جلوے نے ترے ایک کیا دیر و حرم کو
ہم نے وہ صنم خانہ بنایا ہے کہ جس میں
ہو دخل نہ زاہد ترے تقوے کے صنم کو
دل ہے جو گزرگاہ خدا کعبہ یہی ہے
اے شیخ ترا کعبہ نہیں چاہیے ہم کو

المختصر ان باتوں سے عالم باطن کی عظمت کو خیال کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے
کہ عالم باطن عالم خارج سے کس قدر اشرف ہے خیر ان دونوں عالم کی کیفیت

تو اس طرح واقع ہے جیسا کہ فقیر نے بسبیل اختصار سابق میں ان کے بیان کو حوالۂ قلم کیا ہے مگر اب یہ جاننا چاہیے کہ یہ دونوں عالم یعنی عالم خارج و عالم باطن جو رضائے الٰہی کے مطابق ظہور میں آئے ہیں انھیں کی نقل صحیح الفاظ بامعنی کے ذریعہ سے شاعری کا حکم رکھتی ہے۔

شاعری کی تقسیم از روئے تقاضائے مضامین

پس جب عالم دو نہج پر واقع ہے یعنی مادی اور غیر مادی تو مضامین بھی جو اُن سے متعلّق ہوں گے ضرور ہے کہ ہم رنگ نہ ہوں چنانچہ حقیقت حال بھی یہی ہے۔ کہ جو مضامین اشیائے فی الخارج سے تعلّق رکھتے ہیں اُن کا رنگ جدا ہے۔ اور جو امور ذہنیہ سے متعلّق ہیں ان کی کیفیّت کچھ علٰحدہ ہے اسی فرق رنگ کے اعتبار سے شاعری دو قسم پر تقسیم پاتی ہے یعنی شاعری متعلّق عالم خارج جسے بزبان انگریزی آبجکٹو (Objective) اور شاعری متعلق بعالم ذہن جسے بزبان انگریزی سبجکٹو (Subjective) کہتے ہیں۔ اوّل قسم کی شاعری جس کا نام راقم خارجی رکھتا ہے ایسے بیانات پر مشتمل ہوتی ہے۔ جن سے عالم فی الخارج کے معاملات پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں اکثر بیانات رزم، بزم، جلوس، فوج، تزک احتشام بساتین[1]، باغ، قصور، چمن، گلزار، سبزہ زار، لالہ زار جبال، بحور، صحرا، دشت، بیابان، ریگستان، خارستان، جنگل، آبستان، چشمے، ہوا، برق، باران، سیل، برف، شفق، سحر، شام، روز، شب، شمس قمر، سیارے، ثوابت، قطب، بروج اور دیگر خارجی اشیاء کے متعلّق ہوتے ہیں۔ بعض شعرا میں اس قسم کی شاعری کی صلاحیت ایسی دیکھی جاتی ہے کہ ان کے

[1] جمع بستان

بیان سے معاملات خارجیہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے اور جو لطف اعلیٰ درجہ کے مصوّر کی قلم کاریوں سے اُٹھتا ہے وہی لطف ان کے بیان سے پیدا ہوتا ہے۔ یورپ میں اس رنگ کے شاعر کی مثال (انگریزی شاعروں میں) سر والٹر اسکاٹ اور اُردو شاعروں میں کسی قدر نظیر اکبرآبادی ہے۔ یورپ اور ایشیا دونوں میں اس رنگ کے کچھ ایسے شعرا گزرتے گئے ہیں کہ اگر انھوں نے کسی معاملہ رزم کو حوالۂ قلم کیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ رزم آنکھوں کے سامنے ظہور میں آرہا ہے اسی طرح اگر انھوں نے جبال و بحور و صحرا وغیرہ کے حالات موزوں کیے ہیں تو یہ سب موجودات فی الخارج پیش نظر معلوم ہوتی ہیں اس طرح کی واقعہ نگاری پر قادر ہونا آسان امر نہیں ہے۔ جب تک کہ شاعر کو معاملات خارجیہ پر غور اور فطرت اللہ کی تبعیت کی صلاحیت بدرجہ اتم حاصل نہ ہوگی اپنے بیانات میں تصویر کا عالم نہیں پیدا کر سکے گا۔ دوسری قسم کی شاعری جس کو راقم داخلی موسوم کرتا ہے تمام تر ایسے مضامین سے متعلق ہوتی ہے۔ کہ جن کو سراسر امور ذہنیہ سے سروکار رہتا ہے یہ شاعری انسان کے قوائے داخلیہ اور واردات قلبیہ کی کیفیتوں کی مصوّری ہے۔ اس رنگ کے بھی ممتاز شعرا یورپ اور ایشیا میں گزرے ہیں منجملہ ان کے انگریزی شعرا میں لارڈ بیرن (Lord Byron) ہے اور اُردو شاعروں میں میر تقی۔ اس رنگ کے شاعروں نے اگر عشق کو بیان کیا ہے تو عشق کی تصویر سامنے لاکر کھڑی کردی ہے اسی طرح اگر اُنھوں نے غم، غصّہ، رنج، ملال، افسوس، حسد، بغض، رشک، محبت، عداوت، رغبت، نفرت وغیرہ وغیرہ کو حوالۂ قلم کیا ہے تو ایسے ایسے امور

ذہنیہ کے بیان میں مصوّر کی قلمکاری کا لطف دکھایا ہے۔ بہر حال ان دونوں رنگوں کے شعرا کے کلام مختلف زبانوں میں موجود ہیں جن کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسی کو معاملات خارجیہ کے بیان پر قدرت حاصل تھی اور کسی کو امور ذہنیہ کے اظہار کوائف کی صلاحیت مودعہ تھی علاوہ ان کے کچھ ایسے شعرا بھی اقوام مختلفہ میں دیکھے جاتے ہیں کہ دونوں رنگ کی شاعری پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اور اسی شاعری قابلیت کی وجہ سے اُن کی شہرت آج تک برقرار ہے بلکہ ترقی علوم و فنون کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے۔ اس جامعیت کی مثال ہومیروس ورجل فردوسی، شیکسپیر، ملٹن، گوئٹے، میرانیس، والمیکی، بیاس اور کالیداس ہیں۔ انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ اقسام بالا کے شعرا کا مذکور زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے گا جس سے فقیر کے مضامین بالا کی تصریح اور بھی واضح طور پر ہو جائے گی۔

جاننا چاہیے کہ شاعری کے مذاق صحیح و غیر صحیح کا مدار انھیں معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی دانست پر ہے جن شعرا نے عالم درونی و بیرونی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر مضمون بندی کی ہے اُن کی شاعری مذاق صحیح سے خالی نہیں ہو سکتی۔ عالم خارج و داخل کے تقاضوں پر لحاظ رکھ کر کاربند ہونا تبعیت فطرت ہے۔ پس جب کوئی شاعر تبعیت فطرت کی پابندی کے ساتھ مضمون بندی کرے گا تو عام اس سے کہ اُس کی شاعری کا انداز خارجی ہو یا داخلی اُس کی شاعری ضرور فطرتی ہو گی اسی فطرتی شاعری کو مذاق صحیح کا مصداق سمجھنا چاہیے برخلاف اس کے اگر کوئی شاعر معاملات خارجیہ و ذہنیہ کے تقاضوں سے انحراف کرے یعنی تبعیت فطرت نہ کرے تو اُس کی شاعری مذاق غیر صحیح کا نقشہ پیدا کرے گی

اسی اصول پر سخن فہموں کے مذاق کو بھی قیاس کرنا چاہیے اور حق یہ ہے کہ سخن فہم کو معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی دانست اور اُن کے تقاضوں کی اطلاع خود شاعر کے برابر یا شاعر سے بھی زیادہ درکار ہے اگر زیادہ نہ ہو تو خود شاعر کے برابر تو ہو کس واسطے کہ اگر یہ ہوتا ہے کہ فطرتی مضامین شاعر کو تبعیت فطرت کے قصد کے بغیر بسبیل الہام تفویض ہوتے ہیں اور خود شاعر اپنے کلام کی خوبیوں سے شعر گوئی کے وقت آگاہ نہیں رہتا ہے بلکہ بہت سے ایسے مضامین اس کے قلم سے الہامی طور پر نکل آتے ہیں کہ سخن فہموں کو اُس کی خوبیاں بعد فکر و غور کے درک میں آتی ہیں اور خود شاعر اُن کی اطلاع سے ممکن ہے کہ تا دم آخر محروم رہ جائے پس ایسی صورت میں ضرور ہے کہ سخن فہم معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی نہایت وسیع اطلاع رکھے ورنہ شعر فہمی میں عاجز رہے گا اسی لیے ذی فہموں نے کہا ہے کہ "شعر گوئی سے شعر فہمی مشکل ہے" یہ قول اگر تمام تر صحیح نہ بھی مانا جائے اس پر بھی کوئی شک نہیں ہے کہ شعر فہمی ایک دشوار امر ہے کس واسطے کہ اس کے واسطے بڑے مذاق صحیح کی ضرورت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شعر فہمی کا مذاق صحیح کسی کو نہیں حاصل ہو سکتا ہے جب تک کہ معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی دانست اور ان کے تقاضوں سے آگہی بدرجۂ اتم حاصل نہ ہو جب تک انسان بحد امکان اس کی واقفیت پیدا نہ کرے زنہار دعویٰ سخن فہمی نہ کرے کیا تعجب کی بات ہے کہ بعض اشخاص جو عالم مادی اور عالم ذہنی کا فرق تک نہیں سمجھتے ہیں شعرا کی نسبت رائے زنی کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں اور بے محابا جو کچھ منہ میں آجاتا ہے فرما جاتے ہیں ایسے حضرات سے جب چاہیے سن لیجیے کہ فلاں شاعر نے

خوب غزلیں لکھی ہیں فلاں شاعر نے خوب قصیدے لکھے ہیں۔ فلاں شاعر نے خوب مثنویاں کہی ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ان حضرات کو نہیں معلوم کہ غزل کو کس مضامین سے تعلق ہے اور قصیدے اور مثنویوں کے لیے کن اقسام کے مضامین درکار ہیں۔ یعنی انھیں اس کی کوئی خبر نہیں کہ غزل و قصیدہ و مثنوی کے لیے معاملات خارجیہ یا امور ذہنیہ کے متعلق مضامین درکار ہیں یا دونوں کے مضامین کی آمیزش کی حاجت ہے پس جب کسی شخص کو ان باتوں کی تمیز نہ ہوگی تو وہ فطرتی اور غیر فطرتی شاعری کے پہلو کیا سمجھے گا۔ پھر ایسے شخص سے سخن فہمی اور شاعروں کی قدر دانی کی کیا امید کی جا سکتی ہے سخن فہم کو فطرت اللہ سے وفور اطلاع کی بڑی حاجت ہے ایسے شخص کی اطلاع کو بہت وسیع ہونا چاہیے ضرور ہے کہ ایسا شخص معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ سے پوری واقفیت رکھے اور واقفیت اس کی محصلانہ طور کی ہو محصلانہ سے مراد حکیمانہ ہے یعنی یہ نہیں کہ عدم ترتیب کے ساتھ ہزاروں امور سے واقفیت رکھتا ہو مگر اس بے ترتیبی کے سبب سے اپنی واقفیت سے کوئی کام نہ لے سکے۔ مرد محصل کے خیالات سلسلہ وار اور منتظم ہوتے ہیں اور فطرت اللہ کے سمجھنے کے لیے اس ترتیب و انتظام کی بڑی ضرورت ہے۔ المختصر شعر فہمی حکیم کا کام ہے اور شعرا کی نسبت رائے زنی آسان امر نہیں ہے۔ پس مناسب نہیں ہے کہ غیر محصل اشخاص رائے زنی کی تکلیف کو اپنے اوپر گوارا کریں۔

جیسا کہ سابق میں عرض ہوا کہ سخن فہم کو فطرت اللہ سے محصلانہ اطلاع درکار ہے اس عدم اطلاع سے حضرات ناواقف عجیب عجیب طرح کے مغالطے میں پڑتے ہیں بعض اشخاص معاملات فطرت سے ناواقف رہنے کے باعث مجرد شوکت

لفظی کو شاعری سمجھنے لگتے ہیں اور اسی غلط خیالی میں ہمیشہ مبتلا رہ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجرد شوکت لفظی کوئی شے نہیں ہے شاعری زنہار شوکت لفظی نہیں۔

معاملات قطرت سے اطلاع کی ضرورت شاعری کا مدار خوش خیالی پر ہے نہ شوکت لفظی پر شاعری کی جان خوش خیالی ہے شوکت لفظی شاعری کا کوئی جزو بدن نہیں ہے البتہ شوکت لفظی خلعت فاخرہ کا حکم رکھتی ہے اور تب ہی خوشنما معلوم ہوتی ہے کہ قطع بُرید سے درست ہو اور جس مضمون کو پہنائیں وُہ جامہ زیب بھی ہو ورنہ شعر سعدی صادق آئے گا ؎

گر بود بر عروس نازیبا
بد نماید وبیقی و دیبا

اس میں شک نہیں کہ اگر موقع کی شوکت لفظی ہوتی ہے تو اس سے شاعری میں ایک دبدبہ پیدا ہوتا ہے لیکن اگر شوکت لفظی بد فرہنگی کے ساتھ ہے یعنی فطرت اللہ کی تبعیت کے ساتھ نہیں ہے تو ایسی شوکت لفظی شخص محصّل کی آنکھ میں بد نما معلوم ہوگی گو اُس سے غیر محصّل اور ناقص التعلیم کو چکا چوند لگ جائے۔ اکثر شوکت لفظی اس قسم کی ہوتی ہے کہ حکیم اُس سے نافر اور جاہل اُس کی طرف راغب ہوتا ہے کمتر شوکت لفظی ایسی دیکھی جاتی ہے۔ کہ تبعیت فطرت کے ساتھ اُس سے کسی مضمون عالی کی پیدائش ظہور میں آئی ہو۔ جاننا چاہیے کہ مسائل محققہ اور امور فطرتی کبھی محتاج شوکت لفظی کے نہیں ہیں وہی شعرا اس سے کام لیتے ہیں جو اپنے غیر فطرتی اقوال کو پُر از شان و شکوہ دکھایا چاہتے ہیں۔ فطرت کا تقاضا سادگی ہے اور جب کلام تبعیت فطرت کے ساتھ ہوگا ضرور اُس میں سادگی ہوگی ؎

تکلف سے بری ہے حُسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

وللمؤلفہ

حُسن کے واسطے درکار نہیں آرائش
ماہرویانِ حسین کے لیے گہنا ہے گہن

شوکت لفظی کے مارے عوام ہی نہیں ہیں بعض خواص بھی اس کے مبتلا نظر آتے ہیں ایسے مصنفین بہت ہیں جنھوں نے شوکت لفظی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے آئندہ اس کی تصریح مثالوں کے ساتھ آتی ہے اہلِ انصاف سے راقم کو تمام تر امید ہے کہ محض منصفانہ نگاہ سے فقیر کے بیانات کو ملاحظہ فرمائیں گے اور بے لوثیٔ تحریر کی داد دیں گے۔

المختصر جاننا چاہیے کہ بے موقع کی شوکت لفظی نہایت نامطبوع امر ہے اور اس لیے قابلِ حذر ہے جب بے موقع اس کا استعمال ہوگا تو کبھی تقاضائے فطرت کے مطابق نہیں ہوگا اور جب تبعیت فطرت کی باقی نہیں رہی تو حکیمانہ دماغ کو ایسے پُرشکوہ غیر فطرتی کلام سے حظ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ شوکت لفظی کی مثال مصوری کے پیرائے میں یہ ہے کہ اگر کسی مصور کو کہا جائے کہ تم ایک عربی گھوڑے کی تصویر کھینچ لاؤ۔ اگر مصور صاحب مذاق صحیح ہے یعنی مردِ محصّل ہے تو اپنی اطلاع کے مطابق جیسا کہ عربی گھوڑا ہوتا ہے ویسے ہی اس کی تصویر کھینچ لائے گا لیکن اگر بد مذاق ہے یا جان بوجھ کر فطرت اللہ سے عداوت رکھتا ہے تو ترقی شان و شوکت

کی نظر سے تصویر کشی میں جس قدر فطرت اللہ سے انحراف ممکن ہے ۔ انحراف کریگا۔
مثلاً گھوڑے کے بدن کو دھانی رنگ دے گا۔ سُم لعل کے کان یاقوت کے
آنکھیں نیلم کی مُنہ فیروزے کا پیشانی پکھراج کی دُم منقش کی بنا دے گا بلکہ اس پر بھی
قناعت نہیں کر کے دو پر بھی جواہر نگار لگا دے گا۔ گھوڑے کی ایسی تصویر عالم
فطرت کو جیسی مکروہ معلوم ہوگی محتاج بیان نہیں ہے مگر غیر محصّل شخص تو ایسے بوقلمونی
الوان و مرصع کاری کو دیکھ کر جان و مال سے محو سہو ہو جائے گا یہی حال ناتعلیم یافتہ آدمی
کے ہر قسم کے مذاق کا ہے شخص غیر محصّل لباس وہی اختیار کرتا ہے جو زرنگار رنگ اور
زر آلود ہو۔ گھوڑے، ہاتھی، لڑکے، بالے، نوکر چاکر سب کی آراستگی اُسی نامطبوع
ترکیب سے پسند کرتا ہے مکان اُسی مذاق کے ساتھ تعمیر کرتا ہے مختصر یہ ہے کہ جو
کچھ کرتا ہے جاہلانہ شان و شکوہ کے ساتھ کرتا ہے خیر راقم نے جو مصوری کے پیرایے
میں مثال بالاعرض کی اُس میں چنداں مبالغہ کو دخل نہیں ہے ۔ غیر محصّل اشخاص کا
مذاق ایسا ہی ناپسندیدہ انداز کا ہوتا ہے۔ جس کی واقعی مثال اُس تصویر میں ملے گی۔
جس کا بیان مصوری کی بحث میں آیا ہے یعنی جہاں راقم نے ٹیپو سلطان کے باغ کی
اُس تصویر دیواری کا ذکر کیا ہے جس میں ہاتھی گلابی اور گھوڑے سبز زرد آسمانی ۔
دھانی رنگے ہوئے آج تک موجود ہیں بہر کیف یہ مثال تو مصوری کے پیرایے میں تھی
اگر شعرائے ایشیا کے کلاموں میں ایسی مثالیں ڈھونڈھیے تو بے شمار ملتی ہیں واقعی
شعرائے ایشیائی نے ملوک و اُمرا کو عجب تماشے کا گھوڑا بنا رکھا ہے ۔ اگر
گھوڑے کو بلند دکھایا ہے تو اُس کی بلندی کو آسمان سے بھی زیادہ رفیع دکھلایا
ہے چنانچہ ظہیر فاریابی نے اپنے ممدوح کے گھوڑے کو اس قدر بلند دکھلایا ہے

کہ عرش اللہ تعالیٰ بھی اُس سے کچھ نیچا ہی نظر آتا ہے فرماتے ہیں ؎

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا

تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

اس شعر کی سپتی کی محتاج بیان نہیں ہے مگر سعدی کہ شاعری کا مذاق صحیح رکھتے تھے نہایت تبعیت فطرت کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان

نہی زیر پائے قزل ارسلان

رعایت لفظی شوکت لفظی کے علاوہ عوام رعایت لفظی کو بھی جان شاعری قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ رعایت لفظی بجائے خود کوئی شے نہیں ہے اور شاعری سے اس کو کوئی تعلق ضروری نہیں ہے اگر بے تکلف کسی شعر میں رعایت لفظی کی صورت پیدا ہو جائے تو ایسی رعایت لفظی خالی از لطف متصور نہیں ہے مگر بہ تکلف رعایت لفظی کا التزام صرف ناپسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ سچی شاعری کے بہت منافی ہے بعض شعرا کو رعایت لفظی کا مرض ہوتا ہے اور غیر محصّل اشخاص اُن کے کلام کو مجرد رعایت لفظی کے خیال سے پسند کرتے ہیں رعایت لفظی تب ہی لطف دیتی ہے کہ خود بخود الفاظ میں معنوی تعلق موجود ہو ایسی صورت میں رعایت لفظی انتخاب الفاظ مناسب و مربوط کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔

مبالغہ پردازی - منجملہ بدمذاقیوں کے غیر فطرتی مبالغہ پردازی بھی ایک نہایت ناپسندیدہ امر ہے اس کے مرتکب ایشیائی شعرا بہت دیکھے جاتے ہیں۔ ان شعرا کی اس بدمذاقی کا سبب بیشتر بادشاہان اور اُمرا ہوتے گئے ہیں۔ تقرب

سلطانی نے اکثر عالی دماغ اور عالی خیال شعرا کو بھی برباد کر ڈالا ہے۔ عوام مبالغہ پردازی کو عین شاعری سمجھتے ہیں حالانکہ فطرتی شاعری میں مبالغہ پردازی کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

صنائع بدائع۔ سوا ان لغویات کے غیر محصّل اشخاص بہت سے صنائع بدائع کو ضروریات شاعری سے شمار کرتے ہیں۔ لیکن اہلِ مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ایسے ایسے ڈہکوسلوں کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہے انشاءاللہ تعالیٰ ان امور کی تصریح مثالوں کے ساتھ آیندہ حوالۂ قلم ہوگی۔

پست خیالی۔ اس مقام پر ایک اور بھی بدمذاقی کا اعادہ ضرور معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ شعرا کبھی کبھی پست خیالی کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں شاعری کے لیے پست خیالی سخت عیب ہے بعض اساتذہ سے کبھی ایسی بدمذاقی سرزد ہو گئی ہے اور انھیں اساتذہ کو دیکھ کر اس وقت کے بعض زندہ شعر گو بھی اس عیب کو اختیار کرتے گئے ہیں زندہ شعر گویوں کے ایسے کلاموں کو تو مثالاً ہم اس غرض سے عرض نہیں کر سکتے کہ ان کے ایسے کلاموں کا اعادہ ان کی دل شکنی کا سبب ہوگا۔ مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ بعض زندہ شعر گو ایسے ہیں کہ فطرت کے رو سے پست خیال ہیں اور ان کی طبیعت ہمیشہ پستی کی طرف میلان رکھتی ہے۔ راقم ایسے حضرات کو شاعر کے معزز خطاب کے قابل نہیں سمجھ کر اور ان کو شاعر سے فرق کرنے کی نظر سے شعر گو کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ ایسے حضرات بلا تامل زنانِ بازاری کے مناقب لکھنے کے لیے تُلے رہتے ہیں اور خاص کر غزل سرائی میں انھیں فواحش کو معشوق قرار دیتے ہیں اور کلام کی ترکیب ایسی بُری

رکھتے ہیں کہ جس سے معشوق بازاری کے سوا معشوق حقیقی مراد لیا جا ہی نہ سکے۔ اسی طرح جوش جوانی وغیرہ کا بیان اس بدمذاقی کے ساتھ کرتے ہیں کہ جس سے دلی تنفر پیدا ہوتا ہے اور سوا اولیائے مادرزاد کے اکثر بشر کے دل میں کچھ نہ کچھ ناپاک خیال پیدا ہوتے ہیں اور تقاضائے بشریت سے ناجائز امور کی طرف طبیعت کو میلان بھی ہوتا ہے مگر جوانی کے ایسے معاملات زنہار اس قابل نہیں ہیں کہ شاعران کو بڑے ذوق و رغبت کے ساتھ شعروں میں باندھے اور وہ شعر زانو پر ہاتھ مار مار کر پڑھے جائیں کیوں نہ ہو جیسے کہنے والے خوبصورت ویسے پڑھنے والے خوبصورت انھیں شعر گویوں کے کلاموں میں سراپا وغیرہ کے متعلق بھی ایسے مضامین دیکھے جاتے ہیں کہ جن سے طبیعت کو کراہت پیدا ہوتی ہے بہرحال زندہ شعر گویوں کے بدمذاق اشعار کے اعادے کے عوض راقم مثالاً صرف دو معروف شعر دو بڑے شاعروں کے ذیل میں عرض کرتا ہے ؎

نہ انگیا نہ کرتی ہے جانی تمھاری
نہیں پاس کوئی نشانی تمھاری

یہ مطلع نواب سید محمد خان رند کا ہے۔ رند عموماً نفیس گو شاعر ہے اتنے بڑے شاعر کو ایسا شعر کہنا زیبا نہ تھا۔ اس شعر کا مذاق بہت پست ہے ؎

چناں بُرد و آورد و آورد و بُرد
کہ وایہ زحسرت پسِ پردہ مُرد

فردوسی سے ایسی بدمذاقی کا سرزد ہونا محض امر اتفاقی ہے مگر راقم کو تعجب ہے اُن حضرات سے کہ جو اس شعر کو غایت بدمذاقی کی وجہ سے بڑی واہ واہ کے

ساتھ پڑھتے ہیں۔ اہل مذاق صحیح سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ شعر باوجود اس کے کہ اس کی زبان نہایت عمدہ ہے اور مضمون نیچرل طور پر بندھا بھی ہے مگر زنہار اس قابل نہیں ہے کہ شاہنامہ ایسی باوقعت کتاب میں جگہ پا سکتا۔

مکروہ مضامین ۔ مکروہ مضامین سے حتی الامکان اجتناب واجبات سے ہے مجرد نیچرل ہونے سے کوئی مضمون شاعر کے اختیار کرنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ ہزاروں مضمون ایسے ہیں کہ جو نیچرل یعنی فطرتی ہیں مگر اس سے ضرور نہیں کہ شاعر یا ناولسٹ اُن کو حوالۂ قلم کرڈالے پستی خیالات سے احتراز پہلا کام شاعر اور ناولسٹ کا ہے اردو کے ایک انوٹھے ناولسٹ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جو مضمون نیچرل ہے عام اس سے کہ کیسا ہی مکروہ و بد قرینہ ہو اس کو اختیار کر لینا ناولسٹ کا کام ہے چنانچہ وہ ناولسٹ نہایت بدمذاقی کے ساتھ ایک عورت کی قضائے حاجت کے مضامین کو محض نیچرل امر سمجھ کر حوالۂ قلم کرتا ہے اس بدمذاق نے یہ نہ سمجھا کہ آداب تحریر کیا ہیں اور عورت کی مستوریت کے کیا کیا تقاضے ہیں۔ بلاشبہ جو مصنف بامذاق ہوگا عورت تو درکنار مرد کی اس طرح کی ضروریات کا ذکر زبان قلم پر نہیں لائے گا۔ افسوس ہے کہ راقم کو ایسے ایسے مکروہ مضامین کی طرف اس رسالے میں رجوع لانا پڑا مگر چونکہ اس سے اصلاح بدمذاقی منظور تھی ناچار ایسے تنفر خیز امروں کو حوالۂ قلم کرنا گوارا کیا۔

بدمذاقی جدید سابق میں جو بدمذاقیاں حوالۂ قلم ہوئیں بیشتر اُن میں اوپر سے چلی آئی ہیں اور امراض قدیمہ سے شمار کی جا سکتی ہیں مگر اس زمانے میں ایک نئی بیماری پیدا ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اکثر ادھورے انگریزی خوانوں کے دماغ

میں اس خیال فاسد نے جگہ کرلی ہے کہ ساری خوبیاں یورپ پر ختم ہوگئی ہیں۔ ایشیا کو خوبی کا کوئی حصہ ملا ہی نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں یورپ نے مادیات میں بڑی ترقی کی ہے یہاں تک کہ اکابر علمائے یورپ خدا سے بھی مستغنی نظر آتے ہیں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے علوم مادیات کا یہی تقاضا ہے کہ انسان تدہر اختیار کرے چنانچہ یہ امر محقق ہے کہ انسان جس قدر مادیات میں ترقی کرتا جاتا ہے روحانیات سے دور پڑتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ آخرکار خدا اور تمام روحانیات سے منکر ہو بیٹھتا ہے خیر جو کچھ یورپ تدہر کی حالت میں مبتلا ہو رہا ہے اس کی مادی ترقیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے مگر اس سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی ہے کہ اگر یورپ ساری خوبیوں سے معمور ہے تو ایشیا تمام خوبیوں سے محروم ہے قصور معاف اکثر ہمارے نئی روشنی والے حضرات کا تو ایسا ہی خیال معلوم ہوتا ہے وہ ایشیائی خیالات اوضاع و معاملات کو یک قلم قابل نفرت سمجھتے ہیں یورپ کے ہر امر پر عام اس سے کہ معقول ہو یا غیر معقول جان دے دیتے ہیں اور اپنے اقوال و افعال سے عجیب طرح کی نادیدگی ظاہر کرتے ہیں جا و بے جا ہر قدم پر اہل یورپ کے تتبع پر مستعد رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے خذ ما صفا و دع ما کدر کا مضمون ان کے گوش مبارک تک کبھی پہنچا ہی نہیں ان حضرات کی دلدادگیاں معاملات یورپ کی نسبت اس درجے کو پہنچ گئی ہیں کہ ایشیائی شاعری بھی ان کی نظر میں ذلیل و محقر معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ خود اہل یورپ اس کے مقر ہیں کہ ابھی تک انھیں ایشیائی خیالات شاعرانہ سے آشنائی پیدا نہیں ہوئی ہے اور بہت کچھ ان کو معلوم کرنا ہے۔ چنانچہ اس وقت تک جو کچھ

ان کو ایشیائی شاعری سے اطلاع کی شکل پیدا ہوئی ہے وہ پایۂ اعتبار نہیں رکھتی ہے اس پر بھی جس قدر وہ مطلع ہو چکے ہیں اُس حساب سے ایشیائی شاعری کی وقعت ان کے دلوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ حضرات ناظرین راقم کی اس تحریر سے یہ نہ سمجھیں کہ ایشیائی شاعری تمام معائب سے پاک ہے اس پر بھی قابل نفرت نہیں ہے مگر نئی روشنی والے حضرات نے اس کو تسلیم کر لیا ہے کہ جو معائب ہیں ایشیائی شاعری میں ہیں اور یوروپین شاعری تمام معائب سے مبرا ہے میں آئندہ انشاءاللہ تعالیٰ یورپین شاعری کے معائب بھی دکھلاؤں گا جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یوروپین شاعری ایسی نہیں ہے کہ آنکھ بند کر کے شعرائے یورپ کا تتبع کیا جائے اس میں شک نہیں کہ فارسی اور اُردو کی شاعریاں معائب رکھتی ہیں مگر ان معائب سے ایشیائی شاعریاں ایسی ذلیل نہیں ہیں کہ کسی حکیم یا مرد محصّل کے قابل توجہ نہ ہوں راقم جب ان نئی روشنی والوں کو یورپ کی شاعری کا ذکر کرتے سنتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں یوروپین شاعری تمام معائب سے پاک متصور ہے اور ایشیائی شاعری اس کے برخلاف سراسر عیب ہے۔ بدانست راقم اس تنگ چشمی کا سبب نادیدگی ہے یا یہ کہ یوروپین شاعری بسبب ایک امر جدید ہونے کے پُرلذت معلوم ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ یوروپین شاعری کی آگاہی سے ہم ایشیائیوں کی شاعری کو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ نئے نئے مضمون دستیاب ہو سکتے ہیں مگر یہ فائدہ یوروپین شاعری کو بھی ہماری ایشیائی شاعری سے پہنچ سکتا ہے۔ اس واسطے کہ بہت سی نازک خیالیاں ایشیائی شاعری میں ایسی ہیں جن سے شعرائے یورپ کے دماغ کو ابھی آشنائی پیدا نہیں ہوئی ہے اس

امر سے اعتراف خود اہل یورپ اور اہل امریکہ کو ہے بہر حال اہل یورپ کو ایشیائی
خیالات سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے ضرور ہے کہ یا پوری طرح اردو فارسی عربی
سیکھیں یا ان زبانوں کے شعرا کی تصانیف کو نہایت صحت کے ساتھ ترجمہ کر ڈالیں۔
اسی طرح ہم لوگوں کو ترقی فن شاعری کے لیے دو امر درکار ہیں ایک یہ کہ جو معائب
ایشیائی شاعری کے ہیں ان سے متنبہ ہو کر ان کے ازالے کی فکر کریں۔ دوم یہ کہ جو جو
خوبیاں یوروپین شاعری میں ہیں اُن کو حسب ضرورت اپنی شاعری میں داخل کرنے کی
صورتیں نکالیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ ان دونوں امروں کا بیان اپنے محل پر آئے گا
لیکن یہاں ایک بات یوروپین شاعری کی خوبی کی نسبت عرض کر دینا مناسب ہے۔
یہ ایسی بات ہے کہ جس سے ہمارے ایشیائی شعرا محروم معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی
شعرائے یورپ اپنی تصانیف میں ہزاروں امور کو جو تعلق جغرافیہ اور تاریخ کے ہیں
داخل کرتے ہیں برخلاف اس کے ایشیائی شاعر ان امور سے خاص کر امور جغرافیہ سے
نہایت نابلد معلوم ہوتے ہیں۔ چند معمولی شہر و دریا و کوہ کا ذکر بھی جو کرتے ہیں تو آگاہیٔ علم
جغرافیہ سے اُن کے ذکر کو تعلق نہیں معلوم ہوتا ہے۔ بلا شبہ جب ہمارے ملک کے
طبیعت داروں کو اہل یورپ کا یہ مذاق صحیح معلوم ہو جائے گا تو حسب مراد تاریخ و
جغرافیہ کی اطلاع کی صورت پیدا کریں گے اور اس ذریعے سے بہت سے نئے نئے
مضامین ایشیائی شاعری میں داخل ہو جائیں گے۔

شاعری ایک امر طبعی ہے

واضح ہو کہ شاعری ایک امر طبعی ہے اور جزو فطرت ہونے کے باعث کسی حال میں انسان سے منفک
نہیں ہو سکتی۔ جیسے کہ تاریخی وسائل سے انسان کے حالات کا پتا لگتا ہے۔ ہر

ملک ہر قوم اور ہر زمانے میں شاعری نثر یا نظم کے پیرائے میں جلوہ گر رہی ہے۔ وحشی سے وحشی قوم پر لحاظ کیجیے تو کچھ نہ کچھ شاعری اُس قوم میں پائی جائے گی گو اُس قوم کی شاعری ہومیروس، ورجل، فردوسی، ملٹن، بالمیکی، میرانیس کے درجے کی شائستگی اور بلند خیالی کے اعتبار سے نہ سہی کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ جس میں کچھ نہ کچھ گیت نہ گائے جاتے ہوں۔ یہی گیت قومی شاعری سے خبر دیتے ہیں اگر انھیں وحشی اقوام کو تعلیم یا فتگی نصیب ہو تو ان کے شعرا میں بھی ہومیروس وغیرہ کی عالی خیالی پیدا ہو سکتی ہے مختصر یہ ہے کہ چونکہ شاعری داخل فطرت انسانی ہے۔ جہاں انسان کا وجود پایا جاتا ہے وہاں شاعری بھی موجود رہتی ہے گو وہ شاعری کسی درجۂ ابتذال کی ہو اس سے شاعری کا ایک امر فطرتی ہونا ثابت ہوتا ہے اگر شاعری کے ذہنی تعلق پر غور کیجیے تو شاعری سے ایک قلبی کیفیت درک ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری تب انسان سے منفک ہو سکتی ہے جبکہ خود قلب معدوم و مفقود ہو جائے البتہ مختلف انسانوں کو مختلف درجے کی صلاحیت قلبی بخشی گئی ہے اور گو بہت سے انسان بظاہر شاعری سے بے لگاؤ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہے کہ قلب انسان کو دیا گیا ہو اور قلب واردات قلبیہ سے خالی ہو۔ جاننا چاہیے کہ یہی واردات قلبیہ شاعری کے تخم ہیں عام اس سے کہ اُن سے شاعری کا درخت اُگے یا نہ اُگے فقیر کی دانست میں ہر صاحب واردات قلبیہ کچھ نہ کچھ شاعر ہے گو اُس نے کبھی ایک مصرع بھی نہ کہا ہو ایسا شخص اپنے لیے تو ضرور شاعر ہے گو اپنی شاعری کا اثر دوسرے تک بسبب موانع کے نہیں پہنچا سکتا ہے۔ فقیر شاعر نہیں ہے مگر اپنے واردات قلبیہ پر جو لحاظ کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ واردات قلبیہ ایک ایسا عالم رکھتی ہیں جس کی گرد کو بھی عالم مادی نہیں پہنچ سکتا ہے درحقیقت واردات قلبیہ کا ایک ایسا عالم معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالموں سے مستغنی ہے اور اگر اُس عالم میں ترقیاں پیدا ہوں تو قلب پورا عالم اکبر کا عالم دکھلا سکتا ہے یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قلب سے مراد وہ صنوبری شکل مضغۂ گوشت نہیں ہے جو انسان کے سینے کے اندر جانب چپ میں واقع ہے قلب سے مراد وہ لطیفہ ربانیہ ہے کہ جس کو خدا نے اپنی جلوہ گاہ بنایا ہے اور جس سے متعلق روحانیات کو کر دیا ہے پس جاننا چاہیے کہ شاعری اسی لطیفہ ربانیہ کا جوش ہے عام اس سے کہ اُس کا اظہار نطق یا قلم سے ہو یا واردات قلبیہ کی طرح دل ہی دل میں رہ جائے جب شاعری کو اتنا بڑا تعلق قلب کے ساتھ ہے تو شاعری کے فطرتی ہونے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

اغراض شاعری جب شاعری ایک امر فطرتی ہے تو اس سے اغراض انسانی کا کم و بیش طور پر تعلق رکھنا بھی خالی از فطرت نہیں ہے۔ چنانچہ عند التفحص یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شاعری اگلے زمانوں میں اپنا جلوہ دکھلاتی رہی ہے اور آج بھی اُس کی وہی رونق باقی ہے اور تا بقائے نوع انسان اُس کی رونق سابق کی طرح رہے گی قدیم اہل مصر و اہل یونان و اہل روم و اہل ہند اور بھی بعثت آنحضرت صلعم سے پہلے کے اہل عرب کے درمیان میں شاعری ایک قوی آلۂ تمدن و مذہب سمجھی جاتی تھی بعد بعثت کے بھی اس کا زور شور قائم رہا گو انداز شاعری میں بہت فرق آتا گیا اور اُس کے اغراض کے پہلو بدلتے گئے۔ کتب تواریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی بادشاہوں نے شاعری کو بہت عزیز رکھا ہے۔ گو

اُن کی توجہ سے نفس شاعری کو ضرر بھی بہت پہنچتا گیا ہے۔

شاعری صرف شاہان اسلام میں ممتاز صورت نہیں رہی ہے بلکہ عیسائی شاہان یورپ بھی اس کے قدردان رہے ہیں۔ یورپ اور ایشیا دونوں برّاعظم میں اس کی یکساں توقیر رہا کی ہے اور جو اس کی قوت سابق میں تھی آج تک باقی ہے

لمؤلفہ

جیسا تھا حُسن یار باقی ہے　　وہی اگلی بہار باقی ہے

شاعری کا زور جیسا تھا اب بھی ہے

فرق اسی قدر ہے کہ اب شاعری کے عنوان بدل گئے ہیں ورنہ نفس شاعری اپنے حال پر ہے اور اُس سے برنگ سابق تمدنی اخلاقی اور مذہبی کام لیے جارہے ہیں۔ رہا یہ خیال کہ آدمی پوچھ سکتا ہے کہ اس انیسویں صدی میں تو نہ یورپ نہ ایشیا میں شاعری کو کسی قسم کا فروغ نظر آتا ہے پھر شاعری کی سابق قوت سے اعتراف کیونکر کیا جا سکتا ہے ظاہرا شخص ناواقف کا اعتراض بہت بجا معلوم ہوتا ہے واقعی اس وقت میں کہاں ہومیروس، ورجل، شیکسپیر، ملٹن، گوئٹے، فردوسی، سعدی، حافظ، کالیداس بالمکی وغیرہ کے مماثل لوگ ہیں جن سے شاعری کے فروغ کی صورت قیاس کی جا سکتی ہے۔ اس عہد میں ظاہرا شاعری کی رونق تو کہیں بھی دیکھی نہیں جاتی ہے۔ مگر جب نفس شاعری کے فروغ و غیر فروغ پر لحاظ کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعری انسان کے داخل فطرت ہونے کے باعث اُسی قدر فروغ پر ہے۔ جس قدر سابق امم کے وقت میں تھی البتہ شاعری نے لباس بدل دیا ہے ورنہ شاعری معزول نہیں ہوگئی ہے۔ انسان کا جو کام شاعری پہلے کرتی تھی اس صدی میں بھی کرتی ہے

اور زمانہ آئیندہ میں بھی کرتی رہے گی گو اُس کے پیرائے انقلاب پذیر ہوتے چلے جائیں

سہ
بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

اس عہد میں البتہ ممتاز اقوام دنیا بلباس نظم شاعری سے کم کام لیتے ہیں مگر شاعری کو اتنے رنگوں سے برتتے ہیں کہ امم سابقہ نے نہیں برتا ہے شاعری فی زمانتا مختلف پیرایۂ زبان و قلم میں برتی جاتی ہے اور مختلف فنون کے لباسوں میں در آکر اپنی قوت دکھلاتی ہے مختلف پیرایۂ زبان و قلم کی مثال یہ ہے کہ عہد جدید کے فصحا و بلغا کی اسپیچیں عام اس سے کہ تمدنی یا اخلاقی یا مذہبی عنوان رکھتی ہوں وہ کام کرتی ہیں کہ جسے قوی ترین شعرائے عہد سابق بھی نہیں کر سکے ہیں۔ برک (Burke) اور شیریڈن (Sheredun) اور ان کے عہد سے آج تک کے فصحا و بلغائے یورپ نے نطق کے وہ تماشے دکھلائے ہیں کہ مجرد جن کے خیال سے عقل دنگ نظر آتی ہے ان فصحا کے نطق نے سلطنتیں قائم کی ہیں اور سلطنتیں معدوم کی ہیں ملکوں کو خونریزی سے بچایا ہے اور ملکوں کو خونریزی میں مبتلا کیا ہے ظلم کی بنیادیں ڈالی ہیں اور ظلم کی بنیادیں کھود دی ہیں بادشاہوں کو تخت سے اُٹھایا ہے اور تخت پر بٹھایا ہے مختصر یہ ہے کہ قوموں کو جس راہ پر چلایا ہے قومیں وہ راہ چلی ہیں کیا ان فصحا بلغا کے نطق لطافت شاعری سے خالی تھے۔ درحقیقت ان کے نطق عین شاعری تھے جو اُن سے ایسے ایسے حیرت خیز اثر قوموں پر پیدا ہوتے گئے ہیں اسی طرح نطق کے ذریعے سے فرقۂ اہل قانون عجیب و غریب تماشے دکھلاتا ہے واقعی اس عہد کے بیرسٹران نامی اک رنگ کے شعرا ہیں اُن کے کمال نطق کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سامعین

عالم حیرت طاری ہوتا ہے بہت بار ایسا ہُوا ہے کہ سامعین کو اشکباری کی نوبت پہنچی ہے اور بہت بار ہنسی کا روکنا دشوار ہو گیا ہے غرض یہ ہے کہ جادوئے نطق سے ہنسانا رلانا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کبھی ایسا بھی ہُوا ہے کہ کوئی بے گناہ شخص ماخوذ جرم ہو کر عدالت کے سامنے لایا گیا ہے اس کو اپنی بے گناہی کا پورا یقین ہے مگر جب اُس کے خلاف میں بیرسٹر نے بحث شروع کی اور اس کی مجرمیت کو دکھلانا شروع کیا تو بے چارہ ماخوذ باوجود بے جُرم ہونے کے اپنے مخالف کی اسپیچ کے اثر سے اپنے کو مجرم سمجھنے لگا ہے چنانچہ وارن ہیسٹنگس (Warren-W Hastings) لکھتے ہیں کہ جس وقت میرے خلاف میں اسپیچیں بحضور ممبران پارلیمنٹ ہونے لگیں تو ہر چند میں بے گناہ تھا مگر مخالف کے زورِ نطق کا یہ اثر ہمارے دل پر پیدا ہُوا کہ ہم اپنے کو مجرم سمجھنے لگے ایسی ایسی پُرتاثیر اسپیچیں اگر شاعری نہیں ہیں تو کیا ہیں علاوہ فرقۂ اہلِ قانون کے موعظین و مقررین جو طرح طرح کی تاثیریں سامعین کے دلوں پر پیدا کیا کرتے ہیں۔ شاعری کی داد اگر نہیں دیتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ لسانی شاعریوں کے سوا مورخین و ناولسٹ جو کام کرتے ہیں وہ عین شاعری نہیں ہے تو کیا ہے مورخین تاریخ کے پردے میں شاعری کے عجیب عجیب جلوے دکھلاتے ہیں اور ناولسٹ نے تو درحقیقت نظم کی راہ شاعری کو چھوڑ کر نثر کی راہ شاعری کو اختیار کیا ہے اور اپنی طباعی اور خلاقیٔ سخن کے رو سے اُن کی شاعرانہ نثر منظوم شاعری سے کسی بات میں کم نہیں معلوم ہوتی ہے اسی طرح اور بھی طرح طرح کی شاعرانہ نثر کی تحریریں نثاران یورپ نے حوالۂ قلم کی ہیں۔ جن کو منظوم شاعری کے ہم پہلو قیاس کرنا نہایت حق پسندی ہے مثلاً اڈیسن، میکالے، و کارلائل وغیرہ کی نثر اعلیٰ درجہ

کی شاعری کے سوا اور کیا سمجھی جا سکتی ہیں علاوہ تقریری اور تحریری شاعری کے فنون
کے وسائل سے شاعری سے کام لیے جا رہے ہیں مثلاً اس عہد میں مصوری، بت
تراشی، بت سازی اور موسیقی نے جو شاعری کی صورتیں نکالی ہیں انھیں اعلیٰ درجے کی
شاعری نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ بالمختصر یہ عامیانہ خیال کہ اس عہد میں شاعری
رخصت ہو گئی ہے بالکل غلط ہے البتہ اس کی منظوم شکل میں جو کچھ کمی لاحق ہو گئی
ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس نے اور شکلوں میں جو زور پکڑا ہے۔
اس سے شخص محصّل انکار نہیں کر سکتا یہ درحقیقت بڑی تنگ بینی ہے کہ انسان
جب شاعری کو تصوّر کرے تو صرف منظوم پیرائے میں تصوّر کرے نفس امر کے لیے پیرایہ
کیا شے ہے ایک ہی شراب سو قسم کے ظروف میں رکھی جا سکتی ہے اس سے
اس کی خمریت میں فرق نہیں آ سکتا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب تک شراب شیشے
کے ظرف میں رہے گی شراب رہے گی اور جب سونے کے ظرف میں منتقل ہو
جائے گی تو شراب نہیں رہے گی۔ شراب ہر حیثیت سے اس وقت تک شراب ہے
جب تک اس کی ماہیت نہ بدل جائے۔

اغراض انسان سے شاعری کا تعلّق

شاعری کو اغراض انسانی سے بڑا تعلّق ہے۔ ہر زمانے میں شاعری انسان کے تمدنی اخلاقی اور مذہبی
معاملات میں تاثیر رسان اور بکار آمد ہوتی رہی ہے تمدنی معاملات پر شاعری کے
کیا کیا اثر پیدا ہوتے رہے ہیں اس کی مثالیں مستند کتب تاریخ یونان و روم و
عرب وغیرہ میں موجود ہیں۔ زمانۂ جدید بھی اس کے اثر سے خالی نہیں ہے یورپ
قدیم اور جدید کی شاعری تو زیادہ تمدنی ہے یا ایسی ہے کہ زیادہ تر تمدن سے تعلق

دکھتی ہے یہی انداز عرب میں بھی بعثت آنحضرت صلعم کے قبل کی شاعری کا معلوم ہوتا ہے کہ تقاضائے ملک کے مطابق تمدنی مذاق سے خالی نہیں ہے اگر نام بنام یورپ قدیم وجدید اور بھی عرب قدیم کے شعرا کے تمدنی حالات لکھے جائیں۔ تو دس جلدیں بھی ان کے بیان کو مکتفی نہیں ہو سکتی ہیں۔

معاملات تمدّن بہرحال اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ انسان کے معاملات تمدّن میں شاعری کو دخل رہا ہے اور انسان کے تمدنی اغراض شاعری سے کم و بیش طور پر ہر عہد میں متعلّق رہے ہیں۔

معاملات اخلاق اخلاقی معاملات انسان سے شاعری کو کیا تعلق ہے اس کے لیے اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ جتنے معاملات اخلاقی ہیں شعرا قلم بند کر چکے ہیں۔ بدالسنت راقم شاعری سے کوئی قوی تر آلہ اخلاق آموزی کا دوسرا نہیں ہے کیا امیرالمومنین علیہ السلام اور سعدی کے اشعار سے کوئی زیادہ پُرتاثیر اخلاق آموزی کا آلہ نشان دیا جا سکتا ہے کیا اخلاق کی معروف کتابیں یہ تاثیری قوت رکھتی ہیں ہرگز نہیں لاریب شاعری بہترین ذریعہ اخلاق آموزی کا ہے بے سچی شاعری کے انسان کے قوائے اخلاقیہ ترقی نہیں کر سکتے شاعری عین فلسفہ اخلاقی ہے راقم اس وقت ایک ایسی جگہ کی روداد کو عرض کیا چاہتا ہے جس سے شاعری کا اعلیٰ درجے پر اخلاق آموز ہونا ثابت ہوتا ہے چالیس پینتالیس برس کا عرصہ گزرا ہوگا کہ کپتان ڈی ال ریچرڈسن صاحب کلکتہ کے کالج سرکاری میں علم ادب یعنی لٹریچر کا درس دیتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس فن خاص میں اس وقت تک کلکتہ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے خود شاعر بھی تھے اور شعرائے یورپ کی تصانیف سے غایت درجے کی اطلاع رکھتے تھے۔

فقیر کے زمانے سے بہت پہلے اُن کا زمانہ گزر رہا ہے لیکن فقیر نے اُن کی ایک حجیم تالیف
کو جس میں اُنھوں نے ازوقت چاسر (Chaucer) تمام شعرائے انگلستان
کے کلاموں کو نہایت خوبصورتی اور مذاق صحیح کے ساتھ منتخب کیا ہے اپنی زندگی کے
مختلف حصّوں میں چند بار معاینہ کیا ہے۔ کپتان ممدوح کے درس یافتہ طلبہ اب بہت
کم رہ گئے ہیں اُن میں سے ایک صاحب نے جو ایک وقت میں فقیر کے پرائیویٹ
ٹیوٹر یعنی نج کے معلم تھے اور اعلیٰ درجے کی مناسبت ادبیہ رکھتے تھے۔ شاعری کی قوت
اخلاق آموزی کے تذکرے میں اُس جلسے کی رُوداد جس کا ابھی اوپر حوالہ ہوا ہے یوں بیان
کی ہے کہ کچھ متعصب عیسائیوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ شیکسپیر کے کلام مخرب
اخلاق ہیں اس واسطے اس کی پڑھائی سرکاری کالجوں سے اُٹھا دینا چاہیے۔ جب
یہ بات کپتان ممدوح کے گوش گزار ہوئی تو کپتان صاحب نے فرمایا کہ میری دانست
میں اگر ایک پلے (Play) شیکسپیر کا طلبہ کو اچھی طرح پڑھایا جائے اور اچھی
طرح اُنھیں ذہن نشین ہو جائے تو ہزار واعظین کے مواعظ سے زیادہ اخلاق آموز
ہے۔ خیر دو چار روز کے اندر ایک جلسہ انعقاد پایا اور بڑے بڑے حکام اور اہل علم
اعتراض بالا کے حق و ناحق تجویز کرنے کے لیے کالج میں جمع ہوئے کپتان صاحب نے
فرمایا کہ ہم اس کتاب کی نیک آموزی اور بد آموزی میں کوئی بحث نہیں کریں گے مگر
ہم آپ حضرات کے سامنے ایک جماعت طلبہ کو اس کتاب کے دو ایک ورق
پڑھائیں گے۔ میرے درس کے بعد آپ حضرات جو رائے قائم فرمائیں گے ہم
اس کی تبعیت کریں گے چنانچہ باجازت صدر انجمن جو اس وقت کے صدر دیوانی
عدالت کے چیف جسٹس تھے اور بڑے ذی علم اور محقق شخص تھے کپتان صاحب نے

درس دینا شروع کیا۔ ایک صفحے کا نصف بھی نہیں پڑھایا تھا کہ چیف صاحب مع
دیگر ممبران انجمن جیبوں سے رومال نکال کر آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگے اور جب
ضبط رقت نہ کر سکے تو میز پر سر ڈال کر بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔
اس بدافاتگی کو دیکھ کر کپتان صاحب طلبہ سے فرمانے لگے کہ اب ہم درس موقوف کرتے
ہیں عدالت عالیہ کے صدر اور ممبران جلسہ کی حالت قابل توجہ ہو رہی ہے ظاہر ہے
کہ ایسی شورش کے بعد چیف جسٹس صاحب اور دیگر حضرات کو شیکسپیر کی پُر تاثیر اخلاق
آموزی میں کیا گفتگو کی جگہ باقی رہی تھی سب ممبران نے بالاتفاق اُس اعتراض کو جو
متعصبانہ اشخاص نے پیش کیا تھا محض بے معنی اور مہمل قرار دیا اور شیکسپیر کی پڑھائی
اپنے حال پر قائم رہی۔ اس واقعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں
مُلّائے خشک موجود ہیں سوا مُلّائے خشک کے کس کو یہ سوجھ سکتی ہے۔ کہ
شیکسپیر یا میر حسن کی مثنوی نہ پڑھائی جائے مثنوی میر حسن کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ
آتا ہے جس سے اس کتاب کی ندرت اور عظمت ثابت ہو گی۔ خیر رو داد بالا تو راقم
کی چشم دید نہیں ہے مگر شیکسپیر کیا کتاب ہے اس کی شہادت فقیر بھی کسی قدر دے
سکتا ہے اس عاجز نے شیکسپیر کے چند پلے اپنے کالج کے زمانے میں ایسے ایسے
استادوں سے جیسے مسٹر رنڈل (Mr. Rindle) اور مسٹر گریفتھ
(Griffith) تھے پڑھے ہیں۔ میں اپنی واردات قلبیہ سے سمجھ
سکتا ہوں کہ شیکسپیر کے کلام کیا تاثیر رکھتے ہیں اور ان کو اخلاق آموزی میں کیا دخل ہے
واضح ہو کہ انسان کی طبیعت سے خشونت دفع کرنے کا وسیلہ شاعری سے بہتر کوئی
دوسرا نہیں ہے شاعری مزاج انسان میں عجب ملایمت پیدا کرتی ہے جن کو شاعری کا

مذاق صحیح از روئے فطرت حاصل رہتا ہے اُن کی طبیعت تو یقیناً خشونت سے پاک واقع ہُوا کرتی ہے۔ لیکن جو اس کے برخلاف مزاج رکھتے ہیں ان میں بھی اکتسابی طور سے کچھ نہ کچھ ملایمت آہی جاتی ہے بلا شبہ شاعری خراط کا کام کرتی ہے کُندۂ ناتراش کو بھی چھیل چھال کر دُرست کر دیتی ہے یہ بات عندالتجربہ بپایۂ ثبوت کو پہنچی ہے۔ کہ جن کی خلقت میں صفات حمیدہ بہ سبیل فطرت داخل ہیں۔ بلا شبہ شاعری کا مذاق صحیح ان کی خلقی خوبیوں کو افزوں کر دیتا ہے اور جب ناہموار مزاجوں پر شاعری اپنا اثر کچھ نہ کچھ پیدا ہی کرتی ہے تو کیا تعجب ہے کہ اچھوں کو اس سے حسب مراد نتائج مترتب ہوں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ سچی شاعری کا احاطہ بہت وسیع ہے اس کے اندر اللہ و ماسوی اللہ کے متعلق جو مضامین ہیں گنجائش پاتے ہیں پس جس فن کا احاطہ اس قدر وسیع ہو اور اس وسعت کے ساتھ بر ساز لطافت و نزہت بھی ہو تو ایسے فن سے کیونکر تعلیم و تہذیب کی صورت نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ پس اس فن کو اخلاق آموز سمجھنا نہایت قرین انصاف ہے اور اس حیثیت سے یہ فن ایک اہم غرض انسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ جو حضرات شاعری کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں۔ اُنھوں نے شاعری کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے اور لاریب بہت محدود خیالات کے آدمی ہیں۔

انسان کے مذہبی اغراض سے شاعری کو کس قدر تعلق رہا ہے کتب تاریخ و سیر سے اس کی تحقیق دشوار نہیں ہے۔ علمی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم سے مشرک و موحد اقوام دونوں مذہبی معاملات میں شاعری سے کام لیتی رہی ہیں۔ اہل یونان و اہل روم مشرک قومیں تھیں اور ان کے دیوتاؤں کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی ہے۔ کوئی پہاڑ کوئی جنگل، کوئی جھاڑ، کوئی دریا، کوئی پتھر کوئی درخت دیوتا سے خالی نہیں

سمجھا جاتا تھا علاوہ ان کے بہت سے آسمانی اور ارضی دیوتا تھے ان میں کچھ مذکر اور
کچھ مونث مانے جاتے تھے ان دیوتاؤں کے محامد اور مناقب کے لیے شاعری
استعمال میں لائی جاتی تھی۔ اسی طرح قبل بعثت آنحضرت صلعم کے اہل عرب
بُت پرست تھے اور بُتوں کی پرستشوں میں شاعری سے کام لیتے تھے اور ان کے مناقب
کو جلاجل وغیرہ پر گاتے تھے جیسا کہ اس وقت ہنود بھی اپنے دیوتاؤں کے بھجن جھانج
وغیرہ پر گاتے بجاتے ہیں ہنود جن کا سلسلہ شائستگی یونانیوں سے بھی قدیم تر نظر آتا ہے
ساری مذہبی تعلیمات کو حوالۂ شاعری کیے ہوئے تھے اور آج تک بھی ان کی مذہبی کتابیں
شاعرانہ پیرائے میں دیکھی جاتی ہیں چنانچہ ان کی مذہبی کتابیں رامائن، مہابھارت جو معروف
خاص و عام ہیں بہت اعلیٰ درجے کی شاعری سے خبر دیتی ہیں علاوہ ان کے ہزاروں
اشلوک ہیں جو محض مذہبی پیرایہ رکھتے ہیں اور مذہبی تعلیم کی نظر سے سکھلائے پڑھائے
جاتے ہیں اگر بُت پرست اقوام میں شاعری کا دخل اس زور شور کے ساتھ دیکھا جاتا
ہے تو موحد قوموں کی مذہبی کتابیں بھی مذاق شاعری سے خالی نہیں نظر آتی ہیں عتیق
صحیفوں میں علی الخصوص زبور یعنی ادعیہ حضرت داؤد و اقوال حضرت سلیمان علیہم السلام
بہترین نمونہ شاعری ہیں صحف جدیدہ میں جس قدر اقوال حضرت مسیح علیہ السلام کے پائے
جاتے ہیں کس قدر پاک مذاق شاعری کا رکھتے ہیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ اگر تم کو
کوئی ایک گال پر تماچا مارے تو تم دوسرا گال بھی پیش کر دو اس قدر یہ قول شاعرانہ ہے
کہ آج تک اُن کی کسی اُمّت سے اس کی تعمیل نہ ہو سکی بلکہ اُن کی اُمّت اس کے
برخلاف السن بالسن کے اصول کی پابند رہتی چلی آئی۔ لیکن اگر نفس قول پر لحاظ
کیجیے تو سبحان اللہ کیا یہ قول ہے جس سے بڑی نفس کشی کی تعلیم مراد ہے۔ میں بہت سے

اس طرح کے پیارے اقوال اُس جناب کے پیش کر سکتا ہوں مگر خوف تطویل کلام سے قلم کو روک لیتا ہوں اور اب میں بسبیل اختصار شاعری کے اسلامی تعلق کو عرض کیا چاہتا ہوں۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہم مسلمانوں کے تمام امور تمدنی و مذہبی کا دار و مدار قرآن پر ہے اور یہ کتاب مقدس جس کو ہم مسلمان اُمّ الکتاب کے لقب کے ساتھ یاد کرتے ہیں کچھ ایسی ہی متبرک اور بزرگ شے ہے کہ اس کا ذکر رسولِ خدا نے اپنی عترت پاک کے ساتھ اپنے آخر عہد حیات میں فرمایا چنانچہ اس قول کی صحت کی حدیث انی تارك فیکم فی الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی ہے اب جو ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو اس میں اس درجے کی شاعری پاتے ہیں کہ لا عین رأت ولا اذن سمعت کا مضمون پیش نظر ہو جاتا ہے واقعی اس کی فصاحت و بلاغت اور لطافت شاعریہ کی انتہا نظر نہیں آتی ہے کوئی تعجب نہیں کہ اُس کی آیات نے شعرائے عرب کی شاعریوں کو بھلا دیا اس کتاب خدا کے اجزا کچھ توراتِ موسویہ کی طرح احکامات پر مشتمل ہیں اور کچھ قصص سے اور کچھ وعدہ و وعید موعظت توحید و تمجید عبادات ادعیہ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں احکامات بھی فصاحت و بلاغت سے جو ضروریات شاعری ہیں خالی نہیں ہیں۔ مثلاً خداوند تعالیٰ حکم صادر فرماتا ہے کہ اگر کوئی شخص خون کرے تو قاتل مستحق قصاص ہے۔ اس قصاص کی ضرورت کو خدا کس شاعرانہ خوبصورتی کے ساتھ سمجھاتا ہے۔ لقولہ تعالیٰ ولکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب یعنی تم لوگوں کے واسطے قصاص میں زندگی ہے اے سمجھ رکھنے والو۔ فی الواقع اس قول کی بلاغت کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی ہے لفظ تو تھوڑے ہیں مگر کس قدر معنی خیز

ہیں۔ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ قصاص میں حیات کی صورت ہوسکتی ہے کس واسطے کہ جس شخص پر حکم قصاص جاری کیا جاتا ہے اس کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ برعکس اس کے قولہ تعالیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص ذریعۂ حیات ہے لیکن اگر غور سے دیکھیے تو واقعی قصاص میں حیات ہے اوّل تو قصاص ذریعۂ حیات اس شخص کے لیے ہے کہ جو جرم قتل کا مرتکب ہوا یعنی اگر اس سے قصاص نہیں لیا جائے تو مقتول کا خون اس کی گردن پر رہ جائے گا اور بعد مردن جو عالم حیات ابدی کا پیش آنے والا ہے وہ اُس کے لیے بدتر از موت کی شکل پیدا کرے گا اور حقیقت پوچھئے تو حیات ابدی ہی حیات ہے اور جس حیات کو ہم لوگ حیات کہتے ہیں ایسی ہی حیات ہے کہ اُس کے پیچھے موت لگی ہوئی ہے۔ دوم یہ کہ قاتل کے قصاص پانے سے اور بنی آدم کی حیات کی صورت متصور ہے اگر قاتل کو سزائے موت نہیں دی جائے تو امن کی صورت قائم نہیں رہ سکتی ہے ہر انسان کی حیات معرض خطر میں در آسکتی ہے۔کس واسطے کہ جب قاتل کو سزا پانے کا خوف نہیں رہا تو اگر اُس نے آج ایک آدمی کو مارا ہے تو کل دس کو مارے گا پھر اُس کو خونریزی میں مطلق العنان دیکھ کر اور اشخاص بھی خونریزی کے مرتکب ہونے لگیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام معاملات تمدنی و اخلاقی و مذہبی برہم ہو جائیں گے جس کے سبب سے بقائے نوع انسانی کی کوئی صورت قائم نہیں رہے گی۔ جو حصے قرآن مجید کے قصص سے مشتمل ہیں ان کے بیان کی خوبی کی کوئی حد نظر نہیں آتی ہے۔حضرت یوسفؑ کا قصہ کس سچے مذاق شاعری کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ توراۃ میں بھی یہ قصہ موجود ہے مگر وہی قصہ کس خوبصورتی جدت اور بلاغت کے ساتھ قرآن میں دہرایا گیا ہے

جامی کی کتاب منظوم معروف بہ یوسف و زلیخا گوہر۔ ارشاعرانہ خوبیوں سے آراستہ ہے مگر قرآنی لطافتوں کی اُس کو ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ راقم کو اس رسالہ عجالہ میں اس سورہ کی شاعرانہ خوبیوں کے بیان کا موقع نہیں ہے۔ تحریر طولانی ہو جائے گی اس واسطے ناچار قلم کو روک لیتا ہے اسی طرح سورۂ مریمؑ کی بھی خوبیاں قابلِ ذکر ہیں مگر اسی خوف سے وہ بھی حوالۂ قلم نہیں کی جاتی ہیں۔ بالآخر اگر قرآن کے اُن اجزا پر لحاظ کیجیے جو وعدہ و عید، موعظت، توحید، تمجید، عبادات، ادعیہ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ سب کے سب نہایت اعلیٰ درجہ کی لطافت شاعرانہ سے خبر دیتے ہیں چنانچہ جہاں خدائے تعالیٰ نیک کاروں کو جزائے خیر کی بشارت دیتا ہے۔ تو تفہیم عوام کی غرض سے معاملات روحیہ کو حسیات کی شکل میں بڑی ندرت کے ساتھ بیان فرماتا ہے اسی پر اُس کے وعیدوں کو بھی قیاس کرنا چاہیے کہ اُسی پیرایہ میں مذکور ہوتے گئے ہیں۔ موعظت کے ایسے انداز ہیں کہ افصح واعظ بھی اُس انداز کو نہیں اٹھا سکتا اور جو اُن موعظت کے مضامین ہیں اخلاق کے ایسے جیّد اصولوں پر مبنی ہیں کہ فلاسفر اخلاقی ان کی تبعیت سے فائدہ بے شمار حاصل کر سکتا ہے۔

تعلیم توحید۔ توحید کی تعلیم تو وہ تعلیم ہے کہ پیرو محمدؐ بانگ بلند سے ساکنانِ دنیا کو پکار کر کہہ سکتا ہے کہ اے اقوام مختلفہ آؤ اور ہم سے توحید کا سبق لو اس انیسویں صدی کے موحدین جو اپنے توحیدی مذہب کے ایجاد پر فخر و مباہات کرتے ہیں درحقیقت خوشہ چین اسلام کے ہیں۔ اس زمانے کے دعویٰ داران توحید نے معاملۂ توحید میں کوئی بات توحید قرآنی سے ایک خس کے برابر بھی زیادہ نہیں پیدا کی ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ایک ایسا قول زبردست ہے کہ اس سے زیادہ کوئی

دوسرا زبردست قول معاملۂ توحید میں ہو نہیں سکتا۔ یہ دعویٰ داران توحید کیا ایجاد توحید کریں گے۔ بہت دعویٰ داران توحید کے حالات مالی و ملکی سے فقیر کو ذاتی اطلاع ہے خیر یہ کیا ہیں توحید موسوئی تو توحید محمدی کی برابری نہیں کر سکتی پھر اور کوئی ملت و مذہب کی توحید تو کیا توحید محمدی کو پہنچے گی۔ جن حضرات نے پانچوں صحیفے حضرت موسیٰ کے آنکھ کھول کر پڑھے ہیں اور قرآن کو بھی تامل کے ساتھ پڑھا ہے وہ توحید موسوئی اور توحید محمدی میں تمیز کر سکتے ہیں۔ راقم کو اس سے زیادہ یہاں لکھنے کا موقع نہیں ہے بہرحال توحید کی تو یہ ندرت ہے

تمجید باری تعالیٰ اب تمجید باری تعالیٰ کے مضامین کو دیکھیے تو از خود یہی کہنا ہے کہ قرآنی تمجید کی نظیر کسی کتاب دینی یا دنیوی میں نہیں ہے کوئی شخص تمجید کی ایک آیت بھی صحف سابقہ سے یا ایک مصرع بھی کسی شاعر کی تصنیف سے دکھلا دے جو **قولہ تعالیٰ** ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر کا جواب ہو یا کسی کتاب میں آیتہ الکرسی کے برابر کوئی تمجیدی تحریر کا نشان دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آیتوں کے برابر توحیدی اور تمجیدی مضامین اس وقت تک کہیں دیکھے نہیں گئے۔ اور تاقیامت نہیں دیکھے جائیں گے۔ عبادات کے مضامین بھی لطافت شاعریہ سے خالی نہیں ہیں اور ادعیہ کہ مخ عبادت ہیں اس شاعرانہ پیرائے کے ہیں کہ جن کے آگے تمام دنیا کی دعائیں بددعائیں معلوم ہوتی ہیں المختصر قرآن شریف تمام ترسچی شاعری کا نمونہ ہے اس کی شاعری کہیں داخلی یعنی سبجکٹو (Subjective) اور کہیں خارجی یعنی آبجکٹو (Objective) اور کہیں دونوں قسموں کی آمیزش کے ساتھ

واقع ہوئی ہے۔ عبارت کے رو سے قرآن شریف گو نظم ہے مگر سچے مذاق کی شاعری کے لیے جیسی عبارت چاہیے اُس کا عیار کامل ہے یہی سبب ہے کہ عرب کے شعرا و فصحا و بلغا ترکیب عبارت سے الگ عاجز آئے اور عالی خیالی اور بلند پروازی سے الگ مغلوب رہے ناچار بعضوں کو کہنا پڑا کہ قرآن کلام بشر نہیں ہے اور بعض اپنی شاعری کی بے حقیقتی کے معترف ہو کر حلقۂ اسلام میں در آئے۔

ظاہر ہے کہ جو کچھ اس اُمّ الکتاب کے شاعرانہ مذاق کا ذکر بالا میں حوالۂ قلم ہُوا وہ واقعی بہت قلیل اور مختصر طور پر ہُوا ہے بہرحال اب عترت رسول اللہؐ کے بعض حضرات کے مذاق شاعری پر غور درکار ہے بلاشبہ بحیثیت وفور علم و فضل عترت رسول اللہؐ کے سردار علی ابن ابی طالب ہیں۔

کلام حضرت امیر المومنین علیؑ حضرت کے سچے مذاق شاعری کی تعریف ہو نہیں سکتی حضرت کا دیوان حضرت کی شاعرانہ عالی مذاقی کا گواہ ہے۔ سوا اس کے حضرت کے خطبات کس قدر سچے مذاق شاعری سے خبر دیتے ہیں سوا ان خطبات کے جو نہج البلاغت میں موجود ہیں بہت سے خطبات آپ کے ایک کتاب میں مدوّن ہیں۔ جن سے اُن جناب کی عالی درجے کی قوت شاعریہ عیاں ہے روزانہ کے کلام حضرت کے کیا کم رتبۂ شاعری رکھتے ہیں۔ علاوہ ان کے حضرت کی ادعیہ حضرت کے کمال درجے کے توجیدی اور تجبیدی مذاق سے خبر دیتی ہیں۔ منجملہ اور ادعیہ کے حضرت کی دعائے صبح کس قدر پُر تاثیر مذاق شاعری کا نمونہ ہے۔ اس دعا کو پڑھ کر کون انسان ہے جس پر عالم وجد نہیں طاری ہو سکتا ہے۔ یہ دعا انسان کو خدا کے سامنے سے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ داعی کو صاف درک ہوتا ہے کہ مد نظر

حضور میں حاضر ہے اب اس سے بڑھ کر اور کیا توحیدی اور تمجیدی شاعری ہو سکتی ہے علاوہ اُس جناب کے دیگر حضرات خاندان پیغمبر بھی نہایت سچا مذاقِ شاعری رکھتے تھے حتّٰی کہ حضرت خاتونِ جنّت ؑ۔ چنانچہ وہ شعر حضرت کا جسے اپنے پدر بزرگوار کی رحلت میں مرثیے کے طور پر فرمایا ہے کس قدر سچّے مذاقِ شاعری سے مملو ہے وہ شعر کس قدر اعلیٰ درجے کی واردات قلبیہ سے خبر دیتا ہے اور اُس تعلق کو کس عمدگی سے دکھلاتا ہے جو کسی بے حد پیاری بیٹی کو اپنے بے حد پیارے باپ کے ساتھ ہوتا ہے اُس شعر کی مرثیت حضرت آدمؑ کے اُس شعر کی مرثیت سے بڑھی ہوئی ہے جسے حضرت ابوالبشر نے ہابیل کے غم میں ارشاد فرمایا تھا اس طرح کے اشعار مراثی کا شمار اگر مذہبی شاعری میں کیا جائے تو خلاف عقل نہیں ہے۔ کس واسطے کہ جو کلام مذہبی سرداروں کے ہیں بہت مناسب ہے کہ مذہب سے متعلق سمجھے جائیں۔

شاعری ادعیہ صحیفۂ کاملہ

خیر اب ہم اُن ادعیہ کا ذکر کرتے ہیں جو مندرج صحیفۂ کاملہ ہیں یہ کتاب زبور آل محمدؐ ہے اور یہ دعائیں امام ابن امام ابن امام حضرت سجاد زین العباد سے ہیں جن کو امام ممدوح اور ان کے بعد کے ائمہ پڑھا کرتے تھے اور آج تک فریقین کے غیر متعصب ارباب عبادت پڑھا کرتے ہیں اُن ادعیہ کی توحیدی اور تمجیدی شاعری اس اعلیٰ درجے کی ہے کہ اُن کے مضامین سے عجب تازگی اور سچا جوش عبادت پیدا ہوتا ہے۔ میرے اس قول کی گواہی وہی حضرات دے سکتے ہیں جو اس صحیفۂ مقدس کو پڑھا کرتے ہیں۔ کیا دنیا میں ایسا کوئی مذہبی مزاج کا آدمی ہے کہ صحیفۂ کاملہ کی دعاؤں کو پڑھے اور متاثر نہ ہو۔ ان ادعیہ کو خلوص دل سے پڑھنے کے وقت صاف فرق داعی و مدعو۔ خالق و مخلوق۔ عابد و

معبود کا قلب درک کرنے لگتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا توحیدی اور تمجیدی شاعری ہو سکتی ہے علاوہ ان ادعیہ کے ائمہ علیہم السّلام کے بہت سے منظوم و غیر منظوم ایسے کلام ہیں جو توحیدی اور تمجیدی شاعری کے عیار ہیں۔ ان سرداران دین کے اقوال و کلام کے سوا شعرائے عرب و فارس کے بہت کلام ہیں جو مذہبی شاعری کے عمدہ نمونے ہیں۔ مثلاً قصیدہ بردہ۔ قصیدہ فرزدق قصیدہ علامہ مغربی قصائد خاقانی و سنائیؔ مثنوی مولانا روم ہفت بند کاشی وغیرہ علاوہ شعرائے اسلام کے عیسائی شعرا میں بھی مذہبی شاعری کا رواج دیکھا جاتا ہے۔ انگلستان کے گرامی ترین شاعر یعنی ملٹن کے کلاموں کا زیادہ حصّہ مذہبی پیرایہ رکھتا ہے بلکہ جس تصنیف نے ملٹن کی شہرت شاعری کو منتہائے اوج کو پہنچایا تمام تر مذہبی پیرایہ رکھتی ہے۔ یہ تصنیف ملٹن کی دو حصوں میں مشتمل ہے ایک حصے میں حضرت آدمؑ کے جنّت کو کھونے کے احوال مندرج ہیں۔ دوسرے میں ان کے پھر جنّت کے پانے کے احوال رقم ہوئے ہیں۔ ملٹن نے حصّۂ اوّل میں شیطان کو اُن کے جنّت کے کھونے کا سبب دکھلایا ہے۔ اور حصّۂ ثانی میں حضرت مسیحؑ کو اُن کے پھر جنّت کے پانے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ المختصر راقم کی تحریر بالا سے حضرات ناظرین باتمکین پر روشن ہُوا ہوگا کہ شاعری کو مذہبی اغراض انسانی میں کس قدر دخل رہا ہے ہر مذہب نے عام اس سے کہ انداز اُس کا مشرکانہ یا موحدانہ ہو شاعری سے تعلق رکھا ہے اور ہر قوم عام اس سے کہ قدیم یا جدید ہو کچھ نہ کچھ شاعری سے کام لیتی رہی ہے۔

مختلف اقوام کی شاعری پر ریویو

یہ ظاہر ہے کہ اس رسالہ مجالہ میں طول و بسط کے ساتھ تمام اقوام دنیا کی شاعری پر ریویو کی گنجائش

نہیں دی جاسکتی ہے مگر چونکہ مرکوز خاطر راقم یہ ہے کہ ایسے حضرات کو جن کو اپنی دیسی شاعری کے علاوہ کسی اور ملک کی شاعری کے انداز مذاق کو دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ فقیر کی تحریر سے کچھ اطلاع کی شکل پیدا ہو جائے اس سبب سے بسبیل اختصار اقوام مختلفہ کی شاعریوں کے عنوان و انداز کو ذیل میں عرض کرتا ہے اس اطلاع دہی سے اوّل عرض راقم یہ ہے کہ حضرات ناواقف پر نفس شاعری کی وسعت منکشف ہو جائے دوم یہ کہ ہماری دیسی شاعری کی حیثیت دریافت میں آئے۔

واضح ہو کہ مصر برّ اعظم افریقہ کے ملکوں سے ایک مشہور ملک ہے۔

جغرافیہ مصر۔ ہمارے ایسے ناظرین جن کو مُلّائی طریقۂ تعلیم کے سبب سے علم جغرافیہ کی تحصیل کا اتفاق نہیں ہوا ہے اُن کی خدمت میں بہ نظر تفہیم مضمون برّ اعظم گزارش یہ ہے کہ علم جغرافیہ کے رُو سے دُنیا کی تقسیم چند بڑے بڑے حصوں میں عمل میں آئی ہے ان میں ہر حصّے کو برّ اعظم کہتے ہیں اور اس کا لفظ مترادف زبان انگریزی میں کانٹیننٹ (Continent) ہے یہ بڑے بڑے حصّے پانچ ہیں۔ اور وہ برّ اعظم ایشیا۔ برّ اعظم یورپ۔ برّ اعظم افریقہ۔ برّ اعظم امریکہ جنوبی و شمالی۔ اور برّ اعظم اوشینیا ہیں ہر برّ اعظم میں بہت ملک داخل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ برّ اعظم ایشیا میں جاپان۔ چین ملاکا۔ سیام۔ برہما۔ ہندوستان۔ تبت۔ تاتار۔ چین روس۔ کابل۔ فارس۔ عرب۔ عراق عرب۔ ایشیائے کوچک داخل ہیں۔ اور جو اقوام کہ ان ملکوں میں رہتی ہیں اُنھیں ایشیائی کہتے ہیں۔ اس تقسیم کے رُو سے ہم لوگ جو ہند کے رہنے والے ہیں ایشیائی ہونے میں اہل جاپان و چین و فارس و عرب وغیرہ کے برابر ہیں۔ اسی طرح برّ اعظم یورپ میں چند ملک داخل ہیں۔

جیسے ناروے، سویڈن، جرمنی، ڈنمارک، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ، روس، پرتگال، سوئٹزرلینڈ، یونان وٹرکی جسے اہل اسلام روم کہتے ہیں۔ اور جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ ہے برّاعظم افریقہ کے ملک بہت ہیں بخوف طوالت کلام صرف بعض درج کیے جاتے ہیں۔ اور وہ بعض یہ ہیں یعنی مصر، بربر، بارکا، ٹری پولی، ٹیونس، الجیریا یعنی الجزائر۔ فیزان، مراکو۔ حبش۔ کیپ وغیرہ برّاعظم امریکہ شمالی وجنوبی میں بھی اسی طرح بہت ملک ہیں۔ امریکہ شمالی کے ملکوں سے نیوفونڈلینڈ، کینیڈا، مکسکو وغیرہ ہیں۔ اور امریکہ جنوبی کے چیلی برازیل وغیرہ ہیں۔

جاننا چاہیے کہ جو اقوام جن ملکوں میں رہتی ہیں وہ علاوہ اُن ناموں کے جو اُن کے ملک کا ہے اُن برّاعظم کے نام سے بھی یاد کی جاتی ہیں جن برّاعظم میں کابلی اور جو شام میں وطن رکھتے ہیں۔ شامی اور جو چین میں وطن رکھتے ہیں چینی کہلاتے ہیں تو علاوہ ملکی ناموں کے یہ اقوام ایشیائی بھی کہلاتی ہیں۔ اس سبب سے کہ یہ ملک سب برّاعظم ایشیا میں واقع ہیں۔ اسی طرح جو اقوام مختلف بلاد یورپ میں رہتی ہیں مُلکی نام کے علاوہ یوروپین کہلاتی ہیں۔ چنانچہ جرمن، انگریز، فرانسیسی، اسفینی، پرتگالی روسی وغیرہ پر یکساں لفظ یوروپین دلالت کرتا ہے۔ یوروپین بزبان انگریزی اہلِ یورپ کو کہتے ہیں اور اس کا اطلاق تمام ملک ہائے یورپ کے سُکنا پر یکساں طور سے ہوتا ہے اسی طرح ملک ہائے افریقہ کے رہنے والے افریقی کہلاتے ہیں عام اس سے کوئی قوم مصر میں رہتی ہو یا حبش میں یا بربر میں یا الجزائر وغیرہ میں اسی طرح ملک ہائے امریکہ شمالی وجنوبی کے ملکوں کے رہنے والے امریکن

یعنی اہل امریکہ کہلاتے ہیں ان امور متعلق جغرافیہ کو ذہن نشین کرنے سے حضرات ناواقف کو فائدہ یہ ہوگا کہ جن ملکوں کی شاعری کا بیان اس کتاب میں آ جائے گا ان حضرات کو معلوم ہوتا جائے گا کہ وہ ملک سب دنیا کے کس حصے میں ہیں۔ بڑے غضب کی بات ہے کہ آدمی ملکوں کی سمت و جہات و عام حالات سے واقف نہ ہو اس وقت کی ملائی تعلیم کا تو یہی تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے ضروری معاملات بری و بحری سے ناواقف رہے پرانے طریقہ تعلیم کے پابند حضرات سے فقیر کو کوئی ایسے صاحب نہ ملے کہ جو دنیا کے ملکوں کے نام و سمت و جہت سے سرسری طور پر بھی واقفیت رکھتے ہوں۔ گھر بیٹھے ہوئے جو کبھی چین ماچین کا نام لیتے ہیں تو اس سے اُن صاحب کو اس کی کبھی اطلاع نہیں ہے کہ اُن کے دولت خانے سے چین ماچین پچھم واقع ہیں یا پورب۔ اتر واقع ہیں یا دکھن۔ درس تدریس میں ختا و ختن بول جاتے ہیں مگر موضعی اطلاع کچھ نہیں رکھتے ان کے علم جغرافیہ میں صرف چند ملک و شہر ہیں۔ جیسے تبت، تاتار، کابل، فارس، عراق، شام، عرب، مصر، روم لیکن ان ملکوں کے نام کے سوا اُن کی نسبت کچھ نہیں جانتے۔ بہت حضرات تو ملک و شہر میں فرق نہیں کرتے۔ غرض عجب طرح کی لاعلمی میں مبتلا نظر آتے ہیں اس پر اگر علم جغرافیہ کی ضرورت کو ایسے حضرات سے بیان کیجیے تو اس علم کو شاید کسی قسم کی بدعت قیاس کر کے برہم ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ علم ایک وقت میں عین مسلمانوں کا علم تھا ہائے شامت کہ اس وقت یہ علم صرف بے ضرورت ہی قیاس نہیں کیا جاتا ہے۔ بلکہ کوئی ایسا امر قبیح سمجھا جاتا ہے۔ جو پرانی تعلیم والوں کی برافروختگی کا سبب ہوتا ہے راقم زنہار مبالغہ پردازی کے پیرائے میں ان باتوں کو عرض نہیں کرتا ہے فقیر پر یہ سانحہ گزر چکا ہے

اور صرف ایک بار نہیں بلکہ چند بار منجملہ ان الم خیز واقعات کے ایک واقعہ یہ ہے
کہ ایک حضرت ارباب علم و فضل سے سکندر نامہ کا درس دے رہے تھے اور اسی
طرح ہر روز کتب عربیہ و فارسیہ کا درس دیا کرتے تھے اور نہیں معلوم عمر بھر میں کے بار
سکندر نامہ وغیرہ کا درس دے چکے ہوں گے میں نے اس طالب العلم سے جو
اس وقت سکندر نامہ پڑھ رہا تھا پوچھا کہ سکندر کا وطن کہاں تھا وہ کچھ نہ بتا سکا
پھر میں نے پوچھا کہ سکندر کی قومیت کیا تھی اس کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ پھر میں نے
پوچھا کہ سکندر کے ظہور کو کتنا عرصہ ہوا ہوگا۔ اس کا جواب بھی خاموشی کے سوا کچھ
نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ مدرس صاحب نے ان باتوں کی طرف توجہ کو مبذول نہیں فرمایا
تھا بیچارے طالب علم کا کوئی قصور نہ تھا بعد ازاں جو مدرس صاحب سے
بسبیل تذکرہ ان باتوں میں گفتگو پیش آئی تو معلوم ہوا کہ مدرس صاحب کے نزدیک
علم جغرافیہ یا علم تاریخ کوئی شے نہیں ہے۔ واقعی سر پیٹنے کی بات ہے جو ہمارے
حضرات اہل علم کے ایسے خیالات ہو رہے ہیں جائے غور ہے کہ اس زمانے کے
یا ایسے ملایانہ خیالات ہیں یا ایک ایسا وقت مسلمانوں کا تھا کہ علاوہ اور علوم کے
علم جغرافیہ اور علم تاریخ میں اہل اسلام اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اہل یورپ جو اس وقت
علموں میں ید طولیٰ رکھتے ہیں مسلمانوں کے رشتہ دکھائے ہیں کیا تماشا ہے کہ یہ علم
سب اغیار میں چلے گئے اور ہم سے صرف رخصت ہی نہیں ہو گئے بلکہ ہم کو اپنے
سے نفرت بھی دلا گئے تاکہ پھر ہم لوگ ان کے کبھی خواستگار نہ ہوں۔ واضح ہو
کہ اہل یورپ نے علم جغرافیہ اور علم تاریخ کو اس قدر ضروری سمجھا ہے کہ اپنی شاعری
اور عام لٹریچر میں ان علموں کو اس طرح ممزوج کیا ہے کہ اس وقت ان کا لٹریچر

کیا تعلیم کیا نثر ایسا ہو رہا ہے کہ بے علم جغرافیہ و علم تاریخ کوئی شخص قرآن کے لٹریچر کو بخوبی سمجھ سکتا ہے اور نہ ان کے لٹریچر سے کچھ حظ اُٹھا سکتا ہے۔

ہرچند امور بالا کی تحریر کی حاجت اس کتاب میں نہ تھی مگر ملکی ضرورتوں کو لحاظ کر کے راقم نے مضامین بالا کو حوالۂ قلم کرنا مناسب سمجھا خیر اب جو امور ضروری بیان مصر سے متعلق ہیں اس کی طرف حضرات ناظرین توجہ فرمائیں۔

جیسا کہ بالا میں ذکر ہوا ملک مصر برّاعظم افریقہ میں واقع ہے اہل یورپ اس ملک کو ایجیپٹ (Egypt) کہتے ہیں اس کی جانب شمال میں بحیرۂ مغرب یعنی میڈیٹرینین سی (Mediterranean sea) اور مشرق میں بحیرۂ احمر یعنی رڈ سی (Red sea) اور خاکنائے سویز واقع ہے۔ شمال میں ملک نیوبیا واقع ہے اور مغرب میں صحراہائے ریگستانی جو ملک فیزان تک چلے گئے ہیں۔ اس ملک کا عرض ۴۵۰ اور رقبہ ۱۱۰۰۰ میل ہے۔ اس ملک میں صرف ایک دریا ہے جس کا نام نیل ہے یہ بڑا دریا ہے اور بہت دور سے نکل کر مصر سے گزرتا ہوا بحیرۂ مغرب میں گرا ہے تخمیناً اس دریا کا طول ۱۵۰۰ میل ہے یہ دریا مصر کی زراعتی آبادی کا سبب ہوتا ہے۔ اگر یہ دریا نہ ہوتا تو مصر ایک غیر آباد ملک ہوتا اس ملک میں پہاڑ بھی واقع ہیں مگر بہت مرتفع نہیں ہیں علاوہ پہاڑوں کے چند وسیع جھیلیں بھی ہیں۔ آب و ہوا اچھی ہے مگر یبوست غالب پائی جاتی ہے جو شخص مبتلائے امراض بارد ہوتے ہیں ان کے مزاج کے ساتھ یہ ملک موافقت کرتا ہے۔ اس کے بعض حصوں میں بارش کی فصل ۱۲ روز سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ بیشتر ہوائے گرم چلتی ہے۔ ریگستانی حصوں میں باد سموم آزار دہ ہوتی ہے امراض وبائی بھی پیدا ہوتے ہیں اور اکثر اشخاص عوارضِ

چشم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جانوران وحشی اس ملک کے ببر، کفتار، گرگ، آہو، نسناس، جاموس، گھوڑ گدھے، تگر اور ہیپو پوٹمس ہیں۔ واضح ہو کہ ببر ایک قسم شیر کی ہے اور یہ وہی جانور سباعی ہے جسے انگریزی میں ٹائیگر (Tiger) کہتے ہیں اور یہ جانور ہمارے ملک ہندوستان میں کثیر الوجود ہے۔ اہل ہند اُسے سیلا یا سلودھا یا گھر کہتے ہیں اس کے جسم پر لانبی لانبی سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں یہ جانور نہایت قوی پنجہ عظیم الجثہ اور خونخوار ہوتا ہے جو اشخاص علم حیوانات سے اطلاع نہیں رکھتے وہ ببر کو مترادف اسد کا سمجھتے ہیں اور ببر کو محل اسد میں استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اسد ایک اور جانور سباعی ہے۔ جس کے سر اور گردن میں بڑے بڑے بال ہوتے ہیں اور جس کی کنیت ابوالحارث ہے۔ یہ جانور برّ اعظم افریقہ میں پوری نشو و نما پاتا ہے گو اس کی خرد پیکر قسمیں ایران و گجرات و راجپوتانہ وغیرہ کی اطراف میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اسد کو افریقہ سے ویسے ہی خصوصیت ہے جیسا کہ ببر کو ہندوستان و برہما وغیرہ سے ان ملکوں کے سوا ببر جہاں جہاں دیکھا جاتا ہے وہاں خرد مقدار پایا جاتا ہے۔ ہیپو پوٹمس ایک ایسا آبی جانور ہے کہ بر و بحر دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور مثل گینڈے کے عظیم پیکر ہوتا ہے یہ بھی ایک خشمین اور قوی جانور ہے اور اہل افریقہ اس کا گوشت رغبت کے ساتھ کھاتے ہیں۔ طیور اس ملک کے شتر مرغ، عقاب، باز، بط وغیرہ ہیں۔ ایک اور بھی چڑیا ہوتی ہے۔ جسے اہل یورپ آئیبس (Ibees) کہتے ہیں۔ اس چڑیا کے طور کی ایک چڑیا ہندوستان میں بھی دیکھی جاتی ہے۔ جسے شکاری مُنڈل کہتے ہیں۔ اس چڑیا کو قدیم مصری نہایت مقدس و متبرک سمجھتے تھے اور مذہبی حکم کے مطابق اُس کی پرستش کرتے تھے۔ حشرات الارض اس ملک میں بہت اقسام کے پائے جاتے ہیں

منجملہ اُن کے ایک قسم سانپ کی ہوتی ہے جس کے سر پر چھوٹے چھوٹے دو سینگ ہوتے ہیں۔ اس سانپ کا زہر نہایت قاتل ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے ایک سانپ کفچہ دار ہوتا ہے جس کو نیجا کہتے ہیں یہ ہمارے مُلک کے گھمن سانپ سے مشابہ بہت رکھتا ہے اور نہایت زہریلا ہوتا ہے۔ مصر کی زراعتی پیداوار بُھٹا، گیہوں، دھان، پیاز، تربوز، خیار، شکر، افیون، تمباکو، پٹوا، روئی، السی اور نیل ہیں۔ مصر کی زرخیزی کا دارومدار دریائے نیل کے جوش پر ہے جب فصل برشگال آتی ہے یہ دریا سیلاب کی شکل پیدا کرتا ہے اور جب اس کا پانی نکل جاتا ہے تو اس دریا کی ہر دو جانب کی اراضی پر کوسوں تک نئی مٹی کی سطح جم جاتی ہے جو زراعت کے حق میں کھاد کا کام کرتی ہے اور جس کے سبب سے پیداوار حسب مراد ظہور میں آتی ہے اس ملک میں پھل بھی بہت قسم کے ہوتے ہیں۔ نباتاتی چیزیں بھی کثرت سے پیدا ہوتی ہیں یہاں کے اثمار نارنگی، کوئلے، لیموں، انجیر، کھجور، بادام، کیلے اور بیر ہیں۔ نباتی چیزوں میں ایک شے ہوتی ہے جسے اہل یورپ پیپرس (Papurus) کہتے ہیں۔ اس شے سے پہلے پہل کاغذ بنایا گیا تھا انگریزی میں کاغذ کو پیپر (Paper) کہتے ہیں وجہ تسمیہ پیپر کی یہی ہے کہ اس نباتی شے سے شروع شروع بنایا گیا تھا۔ علاوہ اس کے اس ملک میں نیلوفر بھی اقسام طرح کا بکثرت پیدا ہوتا ہے معدنی اشیاء از قسم سونا چاندی وغیرہ نہیں پیدا ہوتی ہیں مگر چند طرح کے پتھر جو عمارت سازی کے کام کے ہوتے ہیں۔ کثیر الوجود ہیں۔ انھیں اقسام سنگ میں ایک سُرخ رنگ کا پتھر دیکھا جاتا ہے جس سے اہرام مصری بنائے گئے ہیں۔ جواہرات میں صرف زمرد پایا جاتا ہے۔ اور اس پتھر کی کانیں اُن پہاڑوں میں دیکھی جاتی ہیں جو ساحل بحیرا احمر کے قرب

میں واقع ہیں۔ اس ملک کی تجارتی اشیاء دندانِ فیل آبنوس مشک عنبر شتر مرغ کے
پر اور قہوہ ہیں۔ کتب سابقہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت میں مصر
اور ہندوستان کے درمیان تجارتی کاروبار جاری تھا اور جناب مسیح علیہ السلام
کے قبل اور بعد بھی مصری جہاز ہندوستان کو جاتے آتے تھے مصر کی عمارات کہن بہت
قابل لحاظ ہیں سب سے پہلے توجہ طلب وہاں کے اہرام ہیں یہ عمارتیں جو مربع شکل
اور نہایت مرتفع ہیں اپنے دیکھنے والوں پر عجیب حیرت پیدا کرتی ہیں جو ان میں سے
ارفع ہے وہ قریب پانسو ۵۰۰ فٹ کے بلند ہے۔ یہ عمارت تعمیر کردہ چیاپس (Cheaps)
کی ہے جو فراعنۂ مصر سے ایک قوی بادشاہ تھا اس کے عہد کو قریب چار ہزار برس
کا زمانہ گزرا ہوگا اتنے عرصۂ دراز کے بعد بھی یہ عمارت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا
آج بنی ہے۔ اہرام مصر کی تعمیر کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل مصر قدیم کا یہ عقیدہ تھا
کہ جب تک بعد ممات لاش کی شکل قائم رہتی ہے تب تک روح کبھی فنا پذیر نہیں
ہوتی ہے اس غرض سے مرنے کے بعد وہ اپنے مردوں کی لاشوں میں ایسی دوائیں
جو مانع بوسیدگی ہوتی ہیں داخل کرتے تھے اور ان لاشوں کو محفوظ جگہوں میں رکھتے
تھے۔ فراعنۂ مصر بھی جو اس عقیدے کے شریک تھے۔ غرض بالا سے اہرام بنائے
گئے تاکہ بعد ممات ان کی لاشیں محفوظ رہیں اسی خیال کی پابندی سے چند بادشاہوں نے
یکے بعد دیگرے یہ عمارتیں جو درحقیقت اُن کے مقابر ہیں تعمیر کیں۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر
یہ تعجب گزرتا ہے کہ ان کی تعمیر کیونکر ظہور میں آسکی کس واسطے کہ ان کی تعمیر میں اتنے
بڑے بڑے پتھر ایسی ایسی بلندیوں پر چڑھائے گئے ہیں کہ جن کو دیکھ کر یہ بات معلوم ہوتی
ہے کہ اس زمانے کے مصریوں کو جرِ ثقیل کا اور کوئی علم حاصل تھا یا سباب ظاہراً ہیں

زمانہ کا علم جرثقیل کسی طرح بکار آمد نہیں ہو سکتا ہے خدا جانے کہ وہ قوم کیسی تھی اور کیا کرتی تھی۔ علاوہ ان عمارات حیرت انگیز کے اُس قوم کے معابد بھی موجود ہیں جن کی عمارتیں اُن احرام کے برابر مرتفع تو نہیں ہیں مگر صناعی کا وہ تماشا دکھلاتی ہیں کہ جو کسی اور ملک کی عمارات کُن کو نصیب نہیں ہے علاوہ ان احرام و معابد کے ایک شہر جس کا نام تھیبس (Thebes) تھا اب ویران پڑا ہُوا ہے۔ دس میل کے اندر تک اُس کی عمارتیں مبتلائے بد حالی نظر آتی ہیں۔ اُس کے سیکڑوں سنگی پائے جن پر بڑے بڑے سنگی شہتیر دھرے ہوئے ہیں۔ ابھی تک کھڑے ہوئے ہیں یہ پائے ایک ڈال ہیں اور ان کے طول و عرض و عمق کو دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے کہ وہ کہاں سے آئے اور کیونکر کھڑے کیے گئے، اندر سو میل کے تو کوئی پہاڑ بھی نہیں ہے جہاں سے اُن کا لایا جانا قیاس کیا جائے۔ ان باتوں کو دیکھ کر مضمون قرآنی ذات العماد کا پیش نظر ہو جاتا ہے اور عبرت مجسم آگے آکھڑی ہوتی ہے۔ اے جبارین زمانہ ہوش میں آؤ دیکھو تو وہ کیسی اُمت تھی جس کے آثار اُس اُمت کی گزشتہ قوت و حشمت کو کن حسرتوں کے ساتھ ثابت کر رہے ہیں وہ اُمت کیا ہو گئی اور تم کیا ہو جاؤ گے اس چند روزہ زندگی پر یہ بے اعتنائیاں اگر تم مرتے نہیں تو کیا نہیں کرتے۔ اے متاع دنیا کے خریدارو اگر دولت دنیا دی نے تمھارے دماغ میں خلل پیدا کیے ہیں۔ تو اس شہر ذات العماد کے ویرانوں کی سیر کر آؤ۔ وہاں پہنچکر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تم کیا ہو اور تمھاری حقیقت کیا ہے۔ تمھاری ثروت کیا اعتبار رکھتی ہے اور تمھارے جاہ و حشم عنقریب کیا ہو جانے والے ہیں ان حیرت انگیز ویرانوں کو دیکھ کر کیا کوئی دنیا پر ناز کر سکتا ہے۔ **مصرعہ** کہ بسیار کس چوں تو پرورد و کشت

اُس کا دوامی دھندا ہے دنیا کیا اور اس کی ثروت کیا اور اس ثروت پر ناز کیا ۔
آں چہ دیر نپاید دلبستگی را نشاید ۔ اگر تم کو خدا نے عروج و نمود کی بخشا ہے تو سر کو سجدہ شکر میں ڈالو احسان منعم حقیقی کو مانو تم کو گردن کشی کا کیا موقع ہے تم نے خود کیا کیا ہے کہ جس پر تم کو اس قدر ناز و تبختر ہے اور بالفرض اگر یہ سب کیا دیا تمھارا ہی ہے تمھارے اُس آقا کا نہیں ہے جس نے تم کو معدوم سے موجود کر دیا ہے تو پھر تمھارا عرصۂ زندگی ہی کیا ہے اور اگر زندگی دراز بھی سہی تو زندگی موجود میں کون بڑی خوبیاں ہیں کہ مرد حقیقت بین و عاقبت اندیش کو محو سہو کر ڈالیں ۔

لمولفہ

سبب شور و شغف اہل جہاں کا کیا ہے ۔ عمر دو روزہ کو نافہموں نے سمجھا کیا ہے
پوچھیے تارک دنیا سے بُرائی اس کی ۔ کیا خبر طالب دنیا کو کہ دنیا کیا ہے
ہائے بن بن کے بگڑ جاتی ہیں شکلیں کیا کیا ۔ مطلب اس عالم فانی کا خدایا کیا ہے
لذت ہستی و اندازۂ لذت معلوم ۔ اور کچھ روز جئیں اس کی تمنا کیا ہے
دل گرفتہ نہ ہونا سازی دنیا سے اثر ۔ ہے غلام شہ مرداں تجھے پروا کیا ہے

مصریان سابق کا لٹریچر

واضح ہو کہ ان قدیم مصریوں کے حالات اہل یورپ کی تحقیقات و تفتیشات سے کسی قدر معلوم ہوتے گئے ہیں ۔ مگر ان مصریوں کے لٹریچر کی نسبت راقم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اپنے وقت میں بہت کچھ برسر ثروت تھی مگر اس قوم کا لٹریچر ممتاز شکل نہ تھا جو نوشتے اُن کے اس عہد میں موجود ہیں ان میں اہل یونان و اہل روم کے لٹریچر کی خوبیاں نام کو پائی نہیں جاتی ہیں ان مصریوں کے زوال کے بعد ملک مصر کیانی شاہان ایران کے زیر حکومت

درآیا پھر اہل یونان کو ہاتھ لگا چنانچہ شہر اسکندریہ جو مصر کے شمالی جزو میں واقع ہے
سکندر یونانی کی یادگار ہے یہ سکندر بادشاہ مقدونیہ (Macedon) کا تھا۔
اس نے تھوڑے ہی عرصے میں جہان کو زیر و زبر کر ڈالا۔ وفات سکندر کے بعد اُس کے
مفتوحہ اور مقبوضہ ممالک اس کے چار میر لشکروں پر تقسیم ہو گئے۔ اُن چار میں ایک
شخص بطلیموس لیگس (Ptolemy Lagus) نامی تھا یہ شخص جو فیلقوس پدر اسکندر
کے نطفے سے تھا پہلا یونانی بادشاہ مصر کا قرار پایا پھر اُس سے شاہی خاندان بطلیموسس
مصر میں جاری ہُوا۔ ان بطلیموسوں میں ایک بادشاہ گزرا ہے کہ جس کا نام بطلیموسس
کلازیوسس (Phlamy Chaudas) ہے یہ شخص بہت
بڑا عالم ریاضی تھا۔ اور کتاب مجسطی اُسی کی تصانیف سے ہے اسی بادشاہ کا وہ
نظام شمسی ہے۔ جو نظام بطلیموس کہلاتا ہے اور جس نظام کی پیروی ہمارے ہندی
ملا کرتے ہیں اور جو کتابیں علم ہیئت کی ہندوستان میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اسی مصری
ہندس کے نظام کے مطابق پڑھائی جاتی ہیں۔ ان شاہان مصر کے زمانے میں مصر کا
وہی لٹریچر تھا جو اہل یونان کا لٹریچر تھا۔ بعد یونانیوں کے اہلِ روم مالک مصر ہوئے
رومیوں کے وقت کا لٹریچر وہی تھا جو رومیوں کا لٹریچر تھا۔ پھر تھوڑے ہی روز ظہور
اسلام کے بعد یہ ملک مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اور اس وقت بھی یہ ملک اہل اسلام
کے متعلق ہے۔ بعد فتح اہل اسلام کے اس ملک میں اہل اسلام کا لٹریچر جاری ہُوا۔
اور اس وقت بھی اسلامی لٹریچر جاری ہے۔ شہر قاہرہ میں جو مصر کا دارالسلطنت
ہے مدارس اسلامیہ جاری ہیں اور وہاں علوم و فنون کی تعلیم خوش اسلوبی کے
ساتھ ہوتی ہے۔ بہرحال سب سے قدیم شائستگی کے رو سے اہل مصر تھے۔

شاعری مصر سابق

ان کی قدامت کی شریک اگر کوئی قوم تھی تو ہنود سابق تھے جن کا تذکرہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ اپنے موقع پر کیا جائے گا۔ ہنود سابق کی شاعری سے محققین بخوبی اطلاع رکھتے ہیں۔ مشاہیر شعرائے ہند کے کلام بکثرت اس وقت موجود ہیں۔ ان کے نام اور ان کے حالات سے ہر تعلیم یافتہ شخص کو اطلاع ہے اور ان کی شاعری اس درجہ کمال کی ہے کہ آج تک شائستہ ترین اقوام دنیا اُن سے حظ وافر اٹھاتی ہیں مگر مصریان بعید العصر کی شاعری سے کسی کو حسب مراد اطلاع نہیں ہے اس قوم کے کسی شاعر کا ذکر فقیر نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا مگر کتابوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم میں نوشت وخواند کا رواج کسی قدر تھا اور جو قدیم کتابیں اس قوم کے حال میں موجود ہیں اُن سے دریافت ہوتا ہے کہ مصریان سابق قصص وحکایات کا مذاق بہت رکھتے تھے یہ قدیم کتابیں تین ہزار برس سے ادھر کی نہیں ہیں بلکہ بعض اس قدر قدیم ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام کے بھی دو ہزار برس قبل لکھی گئی تھیں مگر ان کتابوں سے اہلِ مصر سابق کا مذاق شاعری کچھ دریافت میں نہیں آتا ہے اس قوم کے قصص وحکایات خاص رنگ کے ہیں مگر اُسی رنگ کے کہانی قصے اور اقوام مابعد میں بھی دیکھے جاتے ہیں جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان مابعد اقوام نے مصریان سابق سے اُنھیں لیا ہے۔ بہرحال اس قوم کی شاعری کا کوئی معقول اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے اس واسطے کہ کوئی ایسی کتاب اس قوم کے عہد کی جو اُس کے مذاق شاعری سے خبر دے سکے اقوام جدیدہ تک نہیں پہنچی ہے۔ قیاس راقم ایسا ہے کہ یہ قوم بہت شاعر مزاج نہ تھی۔ اگر کاش ہوتی تو یونانیوں کی طرح کچھ نہ کچھ اپنی شاعری کی ممتاز یادگار چھوڑ جاتی اس

عہد تک جو مصریان سابق کے شاعرانہ کلام پہنچے ہیں وہ بیشتر بھجن وغیرہ ہیں جو اقوام مابعد کے مراتب شاعری کو نہیں پہنچتے ہیں علاوہ ان کلام کے اہل مصر حیوانات کے قصے نظم کیا کرتے تھے یہ منظوم کہانیاں ہم سبھوں تک نامربوط طور پر پہنچی گئی ہیں ان کہانیوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مابعد کے اقوام میں جو حیوانات کی کہانیاں مروج تھیں ان کا ماخذ وہی اہل مصر کی کہانیاں تھیں۔

شاعری اہلِ یونان

بیانِ ملک یونان ملک یونان جسے اہل یورپ گریس (Greece) کہتے ہیں برا اعظم یورپ کے ملکوں سے ہے اس ملک کی جانب شمال یوروپین ٹرکی (European Turkey) یعنی ملک روم جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ ہے اور جانب مغرب میں بحیرۂ یونین (Ionian sea) و جزائر ایونین اور جانب جنوب میں بحیرۂ مغرب یعنی میڈیٹرینین سی (Medi-terranean sea) اور جانب مشرق میں بحیرۂ ایجین (Aegean sea) واقع ہیں۔ یہ ملک طول میں ۲۱۰ اور عرض میں ۱۶۰ میل ہے۔ اور اس کا مجموعی رقبہ ۱۵۰۰۰ میل ہے۔ مگر اس رقبے میں یونانی جزائر بھی شامل ہیں۔ چونکہ اس ملک کے اردگرد سمندر بیشتر واقع ہے۔ یہ ملک جہازرانی کی اغراض کے لیے بہت مناسب ہے اس ملک میں بہت کوہ واقع ہیں اور افتاد اس کی جنگی اعتبارات سے ایسی ہے کہ غنیم کو اس ملک میں داخل ہونا دشوار متصور ہے۔ صرف ایک راہ

قلب اس ملک میں داخل ہونے کی ہے جس کا نام درّۂ تھرماپیلی ہے اس کا طول پانچ میل ہے اور جہاں یہ درّہ نہایت تنگ ہے عرض میں صرف پچاس گز ہے۔ اسی تنگے میں لیانیڈس (Leonidas) بادشاہ یونانی نے تین سو جوان سے ایران کے مور و ملخ لشکر کو روک رکھا تھا یہ واقعہ ۴۸۰ برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور میں آیا تھا اس ملک میں چند دریا اور جھیلیں بھی ہیں۔ آب و ہوا اس ملک کی نہایت معتدل اور روح پرور ہے۔ الا چند ترائیوں کی جو کثرت رطوبت کے سبب سے بغایت بد آب و ہوا ہیں اس ملک کے صحرائی جانور خرس، گرگ، شغال اور آہو ہیں۔ پرورده جانور گدھے، بکریاں اور بھیڑیں ہیں۔ بار برداری کا جانور گدھے کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دودھ۔ دہی، گھی صرف بکری۔ بھیڑ کے ذریعے سے دستیاب ہوتے ہیں۔ جنگل کی کثرت ہے یہاں کے ممتاز اشجار اوک، پائن، اخروٹ اور چسنٹ ہیں۔ پیداوار زراعتی گیہوں، روئی، ریشم، پشم اور تمباکو ہیں۔ ہرچند یونان ایک زراعتی ملک ہے۔ مگر فی الحال اس کی زراعتی حالت اچھی نہیں ہے۔ عہد قدیم میں یہ شکل زراعت کی نہ تھی۔ کس واسطے کہ اس زمانے کے زراعتی آثار جو تھسلی (Thessaly) اور مقدونیہ (Macedon) میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے اس عہد کا فروغ کاشت نمایاں ہے۔ اثمار یہاں کے انجیر، بادام، کھجور، کوتے لیموں اور تربوز ہیں۔ مگر ان سبھوں سے زیادہ یہاں زیتون کی کثرت دیکھی جاتی ہے واضح ہو کہ ملک یونان عہد قدیم میں چند حصوں پر منقسم تھا اور ہر حصے کا ملکی انتظام علیحدہ تھا پہلے ہر حصے میں ایک بادشاہ حکمران رہتا تھا مگر آخر میں تمام حصوں میں جمہوری سلطنتیں قائم ہو گئیں الا مقدونیہ میں کہ جہاں شخصی سلطنت بحالت

خود قائم رہ گئی فیلقوس اسی مقدونیہ کا بادشاہ تھا اور اس کا بیٹا سکندر اعظم ایک بڑا نامی بادشاہ نکلا جس نے اس وقت کی اکثر سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ یہ وہی سکندر ہے جس کا ذکر شاہنامہ میں فردوسی اور سکندر نامہ میں نظامی کرتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ اہل یورپ اہل گریس یعنی اہل یونان کو مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے۔ مثلاً کبھی ان کو اکینس (Achaeans) اور کبھی ارجینس (Argeans) ڈالوپس (Dolopes) ہیلینز (Hellenes) آئی اونس (Ions) معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب میں اہل گریس آخر نام سے مشہور تھے۔ کس واسطے کہ آئی اونس اور یونانی میں بڑی مشابہت ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ یونان معرب آئی اونیا (Ionia) کا ہے جو جزائر گریس سے ہے۔ ملک یونان ہر چند طول و عرض میں نہایت مختصر ہے مگر علم و فضل عقل و ہنر و شجاعت وغیرہ میں شہرۂ آفاق رہا ہے۔ یہاں کے لوگ ہر فن سے مناسبت رکھتے تھے طباعی ان پر ختم تھی فلسفہ، منطق، لطافت، ریاضی وغیرہ نے اس ملک میں ظہور کیا۔ علاوہ ان علوم کے شاعری نے بھی یہاں ابتدا کی اور درجۂ کمال کو پہنچی۔ اہل یونان کی نظم و نثر کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل یونان اعلیٰ درجے کا مذاق ادبیہ رکھتے تھے اور ان کے تتبع سے یورپ کی کوئی قوم خالی نہیں نظر آتی ہے ایک عرصے تک اہل یونان برسر ثروت رہے لیکن آخر کار اقبال نے اُن سے مُنہ موڑا۔ اور رومیان سابق اُن پر غالب آئے اور ان کی سلطنتیں برباد ہو گئیں ہر کمالے را زوال و ہر بنا کا عروج ایسا ہی ہوتا ہے لکل شئ اذا ماتم نقصانٗ۔ بعد رومیوں کے ۱۷۱۸ء میں ترک عثمانی اس ملک کے مالک ہوئے ان کے قبضے سے بھی یہ ملک ۱۸۱۹ء میں نکل گیا۔

اور یہاں ایک خود سر عیسائی سلطنت قائم ہوئی۔

شاعری اہلِ یونان اہلِ یونان کے عروج کا زمانہ اہلِ مصر کے بعد ہے اس قوم کی شاعری صرف اپنے زمانے میں پایۂ عالی نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ اس وقت بھی اُس کا وہی رتبہ قائم ہے جو اپنے وقت میں تھا۔ واضح ہو کہ اہلِ یونان کی شاعری کو کسی طرح تتبع سے تعلق نہیں ہے۔ سرزمین یونان میں پیدا ہوئی اور اسی سرزمین میں نشوونما پاکر نہایت سربرآوردہ ہوئی اور اس کا کمال اس درجے کو پہنچا کہ اقوام مابعد کی شاعری کو اس سے برابر فائدہ پہنچتا گیا۔ تتبع یا اعانت بیرونی سے شاعری کیونکر وجود میں آسکتی ہے۔ اس کی مثال اردو کی شاعری ہے کہ شعرائے اردو ہر طرح کے خیالات کو فارس اور بھی کسی قدر عرب کے شعرا سے اخذ کرتے گئے اور آخرکار اردو کی شاعری تتبع کے ذریعے سے ایک موقر رتبے کو پہنچ گئی۔ یہ کیفیت یونانی شاعری کی نہیں ہے شعرائے یونان کسی ملک کے شعرا کے متتبع نہ ہوئے نہ کسی ملک کی شاعری سے خیالات کی اعانت لی اور نہ کسی ملک کی شاعری کا مذاق اختیار کیا۔ اہلِ یونان فن شاعری کے خود موجد ہوئے اور اپنی طبیعت داری سے اس فن کو منتہائے کمال کو پہنچا دیا۔ یونانی شاعری کا کمال اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یورپ کی اقوام مابعد صدہا سال یونانی شاعری کی تقلید کرتی چلی آئیں۔ شعرائے یونان کی رزمی شاعری (Syrees) اُن کی بزمی شاعری (Epnes) اور اُن کے ڈراما (Drama) کو شعرائے مابعد برابر ہدایت نامہ سمجھتے رہے اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی شاعری مابعد نے جو کچھ فروغ پایا ہے اُن کے فروغ کی بنا یونانی شاعری پر واقع ہے۔ بعد یونانیوں کے رومیوں کا زمانہ آیا۔ رومیوں نے شعرائے یونان کا

تمام تر تتبع اختیار کیا۔ متاخرین شعرائے یورپ بھی اس تتبع سے خالی نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ملٹن (Milton) ایسا شاعر بھی اس تتبع سے بری نہیں دکھائی دیتا ہے۔ ملٹن نے اپنی کتاب پیریڈائیز لاسٹ کی ابتدا ہومیروس کی تقلید کے ساتھ کی ہے اور بہت جگہوں میں اُس کی تصنیف کے اندر ہومیروس کے تتبع کے آثار ہویدا ہیں۔ اب راقم ذیل میں شعرائے یونان کے بعض تصانیف کا ذکر کرتا ہے جس سے کسی قدر اہل یونان کے مذاق شاعری کا اندازہ متصور ہے۔

ہومیروس ۔ یونان کا قدیم ترین شاعر ہومیروس ہے اس کی دو تصنیفیں منظوم آج تک یونانی زبان میں موجود ہیں ایک کا نام ایلیڈ (Illiad) اور دُوسری کا نام آڈیسی (Odyssey) ہے۔ یہ دونوں کتابیں انگریزی زبان میں ترجمہ ہو گئیں ہیں۔ اور طرفہ یہ ہے کہ ایلیڈ کو علم پروران بنگالہ نے بھی اپنی بنگلہ زبان میں ترجمہ کر ڈالا ہے۔ کہاں ہو آے اردو کے خیر خواہو کیا اردو کا لٹریچر ایسا ہی تا قیامت رہے گا اپنی جواری قوم کو دیکھو ستر، اسّی برس کے اندر اُس نے اپنے لٹریچر کو ایک محقر حالت سے موقر درجے کو پہنچا دیا ہے اس وقت کسی قسم کی شاعری نہیں ہے۔ جو بنگلہ زبان میں نہیں ہے۔ افسوس ہم پر کہ ہم جہاں تھے ابھی تک وہیں ہیں۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے ہیں۔ خیر ہومیروس کے کلام کی عمدگی اُسی شخص کو کامل طور پر معلوم ہو سکتی ہے کہ جو اہل یونان کے مذہب، رواج ملکی عادات قومی طریقہ معاشرت معاملات تمدنی و اخلاق وغیرہ سے واقفیت رکھتا ہے۔ بے اس طرح کی واقفیت کے کوئی شخص کسی ملک کی شاعری کے حسن و قبح کو درک نہیں کر سکتا ہے۔ ہومیروس کے لطف کلام کو بیان کرنے کے قبل ضرور ہے کہ اہل یونان کے

کچھ حالات اور ان کتابوں کے قصّے حضرات ناواقف کے مطلع کرنے کی نظر سے
بیان کیے جائیں۔

بیان اہلِ یونان ۔ واضح ہو کہ اہلِ یونان خلقت کے رو سے ذہین مدبّر جری
جفاکش علم دوست گویا طبّاع اور صنّاع تھے۔ جس طرح شاعری کا مذاق رکھتے تھے
ویسی ہی مناسبت اور فنون سے بھی انھیں حاصل تھی۔ فنِ بت تراشی اور بت سازی
کی طرف اُن کو خلقی میلان تھا اور موسیقی کا مذاق بھی خوب رکھتے تھے رفتہ رفتہ اہلِ
یونان نے حکمت و فلسفہ و طب و تمدّن میں بھی بڑی شہرت پیدا کی۔ انتظام ملک
خوب کرتے گئے۔ قوانین طرح طرح کے ترتیب دیے سپہ داری بڑے قاعدے
کے ساتھ کی لشکر آرائی میں یگانۂ روزگار نکلے جہاز رانی میں اُس وقت کے حساب سے
اچھّی دستگاہ حاصل کی مختصر یہ کہ اہلِ یونان اپنے وقت کے شائستہ ترین لوگ تھے۔
اور ان کے علم و قابلیّت کے سامنے اُن کی ہمعصر قومیں سوا اہلِ ہند کے کچھ
وقعت نہیں رکھتی تھیں۔ مذہب کے رو سے اہلِ یونان مشرک اور بت پرست تھے
اور اس قدر خداؤں کے قائل تھے کہ اُن کے دیوتاؤں کی فہرست طولانی ہے علاوہ
اجرام فلکیہ کے طرح طرح کے مذکّر اور مؤنّث خداؤں کی پرستش کرتے تھے۔ ہر شجر
حجر جھاڑ پہاڑ دریا چشمہ کسی نہ کسی دیوتا کا محل قیاس کیا جاتا تھا۔ طرح طرح کی خیالی
اشیا پوجی جاتی تھیں۔ طرح طرح کے خیالی جانور مانے جاتے تھے۔ طرح طرح
کی پریاں دیو زاد عفاریت داخل عقائد تھے۔ طرح طرح کے جادو کرشمے طلسم جزو
معتقدات تھے۔ دوزخ کا وجود تحت الثریٰ سمجھا جاتا تھا۔ بہشت کا مضمون گویا
نادار تھا۔ دیوتاؤں کی یہ کیفیت تھی کہ انسان کی طرح خواہش ہائے نفسانی رکھتے

تھے۔ بعض مذکر خداکو جورو ئیں بھی تھیں بعض نیر اندازی پر اوقات کرتے تھے۔ کبھی مذکر خدا عورتوں پر تصرف کر بیٹھتے تھے اور اس پیوند سے اولاد بھی ہوتی تھی۔ کبھی مؤنث دیوتا کو نوجوان مرد حسین کا حمل بھی رہ جاتا تھا اور اس طرح کی مواصلت سے جو جنس لڑکے پیدا ہوتے تھے وہ آدمے دیوتا سمجھے جاتے تھے۔ غرض یہ کہ مذکر و مؤنث ہر دو طور سے خدا لوگ طبیعت داری سے خالی نہ تھے۔ خواہش نفسانی اُن کی سرشت میں داخل تھی بلکہ کبھی ان کی خواہش نفسانی کو اس قدر جوش ہوتا تھا کہ اگر کوئی عورت بھیڑ بکری چراتی ہوئی جھاڑ پہاڑ میں مل جاتی تھی تو بالجبر بھی رفع ضرورت کر لیتے تھے اہل یونان خود بھی نسوانی معاملات میں ایک خاص انداز رکھتے تھے گو ان کی عورتیں عموماً صاحب عصمت ہوتی تھیں اور زنا اُن کی قوم میں ایک امر نادر سمجھا جاتا تھا۔ مگر عورت کی نسبت اُن کے خیالات اہل اسلام اور دیگر اہل کتاب کی طرح نہ تھے اس وقت میں کوئی شائستہ قوم اس دنیا میں نہیں ہے۔ جس میں ایسا رواج ہو کہ جورو قرض دی جاتی ہو۔ مگر تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضرورت اہل یونان ایسا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار بہت سے یونانی جوان کسی لڑائی پر گئے اور وہاں اُن کو بہت عرصے تک رہنا پڑا۔ اس غیر حاضری کے نتیجہ کو خیال کر کے اُن جوانوں نے بذریعہ پیغام سلام کے مناسب اشخاص کے ساتھ جورؤں کا میعادی بندوبست کر ڈالا۔ علاوہ ایسے قبیح امور کے یونان کے بعض حصے کے باشندے جورو کو اُس نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ جس نگاہ سے ان کے مابعد کی شائستہ قومیں دیکھتی چلی آئی ہیں۔ اہل یونان چوری کو بھی جرم اُسی وقت سمجھتے تھے کہ جب کسی کی چوری پکڑی جاتی تھی لیکن کوئی ایسی چوری جو پکڑی نہ جائے وہ قابلِ تحسین و

آفرین سمجھی جاتی تھی۔ اس قدر اہل یونان کے انداز قومی کو کو ملحوظ رکھ کر اب راقم پہلے ہومر کی ایلیڈ کے قصے کو مختصر طور پر گزارش کرتا ہے اور بعد ازاں آڈیسی کے قصے کو بھی اپنے موقع پر عرض کرے گا۔

قصہ ایلیڈ۔ واضح ہو کہ ایلیڈ کا قصہ بیشتر ایسے مضامین سے تعلق رکھتا ہے جنھیں ابھی راقم نے بالا بین حوالۂ قلم کیا ہے اور اگر پورا قصہ تفصیل وار عرض کیا جائے تو بہت کچھ مضامین بالا سے مطابقت دیکھی جائے گی مگر اس رسالہ مجاز میں اتنی گنجائش کہاں کہ اس کے بیان کو اس قدر طوالت دی جائے بہر حال ایلیڈ کا مختصر قصہ یہ ہے کہ ٹرائے (Troy) کہ جس کا دوسرا نام ایلین (Ilion) بھی ہے ایک شہر تھا جو ایشیائے کوچک کے ساحل پر واقع تھا اس شہر کا ایک بادشاہ تھا۔ جسے پرائم (Priam) کہتے تھے۔ بخت و دولت کے علاوہ اس کے پچاس بیٹے بھی تھے ان میں سے ایک شہزادہ جس کا نام پیرس تھا۔ اتفاق وقت سے یونان کے بادشاہ منیلس (Menelaus) کا مہمان ہوا۔ اس بادشاہ کی ملکہ جو ہلن (Helen) نامی تھی حسن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اس کے شوہر کی غیبت میں پیرس اسے نکال کر اپنے باپ کے ملک میں لے گیا اور جب واپس دینے پر راضی نہ ہوا تو تمام اہل یونان نے یک دل ہو کر شہر ٹرائے پر لشکر کشی کی۔ یونانیوں کے سیکڑوں جنگی جہاز ساحل ٹرائے پر آ لگے محاصرۂ شہر کے ساتھ ہنگامہ جدال و قتال برپا ہوا۔ یہ شہر قلعہ بندی کے قاعدے سے نہایت مستحکم تھا اس کی شہر پناہ نہایت مضبوط تھی۔ اور سامان جنگ بھی افراط کے ساتھ فراہم تھا۔ علاوہ اس کے پرائم بادشاہ کا پسر اکبر جس کا نام ہکٹر (Hector) تھا بہادری اور شجاعت کے ساتھ معاملات

جنگ سے پوری خبر رکھتا تھا۔ جب لشکر یونان نے محاصرہ کیا اور لڑائیاں ہونی گئیں تو اہل ٹرائے نے یونانیوں کو بار بار شکست دی۔ یونانیوں کے اس طرح پر مغلوب ہونے کی اصل وجہ یہ ہوئی کہ ان کا اشجع سردار اکلیز (Achilles) رنجیدہ ہو کر چلا گیا تھا اس سردار کی خلقت مجنس واقع ہوئی تھی کیونکہ اس کا باپ کوئی دیوتا تھا اور ماں بنی آدمؑ سے تھی اس حیرت انگیز آمیزش کے علاوہ اسفندیار کی طرح وہ روئیں تن بھی تھا تیر تبر کسی آلۂ حرب کا اثر اُس کے بدن پر نہیں ہوتا تھا بہرحال اُس کے ناراض ہو کر چلے جانے سے اہل یونان برابر شکستیں اٹھاتے رہے جس کے سبب سے اُنھیں بہت نقصانات جانی و مالی لاحق ہوتے گئے۔ مگر آخرکار جب اکلیز واپس آیا تو اُس نے لڑائی کے دھارے کو پھیرا۔ اہل ٹرائے کے بہت سرداروں کو مارا ہکٹر بھی اُس کے ہاتھ پر گشتہ ہوا۔ اکلیز نے اُس کی لاش کو اپنی جنگی گاڑی سے باندھ کر میدان جنگ میں گھسیٹنا شروع کیا۔ مقتول کا بوڑھا باپ اپنے گرامی فرزند کی لاش کی بے حرمتی دیکھ کر اکلیز کے پاس آیا اور نہایت عاجزانہ طور پر اُس سے پسر کی لاش مانگی جب پرائم لاش لے کر واپس گیا تو اہل ٹرائے نے بڑی توقیر کے ساتھ اُس لاش کو دفن کیا بعد ازاں اکلیز کو پیرس نے مارا ہر چند اکلیز روئیں تن تھا۔ مگر اُس کی ایڑی میں کوئی مقام تھا جو عام بنی آدمؑ کی ساخت رکھتا تھا۔ اس راز سے کوئی شخص واقف نہ تھا الا پیرس جس نے اپنی اطلاع کی وجہ سے اُس اسفندیار وقت کا کام تمام کیا بہرحال یونانیوں نے دس برس تک اس شہر کا محاصرہ قائم رکھا اور آخرکار اُسے فتح کر کے خاک سیاہ کر ڈالا۔ ایلیڈ میں اس پورے محاصرے کا ذکر نہیں دیکھا جاتا ہے۔ لیکن ہومیروس کے عنوان بیان سے

اس لشکر کشی کے ماقبل اور مابعد کے بہت سے احوال نہایت خوبصورتی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ ہومیروس نے اس قصے کو شاعرانہ پیرائے میں بہت طول دیا ہے طرفین کے بڑے بڑے بہادروں کے نام درج کیے ہیں اس ہنگامے کی احوال نگاری میں دیوتاؤں کی کمکیں اور اعانتیں بھی بیان ہوتی گئی ہیں۔ طرح طرح کی بری اور بحری پریاں خیالی جانور اور طرح طرح کے غیر فطرتی معاملات اور بے سروپا معتقدات کے مذکور آتے گئے ہیں۔ اگر سب امور کی تفصیل کی جائے تو ایک جحیم کتاب تیار ہو جائے۔

ہومیروس کی قابلیت شاعری بہرحال اب ہومیروس کی قوت شاعری کو خیال کرنا چاہیے کہ اس شاعر نادر روزگار نے ایک مختصر تاریخی معاملے کو کس طرح پرشاعری کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور اس بیان میں یونانیوں کے پیچ در پیچ معاملات ومعتقدات وغیرہ کو کس اُستادی کے ساتھ پیش نظر کر دیا ہے اگر اس قصے کی وقعت پر نگاہ کیجیے تو برائے خود یہ ایک مہمل قصہ ہے اس قصے میں عظمت و بزرگی و شرافت ونجابت کا مادہ بہت کم ہے نہ یونانیوں کی جانب کوئی بڑی جلالت کی بات دیکھی جاتی ہے نہ اہل ٹرائے کی طرف کوئی امر قابل تعظیم پایا جاتا ہے۔ یہ قصہ ابتدا سے انتہا تک اخلاقی پیرائے سے علٰحدہ نظر آتا ہے ابتدا اس کی ایک ایسے شخص کے فعل سے ہوتی ہے جس کی فطرت میں دغا بازی اور محسن کشی داخل تھی اس شخص نے اپنے اُس میزبان کے ناموس پر نظر ڈالی جو غایت تواضع اور مہمان نوازی کے ساتھ پیش آیا تھا اور جس نے تمام تر اپنے مہمان کی خوش اطواری پر تکیہ کیا تھا یہ مہمان بدتوفیق شاہزادہ پیرس تھا۔ جو مرتکب ایسی سخت دغا بازی کا ہوا پھر اُس عورت کے فعل پر لحاظ کیجیے جو اپنے ایک ممتاز اور عمدہ شوہر کو چھوڑ کر ایک مکار بے آبرو بدکار

شخص کے ساتھ نکل گئی یہ ملکہ ہلن بادشاہ مینلس کی جورو تھی جس نے کچھ بھی اپنے بلند پایہ خوش خصال شوہر کی آبرو کا خیال نہ رکھا۔ بہر حال یہاں تک تو یہ قصہ دغا بازی محسن کشی مکاری، بے حیائی، بدفعلی سے خبر دیتا ہے۔ لیکن آئندہ بھی اس کو دیکھیے تو بہت کم اخلاقی پیرایہ اس کو حاصل ہے۔ چنانچہ جب پیرس اپنے محسن کی جورو کو نکال کر لے گیا تو اپنے باپ کے شہر میں لے گیا۔ باپ صاحب نے بھی یہ طرفہ کام کیا کہ ایسے محسن کش غاصب اور موذی کو اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دی اور وہ نابکار عورت یعنی ہلن ٹرائے کے شاہزادے اور شاہزادیوں میں ہم چشمی کے ساتھ رہنے پائی۔ پیرس کے بھائیوں نے اس عورت کے داخل خاندان ہونے میں کوئی عذر نہیں کیا الغرض کسی کی نگاہ میں پیرس کی دغابازی محسن کشی اور ہلن کی مکاری بدفعلی قبیح نہیں معلوم ہوئی۔ پیرس کی اس حرکت پر یونانیوں کا باہم متفق ہو کر لشکر آرائی کرنا بہت بجا تھا۔ لیکن اس لشکر کشی سے صرف یہ مراد نہ تھی کہ اہل ٹرائے اپنے حق کو پہنچیں بلکہ یہ بھی مرکوز خاطر تھا کہ وہ ناپاک عورت یعنی ہلن اس کے شوہر مینلس کو واپس ملے ظاہر ہے کہ ایسی بازیابی زوجہ کی ایک امر نہایت معذوح ہے۔ کوئی شریف مزاج آدمی اس طرح کی بے وفا، بے آبرو عورت کو واپس لینے کا خیال بھی نہیں کر سکتا ہے لاحول ثم لاحول خیر اہل یونان کی لشکر کشی پر اہل ٹرائے کا فرض منصبی یہ تھا کہ مینلس کی مظلومیت پر خیال کر کے پیرس مع ہلن یونانیوں کے حوالے کر دیتے بالفرض اگر پیرس کو اہل یونان کے حوالے نہیں کرتے تو اسے نفیٔ بلد کر ڈالتے اور ہلن کو اس کے شوہر کو واپس دیتے وہ جس طرح برتاؤ اس بے وفا اور غدّارہ کے ساتھ پسند کرتا کر گزرتا۔ اس کے برخلاف اہل ٹرائے نے پیرس ایسے ظالم اور فاسق کا ساتھ دیا۔ اور

مقاومت کے لیے یونانیوں کے ساتھ جو پایۂ حق پر تھے آمادہ ہوئے اور ناحق کا پلہ اختیار کر کے ایک مدت مدید تک خون خلائق بہاتے رہے اور آخرکار اپنے جان و مال سب کو تباہ کر چھوڑا۔ تماشا ہے کہ اس ہنگامے کے شریک طرفین کے دیوتا بھی ہوتے گئے بعض دیوتا فریقین کے بہادروں کو ہمت دلاتے تھے اور بڑے جوش سے فریقین کو لڑاتے تھے۔ جیسی قوم ہوتی ہے ویسا ہی اس قوم کے دیوتا بھی ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ہو یہ دیوتا بھی جو کوئی مذکر اور کوئی مؤنث تھے۔ پیرس اور ہلن سے طبیعت داری میں کم نہ تھے ان دیوتاؤں کے قصے دیدنی ہیں۔ چونکہ یہ دیوتا آمیزش بنی آدم سے بندے بھی پیدا کرنا جانتے تھے اُن کے جنے آدمی دیوتا مانے جاتے تھے۔ منجملہ ایسے مجنس افراد کے اکلیز بھی تھا جو سرآمد شجاعان یونان سمجھا جاتا تھا چنانچہ اس کے ہاتھ سے اہلِ ٹرائے کو بڑے صدمے پہنچتے گئے اگر اس شخص کی شجاعت پر غور کیجیے تو اس کی شجاعت کچھ بھی اخلاقی پیرایہ نہیں رکھتی تھی اس کی مغلوب الغیظی کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی ہے اور اس کی بے رحمی حد سے گزری ہوئی نظر آتی ہے اس کی شجاعت درندوں کی سی تھی انسانیت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے جب ہکٹر کو مارا تو اس کی لاش کو اپنی جنگی گاڑی میں باندھ کر گھسیٹنا شروع کیا۔ اس بداخلاق کے دل میں یہ بھی خیال نہ گزرا کہ ہم نبرد کشتہ کے ساتھ ایسا فعل کس مذہب میں جائز ہو سکتا ہے اور ہم نبرد بھی وہ کہ جو فی الحقیقت ایک سچا بہادر اور صاحب وقعت شخص تھا۔ المختصر ایلیڈ کا قصہ تو ہر پہلو سے اس طرح کا ناپاک اور مہمل ہے۔ مگر ہومیروس کے حسن طبیعت نے اس کو عجب جلوہ دیا ہے کہ بخیال راقم جس کسی نے ایلیڈ کو نہیں پڑھا اس نے گویا شاعری کا لطف اٹھایا ہی نہیں بے ایلیڈ

کے پڑھے کوئی شخص بیاس، بالمکی، فردوسی، ملٹن اور میر انیس کا قدردان ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرکیف یہ قصہ جو کچھ اخلاقی نگاہ سے بُرا ہو۔ ہومیروس نے زور طبیعت سے اُسے ایسا خوب بنا رکھا ہے کہ زبان اُس کی تعریف و توصیف سے قاصر ہے اُس شاعر جادو بیان نے اس نظم مبسوط کی ترتیب میں آبجکٹو (Objective) اور سبجکٹو (Subjective) یعنی خارجی اور داخلی دونوں قسم کی شاعری کا لطف دکھلایا ہے معاملات خارجیہ اور ذہنیہ دونوں کو بڑی نبعیت فطرت کے ساتھ حوالہ قلم کیا ہے اور جہاں جہاں آبجکٹو اور سبجکٹو مضامین کی آمیزش کی حاجت پڑی ہے۔ وہاں عجیب ندرت کے ساتھ دونوں کو مرکب اور ممزوج کیا ہے لڑائیوں کے نقشے ایسے کھینچے ہیں کہ اہل یونان کی سپہ گری اور لشکر آرائی کا زمانہ پیش نظر معلوم ہوتا ہے فریقین کے اشخاص نامی کے انداز مزاج و کردار ایسی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیے ہیں کہ جس سے اعلیٰ درجہ کی مردم شناسی کا اظہار متصور ہے۔ جہاں معاملات خارجیہ کو امور ذہنیہ کے ساتھ ترکیب دیا ہے وہاں عجیب پُر تاثیر سماں دکھلایا ہے مثلاً وہ مقام جہاں ہکٹر اور اُس کی زوجہ آپس میں کلام کر رہے ہیں ہکٹر کی زوجہ کا نام اندرومکی (Andromache) ہے۔ یہ عورت علاوہ حُسن و جمال کے نہایت فہمیدہ نیک مزاج اور عفیفہ تھی۔ ایسی عورت کو اپنے شوہر سے جو کچھ تعلق قلبی نہ ہو تھوڑا ہے پھر شوہر بھی کیسا کہ کمالات صوری و معنوی سے بھرا ہو قلم میں اتنی قدرت کہاں کہ ہومیروس کی اس قوت شاعری کی داد دے سکے۔ جو ہکٹر اور اندرومکی کے باخودہا کی گفتگو سے آشکارا ہے۔ ہومیروس نے ان دونوں کو آپس میں گفتگو کرتے دکھلایا ہے۔ اور اس بیان میں شاعری کے آبجکٹو اور سبجکٹو دونوں پہلو کا خاتمہ کر ڈالا ہے سبحان اللہ

کیا شاعری ہے۔ شاعری نہیں ہے سحر ہے۔ سحر بھی نہیں ہے خدا جانے کیا ہے راقم کو
اس قدر موقع حاصل نہیں ہے کہ پورا ترجمہ اُس بیان کا یہاں بخدمت ناظرین میں پیش
کرے اگر کاش پورا ترجمہ درج ہوتا تو کچھ اندازہ ہومیروس کی جادو بیانی اور شیریں بیانی
کا ممکن تھا بہر حال کسی قدر ہکٹر اور اندرومیکی کی ہم کلامی کا خلاصہ ذیل میں عرض کیا
جاتا ہے جس سے ہومیروس کی مضمون آفرینی خوش مذاقی طباعی اور فطرتی زور
شاعری کا ناتمام طور پر اظہار متصور ہے۔

ہم کلامی ہکٹر و اندرومیکی جب اکلیز ناراضی کی وجہ سے یونانیوں کو چھوڑ کر میدان
ٹرائے سے چلا گیا تو اُس کی غیبت میں اہل ٹرائے
یونانیوں پر فتحیاب رہا کئے ہر مقابلے میں یونانیوں پر غالب آتے گئے اور کثرت فتح سے
یونانیوں کو ششدر کر ڈالا۔ مگر جب اکلیز واپس آیا اور شریک کارزار ہوا۔ اس وقت
سے اہلِ ٹرائے کو شکست پر شکست ہونے لگی بہر حال چونکہ ہکٹر ایک نہایت بہادر
شخص تھا اُس نے کوئی بے دلی ظاہر نہیں کی اور حتی الوسع ٹرائے کے محفوظ
رکھنے میں کوشاں رہا۔ مگر یونانیوں کا غلبہ بڑھتا ہی گیا۔ اسی حالت میں کہ ٹرائے پر
مغلوبیت غالب تھی۔ ہکٹر اپنے محل کی طرف گیا اور اپنی زوجہ کو تلاش کیا۔ اندرومیکی
کو محل میں نہ پایا تو تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا جہاں وہ تھی وہ ٹرائے کے لشکر کی
بدحالی کو دریافت کرکے ٹرائے کے ایک دروازے پر جس کا نام ایلین تھا کھڑی
ہوئی بڑے تعلق خاطر کے ساتھ انداز جنگ کو تجویز کر رہی تھی اس کے ساتھ ایک
دایہ بھی تھی جس کی گود میں ایک طفل شیرخوار تھا اور جو بطن اندرومیکی سے ہکٹر کا پسر
اصغر تھا۔ اس جگہ زن و شو میں ملاقات ہوئی تو ہکٹر کے جنگی خیالات اُس آن میں

محبت و شفقت کے ساتھ مبدل ہو گئے مگر جو واقعہ ہکٹر کو پیش آنے کو تھا اندرومیکی کی
آنکھ میں پھر گیا اور دل کے بھر آتے با چشم نم اُس نے شوہر سے یوں خطاب کیا۔ کہ
اے شہزادے تو بے حد دلیر ہے تجھ کو زن و فرزند تک کا خیال نہیں رہتا ہے۔
اس طرح کی شجاعت شعاری طول عمر سے خبر نہیں دیتی ہے کیا تجھے نہیں معلوم ہے
کہ تیرے مرنے سے ہم بیوہ اور یہ لڑکا یتیم ہو جائے گا تیری صفات حمیدہ ترے
قتل کا سبب ہوں گی تو بڑا بہادر ہے مگر جب تک تجھ سے دیران یونان فرداً فرداً جنگ
آزما ہوئے ہمیشہ مغلوب رہے اب سب کے سب ایک بار یورش کرنے لگے اس
طرح کی یورش میں تو تیری جانبری دشوار نظر آتی ہے اے دیوتاؤ قبل اس کے
کہ میرے ہکٹر پر ایسا واقعہ گزرے مجھے تم اٹھا لو کہ مجھے ایسا روز سیاہ دیکھنا نصیب
نہ ہو اگر ایسا واقعہ مجھ پر گزرا تو میری زندگی جس تلخی کے ساتھ شروع ہوئی تھی اُسی
تلخی کے ساتھ ختم ہو گی۔ اب نہ میرے باپ ماں ہیں اور نہ کوئی بھائی۔ میرا باپ
تھیبس (Thebes) کا بادشاہ تھا۔ اسی اکلیز نے اُس کا اور میرے بھائیوں کا خاتمہ
کیا۔ جس غم میں میری ماں بھی مر گئی ابھی تک تو ہم کو یہ تشفی کی صورت ہے کہ میرا ہکٹر
زندہ ہے اسی ہکٹر میں باپ ماں بھائی عزیز اقارب سب کے بدل کی شکل پیدا ہے
اگر کہیں اے ہکٹر تو مارا گیا تو یہ سب عزیزاں میرے دوبارہ سر نو سے مارے
جائیں گے تیرے زن و فرزند سب کے سب اس وقت تیرے درد کے شریک
ہیں تو ہم لوگوں کا حق ادا کر اور میدان جنگ میں جانے کے عوض شہر پناہ کے اُس
حصے کی محافظت کر جہاں تو دیکھتا ہے کہ ایک انجیر دشتی کا درخت قائم ہے
اُس جانب بار بار یونانی افواج حملہ آور ہوئی ہے اور ہو رہی ہے بڑی مصلحت ہے

کہ تو اندر شہر پناہ کے رہ کر شہر کی محافظت کرے اپنی بیگم کی اس گفتگو کو سن کر ہکٹر نے جواب دیا کہ ہم اُس جانب کی شہر پناہ کی حفاظت کریں گے اور نہ اُسی کی بلکہ جتنے معاملات جنگ ہیں سب پر اپنی توجہ مبذول رکھیں گے اس وقت میدان جنگ سے میر اکنارے رہنا ہمارے آبائی نام و نشان کے منافی ہوگا اس میں ٹرائے کی سخت بے آبروئی متصور ہے ہم نے بچپن سے فوجی تعلیم پائی ہے جدال و قتال کی زحمت میرے سامنے کیا ہے ہماری شجاعت ہم کو میدان جنگ کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے اور یہ ہمارا فرض منصبی ہے کہ ہم اپنے باپ اور اپنی اولوالعزمی کی شہرت کو قائم رکھیں۔ اگر میرے نصیب میں مارا جانا ہے تو کوئی ہم کو موت سے بچا نہیں سکتا ہے۔ مگر اس بات کو خیال کر کے البتہ دل بھر آتا ہے کہ ٹرائے برباد ہو جائے گا۔ اُس کے شجاع مارے جائیں گے اور اس کے جلال و ثروت کا خاتمہ ظہور میں آئے گا۔ ہم اپنے بوڑھے باپ ماں کی مصیبتوں کو بھی خیال کرتے ہیں مگر میرے غم کی مد اُس وقت کچھ نہیں معلوم ہوتی ہے کہ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہمارے بعد تو گروہ اُسارا میں داخل ہوگی تو لرزاں نالاں گریاں رہے گی اور تجھے اعدا کشاں کشاں لے جائیں گے اسیری کی حالت میں دشمن تجھ سے چرخہ کتوائیں گے کپڑے بنوائیں گے۔ اور ان کپڑوں پر ان لڑائیوں کی تصویریں کشیدہ کرائیں گے اور جو آلام کہ ہم پر گزر رہے ہیں اور جن آلام کی تو شریک اعظم ہو رہی ہے ان سب معاملات اندوہ و غم کے سماں تجھ کو منقش کرنے کو کہیں گے تجھ سے پانی بھی بھروائیں گے اور جس وقت تو ایسی سخت زندگی کے بار کے تلے کراہے گی۔ اعدا طعن سے پکار پکار کر کہیں گے کہ دیکھو دیکھو ہکٹر تو ی ہنجبہ کی یہی جورو ہے۔ اس طور پر جب

کوئی اہلِ یونان سے ہمارا نام لے گا تو اس وقت تجھ پر کیا گزرے گی۔ ثروت گزشتہ تجھے یاد آئے گی اس وقت تجھے شرم پیدا ہوگی۔ ہزار رنگ سے غم والم تیرے سامنے آکھڑے ہوں گے۔ اپنی یہی دعا ہے کہ ہکٹر کو ایسا دن دیکھنا نصیب نہ ہو اور ایسا ہی ہوگا کہ اے اندرومیکی تیرا ہکٹر اس وقت کے کب نہ پہلے خواب عدم میں آرام کرچکے گا۔ راقم اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہے۔ حضرات ناظرین اس قلیل سی ہومیروس کی جادو بیانی کا موازنہ فرمالیں کہ یہ شخص کس درجے کا شاعر تھا۔ اہلِ یورپ اسے ابوالشعرا ایسے وجہ نہیں کہتے ہیں۔ اوّل تو یورپ میں اس شاعر کے پہلے کوئی شاعر نہیں گزرا۔ دوم یہ کہ اس کی شاعری اس درجے کی ہے کہ اُس تک کم کسی شاعر رزمی کی شاعری پہنچی ہے اگر سچ پوچھیے تو ہومیروس کی خوبیوں کو ورجل، فردوسی اور ملٹن بھی نہیں پہنچتے ہیں شعرائے ہنود میں بیاس اور بالمکی البتہ جواب ہومیروس کا ہیں۔ اور بدانست راقم ہومیروس سے مرجح اگر کوئی شاعر ہے تو میر انیس ہیں۔ انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ ان اساتذہ کا ذکر آتا ہے۔ جس سے راقم کے قول بالا کی تصدیق ہو جائے گی۔

ہومیروس کی دماغی قوت راقم نے جس قدر ایلیڈ کی نسبت مضامین بالا میں درج کیے ہیں اُن سے ہومیروس کی شاعری کا اندازہ پورے طور پر نہیں ہوتا ہے۔ مگر حضرات ناظرین معاف فرمائیں گے اس لیے کہ اس سے زیادہ اس رسالے میں گزارش کا موقع حاصل نہ تھا بہر حال کتاب ایلیڈ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہومیروس شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ بہت وسیع اور قوی دماغ رکھتا تھا اسی قوت دماغی کی بدولت اس شاعر نے ایک نامحمود قصے کو بڑی خوب صورتی

کے ساتھ حکمت آموز پیرایہ بخشا ہے بلا شبہ اُس نے اس قصّے کے معائب سے خوبیوں کی شکلیں پیدا کی ہیں ایک کم صلاحیت شاعر اس قبیح قصّے کو اقبح شکل بنا ڈالتا واقعی ہومیروس نے یہ بڑا کمال دکھلایا ہے کہ ایک بڑے قصّے کو باوجود لاحق رہنے مذہبی تمدنی اور اخلاقی نقصانات کے اس قدر صاف اور پاکیزہ صورت بخشی ہے ایلیڈ ایک بڑے بکھیڑے کی کتاب معلوم ہوتی ہے اس کی پریشانی خیالات کی کوئی حد نظر نہیں آتی ہے یہ ہومیروس ہی کا کام تھا کہ اس نے اس قدر اُلجھے خیالات کو سلجھایا ہے اور نامربوط غیر منتظم مضامین میں ربط و نظم پیدا کیا ہے۔ ہومیروس کی شاعری کی تعریف میں یہی کہنا بس ہے کہ یورپ کے مابعد کے شعرا کے لیے ہومیروس خضرِ راہ ہوا ہے اور واقعی ایسا ہی ہے کہ ہر پہلو سے ایلیڈ کی شاعری اُستادی کا جلوہ دکھلاتی ہے۔

قصّہ آڈیسی — ہومیروس کی دوسری تصنیف جس کا نام آڈیسی (Odyssey) ہے۔ ایلیڈ کے بعد لکھی گئی تھی ہر چند یہ کتاب بہت کچھ لطف شاعری رکھتی ہے مگر ایلیڈ کے پایۂ شاعری تک نہیں پہنچتی ہے۔ آڈیسی کا قصّہ بھی بجائے خود مربوط اور منتظم انداز کا نہیں ہے مگر ہومیروس کی شاعری نے اُسے بہت کچھ قابل توجہ بنا ڈالا ہے۔ آڈیسی میں یولیسس کا قصّہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہنگامہ ٹرائے کے بعد جب یولیسس (Ulysses) اپنے جزیرہ آئی تھاکا (Ithaca) کو جس کا وہ بادشاہ تھا واپس آنے لگا تو اُس کو عجیب پریشانیاں اور سرگردانیاں نصیب ہوتی گئیں۔ سات برس تک وہ جزیرہ اوجیجیا (Oggejia) میں ایک دریائی پری کا جس کا نام کیلیپسو (Calypso) تھا قیدی رہا اس عرصے میں اُس کے اہلِ وطن نے یہ سمجھا کہ یولیسس فوت ہو گیا اور اس قیاس کی بنیاد پر

اُس کی زوجہ پنیلوپ (Penelope) سے بیاہ کرنے کے لیے تو اُس سے زیادہ اشخاص نے آمادگی ظاہر کی ان خواستگاران ازدواج میں ہمیشہ باہم جھگڑے برپا رہتے تھے اور پنیلوپ کا گھر دارالفساد ہو رہا تھا یہاں تک کہ قید ہفت سالہ کے بعد یولیسس آ پہنچا اور تمام مفسدوں کو ہلاک کر کے اپنے گھر کو فتنہ و شر سے پاک کر ڈالا مختصر قصہ آڈیسی کا یہی ہے اس میں بھی دیوتا اور پری کے بیانات دیکھے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ایلیڈ میں ایسے بیانات بکثرت موجود ہیں خیر یہ قصہ جو کچھ نامربوط یا نامطبوع رنگ رکھتا ہو۔ مگر ہومر کی شاعری نے اس کو بھی نہایت دلچسپ پیرایہ بخشا ہے اور لاریب یہ کتاب بہت کچھ اہل فن کی توجہ کے قابل ہے۔

واضح ہو کہ ایلیڈ کی شاعری رزمی انداز رکھتی ہے جیسا کہ دیگر شعرائے یورپ مثلاً ورجل (Virgil) ملٹن (Milton) یا ایشیائی شعرا مثلاً فردوسی میر انیس بیاس و بالمکی رزمی شاعری کا جلوہ دکھلاتے گئے ہیں۔ ان رزمی شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے مذکور آئندہ آئیں گے۔ مگر یہاں چونکہ یونانی شعرا کا ذکر پیش ہے اور یہ یونانی شعرا کوئی رزمی اور کوئی بزمی اور کوئی ڈراما نگار (Dramatists) گزرے ہیں۔ اس لیے ضرور ہے کہ کچھ ان اقسام شاعری کا بیان سر دست کیا جائے۔

بزمی شاعری مشتمل لیرکس یعنی غزل سرائی پس جاننا چاہیے کہ ان شاعریوں سے ایک قسم شاعری کی ہے۔ جسے لیرکس (Lyrics) کہتے ہیں اس قسم کو فارسی اور اُردو کی غزل سرائی سے اک گونہ مناسبت ہے۔ بلکہ درحقیقت جو تقاضا اہل یورپ کے لیرکس کا ہے وہی ہم لوگوں کی غزل سرائی اور تمام دنیا کی اُس شاعری کا ہے جسے لگاؤ میں سائیدن کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال جاننا چاہیے

کہ لیرکس کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں ایسے مضامین داخل رہیں کہ جو داخلی یعنی سبجکٹو (Subjective) انداز رکھتے ہیں اور اگر خارجی (Objective) رنگ رکھتے بھی ہوں تو داخلی انداز سے آمیزش پائے ہوں اگر لیرکس میں شاعر اس آمیزش کے ساتھ خارجی مضامین کو حوالۂ قلم نہ کرے گا تو اس کا کلام بے مزہ ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ بعض فارسی اور اُردو شعرا کی غزل سرائی مطبوع نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ایسے غزل سرایان نے برخلاف تقاضائے غزل سرائی مضامین خارجی کو بلا آمیزش رنگ داخلی اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ جس کے سبب سے اُن کی اکثر غزلیں روکھی سوکھی درد سے خالی بے اثر اور محض بے کیف معلوم ہوتی ہیں۔ لیرکس اور غزل سرائی کے لیے ضرور ہے کہ واردات قلبیہ اور پُر تاثیر امور ذہنیہ حوالۂ قلم کیے جائیں۔ اس طرح کی شاعری کے لیے شاعر کو اپنا عالم درونی کافی ہوتا ہے اُسے کوئی حاجت نہیں ہے کہ اپنے احاطۂ ذہنیہ سے باہر جائے اُس کا ذہن ہی اُس کی دنیا ہوتا ہے اسی کے اندر وہ سب کچھ دیکھتا ہے اور جو کچھ دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے اُسے حوالۂ قلم کرتا ہے جتنے اس کے کلام ہوتے ہیں اُس کے واسطے کلیات کا حکم رکھتے ہیں گو اُس کے وہ کلام کلیات کے طور پر دیگر افراد انسانی کے امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ پر بھی صادق آئیں بالمختصر لیرکس یا غزل سرائی کو عالم خارج سے بہت کم تعلق ہے اس کی شاعری شخصی انداز رکھتی ہے یعنی جو کچھ شاعر پر گزرتی ہے یا جو کچھ اس کی واردات قلبیہ ہوتی ہیں اُنھیں کو قلم بند کرتا ہے۔ اور شروع سے آخر تک۔ اُس کا کام یہ ہے کہ خود سرائی کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور جو کچھ موزون کرے اس میں اپنے کو نہ بھول لے اپنے تشخص پر غیر تشخص کو قائم نہ کرے ورنہ اس کا کلام بے تاثیر ہوگا اسی صلاحیت کی بدولت حافظ، خواجہ

میر درد، میر تقی، مومن اور غالب کے کلام اس قدر پُر تاثیر دیکھے جاتے ہیں اگر یہ شعرا اپنی ذاتی واردات قلبیہ کو نہیں تحریر کیے ہوتے تو اس قدر اُن کے کلاموں میں مقبولیت نہ ہوتی ان شعرا کا ایک ایک مصرع بول اُٹھتا ہے کہ میں حافظ ہوں۔ میں درد ہوں۔ میں میر ہوں۔ میں مومن ہوں۔ میں غالب ہوں۔ فطرت نے اُن کو اور اُن کے ایسے شعرا کو غزل گو بنانے کے وقت اُن کے کانوں میں غزل گوئی کا گُر اِن لفظوں میں سکھلا دیا تھا کہ غزل سرائی کا دُوسرا نام خود سرائی ہے

تقاضائے رزمی شاعری برخلاف اس کے رزمی شاعری یعنی ایپک (Epic) ہے کہ جس میں شاعر کو اپنی ذاتی حیثیت سے بہت کنارے ہونا پڑتا ہے اور کلیات سے جزئیات کی طرف رجوع لانا پڑتا ہے۔ ہم لوگ ایشیائی اہل اسلام میں یہ شاعری بیشتر مثنوی کی شکل میں دیکھی جاتی ہے۔ جیسے شاہنامہ فردوسی، سکندر نامہ نظامی، حملہ حیدری وغیرہ یا بندات کی صورت میں جیسے بندات مراثی میر انیس و مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہما فی الجنہ بہر حال ایپک شاعری میں شاعر کو جس قدر مضامین عالم خارج سے لینا ہوتا ہے۔ اُسی قدر اسے عالم درونی سے بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ پھر دونوں کی آمیزش بھی اُسے کرنا ہوتا ہے۔ مختلف افراد انسانی کے جیسے شخصی تقاضے ہوتے ہیں اُنھیں ملحوظ رکھنا رزمی شاعر کا کام ہے رزمی شاعری اسی کی متقاضی ہوتی ہے کہ شاعر خودی کو جہاں تک ممکن ہو بھول جائے اور اپنے شخص پر غیر اشخاص کو قائم کرے جیسا کہ ہومر و ٹس نے ایلیڈ میں تمام تر اپنے کو اپنی ذاتی حیثیت سے کنارہ کیا ہے اور جتنے اشخاص کا ذکر کیا ہے ان کے جزئی اور مختص حالات درونی و بیرونی کو قلمبند کیا ہے یعنی ہر شخص کی تصویر جیسی در کار تھی کھینچی ہے مثلاً اگر اکلیز کو بیان کیا ہے

تو معلوم ہوتا ہے کہ اکلیز ایک شخص محض علیحدہ انداز کا یولیسس وغیرہ سے ہے۔ اور جہاں ہلن کو بیان کیا ہے تو وہ انڈرومیکی سے بالکل ایک جدا انداز کی عورت معلوم ہوتی ہے اسی طور پر ہر خاص شخص کے خاص معاملات کو اس طور پر دکھلایا ہے کہ وہ معاملات خواہ درونی اور خواہ برونی ہوں سوا ایک شخص خاص کے دوسرے شخص پر صادق نہیں آتے ہیں اس طرز بیان کو کیرکٹر نگاری کہتے ہیں کیرکٹر (Character) زبان انگریزی میں ایسے طور اطوار کو کہتے ہیں جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممیز کرا دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی کیرکٹر نگاری ہے جس نے میر انیس کی شاعری کو بے حد ممتاز بنا رکھا ہے یہی کیرکٹر نگاری ہے کہ جس نے بالمکی اور بیاس کو مشہور عالم کیا ہے اور یہی کیرکٹر نگاری ہے کہ جس کی عدم موجودگی سے فردوسی کی شاعری ہومیروسس ورجل، ملٹن، بیاس، بالمکی اور میر انیس کی شاعری کو نہیں پہنچتی ہے۔

ڈراما۔ واضح ہو کہ ہومیروسس کی کیرکٹر نگاری اس درجہ کی نظر آتی ہے کہ جو نہایت اعلیٰ درجے کی ڈراما نگاری کے لیے درکار ہے ڈراما (Drama) بزبان انگریزی ناٹک کو کہتے ہیں یہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی شاعری ہے۔ رزمی شاعری اور ڈراما کی شاعری میں فرق یہی ہے کہ رزمی شاعری سے زیادہ ڈراما کی شاعری میں جزئیات معاملات انسانی کا لحاظ رکھنا درکار ہوتا ہے اور افراد انسانی جو کسی ڈراما سے متعلق ہوتے ہیں ان کے پورے کیرکٹر کو اُن کے ہر جزوی افعال و اقوال کے مطابقت کے ساتھ حوالۂ قلم کرنا ہوتا ہے علاوہ اس کے رزمی شاعری میں شاعر کسی قصے کو بسبیل نقل و حکایت بیان کرتا ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے اُس قصے کے افراد انسانی کے کیرکٹروں کو ملحوظ رکھ کر اپنے بیان کو جلوہ دیتا ہے۔ ڈراما میں وہی قصہ بسبیل نقل و حکایت نہیں بیان ہوتا ہے۔ بلکہ وہی افراد انسانی

جو اس قصّے سے متعلق رہتے ہیں تا وسعت تعلق ذاتی اپنے اقوال و افعال سے اُس قصّے خود بیان کرتے ہیں۔ قوت تخیّل سے شاعر اپنے کو ہر فرد کا قائم مقام بناتا ہے اور جیسے وہ افراد ہوتے ہیں ویسا ہی اپنے کو قولاً و فعلاً دکھلاتا ہے۔

غرض ڈراما۔ غرض ڈراما یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ درجے کی تعلیم نصیب ہو وعظ و نصیحت سے بھی وہ کام نہیں نکل سکتا ہے۔ جو اس شاعری سے ظہور میں آ سکتا ہے۔ شاعر ڈراما نگار کا یہ کام ہے کہ کوئی ممتاز قصہ حکایت یا واقعہ اس طرح بیان کرے جیسا کہ فطرت اس کے بیان کی متقاضی ہے تاکہ اُس کے بیان سے معاملات عالم کا فطری انداز ہویدا ہو سکے۔ ڈراما منتہائے شاعری ہے اور کوئی شخص ڈراما نگار نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ جزئیات معاملات دنیا سے فطری اصول کے ساتھ باخبر نہ ہو ڈرامے کے لیے قصّے یا حکایت یا واقعے کا اس قدر اہم ہونا ضرور ہے کہ وہ معمولی حیثیت کے معاملات سے ارفع ہو اور خاتمہ اس کا کوئی نتیجہ معقول جو خواہ مسرّت خیز اور خواہ الم انگیز ہو پیدا کر سکے۔

کامیڈی۔ جو ڈراما مسرّت خیز نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اُسے بزبان انگریزی کامیڈی (Comedy) کہتے ہیں اس کی مثال شیکسپیر کا وہ پلے (Play) ہے جس کا نام کامیڈی آف ایررس (Comedy of Errors) ہے۔ پلے بزبان انگریزی ایک ایسے پورے قصّے کو کہتے ہیں جو بشکل ڈراما لکھا گیا ہو۔

ٹریجیڈی۔ اس خاص پلے کا خاتمہ مسرّت و انبساط پر ہوا ہے۔ لیکن وہ ڈراما جس کا نتیجہ الم خیز ہو اُسے بزبان انگریزی ٹریجیڈی (Tragedy) کہتے ہیں اس کی مثال شیکسپیر کا وہ پلے ہے جس کا نام ہیملٹ (Hamlet)

چونکہ زبان عربی و فارسی میں ڈراما نگاری نہیں دیکھی جاتی ہے اس واسطے کوئی مثال کسی

پہلے کی پیش نہیں کی جا سکتی ہے۔

اسلامی شعرا میں عدم ڈرامانگاری

افسوس ہے کہ یہ صنف شاعری ایشیائی مسلمانوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔ علاوہ افسوس کے بہت جائے تعجب ہے کہ اہل اسلام نے یونان کے تمام علوم و فنون کو اختیار کیا مگر ان کی شاعری کی طرف توجہ نہیں کی اگر کرتے تو ضرور یونانی ڈرامانگاروں کے طریقۂ شاعری کو اختیار کرتے اس عدم توجہ کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اپنے کو معاملۂ شاعری میں کسی قوم سے کم نہیں سمجھتے تھے اس واسطے غیر قوم سے اکتساب شاعری کو بے کار جانا یا یہ کہ چونکہ اہلِ اسلام اہل یونان کے مذاق بت پرستی سے بہت دور تھے اور اہلِ یونان کی شاعریاں اس مذاق سے مملو تھیں۔ انھوں نے یونانی شاعری کی طرف توجہ کرنا خلاف مصالح مذہبی سمجھا خیر جو سبب ہو جب اہلِ عرب نے معاملۂ شاعری میں کسی طرح کی اعانت بیرونی کو روا نہ رکھا تو اہلِ فارس نے بھی اپنے ملکی انداز شاعری پر قناعت کی پھر بے چاری اردو جو فارسی کی محض متتبع ہے کیا انحراف ورزی اختیار کرتی۔ اہلِ اسلام کا ڈرامانگاری کو اختیار نہ کرنا افسوس انگیز امر ہے بلاشبہ انھیں اس صنف شاعری کے اختیار کرنے کا موقع برابر ملتا گیا اس پر بھی وہ اس کی طرف مائل نہ ہوئے۔ اوّل تو انھیں علوم یونان سے سابقہ پڑا۔ دوم یہ کہ اہلِ اسلام ہندوستان میں آئے اور حکمران ہندوستان ہو کر ہندوؤں سے شیر و شکر ہوئے اور ان کے محصل اور ممتاز اشخاص جیسے فیضی اور عبدالرحیم خان خاناں اور علامہ بدایونی وغیرہ علوم سنسکرت سے بہرہ مند ہوتے گئے اس پر بھی اُن میں سے کسی نے ڈرامانگاری کی طرف توجہ نہیں کی۔ حالانکہ سنسکرت کی ڈرامانگاری اس درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ اہل یونان کی ڈرامانگاری کا جواب ہو رہی تھی بلکہ اُس سے

بھی نشیاگ زائد بڑھی ہوئی تھی اور اس لیے بلا گفتگو بہت قابل توجہ متصور تھی لاریب اہل اسلام اس صنف شاعری کو رواج دینے کے موانع برابر پاتے گئے مگر افسوس ہے کہ کسی عہد ماضی میں اس کی طرف مائل نہ ہوئے اگر کاش اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کیے ہوتے تو اس وقت اسلامی شاعری اہل یونان اہل رُوم یا اہل ہند کی شاعری سے بلند پائیگی میں کم نہ ہوتی بہر حال جائے مسرت یہ ہے کہ اب ملک ایران میں ڈراما نگاری کی ابتدا ہوئی ہے خوب ہو اگر شعرائے حال کے اس صنف شاعری کی طرف متوجہ ہوتے سے فارسی کی شاعری کا تکملہ ظہور میں آئے۔

ایران میں ابتدائے ڈراما نگاری

واضح ہو کہ ڈراما نگاری کے بغیر کسی زبان کی شاعری درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی ہے اگر اہل فارس کو ڈراما نگاری کا مذاق پیدا ہوا تو امید قوی ہے کہ شعرائے فارسی کی نامطبوع مبالغہ پردازیاں بھی رخصت ہو جائیں گی کس واسطے کہ ڈراما نگاری میں تبعیت فطرت کی بڑی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ تبعیت فطرت منافی مبالغہ پردازی ہے فارسی کی شاعری جو مبالغہ پردازیوں کے باعث معیوب ہو رہی ہے نہایت اصلاح کی حاجت رکھتی ہے اس کی اصلاح ڈراما نگاری کے بغیر غیر ممکن الوقوع ہے۔ خیر اگر اب بھی اہل اسلام ڈراما نگاری کی طرف میل فرمائیں تو بہت غنیمت ہے اس وقت تک کی ان کی ناتوجہی بہت حیرت خیز امر ہے۔ جاننا چاہیے کہ ڈراما نگاری شاعری کا خاتمہ ہے۔

شعرائے سنسکرت کی ڈراما نگاری

زبان سنسکرت میں ڈراما نگاری ایسے اعلیٰ درجے کی دیکھی جاتی ہے کہ بہت محققوں کی یہ رائے ہے کہ اب تک کسی قوم نے چہ ماضی و چہ حال

اس صنف شاعری میں اس کے برابر ترقی نہیں کی ہے یورپ میں بلکہ تمامی دنیا میں شیکسپیر شاعر انگلستان بہترین ڈراما نگار سمجھا جاتا ہے اور واقعی اس کی ڈراما نگاری کچھ ایسے الہامی درجے کی معلوم ہوتی ہے کہ اُس کے کمالات کو دیکھ کر عقل انسانی مبتلائے حیرت ہوتی ہے مگر اب بعد تحقیق ایسا معلوم ہونے لگا ہے کہ زبان سنسکرت کا ڈراما نگار شاعر کالی داس یا شیکسپیر کا ہم پہلو ہے یا شیکسپیر سے بھی بلند تر رتبہ رکھتا ہے۔ اسی سے سنسکرت کی شاعری کے رتبے کو قیاس کرنا چاہیے کہ اس زبان میں کالی داس سا ڈراما نگار دیکھا جاتا ہے اور بیاس مصنف مہا بھارت اور بالمکی مصنف رامائن سے رزمی شاعر پائے جاتے ہیں بخیال مؤلف کسی زبان میں سنسکرت سے بہتر شاعری نہیں دیکھی جاتی ہے خاص کر ڈراما نگاری کہ کہیں جواب نہیں رکھتی ہے اُس کی رزمی شاعری کا بھی جواب کمتر نظر آتا ہے ہومر اور ملٹن بیاس اور بالمکی کے پورے جواب نہیں ہیں ہاں اگر کوئی شاعر جواب میں پیش کیا جاسکتا ہے تو میر انیس ہیں کاش اگر کوئی ڈراما نگار اردو کا شاعر اسی درجے کا جس درجے کے میر انیس رزمی شاعر گزرے ہیں زبان اردو میں ظہور کیے ہوتا تو لاریب دنیا میں سنسکرت کی شاعری کے بعد اردو ہی کی شاعری کا درجہ ہوتا اس صنف شاعری کی معدومی سے عربی، فارسی اور اردو کی شاعریاں نامکمل حیثیت رکھتی ہیں۔

فارسی اور اردو کی مثنویاں جو کامیڈی اور ٹریجیڈی پیرایہ رکھتی ہیں

بالمختصر معدومی ڈراما نگاری سے کامیڈی اور ٹریجیڈی کی مثالیں ڈراما کی صورت پر عربی، فارسی اور اردو کی شاعریوں سے پیش نہیں کی جاسکتی ہیں لیکن کامیڈی اور ٹریجیڈی کے انداز کو سمجھانے کے واسطے بعض مثنویوں کا بیان ذکر کیا جاتا ہے۔ جو اگرچہ وضع ڈراما

لکھی جاتیں تو کامیڈی اور ٹریجیڈی کی شکلیں پیدا کریں مثلاً مثنوی، یوسف زلیخا کہ جس میں ایک ایسے قصے کا بیان ہے کہ جس کا نتیجہ مضامین مسرت انگیز پر مشتمل ہے۔ یعنی وہ قصہ پہلے حضرت یوسفؑ کی پریشانیوں کو اور حضرت یعقوبؑ کے مبتلائے رنج و آلام ہونے کو بیان کرتا ہے اور آخر کار حضرت یوسفؑ کے ثروت کو پہنچنے اور حضرت یعقوبؑ کے ملنے سے خبر دیتا ہے ایسا قصہ کہ جس کا خلاصہ یہ ہو کہ

پیرے بود پیرے داشت گم کرده بود باز یافت

سوا مسرت انگیز ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے اسی پر مثنوی میر حسن کے قصے کو بھی قیاس کرنا چاہیے کہ وہ بھی ایک پیرایۂ خاص میں حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کا قصہ ہے اور اسی لیے اس قصے کا خاتمہ بھی خوشی اور مسرت پر ہوتا ہے بخلاف اس کے قصۂ شیریں و فرہاد ہے جو پوری شکل ٹریجیڈی کی رکھتا ہے اور جس سے حزن و ملال کے سوا کوئی دوسری کیفیت منتج نہیں ہو سکتی ہے۔ لیلیٰ مجنوں کے قصے کا بھی یہی انداز ہے اور راسخ کی وہ مثنوی بھی جس کا نام راز و نیاز ہے یہی پیرایہ رکھتی ہے۔

ڈائی ڈیکٹک شاعری لیرک (Lyric) ایپک (Epic) اور ڈراما (Drama) کے علاوہ شاعری کی ایک قسم ہے جو بشکل مثنوی ہوتی ہے اور اس سے مراد اخلاق آموزی ہے۔ اس شاعری کو بزبان انگریزی ڈائی ڈیکٹک (Didactic) کہتے ہیں۔ اس شاعری سے نصائح پند وغیرہ متعلق ہوتے ہیں۔ اس کی مثالیں سعدی و سنائی و مولوی رومی علیہم الرحمۃ کے کلاموں میں افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام کے اشعار بھی بیشتر یہی رنگ رکھتے ہیں۔ انگریزی شعرا میں ورڈسورتھ (Wordsworth)

ڈرائیڈن (Dryden) اڈیسن (Addison) پوپ (Pope)
وغیرہ بھی یہی ڈائی ڈاکٹک یعنی اخلاق آموز مذاق رکھتے ہیں ۔

پیسٹورل شاعری یہاں پر قابلِ ذکر شاعری کی وہ قسم بھی ہے جسے بزبان انگریزی پیسٹورل (Pastoral) کہتے ہیں اس شاعری کا تقاضا یہ ہے کہ دہی طریقہ زندگانی کا بیان عمل میں آئے یعنی کسان و چرواہان کس طور پر زندگی کرتے ہیں اُن کے مشاغل کس طرح کے ہوتے ہیں اور ان کے ارادات و خواہشات کیا انداز رکھتے ہیں یہ باتیں اس صنفِ شاعری میں حوالۂ قلم ہوتی ہیں شاعر اپنے معاملات کو کسان و چرواہان کے پیرائے میں ظاہر کرتا ہے اس قسم کی شاعری کی مثالیں یورپ کے شاعروں کے کلام میں بہت ہیں ۔ انگریزی شاعروں میں پوپ (Pope) نے اس رنگ میں بہت شعر کہے ہیں یہ مذاق قبل بعثت آنحضرت صلعم کے شعرائے عرب میں بھی دیکھا جاتا ہے اہلِ عرب میں اس مذاق کا موجود ہونا کوئی جائے تعجب نہیں ہے کس واسطے کہ بیشتر اہلِ عرب تقاضائے ملکی سے چرواہان پیشہ تھے اور اب بھی ہیں ۔

زراعتی شاعری اس صنفِ شاعری سے اک گونہ مناسبت وہ شاعری بھی رکھتی ہے جو زراعتی اور باغبانہ مذاق رکھتی ہے یونانیوں میں اس مذاق کا شاعر ہیریڈ (Herodd) تھا جس کا بیان آئندہ آتا ہے اور اس صوبہ بہار میں دو طبیعت دار زراعت پیشہ شخص تھے جو کھاگ اور ڈاگ کے نام سے مشہور ہیں ان دونوں کے زراعتی کلام آئندہ منقول ہوں گے ۔

مدح و قدح ۔ منجملہ اقسام شاعری کے ایک قسم شاعری کی مدح اور دوسری قدح ہے ۔ ان دونوں صنفِ شاعری کی مثالیں ہر زبان میں بکثرت موجود ہیں اردو میں

ان دونوں قسموں کی شاعریاں مرزا رفیع سودا نے سے بڑھ کر کسی نے نہیں کی ہیں آئندہ ان صنفوں کی بحث تفصیل کے ساتھ حوالۂ قلم ہوگی۔ لیکن اس جگہ یہ عرض کر دینا ضرور ہے کہ شاعر مدح میں ایسی مبالغہ پردازی کو راہ نہ دے کہ اس کا کلام احاطۂ فطرت سے باہر معلوم ہو اور نہ قدح میں اس درجہ نامہذب پیرایہ اختیار کرے کہ طبیعت کو تنفر پیدا ہو اگر مرزا سودا ان دونوں باتوں کو مدح و قدح میں مدّنظر رکھتے تو ان کی مدح گوئی اور ہجو گوئی کا جواب کہیں دنیا میں نہیں ملتا۔ شعرائے یورپ بھی طریقہ مدح و قدح کو اختیار کرتے گئے ہیں مگر فحش سے اُن کی تحریریں کمتر آلودہ نظر آتی ہیں۔

مرثیہ نگاری ۔ اصناف شاعری سے مرثیہ نگاری ایک نہایت عمدہ صنف ہے۔ مرثیہ نگاری سے یہاں مراد صرف وہ مرثیہ گوئی نہیں ہے کہ دوست داران خاندان پیغمبر مصائب اہلبیت علیہم السلام کو شاعرانہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں بلکہ تمام دیگر ایسے منظوم وغیرہ منظوم بیانات جو سرمایۂ رنج و الم ہونے کے باعث اظہار غم و حسرت کے ساتھ احاطہ تحریر میں در آتے ہیں مثلاً شاعر اپنے کسی دوست کے مرنے کا اور کسی شخص کے مبتلائے آفات ہونے کا مرثیہ لکھ سکتا ہے یا کسی غم انگیز معاملے کو جیسے جہاز کا ڈوبنا مکان میں آگ کا لگنا وغیرہ ہے قلمبند کر سکتا ہے اس طرح کے مرثیے شعرائے یورپ و ایشیا اکثر لکھتے گئے ہیں گرے (Grey) شاعر انگریزی نے ایک مرثیہ ایک گاؤں کے گورغریباں کے بیان میں لکھا ہے یہ مرثیہ دیدنی ہے۔ اسی طرح حکیم قاآنی نے ایک مرثیہ ایک امیرزادی ناکتخدا کی وفات میں نہایت سوز و درد کے ساتھ موزوں کیا ہے دو شعر اس مرثیے کے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں اُن کی پُر تاثیری محتاج بیان نہیں ؎

بہر بہار گل از زیر گل بر آرد سر — گلے برفت کہ ناید بعد بہار دگر
گلے برفت کہ امروز تا بدامن حشر — گلاب اوست کہ جاری بود ز دیدۂ تر

واضح ہو کہ یوں تو مرثیہ نگاری ہر زبان میں دیکھی جاتی ہے اور مذہبی مرثیہ نگاری بھی ہر قوم میں کم و بیش طور پر مروج رہی ہے لیکن مذہبی مرثیہ نگاری جیسی اس وقت اُردو میں موجود ہے کسی زبان میں نہیں پائی جاتی ہے ہرچند اُردو فارسی کی خوشہ چین کہی جاتی ہے مگر اس صنف شاعری میں فارسی سے بہت زیادہ ترقی کر گئی ہے ترقی کی یہ حالت ہے کہ فارسی کی شاعری کما نہ کیا ذکر اس مرثیہ نگاری کی بدولت اُردو کی شاعری اہلِ یونان، اہلِ رُوم، اہلِ ہند، اہلِ انگلستان کی شاعریوں کا سامنا کرنے کو مستعد نظر آتی ہے۔ اس ترقی عظیم کے باعث میر انیس ہوئے ہیں کہ جن کی بدولت زمین شاعری آسمان سے بھی بلند تر دکھائی دیتی ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم کی ذات پاک قدرت خداوندی کی پوری نشانی تھی۔ خوشا نصیب ان حضرات کے جنھوں نے اُن حضرت کے کلام کو دیدۂ حق بین سے مطالعہ فرمایا ہے بلاشبہ جناب میر صاحب کی شاعری کچھ ایسی ہی ندرت رکھتی ہے کہ جب تک اس کا موازنہ ہومیروس، ورجل، فردوسی، ملٹن، بالمکی اور بیاس کی عربوں کے ساتھ نہ کیا جائے تب تک اُس کی خوبیوں سے اطلاع پانا بیرونِ از امکان ہے جن لوگوں نے مختلف اقوام کی شاعریوں پر نظر غور نہیں ڈالی ہے وہ میر صاحب کے کمالات کو سمجھ نہیں سکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ میر صاحب کے کمالات کا بیان اپنے موقع پر آتا ہے یہاں اس سے زیادہ گزارش کا موقع نہیں ہے اس لیے ذیل میں کچھ شعرائے اہلِ یونان کا ذکر پیش کیا جاتا ہے۔

اصناف بالا کی شاعریوں کو ملحوظ رکھ کر اب حضرات ناظرین ہومیروس کے

مابعد کے شعرائے یونان کے حالات پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں۔ کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہومیروس کی ایپک نگاری یعنی رزمی شاعری نے یونانیوں کے دلوں میں شاعری کے ولولے پیدا کیے تھے چنانچہ اسی معاملہ ٹرائے (Troy) کو چند یونانی شعرا پے در پے ہومیروس کے تتبع میں منظوم کرتے گئے ہیں مگر ان میں سے کوئی شاعر بھی ہومیروس کی عمدگی کو نہیں پہنچتا ہے بہرحال ہومیروس کے بعد ایک شاعر ہیزیڈ (Hesiod) نامی یونان میں پیدا ہوا مگر اس نے رزمی شاعری نہیں اختیار کی اُس نے ہومیروس سے شاعری کی ایک علٰحدہ راہ نکالی۔

ہیزیڈ شاعر یونانی یہ شاعر آٹھ سو برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا اور اس کی مشہور تصنیف جو اس وقت موجود ہے اس کا نام ورکس اینڈ ڈیز (Works and days) ہے یہ نام بھی بزبان انگریزی ایک مترجم نام ہے اردو میں ان لفظوں کا ترجمہ مشاغل وایام کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ خیر اس شاعر نے زراعتی معاملات منظوم کیے ہیں مثلاً کب قلبہ رانی اور کب تخم ریزی کرنا چاہیے۔ ہل کے لیے کیسی لکڑی درکار ہوتی ہے اسی طرح اس نے بہت زراعتی امور حوالۂ قلم کیے ہیں۔ اور باغبانی کی ہدایتوں کے ساتھ اخلاقی تعلیم کو بھی ملحوظ رکھا ہے یہ شاعر بیوشیا (Beotia) کا جو ملک یونان کا ایک حصہ ہے رہنے والا تھا اس کی شاعری ہومیروس کی شاعری کی طرح بہت تخئیلی نہیں ہے بلکہ روزمرہ کے معاملات کو مد نظر رکھتی ہے۔ جس سے کہ امور دنیا میں وہ بکار آمد قیاس کی جاتی ہے۔ ہیزیڈ کی تصنیف سے کچھ اُس کے ایسے مضامین درج ذیل ہوتے ہیں۔ جن سے کیفیت سرما کا اظہار منظور ہے

جنوری کے مہینے سے خبردار رہو! ان ضرر رساں دنوں سے خبردار رہو کہ جن کی تیزی

کے ساتھ سرایت کرنے والی ہوا بیلوں کی کھالیں کھینچے ڈالتی ہے۔ درحالیکہ برف باری آفتیں ڈھاتی ہے زمین کو یخ بستہ کر ڈالتی ہے اور ہوا کے ہر جھونکے کو ٹرش بخشتی ہے باد شمالی تھریشیا (Thracia) کی طرف سے جہاں صبا رفتار گھوڑوں کا کھیت ہے تیز و تند آتی ہے اور سمندر میں پہنچ کر تموج عظیم پیدا کرتی ہے اُس کی ضربت سے گھنے جنگل اور ساحل گونج اُٹھتے ہیں اور یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا زمین نالہ و فغان کر رہی ہے یہ ہوا شدید ضربیں لگا لگا کر پہاڑ کی چوٹی پر کے قوی ہیکل درخت ہائے پائن (Pines) کو پھاڑ ڈالتی ہے اور عظیم ہیکل درخت ہائے اوک (Oaks) کو اُکھاڑ کر دامن کوہ میں پھینک دیتی ہے تب یکا یک بالائے کوہ سے تندی اور تیزی کے ساتھ بگولا زمین کی طرف رُخ کرتا ہے پس اُس وقت طوفان کا شور بلند ہوتا ہے اور تمام جنگل صدائے پرخروش سے بھر جاتا ہے ایسے وقت میں دواب لرزاں ترساں دُم دبائے رہا کرتے ہیں اور سرد ہوا کے جھونکوں سے گڑ گڑا کر تھرّاتے رہتے ہیں۔ ہر چند ان جانوروں کی جلدیں بال سے بھری رہتی ہیں اور گو اُن کی پشمیں دراز ہوتی ہیں۔ اس پر بھی ہوائے زمہریری ان میں سرایت کر ہی جاتی ہے ایسے وقت میں بیل اپنی موٹی کھال سے بھی فائدہ اُٹھا نہیں سکتا اور نہ پشم والی بکری اپنے کو ایسی ہوائے سرد سے محفوظ رکھ سکتی ہے البتہ اس شمالی ہوا سے بھیڑ کو ضرر نہیں پہنچتا ہے جس کے گھنے بال اس کے جسم کی پوری حفاظت کرتے ہیں۔

ایسے زمانے میں شاخ دار و غیر شاخ دار دونوں طرح کے جانور جو جنگلوں میں ملتے دکھتے ہیں بھوک سے اپنے جبڑے بجاتے ہیں اور سردی سے ٹھٹھر کر کانپتے ہوئے پہاڑ کی کھوہوں کی طرف جہاں قد کشیدہ اوک کے درخت اُگتے ہیں بھاگ نکلتے ہیں

بعض کر ہی جھاڑیوں میں جا چھپتے ہیں اور بعض سنگی ماندوں میں گھس کر امن لیتے ہیں جس طرح معمر اشخاص ناتوانی کے مارے سر جھکائے عصاؤں پر ہلتے ڈولتے آہستہ آہستہ چلتے ہیں ویسے ہی دواب کی رفتار معلوم ہوتی ہے جو رینگتی ہوئی چالوں کے ساتھ اپنے کو برف باری کے صدمے سے بچایا چاہتے ہیں۔

واضح ہو کہ سرما کا بیان بالا یونان کی شدت سرما کی پوری تصویر ہے یہ بیان ایسا ہے کہ واقعات کے ساتھ تمام تر مطابقت رکھتا ہے اور فطرتی مذاق سے مملو ہے بیان بالا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے سرما کی کیفیتوں پر غور کر کے راہ دیا ہے اس فصل کے تقاضوں کو خوب سمجھا ہے اور اس قدر واقعات سے مضامین دستیاب کیے ہیں کہ اُسے مبالغہ پردازی کی کوئی حاجت نہیں ہوئی ہے۔

سفو یونانی شاعرہ سفو (Sappho) یونان کی غزل گو شاعرہ ہے یہ عورت چھ سو برس قبل جناب مسیح علیہ السلام کے بقید حیات تھی اس کی غزل سرائی ایسی پُر تاثیر تھی کہ اہل یونان اُس کے کلام کے مفتون و شیدا تھے معاملات عشقیہ کے بیانات پر نادر قدرت رکھتی تھی خود کسی نوجوان پر عاشق تھی اسی لیے اس کا کلام تمام تر عاشقانہ رنگ رکھتا تھا لیر کٹس کسی شخص نے اہل یونان سے اس شاعرہ سے بہتر نہیں لکھا افسوس ہے کہ اُس کے کلام بہت ضایع گئے اس عہد تک جو کچھ پہنچے ہیں وہ بہت قلیل رہ گئے ہیں مگر اُن سے لطف زبان سلاست اور دل آویزی آشکارا ہے ۔ سفو کی غزل سرائی غزل سراؤں کے لیے ہدایت نامہ ہے ۔ تمام اصناف شاعری سے غزل گوئی ایک دشوار شے ہے اس کے لیے دل پُر درد درکار ہے ۔ جس کو فطرت نے قلبی نعمتوں سے محروم رکھا ہے زنہار غزل گوئی کا

قصد نہ کرے اس صنف شاعری کے لیے میر تقی صاحب کی خستگی اور مرزا نوشہ کی نشریت درکار ہیں یوں تو ہر شخص غزل گوئی کرلیتا ہے مگر واقعی غزل گوئی کیا ہے اس کو دل جانتا ہے زبان بیان نہیں کرسکتی۔ بہت سے حضرات غزل لکھنے بیٹھتے ہیں اور قصیدہ کہہ کر اٹھتے ہیں ماشاءاللہ ایسے حضرات کا کیا کہنا زور طبیعت ہے کہ انھیں کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ایسے حضرات کو یا فطرت نے نعمت ہائے قلبی سے محروم رکھا ہے یا اُن کو ابھی تک اپنی نعمت ہائے قلبی سے متمتع ہونے کا موقع نہیں ملا ہے اہلِ واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ غزل گوئی محض بے اختیاری شے ہے۔ ہر شاعر غزل گو نہیں ہوسکتا نہ خود کوئی سچا غزل گو ایسی قدرت رکھتا ہے کہ جب چاہے غزل گوئی کرے اشعار موزون کرلینا اور ہے اور سچی کیفیت قلبیہ کے ساتھ کچھ کرلینا اور ہے انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ اصناف شاعری کی بحثیں آتی ہیں اپنی جگہ پر پوری حقیقت غزل گوئی کی عرض کی جائے گی۔

پنڈار۔ پنڈار (Pindar) یونان کا شاعر قصیدہ گو ہے یہ شخص قریب چارسو پچاس برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا اس شخص نے لیرکس (Lyrics) کا احاطہ وسیع کرکے اوڈ (Ode) کی صورت پیدا کی ہے یعنی غزل کے دائرے کو وسعت دے کر قصیدہ کرڈالا ہے اس شاعر کے قصائد جو دیوتاؤں کے محامد وغیرہ میں ہیں ابھی تک موجود ہیں اُن سے زور طبیعت حسن بیان اور لطف زبان آشکارا ہے اس شاعر نے مرثیہ نگاری بھی کی ہے اور اُس کی مرثیہ گوئی بھی لطافت شاعرانہ سے مملو ہے یہ شخص صوبہ بیوشیا (Beotia) کا رہنے والا تھا۔ اس جگہ کے لوگ برخلاف دیگر صوبہ جات یونان کے نہایت کند ذہن اور ابلہ مزاج

ہوتے تھے مگر پنڈارا اپنے ہم وطنوں میں مستثنیٰ تھا اُس کے تمام ہم وطنوں کے عوض طبیعت داری اُسی کو موہوب ہوئی تھی آج تک بھی جو کسی ملک کے لوگ کند ذہن یا کم فہم ہوتے ہیں تو اُس ملک کو بیوشیا کے نام سے یاد کرتے ہیں چنانچہ ہمارے صوبہ بہار کو بھی بعض اہلِ رائے نے بیوشیا کے خطاب سے یاد فرمایا ہے لیکن اب ممتاز طور سے یہ صوبہ علمی ترقی کرنے لگا ہے اور اس صوبے میں کچھ کچھ لوگ پنڈار کی فہم و فراست کے نظر آنے لگے ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ صوبہ بہار کے سکنا ذہن وذکا میں کوئی خلقی نقصان نہیں رکھتے ہیں مولانا محب اللہ بہاری صاحب سُلّم ورآسخ و بیدل اسی صوبہ کے آدمی تھے مگر کیفیت یہ ہے کہ اس صوبے کے سکنا عہد انگلشیہ میں بہت عرصے کے بعد علومِ یورپ کے حاصل کرنے کی طرف مائل ہوئے اس واسطے اہلِ بنگالہ کے مقابلے میں پس پا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن بیس برس کے اندر جو کسی قدر اہلِ بہار علم اندوزی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں تو اب ان کی توجہ کا اثر بخوبی ممیز ہوتا ہے اور جس انداز سے اب اہل بہار ترقی کر رہے ہیں اُس سے امید کی جاتی ہے کہ نصف صدی کے اندر اہل بنگالہ سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ خیر پنڈار یونان کا ایک نامی شاعر ہے اُس کے زورِ طبیعت نے اُس کے عہد کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا کیا تھا تمام اہل یونان نے اُس کے رنگ کو اختیار کیا اور پنڈار کا رنگ قومی شاعری کا رنگ مانا جانے لگا حقیقت حال یہ ہے کہ پنڈار کے زورِ طبیعت اخلاقِ سخن نے یونان میں ڈرامے کا تخم بویا چنانچہ بعد پنڈار کے یونان میں ڈراما نگاری نے ظہور پکڑا اور اُس کے مروج ہو جانے نے یونانی شاعری کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔ یونانی ڈراما نگاروں سے ممتاز اشخاص اسکائیلس (Aeschylus) سفاکلیز (Sophocles)

یورپائیڈیز (Euripides) اور ارسطوفینز (Aristophenes)
ہیں ان میں پہلے تین شاعر ٹریجیڈی نگار ہیں اور آخر الذکر کامیڈی نگار ہے۔

اسکائیلس۔ اسکائیلس (Aeschylus) چار سو چھپن برس قبل
حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا اس کی ڈرامانگاری نے شاعری کی ایک نئی دنیا
پیدا کر دی اس شاعر کی ستر ٹریجیڈیوں سے اس وقت صرف سات ٹریجیڈیاں موجود ہیں
اور بہت کچھ ارباب مذاق کی توجہ کے قابل ہیں۔

سفاکلیز۔ سفاکلیز (Sophocles) چار سو پچاس برس قبل
مسیح کے بقید حیات تھا۔ اس شاعر نے معاملات انسانی کو انواع پہلو سے حوالۂ قلم
کیا ہے اس شاعر کے کچھ کلام کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

یوں تو بہت چیزیں عجیب و غریب ہیں مگر انسان اعجب العجائب ہے وہ
اس قدر دلیر ہے کہ عین طوفان کی حالت میں ایسے سمندر میں چلا جاتا ہے کہ جہاں مدام
ہر طرف موجوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ دھرتی کو جو سب دیوتاؤں سے زبردست
باقی اور پائدار ہے سال بسال اپنے مصرف میں لاتا ہے ہر سمت ہل چلا چلا کر اس کے
ڈھیلوں کو توڑتا ہے اور روزمرّہ کا کام ہمیشہ اپنے گھوڑوں سے لیتا ہے۔

واضح ہو کہ سفاکلیز نے اپنے کلام بالا میں انسان کا اعجب ہونا بیان کیا ہے
امر واقعی بھی یہی ہے کہ انسان اعجب مخلوقات الٰہی ہے لاریب اُس کے افعال و حرکات
نہایت تعجب خیز ہیں مگر اس شاعر نے صرف خارجی تعجبات انسانی کو حوالۂ قلم کیا ہے
اُس کے اندرونی تعجبات کی طرف توجہ نہیں کی ہے مگر امیر المومنین علی علیہ السلام
اپنے کلام ذیل میں جامعیت حقیقت انسانی کو ارشاد فرماتے ہیں ؎

دَوَاءُكَ فِيكَ وَمَا تَشْعُرُ وَدَاءُكَ مِنْكَ وَمَا تُبْصِرُ
وَتَحْسِبُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ وَفِيكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ

یعنی تیری دوا تجھ میں ہے اور تو نہیں جانتا اور تیرا درد تجھ سے ہے اور تو نہیں دیکھتا تو سمجھتا ہے کہ تو ایک جسم صغیر ہے درحالیکہ تجھ میں مشمول عالم اکبر ہے۔

ارباب حقیقت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ان دونوں شعروں میں حضرت نے انسان کی حقیقت سے خبر دی ہے اور آگاہ فرمایا ہے کہ انسان اگر اپنی حقیقت سے واقف ہو جائے تو جزو و کل وہی ہے اس کے سوا پھر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کلام انسان کے اعجب امور کو ظاہر کرتا ہے۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ خیال ہے اور کس قدر اخلاقی اور دینی تعلیم اس سے ہویدا ہے انصاف یہی ہے کہ حضرت کے اقوال عجب تعلیمی پیرایہ رکھتے ہیں اور فی الواقع معاملات اخلاقی اور امور روحانی میں روئے زمین پر آپ کا نظیر نہیں ہے۔ آپ کا ہر کلام۔ کلام الامیر۔ امیر الکلام کا مصداق ہے۔ کیوں نہ ہو جب درحقیقت آپ قرآن ناطق ہیں اور زبان آپ کی ترجمان حق ہے انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آپ کے کچھ کلام اپنے موقع پر درج تالیف ہذا ہوں گے۔ بہرحال اس جگہ سفاکلیز۔ کے مضامین بالا کی نسبت یہ عرض کر دینا ضرور ہے۔ کہ اُس کا کلام بالا بھی اپنے موقع پر خوب ہے اُس کے اشعار کا یہ مطلب ہے۔ کہ انسان اپنے کو ایک شے بیکار نہ سمجھے وہ بہت دشوار کاموں کو انجام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اُسے بڑی قوتیں عطا ہوئی ہیں اگر اپنی صلاحیتوں سے کام لے تو بہت کچھ کر سکتا ہے البتہ اس شاعر کا رُخ دنیوی امور کی طرف ہے مگر ترقی دنیوی اگر حق طور پر ہو تو ہرگز امر مذموم نہیں۔ جیسا کہ الدنیا مزرعۃ الآخرۃ بلا

گفتگو ترقی دینیوی ایک نہایت توجہ طلب امر ہے کہ دین و دنیا توام ہیں اور تقاضائے اسلام بھی یہی ہے کہ انسان کا دین و دنیا بخیر ہو اسلام کی فرمائش یہ زنہار نہیں ہے کہ دنیا کی خرابی کے ساتھ عاقبت سنورے۔ لمؤلفہ

دنیا کی خرابی ہو نہ عقبیٰ کی مضرت
پیدا کرے اوقات کی صورت بشر ایسی

جن لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بے ہاتھ پاؤں ہلائے دوسروں کے محصولہ پر بلا استحقاق اوقات کرتے ہیں ہرگز اسلام کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے اسلام کا حکم ہے کہ اپنی قوت بازو سے سامان رزق بہم کرو تجارت کرو کھیتی کرو نوکری کرو جس سبیل حلال سے اکتساب معاش کی صورت ہو اُس میں کوشاں ہو۔ یہ کبھی اسلام کی فرمائش نہیں ہے کہ اپنے کو اپاہج نکما نکھٹو افلاس زدہ دست نگر بنا ڈالو۔ دوسروں کی کمائی میں بے ہاتھ پاؤں ہلائے شریک ہو جاؤ۔ دھوکے دھاڑے سے روٹی حاصل کرو۔ اپنی تقدس مآبی ثابت کر کے بیوقوفوں کو جٹو۔ اور لُوٹو۔ اس طرح کے شیوے جو مذہبی پیرائے میں مروج دیکھے جاتے ہیں یہ سب نو احداث ہیں۔ اس کو نہ پیغمبرؐ صاحب کرتے تھے نہ خلفا اور نہ مجتہدین۔ علی مرتضیٰ اُجرت پر کنویں سے پانی نکالتے تھے اس طرح بزرگان دین محنت کر کے اوقات فرماتے تھے۔ مولانا شمس الدین فاخوری جو ایک درویش خدا رسیدہ تھے۔ مزدوروں کے ساتھ دیوار اُٹھا کر رزق حاصل کرتے تھے۔ اگر مفت خوری کوئی اچھی بات ہوتی تو یہ حضرات بابرکات بھی جھونس جھانس پر زندگی کا مدار رکھتے اعوذ باللہ من ذلک۔ المختصر جن لوگوں نے اپنے کو ایسا بے کار محض بنا رکھا ہے اُن سے کب یہ ممکن ہے کہ سفر بھری

اختیار کریں زمین کو جوتیں یا کسی طرح کی ریاضت کریں جس کی وجہ سے وہ اپنے کو سفاکلیز کے قول کا مصداق بنا سکیں پس جب وہ اتنی بھی صلاحیت نہیں رکھتے تو ان سے کیا امید ہے کہ مجاہدہ نفسی کی بدولت اپنے کو اُس درجۂ معرفت کو پہنچائیں کہ اپنے میں عالم اکبر کا تماشا دیکھیں۔

یوریپاڈیز۔ یوریپاڈیز (Euripides) سفاکلیز کا ہمعصر ہے۔ اس شاعر کے کلام میں درد پایا جاتا ہے مگر اُس کی شہرت میں ارسطوفینز۔ (Aristo-phenes) کی ہجو نگاری سے خلل واقع ہو گیا ہے ورنہ برائے خود یہ شاعر ایک ممتاز پایہ رکھتا ہے۔

ارسطوفینز۔ ارسطوفینز۔ (Aristophenes) ایک بڑا شوخ مزاج شاعر ہے اس کی طبیعت ہجو میں خوب لڑتی تھی۔ اس نے بہت سی ہجویں لکھی ہیں سقراط کی ہجو اسی نے لکھی تھی اس حکیم نامی کی ہلاکت کا سبب یہی شاعر ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ارسطوفینز کو ہجا کی طرف میلان طبعی تھا چنانچہ وہ اہل اتھنس (Athens) کی جو اُس کے ہم وطن تھے۔ چالیس برس تک ہجویں لکھتا رہا۔ اس شاعر کو خلاقی مضامین کی عجیب و غریب قوت حاصل تھی اور اس کے کلام پر تاثیر ہوتے تھے۔

بہ ظاہر ہے کہ یونانی شاعری کے حالات اس مختصر کتاب میں مفصّل طور پر درج نہیں ہو سکتے اگر تصریح کے ساتھ ہر شاعر کے احوال و اقوال حوالۂ قلم ہوں تو یہ کتاب بہت طولانی ہو جائے گی مثل ہے کہ رات تھوڑی اور سانگ بہت۔ ناچار راقم قلم کو روک لیتا ہے اور حضرات ناظرین سے خواستگار ہوتا ہے کہ اب لاطینی شاعری کی طرف توجہ مبذول فرمائیں۔ عند الملاحظہ یہ بات ظاہر ہوگی کہ لاطینی شاعری یونانی شاعری کا

انداز رکھتی ہے بلکہ تمام تر متتبع یونانی شاعری کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اُردو کے شعرا فارسی کے شعرا کا تتبع کرتے رہے ہیں لاطینی شعرا یونانی شعرا کے متتبع رہے ہیں اور جس طرح اُردو کی شاعری فارسی کی شاعری تک بہت باتوں میں نہیں پہنچ سکی ہے وہی حال لاطینی شاعری کا بھی پایا جاتا ہے۔

لاطینی شاعری

بیان ملک اِطالیہ ۔ ملک اِطالیہ (Italy) بشکل جزیرہ نما یورپ کے حصہ جنوبی میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں جرمنی اور سوئیزرلینڈ۔ مغرب میں ملک فرانس اور بحر ٹسکن۔ جنوب میں بحرِ یونان اور مشرق میں بحرۂ یڈریاٹک اور ہی کار نیولا جو ملک آسٹریا کا ایک صوبہ ہے واقع ہیں۔ طول اس ملک کا ۵۸۰ میل ہے اور عرض ۳۱۰۔ مگر جہاں پر اس کا عرض کم ہے وہاں ۱۵۰ میل سے زیادہ نہیں رہے۔ اس ملک کو بحری مواقع بہت ہیں اور اس کے متعلق بہت سے جزائر بھی ہیں مثلاً سسلی، سارڈینیا، البا، کارسیکا، مالٹا وغیرہ یہ ملک نہایت پُرفضا اور خوش آب و ہوا ہے خالق نے اسے فطرتی اسباب سے بڑی خوش سوادی بخشی ہے ہر طرح کے پہاڑ موجود ہیں کوئی بہت رفیع جیسے سلسلہ آلپس کوئی پست جیسے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے کوئی سبزہ و گل میں چھپا ہوا ہے اور کوئی روئیدگیوں سے تمام تر معرا ہے کہیں چشمے اُبل رہے ہیں اور کہیں جھرنے جاری ہیں۔ ندیاں رواں ہیں کہیں دریا پہاڑوں کو کاٹتے نکل گئے ہیں کہیں پانی بلندی سے نشیب کی طرف زوروں سے

گذر رہا ہے دامان کوہ میں ہزار ہا اشجار قدکشیدہ نظر آرہے ہیں۔ وادیوں کی صورت گلہائے صحرائی سے عجب رنگ دکھلا رہی ہے سہانے سہانے جنگل پوری شادابی کے ساتھ نادر سماں پیدا کر رہے ہیں مختصر یہ ہے کہ خوشنمائی کے فطرتی اسباب اس کثرت سے مہیا ہیں کہ ایطالیہ کے نہایت دلچسپ ملک ہونے میں کوئی گفتگو نہیں کی جا سکتی ہے۔ شاعر و مصور دونوں کے لیے یہ ملک خلقت کے رو سے موزوں ہے عالم موسیقی بھی اس رائے سے اختلاف نہیں کر سکتا ہے کس واسطے کہ راگنیاں ایسے دیس کے سوا اور کہاں رہنا پسند کر سکتی ہیں آب وہوا بھی اس ملک کی نہایت مطبوع ہے سوا ایسے مقامات مرطوب کے کہ جو نیپال کی ترئی کا انداز رکھتے ہیں یہاں کے مشہور دریاؤں سے پو (Po) اور ٹائیبر (Tiber) ہیں حیوانات صحرائی خوک، ہرن، بجرا، بھال، بز کوہی سیاہ گوش، گرگ، شغال، روباہ اور خرگوش ہیں اور طیور میں اغراض صید کے جانور بکثرت بسر آتے ہیں۔ اس ملک کی پیداوار قابل توجہ ہے۔ انگور، زیتون، انجیر، سیب و دیگر میوہ جات خوب پیدا ہوتے ہیں وہاں ہر طرح کی دالیں، مکئی، روئی، ریشم اور اقسام رنگ کی ترکاریوں اور سبزیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ مویشی بھی کثرت سے پرورده کیے جاتے ہیں اور ان کی پرورش میں آسانی اس سبب سے ہوتی ہے کہ بڑی بڑی چراگاہیں دریائے پو کے قریب میں واقع ہیں یہاں ایسا عمدہ پنیر بنتا ہے کہ روئے زمین پر اس کا نظیر نہیں دیکھا جاتا ہے ملک ملک بسبیل تجارت جاتا ہے اور ملکوں کے لوگوں نے بھی اُس کی نقل اُتارنا چاہی مگر ویسا کبھی نہ بن سکا۔ واضح ہو کہ مویشی کے دودھ میں چری کو بڑا دخل ہے جہاں اچھی چری نہیں ملتی وہاں کے مویشیوں کے دودھ اچھے نہیں ہوتے۔ ہندوستان کے آباد حصوں میں اب جانوروں کو چری کا عمدہ

موقع کم رہا ہے اس لیے آباد مقاموں میں اچھا دودھ نہیں ملتا ہے یہ امر ایسا ہے کہ
بہی خواہان زراعت کو اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے بہر حال علاوہ پیداوار زراعتی کے
اس ملک میں سنگ مرمر اور بعض دیگر بیش قیمت پتھروں کی کانیں بھی دیکھی جاتی ہیں پھٹکری
تانبا اور لوہے کے معدن موجود ہیں الغرض کافی پیداوار اس ملک کی اچھی ہے۔

واضح ہو کہ اہلِ ایطالیہ موسیقی کا مذاق خوب رکھتے ہیں اور اچھے گانے والوں کی
اس سرزمین میں کوئی کمی نہیں ہے حسن بھی اس ملک کا دل آویز ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ارباب
مذاق کے لیے یہ ملک تمام تر مناسب ہے ایسے ملک کو اگر شاعری مصوری اور موسیقی
سے مناسبت نہ ہو تو پھر کس ملک کو ہو سکتی ہے چنانچہ ان تینوں نفیس فن میں یہ ملک
ممتاز رہا ہے۔

ارباب علم کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک ایطالیہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے
کہ ایک بادشاہ ایطالس نامی ملک آرکیڈیا کی طرف سے آکر یہاں اقامت گزین ہوا
تھا جس کے سبب سے یہ ملک اُسی کے نام سے مشہور ہوا۔ بعض محققین کا یہ بھی
بیان ہے کہ ایطالیہ مشتق ہے لفظ ایطالس (Italus) سے جس کے معنی
بیل ہے چونکہ اس ملک میں گائے، بیل کثیر الوجود ہیں اس واسطے اس کا نام ایطالیہ
قرار پایا۔

بیان اہلِ روم جاننا چاہیے کہ زبان لاطینی اُس قوم کی ہے جو متوطن ملک ایطالیہ
کی تھی اس ملک کا دار السلطنت شہر روم تھا۔ یہ شہر اب باقی نہیں
ہے اور وہ شہر جو اس وقت اس کی جگہ موجود ہے روم جدید ہے۔ اور جو زبان اس
وقت وہاں بولی جاتی ہے اُسے ایٹالین (Italian) کہتے ہیں۔ روم سابق کی

بعض کرہی جھاڑیوں میں جا چھپتے ہیں اور بعض سنگی ماندوں میں گھس کر امن لیتے ہیں جس طرح معمر اشخاص ناتوانی کے مارے سر جھکائے عصاؤں پر ہلتے ڈولتے آہستہ آہستہ چلتے ہیں ویسے ہی دواب کی رفتار معلوم ہوتی ہے جو ریںگتی ہوئی چالوں کے ساتھ اپنے کو برف باری کے صدمے سے بچایا چاہتے ہیں۔

واضح ہو کہ سرما کا بیان بالا یونان کی شدت سرما کی پوری تصویر ہے یہ بیان ایسا ہے کہ واقعات کے ساتھ تمام تر مطابقت رکھتا ہے اور فطرتی مذاق سے مملو ہے بیان بالا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے سرما کی کیفیتوں پر غور کر کے راہ دیا ہے اس فصل کے تقاضوں کو خوب سمجھا ہے اور اس قدر واقعات سے مضامین دستیاب کیے ہیں کہ اُسے مبالغہ پردازی کی کوئی حاجت نہیں ہوئی ہے۔

سفو یونانی شاعرہ سفو (Sappho)۔ یونان کی غزل گو شاعرہ ہے یہ عورت چھ سو برس قبل جناب مسیح علیہ السلام کے بقید حیات تھی۔اس کی غزل سرائی ایسی پُر تاثیر تھی کہ اہل یونان اُس کے کلام کے مفتون و شیدا تھے معاملات عشقیہ کے بیانات پر نادر قدرت رکھتی تھی خود کسی نوجوان پر عاشق تھی اسی لیے اس کا کلام تمام تر عاشقانہ رنگ رکھتا تھا لیکن کسی شخص نے اہل یونان سے اس شاعرہ سے بہتر نہیں لکھا افسوس ہے کہ اُس کے کلام بہت ضایع گئے اس عہد تک جو کچھ پہنچے ہیں وہ بہت قلیل رہ گئے ہیں مگر اُن سے لطف زبان سلاست اور دل آویزی آشکارا ہے۔سفو کی غزل سرائی غزل سراؤں کے لیے ہدایت نامہ ہے۔ تمام اصناف شاعری سے غزل گوئی ایک دشوار شے ہے اس کے لیے دل پُر درد درکار ہے۔جس کو فطرت نے قلبی نعمتوں سے محروم رکھا ہے زنہار غزل گوئی کا

قصد نہ کرے اس صنف شاعری کے لیے میر تقی صاحب کی خستگی اور مرزا نوشہ کی نشتریت درکار ہیں یوں تو ہر شخص غزل گوئی کر لیتا ہے مگر واقعی غزل گوئی کیا ہے اس کو دل جانتا ہے زبان بیان نہیں کر سکتی۔ بہت سے حضرات غزل لکھنے بیٹھتے ہیں اور قصیدہ کر کے اُٹھتے ہیں ماشاءاللہ ایسے حضرات کا کیا کہنا زور طبیعت ہے کہ اُنھیں کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ایسے حضرات کو یا فطرت نے نعمت ہائے قلبی سے محروم رکھا ہے یا اُن کو ابھی تک اپنی نعمت ہائے قلبی سے متمتع ہونے کا موقع نہیں ملا ہے اہلِ واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ غزل گوئی محض بے اختیاری شے ہے۔ ہر شاعر غزل گو نہیں ہو سکتا نہ خود کوئی سچا غزل گو ایسی قدرت رکھتا ہے کہ جب چاہے غزل گوئی کر لے اشعار موزون کر لینا اور ہے اور سچی کیفیت قلبیہ کے ساتھ کچھ کہ لینا اور ہے انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ اصناف شاعری کی بحثیں آتی ہیں اپنی جگہ پر پوری حقیقت غزل گوئی کی عرض کی جائے گی۔

پنڈار۔ پنڈار (Pindar) یونان کا شاعر قصیدہ گو ہے یہ شخص قریب چار سو پچاس برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا اس شخص نے لیرکس (Lyrics) کا احاطہ وسیع کر کے اوڈ (Ode) کی صورت پیدا کی ہے یعنی غزل کے دائرے کو وسعت دے کر قصیدہ کر ڈالا ہے اس شاعر کے قصائد جو دیوتاؤں کے محامد وغیرہ میں ہیں ابھی تک موجود ہیں اُن سے زور طبیعت حسن بیان اور لطف زبان آشکارا ہے اس شاعر نے مرثیہ نگاری بھی کی ہے اور اُس کی مرثیہ گوئی بھی لطافت شاعرانہ سے مملو ہے یہ شخص صوبہ بیوشیا (Beotia) کا رہنے والا تھا۔ اس صوبہ کے لوگ برخلاف دیگر صوبہ جات یونان کے نہایت کند ذہن اور ابلہ مزاج

ہوتے تھے مگر پنڈار اپنے ہم وطنوں میں مستثنیٰ تھا اُس کے تمام ہم وطنوں کے عوض طبیعت داری اُسی کو موہوب ہوئی تھی آج تک بھی جو کسی ملک کے لوگ کند ذہن یا کم فہم ہوتے ہیں تو اُس ملک کو بیوشیا کے نام سے یاد کرتے ہیں چنانچہ ہمارے صوبہ بہار کو بھی بعض اہلِ رائے نے بیوشیا کے خطاب سے یاد فرمایا ہے لیکن اب ممتاز طور سے یہ صوبہ علمی ترقی کرنے لگا ہے اور اس صوبے میں کچھ کچھ لوگ پنڈار کی فہم و فراست کے نظر آنے لگے ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ صوبہ بہار کے سکنا ذہن وذکا میں کوئی خلقی نقصان نہیں رکھتے ہیں مولانا محب اللہ بہاری صاحب مُسَلَّم وراسخ و بیدل اسی صوبے کے آدمی تھے مگر کیفیت یہ ہے کہ اس صوبے کے سکنا عہد انگلشیہ میں بہت عرصے کے بعد علومِ یورپ کے حاصل کرنے کی طرف مائل ہوئے اس واسطے اہلِ بنگالہ کے مقابلے میں پس پا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن بیس برس کے اندر جو کسی قدر اہلِ بہار علم اندوزی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں تو اب ان کی توجہ کا اثر بخوبی ممیز ہوتا ہے اور جس انداز سے اب اہل بہار ترقی کر رہے ہیں اُس سے امید کی جاتی ہے کہ نصف صدی کے اندر اہل بنگالہ سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ خیر پنڈار یونان کا ایک نامی شاعر ہے اُس کے زور طبیعت نے اُس کے عہد کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا کیا تھا تمام اہل یونان نے اُس کے رنگ کو اختیار کیا اور پنڈار کا رنگ قومی شاعری کا رنگ مانا جانے لگا حقیقت حال یہ ہے کہ پنڈار کے زور طبیعت اخلاقِ سخن نے یونان میں ڈرامے کا تخم بویا چنانچہ بعد پنڈار کے یونان میں ڈراما نگاری نے ظہور پکڑا اور اُس کے مروج ہو جانے نے یونانی شاعری کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔ یونانی ڈراما نگاروں سے ممتاز اشخاص اسکائیلس (Aeschylus) سفاکلیز (Sophocles)

یوریپائیڈیز (Euripides) اور ارسطوفینز (Aristo phenes)
ہیں ان میں پہلے تین شاعر ٹریجیڈی نگار ہیں اور آخر الذکر کامیڈی نگار ہے۔

اسکائیلس۔ اسکائیلس (Aeschylus) چار سو چھپن برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا اس کی ڈرامانگاری نے شاعری کی ایک نئی دنیا پیدا کردی اس شاعر کی ستّر ٹریجیڈیوں سے اس وقت صرف سات ٹریجیڈیاں موجود ہیں اور بہت کچھ ارباب مذاق کی توجہ کے قابل ہیں۔

سفاکلیز۔ سفاکلیز (Sophocles) چار سو پچاس برس قبل مسیح کے بقید حیات تھا۔ اس شاعر نے معاملات انسانی کو انواع پہلو سے حوالۂ قلم کیا ہے اس شاعر کے کچھ کلام کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

یوں تو بہت چیزیں عجیب و غریب ہیں مگر انسان اعجب العجائب ہے وہ اس قدر دلیر ہے کہ عین طوفان کی حالت میں ایسے سمندر میں چلا جاتا ہے کہ جہاں مدام ہر طرف موجوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ دھرتی کو جو سب دیوتاؤں سے زبردست باقی اور پائدار ہے سال بسال اپنے مصرف میں لاتا ہے ہر سمت ہل چلا چلا کر اس کے ڈھیلوں کو توڑتا ہے اور روزمرّہ کا کام ہمیشہ اپنے گھوڑوں سے لیتا ہے۔

واضح ہو کہ سفاکلیز نے اپنے کلام بالا میں انسان کا اعجب ہونا بیان کیا ہے امر واقعی بھی یہی ہے کہ انسان اعجب مخلوقات آلٰہی ہے لاریب اُس کے افعال و حرکات نہایت تعجب خیز ہیں مگر اس شاعر نے صرف خارجی تعجبات انسانی کو حوالۂ قلم کیا ہے اُس کے اندرونی تعجبات کی طرف توجہ نہیں کی ہے مگر امیر المومنین علی علیہ السلام اپنے کلام ذیل میں جامعیت حقیقت انسانی کو ارشاد فرماتے ہیں ؎

دَوَاءُكَ فِيكَ وَمَا تَشْعُرُ ۔۔۔ وَدَاءُكَ مِنْكَ وَمَا تُبْصِرُ
وَتَحْسِبُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ ۔۔۔ وَفِيكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ

یعنی تیری دوا تجھ میں ہے اور تو نہیں جانتا اور نیز اور د تجھ سے ہے اور تو نہیں دیکھتا تو سمجھتا ہے کہ تو ایک جسم صغیر ہے درحالیکہ تجھ میں مشمول عالم اکبر ہے۔

ارباب حقیقت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ان دونوں شعروں میں حضرت نے انسان کی حقیقت سے خبر دی ہے اور آگاہ فرمایا ہے کہ انسان اگر اپنی حقیقت سے واقف ہو جائے تو جزو و کل وہی ہے اس کے سوا پھر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کلام انسان کے اعجب امور کو ظاہر کرتا ہے۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ خیال ہے اور کس قدر اخلاقی اور دینی تعلیم اس سے ہویدا ہے انصاف یہی ہے کہ حضرت کے اقوال عجب تعلیمی پیرایہ رکھتے ہیں اور فی الواقع معاملات اخلاقی اور امور روحانی میں روئے زمین پر آپ کا نظیر نہیں ہے۔ آپ کا ہر کلام۔ کلام الامیر۔ امیر الکلام کا مصداق ہے۔ کیوں نہ ہو جب درحقیقت آپ قرآن ناطق ہیں اور زبان آپ کی ترجمان حق ہے انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آپ کے کچھ کلام اپنے موقع پر درج تالیف ہٰذا ہوں گے۔ بہرحال اس جگہ سفاکلیر۔ کے مضامین بالا کی نسبت یہ عرض کر دینا ضرور ہے۔ کہ اُس کا کلام بالا بھی اپنے موقع پر خوب ہے اُس کے اشعار کا یہ مطلب ہے۔ کہ انسان اپنے کو ایک شے بیکار نہ سمجھے وہ بہت دشوار کاموں کو انجام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اُسے بڑی قوتیں عطا ہوئی ہیں اگر اپنی صلاحیتوں سے کام لے تو بہت کچھ کر سکتا ہے البتہ اس شاعر کا رُخ دنیوی امور کی طرف ہے مگر ترقی دنیوی اگر خوب طور پر ہو تو ہرگز امر نامومن نہیں ہے کہ الدنیا مزرعۃ الآخرۃ بلا

گفتگو ترقی دنیوی ایک نہایت توجہ طلب امر ہے کہ دین و دنیا توام ہیں اور تقاضائے
اسلام بھی یہی ہے کہ انسان کا دین و دنیا بخیر ہو اسلام کی فرمائش یہ زنہار نہیں ہے کہ دنیا
کی خرابی کے ساتھ عاقبت سنور ے۔ لمؤلفہ

دنیا کی خرابی ہو نہ عقبیٰ کی مضرت
پیدا کرے اوقات کی صورت بشر ایسی

جن لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بے ہاتھ پاؤں ہلائے دوسروں کے محصولہ
پر بلا استحقاق اوقات کرتے ہیں ہرگز اسلام کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے اسلام کا حکم ہے
کہ اپنی قوت یا دہ سے سامان رزق بہم کرو تجارت کرو کھیتی کرو نوکری کرو جس سبیل
حلال سے اکتساب معاش کی صورت ہو اُس میں کوشاں ہو۔ یہ کبھی اسلام کی فرمائش نہیں
ہے کہ اپنے کو اپاہج نکما نکھٹو افلاس زدہ دست نگر بنا ڈالو۔ دوسروں کی کمائی
بیں بے ہاتھ پاؤں ہلائے شریک ہو جاؤ۔ دھوکے دھاڑے سے روٹی حاصل
کرو۔ اپنی تقدس مآبی ثابت کرکے بیوقوفوں کو جٹو۔ اور لوٹو۔ اس طرح کے شیوے
جو مذہبی پیرائے میں مروج دیکھے جاتے ہیں یہ سب نو احداث ہیں۔ اس کو نہ پیغمبرؐ
صاحب کرتے تھے نہ خلفا اور نہ مجتہدین۔ علی مرتضیٰؑ اجرت پر کنویں سے پانی نکالتے
تھے اس طرح بزرگان دین محنت کرکے اوقات فرماتے تھے۔ مولانا شمس الدین
فاخوری جو ایک درویش خدا رسیدہ تھے۔ مزدوروں کے ساتھ دیوار اٹھا کر رزق
حاصل کرتے تھے۔ اگر مفت خوری کوئی اچھی بات ہوتی تو یہ حضرات بابرکات بھی
جیو نس جیانس پر زندگی کا مدار رکھتے اعوذ باللہ من ذلک۔ المختصر جن
لوگوں نے اپنے کو ایسا بے کار محض بنا رکھا ہے اُن سے کب یہ ممکن ہے کہ سفر بحری

اختیار کریں زمین کو جوتیں یا کسی طرح کی ریاضت کریں جس کی وجہ سے وہ اپنے کو سفاکلیز کے قول کا مصداق بنا سکیں پس جب وہ اتنی بھی صلاحیت نہیں رکھتے تو ان سے کیا امید ہے کہ مجاہدہ نفسی کی بدولت اپنے کو اُس درجۂ معرفت کو پہنچائیں کہ اپنے میں عالم اکبر کا تماشا دیکھیں۔

یوریپاڈیز۔ یوریپاڈیز (Euripides) سفاکلیز کا ہمعصر ہے۔ اس شاعر کے کلام میں درد پایا جاتا ہے مگر اُس کی شہرت میں ارسطوفینز۔ (Aristophenes) کی ہجو نگاری سے خلل واقع ہو گیا ہے ورنہ برائے خود یہ شاعر ایک ممتاز پایہ رکھتا ہے۔

ارسطوفینز۔ ارسطوفینز۔ (Aristophenes) ایک بڑا شوخ مزاج شاعر ہے اس کی طبیعت ہجو میں خوب لڑائی تھی۔ اس نے بہت سی ہجویں لکھی ہیں سقراط کی ہجو اسی نے لکھی تھی اس حکیم نامی کی ہلاکت کا سبب یہی شاعر ہؤا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ارسطوفینز کو ہجو کی طرف میلان طبعی تھا چنانچہ وہ اہل اتھنس (Athens) کی جو اُس کے ہم وطن تھے۔ چالیس برس تک ہجویں لکھتا رہا۔ اس شاعر کو خلاقی مضامین کی عجیب و غریب قوت حاصل تھی اور اس کے کلام پر تاثیر ہوتے تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ یونانی شاعری کے حالات اس مختصر کتاب میں مفصّل طور پر درج نہیں ہو سکتے اگر تصریح کے ساتھ ہر شاعر کے حالات و اقوال حوالۂ قلم ہوں تو یہ کتاب بہت طولانی ہو جائے گی مثل ہے کہ رات تھوڑی اور سانگ بہت۔ ناچار راقم قلم کو روک لیتا ہے اور حضرات ناظرین سے خواستگار ہوتا ہے کہ اب لاطینی شاعری کی طرف توجہ مبذول فرمائیں۔ عندالملاحظہ یہ بات ظاہر ہوگی کہ لاطینی شاعری یونانی شاعری کا

انداز رکھتی ہے بلکہ تمام تر متتبع یونانی شاعری کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اُردو کے شعرا فارسی کے شعرا کا تتبع کرتے رہے ہیں لاطینی شعرا یونانی شعرا کے متتبع رہے ہیں اور جس طرح پر اُردو کی شاعری فارسی کی شاعری تک بہت باتوں میں نہیں پہنچ سکی ہے وہی حال لاطینی شاعری کا بھی پایا جاتا ہے۔

لاطینی شاعری

بیان ملک اِطالیہ ۔ ملک ایطالیہ (Italy) بشکل جزیرہ نما یورپ کے حصّہ جنوبی میں واقع ہے ۔اس کے شمال میں جرمنی اور سوئزرلینڈ ۔مغرب میں ملک فرانس اور بحر ٹسکن ۔جنوب میں بحیرۂ یونان اور مشرق میں بحیرۂ ایڈریاٹک اور ری کار نولا جو ملک آسٹریا کا ایک صوبہ ہے واقع ہیں ۔طول اس ملک کا ۵۸۰ میل ہے اور عرض ۳۱۰ ۔مگر جہاں پر اس کا عرض کم ہے وہاں ۱۵۰ میل سے زیادہ نہیں ہے ۔اس ملک کو بحری مواقع بہت ہیں اور اس کے متعلق بہت سے جزائر بھی ہیں مثلاً سسلی، سارڈینیا، البا کارسیکا، مالٹا وغیرہ یہ ملک نہایت پُرفضا اور خوش آب وہوا ہے خالق نے اسے فطرتی اسباب سے بڑی خوش سوادی بخشی ہے ہر طرح کے پہاڑ موجود ہیں کوئی بہت رفیع جیسے سلسلہ آلپس کوئی پست جیسے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہوتی ہیں ۔ان میں سے کوئی سبزہ وگل میں چھپا ہوا ہے اور کوئی روئیدگیوں سے تمام تر معرّا ہے کہیں چشمے اُبل رہے ہیں اور کہیں جھرنے جاری ہیں ۔ندیاں رواں ہیں کہیں دریا پہاڑوں کو کاٹتے نکل گئے ہیں کہیں پانی بلندی سے نشیب کی طرف زوروں سے

گر رہا ہے دامان کوہ میں ہزارہا اشجار قدکشیدہ نظر آرہے ہیں۔ وادیوں کی صورت گلہائے صحرائی سے عجب رنگ دکھلا رہی ہے تہلتے تہلتے جنگل پوری شادابی کے ساتھ نادر سماپیدا کررہے ہیں مختصر یہ ہے کہ خوشنمائی کے فطرتی اسباب اس کثرت سے مہیا ہیں کہ ایطالیہ کے نہایت دلچسپ ملک ہونے میں کوئی گفتگو نہیں کی جاسکتی ہے۔ شاعر و مصور دونوں کے لیے یہ ملک خلقت کے رو سے موزوں ہے عالم موسیقی بھی اس رائے سے اختلاف نہیں کرسکتا ہے کس واسطے کہ راگنیاں ایسے دیس کے سوا اور کہاں رہنا پسند کرسکتی ہیں آب و ہوا بھی اس ملک کی نہایت مطبوع ہے سوا ایسے مقامات مرطوب کے کہ جو نیپال کی ترائی کا انداز رکھتے ہیں یہاں کے مشہور دریاؤں سے پو (Po) اور ٹائیبر (Tiber) ہیں حیوانات صحرائی خوک، ہرن، بجرو، بھالو بز کوہی سیاہ گوش، گرگ، شغال، روباہ اور خرگوش ہیں اور طیور میں اغراض صید کے جانور بکثرت بسر آتے ہیں۔ اس ملک کی پیداوار قابل توجہ ہے۔ انگور، زیتون، انجیر سیب و دیگر میوہ جات خوب پیدا ہوتے ہیں وہاں ہر طرح کی دالیں، مکئی، روئی، ریشم اور اقسام رنگ کی ترکاریوں اور سبزیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ مویشی بھی کثرت سے پرورش کیے جاتے ہیں اور ان کی پرورش میں آسانی اس سبب سے ہوتی ہے کہ بڑی بڑی چراگاہیں دریائے پو کے قریب میں واقع ہیں یہاں ایسا عمدہ پنیر بنتا ہے کہ روئے زمین پر اس کا نظیر نہیں دیکھا جاتا ہے ملک ملک بسبیل تجارت جاتا ہے اور ملکوں کے لوگوں نے بھی اس کی نقل اتارنا چاہی مگر ویسا کبھی نہ بن سکا۔ واضح ہو کہ مویشی کے دودھ میں چری کو بڑا دخل ہے جہاں اچھی چری نہیں ملتی وہاں کے مویشیوں کے دودھ اچھے نہیں ہوتے۔ ہندوستان کے آباد حصوں میں اب جانوروں کو چری کا عمدہ

موقع کم رہا ہے اس لیے آباد مقاموں میں اچھا دودھ نہیں ملتا ہے یہ امر ایسا ہے۔ کہ بہی خواہان زراعت کو اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے بہرحال علاوہ پیداوار زراعتی کے اس ملک میں سنگ مرمر اور بعض دیگر بیش قیمت پتھروں کی کانیں بھی دیکھی جاتی ہیں پھٹکری تانبا اور لوہے کے معدن موجود ہیں الغرض کافی پیداوار اس ملک کی اچھی ہے۔

واضح ہو کہ اہلِ اِٹالیہ موسیقی کا مذاق خوب رکھتے ہیں اور اچھے گانے والوں کی اس سرزمین میں کوئی کمی نہیں ہے حسن بھی اس ملک کا دل آویز ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ارباب مذاق کے لیے یہ ملک تمام تر مناسب ہے ایسے ملک کو اگر شاعری مصوری اور موسیقی سے مناسبت نہ ہو تو پھر کس ملک کو ہو سکتی ہے چنانچہ ان تینوں نفیس فن میں یہ ملک ممتاز رہا ہے۔

ارباب علم کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک ایطالیہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ ایطالس نامی ملک آرکیڈیا کی طرف سے آ کر یہاں اقامت گزین ہوا تھا جس کے سبب سے یہ ملک اُسی کے نام سے مشہور ہوا۔ بعض محققین کا یہ بھی بیان ہے کہ ایطالیہ مشتق ہے لفظ ایطالس (Italus) سے جس کے معنی بیل ہے چونکہ اس ملک میں گائے، بیل کثیر الوجود ہیں اس واسطے اس کا نام ایطالیہ قرار پایا۔

بیانِ اہلِ روم جاننا چاہیے کہ زبان لاطینی اُس قوم کی ہے جو متوطن ملک ایطالیہ کی تھی اس ملک کا دارالسلطنت شہر رومؔ تھا۔ یہ شہر اب باقی نہیں ہے اور وہ شہر جو اس وقت اُس کی جگہ موجود ہے، روم جدید ہے۔ اور جو زبان اس وقت وہاں بولی جاتی ہے اُسے ایٹالین (Italian) کہتے ہیں۔ رومؔ سابق کی

مختصر تاریخ یہ ہے کہ اس شہر کی بنیاد ڈالی ہوئی دو شخصوں کی ہے جو ایک شہزادی کے بطن سے تھے ان دونوں بھائیوں کا نام راموکس (Romulus) اور ریمس (Remus) ہے۔ کہتے ہیں کہ ان دونوں بھائیوں کو ایک گرگ مادہ نے پالا تھا ان کے افسانہ نما احوال کو پلوٹارک (Plutarch) مورخ نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے اور اس عجیب معاملے کو ابو الفدا نے بھی اپنی تاریخ المختصر فی احوال البشر میں درج کیا ہے آدمی کے بچوں کو ایک گرگ کا پالنا ظاہر از قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے عموماً ہر کوئی شخص ایسے قصے کو مطابق فطرت سمجھے گا اور ایک عرصے تک راقم بھی اس کو ناممکن الوقوع سمجھتا رہا مگر جب سے کرنیل سلیمن (Sleeman) صاحب کی رپورٹ دیکھی اور متواتر دو تین ایسے واقعات کی سچی خبریں راقم کو پہنچیں تب سے اس بات کا یقین ہوا کہ آدمی کے بچے کو بھیڑیوں کا پالنا ممکن الوقوع ہے۔ بہر حال یہ دونوں بھائی شہر روم کے بانی کہے جاتے ہیں۔ اس شہر کی بنیاد سات سو پچاس برس سے کچھ اوپر قبل سن مسیحی کے قرار دی جاتی ہے شہر کی بنیاد ڈالنے کے بعد دونوں بھائیوں میں اختلاف پیدا ہوا چنانچہ بڑے بھائی یعنی راموکس نے ریمس کو مار ڈالا اور اپنی حیات تک اس شہر کا بادشاہ رہا بعد ازاں چند شخص یکے بعد دیگرے اس کی جگہ پر بادشاہ ہوتے گئے آخر کار شخصی سلطنت کا طریقہ اٹھا دیا گیا اور جمہوری سلطنت قائم ہوئی چند صدیوں تک رومیوں کی سلطنت اسی شکل پر قائم رہی یہاں تک کہ جولیس سیزر (Julius Caesar) نے اس انتظام سلطنت کو درہم برہم کر کے پھر شخصی سلطنت قائم کر دی اور اس کے وقت سے ایک سلسلہ شاہنشاہوں کا جاری ہوا جس کا شاہنشاہ خود جولیس سیزر تھا لفظ قیصر سیزر کا معرب ہے اور اب یہ لفظ بمعنی شاہنشاہ استعمال کیا جاتا ہے یہ شخص

سو برس قبل جناب مسیح علیہ السلام کے پیدا ہوا تھا اور تینتالیس برس قبل اُس حضرت کے مقتول ہُوا یہ شخص نہایت مردِ فاضل تھا اور اُس کی تحریریں آج تک اُس کے اعلیٰ درجے کی قابلیت کی شہادت دیتی ہیں۔ واضح ہو کہ رومیان سابق اپنی ابتدائی حالت میں ناتعلیم یافتہ انداز کے لوگ تھے اور ان کی ناتعلیم یافتگی اُن کے روز افزوں اقبال کے ساتھ بھی ایک عرصے تک برقرار رہی لیکن جب سے رومیوں کو اہلِ یونان سے سابقہ پڑتا گیا تو یونانیوں سے انھوں نے اکتساب علم کرنا شروع کیا بہرحال جس وقت رومیوں کا اقبال ترقی کر رہا تھا یونانیوں پر ادبار آ رہا تھا کچھ عرصے میں یہ نوبت پہنچی کہ رومیوں نے یونانیوں کو شکست دے دے کر بدحال کر دیا یہاں تک کہ یونان روم کا ماتحت سمجھا جانے لگا اس وقت میں ہر چند یونانیوں سے اقبال رخصت ہو چکا تھا۔ اس پر بھی اہلِ یونان اپنی فاتح قوم سے علوم و فنون میں غالب تھے مگر تقاضائے اقبال سے رومیوں نے یونانیوں سے علم اندوزی کرنا نہ چھوڑا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یونانی علوم رفتہ رفتہ رومیوں میں مروج ہو گئے منجملہ بہت سے علوم و فنون کے اہلِ یونان کے مذاق شاعری نے بھی رومیوں کے دلوں میں جگہ پیدا کی یونانی شعرا کی تصانیف بزبان لاطینی ترجمہ ہوتی گئیں۔ ایلیڈ کا بھی ترجمہ لاطینی میں تمام کو پہنچا۔ پھر اس زبان میں شعرائے نامی پیدا ہونے لگے۔ جن کا ذکر آئندہ آتا ہے ان رومی شعرا کے کلام میں یونانی مذاق تمام تر ہویدا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رومی شعرا یونانی شعرا کے متتبع ہیں بس وہی نسبت جو اُردو شاعری کو فارسی شاعری کے ساتھ ہے۔ لاطینی شاعری کو یونانی شاعری کے ساتھ پیدا ہے۔ رومیان سابق بھی یونانیوں کی طرح بت پرست تھے اور جو انداز یونانیوں کی اصنام پرستی کے تھے وہی رومیوں کے بھی تھے۔ اسی لیے اور مضامین کے علاوہ رومیوں کی شاعری بھی یونانیوں

اور پریوں وغیرہ کے بکھیڑے سے خالی نہیں نظر آتی ہے۔ نثر بھی دونوں قوموں کی ایک ہی انداز رکھتی ہے اور حق یہ ہے کہ مضامین بت پرستی کو چھوڑ کر ہر دو قوم کی نثر و نظم خوش اسلوب اور مرغوب پیرایہ رکھتی ہیں۔ حال کا لٹریچر جو اہلِ یورپ کا ہے انھیں دونوں قوم کا ممنون ہے گویا ان دونوں قوموں کے لٹریچر حال کے اہلِ یورپ کے لٹریچر کے ہادی ورہبر ہوئے ہیں۔ اس زمانے کا لٹریچر جو اہلِ یورپ کا ہے نہایت حیرت خیز ہے۔ زبان اُس کے بیان سے قاصر ہے افسوس ہے کہ اہل فارس نے عمدہ مذاق لٹریچر کا پیدا نہیں کیا۔ نظم فارسی کی تو خیر کچھ ہے بھی نثر کا مذاق تو بہت کچھ قابل اعتراض ہے۔ اہل انصاف ارشاد فرمائیں کہ سہ نثر ظہوری مینا بازار اور حکیم قاآنی کے کلام منثور وغیرہ میں کیا خوبی ہے بلکہ جو کچھ اگلے لوگ کچھ مذاق پیدا کر گئے تھے۔ ان متاخرین نے اُسے خراب کر ڈالا ہے اسی طرح اردو کا لٹریچر بھی خراب ہو چکا تھا مگر اب مذاق بدلتا نظر آتا ہے خدائے تعالیٰ اپنا فضل شامل حال رکھے۔ نظاہر اقفا مسجع لکھنے والے حضرات تو لٹریچر کا خاتمہ کر چکے تھے مگر اس نا پرسان زبان پر اللہ نے رحم فرمایا کہ کچھ لوگ مولوی نذیر احمد صاحب وغیرہ سے پیدا ہوئے جنھوں نے عوام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ عربی، فارسی اور اُردو کے لٹریچر کی بحث آئندہ لکھوں گا جس سے بدمذاق مصنفوں کی لٹریچر کشی ظاہر ہو گی۔ خیر حضرات ناظرین ان جملہ ہائے معترضہ کو معاف فرمائیں۔ اب میں پھر رومیوں کی شاعری کی طرف رجوع لاتا ہوں اور یہ گذارش کرتا ہوں کہ چونکہ یونان و روم کی شاعریوں کا ایک ہی انداز ہے رومیوں کے مذاق شاعری کی بحث کو طول دینا ضرور نہیں معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال ذیل میں چند شعرائے رومی کے حالات و اقوال حوالۂ قلم کر دیے جاتے ہیں۔ جن سے کسی قدر

حضرات ناواقف کو اطلاع کی صورت منصور ہے۔

لکریشیس۔ لکریشیس (Lucretius) روم کے شعرائے متقدمین کا سرآمد ہے یہ شاعر بانوے برس قبل ظہور حضرت مسیح علیہ السلام کے پیدا ہوا تھا اس کی شاعری کا رنگ نہایت حکیمانہ ہے اس کی تصانیف منظوم سے ایک کتاب ہے جس کا نام حقائق الاشیاء (On The nature of things) ہے یہ کتاب سراپا فلسفہ ہے یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ یونانیوں کا مذاق فلسفیانہ رومیوں کے مذاق فلسفیانہ سے بالکل علٰحدہ تھا گو رومیوں نے فلسفہ کی دولت یونانیوں سے پائی تھی اہل یونان کو علوم ذہنیہ کی طرف میلان خاص تھا برخلاف اس کے اہل روم علوم مادیہ پر زیادہ توجہ رکھتے تھے مگر یہ شاعر برعکس اپنے قومی مذاق کے تمام تر یونانی مذاق کا پابند تھا اور وہ اسی مذاق کے ساتھ امور اخلاقی اور مذہبی کو حوالۂ قلم کرتا ہے کیا افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے شعرا کمتر یونانی اور رومی شعرا اور ان کی شاعریوں سے خبر رکھتے ہیں اگر ہمارے ملک کے موزوں طبیعت حضرات کو ان اقوام گزشتہ کی شاعری سے اطلاع کی صورت پیدا ہو تو یقیناً ایک انقلاب عظیم ہماری دیسی شاعری میں نمایاں ہو۔

کیٹلس۔ کیٹلس (Katellus) بھی روم کے شعرائے متقدمین سے ہے یہ شاعر چون برس قبل سن مسیحی کے بقید حیات تھا اس کے کلام میں بڑا درد پایا جاتا ہے واقعی اس کا انداز بیان ایسا ہی ہے کہ خواہ نخواہ دل پر چوٹ لگتی ہے اس پُردردی کے ساتھ اس کی شاعری فصاحت و بلاغت سے خالی نہیں ہے۔ بیشتر اس شاعر کے کلام عاشقانہ رنگ ہونے کے باعث غزل سرائی

کا پیرایہ رکھتے ہیں۔ علاوہ اس کے مرثیہ نگاری کی طرف بھی اُس کو میلان تھا۔ جانتا چاہیے کہ غزل سرائی کی صلاحیت ہر شاعر کو نہیں ہوتی ہے۔ واقعی جس کی طبیعت عاشقانہ رنگ یا گداختگی نہیں رکھتی ہے وہ کبھی غزل گو ہو نہیں سکتا ہمارے ملکی شاعروں میں اس وقت بھی حضرات موجود ہیں کہ غزل گوئی کے لیے وہ مخلوق نہیں ہوئے تھے اس پر بھی غزل گوئی کی جان نہیں چھوڑتے اپنے خلقی نقصانات سے باخبر ہونا بھی ایک بڑی نعمت ہے اگر انسان میں اتنی تمیز موجود رہے تو بہت سی حماقتوں سے بچ سکتا ہے بہرحال کیٹس کا کلام بلاشبہ بہت پر درد ہے اُس کے کچھ اشعار کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے اس سے اُس کی طبیعت کی خستگی اور گداختگی کا کسی قدر موازنہ متصور رہے یہ اشعار اُس نے اپنے برادر متوفیٰ کے لیے مرثیے یا نوحے کے طور پر لکھے تھے۔

مرثیہ

اے بھائی میں تیری دور افتادہ قبر پر مراسم عزا کی ادا کاری کے لیے بہت سے سمندروں کو طے کرتا ہوا اور بہت سے دیار غیر معروف سے گزرتا ہوا آیا ہوں اور تیری بے صدا خاک کے نزدیک کھڑا روتا ہوں میں تجھے بے کار پکار رہا ہوں۔ نیرہ وتا تحت الثریٰ سے کیا جواب ملے۔ اے بھائی اے بھائی زندگی کا کوئی لطف باقی نہ رہا جب بے رحمی کے ساتھ تو مجھ سے چھین لیا گیا ایک دن آئے گا جب ہم تجھ سے پھر ملیں گے اس وقت مجھ سے وہ عطیہ قبول کر جنھیں ہم لوگوں کے اجداد مقدس اور محترم ہاتھوں سے اپنے اُن عزیزوں کی قبروں پر چڑھاتے تھے جن سے وہ حین حیات میں محبت رکھتے تھے یہ نذریں بھائی کے آنسوؤں سے نم ہو رہی ہیں اب میں رخصت ہوتا

ہوں سلام تجھ پر اور تمام ہراس و بیم سے تجھ کو امان۔

واضح ہو کہ اس شاعر نے بھائی کی قبر پر نوحہ خوانی کے انداز کو خوب دکھلایا ہے اس میں نہ کوئی مبالغہ ہے اور نہ کوئی غیر فطرتی اونچے مضامین بالا کیے دیتے ہیں کہ بھائی کا غم بھائی کو کس طور پر ہونا چاہیے یعنی برادر متوفی کے غم کا کیا تقاضا ہے اگر کوئی غیر فطرتی مذاق کا شاعر ہوتا تو ایسے محل میں آسمان سے خون برساتا ابر سے آنسو گرواتا اور اسی طرح کے بدقرینہ مضامین سے نوحے کی تمام تاثیروں کو کھو دیتا۔ یہاں شاعر نے اظہار غم کے فطرتی رنگ کو اختیار کیا ہے جس کے سبب سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے جاننا چاہیے کہ غیر فطرتی انداز کے مضامین سے حظ کا اٹھنا ممکن نہیں ہے۔ جب تک کہ مذاق سامع شاعر کے مذاق کی طرح خراب نہ ہو لے غیر فطرتی شاعری مطبوع نہیں ہو سکتی ہمارے عہد کی دیسی شاعری بہت اصلاح طلب ہو رہی ہے نامطبوع استعارات اور مبالغہ پردازیوں نے وہ بے لطفی پیدا کر رکھی ہے کہ ایسی شاعری کا کوئی اثر دل پر پیدا نہیں ہوتا برخلاف اس کے ہندی شاعری دیکھی جاتی ہے۔ ہندی کے دوہرے گیت وغیرہ جو بیشتر استعارات مبالغہ پردازیوں اور بے معنی نازک خیالیوں سے معرا ہوتے ہیں۔ عجب تاثیر رکھتے ہیں ان کی سادگی اور فطرتی خوبیاں نشتر کا کام کرتی ہیں جو حال اردو کی شاعری کا ہے وہی فارسی کی شاعری کا بھی ہو رہا ہے۔ اگر سادگی اور فطرتی انداز بیان میں دلربائی نہ ہوتی تو بے چارے سعدی حافظ کو کون پوچھتا۔ میر صاحب کو کون جانتا افسوس ہے بہت سے شعرائے فارسی و اردو نے فطرتی خوبیوں سے انحراف کر کے شاعری کو سوہان روح بنا رکھا ہے انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ وضاحت کے ساتھ بدمذاق شعرا کے حالات حوالۂ قلم ہوں گے۔ جن سے شاعری کی صحت مذاق کی حقیقت

منکشف ہوگی۔

ورجل شاعر رومی ورجل (Virgil) سرآمد شعرائے روم ہے اور رومی شاعروں میں ہومیروس کا درجہ رکھتا ہے گو فی نفسہ کسی طور پر ہومیروس کا ہم پلہ مانا نہیں جا سکتا ہے شاعری کی قوت کا فرق ان دونوں میں وہی ہے۔ جو فردوسی اور نظامی میں پایا جاتا ہے۔ یہ شاعر ۱۹ برس قبل جناب مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا۔ ورجل عہد قیصر آغسطس (Caesar Augustus) کا شاعر ہے اس عہد میں رومیوں کا لٹریچر پختگی کو پہنچ چکا تھا اس قیصر کے زمانے میں سلطنت روم ہر طرح کے خرخشے سے پاک ہو کر امن و مرجع خلائق ہو رہی تھی اہل فن اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے نثر نگاری اور شاعری دونوں عروج کو پہنچ چکی تھیں چنانچہ اس بادشاہ کا عہد ترقی لٹریچر کی وجہ سے ضرب المثل ہو گیا ہے۔ اہلِ فرنگ جب کسی ایسے زمانے کا ذکر کرتے ہیں کہ جس میں لٹریچر کی ممیز ترقی دیکھی جاتی ہے یا جس میں شعرا اور نثار بکثرت دیکھے جاتے ہیں تو ایسے زمانے کو عہد آغسطس کے ساتھ یاد کرتے ہیں انگلستان کی ملکہ این (Queen Anne) کا زمانہ بھی عہد آغسطس کہلاتا ہے اس لیے کہ اُس ملکہ کے عہد حکومت میں بڑے بڑے ناظم و نثار مثلاً اڈیسن (Addison) و اسٹیل (steel) و پارنل (Parnell) و پوپ (Pope) و ٹکل (Tickell) وغیرہ وغیرہ موجود تھے۔ بہر حال ورجل نے ایسا زمانہ پایا ہے کہ جس میں ہر طرح کا امن و امان حاصل تھا سلطنت رُو بہ ترقی تھی ہر طرح کے فتنہ و فساد ہو چکے تھے تمام تر حفظ و امان کی شکل پیدا تھی قومی جاہ و حشم منتہائے اوج کو پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ ورجل کی شاعری سے یہ سب معاملات آشکارا ہیں اس شاعر کی مشہور تصنیف منظوم اینیڈ

(Aeneid) ہے یہ کتاب بارہ ابواب یا مقالات سے مشتمل ہے اور اس میں اس نے
اینیس (Aeneas) کی سرگردانی اور نبرد آزمائی کے حالات حوالۂ قلم کیے ہیں۔ اس
کتاب کی پہلی چھ جلدیں آڈیسی کا انداز رکھتی ہیں کس واسطے کہ جس طرح آڈیسی میں یولیسس
کی سرگردانیوں کے احوال رقم ہیں اُسی طرح ان چھ جلدوں میں اینیس کی سرگردانی کے
احوال مذکور ہیں باقی چھ جلدوں میں اینیس کی نبرد آزمائیاں ویسی ہی درج ہیں کہ جیسے ایلیڈ
میں اہل ٹرائے اور اہل یونان کی جدال و قتال کے احوال تحریر ہیں پس سمجھنا چاہیے کہ ورجل
نے جو اپنی زبان میں ہومیروس کے رنگ کی کتاب لکھی ہے اس کی ترتیب ہومیروس
کی ایلیڈ کے برعکس رکھی ہے یعنی ہومیروس نے پہلے ایلیڈ لکھی ہے بعد ازاں آڈیسی
تصنیف کی ہے مگر ورجل نے پہلے آڈیسی تب ایلیڈ لکھی ہے بہر حال یہ شاعر ہومیروس
کے تتبع سے خالی نہیں ہے۔ تتبع درکنار بہت مقاموں میں مضامین کی موافقت گمان سرقہ
پیدا کرتی ہے۔ خیر جو کچھ تتبع یا سرقہ کا الزام ورجل پر عائد کیا جائے اس شاعر نے اپنی
زبان میں ایک ممتاز کتاب رزمی شاعری کی تصنیف کی ہے جس سے اُس کی اور اُس کی
قوم کی بقائے نام کی شکل قائم ہو گئی ہے یہ شاعر اپنی طباعی خوش بیانی اور موزون طبعی
کی بدولت اکابر شعرائے عالم سے شمار کیا جاتا ہے۔ اور تمام تر ہومیروس، فردوسی، ملٹن
بیاس، بالمکی، میر انیس کے ساتھ یاد کیے جانے کا استحقاق رکھتا ہے اس کی تصنیف
مذکور کے متعلق جو قصہ ہے وہ یہ ہے۔

جب اہل یونان نے ٹرائے (Troy) کا محاصرہ کیا اور آخر کار اس شہر کو غارت
کر ڈالا تو اینیس (Aeneas) کسی طرح وہاں سے بچ کے کوہ آئیڈا (Ida)
کی طرف بھاگ نکلا اس شخص کے ٹرائے میں رہنے کی وجہ یہ تھی کہ پرائم (Priam)

بادشاہ ٹرائے کی بیٹی اس کے حبالۂ نکاح میں در آئی تھی۔ بہر حال ٹرائے سے بھاگتے کے وقت اُس نے کاندھوں پر اپنے بوڑھے باپ کو اُٹھایا اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا اور زوجہ سے کہا کہ ساتھ ساتھ پیچھے پیچھے چلی آ۔ اس شکل سے جب وہ اس پہاڑ تک پہنچا تو اُس نے وہاں جہاز بنائے اور جائے مناسب میں بسنے کی غرض سے سفر دریا اختیار کیا۔ ورجل لکھتا ہے کہ جب وہ جزیرہ سسلی (Sicily) سے ایطالیہ (Italy) کو جا رہا تھا اُس کے جہاز بہک کر ساحل افریقہ سے جا لگے شہر کارتھج (Carthage) جو لب ساحل واقع تھا اُس زمانے میں اُس کی ملکہ ڈائیڈو (Dido) تھی۔ اُس ملکہ نے اینیس کو بہت تواضع اور مدارات کے ساتھ اپنا مہمان کیا اینیس نے بطور تحفہ اُسے ہلن (Helen) کی کوئی پوشاک دی اُس کے قیام کے زمانے میں ڈائیڈو اُس پر فریفتہ ہو کر اُس سے مناکحت کی خواستگار ہوئی۔ مگر دیوتاؤں نے اینیس کو اس پیوند کی اجازت نہ دی یہاں سے جب اینیس روانہ ہوا تو مقام کیومی (Cumae) میں پہنچا یہاں سابل (Sybil) نے اینیس کو دوزخ کی سیر اس غرض سے کرائی کہ اینیس اپنے پدر متوفی سے اپنے حالات آئندہ کو دریافت کرے۔ یہاں سے اینیس بہت سی سرگردانیوں کے بعد دریائے ٹائبر (Tiber) میں داخل ہوا جیسا کہ اوپر رقم ہو چکا ہے۔ یہ دریا ملک ایطالیہ میں واقع ہے۔ اُس وقت ایطالیہ کا بادشاہ لٹینس (Latinus) تھا اُس بادشاہ نے اینیس کی بڑی خاطرداشت کے ساتھ مہمانداری کی اور اپنی بیٹی سے جس کا نام لوینیا (Lavinea) تھا بیاہ کر دینا چاہا مگر لوینیا کی ماں نے اس لڑکی کو قبل میں ٹرنس (Turnus) سے جو ایک بادشاہ تھا منسوب کرنا چاہا تھا۔ اسی سبب سے ٹرنس اینیس کے ساتھ

آمادۂ کارزار ہوا بہت سی لڑائیوں کے بعد یہ بات تجویز پائی کہ یہ دونوں دلاور باخود ہا
نبرد آزمائی کریں تاکہ بندگان خدا کشت و خون سے محفوظ رہیں اس نبرد آزمائی میں ٹرنس
اینیس کے ہاتھ پر مارا گیا اور اینیس نے لوینیا سے شادی کر لی۔ اپنے خسر کے انتقال کے
بعد اینیس ایطالیہ کا بادشاہ ہوا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد راہی ملک بقا ہو گیا۔
واضح ہو کہ رومیان سابق اپنے کو اینیس کی اولاد کہتے تھے اور اپنا تعلق ٹرائے کے
ساتھ بوضع بالا بیان کرتے تھے۔ چنانچہ ورجل نے عالی نسبی کے اثبات میں بیان بالا کو
اختیار کیا ہے۔ اینیس کی نسبت اہل روم کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ وہ شاہزادہ انکائیسس
(Anchises) کا بیٹا بطن زہرہ سے تھا۔ زہرہ ایک مؤنث دیوتا مانی جاتی تھی
اور عام زنان کی طرح اُس سے اجرائے نسل کی شکل ممکن تھی یونانیوں اور رومیوں کے معتقدات
کو دیکھ کر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ باوجود حاصل رہنے علم و فضل کے یہ قومیں حد درجے کے
توہمات میں مبتلا تھیں۔ اُن کی شاعریاں بھی اسی واسطے تمام تر اوہام وغیرہ سے بھری نظر
آتی ہیں اور واقعی امر یہ ہے کہ جو شخص ان قوموں کے مذہبی اخلاقی اور تمدنی معاملات سے
مطلع نہیں ہے ان کی شاعریوں سے حظ اُٹھا نہیں سکتا بہرحال وہمی خیالات کو علیحدہ
کر کے بھی ان کی شاعریوں میں اس قدر لطف اور ندرت ہے کہ اگر ایشیائی زبانوں میں ان کے
ترجمے ہو جائیں تو بہت کچھ توسیع خیالات شاعرانہ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے افسوس
ہے کہ اکثر ہمارے ملکی شعرا یونان اور روم کی شاعریوں سے حسب خواہ اطلاع نہیں
رکھتے اسی واسطے ان کے قدم ان کے محدود دائرۂ شاعری سے باہر نہیں پڑتے ہیں
دیسی شاعری کے خیر خواہوں کا یہ فرض منصبی ہے کہ فائدہ رسانی کی نظر سے ہومر و
ورجل اور دیگر شعرائے یونان کے کلاموں سے افادت کے سامان پیدا فرمائیں۔

ہارس شاعر رومی

ورجل کے بعد روم کا نامی شاعر ہارس (Horace) ہے یہ شاعر ورجل کی طرح رزمی شاعر نہیں ہے اس کے اشعار غزل قصیدہ دونوں کے رنگ رکھتے ہیں۔ مؤلف کے خیال میں اس شاعر کا کلام سفو شاعرہ اور پنڈار کے رنگوں سے ممزوج معلوم ہوتا ہے۔ ہارس نے بیشتر اوڈ لکھے ہیں جو قصائد کی تشبیب سے مشابہت رکھتے ہیں اس کے کلام کا کچھ ترجمہ ذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔ کلام ذیل ایک اوڈ ہے جس میں ہارس اپنی معشوقہ پیرا کی بیوفائی اور تلون مزاجی کی شکایت کرتا ہے اور یہ عورت جو ایک درباری عورت تھی اُسے سمندر سے تشبیہ دیتا ہے۔ تشبیہ سمندر کے ساتھ اس مشابہت سے دیتا ہے۔ کہ سمندر جب ٹھہرا رہتا ہے تو مسطح شکل ہوتا ہے اور اس سے باسباب ظاہر کوئی خطرہ نہیں معلوم ہوتا ہے مگر چشم زدن میں متموج ہو جاتا ہے اور ہلاکت کا نقشہ دکھلانے لگتا ہے ویسی ہی پیرا کی کیفیت ہے کہ پہلے نہایت مطبوع انداز دکھلاتی ہے مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کے تلون کا سمندر موجزن ہونے لگتا ہے اور عاشق کی جان پر آبنتی ہے اس تشبیہ کے بعد اپنی معشوقہ کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ ہم بھی تیرے فریب کے سمندر میں ڈوب چکے تھے مگر کسی طرح بچ نکلے اگر اس کی تصدیق درکار ہو تو کوئی جاکر دیکھ لے میری تصویر اور بھیگی پوشاک خدائے بحور کے مندر میں آویختہ ہیں یہ بیان قصہ طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل روم جیسا کہ بالا میں ذکر ہوا ہے بڑے بت پرست تھے منجملہ انواع اقسام کے دیوتاؤں کے ایک بہت بڑا دیوتا مانا جاتا تھا کہ جس کا نام نپچون (Neptune) تھا۔ یہ دیوتا سمندروں کا مالک تھا اور تمام معاملات بحری اُس سے متعلق سمجھے جاتے تھے اس دیوتا کے لیے ایک بہت بڑا مندر بھی

تعمیر کیا گیا تھا اور اہل حاجت وہاں پرستش اور پرستاری کی نظر سے جایا کرتے تھے منجملہ
اور رسومات مذہبی کے رومیوں کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کوئی رومی سفر بحری اختیار کرتا تھا
اور اتفاق وقت سے اُس کا جہاز تباہ ہو جاتا تھا اور وہ خود کسی صورت سے بچ کر وطن
کو واپس آتا تھا تو ادائے سپاس کی نظر سے وہ نجات یافتہ شخص نیپچون کے مندر میں حاضر
ہوتا اور ایک تصویر اُس میں آویزاں کرتا تھا اس تصویر میں اُس شخص اور اُس کے جہاز کی صورت
کھچی رہتی تھی مراد اس تصویر آویزی سے یہ تھی کہ خدائے بحور نے تصویر کے آویزاں
کرنے والے پر رحم کیا ہے اور ہلاکت سے نجات دی ہے اس واسطے ادائے سپاس
کی نظر سے ایسی تصویر کا آویزاں کرنا ضرور ہوا۔ ایسے وہمی مراسم سے رومیوں کی مذہبی
عقل کا انداز خوب کھلتا ہے۔ باوجود افراط عقل و دانش کے یہ قوم مذہبی خیالات
کی صفائی مطلق نہیں رکھتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل دنیا اور عقل دین دو شے
ہیں اس زمانے میں بھی بہت سی عاقل قومیں دیکھی جاتی ہیں جو باوجود پیدا کرنے ہر طرح کی
دنیاوی ترقیوں کے مذہبی معاملات میں عاجز نظر آتی ہیں یہ قومیں ہزاروں علمی طریقے
دنیا حاصل کرنے کے جانتی ہیں۔ اور اس وقت علوم و فنون میں درجۂ کمال حاصل کر چکی
ہیں۔ مگر مسئلہ توحید سے تمام تر بے خبر ہیں خدائے واحد کی پرستش کا مضمون اُن کی سمجھ
میں آتا ہی نہیں ہے جیسا اہل یونان اور اہل روم یا اور بھی بہت سی موجود قومیں جو دنیاوی
شائستگی کا نمونہ سمجھی جاتی ہیں اگر بت پرستی سے خالی نہیں تو نہ ہوں تعجب ہے اُن
اہل اسلام سے جو خواجہ خضرؑ کا بیڑا یا کاغذی کشتی بنانے والے ہیں۔ ہر سال ہزاروں
جہّال زبانی توحید کے قائل۔ برسات کے دنوں میں گنگا، گانگی، سون، پن پن اور اسی
طرح کی ندیاں اور نالوں میں کاغذی کشتیاں دھوم دھام سے حضرت خواجہ خضرؑ کی

نذر کیا کرتے ہیں اعوذ باللہ من ذٰلک بہرحال ہارس کے اوڈ کا مفہوم راقم ذیل میں عرض کرتا ہے امور بالا کے عرض کر دینے سے یہ غرض تھی کہ قصہ طلب مضامین کے بیان سے کلام شاعر آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہو جا سکے کس واسطے کہ ہر ملک کی شاعری کچھ نہ کچھ رسوم ملکی سے متعلق ہوا کرتی ہے اور ناواقفیت کی حالت میں نہ سمجھ میں آ سکتی ہے اور نہ سامع کے دل کو لذت یاب سخن کر سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اس رسم سے واقف نہ ہو کہ ایک وقت میں یہ دستور تھا کہ جو کوئی فریادی ہوتا تھا وہ دادخواہی کی غرض سے پیراہن کاغذی پہنتا تھا تو ایسا شخص مرزا نوشہ کے اس مطلع کو یعنی ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی اس سے لطف سخن اٹھا سکتا ہے۔ خیر حضرات ناظرین اب ہارس کے اوڈ کی طرف توجہ فرمائیں گو ترجمے سے اس کے اصلی کلام کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔

خطاب بہ پیرا

اے پیرا تو کس جوان حسین کو جو عطریات میں ڈوبا ہوا ہے خلوت کدوں میں ہم آغوش کیے رہتی ہے کس کے لیے تو اپنی زلفیں اس سادگی کے ساتھ سنوارا کرتی ہے ہزار حیف کہ وہ تیری طرف سے مطمئن ہو رہا ہے اسے کیا معلوم کہ اسے تیری بے وفائی کی بدولت کیا کیا نہ اشک ریزی کرنی ہوگی اسے اس کی کیا خبر ہے۔ کہ تو ابھی کیا سے کیا ہو جانے والی ہے وہ بیچارہ کیا جانتا ہے کہ تو وہ سمندر ہے کہ

جو ہر تموّج ہوا کے ساتھ کیفیت گوناگون پیدا کرتا ہے اے پیر آج سنے تجھ پر اعتماد کیا ہے کہ تو اُس کی ہو رہی ہے اُس کو ہوا کی غیر استقلالی سے تمام تر بے خبری ہے کمبخت وہ ہیں جن کی آنکھوں میں تو بھلی لگتی ہے مگر اُنھیں تیری حقیقت سے اطلاع نہیں ہے میری سرگزشت تو میری اُس تصویر سے ظاہر ہے جو خدائے بحور کے مندر کی دیوار پاک سے آویزاں ہے اور اُن تر کپڑوں سے جو وہاں لٹکے ہوئے ہیں۔ یہ چیزیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ہم غرق ہونے سے بدشواری بچ نکلے ہیں

واضح ہو کہ ہارس اپنے کلام بالا میں اُسی مضمون کو شرح و بسط کے ساتھ حوالۂ قلم کرتا ہے جس کو مرزا صائب نے مطلع ذیل میں باندھا ہے۔ ؎

چو می بینم کسے از کوے تو دل شاد می آید

فریبے کز تو اوّل خوردہ بودم یاد می آید

مگر معشوقۂ خودکام سے نجات پانے کے مضمون کو حافظ علیہ الرحمۃ نے نہایت خوبصورتی اور پرتاثیری کے ساتھ غزل ذیل میں فرمایا ہے۔

دوش وقتِ سحر از غصّہ نجاتم دادند — وندران ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

بیخود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند — بادہ از جامِ تجلّی بصفاتم دادند

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے — آن شبِ قدر کہ این تازہ براتم دادند

چوں من از عشق رخش بیخود و حیراں گشتم — خبر از واقعۂ لات و مناتم دادند

من اگر کام روا گشتم و خوش دل چہ عجب — مستحق بودم و ایں رہ بزکاتم دادند

بعد ازیں روے من و آئینۂ حسن نگار — کہ دریںجا خبر از جلوۂ ذاتم دادند

ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد — کہ بیازار غمت صبر و ثباتم دادند

این ہمہ قند و شکر کز سخنم می ریزد
اجر صبرے ست کزاں شاخ نباتم دادند

کیمیائے ست عجیب بندگی پیر مغاں
خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

بحیات ابداں روز رسانید مرا
خط آزادگی از حسن مماتم دادند

عاشق آندم کہ بدام سر زلف تو فتاد
گفت کز بند غم و غصہ نجاتم دادند

شکر شکر بشکرانہ بیفشاں اے دل
کہ نگار خوش و شیریں حرکاتم دادند

ہمت حافظ و انفاس سحر خیزاں بود
کہ ز بند غم ایام نجاتم دادند

واضح ہو کہ خواجہ حافظ علیہ الرحمۃ کے عہد شباب کی معشوقہ شاخ نبات تھی جس کا نام غزل بالا میں آیا ہے یہ عورت لولیان شیراز سے تھی۔ مگر حسن و جمال ایسا رکھتی تھی کہ شاہزادگان و اُمرازادگان اُس کے اوپر جان دیتے تھے۔ اتفاق وقت سے حافظ علیہ الرحمۃ اُس کے گھر پہنچے۔ وہ عورت ان کے انداز عاشقی کو دیکھ کر کہنے لگی کہ بغیر نقش درم کوئی عمل کارگر نہیں ہو سکتا۔ حضرت مالدار نہ تھے مگر کچھ عرصے میں زر کافی بہم کر کے پھر اُس کے گھر گئے اس بار حسب طریق زنان بازاری وہ نہایت اخلاق سے پیش آئی۔ مختصر یہ ہے کہ اُس کے گھر شب بسر کرنے کی ٹھہری صحبت اغیار سے پاک تھی اور عشق خواجہ زوروں پر تھا اُس عورت سے قریب نصف شب گئے تک، ہمکلام رہے جب اُس نے استراحت کی طرف میل دکھلایا خواجہ کو اس وقت ایک بات یاد پڑی جو اُس شب کو عمل میں لایا کرتے تھے اتفاق سے وہ شب شب آدینہ تھی۔ شب آدینہ کو خواجہ کا یہ معمول تھا کہ دو شمع مومی لے کر مصلائے شیراز کو جاتے اور وہاں قبر پر ایک امام زادے کے جو وہاں آسودہ ہیں نہایت خلوص دل سے

اُن دو شمعوں کو روشن کرنے یہ خدمت خواجہ سے کبھی ترک نہیں ہوئی تھی الّا اُس شب میں
کہ شاخِ نبات کے زور فریفتگی میں فراموش ہونے کو تھی ۔جس وقت خواجہ حسب درخواست
اُس عورت کے مایل استراحت ہونے کو تھے کہ وہ خدمت قدیمہ امام زادے کی یاد آئی
یہ سوچ کر کہ مصلائے شیراز بہت دور نہیں ہے دو گھنٹے کی تو بات ہے فوراً پھر کر چلا
آؤں گا ۔شاخ نبات کے نزدیک سے اُٹھنا چاہا شاخ نبات نے آستین پکڑی
مگر خواجہ نے نہیں مانا ۔گھر آکر دو شمع مومی لے کر مصلائے شیراز کی طرف روانہ ہوئے اور
قبر حضرت امام زادہ پر اُنھیں روشن کیا اس جوش خلوص کا یہ اثر ہوا کہ شاخ نبات کی آرزو
بالکل دل سے جاتی رہی اور مزاج پاک میں کچھ ایسا ولولۂ عشق حقیقی پیدا ہوا کہ دنیائے دون
اور اس کے کل متعلقات کی ہوس دل سے جاتی رہی ۔واقعی یہ ان کی پاکی خیالات کا اثر
ہے کہ ان کا کلام اس قدر مقبول عالم ہو رہا ہے شاعر ہوس باز و ناپاک خیال میں یہ حسن
قبول کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے ۔خواجہ کا یہ شعر ؎

این ہمہ شہد و شکر کز سخنم می ریزد
اجر صبریست کز ان شاخ نباتم دادند

اُن کی پاکبازی اور ان کی پاک خیالی کی بخوبی شہادت دیتا ہے ۔واقعی خدمت امام زادہ
بہت کام آئی ۔اور کیوں نہ ہو دوست داری خاندان پیغمبرؐ کا اگر اتنا بھی صلہ نہ ملے تو اُس
خاندان کی دوست داری سے کیا فائدہ متصور ہے ۔بہر حال خواجہ کو شاخ نبات کے بکھیڑے
سے ویسی ہی نجات ہوئی جیسا کہ ہارس کو پیرا کے دام فریب سے ۔مگر دونوں کے
کلام کو موازنہ کرنے سے خواجہ کا معاملہ ہارس کے معاملے سے بہت زیادہ روحانی
انداز رکھتا ہے ۔حضرات ناظرین کے آگے اس کے بیان کی حاجت نہیں ہے ۔

جاننا چاہیے کہ یہ شاعر آٹھ برس قبل ظہور حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا اس کے کلام مقبول خاص و عام ہیں اور یورپ میں اس کا نام ابھی تک زندہ ہے۔

لوکن شاعر رومی ۔ ہارس کے بعد رومیوں میں لوکن (Lucan) بھی ایک نامی شاعر گزرا ہے یہ شاعر ۶۵ء میں مرگیا مگر افسوس ہے کہ بنی وقت کے دین کو بے قبول کیے راہی ملک بقا ہوا۔

جونیل شاعر رومی ۔ منجملہ قابل ذکر شعرائے روم سے جُونیؔل (Junenal) بھی ہے یہ شاعر ہجوگو تھا۔ ہجوگوئی سے اُس کی مراد اصلاح ابنائے زمانہ تھی اُس کے عہد میں اس کے ملکی لوگ بتلائے بے اعتدالی ہو رہے تھے ذیل میں اس کے کلام کا کچھ مفہوم درج کیا جاتا ہے۔ یہ شاعر ۱۳۰ء میں راہی ملک عدم ہوا۔ اس کے زمانے میں رومیوں کے درمیان نثر نے زور پکڑنا شروع کیا تھا اور نظم کو زوال آنے لگا تھا۔

مضامین ہجو

کوئی کیوں تیکھے اشعار سے نہ دفتر بھرے جب سڑکوں پر ایسی خلقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ کوئی تو ایسا ہے کہ جبلیہ ہونے پر بھی ہوادار پر چھ غلاموں کے کاندھوں پہ سوار۔ دن دوپہر کمال وقاحت کے ساتھ منظر عام میں نظر آتا ہے یہ وہ شخص ہے۔ کہ جس کا عروج ایک نرخرہ اور جھوٹی تاریخ کا ممنون ہے اس بدکرداری پر بھی اُس کی آنکھیں شرم سے علاقہ نہیں رکھتی ہیں اور وہ بے تکلف نہایت اطمینان کے ساتھ میسینس (Macenus) کی طرح شہر سے گزار کرتا ہے سادہ اصح ہو

کرمیت نینس ایک نہایت عمدہ سرشت پاک طینت اور خوش مزاج رومیوں سے تھا یہ شخص قیصر آغسطس کے زمانے میں نیک نامی کے ساتھ زندہ تھا، پھر اس خلقت سے کوئی ایسی مالدار خاتون ہے کہ جس نے شوہر کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالا ہے اور اس کی دولت پر قابض ہو بیٹھی ہے اس کمبخت نے جو لوکسٹا (Locusta) سے بھی زیادہ حرافہ ہے شوہر کو حالت تشنگی میں ایسی شراب پلادی کہ جس میں زہر ہلاہل ملا رکھا تھا یہ نافرجام ابھی تک اس لیے زندہ ہے کہ اپنے ملک کی عورتوں کو زہر آمیزی کا نسخہ سکھلائے اس عورت کی بے حیائی کو دیکھیے کہ ہرچند اس پر برسر شاہراہ ہر طرف سے لعنت ملامت کی بوچھاڑ پڑتی ہی رہی مگر شوہر کی زہر خوردہ و اغار لاش کو بخوف دہر اس نصف النہار میں شہر ہو کر اٹھوا لے گئی۔

اس زمانے میں اگر کسی کو عروج منظور رہے تو طالب عروج کو لازم ہے کہ بے دھڑک جرائم کی بنیاد پر ثروت کی عمارت قائم کرے اس زمانے میں نیکی نہیں پھلتی واہ کیا کہنا ہے بدکاریوں کے وسیلے سے کیا کیا سامان عشرت میسر نہیں آتے ہیں۔ تخت عاج جام زریں ظروف بیش بہا ایوان بلند مال و عقار سب ہی نصیب ہوتے ہیں ایسے عہد میں کسے چین آسکتا ہے اور کسے زندگانی کا مزا مل سکتا ہے۔ جب حال یہ ہے کہ باپ بیٹوں کی حریص جوروؤں کو بھرپیٹ ملغوبا کھلانے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتے۔

واضح ہو کہ اس طرح کے مضامین ہجو ہر زبان میں دیکھے جاتے ہیں چنانچہ ایک اردو کا شاعر اپنے شہر آشوب میں سامان عشرت کے حاصل ہونے کو اس طور سے لکھتا ہے۔

ہمشیر کے وسیلے سے ملتا ہے شیر مال　　دولت تو ماں بہن کی بدولت نصیب ہے

اسی طرح دوسرے شاعر نے کسی مثنوی ہجو میں لکھا ہے ؎

ہوا ——— اس فتوے کا مفتی
بیک زن باپ بیٹے کریں جفتی

یہ سب اشعار جو تل کا رنگ رکھتے ہیں اور ہر زبان میں ہجو کا رنگ قریب قریب ایسا ہی ہوتا ہے البتہ شاعر کو اتنا لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ تحریر محض فحش نہ ہو جائے افسوس ہے کہ مرزا رفیع سودا کبھی کبھی اس کا لحاظ نہیں رکھتے تھے اور دائرۂ اعتدال سے ان کی شاعری کا قدم باہر چلا جاتا تھا حقیقت یہ ہے کہ فحش سے لطف کلام جاتا رہتا ہے مرزا سودا کی شوخیٔ مزاج ایسی تھی کہ ان کو فحش کی طرف مائل ہونے کی کوئی حاجت نہ تھی ایسا ظریف شاعر کیونکر مائل فحش گوئی ہوا خالی از تعجب نہیں ہے یہ اعانت فحش جو وہ کہ جاتے ہیں۔ اُس کا جواب اُردو کے علاوہ اور کسی زبان میں بھی کمتر دیکھا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا سودا کبھی کبھی محض ناچاری سے فحش گوئی اختیار کرتے تھے۔ یعنی اگر وہ فحش گوئی پر آمادگی نہ دکھلاتے تو ان کے اعدا اُن سے بھی زیادہ فحش گوئی کے معمل ہوتے ایسی صورت میں ناچار مرزا سودا کو فحش گوئی اختیار کرنی پڑی جس کی وجہ سے وہ نہ صرف دشمنوں کے واروں کو روک سکے بلکہ دشمنوں پر ان کا رُعب بھی قائم ہو گیا بہر حال جاننا چاہیے کہ فحش گوئی احاطۂ شاعری سے باہر ہے اور یہ طریقہ تمام تر واجب الاجتناب ہے۔ اُردو یا جس کسی زبان کے شاعر نے جس قدر فحش گوئی اختیار کی ہے اُس قدر اس کا کلام زنہار قابل توجہ نہیں ہے۔ ہجو گوئی اسی قدر شاعری کا حکم رکھتی ہے کہ جو فحش گوئی سے پاک ہے۔

یورپ کے عہد جہالت کا بیان اور اس عہد کی شاعری

واضح ہو کہ اہل روم بھی اہل یونان کی طرح آخر کار نیست و نابود ہو گئے اور ان کے علوم و فنون اُن کے ساتھ رخصت ہو گئے رومیوں کی بربادی کے بعد چند صدیوں تک یورپ مبتلائے جہالت رہا عیسائی راہبوں کے سوا کسی کو معمولی لکھنا پڑھنا تک نہیں آتا تھا یہ راہب اکثر چھوٹی چھوٹی ملکیتیں رکھتے تھے اور اپنے اپنے کلیسا میں بیٹھے ہوئے ہمارے بعض ملاؤں کی طرح کسی کو اپنے سوا قابل نجات نہیں سمجھتے تھے ایسے وقت میں کہ تمام یورپ پر ظلمت جہالت چھائی ہوئی تھی۔ اہل اسلام علوم پروری میں شہرۂ آفاق ہو رہے تھے ان کی سلطنتیں اسپین وغیرہ میں زوروں پر تھیں ایک شہر قرطبہ میں صدہا مدارس تھے ان مدارس میں عیسائی طلبہ دور دور ملکوں سے آکر مسلمان طلبہ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور علوم حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے ملکوں کو واپس جاتے تھے اپنے اپنے وطن جا کر ملکی لوگوں کو علوم و فنون سکھلاتے تھے یہ سلسلہ علم اندوزی کا عیسائیوں میں ایک عرصے تک قائم رہا جس کے سبب سے مختلف قومیں یورپ کی تعلیم یافتہ ہو گئیں اور حصول علوم کے ساتھ ان میں ہر قسم کی قوت بھی آ گئی۔ جاننا چاہیے کہ علم کے ساتھ قوت کو ایک خاص مناسبت حاصل ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ علم ہی قوت ہے چنانچہ انگریزی ضرب المثل ہے کہ نالج از پاور (Knowledge is Power) یعنی العلم قوۃ اور فردوسی کا یہ قول کہ ؎

توانا بود ہر کہ دانا بود

اُسی ضرب المثل کی تائید ہے بالمختصر جب اہل یورپ اس طرح مسلمانان اسفین کی بدولت صاحب علم اور صاحب قوت ہوگئے تو روز بروز ان میں ہر رنگ کی ترقیاں پیدا ہونے لگیں اور آخرکار یورپ اُس پایۂ شائستگی کو پہنچ گیا کہ جس کو آج ہم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ عیسائیان یورپ کی فلاح کا سبب مسلمانان اسفین ہوئے ہیں اگر یہ مسلمانان اسفین یورپ کے ایام جہالت میں علم پروری کو ملحوظ نہیں رکھتے تو آج یورپ مبتلائے جہالت رہتا اب اسفین و پرتگال وغیرہ میں اسلامی سلطنتیں باقی نہیں ہیں عرصہ ہوا کہ عیسائیان یورپ نے تعلیم یافتہ ہوکر اپنے اسلامی محسنوں کو اُن کے علاقوں سے نکال دیا مگر اُن کے علوم کے آثار مختلف اقوام یورپ میں اب بھی موجود ہیں۔ ابن الرشد کو جسے اہل یورپ آوِروز (Averroes) کہتے ہیں علمائے یورپ ابھی تک نہیں بھولے ہیں ایک وقت میں اس حکیم اسلامی کا فلسفہ تمام یورپ میں صحیح مانا جاتا تھا اور اب تک اس کے فلسفے سے حکمائے یورپ اطلاع رکھتے ہیں۔ اسی طرح یورپ کے لٹریچر میں مسلمانان اسفین کے لٹریچر کی بُو پائی جاتی ہے اور دو سو برس قبل کی شاعریاں اسلامی اثر سے خالی نہیں معلوم ہوتی ہیں عموماً اس عہد جہالت کی شاعریاں وہی یونانی اور رومی شاعریوں کا انداز رکھتی ہیں۔ اُس عہد کے شاعر بیشتر شعرائے یونان اور روم کے متتبع نظر آتے ہیں تمام اقوام یورپ تجدید علوم کے ساتھ شاعری کی طرف بھی متوجہ ہوتی گئیں اور شاعری کو مختلف ملکوں میں فروغ ہوتا گیا۔ اُس عہد کے شعرا میں کوئی شاعر ہومیروس یا ورجل کے رتبے کا نظر نہیں آتا ہے۔

ڈینٹی شاعر سیزدہ صدی مسیحی۔ بہرحال یہاں قابل ذکر شاعر ڈینٹی (Dante)

ہے جو تیرھویں صدی مسیحی میں زندہ تھا اور واقعی نہایت ہی خلاق مضمون تھا۔ اس
شاعر کا مولد شہر فلارنس (Florence) ہے جو ملک ایطالیہ میں واقع ہے ۔
اس کے عہد میں ملک ایطالیہ کی زبان درمیان سابق کی زبان جو لیٹن (Latin)
یعنی لاطینی تھی باقی نہیں رہی تھی وہاں اس شاعر کے عہد میں زبان اٹیالین (Italian)
مروج ہو چکی تھی جو زبان کہ اس وقت بھی بولی جاتی ہے ۔ مگر یہ شخص زبان قدیم یعنی لاطینی میں
بھی ماہر تھا ایک بہت ممتاز شاعر ہونے کے علاوہ ڈینٹی فلینڈرس کے مدبران ملک سے
بھی تھا اور مرد سپاہی ہونے کے باعث کسی طرح کی ملکی خدمتوں میں اُسے مجبوری
لاحق نہ تھی اس شاعر کے نام سے دنیا کا ہر پڑھا لکھا آدمی واقف ہے ۔ اُس کی قوت
شاعری ایک نہایت اعلیٰ درجے کی ہے اور اُس کا شمار بڑے بڑے اساتذہ کے ساتھ
ہوتا ہے ۔ منجملہ اُس کی تصانیف منظوم کے ایک اُس کی تصنیف ہے جس کا نام انفرنو
(Inferno) ہے اُس کی اس تصنیف سے تمام تعلیم یافتگان یورپ و ایشیا
اطلاع رکھتے ہیں ۔ اس مثنوی میں ڈینٹی نے جہنم کے معاملات نہایت شاعرانہ پیرائے
میں حوالہ قلم کیے ہیں ۔ ڈینٹی کی یہ تصنیف اُس کی بڑی قوت تخیل سے خبر دیتی ہے ۔

یورپ کی قدیم شاعریوں کو لکھ کر ظاہر امناسب تھا کہ راقم اُس برّاعظم کی جدید
شاعریوں کو حوالۂ قلم کرنا شروع کرتا اس سبب سے اس وقت جو وہاں کی تین سو برس
کے اندر کی شاعریاں ہیں وہ تمام تر یونان و روم کی شاعریوں کا رنگ رکھتی ہیں اختلاف
جو کچھ ہے وہ مذاق شاعری کا اختلاف نہیں ہے صرف اسباب شاعری کا اختلاف ہے
اسباب اختلاف مذہب و معاشرت و تمدن وغیرہ واقع ہوئے ہیں ۔ نفس شاعری
میں کوئی اختلاف نہیں پڑا ہے مثلاً ہومیروس اور ورجل کے عہد میں رزمی اشعار میں

دیوتاؤں وغیرہ کا ذکر دیکھا جاتا ہے اب اُس کی جگہ مسیحؑ اور ملائکہ وغیرہ کا بیان قائم ہوتا
گیا ہے اسی پر اور باتوں کو بھی قیاس کرنا چاہیے بالمختصر یورپ کی قدیم اور جدید شاعریوں
میں بنفسہ اختلاف مذاق نہیں ہے اور اگر اس وجہ سے یورپ کی جدید شاعریوں کا بیان
ان قدیم شاعریوں کے بعد احاطۂ تحریر میں در آتا تو سلسلۂ بیان پورے طور پر قائم رہتا مگر
چونکہ اہلِ عرب کو رومیوں کے بعد ہی فروغ حاصل ہوا۔ اس واسطے مناسب معلوم ہوا کہ
ہندوستان سے جانبِ مغرب میں جتنی برآوردہ قومیں گزر گئی ہیں اُن کا ذکر زمانے کے
التزام کے ساتھ درج اندا کیا جائے اس واسطے رومی شاعری کے بعد اہلِ عرب کی
شاعری کا بیان حوالۂ قلم کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اہل فارس کی شاعری کا بیان عرض
کیا جائے گا۔ اہل فارس کی شاعری کے ساتھ اُردو کی شاعری کی حقیقت بھی تحریر ہوگی
اس واسطے کہ فارسی اور اُردو کی شاعریاں مذاق شاعری کے اعتبار سے محض شے واحد
ہیں خیالات دونوں کے ہم رنگ و ہم انداز ہیں صرف دو زبان کا فرق ہے ورنہ در حقیقت
دونوں ایک ہیں۔ بعد ان بیانات کے یورپ جدید کی شاعریوں کا سلسلۂ بیان شروع
ہوگا۔ اور اس میں بیشتر انگریزی شعرا کے انداز کلام سے خبر دی جائے گی۔ اس کے بعد
سنسکرت کی شاعری سے بحث کی جائے گی اور اُس کے ذیل میں حتّی الامکان بھاشا میں
جو شاعریاں ہیں بیان ہوں گی۔ اسی کے شمول میں کبت، دوہرے اور گیتوں کے مذکور
آئیں گے آخر میں چین و جاپان و برہما کی شاعریوں کے مختصر احوال رقم ہوں گے۔
الحاصل بیانات کے اندر نظم و نثر کے متعلق جو ضروری امور ہوں گے اندراج پائیں گے۔
حضرات ناظرین سے التجا ہے کہ فقیر کی خطاؤں سے درگزر کرکے اُسے دعائے خیر کے
ساتھ یاد فرمائیں گے ۔ س

ہر چند نیم لائق بخشائیش تو　　بر من منگر بر کرم خویش نگر

اہل عرب کی شاعری

واضح ہو کہ عرب کا ملک فطرتی اسباب اور معاملات کے رو سے یونان و روم بلکہ تمام اُن دیار اور امصار سے جہاں شاعری کو فروغ ہوا ہے ایک علیحدہ انداز رکھتا ہے یہ امر بدیہی ہے کہ کسی ملک کی شاعری کے حُسن و قبح پر کوئی شخص اطلاع پا سکتا ہے جب تک اُسے اُس ملک کے تقاضائے فطرت اور معاملات مذہب - اخلاق - تمدن و معاشرت وغیرہ سے اطلاع کی شکل حاصل نہ ہو لے پس قبل اس کے کہ راقم اہلِ عرب کی شاعری کی کیفیتوں کو بیان کرے ضرور ہے کہ کچھ خود ملک عرب اور اہلِ عرب کے اُن حالات کو جو امور بالا سے تعلق رکھتے ہیں عرض کرے تاکہ وہ حضرات جو اُن سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں واقف ہو جائیں اور اس واقفیت کے ذریعے سے عرب کی شاعری کے انداز کو سمجھ سکیں تحریر ذیل سے کسی قدر امور بالا کا انکشاف متصور ہے

ملک عرب اور اس کے صوبے

عرب برّ اعظم ایشیا کا ایک وسیع ملک ہے اس کی شکل ناہموار طور پر مستطیل ہے اور اس کا زیادہ حصّہ بحور سے محاط ہے اسی لیے اسے جزیرہ نما کہتے ہیں یہ ملک برّ اعظم ایشیا کے مغربی حصّے میں واقع ہے اور اس کے ارد گرد کے ملک فارس عراق عرب اور شام ہیں - مصر جو برّ اعظم افریقہ کا ایک مشہور ملک ہے - بہت قریب اُس کی جانب مغرب میں واقع ہے ان دونوں ملکوں کو بحیرۂ احمر نے ایک دوسرے

سے جدا کر دیا ہے اور اگر یہ چھوٹا سا سمندر درمیان میں لاحق نہ ہوتا تو ان دونوں ملکوں کی
زمین ایک دوسرے کی مماس ہوتی۔ جاننا چاہیے کہ اہل یورپ ملک عرب کو تین حصوں
میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک حصہ جو زرخیز اور شاداب ہے اُسے عربیا فلکس (Arabia
Felix) یعنی عرب آباد۔ دوسرے حصے کو جو کوہستانی ہے عربیا پٹریا
(Arabia Petraea) یعنی عرب جبالی۔ اور تیسرے حصے کو جو ریتلا ہے
عربیا ڈزرٹا (Arabia Deserta) یعنی عرب ریگستانی کہتے ہیں۔ خود
اہلِ عرب اس ملک کو ان ناموں پر تقسیم نہیں کرتے ہیں۔ اُن کی تقسیم کے رو سے ان حصوں کا
نام بہ ترتیب بالا یمن حجاز اور نجد ہے۔

کیفیت ملک عرب ملک عرب عام طور سے آباد و شاداب نہیں ہے بہت حصے
اس کے ریگستانی ہیں۔ جبال بھی بہت ہیں ایک سلسلۂ کوہی بحیرۂ
احمر سے مکہ معظمہ کے قریب ہوتا ہوا بحیرۂ فارس تک چلا گیا ہے۔ علاوہ اس سلسلے
کے ایک سلسلہ اور بھی ہے جو آبنائے باب المندب سے بحیرۂ عقابہ تک جنوباً و شمالاً
مغربی ساحل عرب کے تمام طول ہو کر گزرتا ہے۔ اسی بحیرۂ عقابہ کے قرب میں طور سینا
واقع ہے۔ جس کا ذکر کتب سماویہ میں آ تا گیا ہے یہ وہی پہاڑ ہے جس کو ہمارے
دیسی شعرا بیشتر غزلوں میں باندھا کرتے ہیں یہ پہاڑ خاکنائے سویز کے جوار میں ہے
اور دریائے احمر سے بہت دور نہیں ہے زرخیز اور شاداب خطے صرف یمن حضرموت
عمان اور لحصہ ہیں علاوہ ان کے ساحلوں کے کنارے بھی شاداب ٹکڑے پائے
جاتے ہیں ایسی جگہوں میں اشجار حسب مراد نشو و نما پاتے ہیں اور اثمار بھی پیدا ہوتے
ہیں۔ ملک عرب میں کوئی ایسا دریا نہیں ہے جس میں کشتی چل سکے۔ کہیں کہیں چھوٹے

چھوٹے چشمے ہیں وہ بھی فصل گرما میں خشک ہوجاتے ہیں جھیلیں بھی کہیں نہیں ہیں جنگل بھی جیسے کہ ہندوستان یا فارس میں موجود ہیں نہیں پائے جاتے۔ بارش بعض حصّوں میں تمام سال میں ایک بار بھی نہیں ہوتی جانوران صحرائی بھی صرف چند اقسام کے ہیں۔ گرگ، شغال، پلنگ و کفتار صحراؤں میں دیکھے جاتے ہیں اور پہاڑوں میں ایک قسم کی بکریاں ہوتی ہیں جن کو اہل عرب شکار کرتے ہیں علاوہ ان کے دو چار قسم کے آہو بھی پائے جاتے ہیں جو اس ملک کے شاداب حصّوں میں رہتے ہیں ان اقسام آہوان سے ایک قسم ہوتی ہے جس کی ناف میں مشک ہوتا ہے۔ اسے اہل عرب ظبیاء المسک کہتے ہیں پرورده جانوروں میں گائے، بیل، دنبے، گھوڑے اور اونٹ ہیں یہ آخر کے دونوں جانور اس ملک کے شہرۂ آفاق ہیں جیسے گھوڑے اس ملک میں ہوتے ہیں روے زمین پر کہیں نہیں ہوتے مگر اہل عرب کے لیے بکار آمد ترین جانور اونٹ ہے طیور میں عقاب، باز، کرگس وغیرہ اکثر دیکھے جاتے ہیں اور تیتر، کبوتر، مرغ وغیرہ بھی آباد حصّوں میں بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔ مزاج اس ملک کا حار یابس ہے مگر جہاں کوہی مقامات ہیں وہاں کی آب و ہوا معتدل المزاج ہے صحراؤں میں ایسی لو چلتی ہے کہ آدمی کا ہلاک ہوجانا کوئی دشوار امر نہیں ہے۔ ایک ہوا چلتی ہے جسے باد سموم کہتے ہیں یہ غضب کی ہوا ہوتی ہے کہ کاروان کے کاروان کو بدحال کر ڈالتی ہے اس ہوا کے ساتھ ریت اس قدر اُڑتی ہے کہ آدمی اور حیوان اس میں چھپ جاتے ہیں اور سخت ایذائیں اُٹھاتے ہیں۔ پیداوار ملک کی کھجور، شہد، گیہوں، جو، تمباکو، نیل، قہوہ، قند، تمر ہندی، اقسام مصالح صمغ عربی مصطگی رومی ماہیران، انار، انگور، کشمش، زرزرد، خربوزہ وغیرہ ہیں چند قسم کی معدنی اشیا بھی دستیاب ہوتی ہیں مگر ابھی تک ملک عرب کی معدنیات کی تحقیق کافی طور پر نہیں ہوئی ہے۔

اہل عرب کا بیان

اہل عرب قامت اور جثے کے رو سے اوسط درجے کے لوگ ہوتے ہیں اکثر ان میں میانہ قد اور لاغر اندام دکھائی دیتے ہیں رنگ ان کا مائل بہ زردی ہوتا ہے مگر ان کی عورتیں صاف رنگ اور خوش رو ہوتی ہیں - ان کے گزران کا طور بہت سادہ ہے لباس اور غذا کا طور سادگی سے خالی نہیں ہوتا الا شہر والے عرب جو خوش لباسی اور خوش غذائی کو محبوب رکھتے ہیں عموماً اہل عرب کی غذا شیر شتر ہے شتر کا گوشت کمتر استعمال میں لاتے ہیں الا شہروں میں کہ جہاں شتر زیادہ تر ہے کا گوشت کثر سے بیسر آتا ہے - بادیان عرب خارپشت، موش، سوسمار ٹڈی، نیول وغیرہ بے تکلف کھاتے ہیں اسی کثیف خواری کی وجہ سے ایرانیوں نے جب معلوم کیا کہ اہل عرب ان کے ملک کے خواہاں ہیں تو حقارت کی راہ سے کہا تھا کہ اسی منہ سے ملک ایران کی تمنا رکھتے ہیں - چنانچہ صاحب شاہنامہ لکھتے ہیں سے

زشیر شتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجائے رسید ست کار

کہ ملک عجم را کنند آرزو　　تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

سوا شہریوں اور قصباتیوں کے بیشتر قبائل عرب خیموں میں اوقات کرتے ہیں اور اپنے گلوں کو چراتے ہوئے صحراؤں میں جہاں جہاں چرنی کے سامان بیسر آ سکتے ہیں پھرا کرتے ہیں یہ لوگ پورے خانہ بدوش ہیں - تقاضائے ضرورت سے ایک جگہ بود و باش اختیار نہیں کر سکتے یہ صحرائی عرب تھوڑے میں اوقات کر لینا جانتے ہیں ان کی غذا لباس اور طریقۂ معاشرت سے تمام تر سادگی عیاں ہے ان کا تمدن بھی دنیا کے تمدن سے علٰحدہ انداز رکھتا ہے قبیلے قبیلے کا شیخ ہی ان کا بادشاہ یا حاکم ہے - ان کو شائستہ اقوام دنیا کے معاملات تمدن سے کوئی علاقہ نہیں یہ لوگ یورپ کی پالیسیوں سے نہ خبر نہ کوئی سروکار

دیکھتے ہیں ان کے کانوں تک بسمارک (Bismark) اور گلیڈاسٹن (Gladstone) کے نام تک نہیں پہنچے ہیں خصائل کے رو سے یہ بادیہ نشینان عرب جنگجو، مہمان نواز، کینہ آور اور سنگ دل ہوتے ہیں۔ ان کی اوقات گزاری کا ذریعہ لوٹ مار ہے آج تک بھی سفر حجاز ان بدویوں کے باعث سے مخطور رہو رہا ہے۔ حرم در پیش و حرامی در پس سعدی علیہ الرحمۃ کا ایسا قول ہے کہ جس سے ہر زائر کعبہ خوب مطلع ہے بعثت آنحضرت صلعم کے پہلے ان مردمان صحرائی کے جو انداز تھے وہ اب بھی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان وحشیوں کو کوئی روحی فائدہ اسلام سے نہ ہوا یہ لوگ جیسے ایام جاہلیت میں تھے ویسے آج بھی ہیں۔ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

یہ بہت تعجب انگیز امر ہے کہ اسلام کی بدولت فارس، ہندوستان، کابلستان، عراق عرب شام، مصر، روم اور بنظر انصاف دیکھیے تو تمام یورپ نے فائدۂ علمی اٹھایا مگر بدویان عرب کی جہالت اپنی حالت پر رہی خیر اگر اسلام کا اثر ان بدویوں پر نہ ہوا تو نہ ہوا لیکن اس دین پاک نے شہری اور قصباتی عربوں میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم کی بعثت کے پہلے ان عربوں کے تمدنی اخلاقی اور مذہبی معاملات نہایت اصلاح طلب ہو رہے تھے مگر تھوڑے عرصے میں اسلام نے انھیں دوسری قوم بنا ڈالا مذہب ان کا بدترین شرک و کفر کا نمونہ ہو رہا تھا۔ بتوں کا شمار ایسا نہ تھا کہ کوئی شخص ان کو انگلیوں پر گن کر بتا دے سکتا خانۂ کعبہ میں تین سو ساٹھ ۳۶۰ بت سال کے ہر روز کے حساب سے موجود تھے۔ مشہور بتوں سے لات، عزا، ہبل صفا، نائلہ، منات تھے۔ آفتاب ماہتاب کو اکب سب کی پرستش ہوتی تھی۔ بتوں پر

جانور چڑھائے جاتے تھے۔ آدمی کی قربانی بھی کوئی تکلف خیز بات نہ تھی خدائے واحد کی کوئی پرستش نہیں کرتا تھا۔ تمدنی حالت یہ تھی کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا آپس میں بے دھڑک تلواریں چلا کرتی تھیں۔ عام قانون کوئی نہ تھا۔ قانون وہی سمجھا جاتا تھا جو کسی شخص یا کسی قبیلہ زبردست کی رائے ہوئی تھی۔ اخلاقی معاملات کو کیا کوئی بتائے کہ کیا تھے کوئی گناہ یا بداطواری روے زمین پر نہیں ہے جس کے مرتکب ایام جاہلیت کے عرب نہ ہوتے تھے۔ شراب خواری، قمار بازی، خونریزی، زناکاری، غارتگری، دختر کشی مروج عام تھی ان کے ہر روز کا مشغلہ ارتکاب معاصی تھا۔ الغرض ان کے جو افعال تھے اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نقصانات سے پاک نہ تھے اور سراسر اصلاح طلب ہو رہے تھے۔ جاننا چاہیے کہ وقت ظہور اسلام عرب میں تین مذہب جاری تھے ایک تو مذہب کفار عرب کا تھا جس کا مذکور بالا میں آچکا ہے یہ مذہب بدترین مشرکانہ انداز رکھتا تھا اس میں دین ابراہیم علیہ السلام کا کچھ بھی اثر پایا نہیں جاتا تھا دوسرا مذہب عیسائی تھا جو نقصان تثلیث کے علاوہ تمام تر پیرایۂ شرک رکھتا تھا۔ تیسرا مذہب موسوی تھا جو دولت توحید کو گم کر کے ہر دو مذہب بالا کی طرح خراب ہو رہا تھا مذہبی خرابیوں کے علاوہ ان تینوں مذاہب کے پیرو یکساں طور پر معاملات اخلاقی میں پسپا ہو رہے تھے مگر صدی ہفتم میں جو اسلام نے ظہور فرمایا تو عرب میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ بانی اسلام صلعم نے بت پرستی کو جو تمام معصیت کی جڑ ہے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ شرک کی جگہ توحید سکھلائی شراب خوری، قمار بازی، زناکاری، خونریزی، غارتگری، دختر کشی کا استیصال کر ڈالا مختلف قبائل عرب میں آشتی کے انداز پیدا کر دیے ان میں مواخات قائم کی معیشت کے آداب بتلائے تجارت کے رستے دکھلائے حق و ناحق کی تمیز دلائی دنیا کے ساتھ عاقبت کی رہ

سمجھائی۔ غرض وہی اہل عرب جو مذہبی، تمدنی اور اخلاقی نقصانات میں ڈوبے ہوئے
تھے۔ صاف ستھرے ہو کر ایک پاکیزہ قوم ہو گئے راقم کی دانست میں ایسے بڑے
وقت میں اسلام کا ظہور اسلام کے برحق ہونے کی ایک قوی دلیل معلوم ہوتا ہے۔

عرب کی شاعری قبل و بعد بعثت صلعم

واضح ہو کہ مذہبی، تمدنی اور اخلاقی انقلاب کے
ساتھ ہر قوم کے لٹریچر میں بھی ایک انقلاب پیدا
ہوتا ہے۔ ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ بعثت آنحضرت صلعم کے پہلے
اہل عرب کا لٹریچر کچھ بھی نہ تھا ان کے لٹریچر کا دائرہ شعر گوئی سے باہر نہ تھا اور ان کی
شعر گوئی بھی ایک محدود انداز کی تھی مگر ظہور اسلام کے بعد بتدریج عربی کا لٹریچر ترقی
کر کے ایک اعلیٰ درجے کو پہنچ گیا اس وقت جو کتابیں صرف و نحو، بلاغت، عروض، تاریخ
و تفسیر وغیرہ کی موجود ہیں۔ اہل عرب کی ترقی لٹریچر پر گواہ ہیں شاعری نے بھی پر بدلا گو
عرب کی شاعری کبھی اُس درجے کو نہیں پہنچ سکی جس درجے پر ہومیروس، ورجل، فردوسی
ملٹن، بالمکی، بیاس، میرانیس، شیکسپیر، گوئٹا یا کالیداس کی شاعریاں دیکھی جاتی ہیں
اس پر بھی اسلام نے عربی شاعری کے مذاق کی ایک معنی کر کے بڑی اصلاح کر دی۔
اور وہ یہ کہ ایام جاہلیت میں شعرا جو مضامین فسق و فجور کو بے باکانہ طور پر باندھا کرتے تھے
اور اپنی بے حیائیوں پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے یہ بد قرینگی عہد اسلام میں یک قلم مفقود
ہو گئی اور اگر مفقود نہیں ہوئی تو وہ اسلام کے رو سے ممنوع سمجھی جانے لگی لاریب اسلامی
شاعری نے تہذیبی پایہ اختیار کیا بلکہ اخلاقی راہ اس مضبوطی سے اختیار کی کہ اُس کی نظیر
کمتر اور کسی ملک کی شاعری میں دیکھی جاتی ہے چنانچہ کلام امیر المومنین کا ایسا اخلاقی
پیرایہ ہے کہ اس کی تبعیت ہر ملک کے اخلاق آموز کے لیے ضرور معلوم ہوتی ہے

چنانچہ سعدی علیہ الرحمۃ جو ایک بڑے ولی اللہ اور اخلاق آموز گزرے ہیں بہت کچھ خرمن مضامین مرتضوی کی کے خوشہ چین نظر آتے ہیں بہر حال اب حضرات ناظرین تحریر ذیل پر توجہ فرمائیں جس سے مختصر طور پر اہلِ عرب کی قبل و بعد بعثت کی شاعری کے انداز ظاہر ہوں گے۔

یہ امر بدیہی ہے کہ عرب تقاضائے فطرت سے ایسا ملک نہیں ہے کہ جو شاعری کے واسطے مخلوق ہوا ہو۔ اس کو شام، فارس، ہندوستان، مصر، روم، یونان، ایطالیہ وغیرہ کی فطرتی خوبیاں نصیب نہیں ہوئی ہیں۔ جیسی جیسی خوش سوادیاں واہب العطایا نے ان ملکوں کو بخشی ہیں اُن کا ہشتم حصہ بھی اس ملک کو تفویض نہیں فرمایا ہے اگر ان ملکوں میں جائیے تو یہ معلوم ہوگا کہ فطرت نے بہت زیادہ توجہ کے ساتھ اپنی بخششیں ان کے حال پر مبذول رکھی ہیں ان ملکوں کو سبزہ و گل سے آراستہ کیا ہے شادابی کے بیلے کثرت سے چشمے بلکہ بڑے بڑے دریا ہر طرف بہائے ہیں۔ پہاڑوں کو اشجار و اثمار سے زینت دی ہے جنگلوں کو قبائے سبز سے مخلع کیا ہے۔ میدانوں کو فرش زمردین بنا رکھا ہے بڑی بڑی جھیل اور آبشار سے میدانی اور کوہی مقامات کو تازگی بخشی ہے طرح طرح کے مرغان نوا سنج پیدا کیے ہیں اور اسی طرح کی ہزاروں نعمتیں ہیں جن سے ان ملکوں کو جنت کا نمونہ کر دکھلایا ہے۔ برخلاف اس کے اگر ملک عرب میں اس کی ایک حد سے دوسری حد تک چلے جائیے تو سوا بڑے بڑے صحرائے ریگستانی پتھریلے ٹیلوں کے جلے بھنے پہاڑوں کے بیشتر کچھ نظر نہ آئے گا یہاں کوئی جھیل لیک کومو (Lake Como) کی کیفیت کی دکھائی نہ دے گی کوئی پہاڑ دارجلنگ، منصوری، شملہ، نینی تال کے رنگ کا نظر سے نہ گزرے گا۔ کوئی دریا ڈینوب، نیل، فرات، دجلہ، جیحون، سیحون

اُرس، گنگا، جمنا، سوآن کی حیثیت کا نہ پایا جائے گا۔ اس ملک میں نہ کوئی میدان یا کوہ ایران وکشمیر کی طرح پُراز لالہ و نافرمان ہے نہ یہاں بُلبل، قمری، فاختہ، طوطی، شاما، کویل، پپیہا بھنگراج وغیرہ کی صدائے دلکش کانوں میں آتی ہے مختصر یہ ہے کہ ملک عرب اپنی ساخت کے رو سے ایسا ملک نہیں ہے کہ شاعری کے واسطے مخلوق ہُوا ہو لاریب یہاں شاعری کو میدان وسیع حاصل نہیں ہے پس ضرور ہے کہ ایسے ملک کی شاعری محدود صورت ہو چنانچہ اہل عرب کی شاعری جو ایام جاہلیت کی ہے ایسی ہی ہے تمام ان شعرائے عرب کے خیالات ایک تنگ دائرے کے اندر واقع نظر آتے ہیں ان کے تمام شاعرانہ خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعر یا اپنی معشوقہ کے حسن وجمال کا ذکر کرتا ہے یا اپنے عشق و تعشق کی کیفیت کو بیان کرتا ہے یا شراب کی خوبی اور مے کشی کے لطف کو حوالۂ قلم کرتا ہے۔ ایسے ایسے مضامین کے علاوہ یا اپنی ذاتی شجاعت یا قومی بہادری کا اظہار کرتا ہے۔ یا اپنے کسی مطبوع گھوڑے یا اونٹ کو یاد کرتا ہے انھیں اقسام کے مضامین کے ساتھ ٹیلے، ریگستان صحرا وغیرہ کے متعلق کی باتیں موزون کرتا ہے لیکن واضح رہے کہ ہرچند قبل بعثت آنحضرت صلعم کی شاعری عرب کا دائرہ محدود نظر آتا ہے۔ تاہم شعرائے ایام جاہلیت کے کلام بہت فطرتی انداز رکھتے ہیں اور مجرد اس تبعیت فطرت کی بدولت بہت کچھ قابل توجہ ہیں زبان عربی برائے خود بہت کچھ وسعت بیان رکھتی ہے اور جب اس کا استعمال تبعیت فطرت کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس کی وسعت لسانی بہت خوبیاں پیدا کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وسعت زبان اور تبعیت فطرت کی بدولت یہ شعرائے عرب اپنی شاعری کے محدود دوائرے میں بہت کچھ لطف مضامین دکھلاتے ہیں ان کی شاعری کے پُر لطف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اہل عرب مزاج

گرم رکھتے ہیں جو نعورا آور شاعری کے لیے ایک امر ضروری ہے ان شعرائے عرب کے کلام سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی معشوقہ کی تعریف کرتے ہیں یا اپنے عشق کو بیان کرتے ہیں یا اپنی شجاعت ذاتی یا قومی کا ذکر کرتے ہیں یا اسی طرح جو کچھ موزوں کرتے ہیں اسے کیفیت قلبی کے ساتھ حوالۂ قلم کرتے ہیں تصنع یا کمزوری دل کو ان کے کلام میں دخل نہیں معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ سبعہ معلقہ وغیرہ کی شاعری یہی انداز رکھتی ہے واضح ہو کہ قبل بعثت کی شاعری کا یہی انداز دیکھا جاتا ہے جیسا کہ بالا میں عرض ہوا مگر بعد بعثت شاعری کا دوسرا نقشہ بندھا ظہور اسلام کے بعد اہل عرب کو اقوام مختلفہ سے سابقے کی شکل پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کی سلطنتیں مختلف ملکوں میں پھیلیں جس کے سبب سے عرب کی شاعری میں بین انقلاب نمایاں ہونے لگے۔ عہد بنی امیہ سے مذاق عجم اہل عرب کی شاعری میں داخل ہونا شروع ہوا۔ اور عہد بنی عباس میں تو عرب کی شاعری اچھی طرح سے عجمی شاعری ہو گئی زبان تک بدل گئی وہ بے ساختگی وہ بے تکلفی وہ سادگی وہ تبعیت فطرت جو ایام جاہلیت کے شعرا کو حاصل تھی رخصت ہو گئی۔ جس خلوص جس جوش جس گداز سے شعرائے قبل بعثت شعر کہتے تھے وہ باتیں مفقود ہو گئیں۔ سلطنت کے تقاضے سے درباری شعرا پیدا ہوتے گئے شاعری ذریعۂ رزق سمجھی جانے لگی شعرا نے مدح گوئی کا پیشہ اختیار کیا۔ اس عہد میں جو و کلا اور بیرسٹر کماتے ہیں اس کا دہ چند شعرا کمانے لگے ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ روپے پانے لگے۔ تجار نے لونڈیوں کو شعر گوئی سکھلائی اور خلفا و امرا سے ہزاروں ہزار پیدا کیے غرض کہ یہ تقاضائے وقت سے شاعری جو ایک امر روحانی ہے حکم مزخرفات میں در آئی اُن زمانوں کے شعرا کے کلام سے صاف نمایاں ہے کہ اُن کی شاعری جبارین وقت کے آگے دست سوال دراز کیے

ہوئے ہے ان درباری شعرا کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی ہے ہر نامی خلیفہ کے وقت میں
ان اجرت طلب شعرا کی یہ کثرت تھی کہ ان کے ناموں کو یاد رکھنے کے واسطے ایک نہایت
قوی حافظہ درکار ہے بہر حال ان کے کلام سے یکساں بوئے زر ٹپکتی ہے اور یہ ایسا امر قبیح
ہے کہ سچی شاعری کے بہت منافی ہے بالمختصر بعد بعثت شاعری عرب نے ایک
بڑا انقلاب پیدا کیا مگر بدانست راقم اس انقلاب سے نفس شاعری کو کوئی فائدہ نہ ہوا
بلکہ اہل عرب کے فطرتی مذاق میں ایک نقصان عظیم لاحق ہو گیا۔ اہل اطلاع سے پوشیدہ
نہیں ہے کہ شاعری کو روحانیت سے تمام تر تعلق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سچی شاعری
خلوص جوش سوز و گداز سے عبارت ہے۔ پس جہاں زر اندوزی، شکم پروری اور ہوسناکی
کو دخل ہوا وہاں پھر سچی شاعری کہاں۔ ان خلفاے عرب کے زمانوں کی شاعریاں بیشتر
ایسی ہیں کہ ان کو شاعری سے کوئی علاقہ نہیں ہے اس طرح کی جتنی شاعریاں ہیں دراصل
طومار بدمذاقی ہیں افسوس ہے کہ اہل عرب نے اپنے عہد حکومت میں باوجود ہر طرح کی
علمی ترقیوں کے شاعری میں کوئی سچی ترقی نہیں کی گو عربی کا لٹریچر بہت ترقی کر گیا اور
شعر گوئی کا طوفان بھی ایک مدت دراز تک بپا رہا مگر نفس شاعری کو کوئی ترقی نہیں ہوئی
بلکہ جب تک ان کی سلطنتیں قائم رہیں شاعری زوروں کے ساتھ مبتلاے بدمذاقی رہی
اگر خلفائے عرب خوش مذاق ہوتے تو شاعری کو درجۂ ابتذال کو نہیں پہنچا دیتے۔ ایسی
صورت میں نہ درباری شاعروں کی کثرت ہوتی اور نہ احاطہ شاعری کا اس قدر محدود رہ جاتا
اگر عربی شاعری کے احاطے پر نظر ڈالیے تو اس کا احاطہ فارسی کی شاعری سے بھی زیادہ
محدود دکھائی دیتا ہے۔ اہل عرب کی شاعری قصائد، قطعات و رباعیات میں محدود
معلوم ہوتی ہے۔ زبان عربی میں ایک کتاب بھی بشکل مثنوی جیسے شاہنامہ، سکندر نامہ

یوسف زلیخا وغیرہ میں نظر نہیں آتی ہے نہ اہلِ عرب میں غزل گوئی کا مذاق دیکھا جاتا ہے کوئی عرب کا شاعر سعدی، حافظ، جامی وغیرہ کا جواب نہیں معلوم ہوتا واقعی عرب کی شاعری کا دائرہ بہت تنگ ہے اور زیادہ افسوس اس سبب سے ہوتا ہے کہ اپنے عہد حکومت میں اہلِ عرب کو دائرۂ شاعری کے وسیع کرنے کا موقع کامل طور پر حاصل تھا جس طرح اہل عرب مختلف علوم کو زبان یونانی سے اپنی زبان میں لے آئے اگر اہلِ یونان کے مذاق شاعری کو بھی اپنی طرف منتقل کر لیتے تو مثنوی نگاری اور ڈراما نگاری عربی شاعری میں داخل ہو جاتی اگر کاش یہ مذاق آجاتا تو عرب کی شاعری یونان، روم، انگلستان اور سنسکرت کی شاعری کے ہم پہلو ہو جاتی تعجب ہے کہ اس طرف خلفائے عرب نے توجہ مبذول نہیں کی اور شاعری کو اپنی مدحت سرائی کے واسطے مخصوص جانا لاریب عہد خلفائے دمشق و بغداد کی شاعری نمونہ بدمذاقی ہے۔ اسی عہد کی شاعری کا اثر ہے جو فارسی اور اُردو کی شاعری کو بھی گھیرے ہوئے ہے اور دونوں زبانوں کی شاعریوں کی بدمذاقی کا سبب واقع ہُوا ہے۔ اہلِ واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر ملک کی سچّی شاعری کو قرب سلطانی سے ضرر پہنچا ہے بہت سے طباع جو شاعری کا مذاق صحیح رکھتے تھے۔ درباری شاعر ہو کر خراب ہو نے گئے ہیں۔ انگلستان میں بھی آج تک ایک شخص درباری شاعر ہُوا کرتا ہے اس کا کام یہ ہے کہ جب کوئی خوشی کی تقریب خاندان شاہی میں ہو تو مبارک باد لکھے اور جب خلاف اس کے کوئی امر ظہور میں آئے تو مرثیہ لکھے یہ خدمت انگلستان کے عہد جہالت کو یاد دلاتی ہے۔ ایک زمانہ انگلستان کا بھی ایسا تھا کہ اس طرح کے درباری شعرا کثیر الوجود تھے ارباب تحقیق پر روشن ہے کہ سچا شاعر قرب سلطانی کا جویا ہو نہیں سکتا یہ کام ناشاعر کا ہے کہ سلاطین اور اُمرا کی جوتیاں جھاڑتا پھرے، یہ شیوہ سعدی و حافظ نے کبھی اختیار

نہیں کیا اور بعض سچے شاعروں میں سے مثلاً فردوسی اور لارڈ ٹینیسن (Lord
Tennyson) وغیرہ نے اختیار کیا بھی تو بشکل مجبوری اختیار کیا مگر اس تقرب سلطانی
پر بھی جاہ طلبی سے دور رہے اور اپنے فن کی شرافت اور عظمت کے آگے دنیا کے مال و
منال کو لاشئی سمجھتے رہے الغرض تقرب سلطانی کا بُرا اثر سچی شاعری پر پڑتا ہے بہت سے
عمدہ شاعر گزرے ہیں کہ اگر ان کو تقرب سلطانی حاصل نہ ہوتا تو اُن کی صحت مذاق میں خلل
واقع نہیں ہوتا اس کی مثال متنبی ہے کہ جو واقعی بہت بڑا طباع شخص ہے مگر اس کا کام یہی ہے
کہ سیف الدولہ کافور وغیرہ کی مدحیں لکھا کرے یہ امر بدیہی ہے کہ جو پیٹ کے لیے اہلِ
حکومت کی مدح کیا کرے اُس میں آزادی، راستی، خلوص گداز کی صفتیں کیونکر باقی رہ سکتی
ہیں ایسا شخص اگرچہ کیسا ہی شریف مزاج طبیعت دار خوش مذاق صاحب حیا اور راست باز
ہو تو بھی اس طرح کا ذلیل پیشہ اختیار کرنے سے آخر کرائے کا ٹٹو ہو جائے گا۔ راقم کو متنبی کی
قسمت پر بہت افسوس آتا ہے کہ ایسے صاحب ذہن و ذکا کو تقدیر نے ایسی ذلیل خدمت
سپرد کردی یہ بے چارہ ہمیشہ مدح گوئی کیا کرتا تھا اور جب مدح سرائی میں کچھ کمی کرتا تو مورد
عتاب ہوتا تھا چنانچہ سیف الدولہ کے رفع آزردگی کے لیے جو اشعار کہے ہیں اُس کا
مطلع یہ ہے۔

اَرٰی ذٰلِکَ الْقُرْبَ صَارَ اِزْوِرَارَا　　وَصَارَ طَوِیْلُ السَّلَامِ اِخْتِصَارَا

کوئی شک نہیں کہ تمام اشعار بڑی ذہانت اور طباعی سے خبر دیتے ہیں۔ مگر سچے
شاعر کا یہ کام نہیں کہ جو متنبی کو کرنا پڑتا تھا اگر اس کے ممدوحین شاعری کا مذاق صحیح رکھتے
تو ایسے طباع شخص سے شاعری کے عمدہ عمدہ کام لیتے اگر مجرد شاعری کی قابلیت پر
لحاظ کیجیے تو متنبی سخن آفرینی اور طباعی میں کبھی ہومیروس، ورجل وغیرہ سے کم نہیں ہے

مگر افسوس یہ ہے کہ اس نے شاعری کے اعتبار سے نہ مناسب زمانہ نہ مناسب ملک
پایا سلطنت کی بدمذاقی کے باعث یہ حیرت افزا شاعر بے کار عالم وجود میں آیا بلکہ
ہزار حیف کہ دنیا سے درباری شاعر کا پورا نمونہ بن کر راہی ملک بقا ہوا علاوہ متنبی کے
بہت سے اور بھی درباری شعرا ہیں کہ جن کا بیان خالی از طوالت نہیں ہے خلفائے بغداد
کے درباران سخن فروشوں سے بھرے رہتے تھے کہاں تک کوئی ان کے نام لے۔
یہ شعرا بیشتر حصول مال ومنال کے لیے شعر کہتے تھے ان لوگوں کو شاعری کے مذاق صحیح
سے کیا علاقہ ان لوگوں نے شاعری کو ایک کثیر النفع روزگار سمجھ لیا تھا اور زر اندوزی
کی نظر سے شعر کہا کرتے تھے بعض جب شکل منفعت نہیں دیکھتے تھے تو شاعری کو خیرباد
کہ کر کوئی دوسرا دھندا اختیار کرتے تھے چنانچہ کُثَیِّر سے جو لوگوں نے پوچھا کہ اب
شعر کیوں نہیں کہتے تو اس نے جواب میں یہ کہا کہ جوانی گزر گئی عزّہ مرگئی عبد العزیز
نہ رہا اب نہ وہ اُمنگ ہے نہ ولولہ نہ کوئی امید صلہ پھر کون سی شے باقی ہے۔ جو
مجھ سے شعر کہوائے ایسا جواب سوائے ناشاعر کے اور کون دے سکتا ہے اہلِ انصاف
ملاحظہ فرمائیں کہ شاعری میں جوانی و پیری کو کیا دخل ہے بلکہ شاعری تب ہی جوان ہوتی ہے
جب شاعر پیر ہوتا ہے جوانی کے اشعار بھی اشعار ہوتے ہیں بیشتر اس عمر کے ایسے
ہی اشعار ہوتے ہیں کہ خود شاعر معمر ہو کر اُن کی اصلاح کرتا ہے یا اُنھیں ضائع کر ڈالتا
ہے۔ علاوہ اس کے شاعری کو دل سے تعلق ہے۔ اور معاملات دلی جو واقعی معاملات
دلی ہوتے ہیں جوانی اور پیری سے بحث نہیں رکھتے یہ کیسا خیال ہے کہ جب جوانی گئی تو
شاعری بھی رخصت ہو گئی سچا شاعر یا شاعری کا سچا مذاق رکھنے والا جوانی اور پیری میں یکساں
شاعری کا دلدادہ ہوتا ہے بلکہ سچی شاعری کے لیے تو یہ کہنا نہایت صحیح ہے کہ عمر کا تو

اُس پر کچھ نہیں ہوتا بلکہ سچا شاعر نہ پیر ہوتا ہے اور نہ مرتا ہے سدا جوان و زندہ رہتا ہے کس واسطے کہ شاعری کی وہ آگ جو اُس کے قلب میں خدا کی جانب سے ڈالی جاتی ہے اس کو نہ بوڑھا ہونے دیتی ہے اور نہ مرنے دیتی ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

دُوسرا سبب شاعری کے ترک کا جو کثیرؔ نے عزہ کے مرنے کو قرار دیا یہ بھی ایک بے معنی امر ہے اگر کثیر سچا شاعر ہوتا تو اُس کی شاعری اس واقعہ سے اور ترقی کر جاتی اس کا کلام اور مزہ دار ہو جاتا معشوقہ کا مرنا سچے شاعر کے لیے نہایت مضمون خیز امر ہے اس حادثے سے شاعری کا ترک ہو جانا چہ معنی دارد پہلے اگر کثیر عزہ کے عشق میں غزل سرائی کیا کرتا تھا تو اب اُس کے مرثیے لکھتا جیسا کہ مومن خاں دہلوی نے مرگ معشوقہ پر ایک نہایت پُر درد مرثیہ لکھا ہے۔ مگر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کثیر کو عزہ کے ساتھ ویسا ہی تعلق تھا جیسا کہ ہوسناکوں کو ہُوا کرتا ہے۔ تیسرا سبب یہ کہ عبدالعزیز نہ رہا البتہ اجرت طلب شاعر کے لیے ایک امر عظیم تھا۔ درباری شاعر کو جب یافت کی صورت باقی نہیں رہی تو پھر کیوں شعر گوئی کی تکلیف گوارا کرنے لگا یہ آخر قول کثیر کا درباری شعرا کی حقیقت حال سے خبر دیتا ہے سچے شاعر کو بادشاہ کے وجود و عدم سے کیا مطلب۔ شاعری نہ ہوئی گدائی ہوئی جب تک شاعر سلاطین و اُمرا سے فارغ نہ ہو بیٹھے پھر شاعر کیا ہے حق یہ ہے کہ درباری شاعروں کا مذاق شاعری ہی نہیں خراب ہو جاتا ہے بلکہ اُن کے تمام قوائے اخلاقیہ ماؤف ہو جاتے ہیں اور یہ خرابی مجرد شاعروں کو لاحق نہیں ہوتی گئی بلکہ تقرب سلطانی کی بدولت بہت سے علمائے ادب بھی درباری مزاج ہو گئے تھے۔ ہر صحبت کا ایک اثر خاص ہوتا ہے دربار خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس بیشتر ایسے

تھے جہاں خلق محمدی کا نشان دشواری سے ملتا تھا اور دین محمدی یاندارد تھا یا اہلِ غرض کی دست اندازیوں سے بہت کچھ اپنے مرکز سے تجاوز کر گیا تھا بیشتر خلفا شراب خوار مردم آزار، بدکار، ظلم سرشت، خوشامد دوست دشمن عقل تھے ان کے درباری بھی بیشتر بفحوائے النّاس علیٰ دین ملوکھم اُسی عقل و دین کے لوگ تھے پس ایسے درباروں کے متعلق جو شاعر یا ادیب تھے ان سے صلاح و تقویٰ کی کیا امید کی جا سکتی تھی۔ ایسے شعرا و علمائے ادب کے اخلاق حمیدہ کیونکر درست رہ سکتے تھے ان شعرا و علما کو خوشامد اور ظرافت سے چارہ نہ تھا اگر خلفا اور امرا کے خوش کرنے کے لیے مستعد نہ رہتے تو روپے کیونکر ملتے اکتساب معیشت کے لیے اُنھیں سب کچھ کرنا پڑتا تھا پھر آپس میں بغض و حسد کو راہ دیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی تفضیح میں مضایقہ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اصمعی جو ایک مشہور ادیب ہے اور شاید اس کا جواب کم کوئی ادیب ہوگا ایک روز امین الرشید کے وزیر فضل بن ربیع کے پاس موجود تھا اُس وقت ابو عبیدہ بھی جو اُس کا ہم پلہ ادیب سمجھا جاتا تھا وہاں حاضر تھا اصمعی نے ایک گھوڑے کے ہر عضو کی نسبت عربی اشعار پڑھے۔ ابو عبیدہ اس طرح کی اشعار خوانی سے قاصر رہا فضل نے وہی گھوڑا اصمعی کو دے دیا۔ اصمعی کہتا ہے کہ جب ہمیں ابو عبیدہ کو چھیڑنا منظور ہوتا تھا تو اُسی گھوڑے پر سوار ہو کر ہم ابو عبیدہ سے ملنے کو جاتے تھے۔ اس حکایت سے صاف ہویدا ہے کہ اصمعی باوجود ایک بڑے ادیب اور محقق فن ہونے کے سراپا درباری مزاج کا آدمی ہو گیا تھا۔ اتنے بڑے شخص کا ندیم وزیر و امیر ہونا ایک حیرت انگیز امر ہے اُس پر سے طرہ یہ ہے کہ حریف کو چھیڑنے میں اُس روش کو اُس نے اختیار کیا جو عوام کالانعام کی عموماً ہوا کرتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ درباری شاعری سچی شاعری سے

براحل دور ہوا کرتی ہے اور در حقیقت شاعری کا حکم نہیں رکھتی ہے۔ بہر حال اب راقم
اُس شاعری کا ذکر پیش کرتا ہے جو مذاقِ صحیح سے خبر دیتی ہے اور یہ وہ شاعری ہے کہ
ہر ملک اور ہر زمانے میں قابلِ قدر اور قابلِ تعظیم ہوا کرتی ہے اُس کی عمدگی سے ہر قوم
اور ہر شخص کو اعتراف ہوتا ہے اور وہ ایسے اقوالِ منقح سے مشتمل ہوتی ہے جس کی مقبولیت
کبھی معرضِ گفتگو نہیں ہوتی یہ شاعری تمام تر رضائے الٰہی کی نقلِ صحیح ہوتی ہے اور اس
سچی خوشی رُوح کو مترتب ہوتی ہے اور اس انشراح کی بدولت قوائے اخلاقیہ ترقی کر
جاتے ہیں اور اخلاقِ ذمیمہ اخلاقِ حمیدہ سے مبدل ہو جاتے ہیں۔ زبانِ عربی میں ایسی
شاعری کی قلت نہیں دیکھی جاتی ہے گو درباری شاعری کی کثرت سے عربی شاعری بہت
کچھ داغی ہو رہی ہے۔ بہر حال انتخاباتِ ذیل سے عربی شاعری کے انداز ظاہر ہوں گے اور
حضرات ناظرین ان انتخابات کو فقیر کی تحریراتِ بالا کے مضامین سے مطابق پائیں گے۔

عربی شاعری کے نمونے واضح ہو کہ ایامِ جاہلیت میں بہت شعرا گزرے ہیں اُس زمانے میں جو
شخص شاعر ہوتا تھا وہی تعلیم یافتہ اور محصل سمجھا جاتا تھا۔ شاعری
ہی تمام کمالات کی دلیل سمجھی جاتی تھی راقم ایامِ جاہلیت کے انداز شاعری کو دکھلانے
کے لیے کچھ اشعار کتاب سبعہ معلقہ سے انتخاب کر کے خدمتِ حضرات ناظرین میں پیش
کرتا ہے یہ کتاب سات قصائد سے مشتمل ہے اور یہ وہ قصائد ہیں جو عہد جاہلیت میں
خانۂ کعبہ میں آویزاں کئے گئے تھے۔ فصحائے عرب کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی قصیدہ
انشا کرتے تھے تو اُسی خانۂ کعبہ میں اس غرض سے لٹکا دیتے تھے کہ اگر کوئی شاعر دعویٰ
سخن رکھتا ہو تو اُس کا جواب لکھے یہ سات قصیدے ایسے تھے کہ جن کا جواب ایام
جاہلیت کے کسی شاعر سے نہ ہو سکا تھا چنانچہ یہ قصائد یوں ہی معلق رہے یہاں تک کہ

اسلام نے ظہور فرمایا اور فصاحت و بلاغت قرآنی کے سامنے اُن قصائد کا کوئی وزن باقی نہیں رہا اور تب یہ قصائد خانہ کعبہ سے دُور کیے گئے۔

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَىٰ حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ ۔۔۔ بِسِقْطِ اللِّوَىٰ بَيْنَ الدَّخُولِ فَحَوْمَلِ

معنی ۔ اے ہر دو ہم نشینان میرے ٹھہرو تاکہ ہم یاد میں حبیب و منزل حبیب کے جو ایک ریگ تودے پر درمیان دخول اور حومل کے واقع ہے رولیں۔

قصیدۂ اولیٰ از امرء القیس ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر ملک کی شاعری کا ایک رنگ خاص ہوتا ہے اور اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ہر ملک کی افتاد ایک خاص رنگ کی ہوتی ہے ملک عرب کی شاعری خاص کر اُس عہد کی کہ جب اہل عرب کو اقوام مختلفہ سے مخالطت کی نوبت نہ پہنچی تھی اہل عرب کے طریقہ گزران سے پوری خبر دیتی ہے چنانچہ یہ شعر اُس قوم کے ملکی انداز کو خوب دکھلاتا ہے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ریتیلی زمین پر کبھی معشوقہ شاعر کا قیام تھا یہ قیام بے وجہ نہ تھا وہ معشوقہ ایک ایسے قبیلے کی تھی کہ جو مویشی کی چری کے خیال سے اُس جگہ مقیم تھا اور جب وہاں چری کی صورت باقی نہیں رہی کسی اور طرف چلا گیا پس اپنے قبیلے کے ساتھ معشوقہ بھی روانہ ہو گئی شاعر جو اب اُس موضع پر پہنچا تو حبیب اور منزل حبیب کی یاد سے اُس کا دل بھر آیا اس واسطے اپنے دو ساتھیوں کو جو اُس کے ہمراہ تھے کہنے لگا کہ اے ہمدمو ٹھہر جاؤ کہ ہم یہاں اشک فشانی کرلیں اس کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شعرائے عرب جو شیلا مزاج رکھتے تھے جوشیلے مزاج والے بیشتر شاید باز ہوتے ہیں اور اشک ریزی پر تلے رہتے ہیں ایسے مزاج والوں کا گزر ایسی جگہوں پر جہاں اُنھوں نے کبھی لطف زندگانی اُٹھائے ہوں اور اب وہ جگہیں ویران دکھائی دیتی ہیں بس غدر

توحش واندوہ اُن کے دلوں میں پیدا کرے بجا ہے صحبت گزشتہ کو یاد کرنا ایک امر فطرتی ہے کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جو دل رکھتا ہو اور خوشی کے وقتوں کو یاد کر کے آہ حسرت نہ کھینچے اس شعر سے امرء القیس کی بڑی طبیعت داری کا اظہار متصور ہے یہ شعر ایک پُر درد معاملۂ قلبی سے خبر دیتا ہے سامع کے لیے بھی ضرور ہے کہ واردات قلبیہ کے تقاضوں سے باخبر ہو تاکہ اُس کی نیچرل خوبیوں کو حسب مراد درک کر سکے ۔ لطف گزشتہ کے مضمون کو میر تقی صاحب نے بھی خوب باندھا ہے آپ فرماتے ہیں ؎

جہاں آ گئے بہاریں ہو گئی ہیں　　　وہاں اب خار زاریں ہو گئی ہیں

یہ دو مصرعے بہت کچھ واردات قلبیہ سے خبر دیتے ہیں اور توحش واندوہ پیدا کرنے کے قوی آلے ہیں مرزا نوشہ کا قطعہ بھی اس جگہ قابل ذکر ہے ۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل　　　زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　　میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی　　　مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ　　　یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں　　　نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

سبحان اللہ کیا انداز کلام ہے بلا شبہ اُردو کی شاعری ایسے حضرات شعرا کی بدولت ایک بڑے درجے پہنچ گئی ہے یہ کلام معجز نظام ہر ملک کے ارباب کیفیت و دانست کو وجد میں لانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے ۔ اپنے قصیدے میں امرء القیس نے صحبت

گزشتہ کے مضمون کو نہایت پسندیدگی کے ساتھ حوالۂ قلم کیا ہے اور واردات قلبیہ کی کیفیتیں زور بیان سے خوب دکھلائی ہیں مگر ان امور ولی کو حضرت حضرت غالب نے بھی قطعۂ بالا میں بڑی دردناکی اور گداز کے ساتھ قلم بند فرمایا ہے اور واقعی عمر رفتہ اور صحبت گزشتہ کے مضامین ایسے ہی ہیں کہ ان کا بیان بھی ایسے ہی حسرت انگیز اور پُرجوش انداز سے کیا جائے بعض حضرات جو شاعر طبیعت نہیں ہیں اور کچھ ضرورت سے زیادہ خلط بلغم اپنی ترکیب جسمانی میں رکھتے ہیں اُن کو ایسے کلام سے کوئی لطف حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ یا واردات قلبیہ سے بالکل معرا ہیں یا ان کی مرطوب مزاجی کے باعث اُن پر واردات قلبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا خدا جانے حقیقت حال کیا ہے مگر فقیر کو بعض ایسے حضرات سے سابقہ ہُوا ہے کہ جو ایسے اشعار سے کسی طرح کا حظ نہیں اُٹھا سکتے چنانچہ ایک روز کی سرگزشت یہ ہے کہ فقیر حسب عادت ایک شکارگاہ میں خیمہ زن تھا اس شکارگاہ میں فقیر کا آنا برسوں کے بعد ہُوا تھا۔ بار اوّل میں جو احباب تشریف رکھتے تھے اُن میں سے ایک صاحب بھی اس جلسۂ شکار کے شریک نہ تھے۔ کچھ تو ان میں بقید حیات نہ رہے تھے اور کچھ متفرق ہو کر جہاں تہاں چلے گئے تھے اُس وقت یہ حسرت دامنگیر ہوئی کہ اے خدا یہ چشمے یہ پہاڑ یہ جنگل تو جیسے پندرہ برس پہلے تھے اب بھی ویسے ہی دکھائی دیتے ہیں مگر یہ مجلس وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ اُس وقت یاران رفتہ یاد آتے گئے اور جو جلسۂ سابق میں لطف ہوتے گئے تھے دل کی آنکھ کے سامنے پھرنے لگے اُس گھڑی طبیعت بھر آئی اور فقیر نے شعر بالا امرء القیس کا پڑھا اور کچھ اردو اور فارسی اشعار بھی پڑھے اس کے بعد صحبت سابق کے متعلق کچھ پُرحسرت باتیں بھی زبان پر آ گئیں ایک شریف شخص راقم کے قریب بیٹھے ہوئے تھے یہ حضرت نہ شاعری سے غرض اور نہ شکار انگی سے مطلب رکھتے تھے کسی غرض خاص سے شکار گاہ

تک چلے آئے تھے میرے حسرت آلود کلام کو سن کر نہایت بے پروائی سے بول اُٹھے کہ دُنیا کا یہی طور ہے اس میں شک نہیں کہ دنیا کا یہی طور ہے مگر دل کا بھی یہی طور ہے کہ صحبت گزشتہ اور یاران رفتہ کو یاد کرکے محزون ہو ایسا شخص جو واقعی اسباب غم سے محزون نہ ہو یا بہت اعلیٰ درجہ کا فلسفی ہے یا اقسام سنگ وخشت سے ہے۔

فَتُوضِحَ فَالْمِقْرَاۃُ لَمْ یَعْفُ رَسْمُهَا   لِمَا نَسَجَتْهَا مِنْ جُنُوبٍ وَشَمْأَلِ

معنی۔ وہ منزل حبیب واقع ہے درمیان دخول وحومل اور درمیان توضح اور مقرات کے اور نشان منزل حبیب ابھی تک باقی ہے اس لیے کہ زمین منزل حبیب کی مسطح ہے اُس پر اگر باد جنوبی خاک ڈالتی ہے تو باد شمالی اُس خاک کو اُڑا کر لے جاتی ہے اس سبب سے منزل حبیب کا نشان باقی رہ گیا ہے اور وہ منزل خاک میں پوشیدہ نہیں ہوگئی ہے۔ شاعر نے یہ شعر کہہ کر منزل حبیب کے حدود اربعہ کو پورا کر دیا اور اس سے یہ بھی خبر دی کہ اُس کا نشان محو نہیں ہوگیا ہے یہ بقائے نشان دل میں ولولۂ غم پیدا کرنے کے واسطے کافی ہے نشان سرائے دوست کیا کیا لطف گزشتہ نہیں یاد دلا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر آنکھیں اشک حسرت نہ بہائیں تو کیا کریں۔ واضح ہو کہ امرء القیس نے ان اشعار میں شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کو نہایت بامذاقی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ خارجی امور کی اگر اچھی تصویر کھینچی ہے تو داخلی امور کی بھی اچھی بندش دکھلائی ہے یعنی منزل حبیب کا بیان اگر اچھے طور پر کیا ہے تو منزل حبیب کے دیکھنے سے جو واردات قلبیہ پیدا ہوتی ہیں اُن کو بھی پُرتاثیری کے ساتھ موزون کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اُن واردات قلبیہ کو صرف دو تین لفظوں کے ذریعے سے ظاہر کیا ہے مگر یہ دو تین لفظ ایسے ہیں کہ ایک دفتر کا حکم رکھتے ہیں خاص کر ایسے حضرات کے لیے جو معاملات قلبی سے اطلاع رکھتے ہیں۔

تَرٰی بَعَرَ الاٰرَامِ فِی عَرَصَاتِہَا وَقِیعَانِہَا کَاَنَّہٗ حَبُّ فِلْفِلِ

معنی - اے مخاطب دیکھ تو منزل حبیب کی فضاؤں اور کشادگیوں میں آہوان سفید کی مینگنیوں کو گویا کہ وہ دانہ فلفل ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ یا منزل حبیب ایسی تھی کہ ایک نہایت آباد جگہ تھی اُس میں معشوقہ قیام رکھتی تھی یا اب وہاں آہوان صحرائی رہتے ہیں اور وہ جگہ غیر آباد پڑی ہے۔ شاعر منزل حبیب کی ویرانی کو بیان کرتا ہے اور ذکر آہوان صحرائی کا اس واسطے کرتا ہے کہ یہ جانور پورا نمونہ وحشت ہوتے ہیں اور مدام بیابان میں رہتے ہیں۔ جب تک کوئی جگہ پورے طور پر ویران نہ ہو لے یہ وہاں قیام اختیار نہیں کرتے بلا گفتگو یہ شعر نہایت نیچرل رنگ رکھتا ہے اور ایشیائی مبالغہ سے تمام تر پاک ہے فقیر نے شغل شکار میں اپنی آنکھوں سے آہوان صحرائی کو ایسے مقاموں میں قیام اختیار کرتے دیکھا ہے جو ایک وقت میں نہایت آباد ہوں گے مگر اب اس قدر وہ جگہیں غیر آباد ہو رہی ہیں کہ بے تکلف وحوش وحشی وہاں خواب وخور کرتے ہیں۔ شاعر کے قول کا لطف تب ہی سامع کو پورے طور پر نصیب ہوتا ہے جب وہ معاملات عالم سے ذاتی خبر رکھتا ہے فقیر اس شعر کے لطف کو عرض نہیں کر سکتا۔ کس قدر یہ شعر نیچرل ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس وقت ہندوستان میں بہت مقامات ایسے ہیں کہ جو امراء نو ابان وراجگان سابق کے قلعے اور قصور تھے مگر اب وہ افتادہ ہیں اور ان میں گرگ وپلنگ، سابر، نیل، چیتل وغیرہ رہتے ہیں اور اب وہ عمارتیں شکار گاہ کا حکم رکھتی ہیں فقیر نے بارہا ایسی عمارتوں کو دیکھ کر بے اختیار اشک ریزی کی ہے۔ اور ہر شخص جو انھیں دیکھے گا ضرور متاثر و متالم ہو گا شاعری کے واسطے ہر طرح کی اطلاع درکار ہے شاعر شاگرد فطرت ہوتا ہے۔ انہیں کے کلام کے سمجھنے کے واسطے فطرت اللہ سے

باخبر ہونا واجبات سے ہے وہ شخص جو گھر کے اندر بیٹھا ہوا شعر کہتا ہے یا اس پاشکستگی کے ساتھ اُستادوں کے کلام کو سمجھنا چاہتا ہے وہ ایسے نیچرل اشعار کے لطف کو کیا پا سکتا ہے ممکن نہیں کہ ایسے خانہ نشین عنکبوت سیرت شخص کو نیچرل بیانات سے حظ کامل حاصل ہو سکے سبحان اللہ امرء القیس نے شعر بالا میں مضمون ویرانی کو خوب باندھا ہے عشرت سرائے محبوب میں جو انقلاب عظیم پیدا ہوا ہے اُسے بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ دکھلایا ہے۔ فخر المتاخرین حضرت غالب نے بھی خانہ ویرانی کے مضمون کو عجیب جدت کے ساتھ باندھا ہے آپ فرماتے ہیں۔ ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہر چند یہ شعر خود شاعر کی خانہ ویرانی کا اظہار کرتا ہے اور منزل حبیب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تاہم اس سے غایت ویرانی کا مضمون بڑی ندرت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اس شعر میں بھی امرء القیس نے شاعری کے دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا ہے اگر الفاظ خارجی معاملات واضح طور پر بیان کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ ان خارجی معاملات سے جو واردات قلبیہ شکل پکڑتی ہیں وہ بھی خوب صورت طور سے معناً بیان ہو جاتی ہیں یعنی شاعر نے الفاظ سے منزل حبیب کی موجودہ حالت بیان کی ہے۔ مگر نہج بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ جس سے اندوہ و توحش کا عالم پیدا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب کو دیکھ کر کیونکر کوئی آنسو نہ بہائے پس شاعر کا پہلے شعر میں یہ کہنا کہ اے میرے ہمدمو یہاں ٹھہر جاؤ کہ ہم منزل حبیب کی یاد میں رولیں نہایت قرین فطرت ہے ایسے معاملات، تو الم خیز اور حسرت انگیز ہوتے ہی ہیں کیونکہ دل نہ بھر آئے اور آنکھیں پُر آب نہ ہو جائیں فقیر کا ایک قطعہ بھی اسی رنگ کا ہے باجازت حضرات ناظرین آثم اُسے ذیل میں عرض کرتا ہے ؎

اب نہ گل ہیں نہ وہ چمن شاداب ۔۔۔ بلبلوں کا جہاں ترانا تھا
سنتے ہیں وہ شجر بھی سوکھ گیا ۔۔۔ جس پہ صیاد آشیانا تھا

كَأَنِّي غَدَاةَ الْبَيْنِ يَوْمَ تَحَمَّلُوْا
لَدَى سَمُرَاتِ الْحَيِّ نَاقِفُ حَنْظَلِ

معنی ۔ گویا کہ میں فراق کی صبح کو جس روز کہ یاروں نے کوچ کیا سمرات حی کے نزدیک حنظل کو شکستہ کر رہا تھا ۔

سمرات درخت طلح کو کہتے ہیں اور حی عبارت ہے قبیلے سے اور حنظل کو شکستہ کرنے سے مراد ہے زار زار رونا حنظل ایک نہایت تلخ پھل ہے جو شخص حنظل کو توڑتا ہے اس کی آنکھوں سے بہت آنسو رواں ہوتے ہیں اسی طرح جیسا کہ پیاز کے پیسنے والے کی آنکھ سے بہت پانی گرنے لگتا ہے ۔ پس مراد شاعر یہ ہے کہ جس دن صبح کے وقت یاروں نے کوچ کیا میں قبیلے کے درخت طلح کے پاس زار زار رو رہا تھا یہ شعر معاملات خارجی کے اعتبار سے تمام تر عربی مذاق رکھتا ہے ۔ اگر صوبہ بہار کا کوئی شاعر اس رنگ میں شعر کہتا تو درخت طلح کی جگہ درخت نیب یا درخت برگد وغیرہ کو ذکر کرتا کسی ملک خاص کے کلام سے لطف اٹھانے کے واسطے سامع کو اس ملک کی حالتوں سے باخبری واجبات سے ہے لیکن مضمون شعر ایسا طبعی ہے کہ ہر ملک کے شاعر نے یادِ وقتِ سفر کے مضامین کو مختلف رنگوں سے موزوں کیا ہے مرزا نوشہ فرماتے ہیں ؎

جب بتقریب سفر یار نے محمل باندھا ۔۔۔ تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا

کسی کا یہ شعر بھی خالی از درد نہیں ہے گو زبان پرانی ہو گئی ہے ۔ ؎

اے مانجھی لگا کشتی مرا محبوب جاتا ہے ۔۔۔ کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے

ظاہر ہے کہ اس طرح سے معاملات خارجی کے ساتھ خاص عرب کا پیدا و متوطن شاعر مضمون سفر کو نہیں باندھے گا کس واسطے کہ اُس کے تمام دیار میں کوئی ایسا دریا نہیں ہے کہ جو سفر بحری کے قابل ہو یہ شعر ملک ہندوستان کے معاملات خارجی سے تعلق رکھتا ہے اور اہل ہند کے نہایت حسب حال ہے۔ اُستاد فن شیخ امام بخش ناسخ بھی مضمون مفارقت کو یوں باندھتے ہیں ؎

وہ اُدھر رخصت ہوا اُٹھا اِدھر طوفان اشک
تیرتا جاتا تھا اُس قاتل کا توسن آب میں

ہر چند اس شعر میں نیچرل انداز قائم نہیں رہا ہے تو بھی اس سے شیخ غفران مآب کے زور طبیعت کا انداز ظاہر ہوتا ہے۔ لمؤلفہ

رقت رہی مجھ کو ترے وقت سفر ایسی
ہوتے ہوئے رخصت تجھے اے یار نہ دیکھا

ہوئے ہوش ہیں اُن کی رخصت کے بعد
نہیں ہم کو معلوم کب وہ گئے

وُقُوْفًا بِهَا صَحْبِیْ عَلَیَّ مَطِیَّهُمْ
یَقُوْلُوْنَ لَا تَهْلِكْ أَسًى وَتَجَمَّلِ
وَإِنَّ شِفَائِیْ عَبْرَةٌ مُهْرَاقَةٌ
فَهَلْ عِنْدَ رَسْمٍ دَارِسٍ مِنْ مُعَوَّلِ
كَدَأْبِكَ مِنْ أُمِّ الْحُوَیْرِثِ قَبْلَهَا
وَجَارَتِهَا أُمِّ الرَّبَابِ بِمَأْسَلِ
إِذَا قَامَتَا تَضَوَّعَ الْمِسْكُ مِنْهُمَا
نَسِیْمَ الصَّبَا جَاءَتْ بِرَیَّا الْقَرَنْفُلِ

فَفَاضَتْ دُمُوْعُ الْعَيْنِ مِنِّیْ صَبَابَۃً
عَلَی النَّحْرِ حَتّٰی بَلَّ دَمْعِیَ مِحْمَلِ

معنی ۔ میرے احباب اُس جگہ میرے آگے اپنے ناقہ ہائے سواری کو استادہ کر کے مجھ سے کہتے ہیں کہ غم سے اپنے کو ہلاک نہ کر ڈال اور صبر اختیار کر حالانکہ میری بیماری کی صورت شفا اشک ریزی ہے پس اس منزل ویران شدہ کے نزدیک کوئی ایسا شخص ہے کہ جو میری نالہ زنی کا شریک ہو رونے سے منع کر کے پھر احباب میرے حال پر ترس کھا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ تیرا طور عشق عُنیزہ میں ویسا ہی ہے جیسا کہ قبل ہی ام حویرث کے عشق میں تھا اور بھی ام حویرث کی اُس ہمسائی کے عشق میں تھا ۔ جس کا نام ام الرباب اور جس کا مقام کوہ ماسل تھا یہ دونوں معشوقہ ایسی تھیں کہ جب وہ نقل و حرکت کرتی تھیں تو اُن سے بوئے مشک نکل کر پھیلتی تھی اُسی طور پر جیسے نسیم بوئے قرنفل لے آتی ہے پس جب احباب نے مجھ کو رونے سے منع کیا اور یہ کہا کہ عشق عُنیزہ سے تجھ کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا جیسا کہ عشق ام حویرث اور عشق ام رباب سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو جاری ہوگئے آنسو میری آنکھوں سے سوزش عشق کی وجہ سے اور بہ نکلے ۔ میری ہنسلی پر یہاں تک کہ میرے اشکوں نے میری دوال شمشیر کو تر کر ڈالا ۔

واضح ہو کہ اشعار بالا سے صاف عیاں ہے کہ سوا ملک عرب کے شاعر کے اس رنگ کے اشعار کوئی دوسرے ملک کا شاعر نہ کہے گا یہ اشعار معاملات اہل عرب سے خوب خبر دیتے ہیں اُونٹوں کی سواریاں عادت شاہد پرستی جوشیلا پن حار مزاجی خوبرویوں کی طرف میلان خلقی عطریات کا طبعی شوق بہادرانہ عشق بازی یہ جتنی باتیں ہیں اہل عرب کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں ۔ حتّٰی کہ بیان فرط گریہ میں دوال شمشیر کا مضمون فروگزاشت نہ ہوا ۔ بنگالہ کا شاعر گریہ و شمشیر میں کیا شکل مرابطت پاتا جوان دو نامربوط چیزوں کو

بہم کر دیتا بہرحال علاوہ ملکی خصوصیتوں کے یہ اشعار بہت نیچرل انداز رکھتے ہیں گو اخلاقی پایہ ان اشعار کا بہت عالی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان سے پورے عشق کا انداز نہیں ٹپکتا ہے یعنی جس عشق بازی کو شاعر نے حوالۂ قلم کیا ہے وہ ہوسناکی سے خالی نہیں دکھائی دیتی ہے اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس واسطے کہ عہد جاہلیت کے عرب نسوانی معاملات میں کسی اصول معقول کے پابند نہ تھے۔ بہرکیف یہ اشعار فطرتی لطف سے خالی نہیں ہیں احباب کا دوستانہ سمجھانا اور صبر کی ہدایت کرنا اور اس فہمائش سے غم عشق کا ترقی کرنا اور بے قراری سے اشکوں کا جوش مارنا نیچرل کیفیتوں سے خبر دیتا ہے واقعی عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ نصیحت گر کی نصیحت سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ آتش عشق تیز ہو جاتی ہے اور ناصح کو چپ ہو جانا پڑتا ہے بقول استاد غزل مومن خان دہلوی سے

نالۂ پیہم سے یاں فرصت نہیں   حضرتِ ناصح کریں ارشاد کیا

فقیر کے چند اشعار فارسی جو حسب حال ہیں ذیل میں پیش کش حضرات ناظرین ہوتے ہیں

لمؤلفہ

ناصح تو جلوۂ رخ جاناں ندیدۂ   زلفِ سیاہ و کاکلِ پیچاں ندیدۂ
واعظ حدیث خوبیٔ طوبیٰ براہِ شوق   زاں بیکسی کہ سروِ خراماں ندیدۂ
بر کفرِ من ز بیخردی طعنہ مزن   چشمش کہ ہست دشمنِ ایماں ندیدۂ
بنشیں مگو ز سختیٔ روزِ جزا سخن   رنج و مصیبتِ شبِ ہجراں ندیدۂ
طوفانِ نوح شمۂ طوفانِ اشکِ ماست   اے ابر جوش دیدۂ گریاں ندیدۂ

دوسرا امر طبعی جو امرء القیس نے حوالۂ قلم کیا ہے وہ یہ ہے کہ گریے سے غم میں
تسکین ہو جاتی ہے اس واسطے وہ کہتا ہے کہ مجھے گریاں دیکھ کر احباب صبر کی فرمائش کرتے
ہیں حالانکہ رونا وہ شے ہے کہ مریض غم کے لیے عین شفا ہے افراط غم میں ضبط گریہ ایک
خوفت انگیز امر ہے جو لوگ ضبط کو راہ دیتے ہیں یا ضبط پر مجبور ہو جاتے ہیں ان کا غم جلد زوال پذیر
نہیں ہوتا بلکہ ممکن ہے کہ ضبط سے ہلاکت نتیجہ ہو حالت غم میں رونا ایک امر طبعی ہے
فطرت نے گریے کو غم ربائی کا ذریعہ بنایا ہے یہ عوام کا خیال محض غلط ہے کہ اسلام کے
رو سے گریہ کرنا امر ممنوع ہے اس تنگ چشمی کا متقاضی کبھی اسلام نہیں ہے اسلام میں
کسی غیر فطرتی امر کی فرمائش نہیں ہے جب انسان کو غم ہوگا تو ضرور روئے گا۔ اسلام ایک
امر فطرتی کا کیوں مانع ہونے لگا۔ خود پیغمبر خدا صلعم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے
دفن ہونے کے وقت اشک باری کی۔ اشک ریزی تو متوفی کا حق ہے فطرتی طور پر
اس حق کی ادا کاری کیوں ممنوع ہونے لگی۔ نادانوں نے صبر کے معنی یہ سمجھ لیے ہیں کہ چشم
پُر آب ہونا نہیں چاہیے اس غیر فطرتی فرمائش کا ایک بیّن نتیجہ تو یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ
ایسے خیالات کے پابند جو لوگ ہوتے ہیں اُن میں ایک ممیز درجے کی سنگ دلی آجاتی
ہے خدا نے بے وجہ آنسو کو مخلوق نہیں کیا ہے۔ اس کی خلقت کا مطلب یہی ہے۔ کہ
دل کو نرم رکھے پس جن کے آنسو غیر فطرتی ضبط سے خشک ہو گئے ہوں اُس سے
نرم دلی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ تیسرا امر طبعی جس سے شاعر نے اپنے کلام کو زینت
دی ہے وہ یہ ہے کہ تقاضائے فطرت سے انسان حالت غم میں اپنے درد کا شریک
ڈھونڈتا ہے پس یہ قول امرء القیس کا کہ هَلْ عِنْدَ رَسْمٍ دَارِسٍ مِنْ
مُعَوَّلِ نہایت فطرتانہ لطف رکھتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہاں کوئی ایسا ہے جو میری

آہ وزاری کا شریک ہو۔ نواب سید محمد خان رند فرماتے ہیں۔ ~~شعر~~

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

بلا شبہ یہ دونوں نیچرل مذاق رکھتے ہیں غم کی حالت میں کسی ہمدرد کا نہ ہونا غم کی مصیبت کو دو گونہ بڑھا دیتا ہے پس شدت غم کو ظاہر کرنے کے لیے امرء القیس نے نہایت بامذاقی کے ساتھ اس سوال کے پہلو کو اختیار کیا ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ایسا کوئی غمخوار نہیں ہے جو اس کی تسکین خاطر کا سبب ہو۔

أَلَا رُبَّ يَوْمٍ كَانَ مِنْهُنَّ صَالِحٍ
وَلَا سِيَّمَا يَوْمًا بِدَارَةِ جُلْجُلِ
وَيَوْمَ عَقَرْتُ لِلْعَذَارَى مَطِيَّتِي
فَيَا عَجَبًا مِنْ كُورِهَا الْمُتَحَمَّلِ
فَظَلَّ الْعَذَارَى يَرْتَمِينَ بِلَحْمِهَا
وَشَحْمٍ كَهُدَّابِ الدِّمَقْسِ الْمُفَتَّلِ

معنی۔ آگاہ ہو کہ بہت سے خوشی کے دن ان معشوقوں کے وصل میں بسر ہوئے ہیں۔ بالخصوص وہ دن کہ دارۃ جلجل میں گزرا اور وہ دن کہ جب میں نے واسطے زنان دوشیزہ کے اپنے ناقہ سواری کو ذبح کر ڈالا اور میں نہایت تعجب کرتا ہوں اس کے پالان سے کہ ان عورتوں نے باخود بار کر لیا تھا پس جب میں نے اپنے ناقہ سواری کو ذبح کر ڈالا تو اس روز وہ زنان دوشیزہ اس کے گوشت بریان کو ایک دوسری کے سامنے ڈالتی گئیں اور بھی اس کی تلی ہوئی چربی کو جو بٹے ہوئے ریشم کی طرح نرم تھی۔

انہی اشعار کے مضامین قصہ طلب ہیں اور وہ یہ ہے کہ زنان قبیلہ دارۃ الجلجل کو گئی

تھیں مگر اُن کے وہاں پہنچنے سے پہلے امرء القیس پہلے سے پہنچ کر وہاں چھپ رہا تھا
اُسے یہ معلوم تھا کہ جب وہ عورتیں موضع آب میں پہنچتی ہیں تو وہاں غسل ضرور کرتی ہیں
چنانچہ وہ زنان دوشیزہ جن میں عُنیزہ بھی شامل تھی موضع آب میں پہنچ کر آمادۂ غسل ہوئیں
پانی میں اُترنے کے قبل سبھوں نے اپنے کپڑے اُتار ڈالے اور عریاں ہو کر داخل آب
ہوئیں - امرء القیس کہ اپنی گھات میں تھا اُن کے سارے کپڑوں پر قابض ہو بیٹھا اور
یہ قسم کھائی کہ زنہار اُن کی پوشاکیں اُس وقت تک نہ دوں گا جب تک وہ سب پانی سے
نکل کر بحالت عریانی اُس سے فرداً فرداً اپنی پوشاک کی خواستگار نہ ہوں اس پر وہ عورتیں
اُس سے جھگڑنے لگیں مگر اُس نے کچھ نہ سُنا ناچار اُن عورتوں سے ایک جو زیادہ شوخ
تھی پانی سے نکل کر اُس کے سامنے گئی اور خواستگار پوشاک ہوئی - امرء القیس نے اُس کا
کپڑا اُس کے حوالے کر دیا پھر اسی طرح سب آتی گئیں اور رفع عریانی کرتی گئیں -
مگر عُنیزہ جو اُس کی معشوقہ تھی پانی سے باہر نہ آئی اور امرء القیس کو کپڑا دینے کی قسم
دی اُس نے کہا کہ جس طرح اور عورتوں نے کیا تو کیوں نہیں کرتی آخر کار جب بہت
مجبور ہوئی تو پانی سے باہر آئی اور طالب پوشاک ہوئی - امرء القیس نے اُسے اچھے
طور سے عریاں دیکھ کر اُس کی پوشاک بھی اس کے حوالہ کر دی جب سب عورتیں کپڑے
پہن چکیں سبھوں نے امرء القیس کو ملامت کرنا شروع کیا اور کہنے لگیں کہ تو نے ناحق
ہم سبھوں کو بھوکا رکھا اور گھر جانے میں مانع ہوا اُس پر اُس نے کہا کہ اگر ہم اپنے ناقۂ
سواری کو ذبح کر ڈالیں تو تم سب تناول کرو گی سبھوں نے کہا ہاں - امرء القیس نے
اپنے ناقے کو ذبح کر ڈالا اور ان عورتوں نے لکڑی جمع کر کے اُس کے گوشت کو بھونا
اور خوب کھایا امرء القیس کے ساتھ ایک مشکیزہ شراب کا بھی تھا اُس نے اُنھیں

مے بھی پلائی جب کھا پی کر وہاں سے روانہ ہونے لگیں تو ان عورتوں نے امرء القیس کے ناقۂ سواری کے پالان اور اس کے اسباب کو اپنے اونٹوں پر بار کر لیا اور خود امرء القیس کو ان عورتوں کی سفارش سے عنیزہ کے اونٹ پر درمیان اس کے کوہان اور اس کی گردن کے جگہ ملی۔

واضح ہو کہ یہ اشعار ایام جاہلیت کے اہل عرب کی عشق بازی کی پوری تصویر ہیں ظاہر ہے کہ کوئی شخص پابند اسلام ایسی حرکات کو کب جائز سمجھے گا۔ اسلام میں عورتوں کو اس طرح دیکھنا فعل حرام ہے ہر چند یہ اشعار لفظاً فحش نہیں ہیں مگر معناً تمام تر فحش ہیں یہ اسی قسم کی شاعری ہے جسے اسلام نے ممنوع کر دیا ہے۔ علاوہ تقاضائے اسلام کے اس وضع کی حرکتیں تمام دنیا کے قانون اخلاق کے رو سے ناپسندیدہ ہیں ان اشعار سے تمام تر فسق و فجور کے انداز مترشح ہیں ان مقدوح معاملات کو عشق بازی سے کیا علاقہ ایسے ایسے افعال سوا لچے گنڈوں کے اور کس سے صادر ہوں گے۔ بہرحال ان اشعار سے اہل عرب کے عہد جہالت کے انداز اخلاق کا خوب پتا لگتا ہے بلا گفتگو اس عہد کے اہل عرب کی صحبت نہایت نامطبوع اور قابل اصلاح تھی ایسے ہی معاملات پر غور کرنے سے صاف ہویدا ہوتا ہے کہ اسلام کے ایسے دین کی کیا ضرورت تھی۔ خیر یہ اشعار امرء القیس کے اخلاقی پایہ ہے جو کچھ زشت و زبون ہوں مگر ان سے ملکی خصوصیات کا اظہار بخوبی متصور ہے۔ سوا اہل عرب کی طبیعت داری کے کہاں ہے کہ کسی ملک کے عیاش کو اپنی سواری کے جانور کو معشوق کے واسطے ذبح کرنے کی نوبت پہنچی ہو گی نہ اس خواہش اور رغبت کے ساتھ کسی ملک کے معشوق نے اونٹ کے گوشت سیر ہو ہو کر چکھے ہوں گے۔ اور نہ

کسی عاشق کو معشوقہ کے اونٹ کی گردن پر سوار ہونے کا اتفاق ہُوا ہوگا۔ البتہ اس طرح نہاتی ہوئی عورتوں کے کپڑوں پر قابض ہو بیٹھنے کا قصہ ہندوستان میں کنہیاجی کی نسبت کہا جاتا ہے اور کسی ملک میں تو اس کی نظیر راقم کو نہیں ملی ہے۔ مگر کنہیاجی کا قصہ ساختہ معلوم ہوتا ہے تاریخی ثبوت نہیں رکھتا ہے۔

وَیَوْمَ دَخَلْتُ الخِدْرَ خِدْرَ عُنَیْزَۃٍ
فَقَالَتْ لَکَ الوَیْلَاتُ اِنَّکَ مُرْجِلِی
تَقُولُ وَقَدْ مَالَ الغَبِیطُ بِنَا مَعًا
عَقَرْتَ بَعِیْرِی یَا امْرَءَ القَیْسِ فَانْزِلِ

یعنی ۔ اور وہ بھی خوشی کا دن تھا کہ جب میں عنیزہ کے محمل میں داخل ہُوا۔ پس اُس نے مجھ سے کہا کہ وائے تجھ پر تو مجھے پیادہ کر دینے والا ہے (یعنی تیرے سوار ہونے سے میرا اونٹ زخمی ہو جائے گا اور قابل رفتار نہ رہے گا پھر مجھے پیادہ چلنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہیگا) جب میں داخل محمل ہو گیا اُس وقت وہ کہنے لگی درحالیکہ ہم دونوں کے بار سے ہودج کج ہو گیا کہ تو نے میرے اونٹ کو زخمی کر ڈالا۔ اے امرء القیس ہودج سے اُتر اور چلا جا۔

اخلاقی پہلو ان اشعار کا محتاج بیان نہیں ہے۔

فَقُلْتُ لَهَا سِیْرِی وَاَرْخِی زِمَامَهُ
وَلَا تُبْعِدِینِی مِنْ جَنَاکِ المُعَلَّلِ
فَمِثْلُکِ حُبْلَی قَدْ طَرَقْتُ وَمُرْضِعٍ
فَاَلْهَیْتُهَا عَنْ ذِی تَمَائِمَ مُحْوِلِ
اِذَا مَا بَکَی مِنْ خَلْفِهَا انْصَرَفَتْ لَهُ

یُشِقَ وَتَحْتِی شِقُّہَا لَمْ تُحَوَّلِ

معنی ۔ جب عنیزہ نے اپنے اونٹ سے اُتر جانے کو کہا تو ہم نے اُس سے کہا کہ اونٹ کو چلا اور اس کی مہار کو ڈھیل دے اور مجھے اپنے میوۂ رسیدہ سے محروم نہ رکھ پس بہت بار تیری ایسی زن حاملہ کے پاس میں شب کے وقت گیا ہوں اور دودھ پلانے والی عورت کے پاس بھی اور باوجود اس کے مرضعہ ہونے کے اُسے اُس کے یک سالہ بچّہ سے جو اس عمر میں تعویذات پہنے رہتا ہے پھیر کر اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے پس جب اُس کا بچّہ اُس کی پیٹھ کے پیچھے رونے لگتا تو وہ آدھے دھڑ سے اُس کی طرف مڑتی درحالیکہ اس کا دوسرا آدھا میرے نحت میں تھا اور اُس کو بحالت خود رہنے دیتی

شارحوں نے اُس کو فحش صریح سے بچانے کے لیے اس کے معنی یوں بتائے ہیں کہ جب اس کا لڑکا رونے لگتا ہے تو وہ اُس کی جانب پھرتی اور گوشۂ چشم سے اُسے دیکھتی درحالیکہ ایک رخسارہ اس کا میرے زیر دہن تھا اور اُسے وہ میری جانب سے نہیں پھیر لیتی تھی اس تاویل پر بھی یہ اشعار اخلاقی پائے سے بہت کچھ گرے ہوئے ہیں عاشق کا اپنی معشوقہ سے یہ کہنا کہ شب کے وقت ہم بہت سی زنان، حاملہ اور مرضعہ کے پاس گئے ہیں اور ہرچند ایسی عورتوں کو مرد کی طرف میلان نہیں ہوتا مگر ہم ایسے مرد ہیں کہ ان عورتوں کو بھی ہماری طرف میلان ہُوا اور تو نہ حاملہ نہ مرضعہ ہے۔ تجھ کو مرد کی خواہش کیوں نہ ہوگی۔ کچھ عجب مضمون ہے خود یہ کیا کم فحش ہے۔ جو شارح کو فحش سے بچنے کی شکل پیدا کرنے کی حاجت ہوئی۔ کوئی صاحب عشق معشوقہ سے ایسی ناپاک گفتگو نہیں کرتا یہ تو محض شہدوں کی سی بات چیت ہے اور اُس کو عاشقانہ مذاق سے کیا علاقہ ایسے ہی خیالات ناپاک نے شاعری کو بدنام کر دکھا ہے

اور بلاشبہ ایسی ہی شاعری اسلام کے رو سے ممنوع ہے یہ اشعار مرزا شوق لکھنوی کے کلام کا انداز رکھتے ہیں جنھوں نے چار مثنویاں تصنیف فرمائی ہیں اور جن کی یہ سب مثنویاں پایۂ اخلاق سے گری ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ حکم گورنمنٹ سے اُن کی اشاعت روک دی گئی ہے۔

وَيَوْمًا عَلَى ظَهْرِ الْكَثِيبِ تَعَذَّرَتْ　　عَلَيَّ وَآلَتْ حَلْفَةً لَمْ تَحَلَّلِ

معنی۔ اور وہ بھی دن خوب تھا کہ جب پشت ریگ تودہ پر عنیزہ نے مجھ پر سختی کی اور مجھ سے رُک رہی اور میری مواصلت اور ملاقات سے قسم کھائی اور ایسی قسم کھائی کہ جس میں انشاء اللہ نہ کہا اور اس کا کہنا ایسا ہوتا ہے کہ جس سے قسم بالکل ہو جاتی ہے یعنی عنیزہ نے ایسی قسم کھائی کہ وہ اُٹھ نہیں سکتی تھی تھے اُس سے تقریر ذیل کی جو بہت سے اشعار سے مشتمل ہے۔

أَفَاطِمُ مَهْلًا بَعْضَ هَذَا التَّدَلُّلِ　　وَإِنْ كُنْتِ قَدْ أَزْمَعْتِ صَرْمِي فَأَجْمِلِي

معنی۔ اے فاطمہ چھوڑ بعض اپنے ناز و کرشمہ کو اور اگر تو نے مفارقت پر آمدگی کی ہے تو مجاملت کو راہ دے یعنی کوئی شدت کی کارروائی نہ کر۔

أَغَرَّكِ مِنِّي أَنَّ حُبَّكِ قَاتِلِي　　وَأَنَّكِ مَهْمَا تَأْمُرِي الْقَلْبَ يَفْعَلِ

معنی۔ تو اس بات پر مغرور ہو رہی ہے کہ تیرا عشق درجۂ کمال کو پہنچ کر میرا قاتل ہو رہا ہے اور اس بات پر بھی مغرور ہو رہی ہے تو جو کچھ ہم کو حکم دیتی ہے میرا دل اُسے بجا لاتا ہے یعنی اس یقین سے کہ تیرا عشق ہم پر غالب ہے اور جو کچھ تو کہتی ہے ویسا ہی میرا دل کار بند ہوتا ہے تو ناز و کرشمہ کرتی ہے اور مفارقت کی سناتی ہے یہ بات اچھی نہیں ہے۔ عاشق سے کنارہ خوب نہیں۔

وَاِنْ تَکُ قَدْ سَاءَتْکِ مِنِّیْ خَلِیْقَةٌ　　فَسُلِّیْ ثِیَابِیْ مِنْ ثِیَابِکِ تَنْسُلِ

معنی ۔ اور اگر میری کوئی خلق تجھے پسند آیا ہو تو مفارقت اختیار کر تیری خوشی عین میری خوشی ہے ۔ میں یہ کب گوارا کر سکتا کہ کوئی بات تیری مرضی کے خلاف ہو۔

یہ شعر بڑی کسر نفسی اور بے غرضی سے خبر دیتا ہے رضائے دوست کے مقابل میں اپنی آرزو کا خون گوارا رکھنا عین عاشقی ہے ؎

صلاح ما ہمہ آنست کان صلاح شماست

مگر یہاں امرء القیس میسے بے لوث اور پاک عشق کو پیش نظر نہیں رکھتا ہے یہ تقریر خود غرضی سے خالی نہیں ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ عنیزہ اُس سے کسی طور پر مفارقت قبول کرے اگر یہ ہوتا تو اسی قدر کہکے رہ جاتا آئندہ کے کلام کہے دیتے ہیں کہ ایسے اظہار بے غرضی سے معشوق فریبی مراد تھی

وَمَا ذَرَفَتْ عَیْنَاکِ اِلَّا لِتَضْرِبِیْ　　بِسَهْمَیْکِ فِیْ اَعْشَارِ قَلْبٍ مُقَتَّلِ

معنی ۔ تیری آنکھوں سے آنسو نہیں جاری ہوئے الا اس غرض سے کہ اپنے دونوں تیروں یعنی ہر دو تیر ہائے نگاہ سے میرے عشق کے مارے ہوئے دل کو تو مجروح کرے ۔

واضح ہو کہ یہاں شاعر نے معشوقہ کے رونے کے مضمون کو نہایت تبعیت فطرت کے ساتھ ذکر کیا ہے عورت کے پاس قوی ترین آلہ جس سے وہ مرد پر غالب آیا کرتی ہے آنسو ہے ۔ فمرا لقدا خرین حضرت غالب خوب فرماتے ہیں ؎

کرے ہے قتل لگاوٹ یہ تیرا رو دینا　　تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

وَبَیْضَةِ خِدْرٍ لَا یُرَامُ خِبَاءُهَا　　تَمَتَّعْتُ مِنْ لَهْوٍ بِهَا غَیْرَ مُعْجَلِ

معنی ۔ بہت سی ایسی زنان حسین صافی رنگ و پردہ نشین ہیں کہ ان کے خیمے کی طرف قصد

نہیں کیا جا سکتا ہے اس سبب سے کہ وہ عورتیں صاحب رتبہ اور بڑی قوم والی ہیں اس پر بھی میں نے
ایسی عورت کے ساتھ لعب و بازی کی اور وہ بھی عجلت کے ساتھ نہیں بلکہ بے خوف ہو کر۔

تَجَاوَزْتُ أَحْرَاساً إِلَيْهَا وَمَعْشَراً عَلَيَّ حِرَاصاً لَوْ يُسِرُّونَ مَقْتَلِي

معنی ۔ پس اُس تک یعنی اُس زن پردہ نشین تک پہنچ گیا پاسبانوں کو ٹپ کر اور
بھی ایسے لوگوں کو جو پوشیدہ طور پر میرے مقتل کے خواہاں تھے یعنی ہر چند اُس زن پردہ نشین کے
خیمہ کی محافظت پاسبان کرتے تھے اور ایسے لوگ بھی نگہبان تھے جو میری شجاعت شعاری
کی وجہ سے برملا طور پر میرے قتل پر اقدام نہیں کر سکتے تھے تاہم میں اُس زن پردہ نشین تک
پہنچ گیا اور محافظین سے کچھ نہ ڈرا۔

شعر آئندہ میں شاعر زن پردہ نشین تک پہنچنے کے وقت کو بیان کرتا ہے ۔
واضح ہو کہ معشوقہ کے ساتھ اس وضع کی گفتگو کہ میں ایسا عیاش دلیر ہوں اور میں اعلیٰ
درجہ کی عورتوں کے ساتھ اس طور پر پیش آیا ہوں اور یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے ۔ سچے
مذاق عشق بازی سے بعید ہے ظاہراً ان سب باتوں کے کہنے کا یہ مطلب ہے
کہ اے عنیزہ اگر تو مجھ سے کنارہ کشی پر آمادہ ہے تو یہ خوب نہیں ہم ایسے بہادر
عیاش ہیں کہ اپنا جواب نہیں رکھتے تو میرے عشق کی قدر کر اور مجھ سے مفارقت
روا نہ رکھ۔

إِذَا مَا الثُّرَيَّا فِي السَّمَاءِ تَعَرَّضَتْ
تَعَرُّضَ أَثْنَاءِ الْوِشَاحِ الْمُفَصَّلِ

میں اُس زن پردہ نشین تک اُس وقت پہنچا کہ جس وقت پروین نے آسمان میں
اپنے کرانہ[1] و ناحیہ کو آشکارا کیا مثل آشکارا کرنے اُس حمیل کے جس کے دو مہرتوں سے کے

---

[1] یعنی کنارہ ۱۲

درمیان کچھ زر کی چیز حائل رہتی ہے اپنے کرانہ دناجیہ کو

واضح ہو کہ یہاں ثریا کو تشبیہ کمر زیب کے ساتھ دی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اہ
کمر زیب موتیوں سے بناتے تھے اور جب موتیوں کو رشتے میں پروتے تھے
دو موتیوں کے درمیان زر کے تار دیتے یا زرین دلنے داخل کرتے تھے تو جب
پروین کے تارے ایک دوسرے سے فرق معلوم ہوتے ہیں کمر زیب کے مو
بھی ایک، دوسرے سے علحدہ نظر آتے تھے لاریب یہ تشبیہ نہایت خو ر
مرغوب ہے مختصر یہ ہے کہ شاعر اپنے جانے کے وقت کو بیان کرتا ہے کہ یہ
وقت اس زن پردہ نشین کے پاس پہنچا کہ جب عقد ثریا آسمان میں نمودار تھ

فَجِئْتُ وَقَدْ نَضَّتْ لِنَوْمٍ ثِيَابَهَا ۔۔۔ لَدَى السِّتْرِ إِلَّا لِبْسَةَ الْمُتَفَضِّلِ

معنی:- پس آیا میں اس محبوبہ کے پاس درحالیکہ وہ بغرض خواب اپنے کپڑے
جامہ شب خوابی کے پردے کے پاس اتارے ہوئے تھی یعنی سونے کی طرف مائل ہو چکی
اس واسطے جامہ شب خوابی پہنے ہوئے تھی اور اپنی معمولی پوشاک کو پردے کے پا
اتار کر رکھ دیا تھا۔

واضح ہو کہ یہ معاملہ امرء القیس کی بڑی ڈھٹائی سے خبر دیتا ہے اور ہر ایک
سین کی تصویر ہے کہ سوا ایک بہادر طبیعت دار کے کسی بودے ہوئے
آدمی کو ایسے سین کے دیکھنے کا اتفاق ہو ہی نہیں سکتا ہے بہادر قوم کی عا
بہادرانہ انداز رکھتی ہے ایسے عشقیہ معاملات کو انھیں اقوام سے تعلق ہوتا۔
جن کی خلقت میں بہادری داخل رہتی ہے اس سین کو ایک گونہ شیکسپیر کے
جولیٹ کے اس سین سے مشابہت ہے کہ جہاں رومیو۔ جولیٹ کے ا

ن پر کھیل کر گیا ہے اور جو لیٹ اس سے پوچھتی ہے کہ کس طرح اس کا وہاں
دسکا اور کیونکر اسے اعدا کا خوف نہ آیا اور کیوں اسے جان عزیز بھاری
ہے۔

فَقَالَتْ یَمِیْنَ اللّٰہِ مَا لَکَ حِیْلَۃٌ ۔۔۔ وَمَا اِنْ اَرٰی عَنْکَ الْغَوَایَۃَ تَنْجَلِیْ

ی:- پس کہا اس محبوبہ نے کہ بخدا تیرے پاس کوئی حیلہ نہیں ہے یعنی تو جو
یا ہے تو اب تیرے واسطے کوئی صورت جان بری کی نہیں ہے ضرور تو مارا
گا۔ اور میں دیکھتی ہوں کہ تجھے جہالت عشق دور نہ ہوگی یعنی تو عشق میں ایسا دیوانہ
ہے کہ سودائے عشق تیرے سر سے جانے والا نہیں ہے

لمؤلفہ

ئے تو جائے مگر اسے حضرت ناصح ۔۔۔ اس زلف سیہ فام کا سودا نہیں جاتا

خَرَجْتُ بِھَا تَمْشِیْ تَجُرُّ وَرَاءَنَا ۔۔۔ عَلٰی اَثَرَیْنَا ذَیْلَ مِرْطٍ مُرَحَّلِ

ی:- میں باہر لایا اس محبوبہ کو درحالیکہ وہ چلتی تھی اور کھینچتی تھی پیچھے ہم دونوں
شہائے قدم پر دامن کو اپنے گلیم منقش کے۔ یعنی ہم اسے اس کے بے سے
ئے اور جب وہ چلی تو اپنے گلیم کو زمین پر گھسیٹتی چلی تا ہم دونوں کے نقش ہا اپنے
ہیں اور پہچان میں نہ آسکیں۔

ہو کہ اہل عرب نقش پا سے دوست و دشمن کو پہچان لیتے تھے اور آسانی
شخص مفرور کا سراغ لگا لیتے تھے بہت سی حکایات ایسی ہیں کہ جن میں آثار
مفرورین کا تعاقب کیا جانا منقول ہے اور اس طرح کی پہچان اہل عرب
پر موقوف نہیں ہے براعظم افریقہ اور براعظم آسٹریلیا وغیرہ میں بہت
سی اقوام ہیں جو نقش پا کو خوب پہچانتی ہیں اور مفرور کا تعاقب منزلوں

تنگ کر کے اسے گرفتار کر لیتی ہیں ان اقوام کو نقش پا کی ایسی پہچان ہے کہ پتھریلی زمینوں پر سے بھی جو مفرور گزر کرتا ہے اور جہاں بظاہر اس کا نقش پا نام کو بھی تمیز میں نہیں آتا ہے وہاں بھی اپنی مشق شناخت سے پورا کام لیتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مشق آدمی کو تب ہی بہم پہنچتی ہے جب وہ ابتدائے سن شعور سے اس کی طرف توجہ کرتا ہے زیادہ سن میں اس کی مشق کمال کو نہیں پہنچ سکتی ہے فقیر نے اس کو امتحان کر کے دیکھا ہے اور وہ اس طرح پر کہ شغل صید افگنی میں جانوران کو ہی وحشی کے نقش پا کو پہچاننے کی بڑی حاجت ہوتی ہے اور ہر چند فقیر اس کی شناخت کسی قدر رکھتا ہے مگر نہ اس قدر جتنا کہ مردمان کوہی دوشتی وغیرہ رکھتے ہیں یوں تو ہر شکاری جانوروں کے طرح طرح کے نقش پا کو پہچانتا ہے مگر ان کو ایسے سنگی مقاموں پر تمیز کر لینا جہاں باسباب ظاہر کوئی نقش پا محسوس نہ ہو آسان کام نہیں ہے ایسی شناخت تب ہی حاصل ہوتی ہے جب کوئی شخص عہد طفولیت سے کوہ و دشت میں رہ کر اس کی مشق کا سلسلہ جاری رکھتا ہے فقیر کے رسالہ صید کے ملاحظے سے یہ امور وضاحت کے ساتھ دریافت میں آسکتے ہیں۔ یہاں تقریر کو طول دینے کا موقع نہیں ہے

فَلَمَّا اَجَزْنَا سَاحَۃَ الْحَیِّ وَانْتَحٰی ٭ بِنَا بَطْنُ خَبْتٍ ذِیْ حِقَافٍ عَقَنْقَلٖ

معنی:۔ پس جب کہ فضائے آبادانی سے ہم لوگ باہر نکل گئے اور پہنچے زمین پست میں کہ جس میں کج اور منتشر تودہائے ریگ واقع ہیں یعنی آبادی سے نکل کر ایک ویران جگہ پہنچے جہاں خوف اعدا کچھ نہ تھا تو حالت اطمینان میں میں نے یہ کہا جو بیت ذیل میں ذکر ہوتا ہے۔

هَصَرْتُ بِفَوْدَیْ رَاْسِهَا فَتَمَایَلَتْ　　عَلَیَّ هَضِیْمَ الْکَشْحِ رَیَّا الْمُخَلْخَلِ

معنی:۔ کھینچا میں نے اپنی طرف دونوں کاکل سر محبوبہ کو پس وہ میری طرف مائل ہوئی درحالیکہ وہ محبوبہ باریک میان اور پُرگوشت ساق ہے۔

واضح ہو کہ محبوبہ کا باریک میان اور پُرگوشت ساق ہونا محبوبہ کے خوش اندام سے خبر دیتا ہے اور اس سے شاعر کی خوش مذاقی کا اظہار منظور ہے۔

مُهَفْهَفَةٌ بَیْضَاءُ غَیْرُ مُفَاضَةٍ　　تَرَائِبُهَا مَصْقُوْلَةٌ کَالسَّجَنْجَلِ

معنی:۔ وہ معشوقہ نازک میان ورنگ صبیح رکھتی ہے اور اس کا پیٹ فربہ اور بدگوشت نہیں ہے اور اس کا سینہ آئینے کی طرح صیقل کردہ ہے۔

یہ سب اوصاف بھی محبوبہ کی جسمانی خوبیاں ظاہر کرتے ہیں اور شاعر کے خوش پسند ہونے پر دال ہیں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اہل عرب بھی اقوام یورپ و سکنائے شام و عراق و ایران و کابلستان کے مانند سفید رنگ کو محبوب جانتے ہیں۔ سانولا یا سیاہ رنگ دلپسند نہیں کرتے چنانچہ تمام اہل یورپ اور کبھی ان ملکوں کے شعرا محبوب کے رنگ کو جب بیان کرتے ہیں تو تیرگی سے مبرّا دکھاتے ہیں مگر ہندوستان میں گو سفید یعنی گورا رنگ نامحمود نہیں سمجھا جاتا ہے اس کے ساتھ بھی سانولا رنگ خالی لطف سے نہیں تصور کیا جاتا ہے ظاہرا سبب اس کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہند کے دیوتا سری کرشن جی سانولا رنگ رکھتے تھے مگر ملک حبش میں سوا رنگ سیاہ کے کوئی دوسرا رنگ محبوب و مطبوع خیال ہی نہیں کیا جاتا ہے چنانچہ جب اہل فرنگ پہلی بار ملک حبش میں گئے۔ تو اہل حبش ان کے سفید رنگ کو دیکھ کر بہت ہنسے

اس واسطے کہ آدمی کا گورا ہونا ان کی آنکھوں میں نہایت مذموم متصور تھا یہ ہم لوگوں کے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ قومی مذاق میں اعتبارات ملکی کو ہمیشہ دخل ہوا کرتا ہے۔

کَبِکْرِ المُقَانَاۃِ البَیَاضِ بِصُفْرَۃٍ　　غَذَاھَا نَمِیْرُ المَاءِ غَیْرُ مُحَلَّلِ

معنی:۔ وہ محبوبہ مانند اس دُر یکتا کے ہے جس کی سفیدی میں زردی شامل ہوتی ہے اور جس کی تربیت ایسے صاف پانی سے ہوتی ہے کہ جو پانی فرودگاہ مردمان نہیں ہوتا یعنی جس محل آب پر آدمی نہیں اترتے اور اس سبب سے وہ پانی گدلا نہیں ہوتا ہے یہاں شاعر نے محبوبہ کو ایک گوہر پُر صفا سے تشبیہ دی ہے اور وہ نسبت دیجا صفا ہے نہ رنگ گوہر۔ بلا شبہ یہ تشبیہ نہایت لطیف انداز رکھتی ہے اور کسی ملک کے تعلیم یافتہ اور بامذاق شخص کو اس تشبیہ کی عمدگی میں عذر ہو نہیں سکتا

تَصُدُّ وَتُبْدِی عَنْ اَسِیْلٍ وَتَتَّقِیْ　　بِنَاظِرَۃٍ مِنْ وَحْشِ وَجْرَۃَ مُطْفِلِ

معنی:۔ وہ محبوبہ مُنہ پھیرتی ہے مجھ سے اور اس منہ پھیرنے میں اپنے رخسارۂ کشیدہ کو ظاہر کرتی ہے اور وقت نگاہ کرنے کے درمیان میرے اور اپنے اپنی آنکھ کو حائل کرتی ہے جو صحرائے وجرہ کے ان آہوان سے مشابہت رکھتی ہے جنھوں نے نئے بچے جنے ہیں وجرہ ایک صحرا ہے جو درمیان مکہ اور بصرہ کے واقع ہے اور نئے بچہ دینے کی یہ تخصیص ہے کہ اس وقت میں مادہ آہو ضعیف ہوا کرتی ہے پس چونکہ آنکھ کی تشبیہ عموماً آہو کے ساتھ دی جاتی ہے۔ اور شعرائے عرب و عجم آنکھ کو ضعیف و بیمار بھی لکھا کرتے ہیں اس واسطے شاعر نے وقت تشبیہ دہی اس تخصیص کو ملحوظ رکھا بہر حال آنکھ کی تشبیہ آہو کے ساتھ ایک معقول تشبیہ ہے اور تمام

تعلیم یافتہ ملکوں میں یہ تشبیہ ایک امر مسلم ہے ہندوستان میں بھی یہ تشبیہہ معروف عام ہے چنانچہ مرگ نین ایک مشہور قول ہے۔

وَجِیْدٍ کَجِیْدِ الرِّئْمِ لَیْسَ بِفَاحِشٍ   اِذَا ھِیَ نَصَّتْہُ وَلَا بِمُعَطَّلِ

معنی :- اور وہ محبوبہ اپنی گردن آشکارا کرتی ہے جو گردن آہو کی طرح اور گردن آہو کا یہ طور ہوتا ہے کہ جب آہو اپنی گردن کو اٹھاتا ہے تو اس کی گردن کا جس درجۂ اعتدال سے گزر نہیں جاتا ہے اور نہ خالی پیرایۂ خوبی سے ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ گردن معشوق کی تشبیہ گردن آہو کے ساتھ شعرائے عرب کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہے اور کسی ملک کی شاعری میں ایسی تشبیہ کمتر دیکھی گئی ہے۔ مگر یہ تشبیہ لطف سے خالی نہیں ہے معناً خبر دیتی ہے کہ معشوق کو بلند گردن ہونا چاہئے کوتاہ گردن ہونا معشوق کا تو درکنار کسی آدمی کا کوتاہ گردن ہونا خالی از قبح نہیں ہے شعرائے فارسی و اردو بھی گردن کے بلند ہونے کو ممدوح جانتے ہیں گو عموماً اہل ہند کا یہ مذاق نہیں معلوم ہوتا ہے اہل فرنگ بھی گردن بلند کو لوازم حسن سے شمار کرتے ہیں اور گردن معشوق کو گردن شُتر آن سے تشبیہ دیتے ہیں شُتر آن ایک قسم فاز بط کی ہے اور اس کے گردن نہایت بلند اور خوب صورت ہوتی ہے فارسی و اردو کے شعرا جو گردن کو صراحی دار باندھتے ہیں اس کا سبب بھی یہی ہے کہ صراحی کی گردن بلند اور خوش نما ہوتی ہے اور واقعی گردن بلند عجب دل آویزی رکھتی ہے اور بلا شبہ انسان کی خوش ترکیبی سے خبر دیتی ہے شاید تمام دنیا میں خاتونان انگلستان بہترین گردن رکھتی ہیں جن حضرات کو صاحب نظر کے طور پر ان کے مشاہدے کا اتفاق ہوا ہوگا فقیر کی رائے

سے موافقت فرمائیں گے۔

وَفَرْعٍ یَزِیْنُ الْمَتْنَ اَسْوَدَ فَاحِمٍ ۔ اَثِیْثٍ کَقِنْوِ النَّخْلَۃِ الْمُتَعَثْکِلِ

معنی:۔ اور وہ محبوبہ اپنے موئے دراز کو آشکارا کرتی ہے کہ جو اس کی پشت کو زینت دیتے ہیں اور بال اس کے نہایت سیاہ کثیر اور پیچیدہ ہیں مثل خوشہ ہائے نخل کے کہ جو نہایت بار آور ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ شعرائے فارسی و اردو کے کلام میں ایسی تشبیہ نہیں دیکھی جاتی ہے۔ شک نہیں کہ یہ ایک نہایت عمدہ تشبیہ ہے اور تمام تر موافق فطرت ہے

غَدَائِرُھَا مُسْتَشْزِرَاتٌ اِلَی الْعُلٰی ۔ تَضِلُّ الْعِقَاصُ فِیْ مُثَنًّی وَمُرْسَلِ

معنی:۔ گیسوئے تافتہ اس کے بلند کئے گئے ہیں برتری کی طرف یعنی دھاگے سر کے اوپر بندھے ہوئے ہیں اور بالوں کی یہ کثرت ہے کہ موئے گمہ زدہ گم ہیں اس کے موئے تافتہ اور ناتافتہ ہیں

ان دونوں شعر بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ زنان اہل عرب چند طور سے بالو کرتی تھیں اور ان کے بال فطرت کی رُو سے بھی اچھے انداز کے ہوتے۔ اس زمانے میں خاتونان یورپ کے بال اتنی شکلوں سے سنوارے۔ کہ خدا کی پناہ فیشن کی کوئی حد ہی معلوم نہیں ہوتی ہے بہت سے فیشن ہیں کہ ہم لوگ بیچارے ہندوستانیوں کو ان کا مطلب ہی سمجھنا دشوار قدر دانی تو درکنار۔

وَکَشْحٍ لَطِیْفٍ کَالْجَدِیْلِ مُخَصَّرٍ ۔ وَسَاقٍ کَاَنْبُوْبِ السَّقِیِّ الْمُذَلَّلِ

معنی:۔ اور وہ محبوبہ آشکارا کرتی ہے۔ ایسی تہی گاہ کو جو مثل مہار شتر کے

بھی نازک ہے اور آشکارا کرتی ہے ایسے ساق کو مانند انبوب سیراب شدہ اور رام کے ہے۔

• وَتُضْحِي فَتِيتُ الْمِسْكِ فَوْقَ فِرَاشِهَا + نَؤُومُ الضُّحَى لَمْ تَنْتَطِقْ عَنْ تَفَضُّلِ

ش :۔ جب وہ محبوبہ صبح کو سو کر اٹھتی ہے تو اس کے بستر پر ریزہ ہائے مشک جاتے ہیں یعنی اس کے سونے سے بستر معطر ہو جاتا ہے اور وہ خواب میں ہے تا وقت چاشت اور بعد جامۂ شب خوابی پہننے کے اپنی کمر نہیں باندھتی برزادی ہے اسے اس کی حاجت نہیں ہوتی کہ وقت سحر بیدار ہو اور کام ے میں لگے اور بعد پہننے جامہ شب خوابی کے کمر باندھ کر کسی کی خدمت کرے۔
ہو کہ محبوبہ کی بو یائی سے بستر یا قالین یا دریا یا ہوا کا بو یا ہو جانا فارسی اور کے شعرا باندھتے گئے ہیں فرق اس قدر ہے کہ اہل عرب محل بو یائی میں ا کو یاد کرتے ہیں اور فارسی اور اردو کے شعرا گل کو۔ ناسخ فرماتے ہیں ؎

بحر ہر اک شنبشہ گلاب ہوا ۔ معطر اس کے نہانے سے بس کہ آب ہوا

ایضاً

عطر کھینچیں ابھی عطار گل قالین کا ۔ بائے جو گل اندام ہمارا اک دم

وَتَعْطُو بِرَخْصٍ غَيْرِ شَثْنٍ كَأَنَّهُ ۔ أَسَارِيعُ ظَبْيٍ أَوْ مَسَاوِيكُ إِسْحِلِ

ش :۔ اور وہ محبوبہ چیزوں کو انگشت ہائے نرم سے پکڑتی ہے اور وہ انگلیاں سخت نہیں ہیں گویا کہ وہ انگلیاں یا مانند اس کرمک وادی ظبی کے ہیں کہ جن قسم کہتے ہیں یا مانند مسواک ہائے درخت اسحل کے ہیں۔
ہو کہ محبوبہ کی انگلیوں کا نرم ہونا ایک بڑی صفت ہے اکثر وہ عورتیں جو

محنت یا مزدوری کیا کرتی ہیں ان کی انگلیاں سخت ہو جاتی ہیں شاعر یہاں انگلیوں کی نرمی کو بیان کر کے محبوبہ کی اس صفت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کی عورت ہے جو ناز و نعمت میں پالی گئی ہے اس سبب سے اس کی انگلیاں سخت نہیں ہو گئی ہیں بلکہ کمال درجے کی نرمی رکھتی ہیں پھر شاعر محبوبہ کی انگلیوں کو اسروع سے تشبیہ دیتا ہے یہ ایک کیڑا ہوتا ہے جس کا سر سُرخ اور بدن نہایت نازک اور نرم ہوتا ہے یہ کیڑا وادی ظبی میں جو ملک عرب کا ایک مشہور وادی ہے پایا جاتا ہے دوسری تشبیہ انگلیوں کی شاعر نے مسواک ہائے اسحل سے دی ہے یہ ایک درخت ہے جس کی شاخیں نہایت نرم ہُوا کرتی ہیں ظاہر ہے کہ یہ تشبیہیں محض لوکل یعنی موضعی ہیں اور ایسی نہیں ہیں کہ بغیر اطلاع سابق کے ہر ملک کا آدمی ان تشبیہوں سے لطف اٹھا سکے مگر مطلب شاعر کا ایسا ہے کہ تمام دنیا کے آدمی اس کے ساتھ اتفاق کریں گے یعنی محبوبہ کی انگلیوں کا نازک و نرم ہونا ایک بڑی صنعت ہے۔

تُضِیءُ الظَّلَامَ بِالعِشَیِّ کَاَنَّھَا   مَنَارَۃُ مُمْسٰی رَاھِبٍ مُتَبَتِّلٖ

معنی:- وہ محبوبہ روشن کرتی ہے تاریکی کو اپنے چہرے سے گویا کہ وہ محبوبہ راہب باخدا پیوستہ کی شمع شام ہے یعنی محبوبہ کے رخسارہ روشن سے سیاہی ویسی ہی دور ہو جاتی ہے جیسا کہ راہب کے چراغ شام سے تاریکی دفع ہوتی ہے راہبوں کا دستور ہے کہ شام کے وقت جائے بلند پر ایک تیز روشنی اس غرض سے کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی مسافر راہ گم کردہ ہو تو راہ پر آجائے۔

شاعر یہاں محبوبہ کی شمع روی کو چراغ راہب سے تشبیہ دیتا ہے اور بلاشبہ یہ

تشبیہ نہایت خوب و مرغوب ہے یہ ایسی تشبیہ ہے کہ علاوہ شعرائے فارسی و اردو کے اس کے ساتھ تمام اہل یورپ اور بھی وہاں کے لوگ جہاں محبوبہ کی شمع سوئی کو ایک مرمقبول جانتے ہیں اتفاق رکھتے ہیں۔

إِلَىٰ مِثْلِهَا يَرْنُو الْحَلِيمُ صَبَابَةً إِذَا مَا اسْبَكَرَّتْ بَيْنَ دِرْعٍ وَمِجْوَلِ

معنی:- ایسی محبوبہ کی طرف جس کے اوصاف بالا میں بیان ہوئے مرد کامل العقل بھی سوز وگرمی عشق کے ساتھ نظر کرتا ہے جبکہ وہ اس سن کو پہنچتی ہے کہ جو سن میان سن زنان جوان و سن دختران نابالغہ کے ہوتا ہے یعنی جب محبوبہ ابتدائے سن بلوغ کو پہنچتی ہے تو اس وقت عاقلوں پر بھی آفت آجاتی ہے ان کی ساری عقل ہوا ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ یہ شعر نہایت فطرتی انداز رکھتا ہے اور شاعری کے پیرایہ میں حسن کی پُرتاثیری سے خبر صحیح دیتا ہے اس رنگ کے اشعار فارسی اور اردو میں بہت موجود ہیں۔

تَسَلَّتْ عَمَايَاتُ الرِّجَالِ عَنِ الصِّبَا وَلَيْسَ فُؤَادِي عَنْ هَوَاكِ بِمُنْسَلِ

معنی:- دور ہوئیں مردوں کی جہالتیں انقضائے کودکی کے بعد لیکن میرے دل سے تیرا عشق جوانی کے بعد بھی زائل نہ ہو۔

یہ شعر عجب لطف رکھتا ہے عشق کا تقاضا ہی یہ ہے کہ کبھی زائل نہ ہو جو عشق زائل ہو جائے وہ عشق نہیں ہے ہوسناکی ہے اگر امرء القیس اپنی آوارگی اور بے اعتدالی کے قصے نہیں کہے ہوتا تو یہ شعر جو بشکل خطاب، عنیزہ کی طرف ہے سامع میں عرفانی حالت پیدا کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر چونکہ اوپر میں

ایک گونہ بدمذاقی کے ساتھ بردے عنیزہ امرء القیس اپنی جوانہ حرکات
کا اعادہ کرتا گیا ہے اس کا یہ خطاب عنیزہ کی طرف سامع کے دل پر پورا اثر پیدا
نہیں کرتا ہے اگر کاش وہ یہ دکھلاتے ہوتا کہ اسے بہت سے محبوبوں سے سلمنا
ہوا مگر کسی کے ساتھ اس کے دل کو تعلق نہیں پیدا ہوا اور پھر عنیزہ کی طرف یوں
خطاب کرتا کہ صرف تو ہی معشوقانِ عالم سے ایک معشوق ہے جس کا تعلق میرے
دل کو ہے اور یہ ایسا تعلق ہے کہ اس میں شباب وشیب کو کوئی دخل نہیں ہے
تو اس سے عشق صادق کا نقشہ ہویدا ہوتا اور اس بیان کی تاثیر ہی علٰحدہ ہوتی بہرحال
یہ شعر بلائے خود ایک عجب عاشقانہ رنگ رکھتا ہے اور یاد رکھنے کے قابل ہے

اَلَا رُبَّ خَصْمٍ فِیْكِ اَلْوٰی رَدَدْتُهٗ نَصِیْحٍ عَلٰی تَعْذَالِهٖ غَیْرِ مُؤْتَلِ

معنی:- آگاہ ہو کہ بہت سے ایسے ناصح کو جو تیرے عشق میں مجھ سے نکوہش کے
ساتھ پیش آنے والے ہیں اور سختی کے ساتھ مجھے عشق سے منع کرنے والے ہیں میں نے
رد کیا یعنی ایسے ناصح کی ایک نہ سنی اور تیرے عشق میں استوار رہا۔

ناصح کا مضمون فارسی اور اردو کی شاعری میں برخلاف یورپین شاعریوں کے
کثرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اور شک نہیں کہ لطف سے خالی نہیں ہے۔

وَلَیْلٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ اَرْخٰی سُدُوْلَهٗ عَلَیَّ بِاَنْوَاعِ الْهُمُوْمِ لِیَبْتَلِیْ

معنی:- اور بہت سی راتیں ہیں جنھوں نے مانند موج بحر کے اقسام اندوہ کے
ساتھ اپنے پردہائے تاریکی کو مجھ پر ڈال دیا تاکہ مجھے آزمائیں کہ آیا مجھ میں طاقت شکیبائی
ہے یا نہیں۔

فَقُلْتُ لَهٗ لَمَّا تَمَطّٰی بِصُلْبِهٖ وَاَرْدَفَ اَعْجَازًا وَّنَاءَ بِكَلْكَلِ

معنی :- پس کہا میں نے ایسی رات کو کہ جس کا ذکر بالا میں ہُوا جبکہ اس نے اپنی پیٹھ دراز کی اور یکے بعد دیگرے اپنی سرین کو لائی اور سینے کو دور کیا یعنی جب رات دراز ہوئی۔ اور میں یہ سمجھا کہ اب رات کا آخر حصہ پہنچا تو پے در پے حصہ ہائے شب آتے ہی گئے اور گو حصہ اول جو آغازِ شب تھا دور بھی ہو گیا تو بھی وہ شب انتہا کو نہ پہنچی پس میں نے رات کا یہ رنگ دیکھ کر اس سے یہ کہا جو مندرج ذیل ہوتا ہے۔

أَلَا أَيُّهَا اللَّيْلُ الطَّوِيلُ أَلَا انْجَلِ ۔۔۔ بِصُبْحٍ وَمَا الْإِصْبَاحُ مِنْكَ بِأَمْثَلِ

معنی :- آگاہ ہو اے شب دراز اور اپنی تاریکی کو نور صبح کے ساتھ مبدل کر ڈال تاکہ مجھے رنج سے رہائی ہو۔

واضح ہو کہ شب غم بہت بھاری ہوتی ہے اور انسان گھبرا کر یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح صبح ہو جائے پس شاعر تمنائے صبح کا اظہار کرتا ہے اور رات کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے شب دراز صبح ہو جا تاکہ مجھ کو تیری ظلمت سے نجات ہو اور اس وجہ سے تخفیف غم کی صورت پیدا ہو مگر اس کے بعد کہتا ہے کہ اے شب مجھے صبح کی تمنا ہے مگر میرے واسطے صبح تجھ سے خوب تر ہے اس واسطے کہ میرا غم ایسا ہے کہ صبح کے نمودار ہونے سے کوئی فرق اس میں پیدا نہیں ہوگا جیسا میرا غم اس وقت ہے صبح کے ظاہر ہونے پر بھی ویسا رہے گا۔

فَيَا لَكَ مِنْ لَيْلٍ كَأَنَّ نُجُومَهُ ۔۔۔ بِأَمْرَاسِ كَتَّانٍ إِلَى صُمِّ جَنْدَلِ

معنی :- پس تو عجب رات ہے کہ جس کے ستارے گویا رسن ہائے کتان سے

سنگ سخت میں بندھے ہوئے ہیں یعنی اپنی جگہوں سے کھسکتے ہی نہیں۔
درازی شب کا مضمون ہر زبان میں دیکھا جاتا ہے ہر زبان کے شعرانے اس کو باندھا ہے سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎
سعدیا نوبت امشب دہل صبح نہ کوفت ۔۔۔ یا مگر صبح بنا شد شب تنہائی را

لمؤلفہ

من غم دپروائے روز حشر چوں دارم کہ چوں
با سحر ربطے نمی بندد شب یلدائے من

بہر حال اس شعر میں بھی یہ مضمون بڑی خوش سلوبی سے بندھا ہے اور فطرتی انداز سے خالی نہیں ہے شب غم واقعی ایسی ہوتی ہے اور اس میں معلوم ہوتا ہے کہ تارے اپنی جگہ سے کھسکتے نہیں ہیں بخلاف شب مسرت کے کہ چاند تارے دم کے دم میں رخصت ہو جاتے ہیں اور صبح دن سے آپہنچی ہے یہی کیفیت دن کی ماہ صیام میں ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کو کسی نے کھونٹی میں باندھ رکھا ہے کسی طرح شام ہوتی ہی نہیں ہے۔

وَقِرْبَةِ أَقْوَامٍ جَعَلْتُ عِصَامَهَا ۔۔۔ عَلَى كَاهِلٍ مِنِّي ذَلُولٍ مُرَحَّلِ

معنی:۔ اور بہت سی مشکیں قوموں کی ہیں کہ میں نے ان کے دوال کو اپنے فرماں بردار اور مرحل یعنی کوچ کنا بندہ دوش پر رکھا ہے۔

مطلب شعر یہ ہے کہ ہر چند میں بادشاہوں سے ہوں تاہم خدمت دوستان و مہمانان کی نظر سے ان کی مشکوں کو اپنے کاندھے پر اٹھاتا ہوں۔ یہاں شاعر اپنی مدح کرتا ہے اور دکھلاتا ہے کہ خدمت احباب کی بجا آوری میں وہ پس پا نہیں

ہونا اس قول سے اس کی شرافت انکسار اور عمدگی طبیعت کا اظہار مراد ہے آدمی کو چاہئے کہ درجۂ عالی کے حاصل رہنے پر بھی صفت خُلق کو ملحوظ رکھے ؎

چوں بدولت برسی مست نہ گردی مردی

بلند پایگی، کا تقاضائے صحیح یہی ہے کہ خدمت قوم میں کبھی قاصر نہ ہو اور امر واقعی بھی یہی ہے کہ سردار قوم خادم قوم ہوتا ہے اوائے حقوق کرنا اس کا کام ہے اور اسی میں اس کی خوبی ہے۔ ؎

تواضع زگردن فرازان نکوست　　گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

وَوَادٍ كَجَوْفِ الْعَيْرِ قَفْرٍ قَطَعْتُهُ　　بِهِ الذِّئْبُ يَعْوِي كَالْخَلِيعِ الْمُعَيَّلِ

معنی: اور بہت وادی ہیں مانند شکم گورخر کے جس سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا اس واسطے کہ شکم گورسے دودھ نہیں ملتا اور وہ وادی بیاباں بے آب ودانہ ہیں کہ جنہیں میں نے قطع کیا ان وادیوں میں بھیڑیا چلاتا ہے مانند ایسے ہارے ہوئے جواری کے جو عیال کثیر رکھتا ہو یعنی یہاں بھیڑیا غایت گرسنگی سے نالہ و فریاد کرتا ہے۔

یہاں شاعر اپنے تحمل اور دلیری کو صحرانوردی کے پیرائے میں ظاہر کرتا ہے اور واقعی یہ ہے کہ تحمل اور دلیری لوازم عشق سے ہیں عاشقی آسان کام نہیں ہے یہ کام بہادروں کا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

نازنیں را عشق می نہ زیبد نہ ہر گز جان من　　شیر مردانِ بلاکش پا دریں غوغا نہند

فَقُلْتُ لَهُ لَمَّا عَوَى إِنَّ شَأْنَنَا　　قَلِيلُ الْغِنَى إِنْ كُنْتَ لَمَّا تَمَوَّلِ

معنی:۔ پس کہا میں نے اس بھیڑیئے سے جب وہ چلایا کہ بتحقیق میری شان بھی ناداری کی ہے اگر تو مالدار نہیں ہے یعنی تو جو گرسنگی سے چلاتا ہے تو یہاں میرے پاس

کچھ نہیں ہے۔

واضح ہو کہ یہ رنگ بیان فارسی یا اردو کی شاعری میں نہیں دیکھا جاتا ہے یہ بیان کے طریقے ان اقسام سے ہیں جو کسی ملک خاص سے مختص ہوتے ہیں اور دوسرے ملک میں تقاضائے ملکی سے رواج نہیں پا سکتے۔

كِلَانَا إِذَا مَا نَالَ شَيْئًا أَفَاتَهُ ۔۔۔ وَمَنْ يَحْتَرِثْ حَرْثِي وَحَرْثَكَ يَهْزَلِ

معنی :- دونوں ہم لوگوں سے اگر کسی نے کوئی چیز پائی تو اسے ضائع کر ڈالا یعنی ایسے گرگ ہیں اور تو دونوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ہم سے کسی نے مال حاصل کیا تو اسے خرچ کر ڈالا اور جو شخص میری اور تیری طرح کوشش و سعی کرے لاغر ہو جائے گا یعنی میری اور تیری طرح کوشش کرنے والا محتاج ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ انداز بیان فارسی اور اردو میں کمتر دیکھا جاتا ہے۔

وَقَدْ أَغْتَدِي وَالطَّيْرُ فِي وُكُنَاتِهَا ۔۔۔ بِمُنْجَرِدٍ قَيْدِ الْأَوَابِدِ هَيْكَلِ

معنی :- اور میں اول سحر میں جاتا ہوں درحالیکہ طیور اپنے آشیانوں میں رہتے ہیں ہمراہ اسپ کم موئے جو بند وحشیاں ہے اور دراز قوی ہیکل ہے یعنی میں علی الصباح ایسے وقت میں سوار اسپ ہوتا ہوں کہ اس وقت طیور اپنے آشیانوں سے باہر نہیں آتے اور وہ گھوڑا ایسا ہے کہ کم موئے جو دلیل ہے تیز رفتاری کی اور ایسا ہے کہ جو وحوش صحرائے کو گرفتار کر لینے کی قدرت رکھتا ہے اور ایسا ہے کہ دراز و قوی ہیکل ہے

واضح ہو کہ اہل عرب چونکہ گرم ملک کے رہنے والے ہیں تقاضائے آب و ہوا سے ان کا مزاج محرور واقع ہوا ہے جو شیلاپن لوازمات محرور المزاجی سے ہے پس ان کا میلان عورتوں کی طرف یا ان کی رغبت اسلحہ اور گھوڑوں کی جانب ایک

طبعی ہے۔ امرؤ القیس اپنی مردانہ صفتوں کو بیان کر کے اب اپنی شہسواری اور اپنے گھوڑے کی مدح کرتا ہے یہ مدح نہایت فطرتی انداز رکھتی ہے اور ہر چند اس کا پہلو شاعرانہ ہے مگر فارسی اور اردو کے شعرا کی نامطبوع صفت خوانی سے تمام تر پاک ہے شعر ہذا اور ذیل کے اشعار میں جو صفتیں گھوڑے کی مندرج ہیں یقیناً ایسی ہیں کہ عمدہ گھوڑے میں وہ صفتیں موجود ہوتی ہیں واقعی اچھا گھوڑا ایسا ہوتا ہے کہ اس کی صفت میں مبالغہ پردازی کی کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ ان اشعار سے صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر خوب جانتا ہے کہ گھوڑے کو کیسا ہونا چاہئے اور شک نہیں کہ اہل عرب اس بات کو خوب جانتے ہیں ان اشعار میں گھوڑے کی تعریف اس رنگ پر کی گئی ہے کہ جو حضرات سخن سنجی کا مذاق صحیح رکھتے ہیں بہت کچھ لذت یاب سخن ہو سکتے ہیں یہ اشعار ویسے نہیں ہیں جیسا کہ عرفی و ذوق وغیرہما کے ایسے شعرائے فارسی و اردو نے اپنے ممدوح کے گھوڑوں کو تماشے کا گھوڑا بنا رکھا ہے ان دونوں شاعروں کے کچھ کلام جو گھوڑے کی تعریف میں ہیں بغرض ظاہر کرنے ان کی بدمذاقی کے ذیل میں عرض کئے جاتے ہیں انہیں پر ان کے ایسے دیگر شعرا کے کلام کو بھی قیاس کرنا چاہئے۔

عرفی

آن سبک سیر کہ چوں گرم عنانش سازی	از ازل سوے ابد و ز ابد آید بہ ازل
قطرۂ کش دم رفتن چکد از پیشانی	شبنم آساش نشیند گہ رجعت بہ کفل

درمیان کچھ نزر کی چیز حایل رہتی ہے اپنے کرانہ و ناچیہ کو
واضح ہو کہ یہاں ثریا کو تشبیہہ کمرزیب کے ساتھ دی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ا
کمرزیب موتیوں سے بناتے تھے اور جب موتیوں کو رشتے میں پروتے
دو موتیوں کے درمیان نزر کے تار دیتے یا زرین دلنے داخل کرتے تھے تو جب
پروین کے تارے ایک دوسرے سے فرق معلوم ہوتے ہیں کمرزیب کے م
بھی ایک دوسرے سے علحدہ نظر آتے تھے لاریب یہ تشبیہہ نہایت خو ر
مرغوب ہے مختصر یہ ہے کہ شاعر اپنے جانے کے وقت کو بیان کرتا ہے کہ
وقت اس زن پردہ نشین کے پاس پہنچا کہ جب عقد ثریا آسمان میں نمودار

فَجِئْتُ وَقَدْ نَضَّتْ لِنَوْمٍ ثِيَابَهَا   لَدَى السِّتْرِ إِلَّا لِبْسَةَ الْمُتَفَضِّلِ

معنی :- پس آیا میں اس محبوبہ کے پاس درحالیکہ وہ بغرض خواب اپنے کپڑے
جامہ شب خوابی کے پردے کے پاس اتارے ہوئے تھی یعنی سونے کی طرف مائل ہو چکی
اس واسطے جامہ شب خوابی پہنے ہوئے تھی اور اپنی معمولی پوشاک کو پردے کے پ
اتار کر رکھ دیا تھا۔

واضح ہو کہ یہ معاملہ امرء القیس کی بڑی ڈھٹائی سے خبر دیتا ہے اور یہ ایک
سین کی تصویر ہے کہ سوا ایک بہادر طبیعت دار کے کسی بودے ہو
آدمی کو ایسے سین کے دیکھنے کا اتفاق ہو ہی نہیں سکتا ہے بہادر قوم کی بنا
بہادرانہ انداز رکھتی ہے ایسے عشقیہ معاملات کو انھیں اقوام سے تعلق ہوتا۔
جن کی خلقت میں بہادری داخل رہتی ہے اس سین کو ایک گونہ شیکسپیر کے
جولیٹ کے اس سین سے مشابہت ہے کہ جہاں رومیو۔ جولیٹ کے ای

ن پہ کھیل کر گیا ہے اور جولیٹ اس سے پوچھتی ہے کہ کس طرح اس کا وہاں
د سکا اور کیونکہ اسے اعدا کا خوف نہ آیا اور کیوں اسے جان عزیز بھاری
ہے۔

فَقَالَتْ یَمِیْنَ اللّٰہِ مَالَکَ حِیْلَۃٌ ۔ وَمَا اِنْ اَرٰی عَنْکَ الْغَوَایَۃَ تَنْجَلِیْ

ی:۔ پس کہا اس محبوبہ نے کہ بخدا تیرے پاس کوئی حیلہ نہیں ہے یعنی تو جو
آیا ہے تو اب تیرے واسطے کوئی صورت جان بری کی نہیں ہے ضرور تو مارا
گا۔ اور میں دیکھتی ہوں کہ تجھے جہالت عشق دور نہ ہوگی یعنی تو عشق میں ایسا دیوانہ
ہے کہ سودائے عشق تیرے سر سے جانے والا نہیں ہے **لمولفہ**

ئے تو جائے مگر اے حضرت ناصح ۔ اس زلف سیہ فام کا سودا نہیں جاتا

خَرَجْتُ بِھَا تَمْشِیْ تَجُرُّ وَرَآءَنَا ۔ عَلٰی اَثَرَیْنَا ذَیْلَ مِرْطٍ مُّرَحَّلِ

ی:۔ میں باہر لایا اس محبوبہ کو درحالیکہ وہ چلتی تھی اور کھینچتی تھی پیچھے ہم دونوں
نشانہائے قدم پہ دامن کو اپنے گلیم منقش کے۔ یعنی ہم اسے اس سبب سے
ئے اور جب وہ چلی تو اپنا گلیم کو زمین پر گھسیٹتی چلی تا ہم دونوں کے نقش ہا پڑ
ہیں اور پہچان میں نہ آسکیں۔
ہو کہ اہل عرب نقش پا سے دوست و دشمن کو پہچان لیتے تھے اور آسانی
تخص مفرور کا سراغ لگا لیتے تھے بہت سی حکایات ایسی ہیں کہ جن میں آثار
مفرورین کا تعاقب کیا جانا منقول ہے اور اس طرح کی پہچان اہل عرب
پر موقوف نہیں ہے بر اعظم افریقہ اور بر اعظم آسٹریلیا وغیرہ میں بہت
شی اقوام ہیں جو نقش پا کو خوب پہچانتی ہیں اور مفرور کا تعاقب منزلوں

تک کر کے اسے گرفتار کر لیتی ہیں ان اقوام کو نقش پا کی ایسی پہچان ہے کہ پتھریلی
زمینوں پر سے بھی جو مفرد گذر کرتا ہے اور جہاں بظاہر اس کا نقش پا نام کو بھی
تمیز میں نہیں آتا ہے وہاں بھی اپنی مشق شناخت سے پورا کام لیتی ہیں معلوم
ہوتا ہے کہ ایسی مشق آدمی کو تب ہی ہم پہنچتی ہے جب وہ ابتدائے سن شعور
سے اس کی طرف توجہ کرتا ہے زیادہ سن میں اس کی مشق کمال کو نہیں پہنچ سکتی
ہے فقیر نے اس کو امتحان کر کے دیکھا ہے اور وہ اس طرح پر کہ شغل صید افگنی
میں جانوران کوہی و دشتی کے نقش پا کو پہچاننے کی بڑی حاجت ہوتی ہے اور
ہر چند فقیر اس کی شناخت کسی قدر رکھتا ہے مگر نہ اس قدر جتنا کہ مردمان کوہی
و دشتی وغیرہ رکھتے ہیں یوں تو ہر شکاری جانوروں کے طرح طرح کے نقش پا کو
پہچانتا ہے مگر ان کو ایسے سنگی مقاموں پر تمیز کر لینا جہاں باسباب ظاہر کوئی نقش
پا محسوس نہ ہو آسان کام نہیں ہے ایسی شناخت تب ہی حاصل ہوتی ہے
جب کوئی شخص عہد طفولیت سے کوہ و دشت میں رہ کر اس کی مشق کا سلسلہ
جاری رکھتا ہے فقیر کے رسالہ صید کے ملاحظے سے یہ امور وضاحت کے ساتھ
دریافت میں آسکتے ہیں۔ یہاں تقریر کو طول دینے کا موقع نہیں ہے

فَلَمَّا اَجَزْنَا سَاحَۃَ الْحَیِّ وَانْتَحٰی ... بِنَا بَطْنُ خَبْتٍ ذِیْ حِقَافٍ عَقَنْقَلِ

معنی:۔ پس جب کہ فضائے آبادانی سے ہم لوگ باہر نکل گئے اور پہنچے زمین
پست میں کہ جس میں کج اور منتشر تودہائے ریگ واقع ہیں یعنی آبادی سے نکل کر ایک
ویران جگہ پہنچے جہاں خوف اعدا کچھ نہ تھا تو حالت اطمینان میں میں نے یہ کہا
جو بیت ذیل میں ذکر ہوتا ہے۔

هَصَرْتُ بِفَوْدَيْ رَأْسِهَا فَتَمَايَلَتْ عَلَيَّ هَضِيمَ الْكَشْحِ رَيَّا الْمُخَلْخَلِ

معنی:- کھینچا میں نے اپنی طرف دونوں کاکل سر محبوبہ کو پس وہ میری طرف مائل ہوئی درحالیکہ وہ محبوبہ باریک میان اور پُرگوشت ساق ہے۔

واضح ہو کہ محبوبہ کا باریک میان اور پُرگوشت ساق ہونا محبوبہ کے خوش اندام سے خبر دیتا ہے اور اس سے شاعر کی خوش مذاقی کا اظہار مقصود ہے۔

مُهَفْهَفَةٌ بَيْضَاءُ غَيْرُ مُفَاضَةٍ تَرَائِبُهَا مَصْقُولَةٌ كَالسَّجَنْجَلِ

معنی:- وہ معشوقہ نازک میان و رنگ صبیح رکھتی ہے اور اس کا پیٹ فربہ اور بدگوشت نہیں ہے اور اس کا سینہ آئینے کی طرح صیقل کردہ ہے۔

یہ سب اوصاف بھی محبوبہ کی جسمانی خوبیاں ظاہر کرتے ہیں اور شاعر کے خوش پسند ہونے پر دال ہیں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اہل عرب بھی اقوام یورپ و سکنائے شام و عراق و ایران و کابلستان کے مانند سفید رنگ کو محبوب جانتے ہیں۔ سانولا یا سیاہ رنگ دلپسند نہیں کرتے چنانچہ تمام اہل یورپ اور کبھی ان ملکوں کے شعرا محبوب کے رنگ کو جب بیان کرتے ہیں تو تیرگی سے مبرّا دکھاتے ہیں مگر ہندوستان میں گو سفید یعنی گورا رنگ نامحمود نہیں سمجھا جاتا ہے اس کے ساتھ بھی سانولا رنگ خالی لطف سے نہیں تصور کیا جاتا ہے ظاہرا سبب اس کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہند کے دیوتا سری کرشن جی سانولا رنگ رکھتے تھے مگر ملک حبش میں سوا رنگ سیاہ کے کوئی دوسرا رنگ محبوب و مطبوع خیال ہی نہیں کیا جاتا ہے چنانچہ جب اہل فرنگ پہلی بار ملک حبش میں گئے۔ تو اہل حبش ان کے سفید رنگ کو دیکھ کر بہت ہنسے

اس واسطے کہ آدمی کا گورا ہونا ان کی آنکھوں میں نہایت مذموم متصور تھا یہ ہم لوگوں کے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ قومی مذاق میں اختیارات ملکی کو ہمیشہ دخل ہوا کرتا ہے۔

كَبِكْرِ الْمُقَانَاةِ الْبَيَاضِ بِصُفْرَةٍ　　غَذَاهَا نَمِيرُ الْمَاءِ غَيْرُ مُحَلَّلِ

معنی:۔ وہ محبوبہ مانند اس دُر یکتا کے ہے جس کی سفیدی میں زردی شامل ہوتی ہے اور جس کی تربیت ایسے صاف پانی سے ہوتی ہے کہ جو پانی فرودگاہ مردمان نہیں ہوتا یعنی جس محل آب پر آدمی نہیں اترتے اور اس سبب سے وہ پانی گدلا نہیں ہوتا ہے یہاں شاعر نے محبوبہ کو ایک گوہر پُر صفا سے تشبیہ دی ہے اور وہ نسبت دہی صفا ہے نہ رنگ گوہر۔ بلاشبہ یہ تشبیہ نہایت لطیف انداز رکھتی ہے اور کسی ملک کے تعلیم یافتہ اور بامذاق شخص کو اس تشبیہ کی عمدگی میں عذر ہو نہیں سکتا

تَصُدُّ وَتُبْدِي عَنْ أَسِيلٍ وَتَتَّقِي　　بِنَاظِرَةٍ مِنْ وَحْشِ وَجْرَةَ مُطْفِلِ

معنی:۔ وہ محبوبہ منہ پھیرتی ہے مجھ سے اور اس منہ پھیرنے میں اپنے رخسارۂ کشیدہ کو ظاہر کرتی ہے اور وقت نگاہ کرنے کے درمیان میرے اور اپنے اپنی آنکھ کو حائل کرتی ہے جو صحرائے وجرہ کے ان آہوان سے مشابہت رکھتی ہے جنھوں نے نئے بچے جنے ہیں وجرہ ایک صحرا ہے جو درمیان مکہ اور بصرہ کے واقع ہے اور نئے بچہ دینے کی یہ تخصیص ہے کہ اس وقت میں مادہ آہو ضعیف ہوا کرتی ہے پس چونکہ آنکھ کی تشبیہ عموماً آہو کے ساتھ دی جاتی ہے۔ اور شعرائے عرب و عجم آنکھ کو ضعیف و بیمار بھی لکھا کرتے ہیں اس واسطے شاعر نے وقت تشبیہ دہی اس تخصیص کو ملحوظ رکھا۔ بہرحال آنکھ کی تشبیہ آہو کے ساتھ ایک معقول تشبیہ ہے اور تمام

تعلیم یافتہ ملکوں میں یہ تشبیہ ایک امر مسلم ہے ہندوستان میں بھی یہ تشبیہ معروف عام ہے چنانچہ مرگ نین ایک مشہور قول ہے۔

وَجِیْدٍ کَجِیْدِ الرِّئْمِ لَیْسَ بِفَاحِشٍ　　اِذَا ھِیَ نَصَّتْہُ وَلَا بِمُعَطَّلِ

معنی:۔ اور وہ محبوبہ اپنی گردن آشکارا کرتی ہے جو گردن آہو کی طرح اور گردن آہو کا یہ طور ہوتا ہے کہ جب آہو اپنی گردن کو اٹھاتا ہے تو اس کی گردن کا جس درجۂ اعتدال سے گذر نہیں جاتا ہے اور نہ خالی پیرایۂ خوبی سے ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ گردن معشوق کی تشبیہ گردن آہو کے ساتھ شعرائے عرب کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہے اور کسی ملک کی شاعری میں ایسی تشبیہ کمتر دیکھی گئی ہے۔ مگر یہ تشبیہ لطف سے خالی نہیں ہے معناً خبر دیتی ہے کہ معشوق کو بلند گردن ہونا چاہیئے کوتاہ گردن ہونا معشوق کا تو درکنار کسی آدمی کا کوتاہ گردن ہونا خالی از قبح نہیں ہے شعرائے فارسی و اردو بھی گردن کے بلند ہونے کو ممدوح جانتے ہیں گو عموماً اہل ہند کا یہ مذاق نہیں معلوم ہوتا ہے اہل فرنگ بھی گردن بلند کو لوازم حسن سے شمار کرتے ہیں اور گردن معشوق کو گردن سُوآن سے تشبیہ دیتے ہیں سُوآن ایک قسم فازیظ کی ہے اور اس کے گردن نہایت بلند اور خوب صورت ہوتی ہے فارسی و اردو کے شعرا جو گردن کو صراحی دار باندھتے ہیں اس کا سبب بھی یہی ہے کہ صراحی کی گردن بلند اور خوش نما ہوتی ہے اور واقعی گردن بلند عجب دل آویزی رکھتی ہے اور بلاشبہ انسان کی خوش ترکیبی سے خبر دیتی ہے شاید تمام دنیا میں خاتونان انگلستان بہترین گردن رکھتی ہیں جن حضرات کو صاحب نظر کے طور پر ان کے مشاہدے کا اتفاق ہوا ہو گا فقیر کی رائے

سے موافقت فرمائیں گے۔

وَفَرْعٍ يَزِيْنُ الْمَتْنَ أَسْوَدَ فَاحِمٍ   أَثِيْثٍ كَقِنْوِ النَّخْلَةِ الْمُتَعَثْكِلِ

معنی:- اور وہ محبوبہ اپنے موئے دراز کو آشکارا کرتی ہے کہ جو اس کی پشت
زینت دیتے ہیں اور بال اس کے نہایت سیاہ کثیر اور پیچیدہ ہیں مثل خوشہ ہا۔
نخل کے کہ جو نہایت بار آور ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ شعرائے فارسی و اردو کے کلام میں ایسی تشبیہ نہیں دیکھی جاتی ہے گ
شک نہیں کہ یہ ایک نہایت عمدہ تشبیہ ہے اور تمام تر موافق فطرت ہے

غَدَائِرُهَا مُسْتَشْزِرَاتٌ إِلَى الْعُلَى   تَضِلُّ الْعِقَاصُ فِي مُثَنًّى وَمُرْسَلِ

معنی:- گیسوئے تافتہ اس کے بلند کئے گئے ہیں برتری کی طرف یعنی دھاگ
سر کے اوپر بندھے ہوئے ہیں اور بالوں کی یہ کثرت ہے کہ موئے گرہ زدہ گم
ہیں اس کے موئے تافتہ اور ناتافتہ ہیں

ان دونوں شعر بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ زنان اہل عرب چند طور سے بالو
کرتی تھیں اور ان کے بال فطرت کی رُو سے بھی اچھے انداز کے ہوتے۔
اس زمانے میں خاتونان یورپ کے بال اتنی شکلوں سے سنوارے ج
کہ خدا کی پناہ فیشن کی کوئی حد ہی معلوم نہیں ہوتی ہے بہت سے فیشن
ہیں کہ ہم لوگ بیچارے ہندوستانیوں کو ان کا مطلب ہی سمجھنا دشوار
قدر دانی تو در کنار۔

وَكَشْحٍ لَطِيْفٍ كَالْجَدِيْلِ مُخَصَّرٍ   وَسَاقٍ كَأُنْبُوْبِ السَّقِيِّ الْمُذَلَّلِ

معنی:- اور وہ محبوبہ آشکارا کرتی ہے۔ ایسی تہی گاہ کو جو مثل مہار شتر کے

بھی نازک ہے اور آشکارا کرتی ہے ایسے ساق کو مانند انبوب سیراب شدہ اور رام کے ہے۔

وَتُضْحِي فَتِيتُ الْمِسْكِ فَوْقَ فِرَاشِهَا + نَؤُومُ الضُّحَى لَمْ تَنْتَطِقْ عَنْ تَفَضُّلِ

ت: جب وہ محبوبہ صبح کو سو کر اٹھتی ہے تو اس کے بستر پہ ریزہ ہائے مشک جاتے ہیں یعنی اس کے سونے سے بستر معطر ہو جاتا ہے اور وہ خواب میں ہے تا وقت چاشت اور بعد جامۂ شب خوابی پہننے کے اپنی کمر نہیں باندھی برزادی ہے اسے اس کی حاجت نہیں ہوتی کہ وقت سحر بیدار ہو اور کام سے میں لگے اور بعد پہننے جامۂ شب خوابی کے کمر باندھ کہ کسی کی خدمت کرے۔

ہو کہ محبوبہ کی بو یائی سے بستر یا قالین یا دریا یا ہوا کا بو یا ہو جانا فارسی اور کے شعرا باندھتے گئے ہیں فرق اس قدر ہے کہ اہل عرب محل بو یائی میں کو یاد کرتے ہیں اور فارسی اور اردو کے شعرا گل کو۔ ناسخ فرماتے ہیں ؎

بحر ہر اک شیشۂ گلاب ہوا معطر اس کے نہانے سے بس کہ آب ہوا

ایضاً

عطر کھینچیں ابھی عطار گل قالین کا بائے جو گل اندام ہمارا اک دم

وَتَعْطُو بِرَخْصٍ غَيْرِ شَثْنٍ كَأَنَّهُ أَسَارِيعُ ظَبْيٍ أَوْ مَسَاوِيكُ إِسْحِلِ

ی: اور وہ محبوبہ چیزوں کو انگشت ہائے نرم سے پکڑتی ہے اور وہ انگلیاں سخت نہیں ہیں گویا کہ وہ انگلیاں یا مانند اس کرمک وادی ظبی کے ہیں کہ جن قسم کہتے ہیں یا مانند مسواک ہائے درخت اسحل کے ہیں۔

ہو کہ محبوبہ کی انگلیوں کا نرم ہونا ایک بڑی صفت ہے اکثر وہ عورتیں جو

محنت یا مزدوری کیا کرتی ہیں ان کی انگلیاں سخت ہو جاتی ہیں شاعر یہاں انگلیوں کی نرمی کو بیان کر کے محبوبہ کی اس صفت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کی عورت ہے جو ناز و نعمت میں پالی گئی ہے اس سبب سے اس کی انگلیاں سخت نہیں ہو گئی ہیں بلکہ کمال درجے کی نرمی رکھتی ہیں پھر شاعر محبوبہ کی انگلیوں کو اسروع سے تشبیہ دیتا ہے یہ ایک کیڑا ہوتا ہے جس کا سر سُرخ اور بدن نہایت نازک اور نرم ہوتا ہے یہ کیڑا وادی ظبی میں جو ملک عرب کا ایک مشہور وادی ہے پایا جاتا ہے دوسری تشبیہ انگلیوں کی شاعر نے مسواک کے اسحل سے دی ہے یہ ایک درخت ہے جس کی شاخیں نہایت نرم ہوا کرتی ہیں ظاہر ہے کہ یہ تشبیہیں محض لوکل یعنی موضعی ہیں اور ایسی نہیں ہیں کہ بغیر اطلاع سابق کے ہر ملک کا آدمی ان تشبیہوں سے لطف اٹھا سکے مگر مطلب شاعر کا ایسا ہے کہ تمام دنیا کے آدمی اس کے ساتھ اتفاق کریں گے یعنی محبوبہ کی انگلیوں کا نازک و نرم ہونا ایک بڑی صنعت ہے ۔

تُضِیءُ الظَّلَامَ بِالعِشِیِّ کَأَنَّهَا　　مَنَارَةُ مُمْسَی رَاهِبٍ مُتَبَتِّلِ

معنی :۔ وہ محبوبہ روشن کرتی ہے تاریکی کو اپنے چہرے سے گویا کہ وہ محبوبہ راہب باخدا پیوستہ کی شمع شام ہے یعنی محبوبہ کے رخسارہ روشن سے سیاہی ویسی ہی دور ہو جاتی ہے جیسا کہ راہب کے چراغ شام سے تاریکی دفع ہوتی ہے راہبوں کا دستور ہے کہ شام کے وقت جائے بلند پر ایک تیز روشنی اس غرض سے کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی مسافر راہ گم کردہ ہو تو راہ پر آجائے ۔

شاعر یہاں محبوبہ کی شمع روی کو چراغ راہب سے تشبیہ دیتا ہے اور بلاشبہ یہ

تشبیہ نہایت خوب و مرغوب ہے یہ ایسی تشبیہ ہے کہ علاوہ شعرائے فارسی و اردو کے اس کے ساتھ تمام اہل یورپ اور بھی وہاں کے لوگ جہاں محبوبہ کی شمع ہوئی کو ایک مرمقبول جانتے ہیں اتفاق رکھتے ہیں۔

اِلیٰ مِثْلِهَا یَرْنُو الْحَلِیْمُ صَبَابَةً ۔۔۔ اِذَا مَا اسْبَکَرَّتْ بَیْنَ دِرْعٍ وَّمِجْوَلِ

معنی:۔ ایسی محبوبہ کی طرف جس کے اوصاف بالا میں بیان ہوئے مرد کامل العقل بھی سوز وگرمی عشق کے ساتھ نظر کرتا ہے جبکہ وہ اس سن کو پہنچتی ہے کہ جو سن میں میان سن زنان جوان و سن دختران نابالغہ کے ہوتا ہے یعنی جب محبوبہ ابتدائے سن بلوغ کو پہنچتی ہے تو اس وقت عاقلوں پر بھی آفت آجاتی ہے ان کی ساری عقل ہوا ہوجاتی ہے۔

واضح ہو کہ یہ شعر نہایت فطرتی انداز رکھتا ہے اور شاعری کے پیرائے میں حسن کی پرتاثیری سے خبر صحیح دیتا ہے اس رنگ کے اشعار فارسی اور اردو میں بہت موجود ہیں۔

تَسَلَّتْ عَمَایَاتُ الرِّجَالِ عَنِ الصِّبَا ۔۔۔ وَلَیْسَ فُؤَادِیْ عَنْ هَوَاكِ بِمُنْسَلِ

معنی:۔ دور ہوئیں مردوں کی جہالتیں انقضائے کودکی کے بعد لیکن میرے دل سے تیرا عشق جوانی کے بعد بھی زائل نہ ہو۔

یہ شعر عجب لطف رکھتا ہے عشق کا تقاضا ہی یہ ہے کہ کبھی زائل نہ ہو جو عشق زائل ہو جائے وہ عشق نہیں ہے ہوسناکی ہے اگر امرء القیس اپنی آوارگی اور بے اعتدالی کے قصّے نہیں کہے ہوتا تو یہ شعر جو بشکل خطاب، عنیزہ کی طرف ہے سامع میں عرفانی حالت پیدا کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر چونکہ اوپر میں

ایک گونہ بد مذاقی کے ساتھ بر روے عنیزہ امرء القیس اپنی جوانانہ حرکات کا اعادہ کرتا گیا ہے اس کا یہ خطاب عنیزہ کی طرف سامع کے دل پر پورا اثر پیدا نہیں کرتا ہے اگر کاش وہ یہ دکھلانے ہوتا کہ اسے بہت سے محبوبوں سے سامنا ہوا مگر کسی کے ساتھ اس کے دل کو تعلق نہیں پیدا ہؤا اور پھر عنیزہ کی طرف یوں خطاب کرتا کہ صرف تو ہی معشوقان عالم سے ایک معشوق ہے جس کا تعلق میرے دل کو ہے اور یہ ایسا تعلق ہے کہ اس میں شباب وشبیب کو کوئی دخل نہیں ہے تو اس سے عشق صادق کا نقشہ ہویدا ہوتا اور اس بیان کی تاثیر ہی علحدہ ہوتی بہر حال یہ شعر بلانے خود ایک عجب عاشقانہ رنگ رکھتا ہے اور یاد رکھنے کے قابل ہے

أَلَا رُبَّ خَصْمٍ فِيكِ أَلْوَى رَدَدْتُهُ　　نَصِيحٍ عَلَى تَعْذَالِهِ غَيْرِ مُؤْتَلِ

معنی:۔ آگاہ ہو کہ بہت سے ایسے ناصح کو جو تیرے عشق میں مجھ سے نکوہش کے ساتھ پیش آنے والے ہیں اور سختی کے ساتھ مجھے عشق سے منع کرنے والے ہیں میں نے رد کیا یعنی ایسے ناصح کی ایک نہ سُنی اور تیرے عشق میں استوار رہا۔

ناصح کا مضمون فارسی اور اردو کی شاعری میں بخلاف یورپین شاعریوں کے کثرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اور شک نہیں کہ لطف سے خالی نہیں ہے۔

وَلَيْلٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ أَرْخَى سُدُولَهُ　　عَلَيَّ بِأَنْوَاعِ الْهُمُومِ لِيَبْتَلِي

معنی:۔ اور بہت سی راتیں ہیں انھوں نے مانند موج بحر کے اقسام اندوہ کے ساتھ اپنے پردہ ہائے تاریکی کو مجھ پر ڈال دیا تاکہ مجھے آزمائیں کہ آیا مجھ میں طاقت شکیبائی ہے یا نہیں۔

فَقُلْتُ لَهُ لَمَّا تَمَطَّى بِصُلْبِهِ　　وَأَرْدَفَ أَعْجَازًا وَنَاءَ بِكَلْكَلِ

معنی:۔ پس کہا میں نے ایسی رات کو کہ جس کا ذکر بالا میں ہوا جبکہ اس نے اپنی پیٹھ دراز کی اور یکے بعد دیگرے اپنی سرین کو لائی اور سینے کو دور کیا یعنی جب رات دراز ہوئی۔ اور میں یہ سمجھا کہ اب رات کا آخر حصہ پہنچا تو پے در پے حصہ ہائے شب آتے ہی گئے اور گو حصہ اول جو آغازِ شب تھا دور بھی ہو گیا تو بھی وہ شب انتہا کو نہ پہنچی پس میں نے رات کا یہ رنگ دیکھ کر اس سے یہ کہا جو مندرج ذیل ہوتا ہے۔

أَلَا أَيُّهَا اللَّيْلُ الطَّوِيلُ أَلَا انْجَلِي ۔۔۔ بِصُبْحٍ وَمَا الْإِصْبَاحُ مِنْكَ بِأَمْثَلِ

معنی:۔ آگاہ ہو اے شب دراز اور اپنی تاریکی کو نورِ صبح کے ساتھ مبدل کر ڈال تاکہ مجھے رنج سے رہائی ہو۔

واضح ہو کہ شب غم بہت بھاری ہوتی ہے اور انسان گھبرا کر یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح صبح ہو جائے پس شاعر تمنائے صبح کا اظہار کرتا ہے اور رات کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے شب دراز صبح ہو جا تاکہ مجھ کو تیری ظلمت سے نجات ہو اور اس وجہ سے تخفیفِ غم کی صورت پیدا ہو مگر اس کے بعد کہتا ہے کہ اے شب مجھے صبح کی تمنا ہے مگر میرے واسطے صبح تجھ سے خوب تر ہے اس واسطے کہ میرا غم ایسا ہے کہ صبح کے نمودار ہونے سے کوئی فرق اس میں پیدا نہیں ہو گا جیسا میرا غم اس وقت ہے صبح کے ظاہر ہونے پر بھی ویسا رہے گا۔

فَيَا لَكَ مِنْ لَيْلٍ كَأَنَّ نُجُومَهُ ۔۔۔ بِأَمْرَاسِ كَتَّانٍ إِلَى صُمِّ جَنْدَلِ

معنی:۔ پس تو عجب رات ہے کہ جس کے ستارے گویا رسن ہائے کتان سے

سنگ سخت میں بندھے ہوئے ہیں یعنی اپنی جگہوں سے کھسکتے ہی نہیں۔
درازی شب کا مضمون ہر زبان میں دیکھا جاتا ہے ہر زبان کے شعرا نے اس کو باندھا ہے سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

سعدیا نوبتِ امشب دہلِ صبح نہ کوفت یا مگر صبح نباشد شب تنہا ی را

لمؤلفہ

من غم د پروا سے روز حشر چوں دارم کہ چوں
باسحر ربطے نمی بندد شب یلدا ئے من

بہر حال اس شعر میں بھی یہ مضمون بڑی خوش سلوبی سے بندھا ہے اور فطرتی انداز سے خالی نہیں ہے شب غم واقعی ایسی ہوتی ہے اور اس میں معلوم ہوتا ہے کہ تارے اپنی جگہ سے کھسکتے نہیں ہیں بخلاف شب مسرت کے کہ چاند تارے دم کے دم میں رخصت ہو جاتے ہیں اور صبح دن سے آپہنچی ہے یہی کیفیت دن کی ماہ صیام میں ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کو کسی نے کھونٹی میں باندھ رکھا ہے کسی طرح شام ہوتی ہی نہیں ہے۔

وَقِرْبَةِ اَقْوَامٍ جَعَلْتُ عِصَامَهَا عَلٰی کَاهِلٍ مِّنِّیْ ذَلُوْلٍ مُرَحَّلٖ

معنی :- اور بہت سی مشکیں قوموں کی ہیں کہ میں نے ان کے دوال کو اپنے فرماں بردار اور مرحل یعنی کوچ کنا بندہ دوش پر رکھا ہے۔

مطلب شعر یہ ہے کہ ہر چند میں بادشاہوں سے ہوں تاہم خدمت دوستان و مہمانان کی نظر سے ان کی مشکوں کو اپنے کاندھے پر اٹھاتا ہوں۔ یہاں شاعر اپنی مدح کرتا ہے اور دکھلاتا ہے کہ خدمت احباب کی بجا آوری میں دبیس پا نہیں

ہوناا س قول سے اس کی شرافت انکسار اور عمدگی طبیعت کا اظہار مراد ہے
آدمی کو چاہیئے کہ درجۂ عالی کے حاصل رہنے پر بھی صفت خُلق کو ملحوظ رکھے ؎

چوں بدولت برسی مست نہ گردی مردی

بلند پایگی ، کا تقاضا سے صحیح یہی ہے کہ خدمت قوم میں کبھی قاصر نہ ہو اور امر
واقعی بھی یہی ہے کہ سردار قوم خادم قوم ہوتا ہے ادائے حقوق کرنا اس کا کام
ہے اور اسی میں اس کی خوبی ہے۔ ؎

تواضع زگردن فرازان نکوست | گدا اگر تواضع کند خوے اوست

وَوَادٍ كَجَوْفِ الْعَيْرِ قَفْرٍ قَطَعْتُهُ | بِهِ الذِّئْبُ يَعْوِي كَالْخَلِيعِ الْمُعَيَّلِ

معنی: اور بہت وادی ہیں مانند شکم گدہ کے جس سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا
اس واسطے کہ شکم گور سے دودھ نہیں ملتا اور وہ وادی بیاباں بے آب ودانہ ہیں کہ
جنہیں میں نے قطع کیا ان وادیوں میں بھیڑیا چلاتا ہے مانند ایسے ہارے ہوئے جواری
کے جو عیال کثیر رکھتا ہو یعنی یہاں بھیڑیا غایت گرسنگی سے نالہ و فریاد کرتا ہے۔
یہاں شاعر اپنے تحمل اور دلیری کو صحرانوردی کے پیرائے میں ظاہر کرتا ہے اور واقعی
یہ ہے کہ تحمل اور دلیری لوازم عشق سے ہیں عاشقی آسان کام نہیں ہے یہ کام
بہادر دل کا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

نازبیں راعشق می زیبد نہ ہر گز جان من | شیر مردان بلاکش پا دریں غوغا نہند

فَقُلْتُ لَهُ لَمَّا عَوَى إِنَّ شَأْنَنَا | قَلِيلُ الْغِنَى إِنْ كُنْتَ لَمَّا تَمَوَّلِ

معنی: ۔ پس کہا میں نے اس بھیڑیئے سے جب وہ چلایا کہ بتحقیق میری شان بھی
ناداری کی ہے اگر تو مال دار نہیں ہے یعنی تو جو گرسنگی سے چلاتا ہے تو یہاں میرے پاس

کچھ نہیں ہے۔
واضح ہو کہ یہ رنگ بیان فارسی یا اردو کی شاعری میں نہیں دیکھا جاتا ہے یہ بیان کے طریقے ان اقسام سے ہیں جو کسی ملک خاص سے مختص ہوتے ہیں اور دوسرے ملک میں تقاضائے ملکی سے رواج نہیں پا سکتے۔

كِلَانَا إِذَا مَا نَالَ شَيْئًا أَفَاتَهُ ۔۔۔ وَمَنْ يَحْتَرِثْ حَرْثِي وَحَرْثَكَ يُهْزَلِ

معنی:- دونوں ہم لوگوں سے اگر کسی نے کوئی چیز پائی تو اسے ضائع کر ڈالا یعنی ایسے گرگ ہیں اور تو خود کی یہ حالت ہے کہ اگر ہم سے کسی نے مال حاصل کیا تو اسے خرچ کر ڈالا اور جو شخص میری اور تیری طرح کوشش و سعی کرے لاغر ہو جائے گا یعنی میری اور تیری طرح کوشش کرنے والا محتاج ہو جائے گا۔
ظاہر ہے کہ یہ انداز بیان فارسی اور اردو میں کمتر دیکھا جاتا ہے۔

وَقَدْ أَغْتَدِي وَالطَّيْرُ فِي وُكُنَاتِهَا ۔۔۔ بِمُنْجَرِدٍ قَيْدِ الْأَوَابِدِ هَيْكَلِ

معنی:- اور میں اول سحر میں جاتا ہوں درحالیکہ طیور اپنے آشیانوں میں رہتے ہیں ہمراہ اسپ کم موئے جو بند و حربان ہے اور دراز قوی ہیکل ہے یعنی میں علی الصباح ایسے وقت میں سوار اسپ ہوتا ہوں کہ اس وقت طیور اپنے آشیانوں سے باہر نہیں آتے اور وہ گھوڑا ایسا ہے کہ کم موئے جو دلیل ہے تیز رفتاری کی اور ایسا ہے کہ جو وحوش صحرائے کو گرفتار کر لینے کی قدرت رکھتا ہے اور ایسا ہے کہ دراز و قوی ہیکل ہے
واضح ہو کہ اہل عرب چونکہ گرم ملک کے رہنے والے ہیں تقاضائے آب و ہوا سے ان کا مزاج محرور واقع ہوا ہے جو شیلا پن لوازمات محرور المزاجی سے ہے پس ان کا میلان عورتوں کی طرف یا ان کی رغبت اسلحہ اور گھوڑوں کی جانب ایک

طبعی ہے۔ امرء القیس اپنی مردانہ صفتوں کو بیان کر کے اب اپنی شہسواری اور اپنے گھوڑے کی مدح کرتا ہے یہ مدح نہایت فطرتی انداز رکھتی ہے اور ہر چند اس کا پہلو شاعرانہ ہے مگر فارسی اور اردو کے شعرا کی نامطبوع صفت خوانی سے تمام تر پاک ہے شعر ہذا اور ذیل کے اشعار میں جو صفتیں گھوڑے کی مندرج ہیں یقیناً ایسی ہیں کہ عمدہ گھوڑے میں وہ صفتیں موجود ہتی ہیں واقعی اچھا گھوڑا ایسا ہوتا ہے کہ اس کی صفت میں مبالغہ پردازی کی کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ ان اشعار سے صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر خوب جانتا ہے کہ گھوڑے کو کیسا ہونا چاہئے اور شک نہیں کہ اہل عرب اس بات کو خوب جانتے ہیں ان اشعار میں گھوڑے کی تعریف اس رنگ پر کی گئی ہے کہ جو حضرات سخن سنجی کا مذاق صحیح رکھتے ہیں بہت کچھ لذت یاب سخن ہو سکتے ہیں یہ اشعار ویسے نہیں ہیں جیسا کہ عرفیؔ و ذوقؔ وغیرہما کے ایسے شعرائے فارسی و اردو نے اپنے ممدوح کے گھوڑوں کو تماشے کا گھوڑا بنا رکھا ہے ان دونوں شاعروں کے کچھ کلام جو گھوڑے کی تعریف میں ہیں بغرض ظاہر کرنے ان کی بد مذاقی کے ذیل میں عرض کئے جاتے ہیں انہیں پر ان کے ایسے دیگر شعرا کے کلام کو بھی قیاس کرنا چاہئے۔

عرفی

آن سبک سیر کہ چوں گرم عنانش سازی — از ازل سوے ابد و نہ ابد آید بہ ازل
قطرۂ کش دم رفتن چکد از پیشانی — شبنم آساش نشیند گہ رجعت بہ کفل

ایضاً

نہ توسن تو عرق بر زمیں فرو ریزد   صبا ز طرف چمن یاسمیں فرو ریزد

ذوق

آسیا وار پھرے کیوں نہ فلک گرد زمیں   تیرے توسن کے جو کاوے کی اُڑا جائے بھرت

ایضاً

جلد اتنا کہ جہاں عرصۂ جولاں اس کا   عہد مستقبل و ماضی کا وہاں ہے اک حال
اس فلک سیر کو جولاں جو کرے تو تو یہ ڈر   مزرعۂ سبز فلک ہو نہ صبا وا پامال

ظاہر ہے کہ یہ سب اشعار نسبیت فطرت سے تمام تر معرّا ہیں اور درحقیقت کوئی لطف نہیں رکھتے لیکن ایسے شعرا کی طرف سے یہ معذرت پیش کی جاسکتی ہے کہ اس وضع کے اشعار یہ لوگ روٹی کی غرض سے کہا کرتے تھے تب یہ تعجب گزرنے لگتا ہے کہ خدایا کیا ان کے ممدوحین اس درجہ تنزل دماغی کو پہنچے ہوئے تھے۔ کہ ان سے ایسے بے معنیٰ اشعار کہلایا کرتے تھے اور ایسے نامربوط کلام سے خود لذت یاب ہوتے تھے۔

مِكَرٍّ مِفَرٍّ مُقْبِلٍ مُدْبِرٍ مَعًا   كَجُلْمُودِ صَخْرٍ حَطَّهُ السَّيْلُ مِنْ عَلِ

معنی:- اسپ مذکور نہایت حملہ کرنے والا ہے اور نہایت بھاگنے والا ہے گویا کہ بیک وقت منہ سامنے لانے والا ہے اور منہ پھیرنے والا ہے مانند ایک بڑے سخت پتھر کے جس کو سیل نے بلندی سے نیچے کی طرف ڈھلکایا ہو۔

یہ ایک سمہ نیچرل تعریف گھوڑے کی ہے جو ایسا گھوڑا ہوتا ہے وہ میدان جنگ اور شکار افگنی کے قابل ہوتا ہے ایسے ہی گھوڑے کی پیٹھ سے نیزہ بازی کرتے ہیں جس

گھوڑے میں یہ صفتیں نہیں ہوتیں نہ وہ لڑائی کے کام کا ہوتا ہے نہ اس سے اغراض
شکار انگنی نکلتے ہیں ایسے گھوڑے کی قدر وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے میدان
جنگ میں ایسے گھوڑے سے کام لیا ہے جنھوں نے چوگان یعنی پولو کھیلے ہیں یا جنھوں
نے نیزوں سے شور گوزن یا ہرن مارے ہیں۔

كُمَيْتٍ يَزِلُّ اللِّبْدُ عَنْ حَالِ مَتْنِهِ   كَمَا زَلَّتِ الصَّفْوَاءُ بِالْمُتَنَزِّلِ

معنی:۔ اسپ مذکور ایسا کمیت ہے کہ اس کے بدن کی صفائی کے باعث نمدزین
اس کی پیٹھ سے پھسل جاتا ہے جس طرح کہ آب باراں سنگ بّراق سے گر پڑتا ہے
سبحان اللہ کیا تعریف گھوڑے کی شاعر نے کی ہے کمال اطلاع سے گھوڑے کے
رنگ کو کمیت لکھا۔ جاننا چاہیئے کہ بہترین رنگ گھوڑے کے لئے رنگ کمیت
ہے اس رنگ کے گھوڑے کا بدن سرخ ہوتا ہے دُم سیاہ ہوتی ہے اور چاروں
پاؤں سیاہ یا مائل بہ سیاہی ہوتے ہیں گھوڑے کے لئے یہ نہایت پختہ رنگ ہے
اس رنگ کے گھوڑے بیشتر مضبوط تیز رفتار شائستہ اور نیک طبیعت ہوتے
ہیں دیکھنے میں بھی آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں شاعر نے اپنی اطلاع کے رُو سے اسپ
مذکور کو کمیت کہا ناواقف شاعر کوئی اور رنگ لکھ دیتا۔ جیسے سمند تیز رنگ سبزا
مشکی چال ابلق کرہ اقلا چینا سُرخا وغیرہ جو کمیت کے برابر نہیں سمجھے جاتے ہیں فقیر
کی دانست میں فارسی یا اردو کے کم کسی شاعر نے گھوڑے کی تعریف میں اس رنگ
کو کمیت لکھا ہے چونکہ واقعہ نگاری کا مذاق اکثر ان زبانوں کے قصیدہ گو شعرا
نہیں رکھتے ہیں حقیقت حال کی طرف ان کے ذہن کو میلان نہیں ہوتا لے دے کر یا
باتوں کو سوا الٹا لم کر جاتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں کیسے ہی تھا ہیں کہ صرف مبالغہ پردازی

کہ انھوں نے شاعری کی جان سمجھا ہے۔ البتہ میر انیس صاحب کے کلام میں فطرتی انداز بہت موجود رہتے ہیں گو کبھی کبھی ان کی شاعری بھی ملکی نقاضوں کے باعث دائرہ واقعہ نگاری سے قدم باہر رکھ جاتی ہے اس پر بھی اُن کے کلام میں جہاں انھوں نے گھوڑے کی تعریف لکھی ہے ایسی نیچرل خوبیاں پائی جاتی ہیں کہ سامع کو حیرت دامنگیر ہوتی ہے صاف ان کے کلام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ گویا انھوں نے مجرد گھوڑے کے حالات کی تحقیق میں اپنی عمر عزیز بسر کی ہے یہ ندرت نہ کسی فارسی اور نہ کسی اردو کے شاعر میں پائی جاتی ہے ہاں البتہ **میر حسن** مصنف مثنوی سحر البیان جو ایک بڑے نیچرل شاعر ہیں انھوں نے گھوڑے کی تعریف میں کچھ شعر کہے ہیں جو قابل توجہ ہیں مگر یہ اشعار کہے دیتے ہیں کہ شاعر نے ہندوستانی خیالات کو وقت شعر گوئی ملحوظ رکھا ہے یہ بھی ایک نیچرل رنگ ہے جو ہندوستانی مذاق سے خبر دیتا ہے اور یہ وہ خیالات ہیں جن کے پابند عموماً اہل ہند ہیں اشعار ذیل ایک کل کے گھوڑے کے بیان میں ہیں۔

کہا ماہ رخ نے کہ تھے تیرے بخت — کہ بخشا تجھے ہیں سلیمان کا تخت
جو اترے تو کل اس کی یوں جوڑیو — جو برعکس چاہے تو وہ موڑیو
زمین سے لگا اور تا آسماں — جہاں چاہیے جائیے تو وہاں

داستان گھوڑے کی تعریف میں

کہوں کیا میں اس اسپ کی خوبیاں — پریزادوں میں کب ہوں یہ محبوبیاں
ذرا کل جو موڑی فلک پر ہوا — جو کہئے تو کہئے اسے بادپا

نہ کھاوے نہ پیوے نہ سوئے کبھی / نہ ٹاپے نہ بیمار ہووے کبھی
نہ خشری نہ کمری نہ شب کور وہ / نہ وہ کہنہ لنگ اور مُنہ زور وہ
نہ ہڈوں کا نہ موتڑوں کا خلل / نہ پیشانی اور پر ستارے کا بل
نہ ساپن نہ ناگن نہ بھونری کا ڈر / ہر اک عیب سے وہ غرض بے خطر

ظاہر ہے کہ میر حسن نے ہندوستانی خیالات کی پابندی ۔ بھونریوں کے بیان میں کی ہے اس کے پابند ہمارے ملک کے ہر طبقے کے آدمی معلوم ہوتے ہیں درحقیقت یہ خیالات بے معنی ہیں اور عند التجربہ محض مہمل ثابت ہوتے گئے ہاں فقیر نے دیدہ و دانستہ ایک ہرداول گھوڑا لیا تھا جب تک وہ اپنے پاس رہا کسی طرح کا آسیب فقیر کو نہ پہنچا یہ گھوڑا اس بھونری کے ساتھ کوئی ایسی دوسری بھونری بھی نہیں رکھتا تھا کہ جس سے یہ قیاس کیا جاتا کہ وہ ہرداول کے اثر کو زائل کرنے والی تھی اسی طرح فقیر کے ایک عالی رتبہ عزیز جوڑی کا ایک جانور رکھتے تھے جو ستارہ پیشانی تھا جب ان سے کوئی شخص کہتا کہ یہ گھوڑا ستارہ پیشانی ہے اسے دفع فرمائیے تو وہ ہنس کر فرماتے کہ میں آفتاب پیشانی ہوں میرے سامنے اس کا ستارہ پیشانی ہونا کیا اثر بد پیدا کر سکتا ہے یہ سب وہمی باتیں ہیں اور مرد محصّل کی توجہ کرنے کے قابل نہیں ہیں دنیا کے معاملات گھوڑے کی بال بھونری پر موقوف نہیں ہیں فقیر نے بہت سے مبارک بھونری کے جانوروں کے مالکوں کو مبتلائے آفتاب ہوتے دیکھا ہے البتہ شائق کو عیوب شرعی کا ملحوظ رکھنا واجبات سے ہے اور یہ ایسے عیوب ہیں کہ عقل سلیم بھی انھیں عیب مانتی ہے ہم مسلمانوں

میں بال بھونری کا عقیدہ ہندوستان میں آنے کے پہلے نہ تھا اسلام میں
تو ایسی لایعنی باتیں کیوں ہونے لگیں ایام جاہلیت کے اہل عرب بھی بال
بھونری کو لاشئی جانتے تھے تعجب ہے کہ اس عہد کے ہندی اہل اسلام ایسی
لغو باتوں کے پابند ہیں اور صرف اسی کے پابند نہیں ہیں ہزاروں مہمل خیالات ان کے
جزو معتقدات ہو گئے ہیں۔

علاوہ رنگ معقول بیان کرنے میں گھوڑے کی صفائی بدن کو ذکر کیا ہے۔ یہ جاننا چاہیئے
کہ بغیر عمدگی جلد کے گھوڑے کے بدن میں صفائی نہیں آسکتی عمدہ جلد اسی گھوڑے کی ہوتی
ہے جس کی نسل اچھی ہوتی شاعر کا اس صفت کو ملحوظ رکھنا کہے دیتا ہے کہ شاعر اس درجے کا
آدمی ہے کہ اس کے پاس قوم دار گھوڑے تھے امرء القیس شاہزادگان نجد
سے ہے امرائے نجد گھوڑوں کی نسل کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کی اصالت
کے قائم رکھنے میں اہتمام بلیغ کو راہ دیتے ہیں گھوڑوں کے نسب نامے یاد
رکھتے ہیں اور عمدگی قومیت کو خوب پہچانتے ہیں کوئی نجد میں جاکر ان کے
گھوڑوں کی جلدوں کو اپنی آنکھوں سے معائینہ کرے تب قول امرء القیس
کی خوبی کو پہنچ سکے گا کہ ناواقف کا کام نہیں ہے کہ اس کے لطف کلام سے
حظ اٹھائے ہم ہندیوں نے کیا گھوڑے دیکھے ہیں کہ اس کے بیان کی تہ کو
پہنچ سکیں۔ ہر حال جاننا چاہیئے کہ صفائی جلد دلیل نجابت ہے بری نسل کے
گھوڑے بدپشمے ہوتے ہیں بال ان کے خرس وبز کو ہی کی طرح موٹے ملایمت
و ملاحت ندارد اس ملک میں بھی جو کبھی اچھے گھوڑے ملک عرب عراق
ایران بخارا وغیرہ کی طرف سے آجاتے ہیں تو ان کی جلدیں دیکھنے کے قابل

ہوتی ہیں ان پر ہاتھ پھیرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جلدیں کا ہے کو ہیں مخمل
کا ثانی ہیں بلکہ مخمل سے کوئی زیادہ نرم شے ہیں۔

عَلَى الذَّبْلِ جَيَّاشٌ كَأَنَّ اهْتِزَامَهُ ۔ إِذَا جَاشَ فِيهِ حَمْيُهُ غَلْيُ مِرْجَلِ

معنی:۔ اسپ مذکور باوجود لاغری کے جوش مارنے والا ہے گویا کہ آواز
اس کی جب کہ اس کی گرمی جوش میں آئے دیگ کا جوش کرتا ہے یعنی جب وہ
گھوڑا گرم ہوتا ہے تو اس کے گرم ہونے پر اس کی آواز رفتار دیگ کے جوش کا عالم
پیدا کرتی ہے۔

واضح ہو کہ شاعر نے گھوڑے کی تعریف لاغری کے ساتھ کی اسے فربہ نہیں کہا
اس لئے کہ اسپ لاغر تیز رفتار اور بکار آمد ہوتا ہے بخلاف فربہ کے کہ اس
سے نہ لڑائی نہ دوڑ نہ شکار نہ چوگان بازی میں کام لیا جا سکتا ہے سعدی
علیہ الرحمہ نے خوب فرمایا ہے ؎

اسپ لاغر میاں بکار آید ۔ روز میدان نہ گاؤ پرواری

شاعر نے اس جگہ بھی اپنی اطلاع سے کام لیا ہے گھوڑے کی تعریف میں مضمون
لاغری کو پیش نظر رکھا اہل عرب خوب جانتے ہیں کہ گھوڑے کا بدن کس انداز
کا ہونا چاہئے۔ اہل فرنگ بھی پورے طور پر باخبر ہیں کہ سواری کے گھوڑوں
کو کس قدر گوشت رکھنا چاہئے مگر بہت سے ہمارے ہم وطن کے خیالات
اس مادے میں علٰحدہ ہیں ان کی سواری کے گھوڑے دودھ ملیدہ گاجر بھیلا
کھا کر ایک عجیب شے ہو جاتے ہیں تنلو پچاس قدم چل کر پسینے میں ڈوب
جاتے ہیں اور جس طور پر رکھے جاتے ہیں اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ محض

بیکار ہو جائیں ایسے گھوڑے نہ دوڑ کے کام کے رہتے ہیں اور نہ ان سے صیدافگنی کی غرض نکلتی ہے البتہ ایسے گھوڑے رقص کا لطف دکھلاتے ہیں اسی غرض سے گھونگرو وغیرہ بھی پہنائے جاتے ہیں واہ رے مذاق گھوڑا جو سپاہی اور غازی مرد کا حکم رکھتا ہے لُولی حرکات بنایا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ اہل عرب صرف عمدہ گھوڑے نہیں رکھتے ہیں۔ بلکہ گھوڑے کو کیا ہونا چاہیئے اور اس کا کیا مصرف ہے اس کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ اہل فرنگ بھی اس کام کو خوب جانتے ہیں حیف ہے ہم لوگوں پر کہ ہم لوگوں کی جتنی اچھی باتیں تھیں اہل یورپ میں چلی گئیں اور ہم لوگوں نے غیر اقوام کی بُری خصلتیں اختیار کر لیں

مِسَحٍّ اِذَا مَا السَّابِحَاتُ عَلَى الْوَنیٰ ۔ اَثَرْنَ الْغُبَارَ بِالْكَدِيْدِ الْمُرَكَّلِ

معنی: اسپ مذکور نہایت تیز رفتاری کے باعث مثل آب ریختہ کے ہے یعنی جیسے آب ریختہ کی حرکت تیز ہوتی ہے ویسا ہی یہ اسپ بھی اپنی رفتار میں تیز ہے اور یہ تیزی اس کی اس وقت قائم رہتی ہے جب اور تیز رفتار گھوڑے دوڑ سے ماندے ہو کر ایسی زمین سخت میں جو سُم ستور ان سے نرکیدہ اور کوفتہ رہتی ہے غبار اڑانے لگتے ہیں یعنی اور گھوڑے دوڑ میں تھک کر سُست ہو جاتے ہیں مگر اسپ مذکور نہیں تھکتا اور اس کی وہی تیزی برقرار رہتی ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اسپ مذکور صرف نہایت تیز رفتار نہیں ہے بلکہ بہت جفاکش بھی ہے جفاکشی تیز رفتار گھوڑے کے لئے ایک بڑی صفت کی بات ہے شاعر نے بڑی اطلاع کے ساتھ گھوڑے کی یہ تعریف کی ہے جاہل شاعر کے دماغ میں کبھی یہ تعریف نہیں آسکتی ہے یہ تعریف اسی

شاعر کے قلم سے نکلے گی جو گھوڑے کے فن کا بڑا ماہر ہوگا واقعی ایسے گھوڑے
کا کیا کہنا ہے کہ دوڑ میں اور گھوڑے تھک جائیں تو اس کا دم خم بدستور سابق
باقی رہے یہ بات عربی گھوڑوں میں دیکھی جاتی ہے گھوڑ دوڑ میں ایسا دیکھا
گیا ہے کہ جب اور قوم کے گھوڑوں کی قوت رفتار ختم ہونے لگی ہے تو اس
وقت عربی گھوڑے اپنے زور پر آنے لگے ہیں فقیر کا ذاتی تجربہ ہے کہ عربی
گھوڑے ایک اچھی دوڑ کے بعد کھلنے لگتے ہیں اور واقعی وہ اپنی پوری قوت
رفتار پر تب پہنچتے ہیں جب اور گھوڑوں کی قوت کم ہونے لگتی ہے ظاہر
ہے کہ جو شاعران امور سے واقف نہ ہوگا وہ ایسے مضمون کب باندھے گا
یا سامع بےخبر کو ایسے فطرتی کلام سے کیا لطف سخن ملے گا

یُزِلُّ الْغُلَامَ الْخِفَّ عَنْ صَهَوَاتِہٖ وَیُلْوِیْ بِاَثْوَابِ الْعَنِیْفِ الْمُثَقَّلِ

معنی:- اسپ مذکور غایت تیز رفتاری کے باعث طفل سبک کو اپنی پیٹھ
سے گرا دیکھتا ہے۔ یعنی طفل جو سواری میں مہارت نہیں رکھتا ہے اس کی غایت
تیز رفتاری کے سبب اس کی پیٹھ پر ٹھہر نہیں سکتا ہے پس اس کی سواری کے
لئے جوان ماہر درکار ہے جو فن سواری کو جانتا ہے۔
اس تعریف سے غرض شاعر یہ ہے کہ اسپ مذکور نہایت تیز رفتار ہے
نہ یہ کہ بد ہے جو سوار کو پٹک دیتا ہے پس ایسے گھوڑے کو ایک عمدہ
شہسوار درکار ہے۔ اور اسپ مذکور گرا دیتا ہے جامہ ہائے سوار ماہر دگراں
کو یعنی اس کی تیزی کے سبب سے ماہر سوار کے کپڑے اس کے ہاتھ سے
باہر ہو جاتے ہیں۔ مطلب شاعر یہ ہے کہ اسپ مذکور کس قدر تیز ہے کہ

شہسوار کو چاہئے کہ کپڑے مستعدی کے ساتھ پہن کر اس پر سوار ہو ورنہ
ٹوپی دستار کہیں سے کہیں چلی جائے گی

دَرِیْرٍ کَخُذْرُوْفِ الْوَلِیْدِ اَمَرَّہٗ　　تَتَابُعُ کَفَّیْہِ بِخَیْطٍ مُوَصَّلِ

معنی :- اسپ مذکور تیز رو ہے مانند خُذروف لڑکے کے جس کا
دھاگا خوب بٹا ہوا ہوتا ہے اور جسے دونوں ہاتھ سے لڑکے گھماتے ہیں بذریعہ
ایک رشتہ پیوستہ کے۔

واضح ہو کہ خُذروف کو زبان ہندی میں پھرکی کہتے ہیں اس کو گھمانے سے
ایک خاص طرح کی آواز نکلتی ہے لڑکے اس کھیل کو ہندوستان میں بھی کھیلا
کرتے ہیں اس شے کو بنانے کی ترکیب یہ ہے کہ ایک گول مدوّر شے کو جھلی سے
مڑھ دیتے ہیں پھر اس میں دھاگا ڈال کر گھماتے ہیں اس گھمانے سے اس میں
سے آواز نکلتی ہے۔ یہاں آواز سے کوئی مطلب نہیں ہے اس جگہ شاعر گھوڑے
کی تیزی کو اس شے کی گردش کی تیزی کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے ظاہر ہے کہ
جب کوئی ایسی شے گھمائی جائے گی تو اس کی حرکت نہایت سریع ہو گی تشبیہ
بھی دائرہ فطرت سے باہر قدم نہیں رکھتی ہے اور یہ اس طرح کا سے سرد یا
مبالغہ نہیں ہے جیسا کہ عرفی نے اپنے شعر مرقومہ بالا میں ازل و ابد کو اکٹھا
کر کے دکھایا ہے۔

لَہٗ اَیْطَلَا ظَبْیٍ وَّسَاقَا نَعَامَۃٍ　　وَاِرْخَاءُ سِرْحَانٍ وَّتَقْرِیْبُ تَتْفُلِ

معنی :- اسپ مذکور کی ہر دو تہی گاہیں آہو کی تہی گاہیں ہیں اور اس کی ہر دو
ساقین شتر مرغ کی ساقین ہیں اور دوڑ اسپ مذکور کی بھیڑیئے کی دوڑ ہے اور

ریپٹ بچۂ روباہ کی ہے

واضح ہو کہ شاعر نے یہاں سب ایسے جانوروں کو مجتمع کیا ہے جو تیز رفتاری میں ممتاز ہیں آہو کی تہی گاہ اور شتر مرغ کے پانوں کا ذکر کیا دوڑ بھیڑیئے کی اور ریپٹ روباہ کی بتلائی آہو کی تہی گاہ سے تشبیہ اس لئے دی کہ آہو اور دوسرے ساخت بدن چھریرا ہوتا ہے اس کی تہی گاہیں اس ترکیب کی ہوتی ہیں کہ جو اس کی تیز رفتاری کی معین ہوتی ہیں گھوڑے کی تیز رفتاری کا کمال یہی ہے کہ آہو کے برابر دوڑ سکے ایسے کم گھوڑے ہیں جن کی پیٹھ سے شکاری نیزے یا تلوار کے ذریعے سے آہو کو شکار کر سکتا ہے کرنیل کیمبل نے اپنے روزنامچے میں اور اسٹرنڈیل صاحب نے اپنی کتاب میں آہو کے گھوڑے سے شکار کئے جانے کی دو تین سرگذشتیں تحریر کی ہیں مگر یہ آہو جن کے مذکور ان کی تحریروں میں آتے گئے ہیں یہ سب کم وبیش قبل سے زخمی ہو چکے تھے اس پر بھی وہ سب بڑی دوڑ کے بعد دشواری سے ہاتھ لگے بقیاس فقیر ملک عرب میں بھی کمتر ایسے گھوڑے ہوں گے وہ اسی صفت کے ہوں گے جس صفت کا امرء القیس کا گھوڑا تھا پھر شاعر نے شتر مرغ کی ساقوں کا مذکور کیا ہے یہ جانور قوت پرواز نہیں رکھتا اور اسے قوت پرواز کی حاجت بھی نہیں ہے فطرت نے اپنی بخشش میں افراط کو راہ نہیں دیا ہے چونکہ اسے غایت درجے کی تیز رفتاری بخشی ہے اس تیز رفتاری کے ساتھ قوت پرواز افراط بخشش کا حکم رکھتی۔ یہ جانور ریگستانوں میں رہتا ہے اور واقعی عجیب الخلقت ہے جب کوئی اس کا تعاقب کرتا ہے اس تیزی سے بھاگتا ہے کہ دم بھر میں

آنکھوں سے نہاں ہو جاتا ہے عرب اور افریقہ کے بڑے بڑے صحراؤں میں
وطن رکھتا ہے اور ان وسیع بیابانوں میں اپنے پاؤں سے وہ کام لیتا ہے۔
جیسے تیز پرواز طیور مثل عقاب و نسر کے اپنے بازوؤں سے کام لیتے ہیں عرب
کے جو نہایت تیز گھوڑے ہوتے ہیں صرف وہی تو اس کا پیچھا کر سکتے ہیں اور
جو گھوڑا اس کی دوڑ کو پہنچ سکتا ہے اسی کی تیز رفتاری سندی سمجھی جاتی ہے
آہو و شترمرغ کا ذکر کر کے شاعر بھیڑیئے کا مذکور کرتا ہے اس جانور کی بھی بڑی
دوڑ ہوتی ہے اس کا فقیر کو بھی ذاتی تجربہ حاصل ہے واقعی نہایت تیز رفتار
گھوڑے کا کام ہے۔ کہ اس جانور کا تعاقب کرے بغیر شکاری کتوں کی اعانت
کے اس کا شکار دشوار ہے آخر میں لومڑی کا بیان ہے یہ وہ چالاک اور تیز رفتار
جانور ہے کہ تازی کتوں کی کمر اس کے شکار میں ٹوٹ جاتی ہے اہل فرنگ اس
کا شکار خوب کھیلتے ہیں۔ فاکس ہونڈ جو لومڑی کے شکار کے کتے ہوتے ہیں بلے
ان کتوں کے سوا رسے کچھ نہیں بن آتی۔ واضح ہو کہ یہ شعر خوبیوں سے معمور ہے۔
وہی شخص جو علم حیوانات سے خبر رکھتا ہے اس سے لذت یاب ہوگا نہ لاعلم
شاعر ایسا شعر کہہ سکے گا اور نہ لاعلم سامع اس سے حظ اٹھا سکے گا۔ جاننا چاہیئے کہ
استادوں نے گھوڑے کی خوبیوں کی تفصیل یوں کی ہے کہ گھوڑے میں تین خوبیاں
عورت کی ہونی چاہیئے یعنی ایال کی زلف محبوباں کی طرح دراز اور سینہ و سُرین ان
کے سینہ و سرین کی طرح عریض مدوّر اور پھر اسے شیر کی تین صفتیں درکار ہیں یعنی شیر کی
طرح اسے رعب دار چہرہ رکھنا چاہیئے اور شیر ہی کی طرح اسے بہادر اور پر صولت
ہونا چاہیئے میش کی بھی تین چیزیں اس کو حاصل رہنا ضرور ہے یعنی ناک نیکی تحمل

بریں منوال اسے تین اعضا میں یعنی سر پانوں اور جلد میں ہرن سے مشابہ ہونا چاہیئے۔ اور اسی طرح بھیڑیئے سے اس کے حلقوم گلے اور قوت سمع کو اور لومڑی سے اس کے کان دم اور دلکی کو۔ اور سانپ سے اس کی قوت حافظ قوت بصر اور چابک کو اور خرگوش سے اس کی رفتار دوڑ اور جفاکشی کو ہمسری کی حاجت ہے۔ ہر چند امرء القیس نے اس طوالت سے اپنے گھوڑے کی خوبیوں کو نہیں لکھا ہے تاہم شاعرانہ تقاضا سے جس قدر امور ضروری تھے انھیں نہایت استادی کے ساتھ موزوں کیا ہے اس کے لطف کو وہی سمجھے گا جس کی گھٹی میں گھوڑے کا شوق پڑا ہوگا اور جس شوق نے اسے ماہر فن کے درجے کو پہنچایا ہوگا۔

ضَلِيعٌ إِذَا اسْتَدْبَرْتَهُ سَدَّ فَرْجَهُ　　بِضَافٍ فُوَيْقَ الْأَرْضِ لَيْسَ بِأَعْزَلِ

معنی:۔ اسپ مذکور پوری خلقت کا سرین سے پُر گوشت پُر اعصاب اور میان سے بزرگ ہے جب کوئی پس پشت اس کے آتا ہے تو اپنی دونوں رانوں کے درمیان کی کشادگی کو اپنے دم سے بند کرتا ہے اور اس کی دم میں کثرت سے بال ہیں اور دم اس کی اس قدر دراز ہے کہ زمین سے صرف تھوڑی بلندی پر رہتی ہے اور وہ دم کج نہیں ہے جو گھوڑے کے لئے عیب متصور ہے بلکہ نہایت راست ہے۔

یہ تعریف بھی شاعر کے کمال اطلاع سے خبر دیتی ہے واقعی گھوڑے کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کہ خلقت سے پورا ہو نہ اس کے قد میں نقصان ہو نہ اس کے جسم میں کڈھنگا پن ہو سُرین کو پر گوشت ہونا چاہیئے اس کی اعضائی ترکیب میں کوئی نقصان نہ لاحق ہو کمر سے بزرگ ہونے کے سبب سے متحمل وزن اٹھانے کا ہو ہر طرح۔ جوڑ بند سے درست ہو دُم میں بال کثرت سے ہوں اور دراز ایسے ہوں

کر قریب زمین کے پہنچتے ہوں اور بھی دم میں کجی لاحق نہ ہو۔ واضح ہو کہ عربی
گھوڑے جیسے خلقت کے رُو سے خوش ترکیب ہوتے ہیں جیسا کہ شاعر نے لکھا
ہے اس میں ایک حرف مبالغہ نہیں ہے ملک عرب کے گھوڑے تمام دنیا
کے گھوڑوں سے جدا انداز جسم رکھتے ہیں ان کی تھوتھنی چھوٹی پیشانی آنکھیں بڑی
ہوتی ہیں تر اور کان چھوٹے گردن کے بال لانبے گردن کا خم محراب نما سینہ
وسیع قد کے حساب سے پیٹھ چوڑی کمر بزرگ سُرین چپ گوشت پیٹ متوسط
دست و پا سانچے کے ڈھلے ہوتے ہیں مختصر یہ ہے کہ تناسب اعضا ایسا
ہوتا ہے کہ آنکھیں اچھے عربی گھوڑے کو دیکھ کر سیر نہیں ہوتی ہیں یہی جی چاہتا
ہے کہ اسے دیکھا کریں اس پر اس کی شائستگی طبیعت داری شریف
مزاجی وفاداری اور ذہانت ایسی ہوتی ہے کہ شانِ خدا یاد آتی ہے سچ یہ ہے
کہ اس کی محبوبیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اسے نظر سے دور رکھنا طبیعت گوارا
نہیں کرتی۔

كَأَنَّ سَرَاتَهُ لَدَى الْبَيْتِ قَائِمًا ... مَدَاكُ عَرُوسٍ أَوْ صَلَايَةُ حَنْظَلِ

معنی :۔ گویا کہ پشت اسپ مذکور درحالیکہ وہ قریب گھر کے ایستادہ ہے
مثل اس پتھر کے ہے کہ جس پر نئی دلھن کے لئے خوشبودار مصالح پیستے ہیں یا مانند
اس صاف و سخت پتھر کے ہے کہ جس پر حنظل توڑتے ہیں۔ یعنی اس گھوڑے کی پیٹھ
اس کے کھڑے رہنے کی حالت میں ایسی عریض معلوم ہوتی ہے جیسے پتھر کی سل ہو
جس پر مصالح پیسیں یا حنظل توڑیں۔

جاننا چاہئے کہ یہ تعریف بھی گھوڑے کے لئے ایک بڑی تعریف ہے جو گھوڑا

عربیض پیٹھ کا ہوتا ہے اس کی پیٹھ قابل اعتماد ہوتی ہے اور ایسا گھوڑا علاوہ بکار آمد ہونے کے خوش نما بھی ہوتا ہے۔ شاعر کی خوش خیالی نہایت قابل تعریف ہے۔ کیوں نہ ہو شاعر بھی اسی ملک کا شاہزادہ ہے جہاں عمدہ ترین گھوڑے پیدا ہوتے ہیں اس پر بھی شاہزادہ ایسا طبیعت دار، مردانہ مزاج بہادر طبیعت خوش پسند اور خلاق سخن

كَأَنَّ دِمَاءَ الْهَادِيَاتِ بِنَحْرِهِ ۞ عُصَارَةُ حِنَّاءٍ بِشَيْبٍ مُرَجَّلِ

معنی:۔ گویا کہ خون جانوران پیش رو کا اس کے سینے پر فشردہ مہندی کا ہے موئی سفید و شانہ کردہ میں یعنی اسپ مذکور ایسا تیز رفتار ہے کہ وحوش صحرائی کو جو اپنے ہمجنسوں سے دوڑ میں آگے رہنے والے ہیں جا لیتا ہے اور وقت شکار ان کا خون جو اس کے سینے پر گرتا ہے وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا موے سفید وشانہ کردہ عصارۂ حنا سے مخضب ہو رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر وہ گھوڑا اس قدر تیز نہ ہوتا تو کیونکر اس سے جانوران پیش رو کا شکار ممکن ہوتا چونکہ ایسے جانوروں تک دوڑ کر پہنچ جاتا ہے تو وقت شکار ان کے خون سے اس کا سینہ تر معلوم ہوتا ہے کہ گویا سفید اور شانہ کردہ بالوں پر مہندی کا خضاب چڑھا ہے واضح ہو کہ شاعر گھوڑے کی تعریف کرتے کرتے اب اس امر کا تذکرہ کرتا ہے جس سے کہ گھوڑے کی سچی خوبیوں کا تکملہ متصور ہے وہ امر معاملۂ شکار ہے گھوڑے کا پورا جوہر یا میدان جنگ یا شکار گاہ میں کھلتا ہے شکار افگنی کی مشقت بھی نبرد آزمائی کی سی ہوتی ہے شکار افگنی میں بھی بہت کچھ خوف جان لاحق رہتا ہے شکار افگنی اور نبرد آزمائی

میں فرق اس قدر ہے کہ ایک میں انسان کو مقابلہ وحوش صحرائی کے ساتھ
ہوتا ہے اور دوسری میں انسان کا مقابلہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے خیر
فرق جو کچھ ہو شکار افگنی ایک بڑی محنت کا کام ہے اس کے واسطے اور
سامانوں کے علاوہ اچھے سوار اور اچھے گھوڑے کی ضرورت ہے نامراد
راکب اور نامراد مرکب کا کام نہیں ہے کہ ایسے شکار میں اظہار جوہر کر سکے
جس قسم کے شکار کا امرء القیس شعر بالا میں ذکر کرتا ہے شعر بالا کے لطف
مضامین سے بہرہ مند ہونے کے لئے ضرور ہے کہ انسان اعلیٰ قسم کی صید
افگنی کا کچھ ذاتی تجربہ رکھے اس کا تجربہ صرف انہیں لوگوں کو ہوتا ہے جو
صید افگنی کا سچا مذاق رکھتے ہیں سچے مذاق کا حاصل ہونا ایک امر دشوار ہے
ہر شخص شکاری نہیں ہو سکتا اس کے لئے بڑی پُردلی درکار ہے۔ شکار
افگنی بھی ایک قسم شاعری کی ہے جس طرح ہر شخص کو مذاق شاعری حاصل نہیں رہتا وہی حال مذاق صید
افگنی کا بھی ہے۔ امرء القیس شعر بالا میں اپنے مذاق صید افگنی کو گھوڑے کی تعریف کے پردے
میں دکھلاتا ہے اور واقعی یہ مذاق ایسا ہے کہ انسان کو اس مذاق کے حاصل رہنے پر
بالیدگی ہو سکتی ہے اس شعر میں شاعر نے صرف گھوڑے کی تعریف نہیں
کی ہے بلکہ اپنے ایک بڑے ہنر سے بھی خبر دی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ
ایک شعر میں راکب و مرکب دونوں کی عمدگی کو ظاہر کیا ہے کس واسطے کہ
ایسا گھوڑا جو وحوش پیش رو کو دوڑ میں مغلوب کر دے اگر قابل تعریف
ہے تو اس کا سوار بھی جو ایسے صید ہائے تیز رفتار کو شکار کر سکے قابل تحسین
و آفرین ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب وحوش صحرائی کو گھوڑے کے ذریعہ

سے شکار کرنے کا مذاق رکھتے ہیں اور کیوں نہ یہ مذاق رکھیں جب ان کا
ملک عمدہ گھوڑے پیدا کرتا ہے اور خود وہ لوگ مردانہ انداز رکھتے ہیں
ہندوستان میں بیشتر گھوڑے کے ذریعے سے شائقین صید سُوّر کا شکار
کھیلتے ہیں۔ یہ شکار بھی خالی از خطر نہیں ہے مگر راقم اپنے ذاتی تجربہ سے کہہ
سکتا ہے کہ یہ شکار نہایت دلچسپی رکھتا ہے اہل فرنگ نے تو اس
شکار کو کمال کو پہنچا دیا ہے اور اس شکار پر کیا موقوف ہے انھوں نے تو ہر قسم
کی صید افگنی کو قواعد علمی کے ساتھ اس طور پر برتا ہے کہ اس زمانہ میں شکار
افگنی نے ایسی علمی کے ساتھ اس طور پر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شکار افگنی
نے ایسی علمی صورت پیدا کی ہے کہ بغیر مرد محصل ہوئے کوئی آدمی شکاری ہو
نہیں سکتا مگر ہندیوں میں بھی کچھ حضرات ایسے ہیں کہ جو اس کو قاعدے کے ساتھ
برتتے ہیں اور مذاق شکار افگنی سے بےخبر نہیں ہیں سوا سُوّر کے شکار کے اور
کسی جانور کا شکار اس ملک میں نہیں ہے جو گھوڑے کی پیٹھ سے کھیلا جائے
کبھی کبھی نیل گاؤ کا شکار گھوڑے کے ذریعے سے کیا جاتا ہے مگر یہ شاذ کا حکم
رکھتا ہے۔

فَعَنَّ لَنَا سِرْبٌ كَأَنَّ نِعَاجَهُ عَذَارَى دَوَارٍ فِي مُلَاءٍ مُذَيَّلِ

معنی :۔ پس آگے آیا ہم لوگوں کے (ہم شکاریوں کے) ایک گروہ گاوان
دشتی کا گویا کہ مادہ ان کی مانند ان زنان دوشیزہ کے ہیں جو چادر درازدامن پہنے ہوئے
طواف دُوار کرتے ہیں (دُوار ایک بُت کا نام ہے جس کی پرستش اہل عرب ایام
جاہلیت میں کرتے تھے)

شاعر اب شکار کی کیفیت کو بیان کرتا ہے کہ صید گاہ میں کیا شکار سامنے
آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گاوان دشتی ملک عرب میں آہو کی طرح کثیر الوجود ہیں
اور تیز رفتاری ان کی ایسی ہے کہ ان کو گھوڑے کے ذریعے سے شکار کرنے پر
شکاری فخر کر سکتا ہے۔ یہاں وجہ تشبیہ۔ مادہ گاوان اور زنان دوشیزہ میں اس
کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ یہ سوا پاکیزگی نفاست اور خوش نمائی میں مشارکت
رکھتی ہیں۔ واضح ہو کہ ملک عرب صید افگنی کی جہت سے حسب مراد ملک
نہیں ہے یہاں کے جانوران صید صرف دو چار اقسام کے ہیں وحوش ماکول
اللحم جو اغراض صید سے متعلق ہیں۔ ہی گاوان دشتی بُزکوہی اور دو تین اقسام
کے آہو ہیں سباعی جانور بھی تھوڑے ہیں پلنگ و کفتار گرگ سے قوی تر
شکاری جانور اس ملک میں نہیں ہوتے دنیا میں افریقہ سے بڑھ کر کوئی شکار
کی جگہ نہیں ہے اس سے اگر کوئی مرجّح جگہ ہے تو ہندوستان ہے جاننا چاہئے
کہ ہر چند افریقہ میں وحوش ماکول اللحم وغیر ماکول اللحم کی وہ کثرت ہے کہ روئے
زمین پر کہیں نہیں ہے تاہم لطف صید افگنی جو ہندوستان میں اٹھتا ہے
افریقہ کے کسی حصے میں نہیں اٹھتا۔ بہر حال ملک عرب شکار کے اعتبار سے
نہ افریقہ نہ ہندوستان کے برابر ہے تاہم مذاق شکار سے اہل عرب خالی نہیں
ہیں بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر ملک کے طبیعت دار با مذاق شجاعت شعار
مردانہ مزاج اشخاص کم و بیش ضرور اس کا مذاق رکھتے ہیں اہل فرنگ تو اس
زمانے میں مذاق شکار بالیسار رکھتے ہیں کہ ہم ہندوستانیوں کے احاطۂ فہم سے ان
کے شکار دوست ہونے کا مضمون باہر ہے سر سیموئیل بیکر سبنڈرسن بالڈون

کیمبل کنلاک نائیف کوکسن اسٹرنڈیل کیومنگ وغیرہ ہم ایسے شکاری گزرے ہیں
کہ جن سے ہر با مذاق شکاری واقف ہے ان ناموروں کے مذاق پر غور کرنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول کہ شکار کار بیکاراں ست واقعی ایک محض جاہلانہ
قول ہے ان شکاریوں کی محنتوں نے بڑے بڑے مسائل علمیہ کی تحقیق کی ہے
علم جغرافیہ علم طبعیات علم حیوانات علم نباتات علم معدنیات علم معاشرت
علم اخلاق علم تمدن وغیرہ کو ان کی جان فشانیوں سے بڑے بڑے نفعے پہنچتے
گئے ہیں۔ جو شخص حقیقت صید افگنی سے بے خبر ہے وہ کیا جان سکتا ہے کہ اغراض
صید افگنی کیا ہیں نا واقف تو یہی سمجھے گا کہ شکار افگنی کا مطلب یہ ہے کہ ہانڈی گرم
ہو۔ اگر صید افگنی یہی ہے تو چڑی ماری اور صید افگنی میں کیا فرق ہے اور پھر مسٹر سیمول
بیکر اور معمولی بہیلیے میں کیا امتیاز باقی رہتا ہے شکار سے ہانڈی کا گرم ہونا تو
معمولی بات ہے ماکول اللحم کے شکار سے ہانڈی تو گرم ہوتی ہے مگر مقاصد
شکار کھانے پینے تک محدود نہیں ہیں جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صید افگنی
کو انسان کے معاملات جسمانی اور روحانی سے کیا تعلق ہے۔ اور خود شاعری
کو صید افگنی سے کیا مناسبت ہے امرؤ القیس کا مضمون شکار افگنی کو داخل
قصیدہ کرنا اس کی فطرتی خوش مذاقی سے خبر دیتا ہے واقعی یہ مضمون ایسا ہی
بلند پایہ ہے کہ اعلیٰ درجے کی شاعریوں میں اس کو جگہ دی جائے چنانچہ بڑے بڑے
شعرائے عالم نے اپنی تصنیفوں کو مضمون صید افگنی سے زینت دی ہے
مضمون صید افگنی کچھ ایسا ہی قابل لحاظ ہے کہ اس کو اتنے بڑے بڑے شعراء
جیسے کہ ہومیر ڈکنس ورجل فردوسی سعدی بالمکی وغیرہم نے توجہ کے

ساتھ داخل کلام فرماتے گئے ہیں یہ تو قدیم ایام میں یہ مضمون قابل امتیاز سمجھا گیا ہے۔ اس انیسویں صدی میں تو بامذاق اہل فرنگ نے اسے کچھ ایسا توجہ طلب سمجھا ہے کہ اسے ایک بڑے بکار آمد فن کا درجہ بخشتا ہے چنانچہ اس وقت مجرد زبان انگریزی میں فن صیدافگنی میں اس قدر کتابیں تصنیف ہوئی ہیں کہ اگر ایک جا مجتمع کی جائیں تو ان سے ایک اچھا کتب خانہ درست ہو سکتا ہے۔

فَاَدْبَرْنَ کَالْجِزْعِ الْمُفَصَّلِ بَیْنَهُ　　بِجِیْدٍ مُعَمٍّ فِی الْعَشِیْرَةِ مُخْوِلِ

معنی:- پس ان گاوان دشتی نے پیٹھ پھیری درحالیکہ وہ گاوان دشتی ایسے جمیل بلبیہ ہائے یمنی کے ساتھ مشابہت رکھتی ہیں کہ جن کے درمیانیہ کے اندر دیگر جواہرات داخل کئے گئے ہوں اور وہی جمیل ایسے لڑکے کی گردن میں پڑا ہوا ہے کہ خاندان میں بہت عم و خال رکھتا ہو۔ یعنی جب گاوان دشتی نے شکاریوں کو دیکھا تو پیٹھ پھیری اور متفرق ہو کر نکل بھاگیں اور چونکہ ان گاوان دشتی کے چاروں پاؤں اور منہ سیاہ ہوتے ہیں شاعر نے ان کو بلبیہ یمنی سے تشبیہ دی اور جب متفرق ہو گئیں تو ان کو ایسا جمیل مُفَصَّل کہا جو ایسے لڑکے کے گلے میں پڑا رہتا ہے جسکے قبیلہ میں بہت عم و خال ہوتے ہیں وہ جمیل گراں بہا ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ یہ گاوان دشتی ہندوستان کے نیل گاؤ سے علٰحدہ جانور ہیں جو پروردہ گاؤ ہیں ہندوستان کے بعض جنگلوں میں بھی یہ جانور دیکھے جاتے ہیں اور جہاں پائے جاتے ہیں کثرت سے پائے جاتے ہیں وسط ہندوستان کے پہاڑوں میں ایک جانور ہوتا ہے جسے گوڑ کہتے اور اس کا انگریزی نام بائیسن ہے یہ جانور پروردہ گاؤ سے جسامت میں بہت بڑا ہوتا ہے اور ہرچند پروردہ گاؤ سے مشابہت رکھتا ہے مگر

درحقیقت پروردہ گاؤ سے ایک علحدہ جانور ہے گوز کا شکار خوب ہوتا ہے مگر سوائے قوی رغل کے اس کا شکار ناممکن ہے گھوڑے اور نیزے یا تلوار سے کسی شکاری نے آج تک شکار نہیں کیا ہے۔

فَأَلْحَقَنَا بِالْهَادِيَاتِ وَدُونَهُ ‌ ‌ ‌ جَوَاحِرُهَا فِي صَرَّةٍ لَمْ تَزَيَّلِ

معنی: پس لاحق کر دیا اسپ مذکور نے ہم لوگوں کو جانوران پیش رو کے ساتھ اور اس اسپ کے نزدیک تھے پس ماندگان گروہ درحالیکہ وہ گروہ متفرق نہ ہوا تھا۔ یعنی اسپ مذکور نے بسبب تیز رفتاری کے فوراً پیش روان گروہ کو جا لیا اور جو پس ماندہ تھے اور ابھی تک منتشر نہ ہوئے تھے وہ کس شمار میں تھے ان کا شکار کر لینا تو کچھ دشوار نہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ امرء القیس کو پوری دانست فن صید افگنی میں تھی اور صرف دانست نہ تھی بلکہ مذاق شکار افگنی بھی اچھا رکھتا تھا اگر خوش مذاق نہ ہوتا تو اس خوب صورتی کے ساتھ شکار کے مضامین کو حوالۂ قلم نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے بیان کی امید ایک لاعلم اور بد مذاق شاعر سے نہیں کی جا سکتی ہے ان اشعار میں بڑا لطف شاعری موجود ہے اس لئے کہ تمام کلام شاعر بد قرینہ مبالغہ پردازی اور غیر فطری طریقۂ بیان سے معرا ہے اس حسن بیان کی توقع فارسی یا اردو کے شاعر سے تو ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ کس واسطے کہ ان زبانوں کے شعرا جب صید افگنی کے مضامین باندھیں گے۔ تو ان کو بہرام و اسد و حمل و نسر و دیگر بے سر و پا اور خیالی امور کے ذکر کئے بغیر چارہ نہیں معلوم ہوتا ہے چنانچہ شکار کی مثنویاں جو مدح آصف الدولہ وغیرہ میں میر و مرزا نے بھی لکھی ہیں غایت بے سر و پائی سے خبر دیتی ہیں مگر ان

حضرات کی طرف سے یہ معذرت کی جاسکتی ہے کہ ایسی مثنویاں شاعری کی غرض سے نہیں لکھی گئی تھیں ان سے والیان ملک کو خوش کرنا منظور تھا ان اشعار امرء القیس کو جب اہل واقفیت نظر انصاف سے ملاحظ فرمائیں گے تو ان پر ہویدا ہوگا کہ شاعر کس قدر صید افگنی کا صحیح مذاق رکھتا تھا حق یہ ہے کہ اس کا مذاق اس صدی کے مذاق کے قریب قریب پہنچتا ہے اور واقعی بہت تعجب گزرتا ہے جب اس امر کا خیال ہوتا ہے کہ ایسی خوش مذاقی چودہ سو برس پہلے ایک ایسی قوم میں تھی کہ جس کی تعلیم یافتگی کا درجہ بہت بلند نہ تھا اور جس قوم کی شائستگی کو اس زمانے کی شائستگی سے کوئی نسبت حاصل نہ تھی۔

فَعَادَى عِدَاءً بَيْنَ ثَوْرٍ وَنَعْجَةٍ ۔۔۔ دِرَاكاً وَلَمْ يُنْضَحْ بِمَاءٍ فَيُغْسَلِ

معنی:۔ پس اسپ مذکور نے ایک دوڑ میں دو صید کو ایک نر اور ایک مادہ گاؤ کو) پیاپے شکار کر لیا اور اس تیزی پر بھی وہ اس کا خوگر نہ ہوا کہ اس کا بدن پانی سے دھویا جائے۔

ظاہر ہے کہ دو گاو دشتی یعنی ایک نر اور ایک مادہ کو پیاپے وہی گھوڑا شکار کر سکے گا کہ جو نہایت تیز رفتار ہوگا۔ پھر شاعر اس کی جفاکشی کی تعریف کرتا ہے کہ ایسی دوڑ کے بعد بھی اسے اس کی حاجت نہیں ہوتی۔ کہ دھویا جائے اور استراحت کرے۔ واضح ہو کہ اس شعر سے بھی ہر پہلو کی خوش مذاقی عیاں ہے شاعر نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ اپنی شہسواری اور صید افگنی اور گھوڑے کی تیز رفتاری اور جفاکشی کے مضامین کو حوالہ قلم کیا ہے اس صدی میں بھی کہ فن صید افگنی درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہے اگر نامی سے نامی شکاری گھوڑے سے شکار گوزن یا شتر کا کرے گا

تو ممکن نہیں ہے کہ اس سے زیادہ صید افگنی کا لطف دکھلا سکے۔

فَظَلَّ طُهَاةُ اللَّحْمِ مِنْ بَيْنِ مُنْضِجٍ صَفِيفَ شِوَاءٍ أَوْ قَدِيرٍ مُعَجَّلِ

معنی:۔ پس گوشت پکانے والے دو قسم کے ہوگئے ایک وہ جنھوں نے سیخ میں گوشت کو کباب کیا اور دوسرے وہ جنھوں نے گوشت کو دیگ میں ڈال کر دیگدان پر پختہ کیا یعنی جب بطرز بالا جانور شکار ہوتے گئے تو کچھ گوشت کا کباب اور کچھ گوشت ہانڈی میں پکا۔

واضح ہو کہ شاعر نے اس شعر کو اس غرض سے کہا ہے کہ جو جانور شکار ہوتے تھے، وہ ماکول اللحم تھے اگر شیر پلنگ خرس وغیرہ کی طرح غیر ماکول اللحم ہوتے تو ظاہر ہے کہ ان کے گوشت مصرف میں نہیں لائے جاتے اکثر ایسے شکاری جانوروں کی کھالیں یا ناخن، وغیرہ بنظر یادگار لے لیتے ہیں کھالوں کا مصرف زیادہ یہی ہوتا ہے کہ کمروں میں بچھاتے ہیں۔ اور ناخنوں سے زیور بناتے ہیں لیکن ایسے سباعی جانور ملک عرب میں کمتر ہیں شیر و خرس تو نادر دہیں صرف چھوٹے قسم کا پلنگ صحراؤں میں پایا جاتا ہے اگر کاش شیر و ببر و خرس یا ہاتھی گینڈا ارنا گور وہاں ملک ہندوستان کی طرح ہوتے تو امرؤ القیس ضمن صید افگنی میں ان جانوروں کا ذکر کسی نہ کسی پہلو سے کرتا بہر حال اس نے ایک ایسے جانور کے شکار کا بیان اختیار کیا ہے جو عظیم پیکر تیز رفتار پاکیزہ انداز ملک عرب کے تمام جانوران صحرائی میں ہوتا ہے اس تجویز سے بھی اس کی خوش مذاقی عیاں ہے جاننا چاہئے کہ گوشت صید کے پکائے جانے کا بیان بھی خالی از سبب نہیں ہے جو حضرات شکار دوست نہیں ہیں وہ پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ شکار کے گوشت میں کیا لذت

ہوتی ہے وہ حضرات اس کے لطف کو کیا جانیں جو گھر میں بیٹھے ہوئے طرح طرح کے گوشت پکوا کر نوش فرمایا کرتے ہیں ایسے حضرات کو شکاری کی بھوک کہاں نصیب ہوتی ہے جو شکاری کی لذت یابی کا اندازہ کر سکیں۔

وَرُحْنَا يَكَادُ الطَّرْفُ يَقْصُرُ دُوْنَهُ مَتَىٰ مَا تَرَقَّ الْعَيْنُ فِيْهِ تَسَهَّلِ

:- اور ہم لوگ شکار سے شب ہی کو واپس آئے در حالیکہ قریب تھیں آنکھیں کہ اسپ مذکور کے روبرو اس کے حسن کے دقائق کو معائنے سے عاجز آئیں اور آنکھیں جب اس کے تن بالا کی طرف دیکھتی تھیں تو اس کی غایت صفا کے باعث اس کے تن زیرین کی طرف پھسل جاتی تھیں۔

شاعر یہاں دکھلاتا ہے کہ اسپ مذکور تیز رفتاری کے ساتھ شکار کرتا رہا اس پر بھی اس کا دم خم اس قدر بسیار رہا کہ شکار گاہ سے رات ہی کو سوار کے زیر ران رہ کر گھر واپس آسکا دوسرا گھوڑا بعد صید افگنی کے تھک جاتا اور اس قابل نہیں رہتا کہ شب کو اسی مستعدی کے ساتھ شکار گاہ سے منزل مار کر گھر کو واپس آسکتا پس ایسے گھوڑے کے دقائق حسن پر نگاہ کرنے سے آنکھیں اگر اظہار عجز کریں تو بہت بجا ہے یعنی اس کی بسیاری حسن احاطۂ نظر میں نہیں آسکتی اس واسطے آنکھ خیرگی کرنے لگتی ہے سہ

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

مصرع ثانی میں اسپ مذکور کی صفائی و تابانی بدن کا بیان ہے کہ اس کی غایت صفا و تابانی سے نظر اس کے بدن سے پھسل جاتی ہے یعنی اس کے بدن پر نظر نہیں ٹھہرتی ہے یہ تعریف ایسے درجۂ مبالغہ کو نہیں پہنچی ہے کہ بے لطف

معلوم ہو۔ اس تعریف میں فطرتی پہلو نہیں بجا تا رہا ہے بلکہ یہ تعریف ایسی ہے کہ واقعی خارج میں ایک صاف اور تاباں جسم کے گھوڑے پر صادق آتی ہے۔

فَبَاتَ عَلَيْهِ سَرْجُهُ وَلِجَامُهُ   وَبَاتَ بِعَيْنِي قَائِمًا غَيْرَ مُرْسَلِ

معنی:۔ پس رات گذاری اسپ مذکورہ پر اس کے زین و لگام نے اور رات گذاری اس اسپ نے میری آنکھوں کے سامنے درحالیکہ استادہ اور بغیر چراگاہ کئے ہوئے۔ یعنی جب اسپ مذکورہ شکار سے واپس آیا تو جیسا کہ کسا کسایا تھا اسی طرح شب بھر رہا اور میرے رو بہ رو استادہ رہ کر شب بسر کی اور چراگاہ کی طرف بھی نہیں بھیجا گیا کہ چری کرے۔

اس قصیدہ کی شرح کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد شاعر یہ ہے کہ اسپ مذکور ہر شب میرے رو بہ رو استادہ رہتا ہے پس ایسی صورت میں زین و لگام بھی دیا رہتا ہوگا شاید اس طرح سے کسا کسایا اس واسطے رکھا جاتا ہوگا کہ ہمیشہ غنیم کا خوف لاحق رہتا ہوگا مگر راقم کو سلسلۂ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت شکار سے واپس آنے کی شاعر نے حوالۂ قلم کی ہے بہر حال ہر پہلو سے اس کی جفاکشی کی تعریف ظاہر ہوتی ہے۔ واضح ہو کہ شاعر نے اٹھارہ[۱۸] اشعار بالا میں گھوڑے کے اوصاف بیان کئے ہیں اور بیان اوصاف میں صید افگنی کے مضامین کو بھی رقم کیا ہے اس کے بعد اشعار ذیل میں سلسلۂ اوصاف اسپ کو قطع کر کے برق و باراں کا ذکر کرتا ہے قبل اس کے کہ اس بیان تازہ کی طرف حضرات ناظرین کی توجہ کی خواستگاری کی جائے راقم ذیل میں کچھ خیالات خاص گھوڑے اور صید افگنی کے مادّے میں عرض کیا چاہتا ہے۔ واضح ہو کہ اس

قصیدے میں امرؤ القیس نے جو مضامین باندھے ہیں ایسے ہیں کہ ہر ملک کی شاعری میں ان کو پایہ امتیاز حاصل ہے صحبت ہائے گذشتہ کی حسرت ہمدمون کی تشفی دہی مفارقت کے صدمے معشوقوں کی محبت معاملات عشقیہ کی کیفیتیں تسبر چشمی دلبری مردمی فیاضی فروتنی کی خوبیاں اور اسی قبیل کی اور بھی باتیں جو اس قصیدے میں جگہ پاتی گئی ہیں ہر ملک کی اعلیٰ درجے کی شاعری میں دخل رکھتی ہیں انہیں اقسام مضامین سے گھوڑے کی شناخت گھوڑے کی قدردانی اور گھوڑے کی سواری بھی اور اسی پر مضمون صید افگنی کو بھی قیاس کرنا چاہئیے اگر شہسواری اور صید افگنی کے مضامین بلند پائے گی نہ رکھتے تو ہر ملک کے شعرا ایک زبان ہو کر اس کی خوبیوں سے اعتراف نہ رکھتے ۔ اور امرؤ القیس اتنے اشعار ایک قصیدے میں صرف گھوڑے اور شکار کے بیان میں نہ لکھتا لیکن چونکہ گھوڑے اور شکار کے مضامین ایک خاص پایۂ بلند رکھتے ہیں ان اشعار نے نہ صرف امرؤ القیس کے قصیدے کے حسن کو افزوں کر دیا ہے بلکہ اس کی خوبی طبیعت اور خوبی مذاق کو بیّن طور پر ظاہر کر دکھایا ہے ۔ مختلف ملکوں کے شعرا اور مصنفین کے کلاموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے اور شکار کا شوق بڑی عالی مذاقی سے خبر دیتا ہے اگر ایسی بات نہ ہوتی تو طبیعت داران یورپ کیوں گھوڑے اور شکار کا شوق رکھتے اور ہم ہندی مسلمانوں کے ولایتی آباد اجداد اہل یورپ کو ایسی ایسی عالی مذاقیوں کی کیونکر راہ بتلاتے یہ بات بدیہی ہے کہ کوئی قوم بر سرِ اقبال ہوتی ہے تو اسے گھوڑے کا شوق ہوتا ہے وہ خوب گھوڑے پہچانتی ہے خوب گھوڑے چڑھتی ہے خوب چوگان

کھیلتی ہے خوب نیزے لگاتی ہے اور اس طرح گھوڑے کی پیٹھ سے سپہ گری کے سبب کام لیتی ہے اس طرح خوب شکار کھیلتی ہے اور صید افگنی کے مذاق صحیح سے خبر رکھتی ہے بخلاف اس کے جب کوئی قوم مبتلائے ادبار ہوتی ہے تو افیون کھاتی ہے چانڈو پیتی ہے بٹیر لڑاتی ہے اور اسی طرح جلنے اور نامردی کے کام ہیں کرتی ہے بہرحال گھوڑا اور شکار یہ دو ایسے مضمون ہیں کہ نہایت توجہ طلب ہیں ۔ اور ان کے بیان میں جس قدر تحریر کو طول دیا جاتے بعید از لطف نہیں ہے مگر افسوس کہ راقم کو اس کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ ان دونوں مضمون کو حوالۂ قلم کرنے کا موقع نہیں ہے اس لئے ذیل میں اختصار پر قناعت کرتا ہے واضح ہو کہ خدا نے تعالیٰ نے گھوڑے کو تمام جانوروں سے اشرف بنایا ہے دنیا میں آدمی کے بعد اس جانور کا درجہ ہے اس کی خوبیوں کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی ہے جس قدر اس کی تعریف کی جائے بجا درست ہے چونکہ انسان کے بعد روئے زمین پر اسی جانور کو شرافت حاصل ہے اس لئے یہ جانور انسان کے معاملات نیک و بد کا ہمیشہ شریک رہا ہے اس کی قدامت سرکار بنی آدم میں ہر طرح ثابت ہے اس کے سوا کوئی دوسرا جانور نہیں ہے جس سے اغراض انسانی کو اس قدر تعلق رہا ہو ہر چند کتا بہت بکار آمد جانور ہے اور اس میں ہزاروں خوبیاں ہیں مگر گھوڑے کی خوبیوں کو نہیں پہنچتا کتا پھر کتا ہے ۔ کتا کسی زمانے میں انسان کے امور ملکی مالی یا مذہبی سے بسبیل ضرورت متعلق نہیں رہا ہے جتنی بڑی بڑی لشکر کشیاں چہ از بہر دینا وچہ از بہر دین ظہور میں آتی گئی ہیں ان میں کتے کا کسی طرح کا دخل نہیں رہا ہے برخلاف اس کے گھوڑے کے

معاملے کو سمجھنا چاہیئے کہ امور دنیا و دین میں اس کی شرکت ہمیشہ رہا کی ہے اور
تابقائے دنیا قائم رہے گی انسان کی رغبت گھوڑے کی طرف ایک امر طبعی
ہے عدم رغبت نقص انسانیت سے خبر دیتی ہے اسی شخص کو اس جانور
سے عدم میلان ہوگا کہ جس کے قوائے اخلاقیہ خراب ہوگئے ہوں گے۔
خاص کر قوت شجاعت میں ضعف لاحق ہوگیا ہوگا۔ ورنہ خوش اخلاق قوم یا خوش اخلاق
افراد انسانی کو اس کی رغبت سے چارہ نہیں ہے جتنی اولوالعزم قومیں دنیا میں گزری
ہیں یا آج بھی موجود ہیں گھوڑے کی قدردانی سے خالی نہیں دیکھی جاتی ہیں لاریب
گھوڑے کی طرف میلان کا ہونا دلیل شجاعت ہے اور شجاعت، بہت سی خوبیوں
کی جڑ ہے بے شجاعت انسان انسان نہیں ہو سکتا۔ اس صفت کے نقصان
سے انسان مکار پُر فریب دغاباز اور بے حیا ہوتا ہے پس جب اس قدر صفات
ذمیمہ کا مجمع کوئی شخص ہوگا تو پھر اس کے درجۂ انسانیت سے گزر جانے میں کیا گفتگو
ہو سکتی ہے بالمختصر گھوڑے سے رغبت عمدگی طبیعت سے خبر دیتی ہے اور واقعی
گھوڑا ایسا مخلوق خداوندی ہے کہ کوئی ایسا کم بخت ہوگا جو اس کا شیدا نہ ہوگا۔
حقیقت یہ ہے کہ جتنے بڑے لوگ گزرے ہیں اس کے چاہنے والے تھے اور
اور جو اس وقت ہیں اس کے چاہنے والے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی بزرگی اس
کی قدردانی کی مقتضی ہے اور اس کی خوبیاں کچھ ایسے درجے کی ہیں کہ خدا و نبیؐ و وصیؑ
نے بھی ان پر اپنی چشم توجہ ڈالی ہے بقول سعادت یار خاں رنگین غفر اللہ ذنوبہٗ
نوپٹھ والعادیات آنکھیں نہ کہ بند خدا نے کھائی ہے گھوڑے کی سوگند
بہت چاہا ہے اس کو مصطفیٰؐ نے بہت مانا ہے اس کو مرتضیٰؑ نے

یوں تو دنیا کی تمام ممتاز قومیں گھوڑے کی قدردان ہیں اور کوئی ایسی سلطنت نہیں ہے جہاں گھوڑا عزیز نہیں سمجھا جاتا ہے مگر گھوڑے کی قدر و منزلت جس قدر اہل عرب کرتے ہیں روے زمین پر کوئی قوم نہیں کرتی اہل عرب گھوڑے کو زن و فرزند کی مثل عزیز رکھتے ہیں اور زن و فرزند کی طرح ان کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اہل عرب جس خیمے میں خود رہتے ہیں اس میں ان کے لڑکے بالے اور گھوڑے بھی رہتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے گھوڑوں کے گرد و پیش بے خوف سوتے ہیں اور کبھی کسی طرح کا صدمہ نہیں اٹھاتے ان کے گھوڑوں کی شائستگی انسان کی شائستگی سے کبھی کم نہیں ہوتی بلکہ عوام بنی آدم سے ان کی شائستگی زیادہ بھروسا کرنے کے قابل ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ عرب کے گھوڑے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جو کچھ ان کی قدر و منزلت کی جائے بجا ہے اور شک نہیں کہ دنیا میں اہل عرب سے گھوڑے کو زیادہ چاہنے والی قوم بھی کوئی نہیں ہے راقم مثالاً ایک قصہ عرض کرتا ہے جو تاریخی پایۂ اعتبار رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک فرانسیسی جنرل نے ساحل عرب سے اپنے آقا شہنشاہ فرانس کو خبر دی کہ ایک نہایت مفلوک الحال عرب ہے جس کے پاس ایک عمدہ عربی گھوڑی ہے عجب نہیں کہ غایت افلاس کے باعث اس کا مالک اسے فروخت کرے شہنشاہ نے حکم بھیجا کہ جس قیمت کو وہ گھوڑی ہاتھ آئے خرید کرو چونکہ وہ عرب گھوڑی کے بیچنے پر راضی ہو چکا تھا جنرل نے اسے خبر دی کہ قیمت موجود ہے آؤ اور معاہدے کی تعمیل کرو اس خبر کو پاکر وہ عرب اسی گھوڑی پر سوار جنرل کے روبرو آیا جنرل نے قیمت کی اشرفیوں کے توڑے قبل سے اس کے لالچ کے بڑھانے کی نظر سے کھلوا رکھے تھے اس نے پہلے ایک نظران

اشرفیوں کو دیکھا اور پھر اپنے افلاس پر بھی خیال دوڑایا مگر اس کے ساتھ ہی اپنی
گھوڑی کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ میں ہر چند افلاس زدہ ہوں مگر کیا تجھ سے
مفارقت گوارا کر سکوں گا تو میرے گھر کی زینت ہے تجھے زنہار کسی اہل فرنگ کو نہ دے
ڈالوں گا یہ لوگ تجھے کانٹے لگائیں گے۔ اور چابک ماریں گے میں ہرگز تیرے حق
میں ایسی بے رحمی کا سبب نہ ہونگا یہ کہ کر وہ فوراً آنکھوں سے غائب ہو گیا اور
جنرل صاحب کی اشرفیوں کا ڈھیر وہاں پڑا کا پڑا رہ گیا کیوں نہ ہو اسے گھوڑے
کی قدر دانی کہتے ہیں اس کو ہمارے ملک کے ان شائقوں کی ترکیبوں سے مقابلہ
کیجئے جو سو دو سو روپے کے نفع کو ملحوظ رکھکر رخش رستم بھی ہو تو فروخت کر ڈالیں
امر واقعی یہ ہے کہ ہم ہندی وطن مسلمان کیا جانیں کہ گھوڑے کی خوبیاں اور محبوبیاں
کیا ہیں نہ اس ملک میں ملک عرب کے ایسے گھوڑے ہیں اور نہ ہم لوگوں کو اہل
عرب کا سا مذاق میسر ہے انصاف یہی ہے کہ امرؤ القیس کی ثنا خوانیاں جو گھوڑے
کے مادے میں مندرج قصیدہ ہیں کچھ ایسی ہیں کہ ہم ہندیوں کو ان خیالات کے
ساتھ مانوس ہونا دشوار ہے اور دشواری کا سبب یہی ہے کہ اس ملک میں وہ
اسباب موجود نہیں ہیں جو ان خیالات کے ساتھ ہمارے دماغ کو مانوس کر سکیں
خیر یہ امر بدیہی ہے کہ ہندوستان میں نہ ہم لوگ امرؤ القیس کے گھوڑے کے
ایسا گھوڑا پا سکتے ہیں اور نہ امرؤ القیس کی طرح شہسواری کا لطف دکھلا سکتے
ہیں اس پر بھی اگر ہم لوگ کسی قدر کاہل الوجودی کو ترک کریں تو کچھ نہ کچھ سواری
زین سے لطف اٹھا سکتے ہیں ہندوستان میں سؤر کا شکار بھی ایسا ہوتا ہے کہ
شاید و باید فقیر کو ذاتی تجربہ اس کا کافی طور پر حاصل ہے اور فی الواقع یہ شکار

نہایت قابل توجہ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم ہندیوں میں ہزار ممتاز اشخاص سے
ایک صاحب ایسے نہیں نکلیں گے جو عمر بھر میں ایک بار بھی بے قصد شکار
سوار زین ہوئے ہوں گے بخبر شوٹر کا شکار ایک دشوار امر ہے اب تو شام و صبح
کی سواری اسپ بھی معدوم صورت ہوتی جاتی ہے اس وقت کا مذاق تو یہی
معلوم ہوتا ہے کہ بروگش اور لینڈو میں سوار ہو کہ نہایت آرام سے خرّاٹے
لیں اور کاہل وجودی کی داد دیں اس مذاق کو امرء القیس کے مذاق سے ملائیں۔ تو
سمجھ میں آئے کہ ہمارے ملک کے شائقین کا مذاق کس قسم کا ہے حقیقت یہ ہے
کہ جو شخص سواری زین سے متمتع نہ ہوا اس نے کوئی لطف گھوڑے کا نہ اٹھایا۔ گھوڑا
جو ٹم ٹم فٹن بروگش وغیرہ میں کام دیتا ہے پھر وہ گھوڑا نہیں رہتا ہے اگر کسی
کو گھوڑے کا سچا شوق ہے تو لازم ہے کہ اہل عرب کا مذاق پیدا کرے اہل
انگلستان جو اس زمانے میں ہمارے حاکم ہیں اچھا مذاق رکھتے ہیں ہر چند گھوڑے کو
گاڑیوں میں جوتتے ہیں مگر اس سے زین کا کام بھی نہایت مذاق کے ساتھ لیتے ہیں
فوجی کارروائیوں کے علاوہ نیزہ لگاتے ہیں شکار کرتے ہیں پولو کھیلتے ہیں دوڑ میں
شرطیں لگاتے ہیں ٹٹی تڑپاتے ہیں اور ان خاص کاموں کے سوا صبح و شام ہوا خوری
کرتے ہیں ہمارے ہم وطن جن کو خدا نے مقدرت دی ہے باوجود حاصل رہنے
شباب کے بھی ان کاموں سے کوئی کام نہیں کرتے ہیں بھولے چوکے اگر طبیعت بہت
گھبرائی تو بیلوں کی تنگی کی طرح لدے ہوئے میل دو میل سے کسی قسم کی گاڑی پر گھوم
آتے اگر اسی کا نام گھوڑے کا شوق ہے تو ہو مگر ایسے شوق کا ماحصل سوا
خود نمائی کے اور کچھ نہیں ہے ایسے شوق سے نفع جسمانی یا روحانی کا مرتب ہونا

بعید از قیاس ہے حالانکہ سواری اسپ ایک ایسی شے ہے کہ جس سے جسمانی اور
روحانی فائدوں کا حاصل ہونا عندالتجربہ ثابت ہے دنیا میں کوئی ایسی ریاضت
نہیں ہے جو سواری اسپ کی برابری کر سکے ریاضتوں سے قابل لحاظ ریاضت
مشی ہے اسی طرح ڈنٹر، مگدر بھی ہیں مگر ان کے منافع سواری اسپ کے منافع
کے برابر زنہار نہیں ہیں مشی سے خاص فائدہ اعضائے اسفل کو ہوتا ہے اور کوئی
شک نہیں کہ مشی معدے کو بھی بہت مفید ہے مگر سواری اسپ سے نہ صرف
اعضائے اسفل اور معدے کو فائدہ ہوتا ہے بلکہ تمام اجزائے بدن شریک
ریاضت رہتے ہیں اس کے علاوہ معدے کو جو سواری اسپ سے فائدہ ہوتا
ہے وہ فائدہ مشی سے نہیں ہوتا یہ تو جسمانی ریاضت اور اس کے منافع کا پہلو ہے
اب دیکھئے کہ سواری اسپ سے روحانی فوائد کیا ہوتے ہیں دنیا میں کوئی
ریاضت ایسی نہیں ہے کہ سواری اسپ کے برابر انشراح روحی پیدا کر سکے
پشت زین پر صافہ ممیز ہوتا ہے کہ روح ترقی کرتی ہے دماغی قوت افزوں
ہوتی ہے ذہن جودت پیدا کرتا ہے مردانگی بڑھتی ہے ہمت عالی ہوتی ہے
یہ باتیں مشی یا ڈنٹر مگدر میں کہاں ہیں حقیقت یہ ہے کہ سلطان کو تخت پر بھی
وہ لطف حاصل نہیں ہوتا ہے جو سوار کو پشت اسپ پر ہوتا ہے لاریب کوئی
علیش سواری اسپ سے بہتر نہیں ہے بلکہ حق یہ ہے کہ تمام علیش جسمانی و روحانی کی ترقی
کا وسیلہ زین سواری ہے اور کیوں نہ ہو جب نظام جسم و قوائے فاعلیہ و انفعالیہ
اور اخلاقیہ پر ایک اثر خاص سواری اسپ پیدا کرتی ہے راقم نے مشی سے
زین سواری کو انفع ہونے کی وجہ عندالتجربہ یہ بھی پائی ہے کہ ریاضت سواری اسپ

جب تک انسان کرتا ہے اسے مشی کے اعتبار سے صاف تر ہوائے مستنشق نصیب ہوا کرتی ہے علاوہ اس کے اُس کے بدن میں گھوڑے کے بدن سے مادّہ برقی منتقل ہوا کرتا ہے جو اس کی حرارت غریزی کو بڑھاتا ہے اور یہ انتقال مادّہ اس کے بیرونی اور درونی دونوں ترکیبوں کو نفع عظیم بخشتا ہے۔ المختصر سواری اسپ نہایت کار آمد شے ہے ہزار حیف کہ وہ لوگ جو اپنے کو اس سے متمتع کر سکتے ہیں اور اس نعمت سے اپنے کو محروم رکھتے ہیں محض بے وجہ گونا گوں انواع اقسام کے ضرر جسمانی و روحانی اٹھاتے ہیں بہت جائے تعجب ہے کہ ہماری قوم ایک وقت میں گھوڑے کا نہایت مذاق صحیح رکھتی تھی جیسا کہ متنبی نے کہا ہے کہ ؎

اَللَّیْلُ وَالْخَیْلُ وَالْبَیْدَاءُ تَعْرِفُنِیْ ۔۔۔ وَالسَّیْفُ وَالضَّیْفُ وَالْقِرْطَاسُ وَالْقَلَمُ

مگر وا مصیبتا کہ گھوڑے کے مذاق صحیح کے جانے کے ساتھ اور بھی ہماری صفتیں جو شعر بالا میں مذکور ہیں رخصت ہو گئیں انا للہ و انا الیہ راجعون

دوسرا امر جو توجہ طلب ہے مذاق شکار افگنی ہے یہ مذاق مذاق سواری اسپ سے ملتا جلتا ہے بلکہ بعض حالتوں میں شکل مشترک پیدا کرتا ہے کس واسطے کہ بعض قسم شکار کی ایسی ہے کہ جس کا تمام تر مدار شہسواری پر ہے۔

واضح ہو کہ بیشتر عوام شکار افگنی کو بیکاری کا شغل جانتے ہیں اور اپنے اس خیال کی تائید میں اسی بے معنی مقولہ کو کہ "شکار کار بیکاران ست" دلیل گردانتے ہیں بعضوں نے شکار افگنی کا مطلب اسی قدر سمجھا ہے کہ ہانڈی اس کے ذریعے سے بھرتی ہے لیکن راقم کی آئندہ تحریروں سے معلوم ہو گا کہ علاوہ اس کے کہ صید افگنی صحت مندی کا ایک معقول ذریعہ ہے اس کے انجام کی صلاحیت صرف

محصّل اشخاص کو ہے بیکار آدمی شکاری ہو نہیں سکتا۔ شکاری وہی ہو سکتا ہے
جس کا دماغ حکیمانہ واقع ہُوا ہے یا جس کی طبیعت شاعرانہ انداز رکھتی ہے ممکن
نہیں کہ ایسا آدمی جو علوم مختلفہ سے اطلاع نہیں رکھتا ہے جفاکشی کا عادی نہیں
ہے فطرت اللہ سے بےخبر ہے دفتر عالم کے مضامین پر نظر ڈالنے سے مجبور ہے
اور صنائع آفریدگار کے ملاحظہ سے لذت روحانی حاصل نہیں کر سکتا ہے
شکار دوست ہو یا شکار افگنی کا مذاق صحیح رکھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو
جس میں یہ باتیں حاصل ہوں کوئی ذی فہم بیکار نہیں کہے گا اگر ایسا شخص بیکار
سمجھا جائے تو دنیا کے تمام حکما و شعرا بیکار سمجھے جانے کے مستحق ہوں گے پس
یہ خیال کہ شکار بیکاروں کا کام ہے ایک محض غلط خیال ہے البتہ یہ خیال اس
وقت صحیح ہوگا کہ صید افگنی کا شغل ایسا شخص اختیار کرے جو حکیمانہ یا شاعرانہ
دماغ نہیں رکھتا ہے اور غایت بے مادگی کے باعث لفظ بیکار کا مصداق
ہو رہا ہے اسی طرح جن لوگوں نے صید افگنی کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اس سے
ہانڈی کا بھرنا مراد ہے وہ بھی عامیانہ خیال کے لوگ ہیں ہانڈی کا بھرنا شکار
کی علت غائیہ نہیں ہے البتہ جب کوئی صید ماکول اللحم ہاتھ لگتا ہے تو اس کا گوشت
مصرف انسانی میں در آتا ہے لیکن صید افگنی سے مجرد شکم پُری مقصود نہیں
ہے جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا۔

واضح ہو کہ صید افگنی کا مذاق صحیح اس وقت انسان کو حاصل ہوتا ہے جب
انسان علوم مختلفہ سے بہرۂ کافی حاصل کر لیتا ہے صید افگنی کے لئے بہت
سے علوم کی ضرورت ہوتی ہے اس زمانہ میں یہ فن ایسے درجہ کو پہنچ گیا ہے

کہ اس کا شوق اسی کو زیبا ہے کہ جو سر سیموئیل بیکر اینڈرسن اسٹرنڈل وغیرہم کی تعلیم یافتگی کا آدمی ہے اس فن سے بہت علوم متعلق نظر آتے ہیں حق یہ ہے کہ جاہل اس کام کو نہیں کر سکتا وہ اس کا شائق بن کر چڑیمار یا قصاب ہو جائے گا شکاری ہونے کے واسطے فطرتی اور کسبی قابلیتوں کا حاصل رہنا ضرور بات سے ہے یعنی ضرور ہے کہ شائق شکار فطرت کے رُو سے شجاع ذہین حاضر طبیعت خوش مزاج جفاکش صحرا پسند آزاد دل اور سادہ درون ہو اس کے ساتھ کامل درجہ کی صحت رکھتا ہو اور تمام اعضائے بدن اس کے نقصانات جسمانی سے پاک ہوں اور محنت شاقہ کی برداشت کی صلاحیت رکھتے ہوں اختلاف آب و ہوا سے اس کا مزاج درجۂ اعتدال سے نہ گزرتا ہو طبیعت عیش پسند واقع نہ ہوتی ہو علاوہ ان صفات کے اسے بردبار رحیم متحمل سیر چشم مہمان نواز خلیق بے تکلف اور دوست پرست ہونا چاہئے ان طبعی اوصاف کے ساتھ اسے علوم قدیمہ و جدیدہ سے پورے طور پہ باخبر ہونا چاہئے بالنسبت راقم اسے علم مناظر ہوا علم آب علم نور علم برق علم تشریح علم حرکت علم کیمسٹری علم معدنیات علم نباتات علم حیوانات علم جغرافیہ علم سیر علم تاریخ علم اخلاق علم ادب علم مجلس علم جرثقیل علم ریاضی علم فلکیات سے واقف ہونے کی بڑی ضرورت ہے لاریب ایسا شکاری جو فطرتی اور کسبی قابلیتوں سے بوضع بالا بہرہ مند ہو اس کو حقاً دعوائے برابری سر سیموئیل بیکر اور ان کے سے نامبرآوردہ اشخاص کے ساتھ حاصل ہے جاننا چاہئے کہ سر سیمول بیکر ایک بڑے درجے کے شکاری تھے خدا نے ان کو جمیع صفات سے جن کا ذکر بالا میں آیا ہے متصف

فرمایا تھا یوں تو ان کی سیاحت نے انسان کے احاطۂ معلومات کو نفع عظیم بخشا مگر علم جغرافیہ ان کی جانفشانیوں کا بہت ممنون ہے۔ سر سیموایل نے دریائے نیل کی تحقیق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور جو کام قیصرِ روم سابق نہ کر سکا تھا اور جس کام میں محمد علی پاشائے مصر کو ناکامیابی مترتب ہوئی تھی اس کا انجام سر سیمویل کے ہاتھ سے ظہور میں آیا۔ سر سیمویل کی تصنیفات بہت ہیں اور سب کی سب پڑھنے کے قابل ہیں ایسے مصنفوں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ صید افگنی سوائے عالم کے جاہل کا کام نہیں ہو سکتا راقم کو دم تحریر یہ خطرہ ہو رہا ہے کہ عوام الناس فقیر کی ان تحریروں کو مجذوب کی بڑ سمجھیں گے کس واسطے کہ شکار کا مفہوم ناواقفوں کے دماغ میں محض غلط طور پر واقع ہے انھیں اس کی مطلق خبر نہیں ہے کہ اس صدی میں صید افگنی کوئی ایسی شئے ہو گئی ہے کہ بے افراط علم انجام نہیں پا سکتی اس غرض سے راقم کچھ مثالیں ضرورت علوم کی ذیل میں عرض کرتا ہے۔

مثال اول:۔ فیر کے وقت جب نال کے اندر بارودت مشتعل ہوتی ہے تو اس میں گاس پیدا ہوتی ہے اس گاس کے پیدا ہونے کی خبر اسی کو ہو سکتی ہے جو علم کیمسٹری سے واقف ہے علم کیمسٹری کو کوئی شخص بغیر اور علوم کے جانتے ہوئے نہیں سیکھ سکتا ہے علم حساب اور علم جبر و مقابلہ کی دانست کے بغیر علم کیمسٹری کا جاننا ناممکن ہے۔

مثال دوم:۔ جب گولی گاس کے دبیعے سے متحرک ہوتی ہے تو کئی قسم کی حرکتیں اس کو لاحق ہوتی ہیں اس کو بغیر علم حرکت کی دانست کے کوئی شخص نہیں بتلا

سکتا ہے۔ پھر جب گولی گردی ہوتی ہے تو اس کی حرکت مخروطی گولی کی حرکت سے کیا فرق پیدا کرتی ہے۔

مثال سوم :- جب نال سے گولی نکل کر فضائے ہوا میں رواں ہوتی ہے تو اس کی راہ قوسی ہوتی ہے۔ کیوں راہ قوسی ہوتی ہے بغیر عالم ریاضی ہوئے کوئی اس کا سبب نہیں بتلا سکتا ہے اس کے سبب کو جاننے کے لئے زمین کی کشش مرکزی سے بھی باخبر ہونا ضرور ہے۔

مثال چہارم :- معمولی بندوقوں میں ایک دیدبان ہوتا ہے جیسے عوام مکھی کہتے ہیں اور رفل کی نال کے آخر حصّے کے قریب کبھی دو کبھی تین کبھی چار دیدبان کس غرض سے بنائے جاتے ہیں بے علم مناظر سے اطلاع رکھے کوئی شخص اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ علم مناظر سے مطلع رہنے کے لئے ضرور ہے کہ انسان آنکھوں کی ترکیب سے واقف ہو پردے اور رطوبتوں سے باخبر ہو نہ ہب خروج شعاع اور انطباع شبح مرئے سے اطلاع رکھتا ہو اسی طرح جتنے مسائل علم مناظر سے متعلق ہیں ان سے آشنا ہو۔

مثال پنجم :- بندوق کی نال کے لوہے کو پہچاننے کے لئے کچھ معدنیات میں دستگاہ ضروریات سے ہے پھر نال اور چانپ کے لوہوں کا فرق بے علمی اطلاع کے سمجھ میں نہیں آسکتا اسی طرح سیسے کی گولی کو سخت اور وزنی کرنے کے لئے ایسے اجزائے معدنیہ سے باخبر ہونا ضروری ہے جو سیسے کو سخت اور وزنی کر دیتے ہیں ہر دھات کے وزن کو سمجھنے کے لئے مسئلہ سپیسفک گریویٹی (Specific gravity) سے مطلع ہونا واجبات سے ہے سپیسفک گریویٹی

عبارت ہے اعتباری وزن سے کسی شئے مادی کے بمقابلہ کسی دوسری شئے مادی کے مثلاً اگر ایک کاسہ میں پانی بھریں پھر اسی کاسے میں سونا بھریں تو سونا وزن کے اعتبار سے پانی سے انیس ۱۹ گناہ بھاری ہوگا اسی پر اور اجسام کو قیاس کرنا چاہیئے کہ پانی سے بوزن خاص بھاری یا ہلکے ہوں گے ۔

مثال ششم :۔ ہاتھی حالت آزادی میں جہاں کہیں پایا جاتا ہے تو ایسے ہی ملک میں پایا جاتا ہے کہ جو خط استوا کے نیچے یا قریب، اس کے واقع ہوتا ہے اس پیکلئے کے سمجھنے کے لئے ضرور ہے کہ انسان علم جغرافیہ سے واقف ہو ورنہ خط استوا کے سمجھنے سے قاصر رہے گا

مثال ہفتم :۔ ہندوستان اور براعظم افریقہ کے ہاتھی جسمانی ترکیب میں ایک دوسرے سے علٰحدہ دیکھے جاتے ہیں موضع دماغ ایک کا دوسرے کے موضع دماغ سے مناسبت نہیں رکھتا اس مسئلے کے سمجھنے کے واسطے ضرور ہے کہ علاوہ جغرافیہ دانی کے انسان حیوانات کی تشریح سے باخبر ہو تشریح حیوانات میں آدمی کی تشریح بھی داخل ہے پس علم تشریح کی اطلاع کی حاجت محتاج بیان نہیں ہے ۔

مثال ہشتم :۔ شیر میں ایک ایسی قوت برقی مودعہ ہے کہ اکثر انسان کی قوتوں کو سلب کر دیتی ہے اسی لئے شیر کے سامنے کمزور اشخاص حواس باختہ ہو جاتے ہیں اس مضمون کے سمجھنے کے واسطے ضرور ہے کہ انسان برقی معاملات سے خبر رکھے یعنی علم برق سے واقف ہو ۔

مثال نہم : بعض سانپ ایسے ہیں کہ نظر کے زور سے جانوروں کو بےحس کر دیتے

ہیں اور بعض نظر کی کشش سے جانوروں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں ظاہر ہے کہ جب تک انسان تاثیر الانظار کے اصول سے یا جذبات مقناطیسی کے قواعد سے واقف نہ ہوگا ان مضمونوں کی تہ کو نہ پہنچ سکے گا۔

مثال دہم:۔ شیر و پلنگ باوجود گوشت خوار جانور ہونے کے افعال و حرکات میں کچھ مطابقت نہیں رکھتے اسی طرح سابر اور نیل گاؤ کی بود و باش کے طریقے بالکل علیحدہ ہیں۔ ان باتوں کے سمجھنے کے واسطے علم حیوانات کی دانست واجبات سے ہے۔

مثال یازدہم:۔ جنگل مختلف اقسام کے ہوتے ہیں کوئی ڈھاک کا کوئی سیلیٹی کا کوئی بانس کا کوئی کانس کا کوئی جھربیری کا کوئی ساکھو کا وغیرہ وغیرہ ہر قسم کا جنگل تقاضائے خاص رکھتا ہے پس ان کے تقاضاؤں سے مطلع رہنے کے لئے ضرور ہے کہ انسان علم نباتات سے باخبر ہو۔

مثال دوازدہم:۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں صیدافگنی کا کیا طور تھا۔ ان کے بڑے صاحبزادے کیونکر شکار کرتے تھے بے علم سیر کوئی اس کا جواب نہیں دے سکتا۔

مثال سیزدہم:۔ بہرام گور بڑا شکاری تھا اس کی حقیقت بے علم تاریخ کے نہیں منکشف ہو سکتی ہے۔

مثال چہاردہم:۔ شائقین فرنگ نے بہت سی کتابیں فن صیدافگنی میں بہت عالی مذاقی کے ساتھ تصنیف فرمائی ہیں۔ ان کتابوں کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اچھی مناسبت ادبیہ درکار ہے۔

مثال پانزدہم:۔ شائق شکار کو لازم ہے کہ اپنے شکاری بھائیوں کے حقوق کو ملحوظ رکھے جانوران صید کو بلا ضرورت ایذا نہ پہنچائے صید افگنی میں سفاکی کو راہ نہ دے آداب شکار کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔ ان باتوں کی خوبیوں کو کوئی شخص بغیر علم اخلاق کی دانست کے نہیں سمجھ سکتا ہے۔

مثال شانزدہم جب احباب کا جلسہ ہو تو باتیں ایسی کرنی چاہئیں کہ کسی کو گزند نہ پہنچے عنوان کلام ایسا رہے کہ مناظرہ نہ معلوم ہو۔ لینت خلوص بیساختہ پن خندہ روئی اور بشاشت کے ساتھ سلسلۂ تقریر جاری رہے کہیں سے بھی گفتگو بوئے انانیت نہ دے اس کے ساتھ خوشامد چاپلوسی وغیرہ سے پاک ہو ایسے جلسوں میں صید و شکار کا تذکرہ آجاتا ہے خاص کر اگر کسی شریک جلسہ کو اس کا مذاق حاصل ہوتا ہے۔ پھر اکثر حضرات عام اس سے کہ شکاری ہوں یا نہیں رائے زنیاں کرنے لگتے ہیں بعض ناتجربہ کار ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ انھیں سن کر خاموش ہو جانا تقاضائے عقل مندی ہے مگر جو معاملات صید و شکار سے واقفیت رکھتے ہیں ان سے بھی بعض اوقات اختلاف کرنا پڑتا ہے مثلاً اگر کسی نے یہ کہا کہ اکسپرس ۴۵۰ EXPRESS NO 450 شیر کے شکار کو کافی ہے تو اس کی تردید ایسی لینت کے ساتھ کرنا چاہئے کہ سامع کو گراں نہ گزرے اکسپرس نمبر ۵۰۰ کا ذکر اس طرح پہ کیا جائے کہ مخاطب کو برا نہ معلوم ہو اور لطف صحبت برقرار رہے۔ ظاہر ہے کہ صحبتوں میں فراز و نشیب کا خیال رکھنا بے علم مجلس کی دانست کے محض دشوار ہے جاننا چاہئے کہ علم مجلس تمام علوم کا نچوڑ ہے اور ہر شریف آدمی کا فرض منصبی ہے کہ اس سے بہرہ ور ہو۔

مثال ہفتدہم:۔ زراعت کو شیر و پلنگ سے کس قدر نفع حاصل ہوتا ہے

اس کو وہی شخص جانے گا جس نے علم زراعت کو سیکھا ہو گا ظاہرا زراعت کو شیر پلنگ سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا ہے مگر ارباب واقفیت سے ان کا تعلق پوشیدہ نہیں ہے راقم نے کچھ عرصہ ہؤا کہ ایک تحریر بزبان انگریزی لکھی تھی جس کی سرخی شیر اور زراعت تھی خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ان مقاموں میں جہاں سے کوہ و جنگل قریب ہیں زراعت کو ایسے جانوروں سے جیسے سوئر نیل سابر چیتل کوٹارہ وغیرہ ہیں سخت ضرر پہنچتا ہے مگر جب ان اطراف میں شیر و پلنگ ہوتے ہیں تو اقسام بالا کے جانور کی تعداد بڑھنے نہیں پاتی ہے اور زراعت بربادی سے بچ جاتی ہے۔

مثال ہیژدہم:۔ صحرا و دشت میں جب شکاری رات کو راہ بھول کر بھٹکتا پھرتا ہے اور نہ سمت کا پتا لگتا ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر شب باقی ہے تو اختر شناسی بہت کام دیتی ہے اختر شناسی کے ۔لئے ضرور ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ علم فلکیات سے باخبر ہو۔

مثال نوزدہم:۔ کیفیت ہوا اور انفاع کوہ کو دریافت کرنا اکثر شکاری کو ضرور ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے بیرومیٹر کی ضرورت ہوتی ہے بیرومیٹر سے کرۂ ہوائی میں جو انقلابات واقع ہونے کو ہوتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں راقم نے چند بار شکارگاہوں میں ہمراہیوں کو ژالہ باری سے متنبہ کر دیا ہے اور موقع کی اطلاع بخشی سے ان کو صدمۂ عظیم سے مامون رکھا ہے بلاشبہ بیرومیٹر نہایت کارآمد آلہ ہے مگر اس کے اصول سے واقف رہنے کے واسطے کس قدر معلومات کی حاجت ہے یہ آلہ ارتفاع کوہ کے دریافت کرنے کے واسطے بھی خوب شے

ہے ارتفاع کے دریافت کی ضرورت کوہ ہمالہ وغیرہ کے شکار میں ہوتی ہے۔
جب شکاری دریافت کرنا چاہتا ہے کہ وہ سمندر کی سطح سے کس قدر بلندی پر پہنچ
گیا ہے ہمالہ میں بزکوہی کا شکار ہوتا ہے یہ جانور بہت مرتفع مقاموں میں قیام کرتا
ہے علاوہ اس کے وہ خرس و پلنگ بھی جو برف میں وطن رکھتے ہیں بہت مرتفع
جگہوں میں پائے جاتے ہیں پس شکاری کو ایسے وقت میں ارتفاع کی تحقیق کا ذریعہ
بیرومیٹر کے سوا دوسرا نہیں ہوتا ہے۔

مثال بستم:- کبھی شکاری کو رسن کے ذریعے سے کوہی گڑھوں میں اترنا ہوتا
ہے اور وہاں اتر کر شیر یا بزکوہی کو شکار کرنا پڑتا ہے۔ بعد شکار کرنے کے مع شکار
اس کو اوپر آنے کی حاجت ہوتی ہے ایسی صورت میں اگر وہ علم جرثقیل سے
بہرہ رکھتا ہے تو پولی یعنی گھرنی وغیرہ کے استعمال سے اپنے کو اوپر لانے کا
سامان پہلے سے کر لے سکتا ہے۔ اسی طرح ذنی جانوروں کے اٹھوانے میں
اس کی اطلاع اس علم کی بکار آمد ہو سکتی ہے۔

واضح ہو کہ راقم نے بالا میں بہت ہی تھوڑے مسائل علمیہ کو جو فن شکار
سے متعلق ہیں مثالاً بیان کیا ہے اگر کچھ بھی تقریر کو وسعت دی جاتی تو پورا
ایک دفتر تیار ہو جاتا بالمختصر جاننا چاہیئے کہ فن صید افگنی ایک ایسا فن ہے کہ
جس کو بہت سے علوم سے تعلق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا شغل اسی کو
زیبا ہے جو شخص محصل ہے اور ان صفات سے متصف ہے جن کا ذکر راقم
نے بالا میں کیا ہے علاوہ اس کے کہ یہ شغل سر سیموئیل ایسے باکار حکما کا ہے اس شغل
کو سچے شعرا سے بھی تعلق ہے ناواقف کو بہ غرض بھی فقیر کی مجذوب کی بڑ معلوم

ہوگی مگر حقیقت یہ ہے کہ سچا مذاق صید افگنی کا شاعری کے سچے مذاق کے ساتھ ایک بڑی مناسبت رکھتا ہے اس مناسبت سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اہل اطلاع تو بےخبر نہیں ہیں مگر البتہ عوام الناس کو اس کی اطلاع نہیں ہے اور نہ اس شاعر کو اطلاع ہے جو گھر میں بیٹھا ہوا جاہل شاگردوں کا ایک گروہ لئے ہوئے قافیہ پیمائی کیا کرتا ہے اس کنوئیں کے مینڈک کو کیا خبر ہے کہ فضائے آسمان کا کیا عالم ہے اگر اس نے گھر سے باہر قدم رکھا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ دست قدرت نے کیا کیا عجائبات سے روئے زمین کو آئینۂ حیرت بنا رکھا ہے مگر اس نے تو شاعری اسی کو سمجھ لیا ہے کہ اول مصرع میں گل ہو تو دوسرے مصرع میں بلبل ہو اس کو اس کی کہاں واقفیت ہے کہ شاعری نام ہے مشاہدۂ عالم سے اپنے میں کیفیت جذبی کے پیدا ہونے کا اور دوسرے میں کیفیت جذبی کے پیدا کرنے کا پس ہر شخص جو اس طور پر اپنے میں کیفیت جذبی کے پیدا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے یا کسی دوسرے میں کیفیت جذبی کے پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے سچا شاعر ہے ایسا شخص اپنے لئے بھی شاعر ہے اور دوسرے کے واسطے بھی شاعر ہے لیکن اگر اس کو اسی قدر صلاحیت ہے کہ کیفیت جذبی صرف اس میں پیدا ہو تو ایسا شخص صرف اپنے لئے شاعر ہے یہ بھی بہت غنیمت ہے کس واسطے کہ ایسی صلاحیت کا موجود رہنا عمدگی طبیعت کی دلیل ہے برخلاف ان دونوں کے وہ قافیہ پیما ناشاعر ہے جو مشاہدۂ عالم سے محروم رہنے کی وجہ سے نہ اپنے میں کیفیت جذبی کے پیدا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ دوسروں میں کیفیت جذبی پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے بہرحال اب راقم دکھانا چاہتا ہے کہ سچے مذاق صید

افگنی کو سچے مذاق شاعری کے ساتھ کیا مناسبت ہے واضح ہو کہ صید افگنی
ایک بڑا ذریعہ دنیا دیکھنے کا ہے اس کو ہمارے ناواقف ہم وطن دشواری
سے سمجھیں گے کس واسطے کہ ان کو حقیقت صید افگنی سے کچھ خبر نہیں ہے۔
اوّل تو ہم لوگ عموماً اس کا مذاق نہیں رکھتے دوم جو حضرات صید افگنی کا شغل
کبھی کبھی اختیار کرتے ہیں وہ جوار ہیں جو کچھ جانور چرند پرند پاتے ہیں مار لیتے
ہیں اور اسی کو صید افگنی سمجھتے ہیں لیکن جاننا چاہئے کہ نہ یہ صید افگنی ہے نہ اس
میں فَسِیرُوا فِی الْاَرْضِ کی تعمیل متصور ہے۔ صید افگنی کیا شے ہے اسے اہلِ
یورپ خوب جانتے ہیں یورپین شکاری اپنے ملک سے نکل کر کبھی افریقہ کبھی
امریکہ اور کبھی ایشیا کی طرف جاتا ہے عجائبات عالم کا تماشا دیکھتا ہے اپنے
مشاہدات کو حوالۂ قلم کرتا ہے اور اپنی تحریر سے شاعری کی پوری داد دیتا ہے
ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا کی سیاحت کرے گا تو بہت کچھ دیکھے گا اور جب بہت
کچھ دیکھے گا تو بہت کچھ لکھے گا۔ جائے انصاف ہے کہ ایسے شکاری سیاح سے
کسی خانہ نشین عنکبوت سیرت شاعر کو کیا نسبت دی جا سکتی ہے ان یورپین
شکاریوں کے سفرناموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تماشائے فطرت
کے دیکھنے کے بے انتہا مواقع ملا کئے ہیں اور خدا جانے کیا کیا حظوظ قلبی ان کو
نصیب ہوتے گئے ہوں گے ان کی تحریریں، پُر از کیفیت نظر آتی ہیں اور الحق
ان کی خوبیاں سچی شاعری کی تصویر پیش نظر کر دیتی ہیں صید افگنی کی کارروائی جب
عالی مذاقی کے ساتھ عمل میں آتی ہے تو نہایت مطبوع رنگ پیدا کرتی ہے خود
شکاری اس سے متمتع ہوتا ہے اور جب اپنے تمتع کے بیانات کو حوالۂ قلم کرتا ہے تو

اس کی تحریر سے ناظرین حظ روحی اٹھاتے ہیں مشغلۂ صید افگنی میں انسان کو صنائع آفریدگار کے معاینے کا بہت موقع ملتا ہے ایسے مواقع ان اشخاص کو جو گھر بیٹھے رہتے ہیں کبھی نصیب نہیں ہو سکتے ایسے بڑے بڑے شکاریوں کو جیسے سر سیمویل بیکر اسٹرنڈیل انڈرسن بالڈون وغیرہ وغیرہ نے کیا کیا نہیں صنائع آفریدگار دیکھنے کے مواقع ملے ہوں گے مگر فقیر نے بھی شکار کی بدولت جھاڑ پہاڑ کی سیروں میں ایسی ایسی تیتریاں اور خوش صوادیاں دیکھی ہیں کہ ان کے دیکھنے کے بعد کیونکر کوئی منکر ذات باری تعالیٰ ہو سکتا ہے ہر شجر حجر پرند چرند درند گزند جڑی بوٹی جھرنا چشمہ پھول پتی سب کے سب زبان حال سے اس کے وجود کا اقرار کرتے نظر آتے ہیں جدھر دیکھئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہے جو غافل کی آنکھوں سے نہاں رہ کر سب کچھ کیا کرتا ہے۔

لمولفہ

کوئی پنہاں ہے پسِ پردہ سامان بہار   گل چمن میں نہیں بے وجہ ہنسا کرتے ہیں

شکاری کی زندگی لاریب بڑی پیاری زندگی ہوتی ہے نام آور شکاریوں کا تو کیا کہنا خود ان کی تحریریں ان کے عنوان زندگی سے خبر دیتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایسی زندگیاں کمتر اہل دنیا کو نصیب ہوتی ہیں لیکن فقیر نے بھی جس قدر عمر شغل صید افگنی میں بسر کی ہے اس کے لطفوں کو خیال کر کے بے اختیار دل پوچھ اٹھتا ہے کہ کیا اس دار المحن میں بھی انسان کو اس قدر خوش دلی کا موقع ملتا ہے جاننا چاہئے کہ اس مشغلے میں افراط لطف کے حاصل ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ صید افگنی کا لطف محض حسیّ انداز کا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا

لطف بہت کچھ روحانی پہلو بھی رکھتا ہے حالات ذیل سے جو ذاتی معاملات راقم کے ہیں کسی قدر صید افگنی کی لذتوں کا موازنہ متصور ہے۔

فصل سرما کی تھی اور فقیر کے خیمے ایک پہاڑ پہ استادہ تھے عموماً اس فصل میں کمتر شیر وغیرہ کا شکار کھیلا جاتا ہے مگر چونکہ راقم کو صید افگنی کا مشغلہ دوازدہ ماہ رہتا ہے کسی خاص فصل کی پابندی نہیں رکھتا بہر حال جہاں مخیم قرار پایا تھا وہاں کی سبزی نہایت دل آویز تھی ہر طرف سبز پوش پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے تھے ہزاروں عظیم پیکر اشجار چارسو دکھائی دیتے تھے ہری کچھ جھاڑیوں کی کمی نہ تھی سبزے کی کثرت فرش زمردی کا رنگ پیدا کئے ہوئے تھی چند طرح کے صحرائی اشجار بھی بار آور ہو رہے تھے چھوٹے چھوٹے طیور ہر جانب مشغول نوا سنجی تھے مگر سب سے زیادہ قابل لحاظ ایک دریا تھا۔ جو پہاڑوں کو کاٹتا ہوا ملک کے میدانی حصوں کی طرف بہ نکلا تھا۔ جس صورت سے اس دریا نے پہاڑوں کو کاٹا تھا۔ قلم کی طاقت سے باہر ہے کہ اسے احاطۂ تحریر میں در لائے کوسوں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آلات کے ذریعے سے دورویہ پہاڑوں کو کاٹ کر درمیان سے ایک عریض دریا بہا دیا ہے اس دریا کا رخ اس وضع پر واقع ہوا تھا کہ اکثر مقاموں میں وقت صبح آفتاب کی سنہری شعاعوں سے وہ دریا میدان طلا معلوم ہوتا تھا۔ اور شام کو رنگ شفق اسے عقیق کا ایک وسیع تختہ بنا ڈالتا تھا۔ اس کے دونوں کناروں پہ شاداب روئیدگیاں سبز گوٹ کا رنگ پیدا کرتی تھیں اس پہ ذخار جگر ہیں فقیر کو دو تین روز اتفاق قیام ہوا شام کو جب شغل شکار سے فرصت

ہو جاتی تو اسی دریا کے قریب کسی پتھر پر بیٹھ جاتا اور موجودہ سبزیوں پر غور و فکر
کو راہ دیتا طرح طرح کے خیالات اس وقت پیدا ہوتے تھے کبھی قدم
و حدوث کے مسائل پیش نظر ہوتے تھے کبھی کون و فساد کے مضامین دل
میں جگہ کرتے تھے۔ کبھی علل و سبب کی طرف طبیعت رجوع لاتی تھی۔ اور اسی
طرح کے ہزاروں حکمائی خیالات پیش ذہن ہو جاتے تھے علاوہ مسائل الہیات
وغیرہ کے علم حیوانات علم نباتات علم معدنیات علم طب وغیرہ وغیرہ کے
مسائل خوض و فکر کے باعث ہوتے تھے شاعرانہ خیالات کے ہجوم سے بھی
چارہ نہ تھا۔ المختصر وہاں کے قیام مختصر کے زمانے میں جو وقت صیدافگنی سے
خالی پڑتا تھا۔ وہ طرح طرح کے مسائل کے سوچ میں بسر ہوتا تھا اور جوں
جوں سوچ بڑھتا جاتا تھا۔ اسی قدر دل زیادہ مبتلائے تحیر ہوتا جاتا تھا اسی
اثنا میں بعض احباب بامذاق سے کسی مسئلے میں جو گفتگو آجاتی تھی تو رنگ
برنگ کے خیالات کے اظہار کی صورت بھی پیدا ہوتی تھی۔

واضح ہو کہ ایسے مقاموں میں انسان ذی علم و باخبر کو دماغی کاموں کی
طرف طبیعت کو رجوع کرنے کی حاجت نہیں ہوتی خود ایسے خیالات
تقاضائے موقع و محل سے دل و دماغ میں ارباب فکر و غور کے آ ٹوٹتے
ہیں چنانچہ بعض احباب بامذاق کے اظہار خیالات سے عیاں ہوتا تھا
کہ ان کے دل و دماغ سیر و سفر میں بیکار نہیں رہتے تھے اے حضرات ناظرین
اس وقت جو ایسی ایسی گزشتہ صحبتیں یاد آتی ہیں تو ان کی یادیں سر نو
سے وہی ولولے پیدا کر دیتی ہیں طبیعت عالم مادیات کی طرف سے منہ

موڑ کر روحانیات کی طرف میلان دکھلانے لگتے ہیں یہ تو گھر بیٹھے طبیعت کی حالت ہوتی ہے شکارگاہ کی کیا حقیقت بیان کی جائے جہاں دنیا کے زق زق بق بق سے مرد شکاری کو فرصت حاصل رہتی ہے اور حالت آزادی میں اعلیٰ درجے کے خیالات اپنی اپنی جلوہ گریاں دکھاتے ہیں۔

أَصَاحِ تَرَی بَرْقًا اُرِیكَ وَمِیضَهُ　　كَلَمْعِ الْيَدَيْنِ فِي حَبِيٍّ مُكَلَّلِ

معنی :۔ اے ہم نشیں تو برق کے چمکنے اور کودنے کو دیکھ کہ اس کا چمکنا اور کودنا اٹھتی ہوئی گھنگھور گھٹائیں معشوقوں کے ہاتھوں کی رخشانی اور جنبش کے انداز رکھتا ہے۔

شاعر گھوڑے کی تعریف کو تمام کر کے اب برق و باراں کے مضامین کو قلمبند کرتا ہے یہ مضامین براے خود ہر زبان میں شاعرانہ خوبیاں رکھتے ہیں مگر چونکہ عرب میں عموماً بارش قلّت کے ساتھ ہوتی ہے اور اگر حسب مراد ہوتی بھی ہے تو صرف اس کے تھوڑے حصّوں میں ہوتی ہے اس لئے کسی شاعر عرب کا ایسے مضامین کی طرف توجہ کرنا خلافِ فطرت نہیں ہے۔ امرء القیس کا بیان برق و باراں کی طرف نقل کرنا اور بھی امر طبعی ہے۔ یہ شخص بالطبع عاشق مزاج صحرا پسند سپاہی منش آزادہ رو جفاکش دوست پرست مردانہ طبیعت شبر ول محبت کیش یار باش اور شکار دوست تھا۔ اس پر سے شاعری کی قابلیت ایک بڑے درجے کی رکھتا تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ فطرت نے اسے خلقت کی رو سے شاعر بنایا تھا پس ایسے شخص کا سامان ابر و باراں سے بشاش ہو کر برق و باراں کے بیان میں شاعرانہ

مذاق کے ساتھ تقریر کو طول دینا تقاضائے فطرت سے بعید نہیں ہے ایسی بشاشت اس کم بخت شاعر کو نصیب نہیں ہو سکتی ہے جو گھر کے اندر بیٹھا ہوا عنکبوت کی زندگی بسر کرتا ہے جس نے ابر کو سوا۔۔۔ اپنے گھر کے کہیں برستے نہیں دیکھا ہے جس نے کبھی ابر کو کوہستان پر ٹوٹ پڑنے معائنہ نہیں کیا ہے جس نے ابر کو کسی وسیع صحرا کو دم بھر میں نہ آب، کر ڈالتے نہیں ملاحظہ کیا ہے لیکن امرء القیس جو ایک شاعر صحرا نورد تھا۔ اور جو عاشق مزاجی کے ساتھ سیر و شکار کو دوست رکھتا تھا کیونکہ گھوڑے کے حالات کہتے کہتے برق و باراں کے بیان کی طرف متوجہ نہ ہوتا اس شاعر کو ایسے اتفاقات ضرور آپڑے ہوں گے کہ وہ مشغول صید افگنی ہوگا یا دشت نوردی کر رہا ہوگا کہ اسی حال میں ابر گھر آیا ہوگا۔ اور بارش نے اسے پناہ لینے کی فرصت نہیں دی ہوگی۔ فقیر کو ایسے اتفاقات اکثر پیش آئے ہیں اور یہ بھی فقیر کو یاد ہے کہ وقت صید افگنی کوہستانوں میں جو ابر سیاہ نمودار ہوا ہے تو بے اختیار شعر بالا امرء القیس کا ذہن فقیر میں آیا ہے اور اس موقع کی یاد دینے اس وقت ایک عجب لذت دل کو بخشی ہے بس بتانا چاہیئے کہ ایک ربط پوشیدہ امرء القیس کے بیان برق و باراں کو اس کے ان اشعار کے ساتھ حاصل ہے جن میں وہ گھوڑے اور شکار کا مذکور کرتا گیا ہے۔ واضح ہو کہ اس قصیدے میں امرء القیس نے دونوں طرح کے مرقع یعنی داخلی (subjective) اور خارجی (objective) قلمبند کئے ہیں اور دونوں طرح کی مضمون آوری میں داد شاعری دی ہے مثلاً

گھوڑے شکار اور برق و باراں کے جو مضامین ہیں خارجی پیرایہ رکھتے ہیں
مگر جہاں داخلی رنگ منظور رکھا ہے وہ مضامین عشقیہ وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ پہلا
شعر اس قصیدے کا قِفَا نَبْكِ الخ داخلی پہلو رکھتا ہے اسی طرح اور بھی
اشعار ہیں مثلاً تسلت عمایات الرجال الخ۔ اس تمام قصیدے کے دیکھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ امرؤ القیس ایک اعلیٰ درجے کا شاعر تھا اس رتبے کا شاعر ہر
ملک اور ہر زبان میں قابلِ قدر متصور ہے:

يُضِيءُ سَنَاهُ أَوْ مَصَابِيحُ رَاهِبٍ   أَمَالَ السَّلِيطَ بِالذُّبَالِ الْمُفَتَّلِ

معنی:۔ روشن ہوتی ہے اور درخشاں ہوتی ہے وہ برق جنبش کے ساتھ جس طرح
معشوقوں کے ہاتھ درخشاں اور جنباں ہوتے ہیں یا مانند راہب کے چراغوں کے کہ جن میں
تیل بلیتۂ تافتہ کی طرف مائل کیا جاتا ہے تاکہ روشنی تیز ہو۔

واضح ہو کہ شاعر برق کی درخشانی اور جنبش کو دو چیزوں سے تشبیہ دیتا ہے ایک
تو نگاروں کے ہاتھوں سے درخشانی اور جنبش کے ساتھ دوم چراغ ہائے راہب
کے ساتھ جس کی روشنی بہت تیز ہوا کرتی ہے۔ پہلی تشبیہ اس رنگ کی ہے
کہ جس طرح شعرائے فارسی و اردو برق کو معشوق کے خندہ یا نگاہ کے ساتھ
دیا کرتے ہیں گو درخشانی و جنبش دست کے مضمون کو اس طور سے کمتر باندھتے
ہیں لیکن دوسری تشبیہ تو خاص عربی مذاق رکھتی ہے اور ملکی رواج سے خبر
دیتی ہے یعنی راہبوں کا دستور ہے کہ شام کو نہایت روشن چراغ جلایا کرتے
ہیں تاکہ دور سے اس کی روشنی نمایاں ہو جس کے ذریعے سے اگر کوئی بھولا بھٹکا
مسافر ہو تو چراغوں کی روشنی کو دیکھ کر ان کے کلیسا کی طرف حصولِ امن کی

نظر سے چلا آئے بلا شبہ یہ ترکیب مسافر نوازی کی خوب ہے چنانچہ راہبان
کلیسا یعنی پارسایان ترسا کی نیک دلی اور رحیمی کی نقلیں بہت کچھ کتابوں میں
درج ہیں اور خدائے تعالیٰ بھی قرآن شریف میں انھیں خوبی کے ساتھ یاد فرمایا ہے
مگر بعض حکایتیں ایسی بھی منقول ہیں کہ بعض اشخاص راہبوں سے مسافروں
کو مار بھی ڈالتے تھے جاننا چاہئیے کہ راہب عبارت ہے پارسائی ترسا
سے ۔ ترسا سے مراد قوم عیسائی ہے راہب بیاہ نہیں کرتے اور تارک دنیا
ہوتے ہیں رہبانیت کو اسلام نے ممنوع کیا ہے اس اصول پر کہ یہ ایک
غیر فطرتی طور زندگی بسر کرنے کا ہے اور یہ ایک ایسا ضرر انگیز طریقہ ہے کہ جس
سے اندر اس بنی آدم کی صورت یقینی ہے خودکشی سے بھی یہ امر زیادہ
مقدوح نظر آتا ہے کس واسطے کہ خودکشی کا نتیجہ فاعل خودکشی تک محدود رہتا
ہے بخلاف رہبانیت کے کہ اس کی مضرت پہلو ئے عام رکھتی ہے ۔
واضح ہو کہ ہر ملک کی شاعری ایک خاص رنگ رکھتی ہے اس لئے کسی
خاص ملک کی شاعری کے لطف کو درک کرنے کے لئے اس ملک کے
معاملات تمدن معاشرت مذہب اخلاق وغیرہ سے مطلع رہنا ضرور
ہے یہ تشبیہ برق کی چراغ ہائے راہب کے ساتھ ایسے ملک کے متوطن
کو جس کے ہاں راہب نہ رہتے ہوں یا اس شخص کو جو مضمون راہب سے
خبر نہ رکھتا ہو کوئی مزا نہیں دے سکتی حالانکہ یہ تشبیہ جس ملک کی ہے وہاں
اس کی خوبی سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ہے ایسی تشبیہات وہ ہیں جو
کسی خاص ملک کے معاملات تمدن و معاشرت و مذہب وغیرہ سے تعلق

رکھتی ہیں اور عام حیثیت سے دور ہوتی ہیں برخلاف ان تشبیہات کے
جن کو امور فطرت سے تعلق ہوتا ہے مثلاً چشم گریاں کی تشبیہ ابر کے ساتھ
ظاہر ہے کہ یہ تشبیہ ایسی ہے کہ اس کو کسی خاص ملک کے معاملات تمدنی و
مذہبی وغیرہ یا رواج کے ساتھ مناسبت نہیں ہے۔ تشبیہ اول جو شاعر نے
رخشانی وجنبش برق کو دست نگار کے ساتھ دی ہے اسی قسم کا انداز رکھتی
ہے اور اس کا فطرتی پہلو ویسا ہی ہے جیسا کہ برق کو خندۂ خوباں و نگاہ
محبوباں کے ساتھ تشبیہ دی جائے ایک شاعر انگریزی نے برق کے کوندنے
اور بادل کے گرجنے کو زبان کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور جس رنگ سے
تشبیہ دی ہے اس کا انداز بہت خوب ہے وہ کہتا ہے کہ دو کوہ مقابل
میں جو بجلیاں چمک رہی ہیں اور بادل گرج رہے ہیں گویا ایسا ہے کہ وہ دونوں
آپس میں ہم کلام ہو رہے ہیں بلاشبہ یہ ایک نہایت خوبصورت تشبیہ
ہے۔ اور محتاج تصریح نہیں ہے اردو یا فارسی میں ایسی تشبیہ فقیر کی نظر سے
نہیں گذری ہے البتہ ایک دوسرے رنگ میں فخر الشعرا استاد حضرت
غالب نے مضمون کو زبان کو بڑی جدت کے ساتھ قلمبند فرمایا ہے چنانچہ
حضرت فرماتے ہیں۔ ؎

طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار — لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحت شاہ

مگر اس شعر کا پہلو ایسا فطرتی نہیں ہے ہر ایک ملک کا آدمی مضمون لعل وطوطی
سے ناواقف رہ کر اس شعر کو مجرد نعبت فطرت کے سہارے پر سمجھ سکے

تَعَدَّتْ لَهُ وَمُصْعَبِيْ بَيْنَ صَنَارِجٍ — وَبَيْنَ الْعَذَيْبِ بُعْدُ مَا مُتَاَمَّلِ

معنی :- بیٹھے ہم اور یاران ہمارے درمیان ضارج اور عذیب اس ابر کے دیکھنے کے واسطے مگر جس ابر کے دیکھنے کو ہم لوگ بیٹھے وہ بہت دور تھا۔

واضح ہو کہ ضارج اور عذیب دو موضع کے نام ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ تماشائے ابر کے لئے ہم لوگ دو موضع کے درمیان بیٹھے مگر وہ مقام جہاں ابر چھایا ہوا تھا۔ وہ بڑے فصل پر واقع تھا۔ یہ شعر بھی نہایت، فطرتی مذاق رکھتا ہے جب دور پر ابر محیط رہتا ہے تو دور کے دیکھنے والے کو نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے اور بے اختیار ناظر کی توجہ اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امرؤ القیس فطرت کا ایک بڑا شاگرد رشید تھا اپنی شاعری میں کبھی فطرت کی طبیعت سے انحراف نہیں کرتا ہے۔

عَلیٰ اَقْطَنٍ بِالشَّیْمِ اَیْمَنُ صَوْبِہٖ   وَاَیْسَرُہٗ عَلَی السِّتَارِ فَیَذْبُلِ

معنی :- جب میں نگاہ کرتا ہوں تو ابر کو بہ باری کے ساتھ جانب راست میں کوہ قطن پر برستے دیکھتا ہوں اور جانب چپ میں کوہ ستار اور کوہ یذبل پر۔

شاعر یہاں جود باراں کو مذکور کرتا ہے اور وسعت موضع بارش کو دکھاتا ہے ملک عرب میں اس قدر بارش کا ہونا خالی از لطف نہیں ہو سکتا۔ اہل ہند ملک عرب کو اپنے ملک پر قیاس نہ فرمائیں کہ جہاں بارش کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ اس قدر بارش جس کا ذکر امرؤ القیس اپنے شعر بالا میں کرتا ہے کوئی حیرت افزا امر نہیں ہے۔

فَاَضْحیٰ یَسُحُّ الْمَاءُ فَوْقَ کُتَیْفَۃٍ   یَکُبُّ عَلَی الْاَذْقَانِ دَوْحَ الْکَنَہْبَلِ

معنی :- پس موضع کتیفہ پر ابر برستا ہے اور زور باراں اس قدر تھا کہ کنہبل کے

درختوں کو بھی جو جنگل کے درختوں میں عظیم پیکر ہوتے ہیں زمین پر منہ کے بھل گرا دیا تھا۔
اس شعر میں کوئی مبالغہ پردازی شاعر نے ایسی نہیں کی ہے کہ احاطۂ فطرت سے تجاوز کر گئی ہو ہیزیڈ (Hesiod.) شاعر یونانی بھی زور باد و باراں کے مضمون کو اس طور پہ قلمبند کرتا ہے جیسا کہ سابق میں عرض کیا جا چکا ہے وہ کہتا ہے کہ ہوا شدید ضربیں لگا لگا کر پہاڑ کی چوٹی پہ کے قوی ہیکل درخت ہائے پاین (pine) کو پھاڑ ڈالتی ہے اور عظیم پیکر درخت ہائے اوک (oak) کو اکھاڑ کر دامن کوہ میں پھینک دیتی ہے۔

وَمَرَّ عَلَى الْقِنَانِ مِنْ نَفَيَانِهِ فَأَنْزَلَ مِنْهُ الْعُصْمَ مِنْ كُلِّ مَنْزِلِ

معنی :- جب کوہ قنان پر باراں پہنچا تو اس کے خوف سے آہوئے سفید بازو دبز کو بھی ہر طرف سے پہاڑ کے نیچے اتر آئے یعنی جب کثرت آب سے ان کو بھی جانوروں کو پہاڑ میں امن کی شکل باقی نہیں رہی تو میدانی حصۂ زمین کی طرف اتر آئے واضح ہو کہ عموماً بارش زیادہ کوہستان میں ہوتی ہے کوہ ہائے بلند اپنی طرف ابر کو کھینچ لیتے ہیں پس جانوران کو بھی کثرت بارش کی حالت میں صحرا و میدان کی طرف اتر آتے ہیں یہ شعر بھی پورا فطرتی مذاق رکھتا ہے امرؤ القیس کی خوش مذاقی سے خبر دیتا ہے۔

وَتَيْمَاءَ لَمْ يَتْرُكْ بِهَا جِذْعَ نَخْلَةٍ وَلَا أُطُمًا إِلَّا مَشِيدًا بِجَنْدَلِ

معنی :- قریہ تیما میں تو بارش نے تنہ ہائے درخت کو باقی نہ رکھا اور گھروں کو سلامت نہ چھوڑا الا ایسے مکانات کو جن کی تعمیر سنگ و گچ و آہک سے ہوئی تھی۔ یعنی صرف ایسے مکانات کہ سنگی اور پختہ تھے صدمۂ باراں سے محفوظ رہے۔

واضح ہو کہ عرب میں اتنی بارش کثرت کا حکم رکھتی ہے گو ہندوستان میں ایسی بارش کہ جس کی وجہ سے خام مکان گر پڑیں اور پختہ کو کوئی صدمہ نہ پہنچے کوئی نادر امر نہیں ہے بہرحال یہ شعر بھی اپنی وضع پر لطف سے خالی نہیں ہے اور نامطبوع مبالغہ پردازی سے بمراحل دور ہے

كَأَنَّ ثَبِيرًا فِي عَرَانِينِ وَبْلِهِ كَبِيرُ أُنَاسٍ فِي بِجَادٍ مُزَمَّلِ

معنی:۔ گویا کہ کوہ ثبیر اوایل باراں بزرگ قطرہ میں مثل ایک مرد امیر و بزرگ کے معلوم ہوتا ہے کہ جو ایک گلیم مخطط اوڑھے ہوئے ہے۔

واضح ہو کہ اکثر جس وقت پہلا پانی بارش کا گرنا شروع کرتا ہے تو بڑے بڑے قطرے برستے ہیں اور پیاپے جو یہ قطرات زمین کی طرف آتے ہیں تو ان سے خطوط کی شکل پیدا ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے زمین کی طرف لاکھوں خطوط کھچے ہوئے ہیں یہ پانی جب کسی پہاڑ پر پڑتا ہے تو پہاڑ مخطط دکھائی دیتا ہے۔ پس شاعر پہاڑ کے اس طور پر مخطط نظر آنے کو ایک مرد امیر و بزرگ کے گلیم مخطط کو اوڑھے رہنے کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے اور واقعی یہ تشبیہ تشبیہ تامہ ہے کس واسطے کہ کوہ کے ساتھ مرد امیر و بزرگ کو نسبت وقار حاصل ہے اور کوہ کا مخطط نظر آنا گلیم مخطط کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے ۔ جاننا چاہئے کہ گلیم مخطط سوا اُمرا کے غربا کو میسر نہیں آسکتی اسے گلیم درویشی نہیں سمجھنا چاہئے۔ شاعر کی خوبی کلام محتاج بیان نہیں۔

كَأَنَّ ذُرَى رَأْسِ الْمُجَيْمِرِ غُدْوَةً مِنَ السَّيْلِ وَالْغُثَّاءِ فَلْكَةُ مِغْزَلِ

معنی:۔ گویا کہ چوٹی کوہ مجیمر کی وقت صبح سیل و خاشاک کے باعث چرخہ دوک

ہو رہی ہے یعنی کوہ مجیمر کی چوٹی کے گرد جو سیل شکل گرداب پیدا کئے ہوئے ہے اور
اس میں خاشاک بھی شامل ہو رہی ہے تو مجیمر کی چوٹی نے چرخے کی صورت پیدا کی ہے

وَاَلْقٰی بِصَحْرَاءِ الْغَبِیْطِ بِعَاعَهٗ ۔۔۔ نُزُوْلَ الْیَمَانِیْ ذِی الْعِیَابِ الْمُحَمَّلِ

معنی :۔ اور ابر مذکور نے صحرائے غبیط میں اپنے مال ڈال دیئے جس طور پہ کہ تاجر یمنی جو جامہ دانوں کا مالک اور ان کا بار کرنے والا ہوتا ہے نزول کرتا ہے۔

واضح ہو کہ تاجر یمنی جامہ ہائے منقش لاتا ہے اور فروخت کی نظر سے انھیں لوگوں کے سامنے پھیلاتا ہے تاکہ لوگ دیکھیں اور خرید کریں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ ابر مذکور صحرائے غبیط میں تاجر یمنی کا طور اختیار کرتا ہے یعنی رنگ برنگ کے پھول ہر طرف کھلاتا ہے ہر سمت میں سبزہ اگاتا ہے اس کی مثال ویسی ہے کہ جیسے تاجر یمنی کسی دیار میں وارد ہوتا ہے خریداروں کو اپنے جامہ ہائے منقش دکھانے کے واسطے انھیں پھیلاتا ہے شاعر نے ایک نہایت پیاری تشبیہ اختیار کی ہے۔ مرزا قاآنی بھی اپنے قصیدہ منقبت امام ہشتم علیہ السلام میں نمود گل و سبزہ کو پارچہ ہائے منقش سے تشبیہ دیتے ہیں۔

خرد شد ہر دم از گردوں کہ پوشد برتن ہاموں
ز سنبل کسوت اکسون ز ژاله خلعت دیبا
ز بس گلہائے گوناگوں چمن چوں صحف انگلیون
تو گوئی فرش سقلاطوں صبا گسترده در مرعیٰ

کَاَنَّ مَکَاکِیَّ الْجِوَاءِ غُدَیَّۃً ۔۔۔ صُبِحْنَ سُلَافًا مِنْ رَحِیْقٍ مُفَلْفَلِ

معنی :۔ گویا کہ مرغان بیابان نے ایسی شراب بامدادی پی ہے کہ جو خالص اور

فلفل انداختہ ہے یعنی بارش کے ہو جانے سے طیور ایسے مست ہو رہے ہیں کہ کہ گویا انھوں نے شراب صبح پی ہے اور حالت مستی میں نواسنجیاں کر رہے ہیں بعد بارش کے ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے کہ طیور مست نغمہ رہتے ہیں ۔

شاعر کی خوبی بیان محتاج بیان نہیں ہے جس قدر شعر بالا فطرتی مذاق رکھتا ہے اہل مذاق پر ہویدا ہے ۔

كَأَنَّ السِّبَاعَ فِيهِ غَرْقَى عَشِيَّةً ... بِأَرْجَائِهِ الْقُصْوَى أَنَابِيشُ عُنْصُلِ

معنی ۔ جب بارش کی کثرت ہوتی اور درندے تتر بتر ہو کہ خاک آلودہ ہو گئے تو ان کی صورتیں وادیان دور اُفتادہ میں بیج مارے پیاز دشتی کی ہو گئیں جو خاک آلودہ رہا کرتی ہیں یعنی درندے خاک آلودہ ہو کہ بیج مارے پیاز دشتی کی صورت ہو گئے پیاز دشتی کی جڑیں زمین میں مضبوطی کے ساتھ گڑی رہنے کے سبب سے ہمیشہ خاک آلودہ رہا کرتی ہیں ۔ پس دَدان دشتی خاک آلودہ ہو کر انہیں کی صورت کے ہو گئے

واضح ہو کہ یہ قصیدہ نمونہ کے طور پر انتخاب ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تمام قصائد سبعہ معلقہ سے فصاحت بلاغت اور حسن شاعری میں غالب ہے بہرحال اس قصیدے کے ملاحظہ سے حضرات ناظرین قبل بعثت کی شاعری عرب کا اندازہ سمجھ جائیں گے جاننا چاہئے کہ یہ سب قصائد فطرتی مذاق رکھتے ہیں اور بلا شبہ بہت سے عمدہ خیالات پر مشتمل ہیں ان قصائد میں بادشاہوں یا امیروں کی جھوٹی تعریفیں مندرج نہیں ہیں ہر شاعر سچے جوش سے یا داروات قلبیہ اور دیگر امور ذہنیہ کو کہیں ۔ بیان کرتا ہے یا معاملات خارجیہ کو کہیں ۔ حوالۂ قلم کرتا ہے فارسی کے شعرا کی طرح بے سر و پا

طور پر مضمون آوری نہیں کرتا ہے آئندہ معلوم ہوگا کہ کس قدر کم فارسی کے قصیدے ہیں جو سچے مذاق شاعری سے بہرہ رکھتے ہیں عموماً فارسی قصائد مدحیہ ہوا کرتے ہیں اکثر شعرائے فارسی نے اپنی عمر عزیز مدح گوئی میں بسر کی ہے اس کی پوری مثال مرزا حبیب قاآنی ہیں جن کے قصائد ان کی بڑی قابلیت بڑی بدمذاقی اور بڑی مجبوریوں کی شہادت دیتے ہیں۔

انتخابات ذیل کتاب حماسہ سے لئے گئے ہیں

جاننا چاہئے کہ حماسہ کے لغوی معنی شدت ہے۔ چونکہ اس کتاب میں لڑائیوں کے اشعار مجتمع ہیں اور لڑائیاں شدت سے خالی نہیں ہوتی ہیں اس واسطے اس کتاب کا نام اس کے مؤلف ابوتمام حبیب بن اوس الطائی نے کتاب الحماسہ رکھا۔

قَالَ بعض شُعَرَاءِ بلعنبرَ وَاسْمُهُ قُرَیطُ بْنِ اُنیفٍ

کلام قریط بن انیف جو شعرائے بلعنبر سے ہے

لَوْ كُنْتُ مِنْ مَازِنٍ لَمْ تَسْتَبِحْ اِبِلِي　　　بَنُو اللَّقِيطَةِ مِنْ ذُهْلِ بْنِ شَيْبَانَا

یعنی اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا تو میرے اونٹ بنو لقیطہ جو ذہل بن شیبان سے ہیں لوٹ کر نہ لے جاتے

اِذًا لَقَامَ بِنَصْرِي مَعْشَرٌ خُشُنٌ　　　عِنْدَ الْحَفِيظَةِ اِنْ ذُو لُوثَةٍ لَانَا

اس وقت میری مدد کو ایک ایسی جماعت کہ حمیت کے وقت سخت ہے کھڑی ہو جاتی اگرچہ کوئی کمزور نرمی کیا کرے۔

قَوْمٌ اِذَا الشَّرُّ اَبْدٰی نَاجِذَیْہِ لَھُمْ   طَارُوْا اِلَیْہِ زَرَافَاتٍ وَّوُحْدَانَا

جب کسی قوم کے لئے فتنہ اپنی دونوں ڈاڑھیں ظاہر کرے یعنی کوئی قوم مبتلائے فتنہ ہوجائے تو مازن ایسی قوم ہے کہ اس قوم مبتلائے فتنہ کی طرف مدد کی نظر سے گروہ گروہ اور فرداً فرداً اوڑنے لگتی ہے۔

لَا یَسْئَلُوْنَ اَخَاھُمْ حِیْنَ یَنْدُبُھُمْ   فِی النَّائِبَاتِ عَلٰی مَا قَالَ بُرْھَانَا

یہ مازن ایسے ہیں کہ جب ان کا کوئی بھائی۔ یعنی جب کوئی انھیں مصیبت کے وقت پکارتا ہے تو اس سے بلانے کا سبب نہیں پوچھتے یعنی فوراً بے پوچھ بات کئے کمک کو مستعد ہوجاتے ہیں۔

لٰکِنَّ قَوْمِیْ وَاِنْ کَانُوْا ذَوِیْ عَدَدٍ   لَیْسُوْا مِنَ الشَّرِّ فِیْ شَیْءٍ وَّاِنْ ھَانَا

لیکن میری قوم یعنی قوم بلعنبر اگرچہ عدد کے رُو سے بہت افراد سے مرکب ہے لیکن فتنے سے کنارے ہی رہا کرتی ہے گو وہ اس کنارہ کشی میں ذلیل بھی ہوجائے۔

یَجْزُوْنَ مِنْ ظُلْمِ اَھْلِ الظُّلْمِ مَغْفِرَۃً   وَمِنْ اِسَاءَۃِ اَھْلِ السُّوْءِ اِحْسَانَا

میری قوم کا یہ انداز ہے کہ ظالموں کے ظلم کا بدلہ درگزر اور بدوں کی برائی کا معاوضہ بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں

ظاہراً اس شعر سے قوم بلعنبر کی مدح پیدا ہوتی ہے مگر شاعر بسبیل استہزا اس قوم کے حق میں اس قول کو کہتا ہے. مطلب شاعر یہ ہے کہ یہ قوم کسی وضع کی حمیت. یا خودداری نہیں رکھتی ہے محض بیکار اور لاشئی ہے

کَاَنَّ رَبَّکَ لَمْ یَخْلُقْ لِخَشْیَتِہٖ   سِوَاھُمْ مِنْ جَمِیْعِ النَّاسِ اِنْسَانَا

گویا خدا نے اپنے خوف کے لئے سوا ان لوگوں کے تمام نوع انسان میں کسی انسان کو پیدا ہی نہیں کیا ہے یعنی گویا خوف خدا کے لئے سوا قوم بلعنبر کے تمام بنی آدم میں کوئی قوم پیدا ہی نہیں ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ شاعر نے اپنی قوم کی اس شعر میں بڑی ہجو ملیح لکھی ہے۔

فَلَيْتَ لِيْ بِهِمْ قَوْمًا اِذَا رَكِبُوْا　　شَدُّوا الْاِغَارَةَ فُرْسَانًا وَّرُكْبَانَا

اے کاش میرے لئے کوئی ایسی قوم ہوتی کہ جب سوار ہوں تو غارت گری کے لئے تیاری کریں درحالیکہ گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہوں۔

شاعر اپنی قوم کی ضعف و بیچارگی کو بیان کرکے حسرت کرتا ہے کہ کاش ایسی کمزور اور بے کار قوم کے عوض اس کی قوم مستعد اور بکار آمد ہوتی۔

واضح ہو کہ قریط بن انیف جس کے اشعار بالا ہیں قبیلہ بلعنبر کا آدمی ہے بلعنبر دراصل بنو العنبر ہے اس قبیلے کے تیس[۳] اونٹ بنو اللقیط لوٹ لے گئے تھے قبیلہ مازن نے قبیلہ بلعنبر کی اعانت کی اور تیسوں اونٹ بنو اللقیط سے چھین کر قبیلہ بلعنبر کو دے دیتے شاعر اشعار بالا میں قبیلہ مازن کی مدح اور اپنے قبیلہ بلعنبر کی ہجو کرتا ہے۔ بہرحال اشعار بالا پر غور کرنے سے چند باتیں پیش نظر ہو جاتی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اہل عرب قومی تقاضوں سے ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں جس کی شریک کمتر اور کوئی قوم نظر آتی ہے۔ صاف یہ اشعار کہے دیتے ہیں کہ ملک عرب میں کوئی عام گورنمنٹ نہیں ہے جس کے تمام سکنائے عرب پابند ہوں اس ملک کے متوطن قبیلے قبیلے میں تقسیم ہیں اور ہر [illegible] کا انتظام جداگانہ ہے چنانچہ امر واقعی بھی ایسا ہے ہر قبیلے

کا ایک شیخ ہوتا ہے جو حکمران قبیلہ ہوتا ہے۔ اکثر یہ قبائل آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور موافقت و ناموافقت کی بنیاد پر آپس میں دوستانہ یا دشمنانہ برتاؤ رکھتے ہیں جھگڑوں کے سبب بہت ہوتے ہیں کبھی پانی پلانے میں نزاع پیدا ہوتی ہے کبھی جانوروں کی چوری کے لئے جھگڑا اٹھتا ہے اسی طرح بہت سی وجہیں جدال و قتال کے برپا ہونے کی ہوا کرتی ہیں اور آخر کار نوبت تیغ وسناں کی پہنچتی ہے یہاں فتنہ کے برپا ہونے کی وجہ قبیلہ بنو اللقیبطہ کی غارت گری تھی ہیں ان باتوں سے ظاہر ہے کہ اگر ملک عرب میں کوئی عام گورنمنٹ موجود ہوتی تو قبیلہ بلعنبر کے اونٹ بنو اللقیبطہ اس طور پر لے جاتے اور نہ اس طور پر قبیلہ مازن قبیلہ بلعنبر کی اعانت کرتا مگر جس ملک میں طوائف الملوکی کی شکل لاحق رہتی ہے وہاں کے قبائل اسی طرح کی خود سرانہ کارروائی کرتے ہیں یہ تو پولٹیکل انداز اہل عرب کا اشعار بالا سے ظاہر ہوتا ہے اسی طرح ان اشعار سے طریقہ معاشرت اور فطرتی مزاج بھی اہل عرب کا عیاں ہوتا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب ایسے لوگ ہیں کہ زمینداری نہیں رکھتے زراعتی پیداوار پر ان کی اوقات کا مدار نہیں ہے۔ ملک گیری کے خیال سے بری ہیں۔ قوانین سیاسی کے پیچ پیل سے ناواقف ہیں ان میں نہ شائستہ ملکوں کے پیچیدہ قوانین مروج ہیں اور نہ کوئی قانون سزادہی کے اصول پر ان میں جاری ہے سزادہی کے عوض معاوضہ کی کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے اشعار بالا سے تمام تر ان کی قومی بے زری ہویدا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی کاروبار سے تعلق نہیں رکھتے مگر اس

بے زری کی حالت میں بھی اپنے ملک سے مالوف نظر آتے ہیں اور اپنی موجودہ حالت کو تمام اہل دنیا کی حالتوں سے اچھی سمجھتے ہیں۔ امور بالا کے علاوہ یہ باتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں کہ اپنی اوقات گذاری کا مدار اونٹ گھوڑے وغیرہ کی پرورش پہ رکھتے ہیں اور جانوروں کی چری کی ضرورتوں سے بیشتر صحرانشین رہتے ہیں پھر آپس میں لوٹ مار کرتے ہیں اور آپس کے اونٹ گھوڑے جو ان کی مالی کائنات ہیں چراتے ہیں اور نیز معاوضہ کے خیال سے جدال و قتال اختیار کرتے ہیں اس انداز معاشرت کے سبب سے انھیں تیغ بدست رہنے کی حاجت لاحق ہوتی ہے جس کے باعث ان کی قوم بسبیل عادت بہادرانہ انداز رکھتی ہے اور امر واقعی بھی یہ ہے کہ جب کسی قوم کو اپنی تلوار کے بل پر زندگی بسر کرنی پڑتی ہے تو تقاضائے معاشرت سے وہ قوم دلیر اور جنگجو ہو جاتی ہے اس طریقہ معاشرت کا اثر اہل عرب کے تمام افعال و اقوال میں دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری بھی وہی تیغ بدست مذاق رکھتی ہے اگر ملک عرب کی شاعری کو بنگالہ کی شاعری سے ملائیں تو آسمان اور زمین کا فرق محسوس ہوگا ظاہر ہے کہ بنگالہ کے کسی شاعر کے دماغ میں اس طور کے جدال و قتال کے مضامین بسبیل عادت ایسی روانی اور آسانی کے ساتھ جگہ نہیں کریں گے شاید یہ روکھا سوکھا اور تیغ بکف انداز شاعری کا اہل بنگالہ کی زبان میں خوش اسلوب معلوم بھی نہ ہوگا اگر وہاں کا کوئی شاعر اس جنگی انداز کو اختیار بھی کرے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کی شاعری تقاضائے

ملکی سے کنارے ہو رہی ہے ہر چند بنگلہ زبان اب کمال خوبی و محبوبی کو پہنچ گئی ہے اور سب طرح کے خیالات کے ادا کرنے پر قادر ہے۔ اس پر بھی ملکی تقاضوں سے کسی حال میں باہر نہیں ہو سکتی ہے لاریب عرب کی یہ رزمی شاعری جسے حماسہ کہتے ہیں اور اہل فرنگ وار سانگ (War song) کے ساتھ موسوم کرتے ہیں ایک خاص انداز رکھتی ہے کہ اہل عرب کی قومی افتاد طبیعت سے پورے طور پر خبر دیتی ہے۔ واضح ہے کہ عرب کی رزمی شاعری ہومر رجل فردوسی ملٹن بیاس بالمکی وغیرہم کی رزمی شاعریوں سے جدا انداز رکھتی ہے ان شعرا کی تصانیف بڑی بڑی مثنویاں ہیں برخلاف اس کے اہل عرب کے اشعار رزمی قطعات و قصائد وغیرہ پر مشتمل دیکھے جاتے ہیں جیسا کہ اشعار حماسہ سے ہویدا ہے اہل عرب کی شاعری میں یہ ایک بڑی منقصت پائی جاتی ہے کہ کوئی تصنیف منظوم مثنوی کے پیرائے میں موجود نہیں ہے یہ ایسا نقصان ہے کہ اگر عربی کی ذاتی خوب صورتی نہ رکھتی تو فارسی کی شاعری سے اس کو کسی طرح کا مقابلہ نہ ہو سکتا مگر حقیقت حال یہ ہے کہ شعرائے عرب بڑی قوت نطق رکھتے ہیں ادائے خیالات خوب کرتے ہیں بلاغت کی داد کامل طور پر دیتے ہیں اور تبعیت فطرت سے خالی کبھی نہیں رہتے اس لئے ان کی شاعری کو فارسی کی شاعری پر مرجح سمجھنا دور از انصاف نہیں ہے جاننا چاہئے کہ خاص کر یہ عمدگیاں حسب مراد بعثت آنحضرت صلعم سے پہلے کی شاعریوں میں پائی جاتی ہیں اس عہد کے شعرا کے کلام بلاشبہ ممتاز طور

پسنچرل رنگ رکھتے ہیں یہ شعرائے سابق عہد جہاں داخلی یعنی سبجکٹو (subjective) مضامین کو قلمبند فرماتے ہیں تو وہاں ایسے مضامین کو فطرت کی کامل پیروی کے ساتھ جلوہ دیتے ہیں اور اسی طرح خارجی یعنی آبجکٹو (objective) مضامین کو بھی حوالۂ قلم کرتے ہیں۔ ان عمدگیوں کے اعتبار سے سابق کے اہل عرب کی شاعری فارسی کی شاعری پر بہت غلبہ رکھتی ہے۔ البتہ عربی کی شاعری وہی مقدوح نظر آتی ہے جو خلفائے دمشق و بغداد کے زمانوں سے خبر دیتی ہے اہل عرب کے ان زمانوں کی شاعری بیّن شکل سے فارسی کی شاعری کا رنگ رکھتی ہے یعنی وہی بدمذاقیاں جو فارسی کی شاعری میں دیکھی جاتی ہیں ان زمانوں کی عربی کی شاعری میں بھی پائی جاتی ہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ درباری شاعروں نے قرب سلطانی کے حاصل کرنے کی نظر سے کم حوصلگی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔

قَالَ وَدَّاكُ بْنُ ثُمَيْلٍ الْمَازِنِيُّ

وداک بن ثمیل مازنی کہتا ہے۔

رُوَيْدَ بَنِي شَيْبَانَ بَعْضَ وَعِيدِكُمْ   تُلَاقُوا غَدًا خَيْلِي عَلَى سَفَوَانِ

باز آؤ بنی شیبان اپنے بعض وعید سے   ملوگے تم کل میرے سواروں سے سفوان پر

تُلَاقُوا جِيَادًا لَا تَحِيدُ عَنِ الْوَغَى   إِذَا مَا غَدَتْ فِي الْمَأْزِقِ الْمُتَدَانِي

ملوگے تم ایسے گھوڑوں سے جو لڑائی سے منہ نہیں پھیرتے۔

عَلَيْهَا الْكُمَاةُ الْغُرُّ مِنْ آلِ مَازِنٍ   لُيُوثُ طِعَانٍ عِنْدَ كُلِّ طِعَانٍ

ان گھوڑوں پر آل مازن کے وہ چمکتے مُنہ ہوں گے جو ہر ایک جنگ میں جنگی شیر رہیں یعنی ان گھوڑوں پہ آل مازن سوار رہیں گے جن کے مُنہ چمکتے ہیں اور لڑائی میں شیر کے انداز رکھتے ہیں۔

تُلَاقُوهُمُ فَتَعرِفُوا كَيفَ صَبرُهُمُ   عَلَىٰ مَاجَنَتْ فِيهِمِ يَدُ الحَدَثَانِ

جب ان سے تم دوچار ہوں ہوگے تو پہچان لوگے کہ ان کا صبر حوادث کے وقت میں کیسا ہے۔

مَقَادِيمُ وَصَّالُونَ فِي الرَّوعِ خَطوُهُمُ   بِكُلِّ دَقِيقِ الشَّفرَتَينِ يَمَانِ

یہ آل مازن آگے بڑھنے والے اور اپنے قدم کو جنگ میں باریک دھار والی یمنی تلوار پر پہنچانے والے ہیں۔

إِذَا استُنجِدُوا لَم يَسأَلُوا مَن دَعَاهُمُ   لِأَيَّةِ حَربٍ أَم بِأَيِّ مَكَانِ

یہ آل مازن ایسے ہیں کہ جب ان سے نصرت مانگی جاتی ہے تو طالب مدد سے جنگ و موضع جنگ نہیں دریافت کرتے یعنی بیدھڑک اعانت کے واسطے مستعد ہو جاتے ہیں۔

واضح ہو کہ اشعار بالا کا ملکی رنگ وہی ہے جو اور اشعار کتاب حماسہ کا ہے بنظر اختصار راقم نے کتاب مذکورہ سے صرف دو شاعر کے کلاموں کو مندرج ہذا کرنا مناسب سمجھا اس رسالہ مجالہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ کسی بیان کو طول دیا جاسکے پس مضمون اختصار کو ملحوظ رکھکر اب راقم ایک قصیدہ متنبی کا درج ہذا کرتا ہے اس قصیدہ سے تمام حضرات عربی دان واقفیت رکھتے ہیں اور واقعی یہ قصیدہ ایسا ہے کہ جس سے متنبی کی اعلیٰ درجہ کی

قابلیت شاعری ظاہر ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعر نادر روزگار گزرا ہے
اگر اس کی قابلیت کا استعمال بکار آمد طور پر کیا جاتا تو یہ شاعر دنیا کے بڑے
بڑے شعرا میں جیسے کہ ہومیروس ورجل ملٹن فردوسی بالمکی بیاس کالی داس
شیکسپیر گوئٹا اور میرانیس میں شمار کیا جاتا مگر افسوس ہے کہ اس شاعر نے
ایسا بُرا زمانہ پایا کہ جس وقت شاعری سے نہایت مبتذل کام لیا جاتا تھا یعنی
جس وقت شاعری سلاطین و اُمرا کے تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھی جاتی
تھی ظاہر ہے کہ ایسے وقتوں میں شاعری کی خوبیاں باقی نہیں رہ سکتی ہیں
ایسے وقتوں میں شاعر کو جس کا کام یہ ہے کہ آزادی راستی صفائی خلوص سیر
چشمی اور دیگر صفات حمیدہ کو اپنے تمام افعال و اقوال میں ملحوظ رکھے ناچار نا
ناگفتہ امور کو اختیار کرنا پڑتا ہے اس کی شرافت ذاتی اور بزرگی نفس درباری
شاعر ہونے کے ساتھ تمام تر رخصت ہو جاتی ہے درباری شاعر کی ایک
بڑی مثال متنبیؔ ہے جس کی عمر مدحیہ مضامین کے گڑھنے میں بسر ہو گئی اگر اس
کو آزادی حاصل رہتی تو مدح گوئی کے عوض شاعری کے بکار آمد اور مفید
طریقوں کو اختیار کرتا ہزار حیف کہ اس شاعر گرامی کو وہ کام کرنا پڑا جو
معمولی بھاٹ وغیرہ کیا کرتے ہیں کس واسطے کہ عموماً مدحیہ رنگ کی قصیدہ
گوئی بھاٹوں کی مداح سرائیوں سے اعلیٰ یا اشرف پایا نہیں رکھتی ہے معاذ اللہ
اگر شاعری کی یہی اوقات قرار دی جائے کہ وہ سلاطین و اُمرا کے لئے طرح طرح
کے غیر فطرتی مدحیہ مضامین پیدا کیا کرے تو شاعری سے زیادہ پوچ ذلیل
اور نامطبوع کوئی دوسرا کام قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے مگر جائے افسوس

ہے کہ متنبی کو اور اس کے ایسے دیگر درباری شعرا کو اس طرح کی خوار زندگی
بسر کرنے کی صورت لاحق ہوئی اس سے زیادہ کیا مصیبت خیز کوئی طریقہ
زندگانی تصور کیا جا سکتا ہے کہ آدمی ہزار کد و کوشش کے ساتھ ان باتوں
کو عمر بھر زبان قلم پر لایا کرے جنہیں خود وہ اپنے دل میں لغو دروغ اور
مہمل جانتا ہو۔ شاعری زنہار لغو گوئی یا دروغ گوئی نہیں ہے شاعری ایسی
عظیم شئے ہے کہ اس سے ہمارے بڑے بڑے اخلاقی تمدنی اور مذہبی اغراض
متعلق ہیں شاعری ہرگز اس واسطے نہیں مخلوق ہوئی ہے کہ بدمذاق سلاطین
و اُمرا کو خوش کرنے کے لئے ایک نہایت غیر فطرتی رنگ سے برتی جائے
مگر ہزار افسوس ہے کہ عربی فارسی اور اردو شاعریوں کا ایک ممتاز حصہ
ایسا ہی نظر آتا ہے کہ جبّارین وقت کی مدح و ثنا پر مشتمل ہے اگر مداحی و
ثناخوانی کا رنگ فطرتی بھی ہوتا تو قصائد مدحیہ اس قدر تنفر انگیز نہیں معلوم
ہوتے مگر مدح سرائی کا نعوذ باللہ ایسا بُرا پیرایہ نظر آتا ہے کہ طبع فطرت
پسند پورے طور پر متاذی ہوتی ہے ارباب انصاف غور فرمائیں کہ قصیدہ
گویوں کا یہ کیا طریقۂ مدح سرائی ہے کہ اپنے ممدوح کے صاحب قدرت
و ذی اختیار ہونے کو اگر بیان کریں تو اسے مالک قضا و قدر بنا کر
چھوڑیں ہوا برق باراں آتش آب جبال بحر سب کو اس کے زیر فرمان
بتائیں اور اسی طرح ہزاروں لایعنی مضامین کو قلمبند کر جائیں بہت سے
ایسے قصائد عربی فارسی اور اردو میں موجود ہیں کہ ان کے مدحیہ اشعار جو
سلاطین و اُمرا کی شان میں ہیں اگر حمد خدا نعت محمد مصطفیٰؐ اور منقبت علی

مرتضیٰ اکی میں پڑھے جائیں تو کوئی مضایقہ معلوم نہ ہو. متنبی کے اس قصیدے میں بھی جو ابوعلی ہارون بن عبدالعزیز الاروا حی کی مدح میں ہے ایسے ایسے مضامین دیکھے جاتے ہیں کہ اگر رسولؐ خدا اور ائمۂ اطہار کی شان میں عرض کئے جاتے تو کسی شخص کو عذر نہ ہوتا بلکہ وہ مضامین ایسے ہی ہیں کہ بزرگان دین کی شان میں عرض کئے جائیں نہ کہ نام آوران دنیا کی۔ یہ قصیدہ تو خیر جیسا ہے ویسا ہے اگر بعض شعرائے فارسی کے مدحیہ قصاید کو دیکھئے تو وہ بے سروپا باتیں ہیں کہ جس کی کوئی حد نظر نہیں آتی ہے اس پر بھی ایسے قصائد کی قدردانیاں اپنے اپنے وقت میں سلاطین و امرا کی طرف سے اس درجہ پر ہوئی ہے کہ ان کے خیال سے تعجب گزرتا ہے خدا جانے ممدوحین کیسے لغو پسند تھے اور مداحین کیسا مذاق بد رکھتے تھے ممدوحین کی تو یہ حالت دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے شعرائے درباری پر قصائد مدحیہ کی فرمائشیں کرتے تھے اور اگر ان سے بجا آوری خدمت میں کوئی کمی ظہور میں آتی تھی تو ان پر چشم نمائی عمل میں لائی جاتی تھی چنانچہ متنبی کے ساتھ بھی ایسے معاملے پیش آئے ہیں جیساکہ خود اس کے بعض کلام سے عیاں ہوتا ہے یوں تو مدح گوئی سے کسی زبان کی شاعری خالی نہیں ہے مگر جو بھرمار مدح گوئی کی عربی فارسی اور اردو میں دیکھی جاتی ہے اس قدر کسی زبان میں نہیں دیکھی جاتی متنبی کی تمام تصنیف قصائد مدحیہ سے مملو ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر نے سوا مدح گوئی کے کوئی دوسرا کام ہی نہیں کیا ہے حالانکہ اس کی فطرتی قابلیت شاعری ایسی تھی کہ ہر صنف شاعری

میں اس کو ممتاز عالم بنا سکتی تھی مگر حیف ہے کہ اس نے اس وقت عالم
ہستی میں قدم رکھا کہ جب شاعری شیوۂ مذلت اختیار کر چکی تھی یعنی جب
شاعری سلاطین و امرا کی خوشامد کے لئے مختص کی جا چکی تھی ایشیائی دربارن
کی بے عنوانیوں سے قابل لحاظ ایک یہ بے عنوانی بھی ہے کہ ہمیشہ شاعری
عمل کی لونڈی مانی گئی ہے اور شعرا اہلِ دولت کے غلام سمجھے گئے ہیں
تقاضائے ضرورت سے بیچارے شعرا نے بھی ایسے سمجھے جانے کو گوارا
رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی شاعری بد مذاقی کا طومار نظر آتی
ہے اس کثرت کے ساتھ عربی فارسی اور اردو زبانوں میں قصائد مدحیہ
کا موجود ہونا شاعری کے بڑی ابتذال سے خبر دیتا ہے قصیدہ گوئی کا زنہار
مطلب نہیں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس سے بے سروپا طور پر شاہان و امرا
کے مناقب و محامد ضبط تحریر میں در آئیں بلکہ قصیدہ وہ صنف شاعری
ہے کہ جس میں شاعر اعلیٰ درجے کے مضامین جو معاملات اخلاق تمدن
و مذہب و دیگر اہم امور ذہنیہ و خارجیہ وغیرہ وغیرہ پر مشتمل ہوتے
ہیں قلمبند کرتا ہے ایسے قصائد عربی و فارسی میں موجود ہیں اور بوجہ عمدگی
مذاق کے بہت قابل توجہ ہیں مگر کمتر شعرائے زمانہ ایسے رنگ میں کہتے
ہیں چنانچہ اس زمانے میں جب لفظ قصیدہ کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس
سے مراد قصیدۂ مدحیہ ہوتا ہے حالانکہ مدح گوئی جان قصیدہ گوئی نہیں
ہے بلکہ مدح گوئی ایک ارذل طریقہ قصیدہ گوئی کا ہے جو قصیدۂ مدحیہ
ہوتا ہے اس میں آزادی خلوص راستی حق پروری حق شناسی وغیرہ

وغیرہ کے رنگ ہرگز نہیں پائے جا سکتے ہیں پس جو قصیدہ ان خوبیوں سے معرّا ہو اس کی بابت حقیقی رذالت اور کم حوصلگی میں کیا گفتگو کی جا سکتی ہے غرض قصیدہ گوئی یہ ہے کہ عالی درجے کے مضامین جو خواہ عالم ذہن اور خواہ عالم خارج سے متعلق ہوں قلمبند کئے جائیں، مثلاً مسائل توحید وعدل نبوت امامت معاد صدق محبت صبر شکر رضا وغیرہ وغیرہ یا مسائل خلقت ارض سما وما بینہما اور اسی طرح کے دیگر امور اہم جو شاعر حکمت مآب کی توجہ کے قابل متصور ہیں مدحیہ قصائد وہی قابل پسند ہو سکتے ہیں جو حمد و نعت و منقبت میں لکھے گئے ہیں یا آئندہ لکھے جائیں مثلاً قصیدہ بردہ یا قصیدہ فرزدق جو نعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور منقبت امام زین العابدین علیہ التحیہ والثنا پر مشتمل ہیں لیکن ایسے قصائد جو سلاطین و امرا کی مدح میں دیکھے جاتے ہیں زنہار ایسے نہیں ہیں کہ کوئی تعلیم یافتہ دماغ کا آدمی ان سے کسی قسم کا حظ اٹھا سکے عموماً ایسے قصائد معاملات فطرت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اس لئے نہایت قابل نفرت ہیں جو قصیدہ یا کوئی صنف شاعری کہ نیچرل خوبیوں سے معرّا ہے اس جانب شخص محصل کی طبیعت مائل نہیں ہو سکتی. شاعری کے واسطے تبعیت فطرت واجبات سے ہے جو شاعر فطرت کی پیروی سے عاجز ہے اس کو لازم ہے کہ شعر نہ کہے کچھ اور کام کرے بغیر تبعیت فطرت کلام مقبول اہل مذاق نہیں ہو سکتا مجرد تبعیت فطرت کا یہ اثر ہے کہ امرء القیس کی قصیدہ گوئی کو اس قدر حسن قبول نصیب ہے جو صاحب مذاق

اس شاعر کے کلاموں کو پڑھتا ہے ان کی نیچرل خوبیوں کو دیکھ کر آفریں صد آفریں کہتا ہے اور صرف زبانی تعریف نہیں کرتا ہے بلکہ ان کی جذبی تاثیرات کا معترف ہو کر دل سے ان کی محبوبیوں کا اقرار کرتا ہے۔ متنبی قوت شاعری میں امرؤ القیس یا دیگر شعرائے عرب سے زنہار کم نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ اس نے ایسے زمانے میں ظہور کیا کہ جس وقت شاعری اپنی اصلی حالت پہ باقی نہیں رہی تھی وہ شستگی زبان وہ سادگی انداز وہ لطف بے ساختگی وہ ولولہ محبت وہ جوش آزادی وہ قوت خلوص وہ زور استغنا وہ تبعیت فطرت اور بھی دیگر خوبیاں جو امرؤ القیس یا دیگر شعرائے قبل بعثت کو نصیب تھیں عہد متنبی میں گاؤخورد ہو چکی تھیں پس ایسی صورت میں متنبی سے عالی مذاقی کی امید کیا کی جا سکتی ہے ایسے زمانے میں جہاں شاعر کو بھاٹ کا کام کرنا پڑے وہاں شاعری کیا جوہر دکھلا سکتی ہے ناچار متنبی کو ایسا شاعر بننا پڑا کہ جیسا اس کے عہد کا تقاضا تھا قصیدۂ ذیل جو بسبیل انتخاب درج ہذا کیا جاتا ہے اس سے متنبی کی پوری کیفیت معلوم ہو گی یہ قصیدہ بتلا دیتا ہے کہ عہد متنبی میں عربی کی شستگی زبان رخصت ہو چکی ہے عجمی انداز کلام دخل پا چکا ہے مذاق شاعری میں کچھ ایسا انقلاب پیدا ہو گیا ہے کہ جو شعر نظر سے گذرتا ہے کہیں سے سوا الفاظ عربیہ کے خیالات کے اعتبار سے ملک عرب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے شاعری کو جو ایک وقت میں آزادی کا پایہ حاصل تھا زوال پذیر ہو گیا ہے شاعر کو خلوص جوش محبت صدق صفا استغنا اور تبعیت فطرت سے کوئی رابطہ باقی

نہیں رہا ہے شاعری دریوزہ گری ہو رہی ہے اور شاعر نا کسی بے آبروئی اور ذلت کی تصویر ہو رہا ہے اس قصیدے میں اول بارہ[۱۲] شعر تشبیب کے ہیں اور بقیہ مدحیہ اشعار ہیں گریز تیرھویں[۱۳] شعر میں ہے تشبیب کے اشعار غزل کا رنگ رکھتے ہیں اور پُر از بلاغت ہیں مگر جذبی تاثیر سے معرّا ہیں اس لئے کہ واردات قلبیہ اور تبعیت فطرت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے باقی جو مدحیہ اشعار ہیں مبالغہ پردازی کے طومار ہیں اور انہیں کو اچھے لگ سکتے ہیں جو اغراض شاعری سے خبر نہیں رکھتے ۔

قصیدہ در مدح ابوعلی ہارون بن عبدالعزیز الاوراجی الکاتب

اَمِنَ ازْدِیَارَكِ فِی الدُّجیٰ الرُّقَبَاءُ   اِذْ حَیْثُ کُنْتِ مِنَ الظَّلَامِ ضِیَاءُ

معنے :- تاریکی میں تیری ملاقات کی طرف سے رقیبوں کو اطمینان ہے کس واسطے کہ اندھیرے میں جس جگہ تو ہوتی ہے روشنی ہوتی ہے یعنی تیرا پرتو حسن ایسا نور افگن ہے کہ جہاں تو رہتی ہے وہاں اندھیرا نہیں ہوتا تیری شمع روئی کے باعث تاریکی نور کے ساتھ مبدل ہو جاتی ہے پس جب یہ کیفیت ہے تو رقیبوں کو اس امر کی طرف سے اطمینان ہے کہ اندھیرے میں تجھ سے کبھی ملاقات نہیں ہو سکتی متنبی کی خلاقی سخن محتاج بیان نہیں ہے یہ مضمون ہر چند اور زبانوں میں بھی قلمبند پایا جاتا ہے مگر اس شاعر ادیب و بلیغ نے کسی زبان سے سرقہ نہیں کیا ہے یہ مضمون تمام تر اس کے حُسن طبیعت کا جلوہ ہے ۔ قبل اس کے کہ بقیہ اشعار اس قصیدے کے زبان اردو میں ترجمہ کر کے دکھائے جائیں ،

ایک امر قابل عرض یہ ہے کہ عربی میں سخن سنجی کا طور ایسا ہے کہ شعرائے عرب جب اشعار عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں تو اپنے مخاطب کو ہمیشہ مونث قرار دیتے ہیں یعنی عربی کی عاشقانہ شاعری مرد کی طرف سے عورت کی جانب ہوا کرتی ہے بلاشبہ یہ ایک فطرتی طریقۂ سخن سنجی کا ہے اور زبان عربی میں بہت اچھا بھی معلوم ہوتا ہے اسی طرح یورپین زبانوں میں عاشقانہ خطاب کا یہی طور ہوا کرتا ہے مگر فارسی اُردو اور ہندی میں اس کے برعکس طریقہ برتا جاتا ہے بعض نئی روشنی والے حضرات فارسی اور اردو کے اس انداز کلام پر مُنہ آتے ہیں اور غایت نافہمی سے اظہار رائے فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ اب سے متروک کیا جائے اپنی اس رائے کی تائید یہ حضرات اس دلیل کے ساتھ کرتے ہیں کہ فطرتی طریقہ عاشقانہ سخن سنجی کا یہ ہے کہ خطاب عاشقانہ مرد کی طرف سے عورت کی جانب ہونا چاہیے مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ قوانین فطرت میں کیا نقصانات لاحق ہو جا سکتے ہیں اگر وہی خطاب عاشقانہ عورت کی طرف سے مرد کی جانب کیا جائے۔ اس امر کی طرف راقم عنقریب رجوع لائے گا کس واسطے کہ یہ امر ہندی گیت دُہرا وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے مگر فارسی اور اُردو کے انداز سخن سنجی پر جو اعتراض حضرات مسبوق الذکر کا ہے اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ فارسی میں تو نہ اسمانہ ضمائر قید تانیث و تذکیر رکھتے ہیں پس یہ اعتراض عام طور پر کیونکر عائد ہو سکتا ہے چنانچہ اشعار ذیل میں معشوق کے مذکر ہونے کی کوئی تخصیص نہیں نظر آتی ہے۔

غزل حافظ

گل بے رخ یار خوش نہ باشد — بے بادہ بہار خوش نہ باشد
طرف چمن وہوائے بستان — بے لالہ عذار خوش نہ باشد
رقصیدن سرو وحالت گل — بے صوت ہزار خوش نہ باشد
باغ وگل ومل خوش ست لیکن — بے صحبت یار خوش نہ باشد
ہر نقش کہ دست عقل بندد — بے نقش ونگار خوش نہ باشد
بایار شکر لب وگل اندام۔ — بے بوس وکنار خوش نہ باشد

جان نقد محقر ست حافظ
از بہر نثار خوش نہ باشد

ایضاً

گفتم غم تو دارم گفتا غمت سر آید — گفتم کہ ماہ من شو گفتا اگر بر آید
گفتم ز مہر ورزان رسم وفا بیاموز — گفتا ز ماہرویاں ایں کار کمتر آید
گفتم کہ بوئے زلفت گمرہ عالمم کرد — گفتا اگر بدانی ہم اوت رہبر آید
گفتم دل رحیمت کے عزم صلح دارد — گفتا بکنش بجفا را تا وقت آن بر آید
گفتم کہ بر خیالت راہ نظر بہ بندم — گفتا کہ شب رو است ایں از راہ دیگر آید
گفتم خوش آں ہوائے کز باغ خلد خیزد — گفتا خنک نسیمے کز کوے دلبر آید
گفتم کہ نوش لعلت ما را آبا رزو کشت — گفتا تو بندگی کن کاں بندہ پرور آید
گفتم زمان عشرت دیدی کہ چوں سر آید — گفتا خموش حافظ کیں غصہ ہم سر آید

واضح ہو کہ ایسے بہت کلام دکھلائے جا سکتے ہیں کہ جن میں مخاطب کے مذکر ہونے کی تخصیص نہیں ثابت ہوتی ہے. نئی روشنی والے ایسے اشعار کے مخاطب کو اپنی تقلید پرستی کے مذاق کے مطابق مونث قیاس فرمائیں گو یہ اشعار ایسے ہیں کہ عورت اپنے اس معشوق کے حق میں جو فطرت کے مطابق سوا مذکر کے مونث نہیں ہوسکتا ہے زور شوق میں پڑھ سکتی ہے لیکن کچھ اشعار ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ ان کا مخاطب ایسا ہی ہے کہ سوا مذکر کے مونث نہیں ہو سکتا تو اس کی صورت یا یہ ہے کہ وہاں مخاطب معشوق حقیقی ہے جو کسی زبان میں مونث قرار نہیں دیا جا سکتا ہے جیسا کہ اشعار ذیل سے معلوم ہوگا.

حسن خود در روے خوباں آشکارا کردۂ — پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

پرتوِ حسنت نگنجد در زمین و آسماں — در حریم سینۂ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

لمؤلفہ

اے روے ابر رنگ گرفتہ ز بہارت — در گلشنِ حسنِ تو گذر نیست خزاں را

یا یہ کہ وہاں مخاطب ایک ایسا مرد جوان رعنا ہے کہ جس کی شان میں عورت کی طرف سے شاعر کلام عاشقانہ قلمبند کرتا ہے۔

حسن سبزے بخطِ سبز مرا کرد اسیر — دام ہم رنگ زمین بود گرفتار شدم

زنہار اس شعر سے غرض شاعر اظہار امرد پرستی نہیں ہے جیسا کہ کج فہم معترضوں نے سمجھا ہے. اب رہی اردو کی عاشقانہ سخن گوئی تو اس کی حالت یہ ہے کہ زبان اردو میں ہر لفظ مذکر ہے یا مونث خود لفظ معشوق مذکر

سے ہے اور جتنے الفاظ معشوق کے معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں مذکر ہیں جیسے یار جاناں بُت صنم وغیرہ وغیرہ پس ضرورت زبان کی وجہ سے جب کوئی کلام عاشقانہ رنگ میں قلمبند ہوتا ہے تو اس کا مخاطب بھی ضرور مذکر قرار پاتا ہے ورنہ درحقیقت مراد شاعر کبھی امرد پرستی نہیں ہوتی۔ دوم یہ کہ غزل گوئی ایک ایسی صنف شاعری ہے کہ جو فارسی اور اردو کے سوا کسی زبان میں اس وضع خاص سے نہیں دیکھی جاتی ہے اور اگر اس کے تقاضوں پر غور کیجئے تو معلوم ہو کہ اس سے تجید باری تعالیٰ وانکشاف حقائق عشق وغیرہ مراد ہے لیکن عوام یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں عاشقانہ مضامین قلمبند ہوتے ہیں اور اکثر مرکز شاعر کوئی معشوق مجازی ہوتا ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے اس صنف شاعری کو زیادہ تعلق معشوق حقیقی سے ہے بالفرض اگر کہیں معشوق مجازی بھی مرکز شاعر ہوتا ہے تو اس خوبی کے ساتھ ذکر پاتا ہے کہ شان کلام میں کسی طرح ابتذال نہیں لاحق ہوتا ہے پس جب غزل گوئی سے مراد شاعر یہ ہے کہ عاشقانہ پیرایہ سخن میں تجید باری تعالیٰ کی شکل پیدا ہو یا دیگر معاملات عشقیہ وامور ذہنیہ احاطۂ تحریر میں در آئیں تو عظمت مضامین کے خیال سے شاعر اپنے مخاطب کلام کو پیرائے مذکر میں دکھلاتا ہے اگر معشوق کو بہ ترکیب مونث خطاب کرتا تو احاطۂ خیال تنگ ہو جانے کے باعث وہ وسعت کلام جس کی بدولت ذہن سامع فوراً معشوق حقیقی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے بالکل رخصت ہو جاتی اس وقت تو یہ وسعت حاصل ہے کہ جب کسی شعر میں شاعر معشوق کا ذکر

کرتا ہے یا معشوق کی طرف خطاب کرتا ہے تو معشوق حقیقی کا تصور
بلے اختیار دل میں آجاتا ہے ایسی حالت میں یہ قصد اصلاح نئی روشنی
والوں کی جانب سے کہ اب سے جتنے اشعار کہے جائیں ان میں جہاں ذکر
معشوق کا کیا جائے تو نحوی ترکیب صیغہ و ضمائر کی مونث ہوا کرے خالی
از نقصان نہیں ہے واقعی یہ عجب پوچ فرمائش ان حضرات کی ہے اس
سے تو بالکل غرض غزل گوئی فوت ہو جاتی ہے علاوہ توجیہ بالا کے یہ امر بھی
قابل لحاظ ہے کہ اہل اسلام میں عورتیں پردہ نشیں مانی جاتی ہیں اسی لئے انہیں
مستورات کہتے ہیں رواج مذہبی و ملکی بھی ہے اور اس قدر رسم پردہ
داخل معاشرت ہوگئی ہے کہ سوسائٹی میں بے دھڑک ایک غزل میں بیس
جگہ مستورات کا ذکر بہ سبیل صیغہ و ضمیر مونث نہایت مکروہ معلوم ہوگا جب تک
اس رسم پردہ کو حضرات نئی روشنی والے متروک نہ فرمالیں اس ترکیب سے
اصلاح غزل گوئی میں کوشاں نہ ہوں پروفیسر پامر (Prof Palmer)
بھی فارسی اور اردو میں معشوق کے مذکر یاد کیئے جانے کی توجیہہ اسی رنگ سے
بیان فرماتے ہیں جیسا کہ راقم نے ابھی بالا میں عرض کیا بلا شبہ غزل گوئی میں
معشوق کو بار بار بصیغہ و ضمیر مونث ذکر کرنا عظمت غزل گوئی کو ضائع کرنے
والا ہوگا البتہ مثنوی ڈراما مراثی وغیرہ میں جو طور دنیا میں صیغہ و ضمیر کے استعمال
کا ہے اس کی پابندی شعرائے اردو کو بھی کرنی پڑے گی اور اس وقت بھی
کرتے ہیں میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان میں بدر منیر کو مذکر نہیں لکھا
ہے اور نہ اور کوئی مثنوی گو اس طریقہ بیان سے انحراف کرے گا ظاہر اتنی

روشنی والوں کو تبعیت نیچر کی پابندی کا بڑا خیال معلوم ہوتا ہے تبعیت فطرت اللہ ایک ایسی شئی ہے کہ اس کا التزام انسان کے لئے واجبات سے ہے مگر بد لحاظی کے ساتھ کسی امر کا پابند ہوتا قباحت سے خالی نہیں ہوتا اہل انصاف غور فرمائیں کہ اردو کی ترکیب ایک خاص وضع کی ہے ہر لفظ کے مذکر یا مونث ہونے سے یہ زبان نہ صرف دشوار ہو رہی ہے بلکہ اس کا انداز بھی نرالا ہو رہا ہے یہ اعتراض کہ معشوق کو فطرت اللہ کی رُو سے مونث ہونا چاہیئے عجب اعتراض ہے فطرت کی رُو سے تو معشوق مذکر اور مونث دونوں ہو سکتا ہے مرد کا معشوق جب کوئی ہوگا تو عورت ہوگی عورت کا جب کوئی معشوق ہوگا تو مرد ہوگا اگر فطرت کے رُو سے ہمیشہ معشوق کو مونث ہونا چاہیئے تو کوئی عورت شاعرہ اور بھی عاشق ہو تو اس کے معشوق کو بھی مونث ہونا چاہیئے واقعی نئی روشنی والوں کی پابندی فطرت کا یہ عجیب نتیجہ نکلے گا خدا جانے ان حضرات نے کیوں مذکر و مونث کا یہ بکھیڑا پھیلایا ہے ہر قدم پر یورپ کی تقلید کہ ناچہ معنی دارد تبعیت فطرت کے معنی تقلید یورپ نہیں ۔ اگر یہی پابندی فطرت اور جوش تقلید ہے تو ارباب نیچر اب سے شمس کو مذکر اور قمر کو مونث زبان عربی میں قرار دیں گے اس لئے کہ انگریزی زبان میں شمس مذکر ہے اور قمر مونث اس طرح کی اصلاح پر اصرار کرنے والے اکثر وہی حضرات ہوتے ہیں کہ انھیں یوربین زبانوں میں یا دستگاہ نہیں ہوتی یا یوربین زبانوں کو ٹوٹی پھوٹی طرح جانتے ہیں ایسے حضرات کو کمال نادیدگی

سے تمام یورپین چیزیں نہایت عجب انگیز معلوم ہوتی ہیں اور لاعلمیوں کے
باعث ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن سے قومی فائدہ ہونے کے عوض قومی
ضرر مترتب ہوتا ہے دوسرے اور ہندی گیتوں وغیرہ میں بھی معشوق
اکثر مذکر دیکھا جاتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معشوق وہاں ترکیب زبان
کے رو سے مذکر واقع ہے بلکہ ہندی کی شاعریاں جو عاشقانہ رنگ میں
ہوتی ہیں عورت کی طرف سے مرد کی طرف ہوتی ہیں یہ ایک عجیب امر ہے
کہ ہندوستان کی عورتوں کی افتاد مزاج سے خبر دیتا ہے ہندوستان
کی عورتیں اپنے مردوں کو اس قدر چاہتی ہیں کہ روئے زمین پر ان کا سا عشق
کہیں نہیں دیکھا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہیں ایک
شوہر کے بعد پھر دوسرے شوہر کے پانے کی کسی حالت میں توقع نہیں
رہتی ہے اسی لئے ہندی کا عاشقانہ کلام ایسا پُر از سوز ہوتا ہے کہ کسی
ملک کی عاشقانہ شاعری اس کو نہیں پہنچتی ہے ہندی گیت ایسے پُر تاثیر
ہوتے ہیں کہ ان کو سن کر دل ہاتھ سے جانے لگتا ہے اکثر گیتوں میں عورت
اپنے شوہر سے بچھڑ جانے کے مضمون کو بیان کرتی ہے یا اشتیاقیہ کلام
از قسم انتظار و یاس وغیرہ کو زبان پر لاتی ہے علاوہ اس کے قومی
معشوق ہندوؤں کے شام یعنی کانہ جی ہیں اکثر گیت جو تصنیف ہوتے
ہیں ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں پس ایسی حالتوں میں ہندی
گیتوں اور دوہروں وغیرہ میں معشوق مخاطب مذکر ہوا کرتا ہے۔
واضح ہو کہ متنبی اپنے قصیدے کے مطلع بالا میں معشوق کو خطاب

کہتا ہے اور یہ تمام تر عربی شاعری کے دستور کے مطابق ہے کہ لا یخفیٰ

تَلَقَّ الْمَلِيحَةِ وَهِيَ مِسْكٌ هَتْكُهَا   وَمَسِيرُهَا فِي اللَّيْلِ وَهِيَ ذُكَاءُ

معنی:- چونکہ معشوقہ میں مشک کی بو پائی ہے اور آفتاب کی ضیا ہے تو جب وہ حرکت میں آتی ہے یا رات کو چلتی ہے تو یہ دونوں امر اس کی پردہ دری کے سبب ہوتے ہیں۔

أَسَفِي عَلَى أَسَفِي الَّذِي دَلَّهْتِنِي   عَنْ عِلْمِهِ فَبِهِ عَلَيَّ خَفَاءُ

معنی:- مجھے افسوس ہے تو اپنے اس غم پر ہے کہ تیرے پریشان کرنے سے میری عقل اس قدر جاتی رہی ہے کہ مجھے اب غم کے محسوس کرنے کی بھی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔

وَشَكِيَّتِي فَقْدُ السَّقَامِ لِأَنَّهُ   قَدْ كَانَ لَمَّا كَانَ لِي أَعْضَاءُ

معنی:- مجھے جو شکایت ہے وہ اپنے مرض کے جاتے رہنے سے ہے جب مرض تھا میرے اعضا بھی باقی تھے اب جو مرض جاتا رہا ہے تو اعضا بھی معدوم ہو گئے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ سب اشعار بالا تمام تر عجمی مذاق رکھتے ہیں فطرت سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے واردات قلبیہ سے نام کو علاقہ نہیں رکھتے۔ بالکل مصنوعی شاعری کے نمونے ہیں یہی مذاق اکثر عجمی غزل گویوں کا ہے مبالغہ پردازی سے لطف غزل گوئی جاتا رہتا ہے ناممکن ہے کہ مبالغے کے ساتھ کوئی کلام پُر تاثیر ہو سکے۔ اگر متنبی نے ان اشعار تشبیب میں حافظ کی سی شاعری کا رنگ اختیار کیا ہوتا تو یہ اشعار دل پر کوئی معقول

اثر پیدا کرتے مگر چونکہ متنبی کی شاعری روٹی کی شاعری تھی اسے حافظ کا رنگ اختیار کرنا ناممکنات سے تھا روٹی کی شاعری واردات قلبیہ سے ہمیشہ معرّا ہوتی ہے روٹی کا متلاشی شاعر مدام مبالغہ استعارہ تشبیہ وغیرہ کے نامطبوع پہلوؤں کا برتنے والا ہوتا ہے جیسا کہ مرزا حبیب قاآنی د ذوق دہلوی وغیرہ دیکھے جاتے ہیں. ظاہر ہے کہ یہ انداز سخن قبل بعثت آنحضرت صلعم کے شعرا میں کہاں تھا اس عہد کے شعرا نہایت فطرتی انداز غم وخوشی اور اور دیگر واردات قلبیہ کے اظہار کرنے کار کھتے تھے جو طریقہ شاعری اس جگہ متنبی نے اختیار کیا ہے اسکو فطرت کی نسبت سے کوئی علاقہ نہیں معلوم ہوتا ہے اور اہل مذاق کی پسند سے بمراحل دور ہے البتہ جو اغراض شاعری سے ناواقف ہیں اس مبالغہ پردازیوں کی بھرمار سے عاجز آکر صدائے تحسین وآفریں بلند کریں تو خلاف از توقع نہیں ہے۔

مَثَّلَتِ عَيْنَكِ فِي حَشَايَ جِرَاحَةً فَتَشَابَهَا كِلْتَاهُمَا نَجْلَاءُ

معنی:۔ میرے دل میں تو نے اپنی نگاہ سے زخم لگا کر اپنی آنکھ کی تصویر بنا دی ہے کہ وہ دونوں آپس میں فراخی کے اعتبار سے مشابہ ہوگئے ہیں۔ یعنی چونکہ تیری آنکھ بڑی ہے اور جب تیری نگاہ نے میرے دل پر ایسا زخم لگایا ہے کہ جو تیری آنکھ کی تصویر کا حکم رکھتا ہے تو ضرور ہے کہ وہ زخم تیری آنکھ کی طرح بڑا بھی ہو پس میرا زخم دل تیری آنکھ کے ساتھ از روئے فراخی کے مشابہت رکھتا ہے یعنی جس قدر بڑی آنکھیں تیری ہیں اسی قدر میرا زخم دل بھی بڑا ہے۔

یہ شعر بھی مصنوعی شاعری کا نمونہ ہے ظاہر ہے کہ باوجود بلیغ ہونے کے
کوئی لطف معاملہ قلبی کا نہیں رکھتا ہے۔

نَفَذَتْ عَلَیَّ السَّابِرِیَّ وَرُبَّمَا　　تَنْدَقُّ فِیْهِ الصَّعْدَةُ السَّمْرَاءُ

معنی:- تیری نظر میری زرہ کے پار ہوگئی ہے حالانکہ وہ زرہ ایسی ہے
اکثر اس میں سبد سے گندم رنگ نیزے ٹوٹ جاتے ہیں۔ یعنی جس زرہ سے
نیزہ نہیں پار ہوتا ہے تیری نگاہ اس سے پار ہو جاتی ہے۔

اَنَا صَخْرَةُ الْوَادِیْ اِذَا مَا زُوْحِمَتْ　　وَاِذَا نَطَقْتُ فَاِنَّنِیْ الْجَوْزَاءُ

معنی:- میں استقلال میں نالے کا پتھر ہوں جب کہ وہ دھکیلا جائے اور
جب میں بولتا ہوں تو جوزا ہوں۔

واضح ہو کہ جوزا وہ برج ہے کہ مقام عطارد ہے عطارد کو دبیر فلک بھی
کہتے ہیں چونکہ اس سیارے کی طرف علم و ہنر کی نسبت کی جاتی ہے اس
لئے شاعر اپنے کو جوزا کہتا ہے یعنی اپنے کو مقام عطارد قرار دیتا ہے جس
مطلب یہ ہے کہ میں صاحب نطق کامل ہوں

وَاِذَا خَفِیْتُ عَلَی الْغَبِیِّ فَعَاذِرٌ　　اِلَّا تَرَانِیْ مُقْلَةٌ عَمْیَاءُ

معنی:- اگر میں نادان سے پوشیدہ ہوں تو وہ معذور ہے کیونکہ اندھی آنکھ
نہیں دیکھ سکتی۔ یعنی اگر میرے کمال کو نادان نہیں درک کر سکتا ہے تو وہ معذور
ہے کیونکہ اندھے کو کچھ نظر نہیں آتا

لمؤلفہ

آنکھ والا ترے جوبن کا تماشا دیکھے　　دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

شِيَمُ اللَّيَالِي اَنْ تُشَكِّكَ نَاقَتِيْ　　صَدْرِيْ بِهَا اَفْضٰى اَمِ الْبَيْدَاءُ

معنی :۔ حوادثِ زمانہ میری اونٹنی کو شک میں ڈالتے ہیں کہ میرا سینہ ان حوادث سے زیادہ تر وسیع ہے یا وہ جنگل جس میں وہ اونٹنی رواں ہے۔

شاعر یہاں اپنے مبتلائے حوادث روزگار ہونے کو بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس قدر ہم مبتلائے حوادث ہوئے ہیں کہ ان سے میرا سینہ ایسا وسیع ہو رہا ہے کہ میری سواری کی اونٹنی کو شک ہو رہا ہے کہ آیا میرا سینہ زیادہ وسیع ہے یا وہ جنگل جس میں وہ چل رہی ہے۔

فَتَبِيْتُ تُسْئِدُ مُسْئِدًا فِيْ نَيِّهَا　　اِسْاٰدَهَا فِي الْمَهْمَهِ الْاِنْضَاءُ

معنی :۔ پس اس ناقہ کی شب گزاری کا یہ حال ہو رہا ہے کہ اس کی چربی میں لاغری یوں سرایت کر رہی ہے کہ جس طرح وہ خود جنگل میں دوڑتی ہے

اَنْسَاعُهَا مَمْغُوْطَةٌ وَخِفَافُهَا　　مَنْكُوْحَةٌ وَطَرِيْقُهَا عَذْرَاءُ

معنی :۔ اس کے تنگ کے تسمے کھینچتے کھینچتے دراز اور کھُر ناہموار راہوں میں چلتے چلتے سوراخ دار ہو گئے ہیں اور اس کا چلنا ایسی راہ سے ہوتا ہے کہ جس راہ پر کوئی پہلے نہیں گیا ہے۔

يَتَلَوَّنُ الْخِرِّيْتُ مِنْ خَوْفِ التَّوٰى　　فِيْهَا كَمَا تَتَلَوَّنُ الْحِرْبَاءُ

:۔ وہ راہ ایسی ہے کہ جس میں خوف ہلاکت سے رہبر ایسا رنگ بدلتا ہے جیسے گرگٹ۔ یعنی راہ نہایت پُر خطر ہے رہبر کا رنگ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔

گرگٹ ایک معروف جانور ہے اہل عجم اسے بوقلموں کہتے ہیں یہ

جانور ایک گھنٹے میں چند رنگ بدلتا ہے اس لئے شخص متلون کو حربا سے تشبیہ دیتے ہیں یہ ایک خاص قسم کا گرگٹ ہوتا ہے ہر گرگٹ کو اس طور پر رنگ بدلنے کی قدرت حاصل نہیں رہتی ہے حربا کا خاصہ ہے کہ آفتاب میں دھوپ کھانے کی غرض سے دیر تک رہتا ہے اور رنگ بدلا کرتا ہے. مؤلف نے اپنے شعر ذیل میں اس مضمون کو باندھا ہے ؎

جز تلون صنما نیست بذاتت بیلے　　آفتابی ولے خاصیت حربا داری

بَيْنِي وَبَيْنَ أَبِي عَلِيٍّ مِثْلُهُ　　شُمُّ الْجِبَالِ وَمِثْلُهُنَّ رَجَاءُ

معنی :- میرے اور میرے ممدوح ابی علی کے درمیان بھی ایسے ہی بلند اور سخت پہاڑ ہیں اور انہیں پہاڑوں کی سی میری آرزو ہے.

یہاں سے گریز قصیدہ ہے تشبیب کے بعد شاعر گریز اختیار کر کے مدح ممدوح شروع کرتا ہے اکثر مدحیہ قصیدوں کا یہی انداز ہوتا ہے

وَعِقَابُ لُبْنَانٍ وَكَيْفَ بِقَطْعِهَا　　وَهُوَ الشِّتَاءُ وَصَيْفُهُنَّ شِتَاءُ

معنی :- اور درمیان میرے اور ممدوح کے کوہ لبنان کی گھاٹیاں ہیں ان کی مسافت موسم سرما میں کس طرح قطع ہو کہ ان کا موسم تابستان بھی زمستان کا حکم رکھتا ہے. یعنی وہ گھاٹیاں نہایت سرد ہیں.

لَبِسَ الثُّلُوجُ بِهَا عَلَيَّ مَسَالِكِي　　فَكَأَنَّهَا بِبَيَاضِهَا سَوْدَاءُ

معنی :- اس پہاڑ میں کثرت برف سے مجھے راہ نہیں ملتی گویا وہ برف باوجود سفید رنگ ہونے کے سیاہ ہے یعنی اس پہاڑ پر برف کے گرنے سے

راہ چھپ گئی ہے اور اس لئے مجھے راہ نہیں کہ آگے چلیں اور ہر چند رنگ برف کا سفید ہے مگر اس کی سفیدی حکم سیاہی کا رکھتی ہے ظاہر ہے کہ تاریکی میں آدمی چلنے سے عاجز آجاتا ہے اور یہاں بھی کثرت برف سے چلنا دشوار ہے پس ہر چند برف سفید رنگ رکھتی ہے مگر اس کی سفیدی کچھ سیاہی سے کم نہیں جب اس کے سبب سے کوئی چل نہیں سکتا۔

وَکَذَا الْکَرِیْمُ اِذَا اَقَامَ بِبَلْدَۃٍ سَالَ النُّضَارُ بِہَا وَ قَامَ الْمَاءُ

معنی :۔ اور ممدوح ایسا ہی کریم ہے کہ جب کسی شہر میں قیام کرتا ہے تو اس کی سخا کے باعث سونا بہ چلتا ہے اور پانی حیران ہو کر ٹھہر جاتا ہے۔

یہ شعر ایشیائی شاعری کا پورا نمونہ ہے اور فارسی اور اردو کے شعرا کو مبالغہ پردازی کی راہ بنانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے حقیقت یہ ہے کہ متنبی اور اسی کے سے قصیدہ گویوں نے فارسی کے شعرا کو غیر فطرتی رنگ پر مدح سرائی کے طریقے سکھلائے ہیں اور فارسی کی شاعری کے داغی ہونے کے باعث ہوئے ہیں۔

جَمَدَ الْقِطَارُ وَلَوْ رَاَتْہُ کَمَا تَرٰی بُھِتَتْ فَلَمْ تَتَبَجَّسِ الْاَنْوَاءُ

معنی :۔ اس کے جود کو دیکھ کر قطرات باراں جم گئے ہیں اور اگر اس کو جیسے قطرہائے باراں دیکھتے ہیں انواء دیکھتے تو وہ بھی فرط حیرت سے اپنی رفتار میں ٹھہر جاتے واضح ہو کہ انواء ستارے ہیں کہ جن کی طرف امور بارش وغیرہ کی نسبت اہل عرب کرتے ہیں پس مراد شاعر یہ ہے کہ قطرات بارش اسے دیکھ کر جم جاتے ہیں اگر انواء بھی اسے قطرہائے باراں کی طرح دیکھ لیتے تو

رفتار سے باز آتے یہ شعر بھی غیر فطرتی رنگ رکھتا ہے کما لا یخفیٰ
خدا جانے ایسی مدح سرائیاں کس طرح ممدوحین کو پسند آتی تھیں
عہد متنبی شاعری کی بڑی بدحالی سے خبر دیتا ہے ۔

فِي خَطِّهِ مِنْ كُلِّ قَلْبٍ شَهْوَةٌ — حَتّٰى كَأَنَّ مِدَادَهُ الْأَهْوَاءُ

معنی :- ہر دل میں اس کی تحریر کی خواہش ہے گویا دلوں کی خواہشیں اس کے لکھنے کی سیاہی بن گئی ہیں ۔

واضح ہو کہ ممدوح کاتب تھا اس لئے یہ شعر اس کی کتابت کی تعریف میں کہا گیا ہے یہ تعریف یا اس کی خوش خطی کی ہے یا اس کی سخاوت کی ہے کہ وہ فراہین عطیات لکھ دیتا ہے یہ شعر کم غیر فطرتی رنگ رکھتا ہے اور ایسا ہے کہ اگر اس طور پہ مدح ممدوح کی جائے تو ایسی مدح سرائی چنداں خلاف مذاق صحیح نہیں ہوگی ۔

وَلِكُلِّ عَيْنٍ قُرَّةٌ فِي قُرْبِهِ — حَتّٰى كَأَنَّ مَغِيبَهُ الْأَقْذَاءُ

معنی :- اس کے قرب میں سب کی آنکھوں کو ٹھنڈک ہے یہاں تک کہ اس کا نظر سے دور ہونا آنکھوں کی کھٹک کا باعث ہوتا ہے ۔

اس شعر کی شاعری نہایت پیاری ہے کما لا یخفیٰ

مَنْ يَهْتَدِي فِي الْفِعْلِ مَا لَا يَهْتَدِي — فِي الْقَوْلِ حَتّٰى يَفْعَلَ الشُّعَرَاءُ

معنی :- ممدوح ایسا ہے کہ عمل میں اس بات کو پہنچ جاتا ہے جسے شعرا اپنے قول میں نہیں پہنچتے جب تک ممدوح اس کا عامل نہیں ہو لیتا یعنی ممدوح کا ایسا عمل ہوتا ہے کہ شاعر کے خیال میں نہیں آتا جب تک ممدوح سے

دیکھ نہ سکے۔

یہ مدح اچھا شاعرانہ رنگ رکھتی ہے اور قصائد مدحیہ میں ایسی مدح کا پہلو نامطبوع نہیں معلوم ہوتا ہے۔

فِی کُلِّ یَوْمٍ لِلْقَوَافِی جَوْلَۃٌ ﴿﴾ فِی قَلْبِہٖ وَلِاُذْنِہٖ اِصْغَاءٌ

معنی:- ہر روز اس کے دل میں شعرا کے اشعار مدحیہ کی گردش ہے اور وہ انھیں، دل سے سُنتا ہے یعنی ہر روز شعرا اشعار مدحیہ کہہ کر اس کے پاس لے جاتے اور وہ انھیں جی لگا کر سنتا ہے۔

مؤلف کی دانست میں کوئی شخص عام اس سے کہ سلطان یا امیر جب تک مبتلائے بدمذاقی نہ ہوگا ہر روز شاعروں کی مدح سرائیوں کی تکلیف گوارا نہیں کر سکے گا ظاہر ہے کہ شفاف اور صحیح خیال کا آدمی لایعنی تعریفوں سے کیوں محظوظ ہونے لگا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے اہل ثروت بے حد مبتلائے بدمذاقی تھے اور شعرا بھی اپنی ضرورتوں کے باعث بے حد بدمذاق ہو رہے تھے زمانۂ موجودہ بھی مدح طلب اہل ثروت اور مدح گو شعرا سے خالی نہیں ہے ابھی تک ایشیائی درباروں کا یہی رنگ دیکھا جاتا ہے اور اصلاح مذاق کی صورت نظر نہیں آتی ہے۔

وَاِغَارَۃٌ فِیْمَا احْتَوَاہُ کَاَنَّمَا ﴿﴾ فِی کُلِّ بَیْتٍ فَیْلَقٌ شَہْبَاءُ

معنی:- اور جو کچھ اس نے جمع کیا ہے اس میں لوٹ مچی ہوتی ہے گویا ہر شعر ایک لشکر جرار ہے یعنی ممدوح کا خزانہ وقف شعرا ہو رہا ہے ہر شعر مدحیہ

لشکر جرار کی طرح اس کی دولت مخزونہ کو لوٹ رہا ہے :۔
یہ شعر واقعات تاریخی کے خلاف نہیں ہے عہد خلفائے بنی عباس میں درباری شعرا کے ساتھ ایسے ایسے سلوک ہوتے گئے ہیں کہ مرد محصل کو اس کے خیال سے تعجب گذرتا ہے ایک ایک شعر پر شعرا کو لاکھ لاکھ روپے ملے ہیں ۔ یہ اسراف ایشیائی درباروں کے معاملات تمدن و مذہب و اخلاق کی خرابیوں سے پورے طور پر خبر دیتا ہے ۔

مِنْ يَظْلِمِ اللُّؤَمَاءُ فِي تَكْلِيفِهِمْ   أَنْ يُصْبِحُوا وَهُمْ لَهُ الْكَفَاءُ

معنی :۔ ممدوح ایسا ہے کہ لئیموں کو اس امر کی تکلیف دیتا ہے کہ وہ اس کے ہمسر ہو جائیں یعنی ممدوح چاہتا ہے کہ لئیم اس کے سے جواد ہو جائیں۔ یہ خواہش لئیموں کے لئے تکلیف ہے کس واسطے کہ وہ کبھی جواد نہیں ہو سکتے چہ جائے کہ اس کے برابر اور جواد ہو جائیں ۔

وَيُذِيبُهُمْ وَبِهِمْ عَرَفْنَا فَضْلَهُ   وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ

معنی :۔ اور ممدوح ان کو برا کہتا ہے حالانکہ انہیں ، کی بدولت ہم نے اس کی بزرگی پہچانی ہے کس واسطے کہ اضداد ہی سے اشیا کی شناخت ہے یہ شعر اچھا مدحیہ رنگ رکھتا ہے ۔

مَنْ نَفْعُهُ فِي أَنْ يُهَاجَ وَضُرُّهُ   فِي تَرْكِهِ لَوْ تَفْطَنُ الْأَعْدَاءُ

معنی :۔ ممدوح ایسا شخص ہے کہ جسے نفع لڑائی کے برانگیختہ کئے جانے میں اور ضرر جنگ کے ترک میں ہے اگر دشمنوں کو یہ بات معلوم ہو تو کبھی نہ لڑیں اس شعر کا بھی اچھا مدحیہ رنگ ہے ۔

السِّلْمُ يُكْسِرُ مِنْ جَنَاحَيْ مَالِهٖ بِنَوَالِهٖ مَا تَجْبُرُ الْهَيْجَا ءُ

معنی :- پس صلح اس کے جود کے سبب اس کے مال کے دونوں بازو توڑ دیتی ہے مگر اس کی تلافی پھر جنگ کر لیتی ہے یعنی حالت صلح میں وہ اپنا سب مال لٹا دیتا ہے مگر جب پھر لڑائی ہوتی ہے تو مال غنیمت کے دستیاب ہونے سے جو کچھ وہ حالت صلح میں خرچ کر ڈالتا ہے اسے پھر مل جاتا ہے۔

یُعْطِیْ فَتُعْطٰی مِنْ لُهٰی یَدِهِ اللُّهٰی وَتُرٰی بِرُؤْیَتِهٖ الْاٰرَاءُ

معنی :- ممدوح ایسی بخشش کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ کی بخشش سے اور بخشش کرتے ہیں اور اس کی جودت نظر دوسروں کو صواب رائیں سجھاتی ہے

مُتَفَرِّقُ الطَّعْمَیْنِ مُجْتَمِعُ الْقُوٰی فَکَاَنَّهُ السَّرَّاءُ وَالضَّرَّاءُ

معنی :- ممدوح ذات واحد ہو کہ دو متفرق مزے رکھتا ہے یعنی دشمنوں کے حق میں تلخ اور دوستوں کے حق میں شیریں ہے اور مجتمع القویٰ ہے یعنی قوائے جسمانیہ اور قوائے روحانیہ میں اعتدال رکھتا ہے پس گویا ممدوح خود مسرت و مضرت ہو رہا ہے۔

وَکَاَنَّمَا مَا لَاتَشَاءُ عُدَاتُهٗ مُتَمَثِّلًا لِوُفُوْدِهٖ مَا شَاؤُا

معنی :- اور گویا کہ ممدوح اپنے دشمنوں کی خواہش کے تمام تر مخالف ہے حالانکہ اپنے پاس آنے والوں کے لئے وہی صورت بنا رکھی ہے کہ جیسی ان کی خواہش ہے۔

اَیُّهَا الْمُجْدٰی عَلَیْهِ رُوْحُهٗ اِذْ لَیْسَ یَاْتِیْهِ لَهَا اسْتِجْدَاءُ

معنی :۔ اے وہ شخص کہ تجھ پر تیری روح معاف کی گئی ہے اس سبب سے کہ اس کی کوئی مانگ نہیں آئی ہے۔ یعنی ممدوح ایسا شخص ہے کہ اس سے کوئی روح کا طالب نہیں ہوتا ہے ورنہ وہ اپنی روح کو بھی دریغ نہیں رکھتا

فَلْتُزِكَ مَا لَمْ يَاخُذُوا اِعْطَاءُ ُ   اِحْمَدُ عُفَاتَكَ لَا فُجِعْتَ بِفَقْدِهِمْ

معنی :۔ اپنے سائلوں کی مدح کر۔ تجھے ان کے گم ہونے سے دکھ نہ ہو۔ کیونکہ ان کا اس چیز کو نہ لینا جس کے لینے کے وہ طالب نہ ہوئے برائے خود بخشش ہے۔

واضح ہو کہ تجھے ان کے گم ہونے سے دکھ نہ ہو۔ جملہ معترضہ دعائیہ ہے۔ مطلب شعر یہ ہے کہ اگر تجھ سے مانگنے والے تیری روح بھی مانگتے تو دے دیتا مگر چونکہ انھوں نے ایسا نہ کیا تو اپنے ایسے سائلوں کی مدح کر جنھوں نے تجھ سے ایسا مطالبہ نہیں کیا پس ان کا غیر طالب ہونا بھی ان کے واسطے بخشش کا حکم رکھتا ہے یعنی تیری جان ان کی بخشی ہوئی ہے ورنہ تو تو ایسا جواد ہے کہ ان کی طلب پر جان کو بھی عطا کر دیتا اس لئے تجھ کو ان کی مدح کرنا چاہئے کہ تو ان کا ممنون ہو رہا ہے۔

اِلَّا اِذَا شَقِيَتْ بِكَ الْاَحْيَاءُ ُ   لَا تَكْثُرُ الْاَمْوَاتُ كَثْرَةَ قِلَّةٍ

معنی :۔ مقتولوں کی کثرت تیرے عہد میں ایسی نہیں ہوتی کہ جس سے زندوں میں کمی ہو جائے لیکن البتہ اس وقت میں کہ زندوں کو تیری نافرمانی کے باعث شامت آجاتے۔ یعنی تیرے وقت میں بلا ضرورت خونریزی

نہیں ہوتی ہے وہی مارے جاتے ہیں جو اپنی شامت سے تیری مخالفت اختیار کرتے ہیں۔

وَالْقَلْبُ لَا يَنْشَقُّ عَمَّا تَحْتَهُ ۔۔۔ حَتّٰى تَحُلَّ بِهِ لَكَ الشَّحْنَاءُ

معنی :۔ اور کوئی قلب شق نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں تیری دشمنی جگہ نہ کرے واضح ہو کہ یہ سب اشعار بالا خوب صورت انداز مدح رکھتے ہیں اور متنبی کے کمال خلاقی سخن سے خبر دیتے ہیں۔

لَمْ تُسْمَ يَا هٰرُونُ إِلَّا بَعْدَ مَا ۔۔۔ اِقْتَرَعَتْ وَنَازَعَتِ اسْمَكَ الْأَسْمَاءُ

معنی :۔ اے ہارون تیرا نام ہارون نہ رکھا گیا الا یہ کہ ناموں میں منازعت واقع ہونے کے بعد قرعہ ڈالا گیا۔ یعنی اے ہارون تیرا یہ نام تب تجویز پایا جب اور ناموں میں رشک واقع ہونے کے سبب سے لڑائی واقع ہوئی اور اس کا فیصلہ اس طرح پر ظہور میں آیا کہ اور ناموں نے قرعہ ڈالا ہیں از روئے قرعہ اندازی کے تیرا نام ہارون قرار پایا۔

فَغَدَوْتَ وَاسْمُكَ فِيكَ غَيْرُ مُشَارِكٍ ۔۔۔ وَالنَّاسُ فِيمَا فِي يَدَيْكَ سَوَاءُ

معنی :۔ اب تو ایسا ہو گیا ہے کہ اب تیری شہرت کا کوئی شریک نہیں ہے اور جو شے تیرے ہاتھ میں ہے اس میں سب لوگ برابر ہیں یعنی تیری بخشش عام میں سب مساوی ہیں۔

نَعَمْتَ حَتّٰى الْمُدْنُ مِنْكَ مِلَاءٌ ۔۔۔ وَلَعِفْتَ حَتّٰى ذَا الثَّنَاءِ لَفَاءُ

معنی :۔ تو نے وہ بخشش عام کی کہ تمام شہر تیری انعام دہی سے پُر ہو رہا ہے اور تو اس قدر فائق ہو رہا ہے کہ یہ تعریف بے قدر ہے۔ یعنی تیری

عظمت کے آگے یہ تعریف لاشئ ہے۔

وَلَجُدْتَ حَتّٰى كِدْتَ تَبْخَلُ حَائِلًا ‌ ‌ ‌ لِلْمُنْتَهٰى وَمِنَ السُّرُوْرِ بُكَاءُ

معنی:۔ تو نے اس قدر جود کو راہ دی ہے کہ تیرا جود انتہا کو پہنچ گیا ہے جس سے بخل لگا ہوا ہے اور انتہا کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے جیسا کہ سرور کی حد بکا ہوتی ہے یعنی تیری بخشش حد کو پہنچی ہوئی ہے۔

فَالْفَخْرُ عَنْ تَقْصِيْرِهٖ بِكَ نَاكِبٌ ‌ ‌ ‌ وَالْمَجْدُ مِنْ اَنْ يُّسْتَزَادَ بَرَاءُ

معنی:۔ اب فخر تیرے مرتبے تک پہنچنے سے قاصر ہے اور بزرگی تیرا درجہ بڑھانے سے بری ہے۔ یعنی تیرا مرتبہ ایسا بلند ہو گیا ہے کہ فخر و عظمت کو وہاں تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

فَاِذَا سُئِلْتَ فَلَا لِاَنَّكَ مُحْوِجٌ ‌ ‌ ‌ وَاِذَا كُتِمْتَ وَشَتْ بِكَ الْاٰلَاءُ

معنی:۔ اور جب تو سوال کیا جاتا ہے تو اس سبب سے نہیں کہ تو نے لوگوں کو سوال کا محتاج کر دیا ہے۔ اور جب تو چھپ رہتا ہے تو تیری بخشش تجھے ظاہر کر دیتی ہے۔

وَاِذَا مُدِحْتَ فَلَا لِتَكْسِبَ رِفْعَةً ‌ ‌ ‌ لِلشَّاكِرِيْنَ عَلَى الْاِلٰهِ ثَنَاءُ

معنی:۔ اور جب تو مدح کیا جاتا ہے تو اس واسطے نہیں کہ مدح سے تجھے رفعت حاصل ہو شکر گزاروں پر خدا کی ثنا واجب ہے۔ یعنی لوگ جو تیری مدح کرتے ہیں تو اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ مدح گوئی سے تجھے رفعت حاصل ہوتی ہے بلکہ مداحین کا فرض منصبی ہے کہ تیری مدح کریں اسی طرح جیسا کہ شاکروں کی شکر گزاری سے خدائے تعالیٰ کو کوئی کمال حاصل نہیں

بلکہ یہ شاکرین کے لئے ایک امر واجب ہے کہ شکر خداوندی بجا لائیں۔

وَاِذَا مُطِرَتْ فَلَا لِاَنَّكَ مُجْدِبٌ   يُسْقَى الْخَصِيْبُ وَتُمْطَرُ الدَّامَاءُ

معنی:۔ اور جب تجھ پہ بارش ہوتی ہے تو اس سبب سے نہیں تو خشک سالی لانے والا ہے بلکہ شاداب زمین سیراب کی جاتی ہے اور دریا پر مینہ برسایا جاتا ہے

لَمْ تَحْكِ نَائِلَكَ السَّحَابُ وَاِنَّمَا   حُمَّتْ بِهٖ فَصَبِيْبُهَا الرُّحَضَاءُ

معنی:۔ تیری بخشش کو سحاب پہنچ نہیں سکتا مگر بات یہ ہے کہ اسے گرمی رشک سے بخار آگیا ہے اور یہ ریزش اسی بخار کا پسینہ ہے۔

واضح ہو کہ ہر چند ہر دو شعر بالا سے متنبی کی خلاقی سخن ہویدا ہے مگر ایسے شعروں سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اس شاعر نے ایسا بُرا زمانہ پایا تھا کہ جس وقت اس وضع کی مبالغہ پردازیوں سے جبابرہ وقت خوش ہوتے تھے معیوب سمجھے جانے کے عوض ایسی شاعری مقتدر جانی جاتی تھی ان اشعار کا رنگ جیسا غیر فطرتی ہے محتاج بیان نہیں ہے طبیعت کو تنفر ہوتا ہے اور متنبی کی قابلیت کے استعمال بد پر افسوس آتا ہے۔

لَمْ تَلْقَ هٰذَا الْوَجْهَ شَمْسُ نَهَارِنَا   اِلَّا بِوَجْهٍ لَيْسَ فِيْهِ حَيَاءُ

معنی:۔ آفتاب ممدوح کے روئے روشن کے سامنے نہیں ہوتا ہے الا ایک ایسے منہ کو لے کر کہ جس میں کچھ حیا نہیں ہے۔

یہ ایک معمولی رنگ مبالغہ پردازی کا ہے اس میں کوئی بڑی جدت نہیں ہے

فَبِاَيِّمَا قَدَمٍ سَعَيْتَ اِلَى الْعُلٰى   اَدَمُ الْهِلَالِ لِاَخْمَصَيْكَ حِذَاءُ

معنی:۔ اے ممدوح تو کن قدموں سے رفعت کو پہنچا ہے ماہ نو کی کھال تیرے تلوں کی جوتی ہو رہی ہے۔

وَلَكَ الزَّمَانُ مِنَ الزَّمَانِ وِقَايَةٌ ... وَلَكَ الحِمَامُ مِنَ الحِمَامِ فِدَاءُ

معنی:۔ زمانہ ہی حوادث زمانہ سے تیری سپر ہو۔ اور موت ہی تیری موت کا فدیہ یعنی تو جمیع حوادث زمانہ سے مامون رہے اور تجھے کبھی موت نہ آئے

لَوْ لَمْ تَكُنْ مِنْ ذَا الوَرَى اللَّذْ مِنْكَ هُوْ ... عَقِمَتْ بِمَوْلِدِ نَسْلِهَا حَوَّاءُ

معنی:۔ اگر تیری خلقت بنی آدم میں نہ ہوتی تو حوّا بانجھ ہوتی اور اس سے کوئی نسل ظہور میں نہ آتی۔

یہاں متنبی نے مبالغہ پردازی کا خاتمہ کر دیا ہے اپنے ممدوح کی نسبت وہ کہتا ہے کہ اس کا ممدوح ہی اجرائے نسل آدمؑ کا سبب ہوا ہے اگر اس کی خلقت نہ ہوتی تو حوّاؑ کے بطن سے نہ کوئی پیدا ہوتا اور نہ نسل آدم جاری ہوتی۔ مختصر یہ ہے کہ متنبی کے باعث ہوا ہے یعنی اگر منشی ہارون پیدا نہ ہوتے تو نوحؑ شیثؑ ادریسؑ ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اسحٰقؑ یعقوبؑ یوسفؑ موسیٰؑ زکریاؑ یحییٰؑ عیسیٰؑ محمدؐ علیؑ حضرات ائمہؑ وجمیع انبیاء واولیا وجمیع اہل کمال اور جس کے نوکر ممدوح متنبی تھے وغیرہ وغیرہ پیدا نہ ہوتے اگر یہ شعر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی شاعر کہتا تو حسب عقیدہ ہم غلامان محمدؐ کے نہایت مناسب تھا مگر کاتب ہارون کے لئے یہ شعر جس قدر نازیبا ہے محتاج بیان نہیں ہے ملا کاشی نے اپنے ہفت بند میں مولائے دو عالم کی شان میں اسی مضمون کا شعر لکھا

ہے اور وہ یہ شعر ہے

گر نبودے ذات پاکت آفرینش را سبب　　تا ابد حوا استر ون بودی و آدم عذب

مولا کی شان میں یہ شعر نازیبا نہیں ہے کس واسطے کہ بقول پاک حضرت رسول مقبول مولا کو درجۂ عینیت حاصل ہے چنانچہ لحمک لحمی ودمک دمی ونفسک نفسی وروحک روحی وانا وعلی من نور واحد یہ سب ایسے اقوال ہیں جن سے عینیت بخوبی ثابت ہوتی ہے پس جب ایسی مدح سرورکائنات کو زیبا ہے تو مولائے دو عالم کو بھی ایسی مدح کا استحقاق حاصل ہے حضرات ناظرین اس شعر سے تجویز فرمائیں کہ کسقدر شعرائے درباری نے روٹی کے لئے اپنے فن شریف کو ذلیل کر رکھا تھا اپنے ممدوحین کی ستائشیں ایسی بیباکی سے کرتے ہیں کہ ان کو خدا و رسول کسی کی عظمت کا خیال باقی نہیں رہتا ہے۔ متنبی کے سے شعرا کے کلاموں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ممدوحین ان کے اقوال کے رو سے بلاشبہ خدا اور رسول کے ہم پایہ تھے ان کے ممدوحین آفتاب ماہتاب کواکب بروج ہوا ابر برق باراں قضا و قدر سب پر اختیار رکھتے تھے ایسی مدح سرائیوں سے مادح اور ممدوح دونوں کی بدمذاقیاں آشکارا ہیں بلاشبہ ایسی شاعروں سے فن شاعری نے بڑا داغ پایا ہے جن سلاطین و امرا نے ایسی شاعریوں کی اعانت کی ہے وہ درحقیقت فن شاعری کے بڑے دشمن تھے۔ افسوس ہے کہ عربی فارسی اور اردو زبان کی شاعریاں انھیں مدح سرائیوں کی بدولت نہایت ذلیل وحقیر ہو رہی ہیں جس طرح متنبی اور دیگر درباری

شعرائے عرب کی بدولت عربی کی شاعری بدنما ہورہی ہے اسی طرح فارسی کی شاعری قاآنی وغیرہ اور اردو کی شاعری ذوق وغیرہ کے باعث خراب وخستہ ہورہی ہے لیکن اگر چشم انصاف سے دیکھئے تو یہ سب شعرا خود ان سب زبانوں کی شاعریوں کے مخرّب نہیں ہوئے ہیں بلکہ سلاطین کی بدمذاقیاں ان کے مخرب فن شاعری ہونے کی وجہ پڑی ہیں واضح ہو کہ منتخبات بالابعثت آنحضرت صلعم کے قبل اور بعد کی شاعریوں کے نمونے ہیں راقم دونوں کا فرق بیان کرچکا ہے اب اس کے اعادے کی حاجت نہیں مگر ظہور اسلام کے ساتھ جو تہذیب اور تعلیمی مذاق کی شاعری نے جادہ گری دکھلائی اس کی مثال میں کچھ اشعار جناب **امیرالمومنین علی علیہ السلام** کے درج کئے جاتے ہیں ان اشعار کے انداز سے معلوم ہوگا کہ اسلامی شاعری کیا ہے اور معاملات بنی آدم کی اصلاح ایسے اشعار سے کس قدر ہوسکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام کا کلام کلام الامیر امیرالکلام کا مصداق ہے ہر طالب حق کا فرض منصبی ہے کہ آپ کے منظوم وغیر منظوم کلاموں کو بالاستیعاب ملاحظہ کرے اور کچھ نہ ہو تو دیوان حضرت کو ضرور پڑھ ڈالے ظاہرا یہ دیوان بہت کچھ قومی توجہ کے قابل معلوم ہوتا ہے مگر تعجب ہے کہ ہندوستان کے بہتیرے مسلمان ایسے ہیں کہ اس سے ناواقف ہیں یا اس کی طرف توجہ نہیں کرتے ظاہر ہے کہ یہ دیوان ایک بڑے شخص کا ہے وہ شخص نہ صرف مذہبی پہلو سے بڑا مانا جاتا ہے بلکہ ہر ملت ومذہب کا غیر

متعصب آدمی اسے نظر عظمت سے دیکھتا ہے قبل اس کے کہ کچھ اشعار دیوان پاک سے حضرت کے اندراج ہذا کئے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بمصداق ذِکرُ عَلِیٍّ عِبَادَۃٌ حضرت کے ذکر خیر سے راقم اور ناظرین ثواب اندوز عقبیٰ ہوں

علیؑ بن ابی طالب ۔ نام پاک آپ کا علیؑ ہے اور کنیت ابو الحسن اور بھی ابو تراب ہے آپ کے والد بزرگوار کا نام حضرت ابو طالبؑ ہے اس لئے آپ کو علی بن ابی طالب کہتے ہیں۔ ابو طالبؑ پیغمبر خدا کے حقیقی چچا تھے پیدائش آپ کی ۲۳ برس ہجرت کے قبل ظہور میں آئی اور شہادت ۴۰ھ ہجری میں بمقام کوفہ بدست عبدالرحمن بن ملجم واقع ہوئی وقت شہادت سن شریف آپ کا ۶۳ برس کا تھا آپ باپ اور ماں دونوں طرف سے بنی ہاشم تھے کسواسطے کہ ماں آپ کی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم ہیں آپ کے فضائل و محامد ذیل میں محض مختصر طور پر حصول سعادت کی نظر سے عرض کئے جاتے ہیں۔

۱۔ آپ پیغمبر خدا صلعم کے محسن زادے ہیں اس لئے کہ حضرت رسولؐ خدا یتیم تھے حضرت ابو طالبؑ نے حضرت صلعم کو پالا اور بے پدری کے غم کو آپ کے دل مبارک میں آنے نہ دیا جب تک زندہ رہے حضرت صلعم کے جان و دل سے معین و مددگار رہے اور کفار قریش مکہ کے دلوں کو روکتے رہے (دیکھو کتب تاریخ) اور اپنے عرصہ حیات تک

پیغمبر خدا صلعم پر کسی طرح کا آسیب آنے نہ دیا۔
۲۔ حسب و نسب میں رسول خدا کے ہمسر تھے آپس کا رشتہ مرہون محتاج بیان نہیں ہے۔
۳۔ رسول اللہ صلعم آپ کو اپنا جان و تن سمجھتے تھے جیسا کہ فرمودہ آن حضرت صلعم کا ہے لَحْمُكَ لَحْمِي وَدَمُكَ دَمِي وَنَفْسُكَ نَفْسِي وَرُوحُكَ رُوحِي ہے۔
گر لحمک لحمی یہ حدیث نبوی ہے ۔۔۔ بے صل علیٰ نام علیؑ بے ادبی ہے
۴۔ حسب ارشاد نبوی یعنی اَنَا وَعَلِیٌّ مِنْ نُورٍ وَاحِدٍ رسول اللہ صلعم کی خلقت اور آپ کی خلقت نور واحد سے تھی۔
۵۔ آپ داماد پیغمبر صلعم کے تھے اور داماد بھی کیسے کہ حضرت خیر النسا جناب فاطمۃ الزہرا کے شوہر۔
۶۔ آپ داخل آل عبا ہیں یعنی ان سے ہیں جو رسول اللہ صلعم کے کمل میں حکم رسول اللہ صلعم سے در آئے تھے اور رسول صلعم نے ان کو کمل میں لے کر آیت تطہیر یعنی اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا پڑھی تھی۔
۷۔ آپ یکے از اہلبیت نبوی صلعم ہیں خدائے تعالیٰ آپ کو اور آپ کی بی بی کو اور آپ کے دونوں بیٹوں کو لفظ اہلبیت کے ساتھ خطاب کرتا ہے جیسا کہ آیت مذکورہ میں واقع ہے۔
۸۔ آپ یکے از پنجتن پاک ہیں پنجتن پاک عبارت ہے حضرت رسول

اللہ صلعم جناب علی مرتضیٰ، فاطمۃ الزہرا اور حسن و حسین علیہم الصلوٰۃ و السلام سے پنجتن پاک کا مضمون خود آیت تطہیر سے ثابت ہوتا ہے

۹۔ آپ یکے از چہاردہ معصوم ہیں چہاردہ معصوم عبارت جناب پیغمبر خدا و خاتون جنت یعنی جناب فاطمۃ الزہرا اور دوازدہ امام سے۔ معصوم عبارت ہے ایسے شخص سے کہ گناہ کبیرہ و صغیرہ سب سے پاک ہو۔ پس جس طرح پیغمبر خدا صلعم معصوم ہیں اسی طرح حضرت خاتون جنت اور بقیہ حضرات ائمہ اثنا عشر معصوم ہیں۔ راقم کا مذہب یہی ہے کہ یہ چہاردہ تن صغائر کبائر سے تمام تر پاک ہیں لیکن غیر امامیہ سوا رسول اللہ صلعم کے کسی کو معصوم نہیں جانتے۔

۱۰۔ آپ اول خیل ائمہ ہیں۔ واضح ہو کہ خاندان پیغمبر کے امام بارہ حضرات ہیں اول ان سے امام علی مرتضیٰ دوم امام حسن مجتبیٰ سوم امام حسین شہید کربلا چہارم امام سید الساجدین زین العابدین حضرت سجاد پنجم امام باقر ششم امام جعفر صادق ہفتم امام موسیٰ کاظم ہشتم امام علی رضا نہم امام محمد تقی دہم امام علی نقی یازدہم امام حسن عسکری دوازدہم امام مہدی صاحب الزمان علیہم الصلوٰۃ والسلام الیٰ یوم القیام یہ ائمہ معصومین جانشین رسول اللہ ہیں اور بسبب وفور علم اور وہبی کمالات کے دین محمدی کے فروغ دینے والے گزرے ہیں جتنے سادات ہیں انھیں حضرات سے تعلق نسبی رکھتے ہیں اور بقول قطبیہ ایک وقت ہیں سادات انھیں حضرات

کے طریقہ کے پابند تھے ان جگر گوشگان رسول اللہ کے فضایل شمار
سے بیروں ہیں دوست داران خاندان محمدؐ ان پر درود سلام بھیجیں،
یہاں پر ایک درود درج ہذا کیا جاتا ہے جو ان حضرات ائمہ کے ذکر پر
مشتمل ہے اور وہ یہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّکَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا
مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدِ بْنِ الَّذِیْ کَانَ
عَلِیًّا فِیْ دَرَجَاتِہٖ حَسَنًا فِیْ صِفَاتِہٖ شَہِیْدًا فِیْ تَجَلِّیَاتِہٖ
زَیْنَ الْعَابِدِیْنَ بَاقِرَ عِلْمِ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ صَادِقًا فِیْ اَقْوَالِہٖ
مُتَمَسِّکًا فِیْ جَمِیْعِ اَحْوَالِہٖ مُتَمَکِّنًا فِیْ مَقَامِ الرِّضَا جَوَادًا کَفَّہٗ عِنْدَ
الْعَطَا ھَادِیًا اِلٰی سَبِیْلِ النَّجَاتِ عَسْکَرِیًّا مَعَ الْغُزَاۃِ مَھْدِیًّا
اِلٰی طَرِیْقِ الْیَقِیْنِ صَلٰوۃُ اللّٰہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْنَ۔

۱۱۔ آپ آیت مباہلہ نَدْعُ اَبْنَائَنَا وَاَبْنَائَکُمْ کے رو سے بھی داخل
اہلبیت ہیں مسلم سعد ابن ابی وقاص سے روایت کرتے ہیں کہ جب
یہ آیت مباہلہ نازل ہوئی تب رسول اللہ نے علی و فاطمہ و حسن و
حسین کو بلایا اور فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِی۔

۱۲۔ آپ رسول اللہ صلعم کے نزدیک سب لوگوں سے احب
تھے جیسا کہ حدیث طیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور
امام حاکم نے روایت کیا ہے اور وہ حدیث یہ ہے کہ ایک روز
جناب رسول خدا صلعم کے آگے ایک مرغ بریان رکھا ہوا تھا اور

آپ دعا مانگتے رہے تھے کہ "الٰہی اس شخص کو بھیج دے کہ ساری خلقت سے جو تیرا زیادہ محبوب ہے تاکہ وہ میرے ساتھ اس طیر کو تناول کرے" انس بن مالک جو اس حدیث کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ میں خدا سے دعا مانگتا تھا کہ ایسا شخص میری قوم انصار سے ہو مگر کچھ دیر نہ گزری تھی کہ حضرت علیؑ آئے اور آپ نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ اس طیر کو تناول فرمایا۔

۱۳۔ آپ رسول اللہ صلعم کے لئے مثل ہارون کے تھے جیسا کہ حدیث اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اس پر دال ہے۔

۱۴۔ آپ رسول اللہ صلعم کے بھائی دین و دنیا میں ہیں کما قال رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ۔

۱۵۔ آپ کو رسول اللہ صلعم کے ساتھ درجۂ عینیت حاصل ہے چنانچہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ اِنَّ عَلِیًّا مِنِّیْ وَاَنَا مِنْهُ وَهُوَ وَلِیُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ اس حدیث کو عمران بن حصین سے ترمذی نے روایت کیا ہے علاوہ اس کے حدیث نور و حدیث لحمک لحمی وغیرہ سے بھی آپ کی عینیت رسول اللہ صلعم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔

۱۶۔ آپ جمیع مومنین کے ولی و مولیٰ یعنی آقا ہیں اس قول کی مثبت حدیث بالا اور حدیث خم غدیر مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ ہیں ضرورت مذہبی سے جن صاحبوں نے ولی و مولیٰ کا معنی دوست محب اور ناصر قرار دیا ہے اور علی مرتضیٰ کے آقائے جمیع مومنین ہونے

سے چشم پوشی کی ہے ان لوگوں نے در حقیقت رسول اللہ صلعم کے
آقائے مومنین ہونے سے درپردہ انکار کیا ہے کس واسطے کہ ان حدیثوں
سے جو نسبت علی کو ساتھ رسول خدا صلعم کے پیدا ہے وہ ایسی ہے
کہ محض یگانگی سے خبر دیتی ہے ایسی صورت میں ضرور ہے کہ جو مرتبہ
رسول اللہ صلعم کا جمیع مومنین و مسلمین سمجھیں اپنے مقابلے میں وہی مرتبہ
علی مرتضیٰؑ کا بھی مانیں ان حدیثوں کی بنیاد پر کبھی ایسا قیاس نہیں کیا
جا سکتا ہے کہ پیغمبر خدا کا آقائے مومنین ہونا تو مانا جائے مگر علیؑ مجرد
دوست محب اور ناصر سمجھے جائیں زینہار ان حدیثوں میں لفظ مولیٰ
یا ولی اس طور پہ نہیں استعمال کیا گیا ہے۔ کہ پیغمبر صاحب کی نسبت
کے ساتھ تو آقائے مومنین کے معنی پیدا کرے اور حضرت علیؑ کی طرف
جب منسوب کیا جائے تو اس کے معنی ناصر محب اور دوست سمجھے
جائیں۔ ان دونوں حدیثوں کے الفاظ نہ مغلق ہیں اور نہ ترکیب دشوار
ہے فہم معمولی کے خلاف بھی کوئی امر نہیں ہے اس پر بھی اگر ناحق کے
جھگڑے پیدا کئے جائیں تو یہ مقدرات کی بات ہے واقعی محبت علیؑ
بھی ایک امر منجانب اللہ ہے جس کو چاہے خدائے تعالیٰ عطا فرمائے سہ

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۱۷۔ آپ رسول اللہ صلعم کی جانب سے ادائے حق کرنے کے تمام
تر سزاوار تھے اس قول کی مثبت یہ حدیث یعنی عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْ
عَلِیٍّ وَلَا یُؤَدِّیْ عَنِّیْ اِلَّا اَنَا اَوْ عَلِیٌّ راوی اس حدیث کے حبش بن

جنا وہ ہیں۔ معنی اس حدیث کے یہ ہیں کہ علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ
سے ہوں اور نہیں کوئی حق ادا کرے گا میری طرف سے مگر میں۔ یا علیؑ
س حدیث کا قصہ نقض عہد مشرکین مکہ سے متعلق ہے یہاں اس کے
عادے کی گنجائش نہیں ہے شائقین تحقیق خود دریافت حقیقت فرما کر
اسے قائم کر لیں۔

۱۸۔ آپ کی پیدائش کعبے میں ہوئی اور شہادت مسجد میں۔
کعبے میں حیات اور مسجد میں ممات   جو کچھ پایا خدا کے گھر سے پایا

۱۹۔ آپ بہ اسباب ظاہر سب سے اوّل اسلام قبول کرنے والے
ں اس لئے ارشاد فرماتے ہیں سے سَبَقْتُكُمْ اِلَى الْاِسْلَامِ طُرًّا ؛ غُلَامًا
بَالِغْتُ اَوَانَ حُلُمِی ؛ لفظ طُرًّا قابل لحاظ ہے جس سے معلوم ہوتا
ہے کہ سب سے پہلے آپ نے اسلام قبول فرمایا تھا۔ یہ تو عالم اسباب
کی بات ہے ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ جب آپ اور رسول خدا صلعم
نور واحد سے ہیں تو کسی وقت میں آپ کی طرف شرک و کفر کی
نسبت نہیں کی جاتی ہے۔

۲۰۔ آپ بڑے صاحب علم و حکمت تھے اس قول کی مثبت حدیث
اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا ہے راوی اس کے ترمذی ہیں یہ حدیث
اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ کے لفظوں کے ساتھ بھی مشہور ہے آپ کے اقوال
خطبات اشعار اجتہادات وغیرہ وغیرہ بڑی علمی حیثیت سے خبر
دیتے ہیں۔

۲۱۔ آپ بڑے عالم قرآن تھے جیسا کہ امام کو ہونا چاہئے۔

۲۲۔ آپ کو اور قرآن کو رسول اللہ صلعم نے ساتھ ساتھ یاد فرمایا ہے جیسا کہ فرمودہ آنحضرتؐ کا ہے اَلْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ وَّعَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰن

۲۳۔ آپ قرآن ناطق تھے جیسا کہ خود فرمودہ امیر المومنین علیہ السلام کا ہے آپ کو غیر صادق القول وہی سمجھے گا جو گمراہ ازلی ہوگا۔

۲۴۔ آپ عترت رسول اللہ صلعم میں داخل ہونے کے باعث عظمت میں کتاب اللہ کے برابر ہیں رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں یَا اَیُّھَا النَّاسُ انی ترکت فیکم ما ان اخذتم بہ لن تضلوا کتاب اللہ وعترتی واھل بیتی عترتی اور اہل بیتی شئی واحد ہے اور مراد اس سے علیؑ فاطمہؑ حسنؑ اور حسینؑ ہیں جن صاحب نے عترتی اور اہل بیتی سے اخذ سنت مراد لیا ہے عجب حیرت انگیز بات ہے اس قدر عترت اور اہلبیت مصطفیٰؐ سے فرار کیا تھی

۲۵۔ آپ حیرت انگیز قوت قضا رکھتے تھے جیسا کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ اقضاکم علیؑ اور واقعی آپ کے فیصلے ایسے ہوتے تھے کہ اہل عرب تعجب کی آنکھ سے دیکھتے تھے آپ کے بعد لوگ یہ کہا کرتے تھے قَضِیَّۃٌ وَّلَا اَبَا حَسَنٍ لَّھَا یعنی کہ مقدمہ ہے مگر علی نہیں جو فیصلہ کریں۔

۲۶۔ آپ نہایت حلیم کریم رحیم متعبد نفس کش حیادار باذل سخی ذی جود شجاع سیر چشم قانع پاکباز منکسر حق گو حق جو خدا ترس مردم شناس علم دان علم پرور علم دوست صابر شاکر جفاکش صاحب ریاضت خوش جمال خوش خصال خوش خیال صادق المقال با استقلال فہیم ذکی متین

اور آخر بین تھے محامد اور مناقب آپ کے ایسے نہیں کہ احاطۂ تحریر میں آسکیں
ع کس را چہ زہرہ وزہرہ کہ وصف علیؓ کند ؛ اس ناچیز نے مجرد عبادت
سمجھ کہ اس قدر قلم فرسائی کی ہے ورنہ اس سے شمار اوصاف گرامی مقصود
نہیں ہے۔

۲۷۔ آپ کی محبت مومنین پر فرض ہے آپ کا مخالف مومن نہیں ہو سکتا رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں لَا یُحِبُّ عَلِیًّا مُنَافِقٌ وَّلَا یُبْغِضُہٗ مُؤْمِنٌ اس حدیث کو ام سلمہ سے ترمذی روایت کرتی ہیں جاننا چاہیئے کہ محبت علیؓ عین ایمان ہے مگر اس حدیث کی تعمیل کس قدر مفقود نظر آتی ہے۔

۲۸۔ آپ کی شان میں آیات قرآنی بہت ہیں بعض ان میں سے ذیل میں زیب رقم ہوتی ہیں۔

(۱) اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللہ ورسولہ۔ یہ آیت جناب علیؑ مرتضیٰ کے تصدق خاتم سے متعلق ہے۔ ناسخ فرماتے ہیں ؎

انگشتر اپنی دے کے سلیماں کر دیا ‌ ‌ ‌ طاعت میں بھی سوال سنا گر فقیر کا

(۲) یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وکونو مع الصّادقین مراد صادقین سے علی مرتضیٰ علیہ السلام ہیں بسند تفسیر امام ثعلبی وغیرہ۔

(۳) والذین امنوا باللہ ورسولہ اولئک ھم الصدیقون الخ
یہ آیت حضرت علی علیہ السلام وجعفر طیار وحضرت امیر حمزہ علیہما السلام کے حق میں نازل ہوئی ہے اس آیت میں خدائے تعالیٰ ان حضرات کو صدیق اور شہید کے خطابوں سے یاد فرماتا ہے (دیکھو مسند امام حنبلؒ

وتفسیر ثعلبی وغیرہ)

(۴) ویتلوہ شاہد منہ الخ ۔ یہ آیت جناب علی مرتضیٰؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے جمیع علما اس کے شان نزول میں موافق ہیں ملا محتشم کاشی فرماتے ہیں ۔ ؎

مقصد تنزیل بلغ مظہر اسرار غیب ۔ مطلع یتلوہ شاہد مقطع حبل المتین

(۵) ولکل قوم ھاد ۔ حافظ ابونعیم حضرت عبداللہ ابن عباس امام ثعلبی وغیرہ اس آیت کی شان نزول کو بالاتفاق جناب علی مرتضیٰؑ کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔

علاوہ آیات بالا کے مشہور آیات آیت تطہیر و آیت مباہلہ و آیت یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک الخ و آیت الیوم اکملت لکم دینکم و آیت یوفون بالنذر ہیں ملا محتشم فرماتے ہیں ۔

صاحب یوفون بالنذر آفتاب انما ۔ قرۃ العین لعمرک نازش روح الامین ۔

۲۹ ۔ آپ حدود اللہ میں نفسانیت کو دخل نہیں دیتے تھے بلکہ جہاں نفسانیت کا خوف دیکھتے تھے وہاں ایسی کارروائی فرماجاتے تھے کہ جس میں نفس کی شرکت کی صورت باقی نہیں رہتی تھی چنانچہ ایک بار کا یہ ماجرا ہے کہ حضرت ایک کافر قوی پنجہ سے مقابل ہوتے اور اسے بڑی زور آزمائی کے بعد زیر کیا جب چاہا کہ اسے فی النار کریں اس نے روئے مبارک پر تھوک دیا حضرت فوراً اس کے سینے سے اتر پڑے اس عجب خیز کارروائی کو دیکھ کر اس کافر نے پوچھا کہ یا علیؑ اس محنت و مشقت

سے آپ نے ہم کونہ بر کیا اور جب وقت میرے مار ڈالنے کا آیا تو مجھے چھوڑ کر کیوں علٰحدہ ہو گئے حضرت نے فرمایا کہ میں تجھے خدا کے حکم کے مطابق مارنا چاہتا تھا کچھ اپنے نفس کی خاطر نہیں مگر تو نے جو مجھ پر تھوک دیا تو اب میرا تجھے مار ڈالنا شرکت نفس کے ساتھ ہوتا اس لئے میں علٰحدہ ہو گیا اور تجھے قتل نہیں کیا وہ کافر اس تقریر پُر تاثیر کو سن کر ایمان لایا۔ مولانا رومؒ اسی قصے کے متعلق فرماتے ہیں ؎

او خیو انداخت بر روے علیؑ ، افتخار ہر نبی و ہر ولی

۳۰۔ آپ کو درجہ شہادت بھی حاصل ہوا برائے خود یہ بڑا درجہ ہے۔ آپ کی شہادت شہر کوفہ میں واقع ہوئی عبدالرحمٰن بن ملجم شوہر قطامہ آپ کا قاتل ہے آپ کی رحیمی اور کریمی ایسی تھی کہ آپ نے اپنے قاتل سے بھی اپنے خلقی رحم و کرم کو باز نہ رکھا۔

۳۱۔ آپ کسب حلال کی نظر سے مزدوری کرتے تھے اجرت پر کنوئیں سے پانی نکالتے تھے۔

۳۲۔ آپ کی غذا محض سادی تھی بیشتر جَو کی روٹی کھاتے تھے اور وہ بھی اسی قدر کہ تن میں جان باقی رہے لباس کا بھی یہی طور تھا کہ تکلف سے تمام تر بری تھا۔

۳۳۔ آپ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر مقدم جانتے تھے۔ اور کبھی رد سوال نہیں فرماتے تھے چنانچہ ایک بار آپ نے نذر کے تین روزے رکھے شریک روزہ داری اپنے ہی گھر والے تھے۔ یعنی حضرت

بی بی دونوں صاجزادے اور فضہ کنیز۔ نقد و جنس سے پاس میں کچھ نہ تھا اس لئے سامان افطار کے خیال سے امیر المومنین کچھ گیہوں شمعون یہودی کے پاس سے قرض لے آئے روزہ داروں نے کوٹ پیس کر روٹیاں پکائیں شام کو جب حضرت روزہ داروں کے ساتھ افطار کو بیٹھے افطار فرمایا بھی نہ تھا کہ ایک سائل نمودار ہوا اور اس نے سوال کیا حضرت نے جو کائنات افطاری کی شکل میں آ گئے موجود تھی سائل کو دے ڈالی اور خود اور گھر والے سب کے سب پانی سے افطار کر کے سو رہے دوسرے اور تیسرے دن پھر یہی صورتیں ہوتی گئیں اللہ اکبر یہ سخاوت یہ جود یہ بذل یہ کرم کہیں دنیا میں دیکھا جاتا ہے اسی روزہ نذر کی نسبت خدائے تعالیٰ نے قرآن میں آیت یوفون بالنذر کے ساتھ یاد فرمایا ہے۔

۳۴۔ آپ صاحب عرفان کامل تھے اور خدا کا یقین ایسا رکھتے تھے کہ اس سے زیادہ یقین کا امکان دشوار ہے جیسا کہ خود فرماتے ہیں کہ کُشِفَ الغِطَاءُ لَمَا ازْدَدْتُ یقیناً یعنی اگر اٹھ جاتا پردہ تو میرا یقین نہ بڑھتا۔ آپ کی خدا شناسی کا کیا درجہ تھا کیا کوئی بتا سکتا ہے؟

۳۵۔ آپ دنیا کو محض بے حقیقت جانتے تھے یہ بات آپ کے ہر قول و فعل سے ظاہر ہوتی تھی اسباب دنیا سے آپ کے پاس کچھ نہ تھا آپ نانِ جویں کھاتے تھے اور موٹے کپڑے پہنتے تھے اور اکثر زمین پر بیٹھے یاد الٰہی میں مشغول رہتے تھے اس لئے آپ کو لوگ ابو تراب کہتے تھے آپ کا زہد و فقر بہت دشوار رنگ کا تھا باتیں بھی جو کہتے تھے نمنائے

دینوی سے بے لگاؤ ہوتی تھیں ۔ ایک نقل اس جگہ لکھ دی جاتی ہے جس سے آپ کی اوقات بسری کا اندازہ معلوم ہو سکتا ہے آپ کی ایک دن کی سرگزشت یہ ہے کہ آپ مسجد مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور صوم سے تھے ایک مسافر آگیا وقت افطار آپ نے اسے اپنی جو کی روٹی سے جو آدھی تھی نصف اس کا اسے دیا اس نے دیکھا کہ اتنی روٹی سے بھوک نہ جائے گی اس جگہ چلا گیا جہاں امام حسن اور امام حسین علیہما السلام مسکینوں کو طعام تقسیم فرما رہے تھے صاحبزادوں نے اسے ایک آدمی کا حصہ مرحمت فرمایا وہ ایک حصہ لے کر دوسرے حصے کا بھی طالب ہوا شاہزادوں نے فرمایا تو ایک آدمی ہے دو آدمی کے حصے لے کر کیا کرے گا اس نے کہا ایک مسکین اور بھی مسجد میں اترا ہوا ہے جس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے اس کے پاس صرف آدھی نان جوین تھی کہ اس میں سے اس نے آدھی ہمیں دے ڈالی ہے میں اسی کے واسطے ایک حصہ لنگر خانے سے لے جانا چاہتا تھا شہزادوں نے پوچھا اس شخص کی صورت بتا جب اس نے حسب ارشاد صاحبزادگان نے صورت بتائی تو صاحبزادوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ وہ شخص کوئی مسکین نہیں ہے وہ ہمارا باپ علیؓ ہے جو مولائے کونین ہے اللہ اکبر یہ عجیب قصہ ہے واقعی شان مرتضویٰ وہم و قیاس سے بہت باہر ہے اللھم صل علی محمد و آل محمد ۔

۲۳۶ ۔ آپ اپنے حق کے رد سے ویسے ہی سید ہیں جیسے پیغمبر خدا صلعم

سید ہیں اسی لئے آپ کی اولاد جو بطن حضرت سیدہ علیہا السلام سے
نہیں ہے وہ بھی سید کہلاتی ہے وہ سادات جو غیر بنی فاطمہ ہیں انہیں
سادات علوی کہتے ہیں واضح ہو کہ خلعت سیادت دربار خداوندی
سے پنجتن پاک کو مرحمت ہوا ہے حضرت سیدہؓ سید زادی ہونے
کے سبب سے سیدہ نہیں ہیں بلکہ اپنے حق کے رو سے سیدہ ہیں اسی
طرح حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام اپنے
اپنے حق کے رو سے سید ہیں۔ جاننا چاہئے کہ سیادت بڑی نعمت
ہے اس سے بڑھ کر دینی نعمت دوسری کوئی نہیں ہے حضرات سادات
جو اس زمانے میں موجود ہیں ان پہ فرض ہے کہ اس نعمت کی قدر کریں
اپنے آبائی طریقے کے پابند رہیں اپنے اجداد کرام یعنی ائمہ معصومین
علیہم الصلوۃ والسلام کے پورے پیرو رہیں اپنے نسب ناموں
ضائع ہونے سے بچائیں طمع دنیاوی میں مبتلا ہو کر اپنی نسل پاک
خراب نہ کر ڈالیں۔ راقم کو اپنی ایک جواری قوم پہ نہایت افسوس
آتا ہے کہ اس نے اپنے خاندان سیادت کے شرف کو کمال نادانی
سے ضائع کر ڈالا ہے یہ قوم اس دیار میں ملک کہاتی ہے اس قوم
بزرگان شاہی زمانے میں بڑے اہل حکم ورقم تھے چنانچہ ان میں سے
ایک صاحب معروف بہ سید ابراہیم بڑے صاحب ثروت تھے
یہ صاحب قصبہ بہار میں آسودہ ہیں ان کو ملک کا خطاب بادشاہ
وقت کے حضور سے ملا تھا اسی لئے ملک بیؐ کے نام سے آج

مشہور دیار وامصار ہیں ان کی اولاد خطاب مورث کے سبب سے ملک کہلاتی ہے اور اس ملک کے سکنا ناواقفیت کے باعث ملکوں کو ایک مجہول قوم سمجھتے ہیں حالانکہ یہ لوگ سادات سے ہیں۔ علم الاقوام کے رو سے بھی یہ قوم بہت کچھ بنی ہاشم کے انداز رکھتی ہے یہ لوگ نہایت مہمان نواز شجاع اور خوش خلق ہیں اور ان کی وجاہت ظاہری ان کے علو قومیت سے خبر دیتی ہے۔

۳۷۔ آپ نہایت مہمان نواز تھے اور مہمان نوازی آپ پر ختم تھی۔ آج تک سادات کرام میں مہمان نوازی کی صفت ممیز طور پر پائی جاتی ہے

۳۸۔ آپ کا قاتل اور مقتول دونو اہل دوزخ سے ہیں۔

۳۹۔ آپ کا حارب رسول اللہ کا حارب ہے۔ جابر روایت کرتے کہ رسول اللہ صلعم نے علیؑ و فاطمہؓ و حسنؑ و حسینؑ کے حق میں فرمایا حَرْبٌ لِمَنْ حَارَبَهُمْ وَسَلْمٌ لِمَنْ سَالَمَهُمْ یعنی کہ ہمکو جنگ ہے شخص سے کہ جو جنگ کرے ان لوگوں سے اور ہمکو صلح ہے اس شخص سے کہ جو صلح رکھے ان لوگوں سے۔

لمؤلف

دشمن ہے جو علیؑ کا وہ دشمن نبیؐ کا ہے   دشمن نبیؐ کا دشمن اللہ پاک ہے
پس دشمن علیؑ و نبیؐ و خدا جو ہو   وہ عاقبت خراب جہنم کی خاک ہے

۴۰۔ آپ کے ساتھ رسول اللہ صلعم کو بڑا تعلق دلی پیدا تھا۔ جیساکہ روایت عطیہ سے جو صحابیہ تھیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کہتی ہیں۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیشاً فیہم علی فسمعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ والہ وسلم وھو رافع یدیہ یقول اللھم لا تُمِتْنِیْ حتّٰی تُرِینی علیاً۔ راوی اس حدیث کے ترمذی ہیں اور ترجمہ یہ ہے کہ روانہ کیا پیغمبر خدا نے ایک فوج کو کہ جس میں علیؑ تھے پس ہم نے رسول اللہ صلعم کو دونوں ہاتھ اُٹھاکر یہ دعا مانگتے سنا کہ اے اللہ میرے مت مار مجھ کو جب تک کہ تو علیؑ کو مجھے دکھلا نہ لے واقعی جگر جگر اور دگر دگر ہوتا ہے۔

اہم۔ آپ نے جس طرح بیٹی رسول اللہ سے اسی طرح ذوالفقار خدا سے پائی۔ بقول ملا کاشی علیہ الرحمۃ **مصرع**

وزخدو مصطفےٰ شمشیر و دختر یافتہ

۴۲۔ آپ نے صغر سنی میں رسول اللہ کے پاس پرورش پائی اور لعاب دہن رسول اللہ کا وقت پیدائش چوسا اور غسل پیدائش رسول خدا کے ہاتھ سے پایا سب سے پہلے رسول اللہ صلعم کے ساتھ نماز پڑھی

۴۳۔ آپ بروز ہجرت جان پر کھیل کہ بستر رسول اللہ پر سوئے۔

۴۴۔ آپ بُت شکنی کی غرض سے دوش رسول اللہ پر سوار ہوئے یہ شرف کسی کو حاصل نہ ہُوا۔

۴۵۔ آپ علم میں حضرت آدم علیہ السلام سے مشابہ تھے درجہ خلۃ حضرت ابراہیمؑ کا رکھتے تھے۔ ہیبت آپ کی موسیٰؑ کی ہیبت کے مانند تھی اور عبادت عیسیٰؑ کی عبادت سے۔

۴۶۔ آپ رسول اللہ صلعم کے غسل و کفن کے متکفل ہوئے اور خود آپ کو غسل و کفن ملائکہ نے دیا

۴۷۔ آپ حسب حکم رسول اللہ بحالت جنابت مسجد میں جانے کے ماذون تھے یہ اجازت سوائے اہلبیت علیہم السلام کے کسی کو نہ ہوئی

۴۸۔ آپ کا اور آپ کے جگر گوشگان ائمہ معصومین علیہم السلام کا ذکر کتب سماویہ میں آیا ہے

۴۹۔ آپ مفتی ہر چہار دفتر تھے اسی طرح بقیہ ائمہ معصومین علیہم السلام بھی تھے۔

۵۰۔ آپ نے کسی کا حق غصب نہیں کیا۔

۵۱۔ آپ نے ناجائز رنگ پر ایک قطرہ خون کبھی نہ بہایا حریف کے ساتھ مکر و حیلہ کو راہ نہ دی حریف پر بلا ضرورت سختی کبھی نہ کی اسیران جنگ کو یا کسی کو گالی نہ دی اسیران جنگ کے قتل کو کبھی پسند نہ فرمایا اور نہ ان کے قتل کی رسول اللہ صلعم کو صلاح دی کبھی فتنہ و فساد کے گرد نہ پھرے اور جب کوئی فتنہ برپا ہوتا تو اس کے فرد کرنے میں دل سے کوشاں ہوئے۔

۵۲۔ آپ بہت حاضر طبیعت اور حاضر جواب تھے انفصال قضایا میں بھی آپ کا یہی انداز تھا تطویل کلام کے خوف سے راقم مثالیں آپ کی ان صفتوں کی نہیں لکھ سکتا ورنہ مثالیں بہت ہیں

۵۳۔ آپ کے زور بازو شجاعت استقلال اور ہمت سے اسلام

قائم ہو سکا یہ علیؑ ہی کی تلوار تھی جس نے اسلام کو مدینہ میں مضبوط کر دیا مکہ کو ماتحت، مدینہ کر دیا اور جتنے بدخواہ اسلام تھے ان کو زیر و زبر کر ڈالا بلاشبہ رسول اللہؐ کے عہد کا اسلام سو حصے ہیں تو ۹۰ حصے تیغ علیؑ بن ابی طالب کا ممنون ہے سوائے ناسپاس اور ناحق شناس کے کوئی مسلمان واقفیت کی حالت میں اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے عہد محمدیؐ میں کوئی شخص علیؑ سے زیادہ مددگار اسلام موجود نہ تھا اور سچی شجاعت اور سچی بہادری کے رو سے علی کا نظیر کوئی شخص امت محمدیؐ میں نظر نہیں آتا ہے لاریب علی اسلام کے ہیرو آف ہیروز Heroes of heroes) یعنی شجاع شجاعان تھے اس ہیروازم (Heroism یعنی شجاعت کے ساتھ ان صفات حمیدہ سے بھی متصف تھے جو انبیاو اوصیا و اولیا کے لئے درکار ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ اس عہد کے کسی مسلمان سیرت نگار نے علیؑ کا لائف (Life) نہ لکھا راقم کو اس وقت کوئی شکایت نہ ہوتی اگر شد و مد کے ساتھ سیرت نگاری کی طرف بعض ارباب تحقیق مائل نہ ہوتے خدا کا غضب ہے کہ سیرتیں مشاہیر اسلام کی لکھی جائیں، پھر ایک فاسق شراب خوار خونی بدکردار عیاش نفس پرور خودغرض بنی عباس کا خلیفہ ہیروز آف اسلام۔ (Heroes of Islam) یعنی شجاعان اسلام میں ٹھونسا جائے اور اس کی سیرت نگاری میں زور شور کے ساتھ دفتر کے دفتر سیاہ کئے جائیں مگر علی بن ابی طالب کی دو صفحہ کی سیرت بھی حوالۂ قلم نہیں کی

جائے مسلمانو! یہی انصاف ہے کہ عہد محمد کا اسلام جس شخص
کا ممنون در ممنون رہو وہ ہیروز آف اسلام میں شمار بھی نہ ہو اور
اس کے احوال میں دو سطریں بھی اشاعت نہ پائیں اگر یہی اسلامی
ارباب تحقیق کا انداز ہے تو اسلام کو ایسے مصنفین سے فائدہ پہنچ
چکا خلق اللہ کو فائدہ رسانی کے لئے پابندی انصاف شرط ہے اتلاف
حق ایک بُری شئے ہے خاص کر اتلاف حق اہلبیت اسی سے اسلام
کو ضرر پہنچ چکا ہے اور آئندہ بھی ضرر پہنچا کرے گا اب بھی بہی
خواہان اسلام ادائے حقوق اہل بیت کی طرف کوشش فرمائیں ورنہ
ان کی جتنی کوششیں ترقی اسلام کے لئے ہوں گی رائیگاں جائیں گی
خدا کی خدائی انصاف پر چل رہی ہے یہ ممکن نہیں کہ بے انصافی کی بنیاد
پر کسی قسم کی ترقی کی عمارت قائم ہو سکے خدائے تعالیٰ دوستداران
اسلام کو حق بینی اور حق جوئی کی توفیق اور حق و باطل کی تمیز عطا فرمائے۔
آمین ثم آمین۔
خیر راقم اب علی ابن ابی طالب کے وہ احوال رقم کرتا ہے جن سے
ظاہر ہو گا کہ اس جناب کے زور بازو شجاعت استقلال اور ہمت نے
کس طرح دشمنان اسلام کے مقابلے میں اسلام کو غلبہ بخشا اور اسلام
کو تباہ خراب ہونے سے محفوظ رکھا تحریر ذیل پہ حضرات ناظرین با انصاف
کی توجہ درکار ہے۔
واضح ہو کہ جب کفار مکہ کے ظلم و ستم سے رسول اللہ صلعم کو مکہ سے

ہجرت اختیار کرنی پڑی تو حضرت صلعم مدینہ کو تشریف لا ئے اور اہل مدینہ نے آپ کے دین کو قبول فرمایا۔ اہل مدینہ کے اسلام قبول کرنے سے مدینہ ایک اسلامی شہر ہو گیا جب کفار مکہ نے دیکھا کہ محمد صلعم نے مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں اپنے دین کو استحکام بخشا تو کفار مکہ اس معاملے کو بڑے حسد اور عداوت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اور اس فکر میں ہوئے کہ مدینہ پر چڑھائی کر کے اسلام کی حکومت کو درہم برہم کر ڈالئے اس قصد سے سرداران مکہ لشکر کشی پر آمادہ ہو کر مدینہ کی طرف بڑھے ان کی پہلی لڑائی مسلمانوں کے ساتھ چشمۂ بدر پر واقع ہوئی اگر یہ لڑائی اہل اسلام ہار جاتے تو حضرت محمد مصطفیٰ کے دین کا خاتمہ ایک امر یقینی تھا۔

جنگ بدر ماہران علم تاریخ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ پولیٹیکل پہلو سے جنگ بدر کو قسطنطن (constantine) کے زمانے کی پل والی لڑائی (Battle of the bridge) کی حیثیت حاصل ہے یہ لڑائی مسیح علیہ السلام کے ایک سو برس کے بعد درمیان عیسائین اور کفار کے واقع ہوئی تھی اگر قسطنطن کو اس لڑائی میں ناکامیابی ہنتج ہوتی تو دین مسیحی کو عروج دشوار ہوتا اسی طرح اگر جنگ بدر خلاف میں اسلام کے انجام پاتی تو اسلام بالکل ٹھنڈا ہو جاتا۔ جاننا چاہیئے کہ بے جدال و قتال کوئی دین قائم نہیں ہو سکتا ہے قیام و فروغ دین کے لئے جدال و قتال ایک امر ناگزیر ہے ہر چند مسیح علیہ السلام نے خود کوئی جدال و قتال نہیں فرمایا مگر حقیقت یہ ہے کہ دین اس معصوم اور برحق ہادی کا بے تیغ

دستان دنیا میں شائع نہیں ہوا ہے جسقدر غزوات رسولؐ اللہ ہیں
خون بنی آدم کا حکم خدائے قدیر سے زمین پر بہا ہے اس سے چند در چند مرتبہ
زیادہ حامیان دین مسیحی کی تلواروں سے میدان ہائے دنیا لالہ زار بنائے گئے
ہیں یہ بھی اہل انصاف سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جتنے غزوات رسول اللہ
صلعم کے ظہور میں آئے ہیں وہ زبردستی کا پہلو نہیں رکھتے ہیں ان کے
وقوع کے اسباب ایسے ہی نظر آتے ہیں بلے جنگ کے اختیار کئے کوئی
چارہ نہ تھا اسی جنگ بدر کو دیکھئے کہ کفار مکہ نے خود لشکر کشی کی۔ کیا آنحضرتؐ
ان کو مدینہ میں داخل ہو کر اسلام کو درہم برہم کرنے کی اجازت دیتے ان
دشمنان اسلام سے حضرت اگر نہ لڑتے تو کیا کرتے یہ لڑائی تو تمام تر تقاضائے
فطرت کے قرین تھی اگر آج بھی دنیا کی کسی شائستہ ترین قوم پر ایسی چڑھائی
کی جائے تو باوجود حاصل رہنے ہر طرح کی شائستگی کے اسے اپنے دشمن
سے مقابلہ کرنا ایک امر مجبوری ہوگا کفاران مکہ کی تعدی ایک امر قابل لحاظ
ہے پہلے تو یہ دشمنان اسلام پیغمبرؐ صاحب کو مکہ میں طرح طرح کی ایذائیں
پہنچاتے رہے جب آپ نے مجبور ہو کر ترک وطن فرمایا اور ایک غیر شہر
میں جا کر امن پکڑا تو وہاں بھی ان کو قتل کرنے اور ان کے دین کو برباد کرنے
کی کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی حملے پر حملے ہوتے رہے سبحان اللہ اس پر بھی
دشمنان اسلام کی طرف سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپ نے تلوار کھینچی اور
خون بنی آدم بہایا۔ خیر اب ناظرین باانصاف جنگ بدر کے معاملے پر توجہ
فرمائیں اور دیکھیں کہ یہ لڑائی کہ جس پر قیام استحکام اسلام موقوف تھا

کس طرح بہ لڑی گئی اور اس لڑائی میں علی ابن ابی طالبؓ کی تلوار نے کیا جوہر دکھلائے۔ کتب تاریخ میں مندرج ہے کہ جب کفار قریش بمقابلہ لشکر اسلام کے صف آرا ہوئے تو ان کفار سے تین شخص میدان جنگ میں مبارز طلب ہوئے اس وقت مہاجرین سے کوئی بھی ان کے مقابلے کو نہ نکلا الا حضرت علیؓ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب یہ تینوں حضرات بنی ہاشم تھے اور تینوں نے خوب ہاشمیت کی داد دی پھر جب لڑائی عام ہوگئی تو اور بھی حضرات بنی ہاشم نے بہادریاں دکھلائیں اور انصار بھی دلیری کے ساتھ نبرد آزما ہوئے حسب تحریر ارباب سیر ستر آدمی لشکر کفار سے اس لڑائی میں مارے گئے اور ستر آدمی اسیر ہوئے منجملہ مقتولین کفار کے ۳۵ نفر حضرت علیؓ کے دست خاص سے فی النار ہوئے اور بقیہ مقتولین کا زیادہ حصہ حضرت حمزہؓ کی تلوار سے طعمہ دوزخ ہوا کشتگان کی فہرست نام بنام مندرج کتب تواریخ دستیاب ہیں اہل واقفیت سے کوئی امر پوشیدہ نہیں ہے المختصر یہ بدر کی لڑائی وہ ہے کہ اسلام کی آئندہ کی سرسبزی تمام تر اس کی فتح پر موقوف تھی اگر اس لڑائی میں اسلام کو شکست ہو جاتی تو اسلام کا کام تمام ہو چکا تھا پھر نہ دین اسلام جاری ہوتا نہ بعد رسول اللہ کے خلافت راشدہ قائم ہوتی نہ پھر خلافت بنو امیہ کو پہنچتی نہ بنو عباس مالک خلافت ہو سکتے اور نہ دنیا میں کوئی اسلامی سلطنت کا وجود ہوتا یہ تلوار علیؓ ہی کی تھی جس نے اسلام کی جڑ مضبوط کر دی اور یہ وہی تلوار تھی کہ عہد رسول اللہؐ میں اسلام کی جڑ کو مضبوطی بخشتی رہی حتیٰ کہ اسلام ایک

ایسا فوری دہشت ہو گیا کہ جس کی ہیبت کی قیصر روم اور کسرائے فارس بھی نہ کہہ سکے

جنگِ اُحد

واضح ہو کہ جب قریش مکہ نے ہزیمت سخت بدر کی لڑائی میں اٹھائی اور ان کے بہادران مثل ابوجہل وغیرہ کے مارے گئے تو ان کے دلوں میں اس کے معاوضے کی سخت خواہش پیدا ہوئی چنانچہ بدر کے دوسرے ہی سال مشرکین قریش بڑی تیاری کے ساتھ مدینہ کی طرف بڑھے ادھر سے رسول اللہ بھی مہاجرین و انصار کو لے کر ان کے مقابلے کے واسطے مدینہ سے نکلے۔ کوہ احد کے متصل لشکر اسلام اور کفار قریش سے سامنا ہوا کفاران مکہ کا سردار ابوسفیان تھا چونکہ اس کے بیٹے اور رشتہ دار جنگ بدر میں طعمۂ ذوالفقار حیدری ہو چکے تھے اس نے لشکر آرائی میں بڑی کد کی زنان قریش بھی لشکر کے ساتھ آئیں یہ عورتیں جلاجل بجا بجا کر اور اشعار پڑھ پڑھ کر بازران قریش کو تہور دلاتی تھیں اور کشتگان بدر کے معاوضے پر انہیں آمادہ کرتی تھیں ان نسوان قبائل شیطان کی سردار ہندہ تھی یہ وہی ہندہ ہے جو ابوسفیان کی زوجہ تھی اور جس کی نسبت حکیم سنائی لکھتے ہیں ؎

داستان پسر ہندہ مگر نشنیدی الخ۔ غرض جب لڑائی شروع ہوئی تو پہلے لشکر اسلام کو فتح نمایاں ہوئی پھر شکست کا سبب یہ ہوا کہ اسلامی لشکری مال غنائم کے حاصل کرنے کی فکر میں مشغول ہو گئے اور رسول اللہ نے جو ارشاد فرمایا تھا اسے بھول بیٹھے یعنی رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ پچاس ۵۰ شخص تیرانداز پہاڑ کی ایک گھاٹی پر موجود رہیں مگر جب فتح کی شکل نمایاں ہونے لگی اور قریش

مکہ گریزاں نظر آنے لگے تو ان تیراندازوں نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں اور لوٹ
میں مشغول ہو گئے قریش نے یہ طور دیکھ کر اپنے منتشر شدہ لشکر کو سمیٹا اور
پھر قاعدہ سے لشکر اسلام کے مقابل ہوئے تب تو مال غنیمت کے طلبگاروں
پر سخت آبنی لشکر اسلام کو مقاومت کی تاب نہیں رہی عوام مہاجرین ایسے
بھاگ نکلے کہ نشان بھی نہ ملا کہ کدھر غایب ہو گئے صرف مہاجرین بنی ہاشم
جو قرابت داران رسولؐ تھے استوار و گرم پیکار رہے اسی طرح انصار بھی
شریک جانبازی رہے صاحب مدارج النبوۃ جناب محدث شیخ عبدالحق
دہلوی لکھتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے شکست کھائی تو حضرت رسولؐ کو تنہا
چھوڑ کر بھاگ گئے اس وقت آنحضرتؐ غضب میں ہوئے اور پیشانی مبارک
سے پسینا گرنے لگا پھر دیکھا تو علیؑ کو اپنے پہلو پر ایستادہ پایا آنحضرتؐ نے علیؑ سے
مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم نے اپنے بھائیوں کا ساتھ نہ دیا اور ان سے نہیں جا ملے
اس پر علیؑ نے عرض کی کہ اَکْفُرُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ اِنَّ لِیْ بِکَ اُسْوَۃٌ یعنی بعد
ایمان کے بھی ہم کفر اختیار کریں گے بتحقیق کہ مجھے آپ کے ساتھ اقتدا ہے اس وقت
میں ایک جماعت کفار کی پیغمبر خدا صلعم کی طرف متوجہ ہوئی آنحضرت صلعم نے
حضرت علی سے فرمایا کہ اے علیؑ مجھے اس جماعت سے محفوظ رکھو اور حق خدمت
و نصرت بجا لا کہ یہ وقت مددگاری کا ہے حسب ارشاد نبوی حضرت علی مرتضیٰ اس
قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور انھیں بدحال کر کے متفرق کر ڈالا اور ایک جماعت
کثیر کو دوزخ میں پہنچا دیا اس کے بعد محدث ممدوح تحریر فرماتے ہیں کہ
جب علیؑ سے یہ نصرت ظہور میں آئی تو پیغمبرؐ خدا نے بحق علی مرتضیٰ اَنَّہٗ مِنِّیْ و

دَاَنَامِنۡہُ فرمایا اور جبرئیلؑ بولے انا منکما پھر محدث ممدوح فرماتے ہیں کہ یہ آواز سنائی دی کہ کوئی گوئندہ غیبی کہتا تھا. لا فتیٰ الّا علی لا سیف الا ذوالفقار یہ بھی محدث ممدوح لکھتے ہیں نادِ علیاً مظہر العجائب تجدہ عوناً لک فی النوائب کل ہم و غم سینجلی بولایتک یا علی یا علی یا علی کا نزول اسی معرکہ احد میں ہوا ہے سبحان اللہ کیا ذات پاک حضرت علی مرتضیٰؑ کی تھی اور آپ کیسے معاون اسلام اور جان نثار تھے کہ بدر میں کس طرح اسلام کو بربادی سے بچایا اور احد میں کس طرح رسول صلعم کی جان کے محافظ رہ کر دشمنان رسول اللہ کو زیر و زبر کر ڈالا۔ واضح ہو کہ کتب تاریخ و سیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُحد کی لڑائی میں لشکر اسلام سے ۶۵ یا ستر حضرات شہید ہوئے ان میں سے حسب روایت ثانی ۶۶ و بہ تقدیر روایت اول ۶۱ انصار شہید ہوئے۔ مہاجرین میں سے شہیدوں کے عدد تین یا چار نظر آتے ہیں اور یہ شہدا عزیزان پیغمبر صلعم سے تھے عوام مہاجرین سے نہ کوئی شہید اور نہ کوئی زخمی ہوا اس سے عوام مہاجرین کی عقیدت و وفاداری کو سمجھنا چاہیے ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوائے رسول اللہ بنی ہاشم اور انصار کے کوئی غزوات رسولؐ خدا میں لڑتا بھڑتا نہ تھا پر تو جنگ بدر و جنگ اُحد کی سرگزشت ہے آئندہ اور غزوات میں بھی یہی کیفیت ظاہر ہوگی اس جنگ سے متعلق جو نہایت حسرت انگیز اور الم خیز معاملہ ہے وہ حضرت امیر حمزہؓ کی شہادت ہے آپ کی شہادت حضرت رسول خدا کے لئے ایک غم کی بات ہوئی. آپ لشکر خدا کے بڑے معین و مددگار تھے اور بڑی بہادری

سے جان نذر اسلام فرمائی انا للہ و انا الیہ راجعون اس واقعۂ جانگذاسے ایک عجیب نقل تاریخی متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندہ زوجہ ابو سفیان نے کمال شقاوت سے اس جناب کے جگر کو دانتوں سے چبایا اور آپ کے گوش اور بینی مبارک کو جسم اطہر سے علٰحدہ کرکے اور ان کا ہار بنا کر اپنی گردن ناپاک میں ڈالا اس شقاوت کو یاد کرکے حکیم سنائی فرماتے ہیں ع

مادرِ او جگر عم پیمبر بمکید۔

ہندہ کے اس فعل قبیح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کی عورت تھی اور اور جس قبیلے کی وہ عورت تھی اس قبیلے کے اخلاق کس قدر تنزل کو پہنچے ہوئے تھے یہ عورت بنی امیہ سے تھی بنی امیہ قریش کا ایک ایسا قبیلہ تھا کہ جو مکاری دغا بازی زناکاری خونریزی شراب خوری وغیرہ وغیرہ میں فرد تھا پیغمبر خدا کو اس قبیلے سے تمام تر نفرت تھی اور تا رحلت یہ نفرت آپ کی قائم رہی چنانچہ عمران بن حصین سے مروی ہے مات النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم وھو یکرہ ثلثہ احیاء ثقیف و بنی حنفیہ و بنی امیہ راوی اس حدیث کے ترمذی ہیں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم درحالیکہ وہ حضرت کراہت رکھتے تھے تین قبیلوں سے یعنی ثقیف بنی حنیفہ اور بنی امیہ سے شاہ صاحب اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت رسولؐ نے خواب میں دیکھا کہ بندر آپ کے منبر شریف پر کھیل رہے ہیں اور آپ نے تعبیر ان بندروں کی بنی امیہ سے فرمائی اور واقعی ایسا ہی ہوا کہ آپ کی رحلت کے ساتھ بنی امیہ اپنی حرفتوں سے صاحب

اقتدار ہو گئے ملک شام ان کے زیر حکومت ہو گیا یہاں تک کہ تمام بلاد اسلام کے مالک بن گئے اور پھر بیٹ منبر رسولؐ پر مشغول بازی رہے نہایت جائے افسوس ہے کہ جس قبیلے کو رسولؐ اللہ اپنے عہد میں نہایت کمزور اور بدحال کر گئے تھے حضرت کی رحلت کے ساتھ اس قبیلے کی قوت نہ صرف عود کر آئی بلکہ ہزار درجہ ترقی کر گئی کاش اس قبیلے کو ذی اختیار ہونے کا موقع نہیں دیا جاتا اگر یہ قبیلہ مرضی رسولؐ خدا کے مطابق حالت ابتذال میں چھوڑ دیا جاتا تو نہ علی مرتضیٰ کی عمر تلخی میں بسر ہوتی نہ بنی ہاشم مبتلائے تکالیف جسمانی و روحانی ہوتے نہ حضرت مقداد و دیگر دوستداران علیؑ ذلتیں اٹھاتے نہ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ شکست بیعت فرماتے نہ حضرت عائشہؓ جمل کی لڑائی لڑتیں نہ حضرت عائشہؓ کنوئیں میں گرائی جاتیں نہ امام حسنؑ کو زہر دیا جاتا نہ امام حسینؑ شہید دشت کربلا ہوتے نہ امامؑ زادے صعوبتوں کے ساتھ مارے جاتے اور نہ اہل حرمؑ اسیر ہو کر دمشق کی گلیوں میں پھرائے جاتے۔ لاریب قبیلہ بنی امیہ کے صاحب اقتدار ہو جانے سے آل محمد کو بڑا نقصان لاحق ہوا اور ان سے خوب خوب کشتگان بدر کے بدلے لئے گئے اس جگہ سائل سوال کر سکتا ہے کہ پھر کس نے قبیلہ بنی امیہ کو سر نو سے قوی کر دیا اس کا جواب تاریخ کی کتابیں دے سکتی ہیں راقم اس جگہ اسی قدر عرض کر دینا کافی سمجھتا ہے کہ بنی امیہ کو علی نے نہیں سر چڑھایا رسولؐ اللہ جس قبیلے سے نفرت رکھتے تھے اس کو علیؑ سر نہیں چڑھا سکتے تھے اگر سر چڑھائے ہوتے تو واقعہ کربلا کا الزام حقاً علیؑ ہی پہ عائد

ہوتا کس واسطے کہ یہ واقعۂ جانگزا محض قبیلہ بنی امیہ کے سرچڑھانے کا نتیجہ ہے
اس جنگ میں لشکر کفار سے صرف تیس آدمی مارے گئے ان میں سے
۹ لوا بردار لشکر کفار تھے یہ نو یکے بعد دیگرے طعمۂ ذوالفقار حیدری ہوتے گئے
پھر ۱۲ اور بھی حضرت علی مرتضٰیؑ کے ہاتھ سے مارے گئے باقی رہے ۹ان میں
چند شخص کو حضرت حمزہ علیہ السلام نے مارا اور بقیہ انصار کے ہاتھ سے فی النار
ہوئے مہاجرین غیر بنی ہاشم سے کسی کافر کا مارا جانا ثابت نہیں ہوتا ہے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہاجرین نہایت دور اندیش حضرات تھے نہ مارتے تھے
اور نہ مارے جاتے تھے مگر جاننا چاہئے کہ شجاعت ایک ایسی صفت
ہے کہ تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور اسی کے برخلاف بزدلی ہے اور واقعی
شجاعت ایک ایسی صفت ہے کہ انسان کو بہت کچھ ذریعۂ عزت ہوا کرتی
ہے جیسا کہ خود اس لڑائی میں رسولؐ اللہ کے ایک صحابی نے یہ شعر پڑھا تھا

فِی الْجُبْنِ عَارٌ وَفِی الْاِقْبَالِ مَکْرُمَۃٌ — وَالْمَرْءُ بِالْجُبْنِ لَا یَنْجُوْ مِنَ الْقَدَرِ

یعنی نامردی میں ننگ ہے اور دشمن سے سامنا کرنے میں بزرگی ہے اور مرد
نامردی کے ذریعے سے مقدر سے نہیں بچ سکتا۔

احد کی لڑائی کے بعد چند غزوات اور سرایا پے در پے ظہور میں آتے گئے مگر
وہ مشہور نہیں ہیں۔ کتب تاریخ و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان غزوات
و سرایا میں بھی علیؑ کی تلوار نیام میں بیکار نہیں پڑی رہی شاہ مردان نصرت
حضرت رسولؐ اور اعانت اسلام سے غافل نہیں رہے چنانچہ غزوہ بنی
نضیر میں جو انہیں غزوات غیر مشہور سے ہے شیر خدا نے ایک بڑے کافر

جری کو مارا یہ شخص بنی نضیر سے تھا اور ایسا تھا کہ جس کا سامنا مہاجرین غیر بنی ہاشم نہیں کر سکتے تھے یہ شخص رات کو رسول اللہ پر حملہ آور ہونے کو تھا اور اسی قصد سے اپنے قلعے سے نکلا تھا حضرت امیر اس کے انداز کو سمجھ کر شب کو اس کی طرف بے فرمائش رسول اللہ کے تشریف لے گئے وہ عاقبت بربادقصد بالا سے خیمۂ رسول اللہ کی طرف چلا آتا تھا کہ راہ میں شاہ مردان سے سامنا ہوگیا اور حضرت نے اسے جہنم واصل فرمایا اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر رسول اللہ کی فرمائش کے بغیر بھی نصرت رسول اللہ اور اعانت اسلام فرمایا کرتے تھے سبحان اللہ کیا حضرت کی شجاعت شعاری اور قوت ایمان تھی واقعی اگر علیؑ کو خدائے تعالیٰ نہیں پیدا کئے ہوتا تب اسلام کے زور پکڑتے اور استحکام حاصل کرنے کے واسطے خدائے تعالیٰ کو اور کوئی سامان تقویت پیدا کرنا پڑتا ظاہرا تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو جو کچھ زور اور استحکام حاصل ہوا اس میں حضرت علیؑ کی ذات کو بڑا دخل تھا خیر ان غزوات و سرایا کے بعد وہ لڑائی وقوع میں آئی جو جنگ خندق کے نام سے مشہور ہے۔ اسے جنگ احزاب بھی کہتے ہیں۔ یہ لڑائی بھی جنگ

جنگ خندق

بدر و جنگ احد کی شہرت رکھتی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جنگ ہجرت کے پانچویں سال میں واقع ہوئی قریش مکہ اور چند قبائل دیگر جن میں یہودی بھی شامل تھے حضرت ابوسفیان پدر حضرت معاویہؓ کی ماتحتی میں مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے اور اس کا محاصرہ کچھ روزوں تک کئے رہے ان کے حملوں سے شہر کو محفوظ رکھنے کی غرض سے

پیغمبرؐ خدا نے شہر کے گرد خندق کھدوائی تھی اس خندق کی وجہ سے اس جنگ کو غزوۂ خندق کہتے ہیں کفار محاصرین نے چند بار اس خندق پر حملے کیے مگر اندر شہر کے نہیں داخل ہو سکے اس وقت بھی علیؑ اعانت اسلام سے غافل نہ تھے اور ان کی شجاعت شعاری حملہ آوروں کی خبر لیتی رہی لیکن جب آخر کار لڑائی میدان کی ٹھہری تو اس وقت لشکر کفار سے ایک شخص عمرو ابن عبدود نام مبارز طلب ہوا لشکر اسلام سے کسی کو تاب نہ پڑی کہ ایسے دیو نژاد کا سامنا کرے یہ کافر ہزار سوار کے برابر تن تنہا سمجھا جاتا تھا خیر جب کوئی بھی لشکر اسلام سے نہ نکلا تو حضرت اس سے مقابلے کے واسطے نکلے مگر آنحضرت صلعم نے روکا اور لشکر اسلام کی طرف متوجہ ہو کر تین بار فرمایا کہ کوئی تم میں سے ہے جو اس کافر کے ساتھ نبرد آزما ہو مگر کسی نے بھی لڑنے کی طرف رخ نہیں کیا تب کچھ اور گفتگو کے بعد جس کی تحریر کی یہاں حاجت نہیں ہے حضرت رسولؐ نے حضرت علی کو عمر ابن عبدود سے جنگ کی اجازت بخشی شاہ مرداں تو اسی کے منتظر تھے اور اس کے پہلے بھی حضرت رسول کی فرمائش کے بغیر آمادۂ جنگ ہو چکے تھے اس دیو ناپاک کا فوراً مقابلہ کیا وہ کافر بڑا ہی ہیکل تن قوی ہیکل اور نبرد آزما تھا دیر تک شاہ مرداں کا سامنا کرتا رہا آخر کار ضربت حیدری سے فی النار والسقر ہوا۔

واضح ہو کہ اس غزوے میں بھی علیؑ کی تلوار نے ویسی ہی حمایت کی جیسا کہ غزوات سابقہ میں کی گئی تھی اگر شاہ مرداں عوام مسلمانوں کی طرح عمر ابن عبدود کے مقابلے سے انکار فرما جاتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کفار مکہ غالب آتے

اور مدینہ والوں کو بچہ مہاجرین وبچہ انصار زیروزبر کرڈالتے اور اسلام جو حالت صغر سنی میں تھا آغوش عالم سے رخصت ہوجاتا مگر قتل عمر بن عبدود سے اسلام کے بازو قوی ہوگئے اور کفر کی کمر ٹوٹ گئی اس ملعون کے قتل ہوتے ہی اہل مکہ بے دل ہوئے اور جو قبائل بسرداری ابوسفیان مدینہ پر چڑھ آئے تھے ان میں پھوٹ مچ گئی اور وہ سب کے سب بھاگ نکلے جاننا چاہیئے کہ جناب امیرؑ کی اس خدمت اسلام کی نسبت رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ علیؑ کی خندق کے دن کی لڑائی میری تمام امت کے اعمال سے کہ وہ قیامت تک کرے گی افضل ہے یہ حدیث کتاب مدارج النبوۃ ومعارج النبوۃ وکشف الغمہ میں مندرج ہے اور اس کی صحت میں کسی کو انکار نہیں ہے۔

واضح ہو کہ اس غزوے میں بھی غزوۂ بدر وغزوۂ احد کی طرح کسی مہاجر غیر بنی ہاشم نے نہ کسی کافر کو مارا اور نہ مارا گیا مارا جانا تو درکنار کسی کو خراش بھی نہیں لگی صرف چھ شخص انصار شہید ہوئے اور کفار سے بھی صرف تین نفر مارے گئے یہ فتح مسلمانوں کو بغیر بہت کشت وخون کے نصیب ہوئی اور سبب اس کا وہی ہوا کہ شاہ مردان نے قتل عمر بن عبدود سے لشکر کفار میں ایک بڑا تہلکہ ڈال دیا جس کے باعث مشرکین بھاگ کھڑے ہوئے اور تاب مقاومت نہ لاسکے۔

جنگ خیبر سن ہفتم ہجری میں جنگ خیبر واقع ہوئی فریق مخالف اس میں یہودیان خیبر تھے خیبر یہودیوں کا ایک قلعہ مرحب اس کا

سردار اور اس کا بھائی حارث بھی اسی کی طرح ایک مشہور پہلوان مرد میدان
تھا الغرض دونوں بھائی بڑے مشہور شجاع تھے اور ظاہرا ان کا کوئی ہم نبرد
دکھائی نہیں دیتا تھا زمانۂ جنگ میں رسول اللہؐ مبتلائے درد شقیقہ تھے
اس لئے خیمے میں تشریف رکھتے تھے مگر لشکر اسلام میدان جنگ میں تین۳
روز پے در پے جایا کیا اور ہر بار شکست کھا کھا کر واپس آیا کیا تینوں روز
لشکر اسلام پر یہ گزرا کیا کہ جو مجاہد اسلامی لشکر یہود سے مقابلہ کرنے کے
واسطے جاتا حارث اسے شہید کر ڈالتا جب اس طرح دو آدمی شہید ہو
جاتے پھر کوئی مسلمان مقابلے کا قصد نہیں کرتا یہ بے آبروئی لشکر اسلام کو
تین روز سے نصیب ہو رہی تھی روز لشکر اسلام یہودیوں کے مقابلے کو
جاتا اور کمال ذلت کے ساتھ خیمہ گاہ کو بھاگ آتا حضرت امیرؓ وقت دو انگی
لشکر اسلام مدینہ میں بوجہ آشوب چشم کے باعث رہ گئے تھے اور باسباب ظاہر
جنگ و پیکار کے قابل نہ تھے مگر عقب سے باوجود لاحق رہنے اس
شکایت کے بہ تقاضائے حمایت رسول اللہؐ و بخیال نصرت اسلام
لشکر خدا میں حاضر آئے واقعی ایمان اور حمیّت اسلام اسے کہتے
ہیں سبحان اللہ حالت مرض میں بھی مفارقت رسول اللہؐ گوارا نہ فرما سکے
نصرت دین خدا کی نظر سے مدینہ سے خیمہ گاہ رسول اللہؐ تک چلے ہی آئے
مگر ان تینوں دنوں میں کسی دن شریک کارزار نہ ہو سکے جب تیسرے
دن بھی لشکر اسلام شکست کھا کر بھاگ آیا تب رسول خداؐ نے فرمایا کہ
کل صبح کو ہم علم لشکر اسلام اس شخص کو دیں گے جو کرّار غیر فرار ہے۔

یعنی جو سخت بہادر ہے اور بھاگنا نہیں جانتا اور جو خدا اور رسولؐ کو دوست
رکھتا ہے اور خدا و رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہیں نہیں لوٹے گا وہ جنگ
کہ خدا اس کے ہاتھ پر فتح نہ دے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ حدیث نبوی یہ
ہے لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَجُلًا کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ
یرجع الا یفتح اللّٰہ علیٰ یدیہ۔ اس ارشاد رسول اللّٰہؐ کو سن کر بہت لوگ
امیدوار علم ہوئے مگر حضرتؐ نے وہ علم اس شخص کو بخشا جس کی شجاعت
کا امتحان جنگ بدر و احد و خندق وغیرہ میں ہو چکا تھا اور جو اس وقت تک
دین خدا کو تباہی سے برابر بچاتا چلا آیا تھا۔ خیبر صبح کو حضرت رسول صلعم نے
حضرت علیؑ کی جو شش کہ وہ آنکھوں پر لب مبارک لگایا جس سے جوشش کی
تکلیف جاتی رہی اور علم موعود مرحمت فرما کر اجازت جنگ بخشی اس
کے بعد بحکم خدائے عزوجل یہ رباعی پڑھی۔ نادِ علیاً مظہر العجائب الخ
شاہ مردان نے میدان جنگ میں پہنچ کر مرحب اور حارث دونوں کافرو
کو بڑی شجاعت شعاری کے ساتھ واصل جہنم فرمایا در خیبر کو اکھاڑ ڈالا اور
قلعہ خیبر کو آن کی آن میں فتح کر لیا۔ غلامان شاہ مردان اس بات پر غور
فرمائیں کہ بلا تائید ایزدی ایسے ایسے اہم کام انسان ضعیف البنیان سے
انجام نہیں پا سکتے بلاشبہ شاہ مردان مؤید من اللّٰہ تھے اگر تائید غیبی شامل حال باکمال نہ ہوتی
ایک فاقہ کش زندہ دار نفس کش شخص سے ایسے ایسے حیرت خیز قوت اور شجاعت کے کام
ظہور میں نہ آتے۔ وہ شخص جو جو کی روٹی کھائے عبادت خدا میں جسم کو گھلائے وہ میدان جنگ
میں ہر بار لشکر کفار کو تہ و بالا کر ڈالے عمر ابن عبدود ایسے دیو پیکر کافر کو

کشتی میں دے مارے مرحب اور حارث ایسے پہلوانان نامی کو دم کے دم میں فی النار کرے اور اس پر تماشا یہ کہ سات سو من کے دروازے کو اکھاڑ ڈالے اور پھر ایسی وزنی شے سے کہ جس کے اٹھانے کے واسطے ستر آدمی درکار ہوں ہاتھ میں لے کر سپر کا کام لے۔ اے اہل انصاف بتایئے کہ کیا ایسے ایسے کام تائید ایزدی کے بغیر انجام پا سکتے ہیں اہل بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شاہ مردان کا در خیبر کو اکھاڑنا جس کے صدمے سے خود قلعہ خیبر کو لغزش ہوئی تھی ایک امر تاریخی ہے لیلی مجنوں کی کہانی نہیں ہے زنہار زنہار یہ افسانہ نہیں ہے یہ محض واقعہ ہے وہ مورخین بھی جو مخالفین اسلام سے ہیں اس عجب انگیز معاملے کو بہ حیثیت مورخ درج تصنیف کرتے ہیں چنانچہ واشنگٹن ایرونگ (Washington Irving) اپنی کتاب تاریخ میں اس واقعے کا ذکر مورخانہ طور پر کرتا ہے پس تعجب ہے اگر نئی روشنی والے حضرات اس حیرت خیز کارروائی کو قصے اور فسانے پر محمول کریں یا اشخاص متعصب اس سے چشم پوشی کریں راقم کی دانست میں اس معاملے کے حق ہونے میں وہی گفتگو کرے گا جو پیغمبر خدا پر ایمان نہیں لایا ہو کا کس واسطے کہ حضرت رسولؐ نے جب حسب وحی خدا شاہ مردان کو مظہر العجائب والغرائب فرمایا ہے اگر کوئی شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور پھر اس قول نبویؐ پر یقین نہیں رکھتا تو وہ داخل اسلام شمار نہیں کیا جا سکتا ہے اب حضرات ناظرین غزوہ حنین کے معاملے پر نظر توجہ فرمائیں یہ آخری لڑائی تھی جو درمیان لشکر اسلام اور کفار قریش کے واقع ہوئی اس

جنگ حنین جنگ کی حقیقت یہ ہے کہ بعد فتح مکہ اکثر قبائل عرب نے رسولؐ اللہ کی اطاعت اختیار کی الا قبیلہ ہائے ہوازن و ثقیف جنہوں نے ہزاروں آدمیوں کے ساتھ میدان حنین میں رسولؐ اللہ سے مقابلہ کیا ہرچند مسلمانوں کے افراد کم نہ تھے مگر چونکہ دشمنوں نے دھوکے سے ان پر حملہ کیا تھا مہاجرین و انصار دونوں رسولؐ اللہ کو چھوڑ کر فرار ہو گئے میدان جنگ میں قائم رہ جانے والے ایک قول کے مطابق کل نو شخص اور دوسرے کے مطابق صرف چار تھے یہ چار شخص حضرت علی مرتضیٰ عباس رضی اللہ عنہ حضرت ابوسفیانؓ اور عبداللہؓ تھے ان چار شخصوں کے نام ان نو شخصوں کی روایت میں بھی دیکھے جاتے ہیں جب جس وقت مہاجرین و انصار بھاگے جاتے تھے پیغمبر خدا نے فرارین کو غیرت دلانے کی نظر سے یا اصحاب السّمرۃ کہ کہہ پکارا اس کے سننے سے نسو آدمی کے قریب انصار وغیرہ سے لوٹے اور پھر جنگ گاہ میں حاضر آئے فرارین کے اصحاب السمرہ کے لقب سے پکارے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اکثر لوگ بیعت الرضوان میں شامل تھے بیعت الرضوان کی حقیقت یہ ہے کہ یہ بیعت اس وقت میں ہوئی تھی کہ جب رسولؐ اللہ عمرہ کے ارادے سے بطرف مکہ تشریف لے گئے تھے اور مطلب اس بیعت کا یہ تھا کہ اہل اسلام جہاد میں پوری کوشش کریں گے جہاد سے کبھی منہ نہ موڑیں گے اور تمام تر رسولؐ اللہ کے مطیع رہیں گے اور چونکہ یہ بیعت الرضوان ایک درخت کے نیچے وقوع میں آئی تھی اس واسطے اسے بیعت تحت الشجرہ بھی کہتے ہیں۔ رسولؐ اللہ نے اسی لئے مفرورین کو غیرت دلانے کے واسطے اصحاب السمرہ کے

لقب سے پکارا یعنی اے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو۔ جاننا چاہیئے کہ سمرہ ایک قسم کا درخت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت جس کے نیچے یہ بیعت ظہور میں آئی درخت سمرہ تھا۔ الغرض جب کچھ بھاگے ہوئے لوگ میدان جنگ میں مجتمع ہو آئے تو لڑائی شروع ہو گئی ہنگام جنگ ابو جرول نامی ایک پہلوان لشکر کفار سے رجز خوانی کرتا ہؤا نکلا اور مبارز طلب ہؤا لشکر اسلام سے کسی نے بھی اس کے مقابلے کا قصد نہیں کیا اس کی تنومندی اور بہادری کے رعب میں سب کے سب گرفتار ہو گئے۔ مگر ذو الفقار شاہ لافتیٰ نے اس دشمن خدا کو سیدھے وہاں روانہ کر دیا۔ جہاں اس کے پہلے عمرابن عبدود مرحب اور حارث اور دیگر سرکشان کفار پہنچائے جا چکے تھے اس لڑائی میں کفار نے شکست فاش اٹھائی۔ اور ان کے مقتولین کا عدد ستر ہے ان میں سے چالیس نفر دست خاص شاہ مردان سے فی النار ہوئے اور بقیہ کو انصار وغیرہ نے مارا کسی مہاجر غیر بنی ہاشم کے ہاتھ سے ایک کافر کا قتل ہونا بھی کتب تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ اس لڑائی میں خلاف عادت انصار بھی فرار ہو گئے اور جو شریک جنگ ہوئے وہ وہی اشخاص تھے جو رسول اللہ کے غیرت دلانے سے لوٹ آئے حضرات مہاجرین غیر بنی ہاشم کا فرار تو ایک معمولی امر تھا مگر ان کے فرار سے زیادہ توجہ طلب خاندان بنی امیہ کی حاضری جنگ ہے قبیلہ بنی امیہ کے بیشتر حضرات جو نئے مسلمان ہوئے تھے میدان جنگ میں حاضر تھے مگر لشکر اسلام سے الگ کھڑے ہو کر لڑائی کے تماشے دیکھ

رہے تھے اور مسلمانوں کی مصیبتوں پر ٹھٹھا کے لگا رہے تھے جیسا کہ بالا میں رقم ہوا ہے اس لڑائی میں بنی امیہ کے سردار حضرت ابوسفیان رضؓ بھی حاضر تھے مگر خس برابر بھی ان حضرت نے رسول اللہؐ کی اعانت نہیں فرمائی الگ سے اپنے عزیزوں کی طرح تماشائے جنگ دیکھتے اور قہقہہ مارتے رہے حضرت نئے مسلمان ہوئے تھے اور یہ پہلا امتحان آپ کے اسلام قبول کرنے کا تھا حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص فتح مکہ کے وقت مجبوراً مسلمان بنا تھا مصرع ،

کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو

اس نے جب دیکھا کہ اسلام غالب آگیا اور دین خدا سے اب مقاومت کی تاب نہیں رہی ناچار دین اسلام کو قبول کر لیا اگر یہ شخص دل سے مسلمان ہوا ہوتا تو اس جنگ میں صرف لڑائی کے تماشے نہیں دیکھا کرتا اور یوں قہقہے نہیں لگاتا رہتا اگر دل سے مسلمان ہوا ہوتا تو مجاہدین مومنین کی طرح اعانت دین خدا کرتا اور رسول اللہؐ کا ساتھ دیتا اس کے اس انداز سے خواہاں تھا اور اسلام ہزیمت کا منتظر تھا مگر چشم بداندیش کو دباد فتح نصیب اسلام ہوتی اگر اس برعکس کوئی معاملہ ظہور میں آتا تو یہ تلبیسی مسلمان مبارکباد کے لئے قبیلہ ہائے ہوازن و ثقیف کی طرف دوڑ لگاتا واقعی بنی امیہ کا مسلمان کہلانا یک طرفہ معاملہ ہے ، حقیقت حال یہ ہے کہ ابوسفیان اور اس کے لوگ خاصے منافق تھے ظاہراً مغلوب ہو کر مسلمان ہو گئے تھے یہ قبیلہ ہر پہلو سے قابل نفرت نظر آتا ہے اگر یہ قبیلہ نہ ہوتا تو بدر و احد اور خندق کی لڑائیاں زنہار وقوع میں نہ آتیں چین سے مذہب اسلام اشاعت پاتا اور اس قدر

بہادران اسلام کی جانیں بے سبب تلف نہ ہوئیں ابوسفیان اور اس کے والوں نے اسلام کی بیخ کنی کا کوئی درجہ اٹھا نہیں رکھا ہے کہ اگر حضرت علیؑ کو خدائے تعالیٰ معین اسلام نہ بنائے ہوتا تو ظاہرا اسلام کی حفاظت اور اشاعت کی کوئی صورت پیدا نہ تھی علاوہ فتنہ انگیزیوں کے اس قبیلے کے اخلاقی مذہبی اور تمدنی امور بہت کچھ پایہ تنزل کو پہنچے ہوتے تھے ایسے قبیلے سے ہر راست باز آدمی کو کراہت کا پیدا ہونا تمام تر مقتضائے فطرت ہے پس پیغمبر خدا صلعم کو اس قبیلے کے ساتھ کراہت بے سبب نہ تھی حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام بھی رسول اللہ کی اس کراہت سے تمام تر واقف تھے اور چونکہ آپ رسول مقبول صلعم کے بڑے مطیع و فرمانبردار تھے بعد وفات آنحضرت صلعم کے بھی قبیلہ بنی امیہ سے کبھی مرابطت پیدا نہیں کی چنانچہ جب حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحلت فرمائی اور خلافت کا انتظام ہوگیا تب حضرت ابوسفیانؓ غرض خاص سے جناب امیر کے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ اے علیؑ تم چپ رہ گئے اور معاملہ خلافت طے پا گیا اگر تم کہو تو ہم صحرائے مدینہ کو سواران مکہ سے بھر دیں اور انتظام خلافت کو درہم برہم کر دیں اس جناب نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اے ابوسفیانؓ تم ایام جاہلیت میں فتنہ انگیزی کیا کرتے تھے اور اب مسلمان ہو کر بھی اپنی عادت فتنہ انگیزی سے باز نہیں آتے یہ جواب پا کر حضرت ابوسفیانؓ نے اپنی راہ لی اور جس طرف بہبود کی صورت نظر آئی اس طرف کو سدھارے حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت امیرؑ کا یہ جواب بڑی مصلحت اور دور اندیشی سے خبر دیتا ہے

اس واسطے کہ ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ قبیلہ بنی امیہ کے سردار تھے یہ قبیلہ رسول اللہ کے عہد میں برابر ناکامیابیاں اٹھاتا رہا تھا اور اس قبیلے کو بڑی مضرتیں خود حضرت علی کی تلوار سے پہنچا کی تھیں جیسا کہ غزوات بدر احد اور خندق کے معاملات سے آشکارا ہے ایسی حالت میں یہ قبیلہ نہ رسولؐ خدا اور نہ آل رسولؐ خدا کا کسی طرح دوست ہو سکتا تھا اگر رسولؐ اللہ کی دوستداری اس قبیلے کو مدنظر ہوتی تو جنگ حنین میں ابوسفیان صاحب اپنے عزیزوں کے ساتھ مسلمانوں کی مصیبتوں کے تماشے دیکھتے اور ٹھٹھا کے لگاتے پس حضرت ابوسفیان نے جو جناب امیرؑ کے انتظام خلافت کو درہم برہم کہ دینے میں مستعدی دکھلائی ہر گز یہ بات خوش نیتی پر مبنیٰ نہ تھی الغرض جناب امیر فوراً سمجھ گئے کہ یہ شخص ہمارے ذریعے سے مجرد اپنے کو اور اپنے قبیلہ کو نفع پہنچانا چاہتا ہے اسے مطلق ہماری اور ہمارے قبیلہ بنی ہاشم کی منفعت مدنظر نہیں ہے اس لئے اسے جناب مرتضیٰؑ نے اس طرح کا جواب دیا جس سے اس کا ایک مفسد شخص ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابوسفیانؓ کو شخص مفسد سمجھ کر جناب امیرؑ نہ اس کے مشورے پر عمل کر سکتے اور نہ اس کی اعانت کو جائز رکھ سکتے تھے پس اسے ایسے جواب کے سوا کیا دوسرا جواب دیتے علاوہ اس کے حضرت علیؑ خوب جانتے تھے کہ حضرت رسول مقبولؐ قبیلہ بنی امیہ سے کراہت رکھتے تھے پس آپ ابوسفیانؓ سے کیونکر میل جول پیدا کر سکتے تھے اگر حضرت امیرؑ ابوسفیانؓ سے لطف مرابطت پیدا کر لیتے

تو حضرت کا یہ برتاؤ حضرت رسولؐ خدا کے برتاؤ سے خلاف پڑتا بلکہ رسولؐ اللہ کی پالیسی کے مغایر واقع ہونا پوشیدہ نہیں ہے کہ رسولؐ اللہ کی یہ ایک بڑی عمدہ پالیسی تھی کہ قبیلہ بنی امیہ جو ایک سرکش اور مفسد قبیلہ تھا ہمیشہ مغلوب رہے چنانچہ بڑی محنت اور مشقت کے ساتھ ایک مدت دراز میں یہ قبیلہ مغلوب کیا گیا تھا اگر حضرت امیرؑ ابوسفیانؓ کے مشورے کو سن لیتے تو یقیناً مرضی رسولؐ اللہ کے خلاف آپ کی یہ کارروائی ہوتی مگر جناب امیرؑ جو ہمیشہ تبعیت رسولؐ اللہ کو فرض سمجھتے تھے اور مرضی آنحضرت صلعم کے خلاف عمل کرنے کو کفر جانتے تھے کیونکر ایسا کام کر سکتے تھے جس میں بنی امیہ کی قوتوں کے عود کرنے کا گمان قوی لاحق تھا فی الواقع اگر ابوسفیانؓ کے مغالطے میں حضرت امیرؑ آجاتے تو آپ پر دو سخت الزام عائد ہوتے اوّل تو یہ کہ جس قبیلے سے رسول اللہ کو کراہت تھی اس کے سردار سے آپ نے موافقت اور مرابطت پیدا کی دوئم یہ کہ جس قبیلے کو رسول اللہ ضعیف اور کمزور کر چکے تھے اسے سرِ نو سے آپ نے قوی اور پُرزور کر دیا ظاہر ہے کہ جب جناب امیرؑ ابوسفیانؓ سے اعانت قبول فرماتے تو اس کے معاوضے میں ابوسفیانؓ کو بلادِ اسلام کی کچھ نہ کچھ حکومت عطا فرمانے ایسی صورت میں ابوسفیانؓ سے بہ سر احتراز رہ کر جناب امیرؑ نے نہ صرف اپنے کو ان دونوں الزموں سے بچایا بلکہ اس الزام سے بھی اپنے کو محفوظ رکھا جو ابوسفیانؓ اور قبیلہ بنی امیہ کی حکومتوں کے حاصل کرنے کی بنیاد پر صورت پذیر ہوتا ہے الحق ابوسفیانؓ اور اس کے قبیلے کا سرِ نو سے قوی ہو جانا خاص کر خاندانِ

پیغمبرؐ کے واسطے کچھ بھی اچھا نہ ہوا اس قبیلے کے سرنو سے قوت حاصل کرنے کے تاریخی حالات قابل ذکر ہیں. جاننا چاہیئے کہ جب حضرت علیؑ نے اعانت ابوسفیانؓ کے قبول کرنے سے انکار فرمایا تو ابوسفیانؓ حضرت علیؑ سے دست بردار ہو کر اپنے طور پر حصول حکومت کی فکریں کرنے لگے اور اپنی کارستانیوں سے ملک شام کی حکومت حاصل کر لی اور یہ بھی حق حاصل کر لیا کہ جس قدر ملک اطراف شام میں مسلمان فتح کریں ان کا چہارم حصہ ان کو ملا کرے الغرض جب ابوسفیان صاحب نے حکومت شام حاصل کر لی تب انھوں نے فرمایا کہ میں پیر ہو گیا ہوں میں مکہ سے باہر جانا پسند نہیں کرتا شام کی حکومت پر ان کا بڑا صاحبزادہ یزید ابن ابوسفیان بھیجا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا صاحبزادے کے حاکم شام ہوتے ہی مردمان بنی امیہ جو پریشان حال ہو رہے تھے شام کو روانہ ہو گئے اور تھوڑے عرصے میں اپنی سابق قومی قوتوں کے اعتبار سے بھی دہ چند زیادہ قوی ہو گئے شام کا سارا ملک زیر حکومت بنی امیہ ہو گیا شام میں چھوٹے سے بڑے عہدے پر بنی امیہ ہی سرفراز دکھائی دیتے تھے کہیں بنی ہاشم کی صورت پر نظر بھی نہیں پڑتی تھی بنی ہاشم کا شام میں کسی عہدے پر بحال ہونا تو محض خلاف توقع تھا جب دار الخلافت مدینہ میں ایک کس بنی ہاشم پانچ روپے کی نوکری کا بھی نظر نہ آتا تھا الغرض جو کچھ تاوان قبیلہ بنی امیہ عہد رسول اللہ میں اٹھاتا گیا تھا اس کی بھاری تلافی اس قبیلے کے لئے فوراً رسولؐ اللہ کی رحلت کے بعد ہو گئی. جاننا چاہیئے کہ شام کی حکومت پر صرف چار برس یزید ابن ابی سفیان

قائم رہ کر مر گئے ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی حضرت معاویہؓ ان کے جانشین بنائے گئے آپ اپنے برادر متوفیٰ سے بمراحل قابل تر تھے آپ کے عہد حکومت میں قبیلہ بنی امیہ کی قوت حشمت شوکت وغیرہ وغیرہ حالط بیان سے باہر معلوم ہوتی ہے آپ بہت عرصے تک حاکم شام رہے اور اس قدر صاحب قوت و ثروت ہو گئے کہ جب اپنے عہد خلافت میں حضرت علی بن ابی طالب نے آپ کو معزول کرنا چاہا تو آپ معزول نہ ہو سکے اور خلیفۂ وقت سے برابر مقابلہ فرماتے رہے بلکہ خلیفۂ وقت کو کثرت جنگ سے اتنی فرصت نہ دی کہ وہ خلافت کے اور کسی کام کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کر سکیں خلافت حضرت علی ابن ابی طالب کا زمانہ صرف چار برس اور چند ماہ تھا اس کے بعد امام حسنؓ خلیفہ ہوئے چھ مہینے کے اندر حضرت امامؓ کو خلع خلافت کی نوبت آئی اس عجیب معاملے کے بعد مدینہ کی جگہ دمشق ہی دارالخلافت ہو گیا واضح ہو کہ بعد رسولؐ اللہ کے بنی ہاشم ضعیف تو ہوتے ہی چلے گئے تھے مگر اس خلع خلافت سے ان کی رہی سہی وجاہت میں پورا زوال آگیا اور بنی امیہ ہر طرح سے منتہائے ثروت دینوی کو پہنچ گئے کیا تعجب ہے کہ وہ قبیلہ جس سے رسولؐ خدا صلعم کو کراہت تھی اور جس کو بڑی کوششوں سے آنحضرتؐ اپنے عہد میں مغلوب و مجبور فرما گئے تھے آپ کی رحلت کے ساتھ زور پکڑنے لگا اور رفتہ رفتہ رفتہ تمام تر مالک اور حاکم تمام بلاد اسلام کا ہو گیا اور بنی ہاشم جو رسولؐ اللہ کا قبیلہ تھا اور جس کی عظمت مسلمانوں پر فرض تھی مغلوب و مجبور ہو گیا

خیر جب حضرت معاویہؓ خلع خلافت کے بعد خلیفہ وقت قرار پائے حضرت اپنی قوت کے برقرار رکھنے میں برابر کوشاں رہے بلکہ اس کی بھی حضرت نے بڑی کوششیں فرمائیں کہ خلافت حضرت ہی کی نسل میں رہ جائے چنانچہ اس خیال سے حضرت نے استخلاف فرمایا اور اپنے صاحبزادے کی بیعت کے معاملے میں کوششوں کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا بنی ہاشم تو ضعیف ہو ہی چکے تھے مگر اس قبیلے کے دو سردار یعنی امام حسنؓ اور امام حسینؓ ابھی تک زندہ تھے جن کی طرف سے حضرت کو اطمینان حاصل نہ تھا تھوڑے عرصے میں امام حسنؓ کی طرف سے تو اطمینان حاصل ہو گیا یعنی امام حسن علیہ السلام زہر پاکر شہید ہو گئے یہ حادثہ خود حضرت معاویہؓ کے عہد میں واقع ہوا اور اس واقعہ کی نسبت ابو الفدا شاہ حمات اپنی تاریخ المختصر فی احوال البشر میں لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسنؓ کے مسموم کئے جانے کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زہر دلوایا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت کے صاحبزادے یزید ابن معاویہؓ نے زہر دلوایا خیر جو امر صحیح ہو آپ کے مسموم کئے جانے سے دو سرداران بنی ہاشم میں سے ایک کی طرف سے تو خرخشے کا احتمال جاتا رہا اور حضرت کی اس اطمینان یابی کی نسبت صاحب تاریخ الخمیس لکھتے ہیں کہ جب امام حسنؓ کی شہادت کی خبر دمشق میں حضرت کے پاس پہنچی تو حضرت نے اظہار خوشی فرمایا تب حضرت کی بہن فاختہ نے کہا کہ اے معاویہؓ تو سبط رسول اللہ کی موت پر خوش ہوتا ہے تب حضرت نے فرمایا کہ میں سبط رسول اللہ کے مرنے پر اظہار فرح نہیں کرتا

مگر اس خبر سے میرے دل کو راحت نصیب ہوئی لاریب امام حسنؓ کی رحلت
حضرت کے واسطے بڑی طمانیت کی صورت ہوئی مگر اب بھی ایک کس
سردار بنی ہاشم یعنی امام حسینؓ علیہ السلام رہ گئے تھے اور چونکہ یہ امامؓ تمام
اپنے باپ حضرت علیؓ شیر خدا کی طرح صاحب شجاعت تھے ان کی جانب سے
دغدغہ لگا ہوا تھا مگر اس امامؓ عالی مقام کا خاتمہ عہد حضرت معاویہؓ میں مقدر
نہ ہوا تھا اس لئے آپ کی شہادت حضرت کے صاحبزادے کے وقت میں
واقع ہوئی۔ المختصر خاندان رسولؐ اللہ کے گرفتار مصائب ہونے کا سبب
قبیلہ بنی امیہ کا سر نو سے نشو و نما پانا واقع ہوا ہے اگر اس کو سر نو سے
قوت حاصل کرنے کا موقع نہ ملتا تو خاندان رسولؐ اللہ اور بنی ہاشم کو اس
قدر مصیبتیں لاحق نہ ہوتیں واقعی حضرت علیؓ نے بڑی دور اندیشی کی راہ اختیار
کی تھی جو حضرت ابو سفیانؓ کی مستعدی اعانت اور ترغیب دہی کی طرف
توجہ نہ فرمائی ورنہ خاندان رسولؐ مقبول اور بنی ہاشم کی مضرت یابیوں کا
الزام خود حضرت علیؓ پر عائد ہوتا یہ بات روشن اور ہویدا ہے کہ اگر حضرت علیؓ بن
ابی طالب حضرت ابو سفیانؓ کی امداد اور اعانت کو قبول فرما لیتے تو اس
کے صلے میں حضرت علیؓ کو حضرت ابو سفیانؓ کے ساتھ بہت کچھ سلوک کرنا
پڑتا ضرور تھا کہ منصب وزارت حضرت ابو سفیان کو تفویض فرماتے جس کے
ذریعے سے پھر قبیلہ بنی امیہ کو ثروت کی صورت پیدا ہو جاتی صاحب اختیار
ہو کر حضرت ابو سفیانؓ اور قبیلہ بنی امیہ وہی سب کام کرتے جو صاحب
ثروت اور صاحب اختیار ہو کر برابر کرتے گئے البتہ خاندان رسول مقبولؐ

اور بنی ہاشم کو حضرت ابوسفیانؓ اور قبیلہ بنی امیہ کے صاحب ثروت اور صاحب اختیار ہونے سے اس حالت میں کوئی ضرر نہ پہنچتا کہ جب یہ لوگ خاندان رسولؐ اور بنی ہاشم کے سچے دوست دار ہوتے جیسے رسولؐ آلِ رسولؐ اور بنی ہاشم کے یہ لوگ دوست دار تھے اس کی حقیقت جنگ حنین میں ظاہر ہو چکی تھی امر حق یہ ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ اور ان کے قبیلے والے ہمیشہ سے دشمن رسولؐ خدا و جمیع بنی ہاشم چلے آئے تھے. حضرت ابوسفیان نے حضرت علیؑ بن ابی طالب کو امداد و اعانت کی مستعدی خلوص و اتحاد کی بنیاد پر نہیں دکھلائی تھی اس اظہار ہمدردی میں تمام تہ ذاتی غرض پنہاں تھی جس کو حضرت علیؑ خوب سمجھتے تھے اس لئے حضرت نے ایسا جواب دیا کہ حضرت ابوسفیانؓ نے مایوس ہو کر نیل مرام . . . . کی نظر سے دوسری جانب رخ فرمایا اور پورے طور پر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ بڑے مدبر آدمی تھے حضرت نے یہ سوچا تھا کہ حضرت علیؑ بن ابی طالب کو ساتھ لے لینے میں ایک بڑی ظاہر داری رہ جاتی ہے مگر حضرت امیرؑ نے تمام تر بے رخی دکھلائی جس سے وہ جناب رسول اللہؐ کی اس کراہت کے شریک رہے جو آنحضرتؐ کو قبیلہ بنی امیہ کے ساتھ تھی اور ان الزامات کے عائد ہونے سے بھی محفوظ و مامون رہے جو قبیلہ بنی امیہ کے سرلوسے اختیار و قوت حاصل کرنے کے نتائج صریح نظر آتے تھے

۴ ۵. آپ کے لئے آفتاب نے رجعت کی جیسا کہ حضرت یوشعؑ کی دعا پر آفتاب ٹھہر گیا تھا آفتاب کا دعائے حضرت یوشعؑ پر ٹھہر جانا توریت میں مندرج

ہے اسی طرح رجعت آفتاب بہ روایت صحیح ثابت ہے طحاوی کی کتاب
کتاب مشکلات الحدیث میں بہ روایت اسماء بنت عمیس اور بھی کتاب
منتقی میں یہ حدیث مندرج ہے اور جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے
بھی اس حدیث کو اپنی کتاب ازالۃ الخفا کے مقصد دوم میں شرح وبسط
کے ساتھ درج کیا ہے صاحب تاریخ الخمیس حسن ابن محمد ابن حسن دیار
بکری نے بھی اسے داخل کتاب تاریخ مذکور کیا ہے اس حدیث کا منکر
صرف ابن جوزی نظر آتا ہے ابن جوزی دوست دار شاہ ولایت مآب نہ تھا
اس کا انکار قابل اعتبار نہیں ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر معجزہ رجعت خورشید
علیؑ کے لگاؤ سے نہ ہوتا تو یہ شخص اس حدیث کو موضوع قرار نہیں دیتا مگر
دشمنان حضرت علیؑ یا نیچریوں کے انکار سے شان مرتضوی میں کچھ دھبا نہیں لگ سکتا
ع چھپے ہے کہیں خاک ڈالے سے چاند ؛ ع آفتاب آمد دلیل آفتاب ؛
بہر حال رجعت خورشید کا یہ معاملہ ہے کہ ایک دن رسولؐ اللہ پر وحی آ رہی
تھی اور سر مبارک رسولؐ اللہ کا حضرت علیؑ کی گود میں تھا اور اتنی دیر
تک رہا کہ غروب آفتاب ہو گیا اور حضرت علیؑ کی نماز عصر قضا ہو گئی
جب نزول وحی ہو چکا تب جناب رسولِ خدا صلعم نے پوچھا کہ اے علیؑ
تم نے نماز عصر پڑھی؟ آپ نے جواب میں عرض کیا کہ نہیں پس آنحضرت
صلعم نے فرمایا کہ اے میرے خدا علیؑ تھا تیری اور تیرے رسولؐ کی اطاعت
میں پس پھیر دے تو آفتاب کو اسماء بنت عمیس جو راویہ ہیں اور یہ وہ
راویہ ہیں جو بقول آنحضرت صلعم قطعی جنتی ہیں کہتی ہیں کہ ہم نے آفتاب

کو غروب ہو جاتے دیکھا تھا اور پھر ہم نے اسے طلوع ہوتے دیکھا اور
اس کی روشنی زمین اور پہاڑ پر پھیلتی دکھائی دی حضرات ناظرین اس حدیث
سے حضرت علیؑ ابن ابی طالب کا بڑا درجہ معلوم ہوتا ہے اوّل تو وقت نزول وحی
سر مبارک آنحضرت صلعم کا حضرت علیؑ کی گود میں تھا دوئم یہ کہ جب آنحضرت صلعم
نے رجعت خورشید کی دعا فرمائی تو یہ ارشاد فرمایا کہ اے میرے خدا علیؑ
تھا تیری اور تیرے رسولؐ کی طاعت میں سوئم یہ کہ حضرت علیؑ کی نماز ایک ایسی اہم
شے متصور تھی کہ اس کے واسطے رجعت خورشید ظہور میں آئی اس جگہ پر
حضرات مسلمین کی خدمت میں گزارش ہے کہ حدیث بالا سے نماز کی بڑی
ضرورت ظاہر ہوتی ہے جو حضرات مسلمان ہو کہ نماز کو ایک غیر قابل توجہ امر
سمجھتے ہیں وہ اس حدیث پر نظر غور ڈالیں تب ان کو معلوم ہو گا کہ نماز
کیا ضروری شے ہے اگر نماز کوئی ضروری شے نہ ہوتی تو پیغمبر خدا صلعم ایک
غیر ضروری شئے کے لئے رجعت خورشید کی دعا نہیں فرماتے۔ واضح ہو کہ
اس وقت میں کچھ ایسے لوگ دیکھے جاتے ہیں کہ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں
ترکہ وغیرہ مسلمانوں کی طرح بانٹتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ معاشرت
رکھتے ہیں اس کے ساتھ یہی نہیں ہے کہ نماز کاہلی سے نہیں پڑھتے بلکہ نماز
کو ایک شئے حقیر اور قابل نفرت جانتے ہیں ایسے حضرات کو لازم ہے کہ
حدیث کو بغور ملاحظہ فرمائیں تب ان کو از روئے اسلام کے پابندی
نماز کی حاجت معلوم ہو گی اپنے کو مسلمان کہنا اور ترک نماز پر اصرار
عجب مضمون ہے یہ امر بات ہے کہ کوئی مسلمان نماز کا پابند نہیں ہے

مگر جو بالقصد تارک صلوٰۃ ہے وہ صلوٰۃ کو ایک بے حقیقت شے سمجھتا ہے وہ
کیونکہ دعوئی اسلام کر سکتا ہے بلا شبہ نماز کا مکلف ہر ایسا مسلمان
ہے جو اس قدر حواس رکھتا ہے کہ اپنے نفع و نقصان کو پہچانتا ہے اگر
کوئی شخص دیوانہ ہے یا منکر اسلام ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو نماز کی
فرمائش نہیں کی جا سکتی ہے مگر جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور اس
اقرار کے ساتھ روٹی مکھن پلاؤ قلیہ سماع رقص نبل عطر پان حال قال
عرس مولود مجرا ناچ شال دوشالہ کوٹ پتلون گاڑی گھوڑے بنگلہ
کوٹھی تجارت معاش اجارہ ٹھیکہ مدعی مدعا علیہ اور تمام دنیا کے امور
کے مطلب کو سمجھتا ہے اور ان سے متمتع ہوتا ہے تو انکار صلوٰۃ کے ساتھ
مسلمان نہیں ہو سکتا بلا شبہ ایسا شخص مرتد یا زندیق ہے اور تمام تر
دائرۂ اسلام سے خارج ہے یہ تو حالت ان اشخاص کی ہے جو اپنے کو
مسلمان کہتے ہیں یا مسلمان ہونے کا دھوکا خلق خدا کو دیتے ہیں ان کے
علاوہ ایک فرقہ ایسے لوگوں کا ہے جو اپنے کو مسلمان کہتا ہے مگر معجزات
سے انکار رکھتا ہے ایسے لوگوں کے نزدیک شق القمر یا رجعت خورشید
یا جذامی کا صحت پانا وغیرہ امور غیر فطرتی متصور ہیں ایسے حضرات معجزات
سے انکار اس بنیاد پر رکھتے ہیں کہ معاملات فطرت کے خلاف کوئی امر
ظاہر نہیں ہو سکتا ہے یعنی خرق عادات کوئی شے نہیں حقیقت یہ
ہے کہ ایسے حضرات بے حد تنگ چشم اور کم بین ہیں ان لوگوں نے اسی
کو معاملۂ فطرت سمجھ لیا ہے جس قدر ان کے ذہن کو ادراک کی وسعت

حاصل ہوتی ہے ان کے ادراک وفہم سے جو بات باہر ہوتی ہے وہ ان کے نزدیک داخل احاطۂ فطرت نہیں ہوتی مگر اس جگہ اور معجزات انبیا علیہم السلام کو چھوڑ کر صرف رجعت خورشید کو مبحث گردانتا ہوں حضرات ناظرین راقم کی تقریر ذیل پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں۔

معجزات حضرات انبیا علیہم السلام کی نسبت منکرین معجزات برابر یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ معجزہ کوئی شے نہیں ہے اس واسطے کہ معجزہ ایک امر غیر فطرتی یعنی خلاف نیچر ہے پس جو امر غیر فطرتی یا خلاف نیچر ہوتا ہے۔ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا ظاہرا یہ قول ایک غیر باخبر سامع کو قرین پذیرائی معلوم ہوتا ہے مگر یہ قول قلت تدبر سے خبر دیتا ہے جیسا کہ عند التحقیق ثابت ہوتا ہے۔ جاننا چاہئے کہ قول تب ہی صحیح سمجھا جا سکتا ہے جب تک معجزات حضرت انبیا علیہم السلام کے محالات عقلیہ سے مان نہ لئے جائیں ظاہرا ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرات منکرین نے معجزات انبیا کو محالات عقلیہ سے سمجھ لیا ہے حالانکہ جتنے معجزے انبیا کے درج کتب ہیں وہ بلا استثنائے احدے سب کے سب امکانی پہلو رکھتے ہیں ایک بھی ان سے ایسا نظر نہیں آتا ہے کہ محال عقلی کا حکم رکھتا ہو فقیر کی اطلاع میں کسی نبی کی طرف کوئی ایسا معجزہ منسوب نہیں کیا گیا ہے جس کے ممکن الوقوع ہونے میں کسی معقولی کو عذر ہو سکتا ہے البتہ جتنے معجزے بیان کئے گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان کے وقوع ہم لوگوں کے ہر روزہ کے تجربۂ فطرت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن

محالات علقیہ کا حکم نہیں رکھتے حضرات انبیا کے معجزے کتابوں میں پڑھے جاتے ہیں ایک بھی ان سے ایسا نہیں ہے کہ ہندسہ کے علوم متعارفہ یا دیگر مقدمات یقینیہ یا اولیات کے خلاف ہو مثلاً کوئی معجزہ ایسا نہیں بیان کیا جاتا ہے فلاں نبی نے کل سے جز کو اعظم کر کے دکھایا ہے لاریب کسی نبی سے محالات عقلیہ کے خلاف کوئی معجزہ ظہور میں نہیں آیا ہے اور نہ ایسا کوئی معجزہ سنا جاتا ہے جس کے وقوع سے کسی مقدمہ یقینیہ کے وجوب و کلیت میں ذرا بھی فساد لاحق ہوا ہو ایسی صورت میں حضرات نیچریہ کا انکار معجزہ پر اصرار اگر قلت تدبر نہیں ہے تو کیا ہے اب ہم معجزہ رجعت خورشید کی نسبت یہ عرض کرتے ہیں کہ یہ معجزہ محالات عقلیہ سے کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے کوئی منکر معجزہ ہمیں بتا دے کہ یہ معجزہ ہندسہ کے کس علوم متعارف یا کس مقدمہ یقینیہ کے خلاف پایا جاتا ہے اس معجزے میں سوا امکانی پہلو کے وجوب کا پہلو نظر ہی نہیں آتا ہے البتہ جو کچھ اس معجزے کے خلاف میں کہا جا سکتا ہے وہ اس قدر

اس کا وقوع روزانہ کے معاملہ فطرت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا ہے یعنی جس قدر منکر کو معاملہ فطرت کا تجربہ حاصل ہے اسکے خلاف اس معجزہ کا وقوع معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اسقدر بھی معجزات تجربہ ہائے منکرین کے خلاف نہ ہوا کرتے تو پھر معجزات معجزات کیوں کہلاتے حضرات ناظرین غور فرمائیں کہ رجعت خورشید کی نسبت جو کچھ اعتراض منکرین معجزات وارد کر سکتے ہیں وہ اسقدر ہے کہ ہم لوگ ہر روز آفتاب کو ڈوبتے دیکھتے ہیں مگر اسے رجعت کرتے نہیں دیکھتے اور چونکہ یہ بات خلاف فطرت ہے۔ اس لئے ایسا

کوئی معجزہ پیغمبر خدا صلعم سے ظہور میں نہیں آیا تھا ایسے اعتراض سے ظاہر ہے
کہ معترضین نے رائے بالا کے قائم کرنے کے وقت محال و ممکن کے فرق
کو ملحوظ نہیں رکھا تھا ورنہ تمہارا ایسی غیر معقولانہ رائے قائم نہیں کرتے جاری
لحاظ ہے کہ آفتاب کا ڈوب کر رجعت کرنا یا آفتاب کا ٹھہر جانا یا آفتاب
کا مشرق کے عوض مغرب سے طلوع کرنا وغیرہ وغیرہ محالات عقلیہ سے نہیں
ہے یہ بخوبی ممکن ہے کہ کسی خاص سبب سے آفتاب ڈوب کر رجعت
کرے یا ایک جگہ کسی وقت تک ٹھہر جائے یا مشرق کے عوض مغرب سے
طالع ہو۔ ایسے وقوع تمہارا احاطۂ امکان سے باہر نہیں ہیں ایسے وقوع ہم لوگوں
کے لئے حیرت انگیز اس لئے معلوم ہوتے ہیں کہ ہم لوگ اپنے تجربے کے احاطہ
تک کے اندر ایسے وقوع سے اطلاع نہیں رکھتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ
اگر ہم کسی شخص سے جو علم الافلاک سے خبر نہیں رکھتا ہے یہ کہیں کہ چار ہزار برس
پہلے ہمارا اس وقت ہم لوگوں کا قطب شمالی ہے قطب شمالی نہ تھا اس وقت
کا قطب شمالی وہ تارا تھا جس کا نام ثعبان (Alpha Draconis) ہے تو وہ ہمارے
اس قول کو اپنے تجربۂ ذاتی کی بنیاد پر صحیح نہیں مانے گا اسی طرح سیکڑوں
انقلابات سماوی کی نظیریں پیش کی جا سکتی ہیں جن کے سامنے آفتاب کا رجعت
کرنا یا آفتاب کا ٹھہر جانا یا آفتاب کا مشرق کے عوض مغرب سے طلوع کرنا
کوئی شے ہی نہیں ہے خدا جانے دنیا کب سے ہے مگر جس قدر صرف چار ہزار
برس کے اندر کے انقلابات سماوی ظہور میں آئے ہیں وہ کیا کم حیرت افزا ہیں
یہ سب انقلابات شکل امکان رکھتے ہیں ان کو محالات عقلیہ سے وہی سمجھے گا جو

محال و ممکن کی تمیز نہیں رکھتا ہو گا پس حضرات منکرین کا رجعت خورشید سے انکار کوئی معقول پیرایہ نہیں رکھتا ہے اس سبب سے عالی نظروں کے قابل توجہ بھی نہیں ہے اسی منوال پر دیگر معجزات انبیا علیہم السلام کو بھی قیاس کرنا چاہیے اور جاننا چاہیئے کہ جتنے معجزات ظہور میں آئے ہیں و احاطۂ امکان سے باہر نہ تھے اس لئے وہ سب خلاف فطرت بھی نہیں کہے جا سکتے ہیں البتہ معترضین کے احاطۂ تجربہ کے اندر ان کی گنجائش نہیں دیکھی جاتی ہے مگر یہ امر خود تقاضائے معجزہ کے مطابق ہے کس واسطے کہ اگر معجزات کو ایسی گنجائش ہوتی تو معجزہ معجزہ نہ ہوتا۔

۵۵۔ آپ کو اسد اللہ یعنی شیر خدا اور ید اللہ کا خطاب ملا اس امتیاز کے حاصل ہونے کی یہ صورت ہوئی کہ شب معراج آنحضرت صلعم نے ایک مقام پر ایک شیر دیکھا حضرت نے اپنی انگشتری اس شیر کے منہ میں ڈال دی پھر مقام قاب قوسین پر شیر برنج کھانے میں جب ایک ہاتھ خدائے تعالیٰ کی طرف سے نمایاں ہوا تو وہی انگشتری اس ہاتھ میں موجود تھی جب صبح شب معراج کو حضرت نے حضرت علیؑ کو دیکھا تو وہی انگشتری دست علی میں دیکھی اس روز سے آپ کا لقب ید اللہ اور شیر خدا قرار پایا تنگ چشم اس واقعہ سے چشم پوشی کریں تو کریں مگر حضرت علیؑ کے ید اللہ اور شیر خدا کے ملقب ہونے کی وجہ یہی ہوئی ہے جو حوالۂ قلم کی گئی۔ عربی فارسی اور اُردو کے لٹریچر میں یہ ہر دو لقب امیر المومنین کے اکثر دیکھے جاتے ہیں کچھ نہیں تو ان زبانوں کے لٹریچر کے تقاضوں کے خیال سے بھی اس کی توجیہ قابل توجہ ہے جناب شاہ نیاز صاحب فرماتے ہیں

زہے عز و جلالی بو تراب فخر انسانی علی مرتضیٰ مشکلکشائے شیر یزدانی

استاد ناسخ کا شعر ہے ؎

بیعت خدا سے ہے مجھے بے واسطہ نصیب　　　دست خدا ہے نام مرے دستگیر کا

۵۶۔ آپ کو بحکم خدا آنحضرت صلعم نے خرقۂ معراج عنایت فرمایا اس خرقے کے مرحمت ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ صفت ستاری میں یکتا تھے اس صفت کے صلے میں اس خلعت سے آپ سرفراز فرمائے گئے۔ لمؤلفہ

خدا کیونکر نہ دیتا خرقۂ معراج حضرت کو　　　گنہگاروں کے عیبوں کو ہمیشہ آپ نے ڈھانکا

۵۷۔ شب معراج میں آنحضرت صلعم نے عرش پر لکھا دیکھا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ وایدناہ بعلی یعنی خدا کے سوا کوئی معبود نہیں محمد خدا کے رسول ہیں اور محمد کے مددگار علی ہیں شیخ

ناسخ فرماتے ہیں ؎

آج مولد ہے جناب حیدر کرار کا　　　ہو گیا بازو زبردست احمد مختار کا

جناب شمس العلما مولانا محمد سعید صاحب عظیم آبادی نور اللہ مرقدہ کا مطلع ہے ؎

جوہر نصرت عیاں از تیغ ابروئے علی　　　شد قوی دین نبی از زور بازوئے علی

(۵۸) آپ قائل قول سلونی تھے۔ ملا جامی شواہد میں لکھتے ہیں کہ آپ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ جس کا جو جی چاہے سوائے عرش کی بات کے مجھ سے پوچھے میرے سینے میں علم کثیر ہے اس لعاب دہن رسول اللہ کی بدولت جسے ہم نے ذائقہ کیا تھا۔

(۵۹) آپ نے فرمایا کہ ہم بندۂ خدا برادر رسول خدا اور وارث رسول خدا ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ ہم ناکح سیدۃ النساء بنت رسول اللہ اور سید الاوصیا

اور خاتم الاوصیا ہیں اور ہم وہ ہیں کہ ہمارے سوا جو ان فضائل کا دعویٰ کرے اس کو خدائے تعالیٰ مبتلاسے بلا کریگا کذا فی الشواھد

۶۰۔ آپ نے ایک دیر کے قریب چشمہ نکالا اس پر دیر کے راہب نے آپ سے پوچھا کہ آپ نبی یا فرشتہ ہیں آپ نے جواب دیا کہ ہیں وصی پیغمبر آخر الزمان کا ہوں تب اس راہب نے ایمان لاکر یہ کلمہ پڑھا اشھد ان لا الہ اللہ واشھد ان محمّد رسول اللہ واشھد ان علی وصی رسول اللہ یہ بھی حضرت جامی کی شواہد میں مندرج ہیں۔

۶۱۔ آپکا وصی رسول اللہ ہونا حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کے قول سے بھی ثابت ہے۔ **رباعی** علیٌ حُبّہٗ جُنّۃ ٭ قسیم النار والجنہ ٭ وَصی مصطفیٰ حقاً ٭ امام الانس والجنہ ٭

۶۲۔ آپ راہ ہدایت بتانیوالے اور گمراہی سے بچانے والے ہیں۔ حاکم نے کتاب مستدرک میں زید ابن ارقم سے روایت کی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے مَنْ یُرِیْدُ اَنْ یَّحْیٰی حَیٰوتِی وَیَمُوْتَ مَمَاتِیْ وَیَسْکُنَ جَنَّۃَ الْخُلْدِ الَّتِیْ وَعَدَنِیْ رَبِّیْ فَلْیَتَوَلَّ عَلِیَّ ابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ فَاِنَّہٗ لَنْ یُّخْرِجَکُمْ مِنْ ھُدًی وَلَنْ یُّدْخِلَکُمْ فِیْ ضَلَالٍ یعنی جو شخص چاہے جینا ہمارے جینے کے ساتھ اور مرنا ہمارے مرنے کے ساتھ اور رہنا اس بہشت میں کہ جس کا وعدہ مجھ سے میرے رب نے کیا ہے تو چاہیے اس کو کہ تولا کرے علی بن ابی طالب سے کہ وہ تم کو نہ نکالے گا ہدایت سے اور نہ داخل کرے گا گمراہی میں۔

۶۳۔ آپ کا دوست رکھنے والا بہشتی اور آپ کا جھٹلانے والا جہنمی ہے۔

حاکم مستدرک میں عمار بن یاسر سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت رسول خدا نے حضرت علیؑ سے فرمایا یا علی طوبیٰ لمن احبک وصدق فیک وویل لمن ابغضک

۶۴۔ آپ کی نسبت رسول اللہ کو وحی ہوئی کہ سید المومنین اور امام المتقین اور قائد الغر المحجلین ہیں عبداللہ ابن عباس اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا اوحی الی فی علی ثلث انه سید المومنین وامام المتقین وقائد الغر المحجلین

۶۵۔ آپ کا مُنہ دیکھنا عبادت ہے مستدرک میں حاکم عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا النظر الی وجه علی عبادة۔

۶۶۔ آپ بروز قیامت حامل لواء الحمد ہوں گے اور تمام انبیاء اس کے نیچے ہو کر چلیں گے اور وہ لوا آپ کے سر پہ تاج کی طرح چمکیگا۔ دیکھو کتاب معارج النبوت۔

۶۷۔ آپ کو گالی دینی رسول اللہ کو گالی دینی ہے کتاب مشکوٰۃ المصابیح کے باب مناقب علیؑ میں بروایت اُمّ سلمہ یہ حدیث مندرج ہے قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سب علیاً فقد سبّنی رواہ احمد۔ واضح ہو کہ شخص ناواقف کو ایسی حدیث کے سُننے سے وحشت کا پیدا ہونا خلاف توقع نہیں ہے یعنی وہ ضرور خیال کر سکتا ہے کہ علی ایسے آدمی کو جو بہ نفس نفیس ایک قابل احترام اور واجب عزت آدمی تھے اور بھی ایک قریب رشتہ مند رسول کے تھے کوئی کیوں گالی دینے لگا مگر حقیقت حال یہ ہے کہ ایک مدت دراز تک حضرت علیؑ مورد لعن و دشنام رہے ہیں رسول اللہ صلعم کو بہ حیثیت رسول ضرور اس

امر کی اطلاع تھی کہ لوگ حضرت علیؑ کو گالیاں دیں گے اس واسطے ایسا قول ارشاد فرما گئے ظاہر ہے کہ عہد رسول اللہ میں کسی کو اس قدر جرأت کہاں تھی کہ حضرت علیؑ کو گالی دے سکتا اور امر واقعی بھی یہی ہے کہ سبّ و شتم آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد ظہور میں آئے۔ سبّ علیؑ کے موجد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے حضرت ممدوح صرف خود ہی نہیں سبّ علیؑ فرماتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کار خیر پر آمادگی دلاتے تھے چنانچہ حضرت ممدوح کی تبعیت میں اس دشنام دہی کا طریقہ خوب جاری ہوا اور کبھی نہ جاری ہوتا جب حضرت ممدوح اپنے عہد کے امیر المومنین اور خلیفہ برحق تھے حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت علیؑ کے سبّ پر اس قدر اصرار تھا کہ حسب تحریر ابوالفدا و دیگر مصنفین جب امام حسن علیہ السلام نے حضرت ممدوح کو نامہ صلح لکھا تو منجملہ اور شروط کے یہ شرط بھی حوالۂ قلم کی کہ حضرت علیؑ کو بُرا نہ کہا کرو مگر حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ تعالیٰ نے اس شرط کو قابل پذیرائی نہ سمجھا ناچار تب امام حسن علیہ السلام نے یہ کہا کہ جس مجلس میں مجھ کو پاؤ میرے سامنے حضرت علیؑ کو گالی نہ دو بہر کیف یہ شرط قبول ہوئی۔ خیر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو رائے ہو شریف جو رسول اللہ صلعم حضرت علیؑ کی دشنام دہی کو علیؑ اپنی دشنام دہی سمجھتے تھے جیسا کہ حدیث بالا میں حوالۂ قلم ہوا۔

۴۸۔ آپ ہمیشہ مورد مراحم نبویؐ رہے مگر مواقع ذیل میں حضرت رسول خدا نے خاص طور پر آپ کی عزت بخشی فرمائی اور ایسے الفاظ استعمال فرمائے جن سے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری جمیع مومنین پر فرض نظر آتی ہے۔

وصی ہے اور میرا وارث ہے اور میرا خلیفہ ہے میرے گھر میں اور میری اُمت میں اور میرے بعد میرے دین کو چلاتے گا اور کوئی شخص ادائے حق مجھ سے نہ کرے گا۔ الا علی۔ اس معاملۂ تبلیغ کو شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی ازالۃ الخفا میں ذکر فرمایا ہے۔

موقع ۵ :۔ ایک بار آنحضرت صلعم نے حضرت علیؑ کو سردار عرب فرمایا چنانچہ مستدرک میں بروایت حضرت عائشہؓ حدیث ذیل مندرج ہے اور ازالۃ الخفا میں شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہم ادعوا لی سید العرب فقلت یارسول اللہ الست سید العرب قال انا سید ولد آدم و علی سید العرب

ترجمہ :۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ سردار عرب کو میرے پاس بلاؤ تو میں نے کہا یا رسولؐ اللہ کیا آپ سردار عرب نہیں ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں سردار اولاد آدم ہوں اور علیؑ سردار عرب ہے۔

موقع ۶ :۔ پیغمبر خدا صلعم نے آپ کو سید المومنین و امام المتقین و قائد الغر المحجلین فرمایا یہ القاب آپ کے لئے مختص ہیں۔

موقع ۷ :۔ پیغمبر خدا صلعم نے آپ کو یہ فرمایا کہ تو میرے بعد ہر مومن اور مومنہ کا امام و سردار ہے ازالۃ الخفا میں یہ حدیث بروایت حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ مندرج ہے اور وہ حدیث یہ ہے قال لہٗ دای یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انت ولی کل مومن من بعدی و مومنۃ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں ولی کے معنی سوا سردار اور امام کے دوست

ناصر محبوب وغیرہ ہو ہی نہیں سکتے۔ اس واسطے کہ من بعدی کا لفظ ان میں ہے کسی معنی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

موقع ۸ :۔ ایک بڑے مجمع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب نص دل دی یہ فرمایا کہ کسی کا دروازہ مسجد نبوی میں سوا علی مرتضیٰ کے دروازے کے کھلا نہیں رہے اس کی تعمیل کی گئی اور یہ امر بہت اشخاص کے لئے موجب حسد ہوا۔ کتاب جذب القلوب میں یہ قصہ مندرج ہے اور اس کی حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے اسی طرح رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اے علیؑ یہ مسجد میرے اور تیرے سوا کسی شخص جنب پر حلال نہیں ہے پھر آنحضرت صلعم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال اس طرح دی کہ حکم خداوندی صادر ہوا کہ اے موسیٰؑ تو ایک مسجد پاک بنا اور اس میں ... سوا تیرے اور ہارونؑ اور پسران ہارونؑ کے کوئی شخص ساکن نہ ہو۔

موقع ۹ :۔ پیغمبر خدا نے ایک بار جناب امیرؑ کو اپنا نائب اور قائم مقام اس طرح مقرر فرمایا کہ آپ کے سر پہ دستار اپنے دست مبارک سے باندھی پھر آپ کو اپنے شتر پہ سوار کر کے کفار کی جانب روانہ فرمایا اور وقت روانگی یہ ارشاد زبان مبارک پہ لائے کہ اگر ایک شخص بھی علی مرتضیٰ کے ہاتھ پہ ایمان لائے گا تو وہ دنیا و ما فیہا سے افضل ہو گا اس کے ساتھ آنحضرتؐ نے یہ دعا بھی بحق علی مرتضیٰؑ فرمائی کہ اللھم ثبت لسانہ واھد قلبہ اور آپ کی منقبت میں اقضاکم علیؓ ارشاد فرمایا دیکھو جناب شیخ عبدالحق صاحب دہلوی کی مدارج النبوۃ جلد دوم صفحہ ۲۲۹ و ۲۳۰۔

موقع ۱۰ :۔ جب ملک یمن کے غنائم کی نسبت حضرت خالدؓ بن ولید نے لوگوں کو ترغیب دے کر شکایت علیؑ کی نظر سے رسولؐ خدا کے پاس بھیجا تو غصّے سے آنحضرت صلعم کا چہرہ سرخ ہو گیا صاحب مدارج النبوۃ لکھتے ہیں کہ اس وقت آنحضرتؐ نے فرمایا کہ علیؑ کی شان میں گمان بد نہ کرو اس لئے کہ وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور وہ ولی تمہارا ہے جس شخص کے ہم مولا ہیں اس کا علی مولا ہے۔ ولی اور مولا سے صاف مراد حاکم ہے۔ یعنی اس کے حکم میں کسی مسلمان کو سرتابی نہیں چاہئے کس واسطے کہ جیسے ہم تم لوگوں کے حاکم ہیں ویسا ہی علیؑ تم لوگوں کا حاکم ہے پس مال غنائم کی تقسیم میں اس کا جو حکم ہے تم لوگوں کو اس کے حکم میں شکایت کی مجال نہیں ہے۔

موقع ۱۱ :۔ جب رسول خدا صلعم تبوک کو تشریف لے جانے لگے تو آنحضرت صلعم نے جناب امیرؑ کو اپنا خلیفہ اور جانشین مدینہ میں مقرر فرمایا حضرت علیؑ کے واسطے یہ امر نہایت موجب فخر کا تھا مگر منافقوں نے عداوت سے یہ مشہور کرنا چاہا کہ رسول خدا صلعم کو آپ کی طرف سے کدورت لاحق ہو گئی ہے اس لئے آپ کو مدینہ میں چھوڑ کر تبوک کو تشریف فرما ہوتے ہیں حضرت علیؑ نے بحضور رسولؐ خدا عرض کی کہ حضور مجھے بچوں اور عورتوں پر خلیفہ مقرر فرماتے ہیں حالانکہ میں نے پانچ لڑائیوں میں کبھی تخلف نہیں کیا۔ اس پر رسولؐ اللہ نے حضرت ہارون اور حضرت موسیٰؑ کی مثال دی اور فرمایا کہ تم میرے نزدیک ایسے ہو جیسا کہ ہارون موسیٰؑ کے لئے تھے اور یہ مثال اس قصّے پر مبنی ہے کہ جب حضرت موسیٰ میقات پر تشریف لے گئے تھے تو حضرت ہارونؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کر گئے اس قصّے کے متعلق جو حدیث ہے وہ ذیل میں عرض کی

جاتی ہے۔ اخرج البخاری عن مصعب بن سعد عن ابیہ ان رسول اللہ صلعم خرج الی تبوک واستخلف علیا فقال اتخلفنی فی الصبیان والنساء قال الا ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لیس نبی بعدی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی مدارج النبوۃ میں اس حدیث کو صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے داخل کرتے ہیں لاریب یہ حدیث حضرت علی مرتضیٰؑ کے بڑے علو مرتبہ سے خبر دیتی ہے مگر جو معاندین علی ہیں اور جو تنقیص شان مرتضویؑ میں کوشاں رہتے ہیں ان کا قول ہے کہ اس حدیث سے کوئی خاص عزت شاہ ولایت مآب کی ثابت نہیں ہوتی ہے اس واسطے کہ رسول خدا صلعم نے آپ کو اپنے اہل وعیال پر خلیفہ مقرر فرمایا تھا عام اہل مدینہ پر خلیفہ نہیں مقرر فرمایا تھا اول تو اہل عناد کا یہ قول خود ہی لغو ہے اس واسطے کہ رسول اللہ نے جب ہارونؑ اور حضرت موسیٰؑ کی مثال بیان فرمائی تو آپ کا جمیع اہل مدینہ پر خلیفہ ہونا ظاہر ہو گیا دوم یہ کہ جب آپ اہل وعیال رسولؐ اللہ پر خلیفہ بنائے گئے تو عوام اہل مدینہ کیا شے ہیں جن پر آپ کے خلیفہ ماننے جاننے میں کوئی عذر کیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معاندین کے خیال میں اہل وعیال رسول اللہ عوام اہل مدینہ سے افضل واشرف نہ تھے تب ہی تو ایسی لنگڑی عذر داری پیش کی جاتی ہے۔ سبحان اللہ کیا اہل بیت وعترت رسول اللہ کی قدر دانی ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ تعصب آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔ اللھم احفظنا من ذلک۔

موقع ۱۲:۔ سنہ ہجری میں جناب رسول خدا صلعم نے منادی فرمائی

کہ آنحضرت صلعم حج کو تشریف لے جانے کو ہیں جس شخص کو شریک حج ہونا منظور ہو مدینہ میں آئے اور ہم رکاب جناب رسالت مآب کے چلے یہ خبر پا کر ہزاروں آدمی قبائل عرب سے حاضر ہو گئے اور رسول خدا صلعم ایک مجمع کثیر کے ساتھ مکہ معظمہ کو تشریف فرما ہوئے جناب امیرؑ یمن میں تھے آپ بھی اس ملک سے روانہ ہو کر مکہ میں رسول خدا صلعم کے حضور میں پہنچے حضرت رسول خدا نے مناسک حج ادا فرمائے ایک خطبہ بھی نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ پڑھا اس خطبے میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اب وفات میری بہت نزدیک ہے اور قریب ہے کہ فرستادۂ خدائے عزوجل آئے اور میں لبیک کہوں پس میں اپنے بعد تم لوگوں میں دو چیز عالی قدر چھوڑتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے بڑی ہیں اور وہ آپس سے جدا نہ ہوں گی تا وقتیکہ حوض کوثر پہ میرے پاس پہنچیں اگر تم لوگ ان کی پیروی کرو گے اور ان کے ساتھ متمسک ہو گے تو ہرگز گمراہی میں نہ پڑو گے اور وہ دو چیز عالی قدر قرآن مجید اور میرے اہلبیت ہیں ترمذی جابرؓ سے جو حدیث روایت کرتے ہیں وہ یہ ہے عن جابر قال رایت رسول اللہ صلعم فی حجۃ یوم العرفۃ وھو علی ناقۃ القصوی یخطب فسمعتہ یقول یا ایھا الناس انی ترکت فیکم ما ان اخذتم بہ لن تضلوا کتاب اللہ وعترتی یعنی حضرت جابرؓ روایات کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا رسول اللہ کو حج میں بروز عرفہ درحالیکہ آنحضرت صلعم اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار تھے اور خطبہ فرما رہے تھے پس ہم نے رسول خدا صلعم کو یہ کہتے سنا کہ اے لوگو ہم نے بہ تحقیق تم لوگوں میں وہ چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اس کو پکڑو گے تو ہرگز

گمراہ نہ ہو گے یعنی قرآن اور میرے اہلبیت یہ حدیث سعد ابن وقاص
سے بھی مروی ہے اور تحفہ اثنا عشریہ میں بھی جناب شاہ عبد العزیز صاحب
اس حدیث کو اس طور پر مندرج فرماتے ہیں۔ انی تارک فیکم الثقلین ان
تمسکتم بہما لن تضلوا بعدی احدہما اعظم من الآخر کتاب اللہ وعترتی
اسی طرح جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی ازالۃ الخفا میں اس حدیث
کو درج کیا ہے اور یہ حدیث صحیح و متواتر ہے اور کسی کو اس حدیث کی
صحت میں جائے گفتگو نہیں ہے بہر حال جب حج سے رسولؐ خدا نے فراغت
پائی تو آنحضرتؐ نے مدینہ کو معاودت فرمائی راہ میں جس وقت مقام
خم غدیر کو پہنچے کہ ذی الحجہ کی اٹھارھویں ۱۸ تاریخ تھی اور ظہر کا وقت تھا جبرئیل
امین یہ خطاب رب العزت سے لائے یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک
من ربک فان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس یعنی
اے رسولؐ پہنچا دے اس پیغام کو جو نازل کیا گیا ہے تیری طرف تیرے
رب کی جانب سے پس اگر تو یہ نہیں کرتا ہے تو گویا ہماری رسالت کی
تبلیغ نہیں کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ کو آدمیوں کے شر و فساد سے محفوظ رکھے
اس وحی کے نازل ہونے پر آنحضرت صلعم وہاں ٹھہر گئے اور لوگوں کو ہر سو
سے مجتمع فرمایا۔ جاننا چاہئے کہ خم غدیر ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں سے
مختلف راہیں نکلی ہیں جب معاودت کے وقت رسول اللہ صلعم کے
ہمراہیان حج یہاں پہنچے تو بہت سے لوگ مختلف راہوں سے اپنے اپنے
گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے پس رسولؐ اللہ نے ان لوگوں کو بلانے کے

واسطے آدمی بھیجے جب گئے ہوئے لوگ واپس آچکے اور بھی جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے رسول خدا سے آملے تب آنحضرت نے نماز پڑھی اور چار کجاوں کا منبر بنایا اور اس پر چڑھ کر ستر ہزار آدمی کی طرف خطاب کر کے فرمایا الستم تعلمون انی اولیٰ بالمومنین من انفسہم یعنی آیا تم نہیں جانتے کہ میں بہتر دوست تر دنزدیک تر مومنوں کا ہوں ذات مومنان سے سامعین نے جواب میں عرض کیا بلیٰ صاحب مدارج النبوۃ اس قول نبوی کے یہ معنیٰ بتلاتے ہیں کہ میں مومنوں کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتا کہ جو ان کی صلاح ونجات وخیریت دنیا وآخرت کے خلاف ہو بخلاف ان کے نفوس کے کہ ان سے کبھی شر وفساد کا بھی احتمال ہے بعد ازاں آنحضرت نے فرمایا کہ میں تم لوگوں میں دو امر عظیم چھوڑے جاتا ہوں کہ ایک ان میں سے دوسرے سے بزرگ تر ہے اور وہ قرآن واہل بیت ہیں ان سے خبردار رہنا اور دیکھنا کہ ان کے ساتھ تم کیا سلوک کرتے ہو اور ان کے حقوق کس طرح ادا کرتے ہو اور یہ دونوں امر میرے بعد ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہونگے یہاں تک کہ وہ مجھ تک حوض کوثر پر پہنچیں۔ اسکے بعد آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ میرا مولا خدا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں۔ اسکے بعد دست علی کو پکڑ کر فرمایا۔ اللھم من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ وادر الحق حیث دار۔ یعنی اے خدا میرے جسکا مولیٰ میں ہوں۔ پس اس کا مولیٰ علی ہے۔ اے اللہ میرے تو دوست رکھ اسکو جو دوست رکھے علی کو اور تو

دشمن ہو اس کا جو دشمن ہو علیؑ کا اور تو مددگار ہو اس کا جو مددگار ہو علیؑ کا
اور تو چھوڑ اس کو جو علیؑ کو چھوڑ دے اور پھیر حق کو ساتھ علیؑ کے جس طرف وہ
پھرے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلعم نے حضرت امیرؑ کو ایک خیمہ میں بیٹھنے
کے واسطے حکم دیا تاکہ مومنین آپ کو مولائے مومنین ہونے کی مبارک باد دیں
چنانچہ ازواج مطہرات نے آپ کے خیمہ میں جاکر آپ کو مبارک باد دی اور
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان پُر زور لفظوں سے مبارک باد فرمائی
بخ بخ یا ابا الحسن لقد اصبحت مولائی و مولا کل مومن و مومنۃ اس
خطبہ خم غدیر کے بعد یہ آیت نازل ہوئی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ
اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا یعنی آج کے دن
کامل کیا میں نے دین تمہارا اور تمام کی تم پر اپنی نعمت اور راضی ہوا میں
واسطے تمہارے دین اسلام سے۔ امام احمدؒ ابن حنبل جو ائمہ اربعہ اہل سنت
سے ہیں تحریر فرماتے ہیں کہ بعد نازل ہونے آیت الیوم اکملت لکم
دینکم کے رسول اللہ نے فرمایا۔ الحمد للہ علی اکمال الدین واتمام
نعمتہ ورضایہ برسالتی وولایت علیؑ من بعدی یہ قصہ خم غدیر کا
حبیب السیر میں بھی مندرج ہے یہ تاریخ فارسی زبان میں ہے معمولی
حیثیت کا آدمی بھی اس کو خود دیکھ سکتا ہے واضح ہو کہ اس قصہ غدیر
کو صحابیوں کی ایک جماعت کثیر اور تابعین اور محدثین کے ایک گروہ
غفیر نے روایت کی ہے اڑہائی سو علمائے شافعی نے بھی حدیث خم غدیر
کو حوالہ قلم کیا ہے منجملہ ان کے علامہ مغربی نے ایک نہایت خوب قصیدہ

تہنیت خم غدیر کا منقبت علی مرتضیٰ میں تصنیف فرمایا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے

اومَن بالتاویل ماکان مشکلاً　　علیٌّ بعلم ناله بالوصیة

المختصر یہ معاملہ غدیر کا تاریخ اسلام میں بہت کچھ ممتاز صورت نظر آتا ہے اور جو اس کے تمام اجزا پر غور کیجئے تو ایک بڑے اہم امر سے خبر دیتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول خدا صلعم نے اپنے بعد کا کوئی ضروری انتظام خود اپنے عین حیات میں انجام کرنا چاہا تھا اور نہ بہار لاتے بڑے اہتمام سے ایک ایسے معمولی امر کو مراد نہیں رکھا تھا کہ جس سے اسی قدر ظاہر ہو کہ علیؑ ناصر اور دوستدار مومنین کے ہیں جیسا کہ شیخ ابن حجر وغیرہ کا قول ہے ارباب انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ اگر رسول اللہ کو اسی قدر بیان کرنا منظور ہوتا کہ علی ناصر اور دوستدار مومنین ہیں اور ان کے حاکم اور ان کے متصرف بامور دینا و دین نہیں ہیں تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ خدائے تعالیٰ بذریعہ وحی کے رسولؐ اللہ سے اس موکدانہ طور پر خطاب فرماتا کہ اے رسولؐ پہنچا دے اس پیغام کو جو نازل کیا گیا ہے تیری طرف تیرے رب کی جانب سے پس اگر تو یہ نہیں کرتا ہے تو گویا میری رسالت کی تبلیغ نہیں کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ کو آدمیوں کے شر و فساد سے محفوظ رکھے گا یہاں　به جزو آیت واللہ یعصمک بھی قابل لحاظ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم اہل شر و فساد منافقین وغیرہ سے مطمئن نہ تھے اور ان کی طرف سے فساد کا احتمال غالب تھا اس لئے اللہ تعالیٰ آنحضرتؐ سے وعدۂ حفاظت فرماتا ہے پھر اس آیت کے نازل ہوتے ہی آنحضرتؐ کا عمل اس طرح ہمراہیان حج کو جمع فرماتے اور

پالان شتر سے منبر بنا کر اس پر چڑھتے اور ان سے یہ سوال فرماتے کہ آیا ہم تم لوگوں سے از روئے تمہارے نفسوں کے اچھے با نزدیک تر یا دوست تر ہیں پھر ان سے جواب میں قول بلیٰ پا کر کتاب اللہ اور اپنی عزت کے متمسک ہونے کی تاکید فرماتے پھر خدا کو اپنا مولیٰ اور اپنے کو تمام مومنین کا مولا بنا کر دست علیؑ کو پکڑتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ اے خدا میرے جس کا مولیٰ میں ہوں پس اس کا مولیٰ علیؑ ہے اے اللہ میرے تو دوست رکھ اس کو جو دوست رکھے علیؑ کو اور تو دشمن ہو اس کا جو دشمن ہو علیؑ کا اور تو مددگار ہو اس کا جو مددگار ہو علیؑ کا اور تو چھوڑ اس کو جو چھوڑے علیؑ کو اور تو پھیر حق کو ساتھ علی کے جس طرف وہ پھرے اگر اتنے اہتمامات سے مراد خدا اور رسولؐ اسی قدر تھی کہ علی مجرد ناصر و دوستدار مومنین کہے جائیں تو دنیا میں کسی نبی یا کسی بادشاہ یا کسی حاکم یا کسی مدبر نے ایسی فضول کارروائی نہیں کی ہے اس پر طرہ یہ ہے کہ جب کلمات بالا آنحضرت صلعم بحق علی مرتضیٰؑ فرما چکے تب آپ نے تہنیت کی ہدایت فرمائی اور امہات مومنین اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ادائے مبارک باد فرمائی اور بقول امام حنبل علیہ الرحمتہ بعد نازل ہونے آیت الیوم اکملت لکم دینکم کے خود رسول اللہ صلعم نے ادائے سپاس الٰہی کے طور پر یہ فرمایا الحمد للہ علی اکمال الدین واتمام نعمۃ ورضا ئہ برسالتی وولایت علی من بعدی ظاہر ہے کہ یہ مبارک بادیاں اور یہ ادائے سپاس صرف اتنی بات کی بنیاد پر ظہور میں نہیں آئی تھیں کہ حضرت علیؑ ناصر یا دوستدار مومنین ہیں دنیا و دین دونوں میں حق پسندی انسان کے لئے

ایک نہایت مفید امر ہے حضرات ناظرین بانمکین اس قصے کے تمام اجزا کو ملحوظ رکھ کر اپنی رائے قائم فرمالیں اس سے زیادہ راقم الحروف اور کیا گزارش کر سکتا ہے۔

واضح ہو کہ مناقب علی علیہ السلام میں جن آیات قرآنی واحادیث نبویؐ ودیگر معلامات سیر وتاریخ کو فقیر نے بالا میں عرض کیا ہے اکثر ان میں ایسے ہیں کہ عربی وفارسی واردو کے لٹریچر میں ان کی طرف حوالات واشارات ہوا کرتے ہیں مذہبی شاعری میں ان کو بہ کثرت دخل رہا ہے منقبت کی غزلیں قصیدے مسدس مثنویات رباعیات وغیرہ ان سے خالی نہیں ہوتیں فردوسی سعدی سنائی انوری حافظ جامی مولوی روم ملا محتشم کاشی قاآنی اور دیگر شعرائے نامی وگرامی سبھوں نے کچھ نہ کچھ ان آیات قرآنی۔ احادیث نبوئی اور دیگر معاملات سیر وتاریخ کو اپنی منقبت نگاریوں میں جگہ دی ہے یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی شخص امور بالا سے ناواقف رہ کر منقبت کی غزلیں قصیدے مسدس مثنویات رباعیات وغیرہ سمجھ سکے ذیل میں راقم ایک اپنی مذہبی غزل درج کرتا ہے جس میں کچھ مضامین ایسے منظوم ہیں کہ جو امور بالا سے تعلق رکھتے ہیں

غزل

مزین مدّ بسم اللہ سے مطلع ہے دیوان کا
الٰہی ہوا شہ میرے بیاں ہیں حسن قرآن کا

فزوں ادراک سے ہے مرتبہ شاہِ سولاں کا
اسے سرتاج خالق نے بنایا جن وانسان کا

فقیری میں مجھے بخشا خدا نے اوج سلطاں کا
گدا مجھکو بنایا آستانِ شاہِ مرداں کا

رولاتا ہے لہو آنکھوں سے غم شاہِ شہیداں کا
مرے گریہ سے دل ہے پانی پانی ابر بلاں کا

نمودِ شکلِ ہستی کن فکاں کی کارسازی ہے ظہورِ ہر دو عالم سے اشارہ تیرے فرماں کا

توانائی وہ ہر ناتواں کا دستِ خالق ہے جو آنکھیں ہوں کہے کوئی تماشا پیرِ کنعاں کا

تغافل اس کا رستم کو بنا دے زال سے بدتر توجہ اس کی بخشے مور کو رتبہ سلیماں کا

تری معراج سے معراج پائی عرشِ اعظم نے فلک کہتے ہیں جس کو ہے وہ نسبہ تیرے ایواں کا

طہارت پنجتن کی آیتِ قرآں سے ثابت ہے نجس خود ہے جو منکر ہو کلامِ پاکِ یزداں کا

زہے توقیر و شانِ آستانِ عرش پیرامن بلا گرداں فلک ہے گنبدِ شاہِ خراساں کا

علیؑ سے تا بہ مہدیؑ یہ امام ہر دو عالم ہیں ہر اک ان میں ہے حکمِ حق سے رہبر جن و انساں کا

علیؑ ہے راز دانِ حق علیؑ ہے ہم زبانِ حق علیؑ ہے ترجمانِ حق علیؑ معنی ہے قرآں کا

سرِ جیلِ اماماں ہے امامِ پاکبازاں ہے امم کا مقتدی ہے پیشوا ہے اہلِ ایماں کا

پڑھی نادِ علیؑ جب حکمِ رب سے سرورِ دیں نے کھلا جوہر احد میں ذوالفقارِ شاہِ مرداں کا

شہا جس دم تیرا بحرِ توجہ جوش پر آیا ہوا غرقِ فنا دم میں عدو موسیٰ عمراں کا

اٹھایا پردہ ظلمت کو تیرے نور نے ورنہ نہاں تھا خضر کی آنکھوں سے چشمہ آبِ حیواں کا

اٹھا دنیا سے عیسیٰؑ نامِ پاکِ مرتضیٰؑ لیتا علیؑ نامِ خدا ہے مومنو ہمنام یزداں کا

ہوا تو حکمِ حق سے ناخدائے زورقِ نصرت نہ پہنچا کوئی صدمہ نوحؑ کی کشتی کو طوفاں کا

کیا سجدہ ملائک نے تجھے آدم کی صورت میں ہوا گمراہی شیطاں کا باعث عار شیطاں کا

خلیل اللہ کو تیرے کرم نے امن میں رکھا دکھایا آتشِ نمرود نے جلوہ گلستاں کا

علیؑ کے ہاتھ میں کونین کی عقدہ کشائی ہے امامِ جنی و انسی ہے مالک جسم کا جاں کا

ہمارا طائرِ دل ہے کبابِ آتشِ الفت نہ ہو کیونکر اثر اس میں حدیثِ طیر بریاں کا

وہ بلبل ہوں کہ باغِ منقبت میں شور ہے اپنا مرے نغموں سے دم ہے بند مرغانِ خوش الحاں کا

خدا کیونکر نہ دیتا خرقۂ معراج حضرت کو — گنہگاروں کے عیبوں کو ہمیشہ ہے چھپانے ڈھانکا

نبیؐ سے اے فخر دیں تو نے پائی دختر ذی شانؑ — کیا حق نے تجھے مورد عطائے تیغ براں کا

ولا تیری نہ ہو جس میں مسلماں ہو نہیں سکتا — مسلماں کا جو معنیٰ ہے وہی معنیٰ ہے سلماں کا

سنا ہے آفتابِ حشر میں گرمی بہت ہوگی — شہا سایہ ملے روزِ قیامت تیرے داماں کا

بجا ہے گر اثر کی ذات پہ نازش کرے دوراں
فلک سے ہے زیادہ مرتبہ تیرے ثنا خواں کا

منتخبات از دیوان امیر المومنین علی علیہ السلام

نفی نسبت طینی و مدح علم و دین

اَلنَّاسُ مِنْ جِهَةِ التِّمْثَالِ اَكْفَاءُ — اَبُوْهُمْ اٰدَمُ وَ اُمُّهُمْ حَوَّاءُ

معنی: جمیع افراد انسان شکل ظاہری کے اعتبار سے یکساں ہیں باپ سبھوں کے آدمؑ ہیں اور ان کی ماں حوّاؑ ہیں۔ یعنی تمام انسان جسمی ترکیب کے رو سے برابر ہیں اس واسطے کہ سبھوں کے ماں باپ وہی آدم و حوّا ہیں پس تفاخر نسب کوئی شئے نہیں ہے اگر تفاخر کوئی جائز کوئی امر ہے تو اس کا سبب نسب نہیں ہو سکتا۔

واضح ہو کہ کلام بالا کی عمدگی محتاج بیان نہیں ہے سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

ظاہرا شیخ علیہ الرحمہ کی کریما بوستان اور گلستان کا ماخذ دیوان امیر المومنین علیہ السلام معلوم ہوتا ہے جس قدر کلمات حکیمانہ و فلسفیانہ ان کتابوں میں موجود

ہیں وہ سب کے سب اس دیوان میں پائے جاتے ہیں بلا شبہ حضرت
شیخ نے مولا علیہ السلام کے اقوال نہایت توجہ کے ساتھ مطالعہ فرمائے ہیں
اس لئے ان کتابوں کو ایسی مقبولیت حاصل ہے ۔

وَاِنَّمَا اُمَّهَاتُ النَّاسِ اَوْعِیَةٌ مُسْتَوْدَعَاتٌ وَلِلْاَحْسَابِ اٰبَاءُ

معنی :۔ اور نہیں ہیں آدمیوں کی مائیں الاظرف کہ جس میں ودیعت نطفہ ہوتی
ہے اور احساب کے لئے باپ ہیں. یعنی مادران مردم ظروف کی حیثیت رکھتی
ہیں ان میں نطفہ سپرد ہوا کرتا ہے مگر حساب نسب کا باپ کی طرف سے ہوتا ہے
اور باپ ہی کا فضل و شرف پایۂ اعتبار رکھتا ہے چنانچہ سیادت کی نسبت بھی باپ
ہی کی جانب سے ہوتی ہے ماں کی جانب سے سیادت سے کوئی شخص سید نہیں ہو سکتا
ایسے شخص کو فقہا شریف کہتے ہیں سید نہیں کہتے ۔

فَاِنْ یَکُنْ لَهُمْ مِنْ اَصْلِهِمْ یُفَاخِرُوْنَ بِهٖ فَالطِّیْنُ وَالْمَاءُ

معنی :۔ پس اگر انہیں از روئے اصل و نسل کے کوئی ایسی وجہ شرف حاصل
ہے جس پر وہ فخر و مباہات کرتے ہیں تو ان کی اصلیت اسی قدر ہے کہ ان کی
خلقت مٹی اور پانی سے ظہور میں آئی ہے ۔

وَاِنْ اَتَیْتَ بِفَخْرٍ مِنْ ذَوِیْ نَسَبٍ فَاِنَّ نِسْبَتَنَا جُوْدٌ وَعَلْیَاءُ

معنی :۔ کسی کو اہل علم کے سوا فضل حاصل نہیں ہے بہ تحقیق کہ اہل علم راہ ہدایت
پر ہیں اور جو شخص ان سے طلب ہدایت کرتا ہے اس کے وہ راہبر ہوتے ہیں
یعنی اہل علم کے سوا کسی کو شرف حاصل نہیں ہے ذریعۂ فضیلت علم ہے نہ نسب
اور نہ اسباب دنیا سے کوئی شے ہے

بنی آدم از علم یابد کمال　　نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

وَقِيمَةُ الْمَرْءِ مَا قَدْ كَانَ يُحْسِنُهُ　　وَالْجَاهِلُونَ لِأَهْلِ الْعِلْمِ أَعْدَاءُ

معنی :۔ اور آدمی کی قیمت وہی ہے جو اس کا علم ہے اور جاہلوں کا طریہ ہے کہ اہل علم کے دشمن ہیں ۔

فَقُمْ بِعِلْمٍ وَلَا تَبْغِي لَهُ بَدَلًا　　فَالنَّاسُ مَوْتَى وَأَهْلُ الْعِلْمِ أَحْيَاءُ

معنی :۔ پس چاہیے کہ ہم لوگ شیوۂ علم اختیار کریں اور علم کا بدل نہ ڈھونڈیں اس لئے کہ اشخاص بے علم مُردوں کے برابر ہوتے ہیں اور اہل علم زندوں کا حکم رکھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جہالت موت کے برابر ہوتی ہے اور جاہل مردہ سے کم نہیں ہوتا ۔

تحذیر از مجالست جاہلان و تنفیر از موانست غافلان

وَلَا تَصْحَبْ أَخَا الْجَهْلِ وَإِيَّاكَ وَإِيَّاهُ　　فَكَمْ مِنْ جَاهِلٍ أَرْدَى حَلِيمًا حِينَ آخَاهُ

معنی :۔ جاہلوں کے ساتھ صحبت نہ رکھ اور ان سے تمام تر کنارہ رہ اس واسطے کہ جاہلوں کے ساتھ مواخات کرنے سے مرد حکیم کو ہلاکت منتج ہوتی ہے

ز جاہل گریزندہ چوں تیر باش　　نہ آمیختہ چوں شکر شیر باش

ترا اژدہا گر بود یار غار　　ازاں بہ کہ جاہل بود غمگسار

يُقَاسُ الْمَرْءُ بِالْمَرْءِ إِذَا مَا هُوَ مَا شَاهُ　　وَلِلشَّيْءِ مِنَ الشَّيْءِ مَقَايِيسُ وَأَشْبَاهُ

معنی :۔ آدمی جس شخص کی ہمراہی کرتا ہے اسی کا سا قیاس کیا جاتا ہے اور ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ایسی نسبت قیاس و مشابہت ہوا کرتی ہے کہ جس کے ذریعہ سے استدلال کی صورت پیدا ہوتی ہے ۔

وَلِلْقَلْبِ عَلَى قَلْبٍ دَلِيْلٌ حِيْنَ يَلْقَاهُ۔

معنی :۔ اور واسطے قلب کے اوپر قلب دیگر کے ہدایت ہے جب کہ قلب قلب سے ملتا ہے یعنی ایک شخص دوسرے کا ملاقی ہوتا ہے تو اس کا قلب دوسرے قلب سے ہدایت پاتا ہے۔

شکایت از روزگارِ غدار و حکایت دوستانِ بے اعتبار

تَغَيَّرَتِ الْمَوَدَّةُ وَالْإِخَاءُ ۔۔۔ وَقَلَّ الصِّدْقُ وَانْقَطَعَ الرَّجَاءُ

معنی :۔ متغیر ہو گئی دوستی اور برادری اور کم ہو گئی راستی اور منقطع ہو گئی امید یعنی نہ دوست دوست نہ برادر برادر ہے دنیا سے راستی جاتی رہی اور اس کے رخصت ہوتے ہی خیر کی امید بھی منقطع ہو گئی۔ لاریب زوال راستی کے بعد پھر خیر کی کیا امید کی جا سکتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنینؑ نے یہ شعر اور مابعد کے اشعار بڑی دل شکستگی کی حالت میں ارشاد فرمائے ہیں رنگ کلام تمام تر اظہار آزردگی کرتا ہے خاص کر آخر کا شعر جو آنے والا ہے اور جس میں حضرت نے حقیقت حال کو صاف صاف بیان فرما دیا ہے یہ آخر کا شعر بدائست فقیر شعر اول کے اجمالی مضامین کا مصرح ہے

وَاَسْلَمَنِیَ الزَّمَانُ اِلٰی صَدِیْقٍ ۔۔۔ کَثِیْرِ الْغَدْرِ لَیْسَ لَهٗ دُعَاءٌ

معنی :۔ اور سپرد کیا مجھے زمانے نے ایک ایسے دوست کو جو نہایت پیمان شکن ہے اور جو رعایت دوستاں ملحوظ نہیں رکھتا۔

سَیُغْنِیْنِیْ الَّذِیْ اَغْنَاهُ عَنِّیْ ۔۔۔ فَلَا فَقْرٌ یَدُوْمُ وَلَا ثَرَاءُ

معنی :۔ پس عنقریب وہ کس (یعنی خدا) مجھے اس سے بے نیاز کر دیگا جس نے اسے مجھ سے بے نیاز کر دیا ہے اور حال یہ ہے کہ نہ بے زری کو مداومت ہے

اور نہ تونگری کو۔ سبحان اللہ کیا قول ہے حافظ فرماتے ہیں۔ ؎

چوں نماند دولتِ شبہائے وصل ۔ بگذرد ایامِ ہجران نیز ہم ۔

وَلَیْسَ بِیَدِ الْحَمِ اَبَدًا نَعِیْمٌ ۔ کَذٰلِکَ الْبُؤْسُ لَیْسَ لَہٗ بَقَاءٌ

معنی :۔ اور کسی نعمت کو بقا نہیں ہے اسی طرح کسی سختی کو بھی استمرار نہیں ہے۔

وَکُلُّ مَوَدَّۃٍ لِلّٰہِ تَصْفُوْ ۔ وَلَا یَصْفُوْ مِنَ الْفِسْقِ الْاِخَاءُ

معنی :۔ ہر دوستی جو خدا کے لئے ہوتی ہے صافی ہوتی ہے لیکن بھائی چارا جو فسق و فجور کے لگاؤ سے ہوتا ہے صافی نہیں ہوتا یعنی جو دوستی حالصتہً للہ ہوتی ہے وہی صافی ہوتی ہے اور اسی کو پائداری بھی حاصل رہتی ہے لیکن جو برادرانہ مرالبطت فسق و فجور کے لگاؤ سے پیدا کی جاتی ہے نہ صافی ہوتی ہے اور نہ اس کو استحکام حاصل رہتا ہے۔

اِذَا نُکِرَتْ عَھْدًا مِنْ حَمِیْمٍ ۔ فَفِیْ نَفْسِیْ التَّکَرُّمُ وَالْحَیَاءُ

معنی :۔ جب کوئی اقارب سے میرے ساتھ پیمان شکنی کرتا ہے تو میرا نفس تکریم و حیا کے باعث اس سے طالب انتقام نہیں ہوتا۔ سبحان اللہ کیا ذات مرتضوی ہے واقعی مولائے دو عالم کا یہی انداز مزاج تھا ؎

از علی آموز اخلاصِ عمل ۔ تار ہا گردی زشیطانِ دغل

لاریب مولا کی کریم النفسی فہم انسانی سے باہر ہے اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ حضرت اپنے دشمن مغلوب کے ساتھ جس نے روئے مبارک پر تھوک دیا تھا کس طرح پیش آئے مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

اوخیوا نداخت برروے علیؑ   افتخار ہر نبی و ہر ولی

حقیقت یہ ہے کہ صفات مسیحیہ بھی ذات پاک میں اس درجے کی واہب العطایا نے بخشی تھیں کہ اگر حضرت چھ سو برس قبل ظہور اسلام کے اس عالم میں رونق افروز ہوتے تو ظاہرا جناب مسیح علیہ السلام کی بعثت کی کوئی حاجت نہ ہوتی

وَكُلُّ جِرَاحَةٍ فَلَهَا دَوَاءٌ   وَسُوْءُ الْخُلْقِ لَيْسَ لَهُ دَوَاءُ

معنی :۔ اور ہر جراحت کے لئے دوا ہے مگر بدخلقی کے آزار کے لئے کوئی دوا نہیں ہے یعنی یہ ہے کہ جس شخص میں خلقت کے رو سے بدخلقی لاحق رہتی ہے کسی صورت سے نہیں جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ آدمی خوش اخلاق پیدا ہوتا ہے خوش اخلاقی تعلیمی امر نہیں ہے بقول سعدی علیہ الرحمہ **مصرع**

طبیعی ست اخلاق نیکو نہ کسب

وَرُبَّ اَخٍ وَفَيْتُ وَفِيٌّ   وَلٰكِنْ لَا تَدُوْمُ لَهُ الْوَفَاءُ

معنی :۔ بہت سے برادر وفادار کی ہیں نے وفا کی مگر ہمیشگی اس کی وفاداری کو نہیں ہے یعنی میں نے بہت سے دعویٰ داران وفا کے ساتھ وفا کی ہے مگر ان سے بیوفائی ہی ظہور میں آیا کی ہے ۔

يُدِيْمُوْنَ الْمَوَدَّةَ مَا رَاٰوْنِيْ   وَيَبْقَى الْوُدُّ مَا بَقِيَ اللِّقَاءُ

معنی :۔ برقرار رکھتے ہیں محبت کو جب تک کہ مجھے دیکھتے رہتے ہیں اور باقی رہتی ہے صورت محبت جب تک کہ ملاقات ہوا کرتی ہے یعنی دیکھے کی محبت رکھتے ہیں

اَخِلَّاءٌ اِذَا اسْتَغْنَيْتُ عَنْهُمْ   وَاَعْدَاءٌ اِذَا نَزَلَ الْبَلَاءُ

معنی :۔ ارباب دنیا کی یہ حالت ہے کہ وہ تب ہی تک دوست بنے رہتے

ہیں کہ جب تک ہم ان سے مستغنی رہتے ہیں اور جب مصیبت آگھرتی ہے تو دشمن ہو جاتے ہیں۔ یعنی ارباب دنیا کی دوستی کا یہ طرہ ہُوا کرتا ہے کہ جب تک انسان کو خوش حالی حاصل رہتی ہے اور اسی خوش حالی کے سبب سے بے نیازی نصیب رہتی ہے تو اس کی دوستی کا دم اہل دنیا بھرتے ہیں مگر جب وہی شخص مبتلائے آفت ہو جاتا ہے تو وہی دعویٰ داران دوستی کھلے ڈلے انداز کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

دوست مشمار آنکہ در نعمت زند۔ لاف یاری و برادر خواندگی

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست در پریشاں حالی وہ در ماندگی

فَاِن غُیِّبْتُ عَنْ اَحَدٍ قَلَانِیْ وَعَاقَبَنِیْ بِمَا فِیْہِ اِکْتِفَاءُ

معنی:۔ پس اگر میں کسی دوست سے دور از نظر ہوتا ہوں تو وہ دوست میرے ساتھ دشمنی کرتا ہے اور اچھی طرح مجھ سے ساتھ عقوبت کے ساتھ پیش آتا ہے۔

اِذَا مَا رَأسُ اَھْلِ الْبَیْتِ وَلّٰی بَدَا لَھُمْ مِنَ النَّاسِ الْجَفَاءُ

معنی:۔ جب سردار اہل بیعت یعنی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحلت فرمائی تو لوگوں کی طرف سے انہیں اہل بیت پر جفائیں شروع ہوئیں۔ اس کلام سے امیرالمومنینؑ کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صلعم کی وفات کے بعد لوگوں کے معاملات اہل بیعت کے ساتھ اچھے نہ تھے ورنہ اس طرح کے ملال آگیں کلام جناب ولایت مآب نہ فرماتے ظاہر ہے کہ تمام اشعار بالا میں حضرت نے احباب دنیا کی پوری تصویر دکھلائی ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ دوستان پُر غرض ایسے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ اشعار بالا میں بیان کئے

گئے ہیں۔

دعا و مناجات با قاضی الحاجات

لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ اَنْتَ مَوْلَاہُ فَارْحَمْ عُبَیْدًا اِلَیْکَ مَلْجَاہُ

معنی :۔ کھڑے ہیں ہم تیرے حکم کی تعمیل کو تو مولیٰ میرا یعنی میرا آزاد کرنے والا ہے پس رحم کر ایسے بندے کہ تیرا ملتجی ہے۔

یَا ذَا الْمَعَالِیْ عَلَیْکَ مُعْتَمَدِیْ طُوْبٰی لِمَنْ کُنْتَ اَنْتَ مَوْلَاہُ

معنی :۔ اے صاحب بزرگیہا تجھ پہ میرا تکیہ ہے۔ خوش ہے عیش اس کا کہ جس کا تو مولیٰ ہے۔

طُوْبٰی لِمَنْ کَانَ نَادِمًا اَرِقًا یَشْکُوْ اِلٰی ذِی الْجَلَالِ بَلْوَاہُ

معنی :۔ خوش ہے عیش اس کا کہ پشیمان و بیخواب رہتا ہے تاکہ اپنی بلا کا شکوہ حضور ذو الجلال میں کرے۔

مَا بِہٖ عِلَّۃٌ وَّ لَا سُقْمٌ اَکْثَرُ مِنْ حُبِّہٖ لِمَوْلَاہُ

معنی :۔ اسے کوئی مرض یا کوئی بیماری اپنے مولا کے عشق سے زیادہ نہیں ہے۔ یعنی مرض عشق کے سوا اس کو کوئی بیماری نہیں ہے۔

اِذَا خَلَا فِی الظَّلَامِ مُبْتَہِلًا اَجَابَہُ اللّٰہُ ثُمَّ لَبَّاہُ

معنی :۔ جب وہ تاریکی میں جا بیٹھتا ہے اور رو رو کر دعائیں مانگتا ہے تب اسے اللہ جواب دیتا ہے اور لبیک فرماتا ہے اس طور پہ جیسا کہ اشعار آئندہ میں ارشاد خداوندی مسطور کئے جاتے ہیں۔

واضح ہو کہ اشعار بالا دعا و مناجات کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ جاننا چاہئے۔

دعاو مناجات مخ عبادت ہیں یہ گمراہوں اور جاہلوں کا شیوہ ہے جو کہتے ہیں
کہ دعاو مناجات کی کوئی حاجت نہیں ہے دعاو مناجات سے مسلمان کو
چارہ نہیں ہے اس سے انکار اسی کو ہوگا جو خدا کا قائل نہیں ہے اور درحقیقت
دہریہ ہے۔ البتہ دہریے کے نزدیک دعاو مناجات کوئی شئے ہو نہیں سکتی
مگر جس کو خدا کے وجود کا یقین ہے وہ دعاو مناجات سے انکار نہیں رکھ سکتا
ہے بعض جاہلوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ دعا تقاضائے رضا کے خلاف ہے ان
جاہلوں کو یہ نہیں معلوم کہ رضائے الٰہی اسی میں ہے کہ بندہ دست دعا کو خدا
کی جناب میں بلند کرے اور اس سے عافیت جسمانی اور روحانی کا طالب
ہو یہ امر کبھی رضائے الٰہی کے موافق نہیں ہے کہ بندہ خدا سے مستغنی ہو
بیٹھے اور یہ کہے کہ دعا کی کیا حاجت ہے جیسا خدا کی مرضی میں آتا ہے وہ
ویسا کرتا ہے اس میں شک نہیں کہ جو خدا کی مرضی ہوتی ہے وہی ہوتا ہے
مگر صریحاً خدا کی مرضی کے مطابق یہ امر نص قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ
خدا سے دعائیں مانگے اگر دعا طلبی بیکار شے ہوتی تو اس قدر دعائیں کیوں
قرآن میں دیکھی جاتیں انبیائے سلف کیوں کاربند دعا ہوتے صحف قدیم
میں دعائیں بکثرت مندرج ہوتیں پیغمبر خدا کیوں ہاتھ اٹھا اٹھا کہ دعائیں فرماتے
علی مرتضیٰ دعا کے طریقے بتلاتے ہیں ائمہ دعا طلبی کو عبادت جانتے اور صحیفہ
کاملہ کی سی کتاب دعا وظیفہ طالبان حق ہوتی۔ اگر دعا کوئی شے نہیں ہے۔
تو نماز بھی کوئی شئے نہیں ہے کس واسطے کہ نماز تو دعاؤں ہی پر مشتمل نظر آتی ہے
لاریب دعا سے انکار شیطان کا کام ہے یہ مردود ازلی کس کی جناب میں

دست دعا بلند کرے خدا کا تو وہ دشمن ہے۔ المختصر دعا و مناجات سے مسلمان کو چھٹکارا نہیں ہے اس کا وہی شخص منکر ہوگا جو خدا کو لاشئی جانتا ہوگا ورنہ عبادت سے انکار خدا کے ماننے والا نہیں کرسکتا ہے پس چونکہ دعا عین عبادت ہے امیر المومنین علیہ السلام اپنے پیروان کو دعا کا طریقہ بتلاتے ہیں آپ کے ارشاد کے مطابق داعی کو سراپا نیاز ہو کر طالب دعا ہونا چاہیئے اور آخر اشعار بالا میں خلوت گزینی کی ہدایت ہے اور اس لئے کہ تمام تعلقات دنیوی سے دل و دماغ داعی کو فراغت حاصل ہو جائے تاکہ یک سوئی کے ساتھ عرض حال درگاہ خداوندی میں کہہ سکے اس شعر سے مراقبہ کی تعلیم بھی ظاہر ہوتی ہے بہر حال جب داعی اس طور سے عرض حال کرتا ہے تو خداوند تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرماتا ہے قبول دعا کے وقت جو خطاب خداوند تعالیٰ اپنے بندے کی طرف فرماتا ہے وہ اشعار ذیل میں ذکر پاتا ہے۔

سَأَلْتَ عَبْدِیْ وَاَنْتَ فِیْ کَنَفِیْ   وَکُلُّ مَا قُلْتَ قَدْ سَمِعْنَاهُ
صَوْتُكَ تَشْتَاقُهُ مَلَائِكَتِیْ   فَذَنْبُكَ الْاٰنَ قَدْ غَفَرْنَاهُ
فِیْ جَنَّةِ الْخُلْدِ مَا تَمَنَّاهُ   طُوْبَاهُ طُوْبَاهُ ثُمَّ طُوْبَاهُ
سَلْنِیْ بِلَا حَشْمَةٍ وَلَا رَهَبٍ   وَلَا تَخَفْ اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰهُ

معنی :۔ تو نے سوال کیا اے ہمارے بندے اور تو ہمارے دائرۂ حمایت میں ہے اور جو کچھ کہ تو نے کہا ہم نے اسے سنا تیری آواز کے مشتاق ہمارے فرشتے ہیں پس تیرے گناہ کو اس وقت ہم نے معاف کیا بہشت جاوید میں ہے وہ

چیز جس کا تو متمنی ہوا خوشا سال اس چیز کا جس کی تو تمنا کرے سے ہم سے اپنے مطلب کا طالب ہو بے لجائے اور بے خوف کھائے اور نہ ڈر بہ تحقیق کہ ہم اللہ ہیں اور ہمارے کرم کی حد نہیں ہے۔

بیان آنکہ بنارہ کار مردم بر مال ست نہ بر عقل کامل و طبع راست

يُغَطِّي عُيُوبَ الْمَرْءِ كَثْرَةُ مَالِهٖ ... يُصَدَّقُ فِيْمَا قَالَ وَهُوَ كَذُوْبٌ

وَيُزْرِيْ بِعَقْلِ الْمَرْءِ قِلَّةُ مَالِهٖ ... يُحَمِّقُهُ الْأَقْوَامُ وَهُوَ لَبِيْبٌ

معنی:۔ آدمی کی زیادتی مال اس عیوب کو چھپا دیتی ہے پس اس کا قول سچا مانا جاتا ہے حالانکہ وہ دروغ گو ہے اور آدمی کی کم مایگی سے اس کی عقل خوار ہوتی ہے پس لوگ اس کو بیوقوف بناتے ہیں حالانکہ وہ خردمند ہے۔

مدح علم و ادب و حمد عقل و حسب

لَيْسَ الْبَلِيَّةُ فِيْ أَيَّامِنَا عَجَبًا ... بَلِ السَّلَامَةُ فِيْهَا أَعْجَبُ الْعَجَبِ

معنی:۔ روزگار میں بلا کا ہونا کوئی عجب انگیز امر نہیں ہے البتہ روزگار میں سلامتی کا پایا جانا سب عجب انگیز مضامین سے زیادہ عجب انگیز مضمون ہے۔

لَيْسَ الْجَمَالُ بِأَثْوَابٍ تُزَيِّنُهَا ... إِنَّ الْجَمَالَ جَمَالُ الْعِلْمِ وَالْأَدَبِ

معنی:۔ جامہ سے زینت انسان کو نہیں ہوتی۔ مرد کو جمال علم و ادب سے ہوتا ہے

لَيْسَ الْيَتِيْمُ الَّذِيْ قَدْ مَاتَ وَالِدُهٗ ... إِنَّ الْيَتِيْمَ يَتِيْمُ الْعَقْلِ وَالْحَسَبِ

معنی:۔ وہ یتیم نہیں ہوتا جس کا باپ مرجاتا ہے یتیم وہ شخص ہے جو عقل و حسب کا یتیم ہوتا ہے

ارشاد ارباب صلاح بہ اسباب فلاح۔

فَرْضٌ عَلَى النَّاسِ أَنْ يَتُوْبُوْا ... لٰكِنَّ تَرْكَ الذُّنُوْبِ أَوْجَبُ

معنی :- آدمی پر فرض ہے کہ گناہوں سے توبہ کرے مگر گناہوں کا ترک کرنا واجب تر ہے۔

وَالدَّهْرُ فِي صَرْفِهِ عَجِيْبٌ وَغَفْلَةُ النَّاسِ فِيْهِ اَعْجَبُ

معنی :- روزگار کے حوادث عجیب ہیں اور غفلت آدمی کی حوادث روزگار میں عجیب تر ہے۔

وَالصَّبْرُ فِي النَّائِبَاتِ صَعْبٌ لٰكِنْ فَوْتَ الثَّوَابِ اَصْعَبُ

معنی :- صبر حوادث روزگار میں ایک دشوار امر ہے مگر اس سے زیادہ تر دشوار حوادث روزگار پر صبر کے ثواب کا فوت ہو جانا ہے۔

وَكُلُّ مَا تَرْتَجِيْ قَرِيْبٌ وَالْمَوْتُ مِنْ كُلِّ ذَاكَ اَقْرَبُ

معنی :- دنیا کی ساری امیدیں قریب ہیں مگر موت سب امیدوں سے قریب تر ہے۔ واضح ہو کہ امیر المومنین کا دیوان۔ ۔ ۔ مسائل اخلاق وحکمت سے معمور ہے اور محتاج انتخاب نہیں ہے ہر طالب حق کا فرض منصبی ہے کہ آپ کے تمام کلام کو بغور مطالعہ کر کے اپنے دین و دنیا کو سنوارے اس کتاب میں حضرت کے تمام کلام معجز نظام کی گنجائش کہاں ہے اس لئے صرف تھوڑے اشعار نمونے کے طور پر داخل ہذا کئے گئے۔

قصیدہ فرزدق۔

واضح ہو کہ قصیدہ آئندہ کو فرزدق نے بدیہہ کہا تھا اور اس کے کہنے کا یہ طور ہوا کہ ہشام بن عبدالملک بن مروان اپنے باپ کے عہد خلافت میں شام سے بہ تقریب حج مکہ معظمہ آیا ہوا تھا۔ وقت طواف جب اس نے

چاہا کہ حجر اسود کو بوسہ دے تو ازدحام مردم سے اسے اس کا موقع نہ ملا
بس ایک منبر پہ بیٹھ کر لوگوں کا تماشا دیکھنے لگا اس وقت جناب سید
الساجدین حضرت امام ہمام زین العابدین علیہ السلام طواف کے لئے
تشریف لائے اور جب حجر اسود کے پاس پہنچے تو لوگ غایت ادب
سے دور دور ہٹ گئے اور آپ نے بے مزاحمت حجر اسود کو بوسہ دیا جب
اہل شام نے خلائق کا یہ رنگ دیکھا تو ایک شامی نے ہشام سے پوچھا
کہ یہ صاحب جاہ و جلال جس کی زائرین کعبہ نے اس قدر تعظیم کی کون ہے
ہشام کو اس خیال فاسد نے لیا کہ اگر ہم بتاتے ہیں کہ یہ یادگار و جانشین پیغمبر
ہی تو اہل شام اس کی جانب مائل ہو کر اس کا کلمہ پڑھنے لگیں گے۔ پس بطرز
تجاہل اس نے غایت بے پروائی سے سائل کو جواب دیا کہ ہم اسے نہیں
پہچانتے۔ اتفاقاً وہاں فرزدق موجود تھا اور ہشام اور اس کے ساتھی کی
گفتگو سن رہا تھا اس سے رہا نہ گیا جوش ولائے اہلبیت میں اس نے یہ
قصیدہ ہشام کے روبرو پڑھا ہشام کی بے دینی حرکت میں آئی اس نے
فرزدق کو محبوس کیا۔ جب حضرت امام علیہ السلام کو اس کی خبر ہوئی۔ آپ نے فرزدق کو
بارہ ہزار درم بھیجے اس دوستدار خاندان پیغمبرؐ نے لینے سے انکار کیا اور کہلا بھیجا میں نے صلے کے
خیال سے قصیدہ مدحیہ نہیں کہا تھا میری غرض اس مدح خوانی سے مجرد خدا و رسول کی طرف اور
اور آپ سے امید مغفرت و شفاعت تھی حضرت امام علیہ السلام نے
فرمایا کہ ہم اہلبیت جو چیز کسی کو دے دیتے ہیں پھر واپس نہیں لیتے اور
خدائے تعالیٰ تیری نیت سے واقف ہے جو تیری مراد ہے اسے بر لائیگا

فرزدق نے تعمیل ارشاد کی اور دین و دنیا دونوں میں اچھا رہا۔

اے حضرات ایمان والے اس قصّہ سے آپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اہل حکومت اور ان کے پیروان کا معاملہ خاندان نبوت کے ساتھ کیا تھا حقیقت یہ ہے کہ بہت تھوڑے لوگ تھے جو خاندان نبوت کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور جو رکھتے تھے ان پر اہل حکومت کی طرف سے بے حد سختیاں ہوتی تھیں فرزدق مجرد اس جرم پر کہ اس نے خاندان پیغمبرؐ کی ثنا خوانی کی۔ قید کیا گیا اللہ اللہ کیا مسلمانی تھی۔ ہشام کو دیکھئے کہ حج کو آیا تھا اور امام وقت کو بقول خود نہیں جانتا تھا۔ تھو تھو پھٹکار ایسے حج پر اور ایسی مسلمانی پر جس کو خاندان پیغمبرؐ سے بے تعلقی ہو۔ یہی حال اس وقت کے دنیا طلب مسلمانوں کا تھا کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کا کلمہ پڑھتے تھے اور ان کی اولاد و احفاد کی تخریب میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھتے تھے کون سی ایذا اور کونسی بے آبروئی ہے جسے کلمہ گویوں نے خاندان پیغمبرؐ کے لئے اٹھا نہیں رکھی۔ کیا کیا حقوق اہل بیت ضائع نہیں کئے گئے ہیں فقیر نمبر دار از ابتدا تا انتہا تمام مصائب خاندان پیغمبرؐ کو عرض کر سکتا ہے مگر دو وجہ سے قلم کو روک لیتا ہے۔ اوّل یہ کہ اسی دنیا میں بقیہ زندگی کو بسر کرنا ہے دوم یہ کہ اگر حق گوئی میں زیادہ کد کی تو یہ کتاب حسب مراد اشاعت پذیر نہ ہو گی اس عہد میں بھی ہشام سے ہزاروں پڑھے لکھے مسلمان ہیں کہ جو نہیں جانتے کہ زین العابدین امام ہیں یا نہیں اور اگر امام ہیں تو خاندان پیغمبرؐ کے امام ہیں یا کسی اور خاندان کے اور اگر خاندان پیغمبرؐ کے امام ہیں تو کون سے امام ہیں اما موں سے ناواقفیت تو

اکثر کلمہ گو رکھتے ہیں۔ فقیر اپنے ذاتی تجربے سے کہہ سکتا ہے کہ زمانہ موجود میں
ہزار خواندہ مسلمان سے شاید ایک شخص ایسا نکلے گا جو ترتیب وار ائمہ اثنا
عشر کے ناموں کو زبانی بتا سکتا ہے اللہ اللہ خاندان پیغمبرؐ کے ساتھ اس سے
زیادہ بے تعلقی کیا ہو سکتی ہے یہ کوئی عجب انگیز امر نہیں ہے جب تعلیم کا یہی
طور رکھا گیا ہے کہ خاندان پیغمبرؐ سے لاعلمی لاحق رہے اس تعلیم کے اصول وہی
ہیں جن پر ہشام نے اپنے سائل کو جواب دیا تھا کتابوں کے دیکھنے سے معلوم
ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کے حالات و معاملات کے چھپانے کے بندوبست ہمیشہ
ہوا کئے ہیں۔ یہ انھیں بندوبست کا نتیجہ ہے کہ ہزار پڑھے لکھے کلمہ گویوں
میں ایک آدمی بھی اس وقت ایسا نہیں پایا جاتا ہے جو ائمہ کے نام صحیح
طور پر ترتیب وار بتا سکے ان کی سوانح عمری سے خبر رہے تو بیرون از توقع
ہے اگر دیدۂ انصاف سے دیکھئے تو اس لاعلمی میں صرف خاندان پیغمبرؐ کی
کسر شان نہیں ہے بلکہ خود پیغمبر صاحبؐ کی کسر شان ہے رسول اللہؐ نے
قرآن اور اپنی عترت کو دو امر اہم فرمایا ہے پس تعجب ہے ایسے مسلمانوں
سے جو ان کی عترت اور آل اطہار سے لاعلمی رکھتے ہیں خیر اب دوستداران
خاندان پیغمبرؐ قصیدۂ ذیل سے لذت روحانی اٹھائیں اور اس مصنف
کی ولا کی داد دیں۔

قصیدہ فرزدق

هٰذَا الَّذِي تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْأَتَهُ ‏ وَالْبَيْتُ يَعْرِفُهُ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

ترجمہ: یہ وہ شخص ہے کہ مکہ اس کے جائے قدم کو پہچانتا ہے اور خانہ کعبہ

اس کو پہچانتا ہے اور پیرامون حرم و حرم پہچانتے ہیں یعنی اے ہشام تو اگر اس شخص کو نہیں پہچانتا ہے تو کیا۔ اس شخص کے موضع قدم کو خانۂ کعبہ اور حل و حرم پہچانتے ہیں۔

هٰذَا ابْنُ خَيْرِ عِبَادِ اللّٰهِ كُلِّهِمُ ۔۔۔ هٰذَا التَّقِيُّ النَّقِيُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ

معنی :۔ یہ بیٹا بہترین بندگان خدا کا ہے۔ یہ پرہیزگار۔ پاکیزہ پاک سردار گروہ ہے۔ بہترین بندگان خدا سے رسول اللہ اور سردار گروہ سے سردار قریش مراد ہے

اِذَا رَاٰتْهُ قُرَيْشٌ قَالَ قَائِلُهُمْ ۔۔۔ اِلٰى مَكَارِمِ هٰذَا يَنْتَهِي الْكَرَمُ

معنی :۔ جب قوم قریش اسے دیکھتی ہے تو ان میں کا کہنے والا کہتا ہے کہ اس شخص پر بزرگی اور جوانمردی کا خاتمہ ہے۔

يُنْمىٰ اِلٰى ذُرْوَةِ الْعِزِّ الَّذِي قَصُرَتْ ۔۔۔ عَنْ نَيْلِهِ عَرَبُ الْاِسْلَامِ وَالْعَجَمُ

معنی :۔ بلند ہوتا ہے اس اوج عزت کو کہ جس کی دریافت میں عرب الاسلام اور عجم عاجز ہیں۔ یعنی اسے وہ ارتفاع عزت حاصل ہے کہ اہل عرب و عجم اس تک پہنچ نہیں سکتے۔

يَكَادُ يُمْسِكُهُ عِرْفَانَ رَاحَتِهِ ۔۔۔ رُكْنُ الْحَطِيمِ اِذَا مَا جَاءَ يَسْتَلِمُ

معنی :۔ قریب ہو جاتا ہے سنگ اسود کہ پکڑ لے اس کے ہاتھ کو جب وہ آتا ہے بوسہ دینے کے واسطے۔ یعنی سنگ اسود یہ جان کر کہ وہ فرزند رسولؐ ہے اسے پکڑ لینا چاہتا ہے۔

فِي كَفِّهِ خَيْزُرَانٌ رِيحُهُ عَبِقٌ ۔۔۔ فِي كَفِّ اَرْوَعَ فِي عِرْنِينِهِ شَمَمُ

معنی :۔ اس کے کف دست میں بید ہے کہ جس کی بو خوش ہے یہ ہاتھ میں اس

خوش جمال کے ہے کہ جس کی ناک بلند ہے۔ جاننا چاہئے کہ بینی کا بلند ہونا شرف
و بزرگی کی علامت ہے وجاہت ظاہری کو عمدگی باطن کے ساتھ ایک تعلق
عظیم ہے اس لئے انبیا نہ صرف معائب جسمانی سے تمام تر پاک تھے بلکہ
صاحب جمال بھی تھے واضح ہو کہ پیغمبر خدا حضرت نبی ؐ اور علی مرتضیٰ اور ان کی
تمام اولاد و احفاد کو خدا نے حسن و جمال بخشا تھا لاریب فطرت اسی کی
مقتضی تھی کہ ایسے ایسے ارباب فضل و شرف کو کمالات صوری بھی حاصل
ہوتے۔ بخیال راقم بدصورت آدمی کمتر خوش صفات ہوتے ہیں بلاشبہ صورت
اور سیرت میں کوئی تعلق خفی ضرور ہے۔

يُغْضِي حَيَاءً وَيُغْضَى مِنْ مَهَابَتِهِ　　فَمَا يُكَلَّمُ إِلَّا حِيْنَ يَبْتَسِمُ

معنی :۔ وہ حیا سے نظر اوپر نہیں کرتا ہے اور لوگ ہیبت سے اس پر نظر
نہیں کر سکتے ہیں اس سے گفتگو نہیں کی جا سکتی ہے الا اس وقت کہ وہ متبسم ہوتا
ہے یعنی حالت بشاشت میں ہوتا ہے۔ بنی زادگی کا رعب ایسا ہی ہونا چاہئے
تب تو وقت طواف دور دور لوگ اپنے جی سے پھٹ گئے تھے۔

يَنْشَقُّ نُوْرُ الْهُدٰى مِنْ نُوْرِ غُرَّتِهِ　　كَالشَّمْسِ يَنْجَابُ عَنْ إِشْرَاقِهَا الظُّلَمُ

معنی :۔ نور ہدایت اس کے نور پیشانی سے پھٹ کر نکلتا ہے جیسا کہ آفتاب
کہ اس کی رخشانی سے تاریکیاں زائل ہو جاتی ہیں۔ یہ شاعرانہ مدح نہیں ہے
حقیقت حال بھی یہی ہے کہ ان حضرات ائمہ سے نور ہدایت اشاعت پذیر ہوتا ہے۔

مِنْ جَدُّهٗ دَانَ فَضْلُ الْأَنْبِيَاءِ لَهٗ　　وَفَضْلُ أُمَّتِهٖ دَانَتْ لَهُ الْأُمَمُ

معنی :۔ ممدوح کا جد وہ ہے کہ جس کے سامنے تمام انبیا کا فضل زیر دست

ہو گیا اور جس کی امت کے فضل کے مقابلے میں تمام انبیاء کی امتیں زیر دست ہو گئیں
یعنی ممدوح کا جد افضل الانبیا ہے اور ممدوح کے جد کی امت افضل الامم ہے۔

مُنْشَقَّةٌ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ نَبْعَتُہٗ طَابَتْ عَنَاصِرُہٗ وَالْخِیْمُ وَالشِّیَمُ

معنی:۔ اس کا درخت رسول اللہ سے اگا ہے پاک ہوئے عناصر اس کے اور
پاک ہوئی خوبو اس کی یعنی ممدوح فرع نخل نبوت ہے اور اس کی ترکیب
بدن اور خوبو سب کے سب پاک وصاف واقع ہوئے ہیں۔

ھٰذَا ابْنُ فَاطِمَۃَ اِنْ کُنْتَ جَاھِلَہٗ بِجَدِّہٖ اَنْبِیَاءُ اللّٰہِ قَدْ خُتِمُوْا

معنی:۔ یہ پسر فاطمہ ہے جان لے اگر تجھ کو نہیں معلوم ہے اس کا نانا
خاتم النبیین ہے۔

وائے بر ہشام کہ اس نے زین العابدین علیہ السلام کی نسبت اظہار
ناواقفیت کیا اور وائے ان مسلمانوں پر بھی جنھوں نے ائمہ علیہم السلام
سے کلمہ گویوں کو ناواقف رکھنے کے بندوبست کئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ
جو کلمہ گو حضرات ائمہ سے تجاہل یا لاعلمی روا رکھتا ہے یا ان سے مطلع رہنے کو
ایک غیر ضروری امر سمجھتا ہے تو لاریب ایسا شخص اسی ہشام کی امت کا
آدمی ہے وہ ہزار کلمہ پڑھنے پر بھی امت رسول اللہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا ہے
بہت جائے افسوس ہے کہ اس زمانے میں خاندان پیغمبرؐ سے ایسی بے تعلقی کلمہ گویوں
میں دیکھی جاتی ہے کہ الٰہی توبہ فقیر نے ہزاروں ایسے حضرات دیکھے ہیں جو
عربی خوان ہیں صوفی مشرب ہیں واعظ ہیں فقیہ ہیں حاجی ہیں زائرین مزارا
اولیا ہیں مصحف بدست ہیں پابند صوم وصلوٰۃ ہیں کاسب ہیں شاغل ہیں

اور خدا جانے کیا کیا ہیں مگر دو دو دہ اماموں کے ناموں سے آشنائی تک نہیں رکھتے۔ لاریب اگر ان برگزیدگان حق کو حضرات ائمہ علیہم السلام سے کوئی تعلق ہوتا تو جس طرح اتنے کمالات کے حاصل کرنے کی طرف سعی فرماتے گئے ہیں بیچارے اماموں کو بھی اپنے گوشۂ خاطر میں جگہ دیتے تب ان مظلوموں کے نام بھی ان اہل کمالات کو یاد رہتے بے تعلقی کی حالت میں کب کوئی کسی کو یاد رکھنے کی زحمت اختیار کر سکتا ہے۔ شائقان تحقیق فقیر کے قول بالا کی خود تحقیق فرمالیں ہزاروں ممتاز صورت ایسے مسلمان نکلیں گے جو حضرات ائمہ سے تمام تر بیخبر ہیں اور ان سے باخبر رہنا کوئی ضروری امر نہیں جانتے اور ناچیز نے چند پڑھے لکھے حضرات کو جو ائمہ خاندان پیغمبر سے تمام تر بیخبر تھے مختلف وقتوں میں آگاہ کر دیا ہے۔ کچھ بزرگوار نے تو میری عرض معقول سمجھ کر حضرات ائمہ کے نام سیکھ لئے۔ مگر بہتوں نے ناتوجہی کو راہ دی اور ہشام وقت بنے رہے۔

اَللّٰہُ شَرَّفَہٗ قِدَمًا وَّ عَظَّمَہٗ　　جَرٰی بِذَالِکَ لَہٗ فِی لَوْحِہِ الْقَلَمُ

معنی:۔ خدا تعالیٰ نے اسے بزرگ و عظیم بنایا قدم میں اس کی بندگی و عظمت کو اللہ پاک نے قلم قدرت سے لوح محفوظ پر ثبت فرمایا ہے۔ یعنی اس کی بزرگی و عظمت قدیمی ہے کسی کمبخت کی توہین و تحقیر سے اس کی بزرگی و عظمت میں کمی لاحق نہیں ہو سکتی۔

اَللَّیْثُ اَھْوَنُ مِنْہُ حِیْنَ تُغْضِبُہٗ　　وَالْمَوْتُ اَیْسَرُ مِنْہُ حِیْنَ یَخْتَصِمُ

معنی:۔ ممدوح سے شیر ببر سبک تر ہے جس وقت کہ تو غصہ میں لائے اسے

اور موت آسان تر ہے ممدوح سے جس وقت کہ وہ تنیم یا غضب دلایا جائے یعنی جب ممدوح غصہ دلایا جاتا ہے تو اس وقت اس سے شیر سبک تر ہے اور جب ممدوح غضب دلایا جاتا ہے تو اس وقت اس سے موت آسان تر ہے۔ واضح ہو کہ پیغمبرؐ خدا اور ان کے خاندان کے ائمہ نفسانیت سے تمام تر پاک تھے ان حضرات کو غضب و غصہ سے کوئی علاقہ نہ تھا لیکن غضب و غصہ ان کو تب ہی آتا تھا کہ جب اللہ کے حقوق معرض تلف میں در آتے تھے ظاہر ہے کہ حقوق خداوندی کی نگرانی نبی سے ہوا کرتی ہے پس چونکہ حضرت سیدالساجدین بر حق جانشینان پیغمبر صلعم سے ہیں حقوق خداوندی کے تلف ہونے پر آپ کا پر غضب ہونا شان امامت سے ہے۔

فَلَيْسَ قَوْلُكَ مَنْ هٰذَا بِضَائِرِهٖ ٭ اَلْعُرْبُ تَعْرِفُ مَنْ اَنْكَرْتَ وَالْعَجَمُ

معنی:- پس تیرا یہ کہنا کہ یہ کون ہے ممدوح کو ضرر رساں نہیں ہو سکتا تو نے جسے نہیں پہچانا اسے عرب و عجم پہچانتے ہیں۔

كِلْتَا يَدَيْهِ غِيَاثٌ عَمَّ نَفْعُهُمَا ٭ تُسْتَوْكَفَانِ وَلَا يَعْرُوهُمَا عَدَمُ

معنی:- دونوں ہاتھ اس کے ایسے فریاد رس ہیں کہ ان سے نفع عام جاری ہے ان سے بخشش کی ریزش ہوا کرتی ہے اور وہ ہاتھ کبھی خالی نہیں ہوتے واقعی خاندان پیغمبرؐ کا جود ایسا ہی ہے کہ ابر مطیر کو بھی اس سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ ایسے جواد نہ ہوئے ہیں۔ نہ ہوں گے ان کے جود کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں خوف تطویل کلام سے اس جگہ پر نقل نہیں کی جاتی ہیں۔

سَهْلُ الْخَلِيقَةِ لَا تُخْشٰى بَوَادِرُهٗ ٭ يَزِينُهُ اثْنَانِ حُسْنُ الْخُلْقِ وَالشِّيَمُ

معنی :۔ وہ نرم طبیعت از روے خلقت کے ہے اس کے مزاج کی تیزیاں ڈر کے قابل نہیں ہیں اسے دو شے آراستہ کئے ہوئے ہیں ایک حسن خلق دوم خوش خوئی ۔

حَمَّالُ اَثْقَالِ اَقْوَامٍ اِذَا فُدِحُوْا ﴿﴾ حُلْوُ الشَّمَآئِلِ تَحْلُوْ عِنْدَهُ نِعَمُ

معنی : وہ قوم کے باروں کا اٹھانے والا ہے اس وقت جب اقوام مبتلاے قرض ہوتی ہے وہ شیریں خصائل ہے اس کے پاس ہیں ہوکر نعمتیں شیریں ہو جاتی ہیں یعنی مردمان مقروض کو شدائد قرض سے نجات دینے والا ہے اور چونکہ شیریں خصائل ہے اس لئے اس سے احسان نمائی ظہور میں نہیں آتی ہے جس کے سبب سے اس کی نعمتیں لوگوں کو خوشگوار معلوم ہوتی ہیں ۔

مَا قَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِيْ تَشَهُّدِهٖ ﴿﴾ لَوْلَا التَّشَهُّدُ كَانَتْ لَاءَهُ نَعَمُ

معنی :۔ کبھی لا نہیں کہا اِلا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہِ کہتے ہیں اگر تشہد نہ ہوتا تو اس کا لا نَعَمْ ہوتا یعنی سوال سائل پہ کبھی لا نہیں کہا لا اس کی زبان پہ تب ہی آتا ہے جب وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہِ کہتا ہے اگر ضرورت تشہد نہ ہوتی تو ہمیشہ نعم ہی فرماتا کبھی لفظ لا کو زبان پہ نہیں لاتا واقعی خاندان پیغمبرؐ کا جود ایسا ہی دیکھا جاتا ہے کہ گاہے سایل سے ان حضرات کی زبان پاک آشناے انکار نہیں ہوتی تھی۔

لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ مَيْمُوْنٌ نَقِيْبَتُهٗ ﴿﴾ رَحْبُ الْفِنَاءِ اَرِيْبٌ حِيْنَ يَعْتَزِمُ

معنی :۔ وہ وعدہ خلاف نہیں ہے مبارک بجان ہے مہمان نواز ہے اور صراط مستقیم کے اختیار کرنے میں زیرک ہے ۔

عَمَّ الْبَرِيَّةَ بِالْإِحْسَانِ فَانْقَشَعَتْ عَنْهَا الْغَيَابَةُ وَالْإِمْلَاقُ وَالظُّلَمُ

معنی:۔ اس نے خلائق کو گرفتار احسان کر ڈالا پس خلائق سے رنج درویشی اور مفلسی جاتی رہی۔

هُمُ الْغُيُوثُ إِذَا مَا أَزْمَةٌ أَزَمَتْ وَالْأُسْدُ أُسْدُ الشَّرَى وَالْبَأْسُ مُحْتَدِمُ

معنی:۔ یہ لوگ یعنی ممدوح و آبائے ممدوح باراں ہیں جب شدت قحط استیصال مردم کرتی ہے اور یہ لوگ شیران راہ کوہ سلمیٰ ہیں جس دم کہ ہنگامہ کارزار برپا ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ شریٰ کوہ سلمیٰ کی راہ کو کہتے ہیں وہاں شیروں کی کثرت پائی جاتی ہے۔

لَا يَنْقُصُ الْعُسْرُ بَسْطًا مِنْ أَكُفِّهِمُ سِيَّانِ ذٰلِكَ إِنْ أَثْرَوْا وَإِنْ عَدِمُوا

معنی: کم نہیں کرتی ہے تنگی فراخی کو ان کے ہاتھوں سے برابر ہے تنگی اور فراخی خواہ وہ مالدار اور خواہ غیر مالدار رہیں۔ یعنی ان کی سخاوت زرداری اور بے زری دونوں حالتوں میں یکساں رہتی ہے یہ کوئی مبالغہ پردازی نہیں ہے خاندان پیغمبرؐ کا یہی حال رہا ہے کہ دولت مندی اور بے دولتی کو ان کی سخاوت شعاری میں کوئی دخل نہ ہوتا تھا

مُقَدَّمٌ بَعْدَ ذِكْرِ اللّٰهِ ذِكْرُهُمُ فِي كُلِّ بَدْءٍ وَمَخْتُومٌ بِهِ الْكَلِمُ

معنی:۔ مقدم ہے بعد ذکر اللہ کے ذکر ان کا ہر سخن کی ابتدا میں اور سخن کا خاتمہ بھی انھیں کے ذکر پر ہے۔ یعنی بعد ذکر خدا کے ذکر محمدؐ و آل محمدؐ کا ہر سخن پر مقدم ہے اسی طرح انھیں حضرات کے ذکر پر ہر سخن کا خاتمہ بھی ہونا چاہیئے واضح ہو کہ حکم نبوی صلعم بھی ایسا ہے۔ اللّٰھم صلِّ علیٰ محمدٍ وآلِ محمدٍ

یَاَبیٰ لَھُمْ اَنْ یَحُلَّ الذَّمُّ سَاحَتَہُمْ　　خِیْمٌ کَرِیْمٌ وَّاَیْدِیْ بِالنَّدیٰ ھُضُمٌ

معنی :۔ نہ نکوہش انکار رکھتی ہے کہ ان کے گھر میں فرود آئے کیونکہ ان کی خصائل کریم ہیں اور ان کے ہاتھ پُرانداز داد و دہش ہیں یعنی ایسے ہاتھ ہیں کہ جو کچھ رکھتے ہیں دے ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ارباب جود و سخا کے گھر نکوہش کیونکر آسکتی ہے۔

اَیُّ الْخَلَائِقِ لَیْسَتْ فِیْ رِقَابِھِمْ　　لِاَوَّلِیَّۃِ ھٰذَا اَوْلَہٗ نِعَمٌ

معنی :۔ کون خلائق سے ہے جو ان کے بندگان سے نہیں ہے بسبب اولیت اس شخص کے یا بسبب اس کی نوازش اور انعام کے یعنی اس وقت کون ایسے لوگ ہیں جو خاندان پیغمبرؐ کے بندے نہیں ہیں اس غلامی کا سبب یہ شخص ہوا ہے اول اپنی افضلیت اور دوم اپنی نوازش و کرم کی بنیاد پر۔

مَنْ یَعْرِفِ اللّٰہَ یَعْرِفْ اَوَّلِیَّۃَ ذَا　　وَالدِّیْنُ مِنْ بَیْتِ ھٰذَا نَالَہُ الْاُمَمُ

معنی :۔ جو شخص خدا کو پہچانے گا وہ اس شخص کی اولیت کو بھی پہچانے گا اور امتوں نے دین کو اس شخص کے گھر سے پایا ہے اس قول کی صحت میں اسی کو گفتگو ہو گی جو تنقیص شان علی ابن ابی طالب اور بقیہ ائمہ معصومین علیہم السلام مد نظر رکھتا ہو گا واضح ہو کہ یہ قصیدہ فی البدیہہ کہا گیا تھا۔ اس سے فرزدق کی طباعی کا موازنہ کرنا چاہیئے۔ واقعی یہ شخص بڑی قوت شاعری رکھتا تھا اس پر لطف یہ ہے کہ اس کا مذاق شاعری کس قدر عالی تھا اس قصیدے میں کسی قسم کی بد مذاقی کی بات نظر نہیں آتی ہے نہ مبالغہ ہے نہ تشبیہ و استعارہ کی کثرت ہے جو مضمون ہے وہ ایسا ہی ہے کہ پیغمبر و خاندان پیغمبرؐ کے معاملات کے

حسب حال ہے علاوہ اس کے ہر شعر کس قدر خلوص و ولا کے مزے سے بھرا ہوا
ہے جوش دین اور ایمان راستی عقیدت کا جلوہ ہر شعر سے عیاں ہے لاریب
جس شاعر کو خاندان پیغمبرؐ کے ساتھ اس قدر تعلق نہ ہوگا وہ ایسا پُر تاثیر قصیدہ
نہیں تصنیف کر سکتا ہے خدائے تعالیٰ فرزدق کو جزائے خیر دے کہ اس نے
پیغمبرؐ صاحب کے خاندان مظلوم کو اس جوش ولا کے ساتھ یاد کیا خدایا وہی
جزائے خیر تو ان حضرات کو بھی عطا فرما جو اس قصیدہ کو اسی جوش کے
ساتھ مطالعہ فرمائیں ظاہر ہے کہ ایسے قصیدوں کا صدق دل سے پڑھنا تمام تر
حقوق خاندان پیغمبرؐ کا ادا کرنا اور اپنی عاقبت کا سنوارنا ہے خیر اب حضرات
ناظرین اس قصیدے کو متنبی کے اس قصیدے کے ساتھ جو کاتب ہارون کی شان
میں ہے ملائیں وقت مقابلہ ظاہر ہوگا کہ متنبی کا کلام کس قدر نامطبوع مبالغوں
سے بھرا ہوا ہے صاف متنبی کے انداز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک
شاعر اجرت طلب تھا۔ کیا خود اپنے دل میں متنبی اس کا معترف نہ ہوتا ہوگا۔
کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض لغو سرائی ہے اس کی تحریر کا مصداق
نہ ہارون نہ ہارون کا آقا ہو سکتا تھا اور نہ کوئی ان کا ایسا دنیا دار شخص
ہو سکتا ہے اسی کے برخلاف فرزدق کے قصیدے کو قیاس کرنا چاہئے
کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا ممدوح اس کے محامد سے بدرجہا عالی و برتر ہے
اور اس لئے جو کچھ اس نے کہا ہے بہت ہی قلیل در قلیل ہے حضرات
ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ قصیدہ گوئی کا یہ مطلب زینہار نہیں ہے کہ شاعر
سلاطین و اُمرا کی مدحوں سے شاعری کو ذلیل کرے قصیدہ گوئی سے مراد

ہے کہ یا مسائل اہم پیرایۂ نظم میں بیان کئے جائیں یا خدا و رسولؐ و آل رسولؐ کی
حمد و نعت و منقبت کے مضامین خوش اسلوبی کے ساتھ موزوں کئے جائیں
پس جاننا چاہئے کہ متنبی اغراض قصیدہ گوئی کے خلاف کاربند ہوا ہے اور
فرزدق تمام تر تقاضائے قصیدہ گوئی کے قرین رہا ہے۔

ذیل میں نمونے کے طور پر کچھ ایسے اشعار درج کئے جاتے ہیں جو ماقبل
کے اشعار سے تمام تر علحدہ رنگ رکھتے ہیں یہ اشعار وزیر بہاء الدین
زہیر کے ہیں یہ شخص ایک بڑا قابل شاعر گذرا ہے علاوہ اس کے بہت
کچھ جامع علوم و فنون تھا اس کا دیوان دیدنی ہے اس کی شاعری تمام تر
یوروپین مذاق رکھتی ہے اس لئے اہل یورپ کو اس کا انداز کلام نہایت
پسند ہے ایشائی مبالغوں سے لاریب اس کے سب ہی اشعار پاک ہیں
تشبیہ اور استعارے بھی الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں شاعری کا لطف
اس عمدگی مضامین اور شستگی زبان سے ہویدا ہے بلاشبہ تعلیم یافتہ اشخاص
کو اس شاعر کا کلام ضرور ہے کہ پسند آئے حضرات شائقین زہیر کے دیوان
کو ضرور ملاحظ فرمائیں یہ دیوان شہر لندن میں چھپ گیا ہے فقیر کے پاس
جو نسخہ ہے مطبوعۂ لندن ہے اسی نسخہ کے دیباچے میں بہاء الدین زہیر کی
نسبت ابن خلکان کی کتاب وفیات الاعیان و ابناء ابناء الزمان میں
سے یہ حالات مندرج دیکھے جاتے ہیں کہ ابوالفضل زہیر بن محمد بن علی
بن یحییٰ بن الحسن بن جعفر بن منصور بن عاصم المہلبی العتکی ملقب بہ
بہاء الدین الکاتب فضلائے عصر سے تھا اور نظم و نثر اور خطاطی میں

سب پر غلبہ رکھتا تھا سلطان ملک صالح خدیو مصر کی سرکار سے متعلق تھا جب سلطان مذکور شام کی طرف گیا وہ بھی ہمراہ تھا اور جب اس کا قبضہ دمشق پر ہو گیا اس نے بھی اس شہر میں قیام اختیار کیا بعدازاں ملک صالح گرفتار ہو گیا تب زہیر شہر نابلس میں رہ کر اپنے آقا کے حالات کا نگران رہا جب صالح کو مخلصی حاصل ہوئی اور وہ مصر کی سلطنت کو واپس گیا یہ شاعر بھی اس کے ساتھ مصر کو گیا ابن خلکان لکھتا ہے کہ ہم کو زہیر سے ملاقات ہوئی اور ہم نے اس کے چند اشعار اس کی زبان سے سنے اس مورخ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ زہیر مصر میں مر گیا اس کی وفات کا سن ہجری ۶۵۶ اور سن عیسوی ۱۲۵۸ ہے اور اس کی قبر قرافات الصغریٰ میں قبر امام شافعی صاحب کے نزدیک واقع ہے۔

نمونہ کلام زہیر

وَقَالَ وَكَتَبَ اِلٰی بَعْضِ اَصْدِقَائِهٖ وَكَانَ قَدْ غَرِقَتْ سَفِيْنَتُهٗ وَذَهَبَ كُلُّمَا كَانَ فِيْهَا

یعنی شاعر نے اپنے ایک ایسے دوست کو یہ اشعار لکھے ہیں کہ جس کی کشتی سفر دریا میں ڈوب گئی تھی اور جو کچھ اس کا مال تھا ضائع ہو گیا تھا۔

لَا تَعْتِبِ الدَّهْرَ فِیْ خَطْبٍ رَمَاكَ بِهٖ	اِنْ اَسْتَرَدَّ فَقِدْمًا طَالَمَا وَهَبَا
حَاسِبْ زَمَانَكَ فِیْ حَالَیْ تَصَرُّفِهٖ	تَجِدْهُ اَعْطَاكَ اَضْعَافَ الَّذِیْ سَلَبَا
وَاللّٰهُ قَدْ جَعَلَ الْاَيَّامَ دَائِرَةً	فَلَا تَرٰی رَاحَةً تَبْقٰی وَلَا تَعَبَا

دَلْ هُوَ مَالَكَ وَهِيَ الرُّوحُ حَقَّنَ سَلِمَتْ — لَا تَأْسَفَنَّ لِشَيْءٍ بَعْدَهَا ذَهَبَا
مَا كُنْتَ أَوَّلَ مَمْنُوٍّ بِحَادِثَةٍ — كَذَا مَضَى الدَّهْرُ لَا بِدْعًا وَلَا كَذِبَا
وَرُبَّ مَالٍ نَمَا مِنْ بَعْدِ مَرْزِئَةٍ — أَمَا تَرَى الشَّمْعَ بَعْدَ الْقَطِّ مُلْتَهِبَا

یعنی زمانے پر عتاب نہ کہ کہ اس نے تجھے محل تردد میں ڈالا۔ اس کا دستور ہے کہ دے کر اپنی دی ہوئی چیز کو لے لیتا ہے زمانے کے ہر دو تصرف پر نظر ڈال تجھے معلوم ہوگا کہ جس قدر لیتا ہے اس کا مضاعف تجھے دیتا ہے خدا نے زمانے کو گرداں بنایا ہے پس نہ رنج کو قرار ہے نہ راحت کو تیرا راس المال تیری جان ہے جو سلامت رہ گئی پس جان کے سوا اور جو کچھ شئے جاتی رہی اس پر ہرگز افسوس نہ کر تو ہی پہلا شخص نہیں ہے کہ مبتلائے مصیبت ہوا ہے دنیا کا یہی انداز ہے اکثر یہی ہوتا ہے کہ مال نقصان پذیر ہو کر ترقی کرتا ہے جیسا کہ شمع گل لینے سے روشن تر ہوتی ہے۔

ان اشعار کا فطرتی انداز محتاج بیاں نہیں ہے شاعر کی خوش مذاقی ہر مصرع سے عیاں ہے،

وَلَهٗ

وَكَتَبَ إِلَى صَدِيقٍ لَهٗ فِي جَوَابِ كِتَابٍ

یعنی ایک دوست کے خط کے جواب میں ہر دو شعر ذیل زہیر نے لکھے۔

وَافَى كِتَابُكَ وَهُوَ بِا — لْأَشْوَاقِ عَنِّيْ يُعْرِبُ
قَلْبِيْ لَدَيْكَ أَظُنُّهُ — يُمْلِيْ عَلَيْكَ وَتَكْتُبُ

یعنی تیرا خط پہنچا اور وہ میرے شوقوں کا اظہار کرتا ہے گویا کہ تیرے دم تحریر میرا دل تیرے پاس موجود ہو کر تجھے مضامین بتا رہا تھا۔

وَلَهٗ

وَقَالَ فِی رِحْلَتِ الشَّبَابِ

یعنی رخصت شباب میں مذہبوں نے یہ کہا ہے

رَحَلَ الشَّبَابُ وَلَمْ اَنَلْ ۔۔۔ مِنْ لَذَّةٍ فِیْهَا نَصِیْبِیْ

یَا طِیْبَهٗ لَوْ لَمْ یَكُنْ ۔۔۔ مَلَاٰءَ الصَّحَائِفِ بِالذُّنُوْبِ

اَرْسَلْتُ دَمْعِیْ خَلْفَهٗ ۔۔۔ فَعَسَاهُ یَرْجِعُ مِنْ قَرِیْبِ

هَیْهَاتَ لَا وَاللّٰهِ مَا ۔۔۔ هُوَ بِالسَّمِیْعِ وَلَا الْمُجِیْبِ

فَقَدِ انْجَلٰی لَیْلُ الشَّبَا ۔۔۔ بِ وَقَدْ بَدَا صُبْحُ الْمَشِیْبِ

فَقُلِ السَّلَامُ عَلَیْكَ یَا ۔۔۔ وَصْلَ الْحَبِیْبَةِ وَالْحَبِیْبِ

وَرَاَیْتُ فِی الْاَنْوَارِهٖ ۔۔۔ مَاكَانَ یَخْفٰی مِنْ عُیُوْبِیْ

یعنی شباب رخصت ہو گیا اور لذت شباب سے مجھے کچھ بھی بہرہ حاصل نہ ہوا. شباب خوش تھا مگر کاش دفتر گناہ سیاہ نہیں ہوا ہوتا میں نے شباب کے پیچھے آنسو رواں کئے اس امید پر کہ شاید شباب معاودت کرے مگر افسوس کہ اس نے عود نہ کیا اور بخدا میری ایک نہ سنی. المختصر شباب کی رات بسر ہو گئی اور پیری کی صبح نمودار ہو گئی پس الوداع اے وصل یار میں نے انوار پیری میں اپنے ان عیوب کو معاینہ کر لیا جنہیں شباب کی ظلمت چھپائے ہوئے تھی. سبحان اللہ کیا خوب استعارہ شاعر نے اختیار کیا ہے

وَلَهٗ

اَیُّهَا الْغَائِبُ عَنِّیْ اِنَّنِیْ ۔۔۔ عَلِمَ اللّٰهُ لَمُشْتَاقٌ اِلَیْكَ

فَاِذَا هَبَّ نَسِیْمٌ طَیِّبٌ   اَفَاذَاکَ الْوَقْتَ سَلَّمْتُ عَلَیْکَ

یعنی اے دوست کہ تو غائب ہے مجھ سے خدا جانتا ہے کہ میں کس قدر تیرا مشتاق ہوں جب ہوائے عطر آگیں بہتی ہے تو میں اس وقت تجھے سلام سے یاد کرتا ہوں۔

تمام ہوئی جلد اول

قطعہ تاریخ از نتیجہ افکار جناب سید علی محسن صاحب بلگرامی شاگرد حضرت صفیر بلگرامی

کامل شعر و سخن سید امداد امام
جن کی تحقیق ہے دنیا میں رشک الشمس اظہر

ہیئت و ہندسہ و طب و فلاحت پہ عبور
ہے قیافہ و نجوم آٹھ پہر پیش نظر

صرف و نحو ادر معانی و بیاں میں کامل
عالم علم ریاضی و تواریخ و سیر

فن تفسیر و حدیث و فقہ و علم کلام
منطق و حکمت و اخلاق و ادب ہیں از بر

ایک فن میں کوئی کامل ہو ہے قابل قدر
جامعیت کا بیاں لطف ہے۔ اے اہل نظر

دیکھو جس فن میں انہیں کامل و اکمل دیکھو
ڈھونڈ لو جس علم میں ہنر سے ملیں گے بہتر

کس لیاقت کی لکھی ہے یہ کتاب نایاب
اس سے انکار ہے بے شبہ خطائے منکر

ہیں ہر اک ملک کے شاعر کے خیالات بہم
امرء القیس کہیں اور کہیں ورجل ہومر

ہے کہیں شاعری اہل عرب کی توضیح
مصر و یونان کے شاعر ہیں کہیں پیش نظر

مختصر یہ ہے کہ ہے عطریہ مجموعے کا
بس گیا جس سے دماغ ہنر و اہل ہنر

للہ الحمد کہ چھپکر ہوئی مطبوع جہاں
شکر صد شکر کہ چھپکر ہوئی منظور نظر

فکر تاریخ جو کی بے سر اعدا محسن
دل پکارا کہ لکھو۔ گلبن بستان اثر

۱۲۱۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صل علیٰ احمد و آل کریم

تقریظ سراپا تاثیر از شاعر بے مثال و نازک خیال جناب سید علی محسن صاحب متخلص بہ محسن بلگرامی شاگرد حضرت صفیر بلگرامی

راست میگویم و یہ داں نہ پسند و خبر است

حرف نار است سر دن روش ماہر من است

امابعد حضرات ناظرین پہ روشن ہو کر بحمد اللہ کتاب کاشف الحقائق معروف بہ بہارستان سخن جلد اول تصنیف جناب شمس العلما مولوی حکیم سید امداد امام صاحب متخلص بہ اثر مرتب ہو کر طبع ہو گئی۔ الحق یہ کتاب عجیب و غریب ہے اسکا رنگ تمام ایشیائی تصانیف سے نرالا ہے شاید یورپین زبانوں میں بھی اس انداز کی کتاب کمتر موجود ہوگی۔ مصنف نے اس کتاب میں دکھلایا ہے کہ شاعری کیا شئے ہے فطری اور غیر فطری شاعری میں کیا فرق ہے شاعری کی صنفیں کیا کیا ہیں شاعری کے اغراض کیا کیا ہیں۔ شاعری سے اغراض انسانی کو کس قدر تعلق ہے اسی طرح صدہا مسائل علمیہ سے اس کتاب لاجواب میں حضرت مصنف نے بحث کی ہے علاوہ اس کے ہر زمانہ کی شاعری سے خبر دی ہے۔ مصری۔ یونانی۔ لاطینی۔ اطالوی۔ جرمن۔ انگریزی۔ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ سنسکرت۔ بھاشا۔ چینی۔ جاپانی۔ برہمائی۔ شاعریوں کے حقائق کو بقدر ضرورت حوالۂ قلم کیا ہے۔ پھر جس

ملک کی شاعری کو بیان کیا ہے اس ملک کے جغرافیہ. تاریخ. سیر. تمدن. مذہب. اخلاق. معاشرت. ادب. علم و فضل. مذاق. حرفہ. صنعت. تجارت. پیداوار. آب و ہوا. مزاج بلدان. وحوش. طیور. جبال. بحور. معادن وغیرہ وغیرہ کو بھی خوش مذاقی کے ساتھ تحریر فرمایا ہے. جدّت مضامین اس قدر ہے کہ مصنف کی جو کچھ قدر کی جائے بجا ہے. لاریب اس تصنیف سے حضرت مصنف کی قوت دماغی. حق پسندی. وفور اطلاع خوش مذاقی. حسن بیان حسب مراد آشکارا ہے. اس دیار کے اکثر ارباب علم و فضل حضرت مصنف کے نام نامی سے واقف ہیں. کس واسطے کہ مذاق شاعری کے علاوہ حضرت مصنف کو اکثر علوم و فنون میں بہرۂ وافی حاصل ہے. عربی فارسی وغیرہ وغیرہ کے سوا حضرت مصنف کو زبان انگریزی میں بھی دخل کامل ہے. فلسفہ جدید و قدیمہ سے وفور اطلاع کی شکل پیدا ہے. معقولات و منقولات سے اطلاع کافی حاصل ہے طبابت. باغبانی. زراعت اور شاعری کے ساتھ حضرت مصنف کی طبیعت ایک مناسبت خاص رکھتی ہے. علاوہ اس کے مذاہب مختلفہ سے پوری باخبری حضرت مصنف رکھتے ہیں. چنانچہ علم کلام میں بھی ان کی تصانیف موجود ہیں. اقسام مذاق کے ساتھ مذاق خدا کا رکچھ ایسا پیدا کیا ہے کہ کوئی شخص بے جامع تحصیل ہوئے ان کے اس انداز مذاق کو حاصل نہیں کر سکتا. راقم الحروف نے چاہا تھا کہ جناب مصنف کی سوانح عمری تذکرۂ ناظرین کرے مگر کم مساعدت زمانہ سے فرصت نہ ملی بہرحال اس جگہ حضرت مصنف کے کچھ خاندانی اور ذاتی حالات ذیل میں حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں حضرت مصنف ہمارے صوبۂ بہار کے ایک ممتاز خاندان سادات کے آدمی

ہیں اور خود بھی ایک مشہور و معروف شخص ہیں۔ چونکہ جناب مصنف کے خاندان سے راقم الحروف کے بزرگوں کو چھ سات پشت سے مرابطت کی تشکل قائم ہی ہے۔ راقم الحروف پر حضرت مصنف کے خاندان کی حقیقت اچھی طرح روشن ہے

حضرت مصنف یعنی جناب شمس العلما مولوی حکیم سید امداد امام صاحب جو خلف اکبر جناب شمس العلما مولوی سید وحید الدین خان بہادر ابن سید امداد علی خان بہادر ابن سید امام علی ابن سید بقیۃ اللہ ابن سید احمد اللہ حسینی الحسنی کے ہیں نسبت نسل حضرت زید شہید فرزند ارجمند حضرت امام زین العابدین علی ابن الحسین ابن علی ابن ابیطالب علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ رکھتے ہیں۔ ان کا نانا ہے حسن دادا حسین رض جد اعلیٰ جناب ممدوح کے سید فیروز جو سید ابوالفرح واسطی کی نسل سے تھے۔ ہندوستان میں تشریف لائے حضرت مصنف کے والد بزرگوار کے اجداد مادری سے حضرت سید حسین خنگ سوار تھے۔ جو اس صوبہ میں بشکل مجاہد تشریف لائے اور بعد نتھیالی کے موضع نیورہ میں توطن پذیر ہوئے اور اسی نیورہ میں جو اس وقت حضرت مصنف کا مسکن ہے ان کا مزار واقع ہے۔ یہ بزرگ حضرت سید حسن خنگ سوار کے کا مزار شریف اجمیر کی پہاڑی پر واقع ہے۔ اور جن کا ذکر کتاب مفتاح التواریخ میں مسٹر بیل صاحب فرماتے ہیں برادر اصغر تھے حضرت مصنف کے والد کے مادری بزرگواروں میں نواب حاجی سید احمد سعید خان بہادر ظفر جنگ امیر الوردا اور نواب سید عتیق اللہ خان صوبہ دار اٹاوہ بھی تھے ان دونوں نامی بزرگواروں کے حالات کتاب سیر المتاخرین کے صفحہ ۳۱۰۔ ۲۱۷، ۳۲۲ - ۲۲۹،۲۴۳،

۳۳۳. ۳۳۴، ۳۳۹، میں مندرج ہیں اور کتاب رقعات عالمگیری کے رقعہ ۵۲ و رقعہ ۹۴ میں بھی حضرت اورنگ زیب شاہنشاہ دہلی انھیں عزت کے ساتھ یاد فرماتے ہیں اسی طرح کتاب گولڈن بک میں سر روپر لیتھبرج صاحب ممبر پارلیمنٹ جناب شمس العلما سید وحید الدین خان بہادر پدر جناب مصنف کے حالات میں نواب حاجی سید احمد سعید خانصاحب کا ذکر کرتے ہیں۔

مصنف ممدوح کے اجداد مادری میں سید محمد نجیب ایک بہت بڑے تعلقہ دار صوبہ بہار کے تھے ان کے صاحبزادے سید حسن عسکری افواج دہلی کے بخشی تھے. یہ حضرت اپنے وقت کے ایک بڑے نامی اور صاحب اختیار امیر تھے ان کا مزار موضع کراپر سرائیں واقع ہے. سید حسن عسکری صاحب کے دو فرزند میر امجد علی صاحب اور نواب میر مردان علی خان بہادر بڑے نامی وگرامی ہوئے میر امجد علی صاحب تو وہی بزرگ ہیں جن کا نام ضلع پٹنہ کے جنوبی حصول میں آج تک السنہ خلائق پر جاری ہے اور جنھوں نے اپنے لشکر سوار و پیادہ سے کولون کی لڑائی میں سرکار انگلشیہ کو بڑی اعانت دی تھی اور جس کے صلہ میں ان کو ایک بڑا تعلقہ سرکار بہادر سے ضلع گیا میں مرحمت ہوا تھا یہ حضرت اپنے وقت کے ایک بڑے قوی اور ذی اختیار تعلقہ دار تھے. اور نہایت سخی اور سپاہی مزاج آدمی تھے نواب میر مردان علی خان بہادر سرکار انگلشیہ کی طرف سے عامل ضلع شاہ آباد کے تھے. اور وسیع اختیارات فوجداری و عدالت و مال و بند و بست وغیرہ وغیرہ کے ساتھ ایک بہت بھاری تنخواہ بھی سرکار انگلشیہ

سے پاتے تھے نواب ممدوح سید امداد علی خان بہادر حضرت مصنف کے جدامجد کے حقیقی نانا تھے ۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حضرت مصنف یعنی شمس العلما حکیم مولوی سید امداد امام صاحب کو سرکار انگلشیہ سے چند پشت کا شرف نمک خواری حاصل ہے خود حضرت مصنف وکیل درجہ اعلیٰ و پروفیسر و منیجر وغیرہ تھے ۔ والد ماجد جناب مصنف کے شمس العلما سید وحید الدین خان بہادر عہدہ ہائے صدر الصدور مجسٹریٹ ضلع و رجسٹرار ضلع و جج اسمال کاز کورٹ و جسٹس آف دی پیس پر سرفراز تھے دادا حضرت مصنف کے سید امداد علی خان بہادر صدر الصدور اور حاکم فوجداری تھے پر دادا حضرت مصنف کے سید امام علی حاکم مال بہ لقب تحصیلدار تھے ۔ اسی طرح جد الجد حضرت مصنف کے یعنی سید بقیۃ اللہ صاحب بھی اسی عہدہ پر سرفراز تھے ۔ اس زمانہ میں یہی عہدہ بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا اس واسطے کہ اس زمانہ کے عہدہ ہائے جلیلہ اس زمانہ میں قائم نہیں ہونے گئے تھے جناب مصنف کے والد ماجد کے نانا سید سلامت علی خان اور ماموں سید راحت علی خان بہادر جلیلہ عہدہ ہائے عدالت و فوجداری پر سرفراز تھے جناب مصنف کے حقیقی چچا سید فرید الدین خان صاحب بھی حاکم عدالت تھے اس خاندان کے اور دو بزرگوار سید نجم الدین صاحب و سید فرزند علی صاحب جو حضرت مصنف کے چچا تھے آفتاب اقران و امثال تھے ۔ سید فرزند علی صاحب ایک نادر درجہ کی عقل و دانش رکھتے تھے اور بڑے ممدوح خلائق تھے سید نجم الدین صاحب کی خدمتیں دفتر ہائے سرکاری میں مندرج ہیں ۔ ولیم ٹیلر صاحب بھی

اپنی تصنیف جسیم موسوم بہ سی وہشت سال در ہند میں سید نجم الدین صاحب کو بڑی عظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے زمانہ میں بڑی بڑی کارگزاریاں سید نجم الدین صاحب سے نمایاں ہوئیں جس کے جلد دہیں سرکار بہادر نے انہیں عہدہ ڈپٹی مجسٹریٹی وخطاب سے سرفراز فرمانا چاہا مگر اس عزت کی پذیرائی میں جناب ممدوح خواہان معذرت ہوئے اس کے پہلے جناب ممدوح قیام دہلی کے زمانہ میں دربار شاہ دہلی سے بھی عزت یاب ہو چکے تھے مگر جناب ممدوح کو کوئی میلان اس طرح کی عزت یابیوں کی طرف نہ تھا بلکہ خلوت نشینی کی طرف ہمیشہ راغب تھے اور اسی طرح زندگی بسر کر ڈالی۔

اس وقت میں بھی جناب مصنف کے خاندان کے حضرات مشاہیر صوبہ بہار سے ہیں خود حضرت مصنف مخاطب بہ شمس العلما از جانب گورنمنٹ ہیں یہ خطاب بہت اعلیٰ درجہ کا ہے یہ خطاب سرکاری خطاب نواب سے چھوٹا ہے ورنہ ہندی خطابوں سے اعلیٰ ہے۔ حضرت مصنف کے برادر اوسط انریبل سید فضل امام خان صاحب منجانب گورنمنٹ خان بہادر کا خطاب رکھتے ہیں مولوی سید نصیر الدین خان بہادر ولد مولوی سید فرزند علی صاحب ایک کارگزار افسر سرکاری ہیں اور ہمارے شہر میں صیغہ مال و فوجداری کے ایک ممتاز حاکم ہیں مولوی سید محی الدین خان بہادر ولد سید نجم الدین صاحب مغفرالیہ عہدہ ڈپٹی کلکٹری و مجسٹریٹی پر فائز ہیں۔

مولوی سید شرف الدین صاحب ولد اصغر مولوی سید فرزند علی صاحب ایک نہایت فروغ یافتہ بیرسٹر ہیں اور کمالات صوری و معنوی سے مملو ہیں

مولوی سید ظہیر الدین صاحب جو حال میں عہدہ دار صیغہ مال تھے ایک اعلیٰ درجہ کے مصنف و محقق ہیں۔ ان کے والد جناب مولوی سید عبدالوہاب صاحب ایک بڑے نامی گرامی بزرگ تھے شجاعت و سخاوت میں کمتر اپنا نظیر رکھتے تھے۔ مولوی محمد یحیٰ صاحب ایک نہایت فروغ یافتہ وکیل درجہ اعلیٰ ضلع پٹنہ کے ہیں۔ علاوہ حضرات بالا کے اور چند حضرات ہیں۔ جو بجا آوری خدمت سرکار کے خیال سے عہدہ ہائے انرری مجسٹریٹی و مینو سپل کمشنری و ممبری ڈسٹرکٹ بورڈ کو انجام کر رہے ہیں۔ ان حضرات کے ذکر کے ساتھ حضرت مصنف کے برادر اصغر کا بھی ذکر ضروری ہے تاکہ نوجوانوں کو ان کے حالات کی اطلاع سے تعلیم کی شکل پیدا ہو۔ ان کا نام نامی مولوی سید یوسف امام صاحب ہے انہوں نے صغرسنی سے انتظام زمینداری و تجارت و کاشتکاری کیطرف توجہ فرمائی اور جو زمانہ نوجوانوں کے برباد ہونے کا ہے اسے اکتساب معیشت میں بسر کیا اس وقت ماشاء اللہ وہ نہایت مرفہ الحال ہیں اور یہ مرفہ الحالی ان کی زیادہ تر قابل تعریف اس نظر سے ہے کہ اکتساب معیشت میں انہوں نے کبھی صفت دیانت و امانت کو ہاتھ سے نہیں دیا اور کوئی ایسا کام نہیں کیا جو ان کی سیادت اور عالی خاندانی کے خلاف تھا اس وقت حکام انگلشیہ بھی ان سے رضامند ہیں اور ان کی خاص رعایا بھی ان سے تمام تر خرسند ہے۔

حضرت مصنف کے اخلاف بھی اسی درخت کے پودے ہیں۔ مولوی سید علی امام صاحب و مولوی سید حسن امام صاحب صاحبزادگان حضرت مصنف فروغ یافتہ بیرسٹر ایٹ لا ہیں ذہانت و ذکاوت و اخلاق وغیرہ میں چشم بددور

سراپا فضل خداوندی نظر آتے ہیں۔ میں ان دونوں لڑکوں کی نسبت بہت کچھ لکھتا مگر اس خوف سے کہ لوگ میری تحریر کو رعایتی نہ سمجھیں صرف اس شعر پر ؎
جو کہ افضال الٰہی سے ہوا نیک ہوا نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا
قناعت کرتا ہوں۔

جناب مصنف کے ہمشیرزاد سید محمد سلیمان صاحب پسر اکبر مولوی سید محمد یحییٰ صاحب بھی بیرسٹرایٹ لا ہیں اور حیدرآباد کی عدالت ہائی کورٹ سے متعلق ہیں سید ضمیر الدین ولد مولوی سید نصیر الدین خان بہادر لندن میں ڈاکٹری کا علم پڑھ رہے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ دو تین سال میں کامیاب ہو کر ہندوستان کو واپس آئیں گے۔ مولوی سید عبدالحمید صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ال پسر کلانی جناب مولوی سید عبدالحی صاحب مرحوم کے جو کہ زمیندار کلانی اور جنرل منیجر تھے حضرت مصنف کے خویش ہیں ان دنوں یہ صاحب سکرٹری ڈسٹرکٹ بورڈ ضلع شاہ آباد کے ہیں ایک اور ہمشیرزادہ حضرت مصنف کے مولوی سید زین الدین صاحب بی۔ اے ہیں۔ اور بی۔ ال کے امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔ سید محمد خلیل داماد مولوی سید محمد اسماعیل صاحب کے بی۔ اے ہیں اور بی ال کے امتحان میں جانے والے ہیں۔ سید عنایت کریم صاحب جو بی۔ اے۔ بی۔ ال۔ اور مولوی سید نصیر الدین خان بہادر کے خویش ہیں وہ بلفعل وکیل شہر پٹنہ کے ہیں امسال حضرت کے ایک بھانجی داماد خواجہ اقبال حسین صاحب نے بھی۔ بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہے ایک اور بھانجی داماد مولوی عبدالرحیم صاحب بیرسٹرایٹ لا ہیں ہائیکورٹ کے پیشہ بیرسٹری کے علاوہ ڈپٹی لیگل ریممبرنسر

کے عہدہ پر بھی سرفراز ہیں۔ ایک اور ہمشیر زادہ حضرت مصنف کے مولوی
سید مظہر امام صاحب سررشتہ دار محکمہ افیون ہیں۔ الغرض این خانہ تمام
آفتاب ست اللّٰہم زدو لا تنقص۔

حضرت مصنف ۱۷ اگست ۱۸۴۹ء کو پیدا ہوئے اس حساب سے
سن شریف ۸۴ برس کا ہے کمالات صوری و معنوی جو مبدءِ فیاض نے عطا فرمائے
ہیں اسکی تحریر کے لئے ایک جداگانہ کتاب ہونی چاہئے۔ علم حساب۔ جبر مقابلہ
اقلیدس۔ علم مثلث۔ علوم معدنیات و نباتات علم حیوانات۔ علم مناظرہ
جغرافیہ۔ تاریخ۔ سیر۔ فلسفہ جدیدہ و قدیمہ وغیرہ وغیرہ سے پوری واقفیت
حضرت مصنف کو ہے ایسا شخص کیوں نہ پایہ عالی رکھے۔ اور فن شکار میں تو
حضرت مصنف کو وہ یدطولا حاصل ہے کہ شاید ہمارے ملک ہندوستان میں
نظیر نکلے۔ اس پر طرز زندگی ایسی سادہ۔ ہمدردی بنی نوع انسان تو گویا گھٹی
میں پڑی ہے اپنے اپنے موقع پر اس طرح کی خالص اور سچی ہمدردی ظہور میں
آئی ہے کہ واقعی اہل ملک کے لئے نمونہ کا فائدہ دے سکتی ہے۔ میں ضرور دو
چار واقعے ہمدردی کے لکھتا مگر بخوف تطویل سے قلم انداز کئے۔ شجاعت
و سخاوت تو خاندانی ترکہ ہے کتنے شیر و پلنگ، اژدر و نہنگ مارے اور بہت
مواقع میں سچی شجاعت کی داد دی ایام سرما و گرما کی شب ہائے تار صحرا و
کوہ میں بسر کیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جفاکشی کے لئے مخلوق ہوتے ہیں۔ اس
صفت شجاعت کے ساتھ سیر چشمی ایسی کہ کمتر دیکھی گئی ہے۔ اپنے دیار میں
قناعت و دیانت و امانت و خلق و انکسار و تواضع میں بھی مشہور رہے ہے

ہیں۔ تصانیف ممدوح سے حضرت کی کثیر المذاقی ظاہر ہے جناب ممدوح کی قابل لحاظ تصانیف ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) کتاب مرآۃ الحکما — یہ دونوں کتابیں سویڈن میں ترجمہ ہو گئی ہیں اور ایک فرمان
(۲) کتاب الاثمار — شاہ سویڈن وناروے کا بنام مصنف مصنف کے پاس ہے حضرت شاہ خلد اللہ ملکہ نے یہ دونوں کتابیں اپنی یونیورسٹیوں کو استفادہ ملکی کے خیال سے سپرد فرمائی ہیں جیساکہ مضمون فرمان ہے۔

(۳) کتاب کیمیائی زراعت — یہ کتاب بمنظوری مہتمم زراعت سرکاری یعنی ڈائرکٹر اگری کلچر طبع ہوئی۔

(۴) ہدیہ قیصریہ — جناب ملکہ معظمہ قیصرہ ہند دام اقبالہا کی سوانح عمری ہے جس تحقیق و تدقیق سے جناب مصنف نے یہ تحریر لکھی ہے دیکھنے والے کا دل جانتا ہے۔

(۵) معیار الحق — اس میں نکاح حضرت زینب جحش پر جو الزامات ملحدین ہیں ان کا جواب ہے اس رسالہ پر تقریظ حضرت تاج العلما مولانا سید علی محمد صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ ثبت ہے

واضح ہو کہ اس کتاب کاشف الحقائق کے ساتھ حضرت مصنف کا دیوان بھی طبع ہوا ہے اس کی نسبت جناب مرزا محمد جعفر صاحب اوج مدظلہ صاحبزادہ جناب غفران مآب سلطان الذاکرین حضرت مرزا سلامت علی صاحب دبیر اعلی اللہ مقامہ فی الجنان نے جو تحریری رائے ظاہر فرمائی ہے اور نیز جناب حکیم

سید نعمان حیدر صاحب رئیس و وکیل عدالت آرہ نے جو تقریظ رقم فرمائی ہے ذیل میں مدرج کی جاتی ہے۔

تقریظ چکیدۂ کلک گہر سلک جناب مرزا محمد جعفر صاحب متخلص بہ اوج خلف الرشید جناب سلطان الذاکرین مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنان۔

باسمہ سبحانہ وتعالی حضرت عزبیان صفانہ السنۃ البلغاء وقصرت عن ادراک حقیقۃ عقول الحکماء سلم وبارک علی اکمل الانس خیر البشر محمد المصطفی وآلہ النجباء

امابعد بہ فحوائے آیہ وافی ہدایہ الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات وبمفہوم حدیث شریف ان من الشعر لحکمۃ صناعۂ شعریہ کہ عموماً بہ مسائل حکیمہ مستلزم ہے اپنی دیگر صنف تخیل سے کابعد فی المشرقین ممتاز ہے اور از بسکہ بہترین مسائل حکیمہ اخلاق حضرات چہاردہ معصومین صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کے اذکار اخبار ہیں۔ پس خصوصاً ان بیانات پر مبنی ہونا فی الدارین موجب اعزاز ہے دو نیولا پہ اشہ مجموعہ کمالات وہنر ہمارے معزز دوست فاضل کامل محقق الادیب مدقق الاریب ذو الفطنۃ الوقاد والقریحۃ النقاد مکارمہ لاتحصے ومحاسنہ لاتملے ارسطو زمان بطلیموس دوران بدر الحکما شمس العلما جناب مولوی سید امداد امام صاحب اثر تخلص کا ملاحظہ ہیچمدان سے گزرا۔ ماشاء اللہ کیا کہنا اگرچہ اردو سے معلی مادری زبان ہمارے ذی علم دوست کی نہیں ہے اس پر بہ محاورت محاورت کی کوششیں طاقت طلاقت کی جوششیں اور سحر لفظ نئے پیرائے مناسب

رعایتیں چوکھی ترکیبیں روح افزا حسن وعشق کے دلکش آئین۔ قدرتی فطرتی انداز جناب مرزا غالب مرحوم پروانہ جس کی پسند پر فطرت خواہ مخواہ مجبور کرتی ہے ہیں کیا ہر اہل ذوق کے دیدۂ شوق میں کھبنے کے لائق۔ اور دفتر فصاحت میں فائق ہیں۔ بس۔

عبدہ و ابن عبدہ محمد جعفر اوج

تحریر جناب مولوی حکیم سید لقمان حیدر صاحب وکیل عدالت آرہ

جناب شمس العلما الحکیم مولوی سید امداد امام صاحب کی کثیر المذاقی ایک امر مسلم ہے شاعری بھی ان کے مذاق ہائے گوناگون کا ایک جلوہ ہے انکی شہرت اسی فن کی دستگاہ پر موقوف نہیں ہے۔ ان کی آبائی عزت ان کی ذاتی قابلیت اس قدر ہے کہ اس کی تفصیل طولانی ہے ؎

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہگری کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

لیکن چونکہ ان کا مذاق شاعری اس جگہ پر زیر بحث ہے تو راقم الحروف ان کی شاعری کی نسبت اپنے خیالات ذیل میں درج کرتا ہے۔

جناب شمس العلما مولوی حکیم سید امداد امام صاحب کے کلام میں کیوں اثر نہ ہو جب یہ قول تجربہ ہائے کافی ووافی سے مان لیا گیا ہے کہ آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد علاوہ اس کے جو صاحبان کہ مصنف والانژاد کی ارتباط لطف ومصفائی قلب سے فیض حاصل کرنے کا فخر خاص رکھتے ہیں ان کے خیال میں تو یہ کلام سہل الممتنع اشراقیت کا پورا پورا رنگ پیدا کرتا ہے۔ سادگی کے ساتھ فصاحت کلامی تو خاندان سیادت کے ساتھ ہمیشہ سے مختص رہی ہے اس پر تحصیل

تکمیل علوم و فنون قدیم و جدید و زبان ہائے عربی فارسی و انگریزی وغیرہ نے
دل صفا منزل پر حضرت مصنف کے ایک ایسا محققانہ اثر ڈالا ہے کہ جوانانہ
مذاق جو محض حیاست ظاہری کی لذات بے ثبات سے تعلق رکھتا ہے
اب ان کی چشم آخر بیں کے سامنے بالکل پھیکا پڑ گیا ہے مگر ساتھ اس کے
بھی غزل سرائی کے سے نازک رنگ میں اس کے حلقہ کے اندر رہکر جس قدر
فطرتی جذبات محققانہ مسائل عاشقانہ واردات قلبیہ محض بیساختہ پن کے
ایک نیچرل پیرایہ میں جناب شمس العلما صاحب نے جو پیش کس اہل بصیرت
کیا ہے اسکا مزا اس دل سے پوچھے جو کسی قدر بھی پُرسوز ہے۔
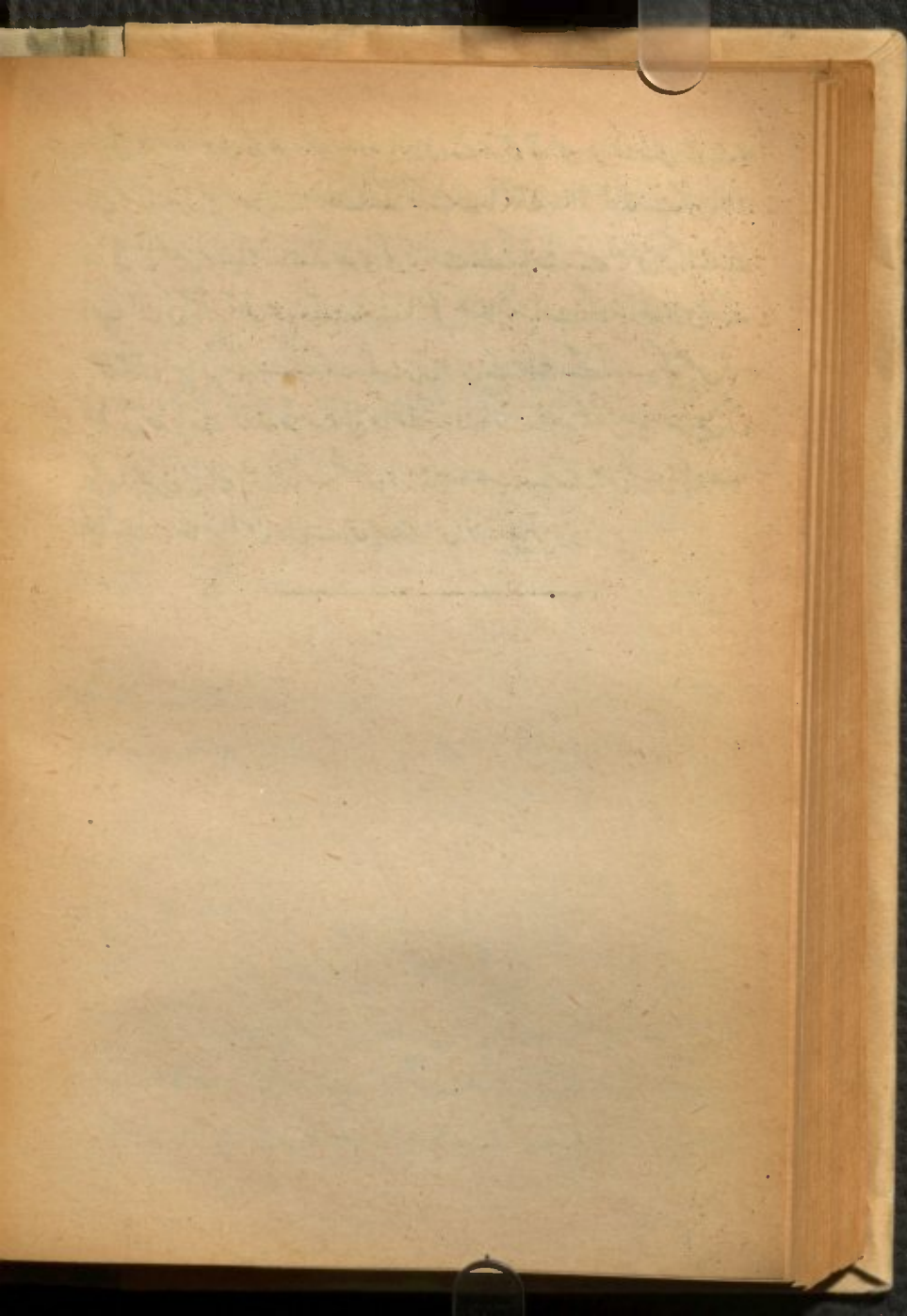
(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

از زمین تا بہ آسمان سخن است

کاشفُ الحقائق

معروف بہ

بہارستانِ سخن

مشتمل بر شاعری ہائے مختلف اقوامِ جہان

از تصانیف

عالیجناب نواب سید امداد امام صاحب زیدی واسطی متخلص بہ اثرؔ و مخاطب بہ نواب شمس العلما بحکم گورنمنٹ ہند متوطن نیورہ ضلع پٹنہ صوبہ بہار و مصنف کتاب مراۃ الحکماء و کتاب الاثمار و مصباح الظلم و کتاب الزراعت و ہدیہ قیصریہ و معیار الحق و رسالہ طاعون و دیوان اثر وغیرہ وغیرہ

جلد دوم

مکتبہ معین الادب اُردو بازار لاہور

طبع دوم جنوری ۱۹۵۶ء تعداد ۱۰۰۰

حرفِ ناشر

زیرِ نظر کتاب کے پہلے ایڈیشن میں غلطیوں کی ایک بڑی تعداد باقی رہ گئی تھی جسے "غلط نامہ" کے تحت (جو بائیس صفحات پر مشتمل تھا) کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا تھا۔ طبع جدید میں یہ غلط نامہ اڑا کر حتی المقدور متن کی تصیح کر دی گئی ہے۔ اس کے سوا اور کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا گیا۔

معین الدین حزین کاشمیری

فہرست مضامین کتاب

نمبر شمار	خلاصہ مضامین کتاب	صفحہ
۱۶	اہلی شیرازی بحیثیت غزل گو	۷۲
۱۷	میلی بحیثیت غزل گو	۷۳
۱۸	کلیم بحیثیت غزل گو	"
۱۹	زلالی بحیثیت غزل گو	۷۴
۲۰	حزین بحیثیت غزل گو	۷۵
۲۱	بیدل واقف مظہر جان جاناں آرزو قتیل بحیثیت غزل گو	۷۶
۲۲	مرزا غالب بحیثیت غزل گو	۷۷
۲۳	موازنہ کلام حافظ و غالب	۸۰
۲۴	موازنہ کلام سعدی و غالب	۸۳
۲۵	مرزا صائب بحیثیت غزل گو	۸۴
۲۶	موازنہ کلام حافظ و صائب	۸۶
۲۷	فارسی اور اردو زبان کا مختصر بیان	۸۷
۲۸	اردو زبان کی نظم و نثر کی مختصر تاریخ	۹۴
۲۹	ولی دکنی بحیثیت غزل گو	۱۰۴
۳۰	مرزا سودا بحیثیت غزل گو	۱۰۶
۳۱	انتخاب کلام سودا	۱۰۷
۳۲	خواجہ میر درد بحیثیت غزل گو	۱۱۰
۳۳	انتخاب کلام درد	۱۱۲
۳۴	میر تقی بحیثیت غزل گو	۱۱۴

نمبر شمار	خلاصہ مضامین کتاب	صفحہ
۳۵	انتخاب کلام میر	۱۱۶
۳۶	مومن خان دہلوی بحیثیت غزل گو	۱۲۲
۳۷	موازنہ کلام مومن و آتش	۱۲۳
۳۸	انتخاب کلام مومن	۱۱۶
۳۹	ذوق دہلوی بحیثیت غزل گو	۱۲۹
۴۰	ذوق کے خارجی مضامین کے اشعار	۱۳۰
۴۱	ذوق کے داخلی مضامین کے اشعار	۱۳۳
۴۲	مرزا غالب بحیثیت غزل گو	۱۳۷
۴۳	انتخاب کلام غالب	۱۳۹
۴۴	شیخ ناسخ بحیثیت غزل گو	۱۵۱
۴۵	موازنہ کلام ناسخ و غالب	۱۵۷
۴۶	موازنہ کلام ذوق و غالب	۱۵۹
۴۷	ناسخ کے داخلی رنگ کے اشعار	۱۶۱
۴۸	خواجہ آتش بحیثیت غزل گو	۱۶۲
۴۹	موازنہ کلام آتش و غالب	۱۶۴
۵۰	انتخاب کلام آتش	۱۶۷
۵۱	رند بحیثیت غزل گو	۱۷۱
۵۲	انتخاب کلام رند	۱۷۱
۵۳	اردو کی غزل گوئی پر ایک محققانہ ریویو	۱۷۸

صفحہ	خلاصہ مضامین کتاب	نمبر شمار

نمبر شمار	خلاصہ مضامین کتاب	صفحہ

کاشف الحقائق

جلد دوم

جس میں فارسی اور اُردو کی شاعری کا بیان حوالۂ قلم ہوا ہے

عامداً و مصلیاً

فارسی اور اُردو شاعریاں واحد المذاق

چونکہ دونوں زبانوں کی شاعریوں کا ایک ہی انداز ہے اس لئے دونوں کا ذکر اجمالی طور پر کیا جاتا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ اُردو کی موجودہ شاعری فارسی کی شاعری کے ساتھ بڑی مشابہت رکھتی ہے۔ دونوں زبانوں کی شاعریاں اصناف کے اعتبار سے برابر ہیں اور خیالات کا رنگ تمام تر ایک ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اُردو کے شعراء فارسی کے ہمیشہ متتبع رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُردو کی شاعری باوجود اس کے کہ اس کو فروغ ہندوستان میں ہوا ہے۔ سنسکرت کی شاعری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے۔ حالانکہ تقاضائے ملکی یہی تھا۔ کہ اُردو کی شاعری سنسکرت کی شاعری

کا انداز پیدا کرتی۔ لاریب اگر اُردو کے شعراء، شعرائے سنسکرت کا تتبع اختیار فرماتے تو اُردو کی شاعری کا دائرہ وسیع ہو جاتا۔ ایسی حالت میں اُردو کی شاعری ممتاز تر صورت پیدا کرتی۔ مگر اس عدم تتبع کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اُردو کے شعراء زبان سنسکرت سے واقفیت نہیں رکھتے تھے اور چونکہ عموماً صرف فارسی میں مہارت رکھتے تھے شعرائے فارسی کے سوا انہیں اور کسی دوسری زبان کے شعراء کے تتبع کا موقع حاصل نہ تھا۔ کاش شعرائے اُردو، شعرائے سنسکرت سے مطلع رہ کر اُن کے متتبع ہوتے تو اُردو میں اصناف شاعری کا عدد بڑھ جاتا۔ مثلاً ڈرامانگاری اُردو شاعری میں داخل ہو جاتی اور اس جدّت سے اُردو شاعری کا وزن یقیناً اہل یورپ کے نزدیک ترقی کر جاتا اور اس ترقی سے زبانِ اُردو کا شمار اعلیٰ درجے کی زبانوں کے ساتھ کیا جاتا۔ ڈرامانگاری کے داخل ہو جانے سے اُردو کی شاعری بلاشبہ ممتاز تر ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ ڈرامانگاری فارسی میں نہیں ہے اور اگر ہے تو ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ پس اگر ڈرامانگاری اُردو میں آجاتی تو فارسی کی شاعری کو اُردو کی شاعری کے ساتھ کوئی صورت مقابلے کی نہیں رہتی۔ ڈرامانگاری کے علاوہ سنسکرت میں ایک بہت اعلیٰ درجے کی رزمی شاعری دیکھی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے راماین اور مہابھارت پڑھی ہیں راقم کے ساتھ اس امر میں ضرور اتفاق رائے فرمائیں گے کہ دونوں تصنیفوں کا جواب فارسی میں نہیں ہے، عربی تو اس صنف شاعری کے اعتبار سے خارج از مبحث ہے اس لئے کہ عربی میں جب مثنوی نگاری نہیں ہے تو ایسی مبسوط کتابوں کا موجود رہنا ہی خلاف توقع ہے۔ فارسی میں جو کتاب شاہنامہ ہے بھی تو اس کی شکل تاریخ نما ہے۔ خاص کسی واقعے کا بیان رزمی شاعری کے

پیرائے میں نہیں کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے خود فردوسی کی شاعری بالمکی اور بیاس کی شاعریوں کو نہیں پہنچتی ہے۔ جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا۔ بالمختصر اگر اُردو کے شعرا نے سنسکرت کے شعرا کا تتبع فرمایا ہوتا تو اس وقت تک اُردو کی شاعری نے بہت کچھ ممتاز صورت پیدا کی ہوتی شاید ایسی حالت میں اُردو کی شاعری کا جواب دنیا میں کمتر ملتا۔ لاریب اُردو کی شاعری فارسی کی شاعری پر من جمیع الوجوہ بہت غالب آجاتی۔ کس واسطے کہ فارسی کی شاعری سنسکرت کی شاعری کے برابر نہ رفیع ہے اور نہ وسیع ہے۔ بلا گفتگو سنسکرت کی وہ رفیع شاعری ہے کہ جس کی قوت کو شعرائے عالم میں صرف شکسپیئر پہنچتا ہے ہومر ورجل اور ملٹن بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بہر حال اُردو کی موجودہ شاعری کی حالت یہ ہے کہ اگر میر انیس صاحب کو شعرائے اُردو کے زمرے سے نکال دیجیے تو اُردو کی شاعری فارسی کی شاعری سے بہت پیچھے پڑ جاتی ہے یہ صرف جناب غفران مآب کا کمال ہے کہ جس کی بدولت اُردو کی رزمی شاعری کا پایہ بہت بلند نظر آتا ہے اور اس اعتبار سے اُردو کی شاعری نہ صرف فارسی کی رزمی شاعری سے اعلیٰ دکھلائی دیتی ہے۔ بلکہ یونانی، لاطینی اور انگریزی شاعریوں سے بھی بہ اعتبار بالا ارفع پائی جاتی ہے۔ لاریب حضرت کی مرثیہ نگاری نے رزمی شاعری کا وہ عالم دکھلایا ہے کہ جس کے مشاہدے سے عقل دنگ ہو جاتی ہے اگرچہ حضرت نے کوئی کتاب رامائن مہا بھارت ایلیڈ اینیڈ شاہنامہ یا پیراڈائز لاسٹ کے طور کی منظوم نہیں فرمائی ہے تو بھی رزمی شاعری کا خاتمہ کر دکھایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی رزمی شاعری کا جواب دنیا میں بالمکی اور بیاس کی تصنیفات کے سوا کہیں نہیں پایا

جاتا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ میر انیس صاحب کی شاعری کی بحث آئندہ آئے گی۔ جس سے حقیقت حال ظاہر ہوگی۔

ملک فارس کا بیان

براعظم ایشیا کے ملکوں سے فارس بھی ایک نامی ملک ہے، اس کے غرب میں ملک شام اور شمال میں ملک قاف، بحر کیسپین اور شرق میں افغانستان و بلوچستان اور جنوب میں بحیرۂ فارس و بحیرۂ عرب واقع ہیں۔

ہندوستان سے پچھم میں فارس سے کوئی ملک ایشیا میں متمول تر نہیں ہے یہ ملک بارہ حصوں میں تقسیم ہے یعنی آذربیجان۔ عراق عجم۔ لورستان خورستان۔ فارس۔ لارستان۔ کرمان۔ گیلان۔ مازندران۔ استرآباد۔ قرہستان خراسان۔ اس کا رقبہ ۵ لاکھ میل کا ہے اور قریب دس کروڑ کے اس کے سکنا کا عدد ہے۔ کوہستان کی کثرت ہے، کوہ قاف کی شاخیں اس ملک میں نکل آئی ہیں اور شمال کی جانب کوہ البرز بھی واقع ہے، یہ وہی پہاڑ ہے جس کا ذکر علاوہ قاف کے شعرائے فارس اکثر کرتے گئے ہیں۔ علاوہ کوہستان کے بڑے بڑے صحرا بھی ہیں جن کی زمینیں محض شور ہیں۔ کوہستان و صحرا و دشت کی اراضی تمام ملک فارس کے تیسرے حصے سے کم نہیں معلوم ہوتی ہے، خاص ملک فارس میں کوئی بڑا دریا اٹک یا گنگا کے انداز کا نظر نہیں آتا ہے گو چھوٹے دریا، ندی، چشمے، جھیل کی کمی نہیں دکھائی دیتی ہے اسی لئے ملک کی شادابی میں کوئی فتور نہیں پڑتا ہے۔ پروردہ جانور اس ملک کے وہی ہیں جو اور اقالیم میں ہوا کرتے ہیں، لیکن یہاں کے خچر، اونٹ اور گدھے بہت ممتاز صورت ہوتے ہیں۔ علاوہ ان کے بکریاں

اس قدر عمدہ ریشم پیدا کرتی ہیں کہ تبت کی بکریوں سے برابری کرتی ہیں صحرائی جانور از قسم آہو وغیرہ کثیر الوجود ہیں اور درندوں سے قابل ذکر شیر، خرس، ببر، پلنگ، یوز، گرگ، شغال، روباہ اور کفتار ہیں۔ پیداوار ملک میوہ جات کے اعتبار سے بہت ہے انگور بکثرت ہوتا ہے اور چونکہ توت کی کھیتی آسانی کے ساتھ ہوتی ہے۔ ریشم کے کیڑے بکثرت پرورده کیئے جاتے ہیں۔ ریشم کی تجارت ایران میں بڑی فراغت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ نیشکر کی کاشت بھی بعض حصّوں میں حسب مراد ہوتی ہے اور افیون کے پیدا کرنے کی نظر سے لالے کی کاشت بڑی مستعدی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ایران کی تجارت افیون کی اسی لئے قابل امتیاز معلوم ہوتی ہے۔ پھولوں میں گلاب کی کاشت تجارت کی نظر سے بکثرت کی جاتی ہے حتیٰ کہ ایران کے عطر گلاب کی شہرت ہند تک پھیلی ہوئی ہے، اہل عجم گلاب کو اپنی زبان میں گل کہتے ہیں اور گلاب اس عرق کو کہتے ہیں جو اس سے تیار کیا جاتا ہے، اردو کے شعرا بھی گلاب کو گل کہتے ہیں۔ مگر عموماً زیادہ گلاب ہی بولا جاتا ہے۔ ایران کی معدنی پیداوار مختصر معلوم ہوتی ہے۔ سنگ نمک کی کثرت دیکھی جاتی ہے۔ قیمتی پتھروں کی بھی کانیں ہیں مگر فیروزہ جس قدر ملک ایران میں اچھا اور بڑا دستیاب ہوتا ہے کسی ملک میں نہیں ہوتا۔ دستکاری کے اعتبار سے اہل ایران ایک ممتاز قوم ہیں۔ یہاں عمدہ اقسام کے ریشمی اور پشمی کپڑے خوب بُنے جاتے ہیں۔ آلات حرب اچھے بنتے ہیں۔ شال، دوشالے دری قالین نفیس سے نفیس تیار ہوتے ہیں، ظروف چینی یہاں کے چین کے ظروف کا جواب دیتے ہیں اس ملک کی تعلیم یافتگی اہل یورپ کی تحریر کے رو سے تمام ایشیائی ملکوں کی تعلیم یافتگی پر غلبہ رکھتی ہے الا زمانۂ حال میں جاپان کہ جس نے

ایک عرصۂ قلیل میں ایک حیرت انگیز ترقی کا عالم دکھایا ہے۔ اہل ایران بالطبع خوش پسند، خوش طبع اور خوش خلق ہوتے ہیں۔ درس و تدریس سے شوق رکھتے ہیں، اور اقسام علوم کی طرف اُن کی طبیعت میں ایک خلقی میلان پایا جاتا ہے۔ اِس وقت کے ایران کا مذہب دین محمدی ہے اہلسنت کے اعتبار سے امامیہ مذہب والے زیادہ اِس ملک میں پائے جاتے ہیں بلکہ شاہی مذہب اِس ملک کا بزبان حال امامیہ ہے۔ سلطنت شخصی انداز رکھتی تھی یعنی شاہ کو ہر امر میں اختیار کامل رہتا تھا، مگر حال میں پارلیمنٹ وغیرہ کی پابندی کا رنگ کھلائی دیتا ہے واضح ہو کہ ملک ایران صدہا صدیوں سے مشہور دیار و امصار رہا ہے۔ کیانیوں کی سلطنت ایک وقت میں منتہائے عروج کو پہنچی تھی۔ پھر عہد دارا میں سکندر اعظم نے اِس ملک کو فتح کیا، پھر ساسانیوں نے اپنا سلسلۂ حکومت قائم کیا، اِس کے بعد اہل عرب نے اسے اپنا کر لیا۔ پھر اِس پر چنگیز اور تیمور حملہ آور ہو کر مالک ملک ہوتے گئے ترکوں نے بھی اُس کے مغربی حصے پر یورشیں کر کے اُس کی حالت بدل ڈالی آخرکار ۱۵۰۱ء میں اسمٰعیل صفوی نے اپنی سلطنت قائم کی۔ خاندان صفوی ایک عرصے تک حکمران رہا۔ مگر جب شاہان صفوی میں ضعف لاحق ہو گیا تو اٹھارھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں افغانوں نے ملک ایران پر سخت حملہ کیا اور بہت کشت و خون کے بعد قابض ملک ہو گئے اِس ہنگامے کا ذکر شیخ محمد علی حزین اپنے سوانح عمری میں فرماتے ہیں۔ افغانوں کا قبضہ ایران پر بہت مختصر رہا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد نادر شاہ نے افغانوں سے خوب بدلہ لیا۔ نادر شاہ کے انتقال کے بعد ملک میں سخت خانہ جنگیاں شروع ہوئیں آخرکار بہت رگڑے جھگڑے کے بعد آغا محمد خواجہ سرا بڑی

بڑی حکمت عملیوں سے اس ملک پر مستولی ہوگیا۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کا بھتیجا اُس کا جانشین ہُوا۔ یہ بھتیجا وہی نامی گرامی فتح علی شاہ تھا جس کے خاندان میں اس وقت ایران کی سلطنت ہے۔

اگر کسی قوم کو شاعری کی طرف میلان نہیں ہے تو اس کی نسبت یہ بات تمام تر صحت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس قوم کے فطری تقاضوں میں ضرور کسی نہ کسی قسم کا نقصان لاحق ہے، لاریب روح کو سچی خوشی بخشنے والی اور اسفل سے اعلیٰ کی طرف لیجانے والی کوئی شئے شاعری سے بڑھ کر نہیں ہے۔ جتنی ممتاز قومیں دنیا میں گزری ہیں یا اس وقت موجود ہیں شاعری کے میلان سے خالی نہیں ہیں ایسی صورت میں اہل ایران کا شاعری کی طرف مائل ہونا کوئی امر خلاف توقع نہیں ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اہل ایران کو شاعری کی طرف بہت بڑا میلان ہے کم ہی کوئی ایسا تعلیم یافتہ ایرانی ہوگا جو کچھ نہ کچھ کہہ نہ لیتا ہوگا یا اُستادوں کے کلام سے لذت یاب نہ ہوتا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک ایران شاعری کا ملک ہے فطرت نے اُسے ایسی خوبیاں بخشی ہیں کہ وہاں شاعروں کی کثرت خلافِ فطرت نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منظوم کتابیں زبان فارسی میں بے حساب ہیں۔ تذکروں میں معروف شعراء کے ناموں کے علاوہ غیر معروف شعرا کے اس قدر نام دیکھے جاتے ہیں کہ اُن کا یاد رکھنا دشوار ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل ایران کو شاعری کی طرف میلان عظیم رہا ہے، اُن کی مضمون نگاریاں بھی ایسی ہیں کہ علمائے اہل یورپ لکھتے ہیں کہ ابھی تک ہم لوگوں کو مشرقی شاعریوں کی نازک خیالیوں سے کماحقہ آشنائی نہیں پیدا ہوئی ہے اور

خیالات کے ایسے ایسے میدان پڑے رہ گئے ہیں کہ جہاں ہم لوگوں کا ابھی گذر نہیں ہُوا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اصناف شاعری سے بعض ایسی ہی ہیں کہ اُن کی ہوا بھی اہل یورپ کو نہیں لگی ہے مگر فارسی شاعری کے نقصانات بھی اُسی درجہ کے ہیں کہ ان کی اصلاح کی بڑی حاجت ہے مثلاً اصناف شاعری سے ڈراما نگاری ہے جو فارسی میں کبھی موجود نہ تھی۔ البتہ اس وقت کچھ حضرات اہل زبان نے اس صنف شاعری کی طرف توجہ شروع کی ہے۔ اسی طرح منجملہ دیگر نقصانات کے فارسی شاعری پر کثرت مبالغہ پردازی کا الزام سخت عائد ہوتا ہے مولف کی دانست میں مبالغہ پردازی راستی کی قوت اور لطافت کو زائل کرنے والی شئے ہے اس سے جس قدر شاعر اجتناب کرے انسب اور اولی ہے، اسی مبالغہ پردازی کی بدولت بیشتر فارسی کی شاعری معیوب معلوم ہوتی ہے سوا سعدی اور حافظ کے کمتر ایسے شعراء نظر آتے ہیں جن کی شاعری کثرت مبالغہ پردازی سے پاک ہے، ان دونوں شاعروں کے مقبول ہونے کی زیادہ وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اکثر اُن کے مضامین عدم مبالغہ پردازی سے فطری رنگ رکھتے ہیں علاوہ اس کے عموماً فارسی شاعری میں ایک بڑا نقصان یہ پایا جاتا ہے کہ فطری خوبیوں سے بیشتر شعراہے فارسی کے اکثر شعراء یہ جانتے ہی نہیں کہ نیچرل بیانات کیا کیا دل آویز تاثیرات پیدا کر سکتے ہیں۔ مولف کی دانست میں کوئی مثنوی زبان فارسی میں ایسی نہیں ہے کہ سر والٹر اسکاٹ کی لیڈی آف دی لیک کی دلکش فطرت نگاری کا جواب دے سکے۔ نظم تو نظم فارسی کی نثروں کی بھی وہی حالت دیکھی جاتی ہے مثلاً سہ نثر ظہوری کہ ایک مشہور کتاب ہے اور اس کی نثر بہت تعجب

خیز بھی جاتی ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ بامذاق تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ایک ایک جملہ اُس کا سوہان روح متصور ہے بالمختصر یہ بات نہایت صحت کے ساتھ حوالۂ قلم کی جاسکتی ہے کہ اہل ایران شاعری کی طرف ایک میلانِ عظیم رکھتے ہیں۔ اور اُن کی شاعریاں قابل توجہ بھی ہیں مگر اُن کی شاعری کا مذاق مختلف پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر بہت کچھ اصلاح طلب ہے اگر حضرات اہل زبان اِس امر کی طرف کوشاں ہوں تو اِس توجہ فرمائی سے نہ صرف فارسی کی شاعری ترقی کر جائے گی۔ بلکہ قومی معاملات اخلاق و تمدن میں بھی حسبِ مراد انقلابات ظہور میں آئیں گے ؀

ملک ہندوستان کا بیان

برِاعظم ایشیا کے ملکوں سے ہندوستان بھی ایک ملک ہے مگر یہ ایسا ملک ہے کہ خود برِاعظم کا حکم رکھتا ہے آب ہوا فصل موسم جبال بحور دشت صحرا جنگل آبادی قوم علم فضل پیشہ حرفہ تجارت زراعت صناعی تمدن نباتات حیوانات معدنیات وغیرہ وغیرہ کے اعتبار سے یہ ملک تمام دنیا کا خلاصہ کہے جانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ تمام دُنیا کی بوقلمونیاں اِس کے احاطہ کے اندر پائی جاتی ہیں اگر ہر مد کی تفصیل کی جائے تو راقم کی عمر اس کی تحریر کو اکتفا نہیں کرسکتی۔ بہرحال جاننا چاہیئے کہ ہندوستان جو برٹش انڈیا کہلاتا ہے اس میں چند ملک جزائر وغیرہ بھی شامل ہیں مگر ہندوستان خاص کے حدود اربعہ اِس طرح پر قرار دیئے جاسکتے ہیں کہ اُس کے مغرب میں ملک کابل بلوچستان اور بحیرۂ عرب اور شمال میں کوہ ہمالیہ اور شرق میں ملک برما اور جنوب میں خلیج بنگالہ اور بحر ہند واقع ہیں۔ ملک ہندوستان جزیرہ نما ہے اس کے دو

جانب میں سمندر پایا جاتا ہے۔ اس ملک وسیع کا طول شمالاً وجنوباً دو ہزار میل ہے اور عرض شرقاً وغرباً اٹھارہ سو میل۔ مربع اس کا چودہ لاکھ میل یعنی ملک فارس سے نو لاکھ میل زیادہ ہے۔ انتظام سلطنت کے خیال سے یہ ملک تین پریسیڈنسیوں میں تقسیم ہوا ہے یعنی پریسیڈنسی بمبئی و پریسیڈنسی مدراس و پریسیڈنسی بنگال، پریسیڈنسی سے مراد احاطہ ہے، علاوہ ان پریسیڈنسیوں کے کچھ صوبے ہیں جو چیف کمشنروں کے زیر حکومت رہتے ہیں علاوہ ان پریسیڈنسیوں اور چیف کمشنریوں کے جو حصہ ہائے ملک باقی رہ جاتے ہیں، ان میں خود مختار راجگان ونوابان زیر نگرانی سرکار انگلشیہ ابھی تک حکمران ہیں۔ اس ملک وسیع میں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں معروف زبانوں سے بنگلہ، اوڑیا، اردو، پنجابی، گجراتی، سندھی، مرہٹی۔ مارواڑی تلنگانی وغیرہ وغیرہ ہیں، مگر ہندوستان کے زیادہ حصوں میں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، ہندوستان میں اردو زبان فرانس کا حکم رکھتی ہے جو یورپ کے اکثر ملکوں میں ذریعہ ہم کلامی ہوا کرتی ہے اردو زبان کی حقیقت آئندہ عرض ہوگی مگر یہاں اس امر کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ہر چند یہ زبان ہندوستان کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہے مگر اس کے صحیح بولے جانے کی نسبت صرف دہلی اور لکھنو کی طرف کی جاتی ہے، جاننا چاہیے کہ دہلی پریسیڈنسی میں بنگال واقع ہے۔ اور لکھنؤ اودھ کی چیف کمشنری کا صدر تھا اور اب اضلاع متحدہ میں داخل ہے۔ پریسیڈنسی بنگال تین حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصہ ایک لفٹننٹ گورنر کے زیر حکومت رہتا ہے پہلے حصہ کو لفٹنٹی بنگال دوسرے کو لفٹنٹی اضلاع متحدہ اور تیسرے کو لفٹنٹی پنجاب کہتے ہیں، دہلی لفٹنٹی پنجاب میں واقع ہے۔ ان دونوں شہروں کے سوا اور جگہوں کے اردو بولنے والے اہل

زبان کے جاننے کا حق نہیں رکھتے ہیں. مثلاً ساکنین صوبہ بہار کہ ہرچند زبان اُردو ہی بولتے اور لکھتے ہیں. مگر اہل زبان اُن کی زبان کو کسی طرح سند نہیں مانتے حقیقت حال بھی یہی ہے کہ ہم بہاریوں کی زبان اہل لکھنؤ یا اہل دہلی کو پسند نہیں ہو سکتی. ہم لوگوں کا بڑا کمال یہی ہے کہ زبان دان کہلائیں۔ اہل زبان ہونا تو تمام تر خارج از امکان ہے۔ واضح ہو کہ عموماً شرفائے بہار کی اُردو یہی ہے کہ جس میں فقیر یہ کتاب لکھ رہا ہے مگر ہمارے وہ اہل وطن جو حضرات اہل زبان کے فیضان صحبت سے مدت مدید تک بہرہ مند رہے ہیں وہ البتہ راقم کی زبان سے کوئی علیحدہ زبان بولتے اور لکھتے ہیں بہرحال جاننا چاہیئے کہ صرف لکھنؤ اور دہلی ہی میں. سندی اُردو بولی جاتی ہے اور انھیں دونوں شہروں میں اُردو کے وہ بڑے بڑے شعرا گذرے ہیں جن کے نام نہایت فخر و امتیاز کے ساتھ لئے جاتے ہیں. واضح ہو۔ کہ سوا اُردو کے اور جتنی زبانیں ہندوستان میں مروّج ہیں اُن کو اس صدی میں بڑی ترقی نصیب ہوتی گئی ہے. چنانچہ بنگلہ زبان کو وہ اوج نصیب ہوا ہے کہ اب یہ زبان جو سو برس پہلے کچھ نہ تھی دنیا کی ممتاز زبانوں میں شمار کی جانے لگی. الآن کوئی علم یورپ کا نہیں ہے کہ اس زبان میں کم و بیش طور پر منتقل نہیں ہوا ہے. شاعری اور ناول نگاری نے تو بہت ترقی پائی ہے۔ ترقی کے اعتبار سے اُردو نے زبان بنگلہ کے مقابل میں گویا کچھ بھی ترقی نہیں کی ہے اُردو نے ابھی تک جو کچھ ترقی کی ہے وہ اُسی قدر ہے۔ جتنا فارسی کے متتبع ہونے سے حاصل کر سکی ہے. حقیقت یہ ہے کہ یورپین علوم سے خاص کر فن شاعری کے لگاؤ میں ترقی اُردو کے لئے گویا کچھ بھی مدد نہیں لی گئی ہے. برخلاف اس کے اہل بنگالہ نہ صرف سنسکرت

سے اقتباس مضامین کرنے گئے ہیں۔ بلکہ یورپین شعرا کے تتبع سے دائرۂ شاعری
کو وسیع کر ڈالا ہے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان کی مروج زبانوں میں صرف
اُردو ہی ایک ایسی جاندار زبان ہے جس کی شاعری مے سنسکرت اور انگریزی سے
کوئی صورت استفادہ کی پیدا نہیں کی۔ ورنہ جتنی اور زبانیں ہیں، سب کی سب
ان دونوں زبانوں سے مستفید نظر آتی ہیں، جیسا کہ اُن کی شاعریوں کا رنگ قول
راقم کی صحت پر گواہی دیتا ہے ؛

ہندوستان بعہدِ حکومتِ انگلشیہ

واضح ہو کہ ملک ہندوستان پر
اوقات مختلفہ میں بیرونی اولو العزم
قومیں یکے بعد دیگرے حکمران ہوتی آئی ہیں اور جب ایک قوم کی سلطنت ضعیف
ہوتی گئی ہے تب دوسری قوم زور آور اُس پر قابض اور مالک ہو بیٹھی ہے ہنود
کے مختلف اقوام جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں ان کے بزرگ بھی
مسلمانوں کی طرح اس ملک کے فاتح تھے اور اُن کی اولاد اور احفاد نے یہاں
بود و باش اختیار کر کے صدہا سال ہندوستان کے مختلف حصوں میں سلطنت رانی
کی ہے۔ بہت سے شاہان ہنود کے نام مثلاً راجہ وسرتھ۔ مہاراجہ رام چندر
راجہ چندر گپت۔ راجہ بکرماجیت راجہ پتھورا وغیرہ وغیرہ السنہ خلائق پر
جاری ہیں اور اُن کی علوم پروری اور عدل گستری کے حالات کتب تواریخ میں
موجود ہیں بہرحال جب ہندوؤں کی سلطنتوں میں ضعف آیا تو مسلمان اُن پر
غالب آئے اور چند صدیاں اس ملک میں حکمران رہے۔ مسلمانوں میں بھی ہنود
کی طرح چند قومیں یکے بعد دیگرے فرمانروائے ملک ہندوستان ہوتی گئیں

آخر میں خاندان تیمور کو عروج ہوا اور اسی خاندان کے ساتھ اس ملک کی سلطنت اسلامیہ بھی معدوم ہوگئی۔ بلاشبہ دولت تیموریہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑی ثروت سے خبر دیتی ہے مسلمان شاہان ہند میں کسی کو وہ ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ جو دولت تیموریہ نے حاصل کی۔ اکبر کے وقت میں سلطنت اسلامیہ کو آئینی استحکام نصیب ہوا اور جہانگیر کا زمانہ اکبر کے حسن جہانبانی کا نتیجہ معقول تھا۔ شاہجہان کی خوبیوں نے سلطنت کو رونق بخشی۔ اورنگ زیب کی حوصلہ مندی نے اُسے بہت وسیع کر دیا۔ مگر اس بادشاہ کی غیر مدبرانہ کارروائیوں سے ہندو رعایا دل شکستہ ہوگئی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے مرتے ہی سلطنت میں زوال بھی شروع ہوگیا۔ آخر کار یہ کیفیت ہوگئی کہ ہندو اقوام نے دہلی کو بھی لے لیا اور بادشاہان دہلی کو محض بے اختیار و بیکار بنا ڈالا۔ دولت تیموریہ کے زوال سے ہندوؤں کو ایسا زور ہوگیا تھا کہ اگر احمد شاہ ابدالی ہندوستان پر حملہ آور نہ ہوتا تو پھر ہندوؤں کی عملداری ہو جاتی۔ اس قومی حملہ آور نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ مرہٹے نہایت ضعیف ہوگئے اس پر بھی شاہان دہلی کی مزاج پرسی کے واسطے کافی تھے، اگر حکام انگلشیہ شاہان دہلی کی حفاظت نہ کرتے رہتے تو مرہٹے کب نہ دہلی کو غارت کر چکے تھے۔ بالمختصر جب عنانِ سلطنت ہندوستان کی حکام انگلشیہ کو منتقل ہوئی اُس وقت ہنود کی چند قومیں اس ملک میں برسر غلبہ تھیں۔ اسی باعث ایک مورخ انگریزی نے لکھا ہے کہ "ہم لوگوں نے یعنی انگریزوں نے ہندوستان کی سلطنت ہندوؤں سے نہ کہ مسلمانوں سے پائی ہے"۔ یہ قول بدالست مولف پورا صحیح تو نہیں ہے۔ مگر اس میں شک

نہیں کہ سلطنت تیموریہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی تھی اور ہر مسلمان صوبہ دار بادشاہ بن بیٹھا تھا اور بہت سے اعضائے سلطنت اولوالعزم اقوام ہنود کے ہاتھ آ گئے تھے، اور اسی وجہ سے ہنود زور آور ہو رہے تھے ایسا قیاس ہوتا ہے کہ اگر حکام انگلشیہ سلطنت ہندوستان کی طرف التفات نہ فرماتے تو آخر کار ہنود ہی فرمانروائے ہندوستان ہو جاتے۔ مالک ہندوستان ہو کر کس طور پر سلطنت کرتے، یہ خدا کو معلوم۔ لیکن اگر وہی مرہٹیا طور قائم رہتا تو رعایائے ہند کو عافیت کا نصیب ہونا ایک امر محال ہوتا۔ خدائے تعالیٰ نہایت رحیم ہے کسی حالت میں اپنے بندے کو بے معین و مددگار نہیں چھوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ جب ملکی قوموں میں جہانبانی کی صلاحیت مفقود پائی تو دور و دراز ملک سے ایسی قوم کو عدل پروری اور داد گستری کے واسطے معین کیا۔ جس نے بار جہانداری کو آسانی کے ساتھ اٹھا لیا۔ اور فرض منصبی کی بجاآوری میں کوئی کوشش دریغ نہیں رکھی۔ یہاں تک کہ از گنگ تا سنگ تمامی ہندوستان مرأت امن و امان بن گیا۔ جان و مال و آبرو کے استحفاظ کی شکل پیدا ہوئی۔ ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے مرتے ہی اُن کے بیٹوں کی خانہ جنگیوں سے سلطنت مغلیہ کا زور جاتا رہا اور جس وقت محمد شاہ کے زمانے میں نادر شاہ نے حملہ کیا، اُس وقت یہ سلطنت ضعیف ہو چکی تھی۔ اِس حملہ سے جو کچھ سلطنت کی وجاہت باقی رہی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اِس حملہ کے بعد ہندوستان میں طوائف الملوکی کی صورت نظر آنے لگی یعنی صوبہ داران اودھ و بنگالہ وغیرہ خود مختار بن بیٹھے۔ سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ جاٹوں نے دہلی اور اطراف دہلی میں ہنگامے مچائے۔ مرہٹوں

نے ہندوستان کے ایک جزو اعظم کو زیر حکومت کر لیا، اسی طرح بہت سے سرداروں قلعہ داروں نے جن کو جس طرح موقع ملا، اپنے کو خود سر کر ڈالا۔ اس طوائف الملوکی کے زمانہ میں ہندوستان کو امن داماں سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ صوبے داروں کے آپس کے خون ریز جھگڑے جاٹوں کی یورشیں سکھوں کی طغیانیاں، روہیلوں کی فساد انگیزیاں راجاؤں کی سرکشیاں، نوابوں کی بے عنوانیاں، فرانسیسیوں کی دست اندازیاں تمامی ہندوستان میں قیامت مچائے ہوئے تھیں کیسی سیاست کیسا انتظام ہر کسی کے جان پر آ بنی تھی۔ نہ دادرسی کا کوئی طریقہ باقی رہا تھا نہ فریاد سے کچھ کام نکلتا تھا۔ جس سے جو بن آتی تھی کر گزرتا تھا۔ شہروں میں ایسے ایسے ڈاکو رہتے تھے جو دن دوپہر دولت مند اشخاص کے مکانات میں گھس کر جس کو پاتے تھے تہ تیغ کر دیتے تھے، قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں مفسدان سرکش عافیت خلائق میں رخنہ ڈالے ہوتے تھے، شاہراہوں پر راہزنوں کا پورا قبضہ تھا، جنگل اور ویرانے ٹھگوں کے دم سے آباد تھے دریاؤں کو دریائی ڈاکوؤں نے سراسر پرخطر بنا رکھا تھا۔ پہاڑوں میں کوہی اقوام خرس و کفتار کو بھی خون خواری میں شرمندہ کئے ہوئے تھے، کیسا تھانہ کیسی فوجداری کیسی نالش، کیسی فریاد، نہ زمین پر پناہ نہ پانی پر امن، آئین و قانون کا کیا ذکر، زبردست کا جوتا سر پر اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا مضمون پیش نظر تھا۔ اس وقت کے اہل حکومت بھی کچھ ڈاکو اور قزاقوں سے کم نہ تھے، اگر کسی رعیت کے پاس دولت پاتے حسب خواہش اپنے گھر اٹھا لاتے، عورتوں کی عزت بھی خدا ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اہل قدرت کے لئے جوروؤں کو شوہر

سے یا بیٹیوں کو باپ سے چھین لینا کوئی تردد طلب امر نہ تھا۔ اس وقت میں بہت سے گیت سنے جاتے ہیں جو اُس وقت کے جباروں کے ظالمانہ فعل سے خبر دیتے ہیں پس ایسے زمانہ میں کہ اہل حکومت ہی اس وضع کی بد اخلاقی میں مبتلا تھے، راہزنوں و بدمعاشوں کا کیا ذکر ہے مختصر یہ ہے کہ ملک ہندوستان اس طور پر دار الفساد ہو رہا تھا کہ اُس کی اصلاح دیسی منتظمان سے ممکن نہ تھی، لیکن رحمت عامہ الٰہی اپنے کرور در کرور بندوں کو کب اس طرح پر گرفتار آلام پریشانی رکھنا قبول کر سکتی تھی۔ اس واسطے اس ملک وسیع کو ایک ایسی قوم کو سپرد کر دیا جو پورے طور پر داد جہانبانی دینے لگی۔ قوم انگلشیہ کے ہندوستان میں آنے کی سرگذشت یہ ہے کہ عہد ملکہ ایلزبیتھ میں جو انگلستان کی فرمان روا اور سلطان جہانگیر ابن اکبر شاہ کی ہمعصر تھیں، ایک کمپنی اس غرض سے قائم ہوئی کہ درمیان انگلستان اور ہندوستان کے سلسلۂ تجارت جاری کرے یہ مجمع تجارتی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے قائم ہوا اور اجازت تجارت دربار ملکہ ممدوحہ سے اس کمپنی کو سنہ ۱۶۰۰ء میں ملی۔ ایک سفیر بھی سر طامس رو نامی شاہِ انگلستان کی طرف سے دربار جہانگیر میں بھیجا گیا۔ مختصر یہ کہ کمپنی مذکور پہلے تو اپنے تجارتی کاروبار کو نہایت شعورمندی کے ساتھ ایک عرصہ تک انجام کرتی رہی اور جب دیسی فرمانرواؤں میں سلطنت کی صلاحیت باقی نہیں رہی، تب بارِ حکومت کو اپنے کاندھے پر لے لیا، سنہ ۱۸۵۷ء تک یہ کمپنی بہ نیابت شاہ انگلستان فرمانروائے ممالک ہندوستان رہی۔ بعد بغاوت کے سنہ ۱۸۵۸ء میں حضرت علیا ملکہ وکٹوریہ آنجہانی نے سلطنت ہندوستان کو زیر حکومت خاص

فرمالیا اور اُس وقت سے اِس وقت تک اسی طور پر یہ ملک زیر انتظام شاہی ہے
البسٹ انڈیا کمپنی کے زمانۂ حکومت میں گورنر جنرل کو صرف کورٹ آف ڈائرکٹرس
کی ماتحتی تھی، اِس افسر اعلیٰ کو ہر طرح کا اختیار حاصل تھا اور کسی قسم کی جوابدہی
کا تعلق سلطنت انگلیشیہ سے یہ عہدہ دار نہ رکھتا تھا۔ البتہ ڈائرکٹران کو اپنی
کارروائی کی جوابدہی یا شرکاء کمپنی کو یا بذریعہ بورڈ آف کنٹرول کے شاہ انگلستان
اور پارلیمنٹ انگلشیہ کو تھی۔ لیکن جب ۱۸۵۸ء میں حضرت علیا ملکہ معظمہ نے
ممالک ہندوستان کو کمپنی کی حکومت سے منتزع فرمالیا، تب سے لقب گورنر
جنرل کے ساتھ خطاب وائسرائے یعنی نائب سلطان کا بھی ضم کیا گیا۔ بہرحال
طوائف الملوکی کے زمانے کے بعد جب رفتہ رفتہ صوبجات ہندوستان احاطۂ حکومت
انگلیشیہ میں داخل ہوتے گئے۔ تو ہر طرح کی برائیاں بھی دور ہوتی گئیں حفظ و امان
خلائق کے لئے قوانین ایسے نفاذ پائے جن سے جان و مال و آبرو سب کی
حفاظت کی شکل پیدا ہوئی۔ والیان ملک کے باخود باجدال و قتال کا انسداد
پورا کیا گیا۔ ڈاکو، راہزن۔ قزاق۔ دزدان برّی و بحری سب نیست و نابود ہوگئے۔
غریب و امیر سب کو امن نصیب ہوا۔ مظلوموں کی دادرسی کے قواعد مقرر
کئے گئے۔ زمینداران و رعایا کے حقوق کی نگہداشت کے واسطے قاعدے
اجرا پائے۔ تجارت اور مہاجنی کے کاروبار کے لئے آئین نفاذ پائے مختلف
اقسام کے دعاوی کے ارجاع کے لئے مختلف محکمات قائم ہوتے گئے، نابالغوں
کے استحفاظ جان و مال کے واسطے قانونی انتظامات عمل میں آئے کاشتکاری کی
ترقی کی طرف توجہ شاہی جو مبذول ہوئی تو ہزارہا بیگھہ اراضی جو جھاڑ جنگل سے

بھری ہوئی تھیں کاشتکاری کے اغراض کے لئے آباد کی گئیں۔ سیرابی زراعت
کے لئے ایسے سامان فراہم کئے گئے کہ ہزاروں بیگھہ افتادہ اراضی حسب مراد
زرخیز ہوگئیں۔ نئے نئے اقسام کے غلے اور اثمار کی کاشت ہندوستان میں
مروج کی گئی۔ صدہا ندی نالوں میں پل تیار کئے گئے، نئی نئی سڑکیں اور راہیں نکالی
گئیں۔ مسافروں کیواسطے سراؤں کا انتظام ہوگیا۔ کثرت سے تالاب و چاہ کی
تعمیر ہوتی گئی۔ اقسام ڈاک کے سامان ظہور میں آئے۔ مریضوں کے واسطے شفاخانے
تیار کئے گئے، شہروں اور قریوں کی صفائی میں کدوکوشش کو راہ دی گئی نامطبوع
رسوم کے اندراس کا سامان کیا گیا، چنانچہ ستی اور بردہ فروشی کا نام تک باقی نہ
رہا۔ قحط اور وبائی عارضوں کے دفع کرنے کے اسباب مہیا کئے گئے، سیر و سفر کے
واسطے عمدہ شکلیں پیدا کی گئیں، مراسلات اور جلد خبر رسانی کے طریقے ایجاد پائے
ممتاز مقامات میں آب مصفا کے بہم پہنچانے کے لئے کارخانے قائم کئے گئے
تفریح طبع خلائق کے لئے نادر نادر تفرج گاہیں آراستہ کی گئیں اور اسی طرح
عیش و آرام کے بے انتہا سامان بہم پہنچائے گئے اور سب سے بڑا کام سرکار انگلیشیہ
کے عہد میں یہ ہوا کہ علوم یورپ کی اشاعت اس وسعت کے ساتھ تمامی ہندوستان
میں کی گئی کہ ہزارہا رعایائے سرکاری اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ ہوکر اپنے خانگی اور ملکی
حقوق کو خوب سمجھنے لگی۔ اور اپنی مالی اور ملکی خرابیوں کی اصلاح میں کوشاں ہونے لگی
یہ اسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتگی کا نتیجہ ہے جو ہندوستان کے اقوام مختلفہ میں مرابطت
اور یک جہتی کی صورت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اہل بنگالہ واہل مدراس و اہل بمبئی میں
موانست و یک دلی کا سلسلہ قائم ہوتا جاتا ہے اور سبھوں کو ملک کی بہتری و بہبودی

کا خیال مرکوز خاطر ہو رہا ہے۔ تعلیم یافتہ سکنائے ہندوستان طرح طرح کی تمدنی کمیٹیاں اور جلسے منعقد کرتے جاتے ہیں۔ اخباروں کے ذریعے سے بڑے بڑے مدبرانہ کام لئے جا رہے ہیں۔ معقول تصنیفات سے ہندوستان کی مختلف زبانیں ترقی کرتی جاتی ہیں اور اجرائے شاہی زبان کی بدولت تمام ممالک ہندوستان میں ہم خیالی زور پکڑتی جاتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اشاعت علوم یورپ نے ہندوستان کو ترقی کی ایسی راہ دکھلائی ہے کہ یوماً فیوماً اس کی تمدنی خوبیاں بڑھتی ہی نظر آتی ہیں۔ اس وقت تک جو کچھ ترقیاں اس ملک کو مراحم خسروانی کی بدولت نصیب ہو چکی ہیں وہ کم حیرت انگیز نہیں ہیں ؀

فارسی کی نظم و نثر کے تاریخی حالات

فارسی کی نظم کی ابتداء کی نسبت بعض کا قول ہے کہ پانچویں صدی مسیحی میں بہرام گور نے وزن اور قافیہ کو ایجاد کیا۔ مگر بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ ابوالحفص سمرقندی نظم کا موجد گزرا ہے۔ بہر حال یہ بات ظاہر ہے کہ آخر کے شاہان ساسانی کو فارسی کی انشاء کی طرف میلان تھا، لیکن جب ملک فارس پر قوم عرب کا قبضہ ہو گیا، تو کچھ عرصہ تک اہل فارس کا یہ میلان دبا رہا، آخر کار جب سلطنت خلفائے عباسیہ کو ضعف لاحق ہؤا اور فارس نے رفتہ رفتہ سر نو قومی آزادی حاصل کر لی تب پھر اہل فارس قومی لٹریچر کی ترقی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ خراسان میں اس کی ترقی کا سلسلہ قائم ہؤا۔ مرو میں ایک شخص مسمٰی بہ عباس نے سنہ ۱۹۳ھ صلعم مطابق ۸۰۹ء میں نظم نگاری شروع کی۔ اس کے بعد خلیفہ مامون ابن

ہارون الرشید کی تعریف میں محمد مونی نے اشعار لکھے، پھر حنظلہ حکیم فیروز اور ابو سالک نے رباعی، غزل اور قصائد لکھے، اس کے بعد ابو شکور بلخی مثنوی کا موجد ہوا۔ یہ صنف شاعری اہل عرب میں نہ تھی، اس کے ایجاد سے فارسی شاعری کو ادائے خیالات مسلسل کا ایک بڑا میدان ہاتھ آیا جس کے سبب سے شاہنامہ وغیرہ کیسی مبسوط کتابیں فارسی میں لکھی جا سکیں، امیر نصیر دوم کے عہد میں از ۹۱۳ء تا ۹۴۲ء مطابق از ۳۰۱ھ ہجری تا ۳۳۱ھ ہجری مسلم سلطنت ایران کو استحکام حاصل ہوا۔ اس عہد کے نامی شعرا عباس بخارائی۔ ابو المظفر نصر نیشاپوری ابو عبد اللہ محمد جنیدی۔ معنوی۔ خسروانی۔ ابو الحسن شاہد بلخی اور رودکی تھے۔ اول اول حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق جس شاعر نے اپنی غزلوں کو مدون کیا، ابو الحسن شاہد بلخی تھا۔ رودکی کی روش کلام حکیم خباز نے اختیار کی پھر ابو شعیب ہراتی روتقی بخارائی، ابو الفتح بستی، امیر ابو الحسن علی النخاس عمر مروی اور کسائی اسی دسویں صدی عیسوی میں شعرائے نام آور ہوتے گئے اسی خاندان سامانی کے نوح دوم کے عہد میں دقیقی نے بھی شاعری کی شہرت پیدا کی، اس کے بعد خاندان سبکتگین کو عروج ہوا۔ محمود غزنوی کے عہد میں فردوسی نے کتاب شاہنامہ لکھی ۱۰۱۱ء میں یہ کتاب اختتام کو پہنچی، فردوسی کے ہمعصر شعرا عنصری، عسجدی تھے، ہرچند یہ سب بڑے درجہ کے شاعر تھے، مگر فردوسی کی طباعی کے سامنے دربار محمود میں پھیکے پڑ گئے، شاہنامہ کی تصنیف سے ہر شاعر کے دل میں رزمی شاعری کا جوش پیدا ہوا شعرا عام طور پر فردوسی کا تتبع کرنے لگے، بلکہ یہ کوششیں ہونے لگیں کہ فردوسی پر بھی سبقت

سے جاییے، علی بن احمد الاسدی نے گرشاسپ نامہ لکھا۔ پھر سام نامہ جہانگیر نامہ
فرامرز نامہ برزو نامہ، شہریار نامہ وغیرہ تصنیف ہوتے گئے۔ ان سب کتابوں
میں شاہنامہ کی طرح کے مضامین منظوم ہیں اور یہ مضامین تمام تر ایران قدیم کے
قصص و حکایات پر مشتمل ہیں جب ایران کے خیالی معاملات لکھتے لکھتے شعرائے
فارس تھک گئے تب یونانی حالات تاریخی وغیر تاریخی کی طرف متوجہ ہوئے اکثر شعرا
نے سکندر کے حالات منظوم کئے، اسی لئے فارسی میں بہت سے سکندر نامے دیکھے
جاتے ہیں، ان سکندر ناموں میں سب سے ممتاز تصنیف نظامی کا سکندر نامہ ہے یہ
کتاب ۱۲۰۲ء مطابق ۵۹۹ ہجری صلعم میں اختتام کو پہنچی، جب سکندر کی
حالات نگاری کا خاتمہ کر چکے تب شعرا نے رزمی شاعری کے دھارے کو فن سیر
کی طرف پھیرا حسن شستری نے انبیا نامہ لکھا ابن ہشام نے خاور نامہ میں
امیر المومنین علیہ السلام کے معاملات جنگ حوالۂ قلم کئے، باذل نے حملہ حیدری تصنیف
کیا اور کاظم نے فرخنامہ، جب حالات سیر منظوم ہونے سے باقی نہ رہے تب
شاہان وقت کے حالات منظوم کئے جانے لگے، ہاتفی نے تیمور نامہ لکھا، قاسمی
نے شاہ اسمٰعیل اور شاہ طہماسپ کے وقائع منظوم کئے، کمال سبزواری نے شاہ عباس
اعظم کا شاہنامہ تصنیف کیا اور عشرتی نے شاہنامہ نادری اسی طرح عہد
فتح علی شاہ قاچار میں شاہنشاہ نامہ لکھا گیا، ہندوستان میں بھی شاہنامہ کے
رنگ کی چند تصنیفیں ظہور میں آ گئیں، عہد ہمایوں میں یعنی درمیان ۱۵۳۰ء و
۱۵۵۶ء کے اس قسم کی شاعری نے اس ملک میں رواج پکڑا، اس کے بعد
ہر عہد میں کچھ نہ کچھ اس رنگ کی کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ عہد شاہ جہان میں

قدسی نے ظفر نامہ شاہ جہانی اور طالب کلیم شاہنشاہ نامہ لکھتے گئے۔ بیجاپور میں آتشی نے عادل نامہ لکھا۔ عہد عادل شاہ کی ابتدا ۱۶۲۹ء سے ہے۔ پھر ایک منظوم تاریخ موسوم بہ تواریخ قلی قطب شاہ لکھی گئی۔ یہاں تک کہ آخرکار ۱۷۸۴ء میں غلام حسن نے فتح نامہ ٹیپو سلطان لکھا؛

واضح ہو کہ فردوسی کی رزمی شاعری نے نہ صرف اہل ایران کو اس رنگ کی شاعری کے برتنے کی راہ بتلائی، بلکہ بزمی شاعری کی طرف بھی شعرا کے دلوں میں میلان پیدا کر دیا۔ کتاب شاہنامہ ایسی مبسوط کتاب ہے کہ اس میں بزمی شاعری کے تخم بہ کثرت موجود ہیں۔ چنانچہ فردوسی کے بعد عماق بخارائی، جامی موجی، قاسم خان ناظم ہردی شوکت حاکم شیرازی بزمی مثنویاں حضرت یوسف اور زلیخا کے حالات میں لکھتے گئے۔ یہ سب تصنیفات یوسف و زلیخا نام رکھتی ہیں جاننا چاہیے کہ اس کے علاوہ وہ یوسف زلیخا ہے جو فردوسی کی تصانیف سے ہے بہرحال ان شعرا کے علاوہ فصیحی، جرجانی، دیبری، نامی وغیرہ نے اپنے زمانے میں وامق و عذرا کے عشق کی کہانیاں بشکل مثنوی منظوم کیں المختصر ہر قسم کی مثنوی نگاری کے مذاق کے پیدا ہونے کا باعث فردوسی کا شاہنامہ ہوا ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ صرف عاشقانہ مثنویوں کے مروج ہونے کی صورت فردوسی کی شاعری نہیں ہوئی ہے بلکہ اس نے پند و موعظت کے رستے بھی شعرائے مابعد کو دکھائے ہیں۔ شاہنامہ میں بہت مقامات ایسے ہیں کہ بہترین واعظ ان سے بہت کچھ پند لے سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں مقامات کے تتبع سے فارسی کے بہت سے شعرا نام آور ہوتے گئے ہیں۔ سعدی، مولانائے

روم، فریدالدین عطار وغیرہ سب کے سب اس خدائے سخن کے پوجنے والے نظر آتے ہیں۔ المختصر تمام اقسام مثنوی نگاری کو اسی کتاب شاہنامہ سے ہدایت ملی ہے اور واقعی فردوسی وہ بڑا شاعر ہے کہ شعرائے فارس اُسے جس قدر عظمت کی نگاہ سے دیکھیں عین انصاف ہے۔ درحقیقت فارسی میں فردوسی کا جواب کوئی شاعر نہیں ہے۔ اس شاعر گرامی سے بہتر شاعر ڈھونڈنے کے لئے تلاش کنندہ کو سرزمین ایران سے باہر جانے کی حاجت ہے۔ بزمی اور رزمی شاعریوں کے علاوہ قصیدہ گوئی بھی زور و شور کے ساتھ ہر طبقۂ شاہان اسلام میں مروج رہی ہے۔ ذیل میں بعض ممتاز شعرائے قصیدہ گو کے نام اور ان کے زمانے درج کئے جاتے ہیں :-

نمبر (۱) فخرالدین اسعد جرجانی بعض شاہان سلجوق کا مداح تھا یہ قصیدہ گو گیارھویں صدی مسیحی میں زندہ تھا ؛

نمبر (۲) ابوالفرج لاہوری و مسعود بن سعد بن سلمان عہد سلطان ابراہیم غزنوی میں تھے، اس بادشاہ کا عہد حکومت از سنہ ۱۰۵۹ء تا سنہ ۱۰۸۹ء ہے ؛

نمبر (۳) ادیب صابر عہد سلطان سنجر میں تھا اس بادشاہ کے حکم سے سنہ ۱۱۴۵ء مطابق سنہ ۵۴۰ھ ہجری میں پانی میں ڈبا دیا گیا ؛

نمبر (۴) جوہری امیر معزی سنہ ممات سنہ ۱۱۴۷ء رشید وطواط سنہ ممات سنہ ۱۱۷۲ء عبدالواسع سنہ ممات سنہ ۱۱۶۹ء اوحدالدین انوری سنہ ممات قریب سنہ ۱۱۶۹ء یہ سب کے سب عہد سلطان سنجر کے شعرا ہیں ؛

نمبر (۵) خاقانی سنہ ممات سنہ ۱۱۹۹ء انوری کا ہمعصر تھا ؛

نمبر(۶) بیلقانی خاقانی کا ہمعصر تھا ؛
نمبر(۷) ظہیر فاریابی ایضاً ؛
نمبر(۸) کمال الدین سنہ ممات ۶۳۷ھ ؛
نمبر(۹) سیف الدین سنہ ممات ۶۶۹ھ ؛

علاوہ ان شعرائے قصیدہ گو کے اور بھی ہزاروں شعرا گزرے ہیں جن کے ناموں کی فہرست طولانی ہے اِن تمام شعرا کے کلام کم و بیش طور پر جادۂ فطرت سے انحراف پذیر معلوم ہوتے ہیں اور اس انحراف ورزی کا سبب یہی ہُوا ہے کہ انہیں مدح بادشاہان وقت میں طرح طرح کے مضامین گھڑنے پڑے ہیں۔ ہر طرح کے استعاروں کو اختیار کرنا پڑا ہے اور مبالغہ پردازی کی اُن راہوں میں چلنا پڑا ہے جن کو فطرت کی راہ سے کوئی علاقہ نہیں ہے، راقم کی دانست میں ایسی شاعریاں کسی صاحب مذاق صحیح کو پسند نہیں آسکتی ہیں اور درحقیقت یہ وہ شاعریاں ہیں جن سے نفس شاعری کو ضرر عظیم مترتب ہوتا گیا ہے ؛

رزمی اور بزمی شاعریوں اور قصیدہ نگاریوں کے ساتھ ساتھ تصوف آمیز شاعری بھی زور پکڑتی گئی۔ تصوف کا مذاق اہل اسلام میں اوّل اوّل ملک فارس کیطرف سے داخل ہُوا مگر اس مذاق کے پیدا ہونے کا سبب بھی وہی شاہنامہ ہُوا ہے۔ فردوسی نے بہت مقالوں پر اخلاقی اور متصوفانہ مضامین حوالہ قلم کئے ہیں، چنانچہ کیخسرو کی نسبت اس کا یہ بیان دیکھا جاتا ہے کہ جب اُس بادشاہ کو ہر طرح کی ثروت دنیاوی حاصل ہو چکی تب دنیاوی بےحقیقتی پر لحاظ کر کے اُس نے دفعتہً ترک دنیا کیا اور تمنائے آرام ابدی میں وہ ایک سرچشمہ پر پہنچ کر چشم عالمیان

سے نہاں ہوگیا، اسلام میں تصوف کا مادہ تمام تر زردشتیوں سے پہنچا ہے، جب اہل عرب اہل فارس سے میل جول کرنے لگے تو ناچار فارسیوں کے مذہبی خیالات اُن کے دلوں میں اثر کرنے لگے، یہ تو نہ ہُوا کہ عقیدہ توحید اسلامیوں کا زوال پذیر ہوسکا، مگر اندازِ توحید ضرور بدل گیا۔ بہت سے جدید خیالات از قسم وحدت وجود و حدت شہود و ہمہ اوست وغیرہ پیدا ہوتے گئے۔ شعرا نے اپنی طباعیوں سے اِن عقائد کو بہت کچھ زور بخشا، حتیٰ کہ ہزاروں منظوم کتابیں اس رنگ کی احاطۂ تصنیف میں در آئیں۔ بہر حال پہلا شاعر جس نے تصوف کے اُصول منظوم کئے فردوسی کا ہم عصر ابوسعید بن ابوالخیر مہانی تھا (۳۵۷ - ۴۴۰ ہجری نبوی علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام) اس نے متصوفانہ مذاق کی رباعیاں لکھیں۔ پھر ناصر بن خسرو نے مثنوی موسوم بہ روشنائی نامہ تصوف میں لکھی۔ پھر علی بن عثمان نے کشف المحجوب لکھی، عمر خیام نے سینکڑوں رباعیاں لکھیں، افضل الدین کاشی نے بھی اس مذاق میں کتابیں تصنیف کیں، حکیم سنائی نے حدیقہ تصنیف کیا، اور جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی مبسوط لکھی (۱۲۰۷ - ۱۲۷۳ء مطابق ۶۰۴ - ۶۷۲ ہجری) اس کے پہلے فریدالدین عطار منظوم و غیر منظوم کتابیں لکھ چکے تھے۔ عطار نے عمر طویل پائی تھی۔ ۱۱۴ برس زندہ رہ چکے تھے کہ قوم مغولیہ نے انھیں قتل کیا۔ پھر سعدی نے متصوفانہ مذاق کی کتابیں لکھیں، معلوم ہوتا ہے کہ سعدی نے ۱۱۰ برس عمر پائی تھی۔ اُن کے انتقال کا سنہ ۱۲۹۲ء مطابق ۶۹۱ ھ ہے۔ سعدی نے خاص کر علم تصوف میں کوئی کتاب نہیں لکھی ہے اُن کا اصل مذاق اخلاق آموزی سے خبر دیتا ہے مگر اِس مذاق کو چونکہ تصوف کے مذاق سے

مشابہت ہے اس لیئے اُن کی تحریر تصوف نما معلوم ہوتی ہے، شیخ کی مشہور کتابیں گلستان اور بوستان کریما اور دیوان ہیں، گلستان اور بوستان کے تتبع میں اکثر کتابیں لکھی گئی ہیں مگر کوئی بھی نقل مطابق اصل کا حکم نہیں رکھتی ہے، متتبعان سعدی سے بعض مصنفین ذیل ہیں :-

نمبر (۱) ہزاری کوہستانی نے کتاب دستور نامہ تتبع بوستان میں لکھی، یہ شاعر سنہ ۱۳۳۰ء مطابق سنہ ۷۲۰ ہجری میں راہی ملک بقا ہوا ؛

نمبر (۲) کاتبی نے کتاب دہ باب بوستان کے جواب میں لکھی، اس شاعر کا سال وفات سنہ ۱۴۳۴ء مطابق سنہ ۸۳۸ ہجری کے ہے ؛

نمبر (۳) حیرتی نے بھی تتبع بوستان میں کتاب گلزار لکھی، یہ شاعر سنہ ۱۵۵۴ء مطابق سنہ ۹۶۱ ہجری میں مقتول ہوا ؛

نمبر (۴) معین الدین نے گلستان کے تتبع میں کتاب نگارستان لکھی، سال وفات اس شاعر کا سنہ ۱۳۳۵ء مطابق سنہ ۷۳۵ھ کے ہے ؛

نمبر (۵) جامی نے بہ تتبع ایضاً بہارستان لکھی۔ سال تصنیف اس کتاب کا سنہ ۱۴۸۷ء مطابق سنہ ۸۹۲ ہجری ہے، متاخرین شعرا و نثار سے بعض اشخاص نے بوستان اور گلستان کے تتبع میں کتابیں لکھی ہیں مگر کسی کی تصنیف سعدی کی تصنیفوں کو نہیں پہنچتی ہے بہر حال متصوفانہ مذاق کو ہمیشہ ترقی ہی رہی۔ اور آج تک بھی یہ مذاق محمود سمجھا جاتا ہے۔ ذیل میں بعض متصوفانہ مذاق کے مصنفوں کے نام درج کئے جاتے ہیں :-

نمبر (۱) عراقی نے لمعات لکھی، سال وفات عراقی کا درمیان سنہ ۱۲۸۷ء

اور سنہ ۱۳۰۹ء مطابق سنہ ۶۶۶ء اور سنہ ۷۰۹ ہجری کے ہے۔

نمبر (۲) حسینی نے زاد المسافرین لکھی، سال وفات اس مصنف کا سنہ ۱۳۱۸ء مطابق سنہ ۶۸۶ اور سنہ ۷۱۸ ہجری کے ہے۔

نمبر (۳) محمود شبستری نے گلشن راز لکھی، سال مصنف سنہ ۱۳۲۰ء مطابق سنہ ۷۲۰ ہجری کے ہے۔

نمبر (۴) اوحدی نے کتاب جام جمشید لکھی۔ سال وفات مصنف سنہ ۱۳۳۸ء مطابق سنہ ۷۳۸ ہجری کے ہے۔

نمبر (۵) قاسم انوار نے انیس العارفین لکھی سال وفات مصنف سنہ ۱۴۳۴ء مطابق سنہ ۸۳۷ ہجری کے ہے۔

نمبر (۶) عارفی نے گوی و چوگان لکھی سال تصنیف سنہ ۱۴۳۸ء مطابق سنہ ۸۴۲ ہجری کے ہے۔

نمبر (۷) فتاحی نیشاپوری نے حسن و دل لکھی۔ مصنف کا سال وفات سنہ ۱۴۴۸ء مطابق سنہ ۸۵۲ ہجری کے ہے۔

نمبر (۸) اہلی شیرازی نے شمع و پروانہ لکھی، سال تصنیف کتاب سنہ ۱۴۸۹ء مطابق سنہ ۸۹۴ ہجری کے ہے۔

نمبر (۹) ہلالی نے شاہ و گدا لکھی۔ اس شاعر کے مقتول ہونے کا سال سنہ ۱۵۳۲ء مطابق سنہ ۹۳۹ ہجری کے ہے۔

نمبر (۱۰) بہاء الدین آملی نے نان و حلوا شیر و شکر وغیرہ لکھی، وفات مصنف کا سن سنہ ۱۶۲۱ء مطابق سنہ ۱۰۲۰ ہجری کے ہے۔

شاعری ہائے اصناف بالا کے علاوہ غزل سرائی بھی ہر وقت میں مروج رہی۔ رودکی کے زمانے سے آج تک اِس صنف شاعری کو شعرا برتتے رہے ہیں۔ ذیل میں کچھ غزل گو شعرائے معروف کے نام و سال وفات اندراج پاتے ہیں:-

نام متغزلین	سنہ وفات عیسوی	سنہ وفات ہجری
سعدی شیرازی	۱۲۹۲	۶۹۱
حافظ شیرازی	۱۳۸۹	۷۹۱
سلمان ساوجی	۱۳۷۷	۷۷۹
کمال خجندی	....	۷۸۴
محمد شیرین مغربی	۱۴۰۶	۸۰۹
نعمت اللہ ولی	۱۴۳۱	۸۳۴
امیر شاہی	۱۴۵۳	۸۵۷
بابا فغانی شیرازی	۱۵۱۹	۹۲۵
نرگسی	۱۵۳۱	۹۳۸
لسانی	۱۵۳۴	۹۴۱
وہبری اصفہانی ملا محتشم کاشی وحشی	اِن تینوں شاعروں نے دسویں صدی ہجری کے اخیر میں رحلت فرمائی۔	
اہلی شیرازی	۱۵۳۵	۹۴۲

امیر حسن	شعرائے دہلی سے تھے	۱۳۲۷	۷۲۷
امیر خسرو		۱۳۲۵	۷۲۵
خواجہ کرمانی		۱۳۵۲	۷۳۵
عبدالرحمٰن جامی		۱۴۹۲	۸۹۸
غزالی مشہدی		۱۵۷۲	
عرفی شیرازی		۱۵۹۱	
فیضی		۱۵۹۵	
زلالی		۱۵۹۲	
صائب تبریزی		۱۶۷۷	
ہاتف اصفہانی		۱۷۸۵	

واضح ہو کہ ہر چند اقسام بالا کی شاعریوں کو ہر عہد میں فروغ رہا، مگر کسی شاعر نے ڈراما نگاری کی طرف توجہ نہ کی، اس صنفِ شاعری کے عدم موجودگی سے فارسی کی شاعری ذلیل اور حقیر معلوم ہوتی ہے، مگر اس صدی کی ابتدا میں اس صنفِ شاعری کی طرف بھی حال کے شعرائے ایران نے توجہ شروع کی ہے، عجب کیا کہ اپنے وقت پر ڈراما نگاری مروج ملکِ ایران میں ہو جائے اُس وقت اس زبان کی شاعری کو یونانی لاطینی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ وغیرہ کی شاعریوں کے ساتھ ساتھ مقابلہ کی صورت پیدا ہو سکے گی، اس وقت ڈراما نگاری جو ملکِ ایران میں مروج ہو چکی ہے وہ معاملات کربلا سے تعلق رکھتی ہے اور اس طرح کچھ تورات کے قصے بشکلِ ڈراما موزون ہوتے گئے ہیں، ظاہر

ہے کہ جب ڈرامانگاری حسب مراد اس طور پہ مروج ایران ہو جائے گی تو فطری شاعری کے رواج پانے کے باعث امید کی جاتی ہے کہ ایرانی شعرا کے حال کا غیر فطری مذاق زوال پذیر ہو جائے گا ؛

جاننا چاہئے کہ زبان فارسی میں بہت سی کتابیں علوم مختلفہ کی موجود ہیں۔ منطق، طبیعیات، فلکیات، ہندسہ، اخلاق سیر و تاریخ وغیرہ وغیرہ کی کتابیں نہایت علمی تقاضوں کے ساتھ تصنیف پائی ہیں، مگر لٹریچر یعنی انشا کی کتابیں کمتر مذاق صحیح سے خبر دیتی ہیں وہی مبالغہ پردازیاں وغیرہ جن سے فارسی کی شاعری معیوب ہو رہی ہے، فارسی کی نثروں میں بکثرت پائی جاتی ہیں سوا گلستان سعدی کے بیشتر فارسی کی کتب ادبیہ فطری مذاق تحریر سے بے بہرہ نظر آتی ہیں مثلاً سہ نثر ظہوری کہ بلا شبہ طومار بدمذاقی ہے، یہی حال مینا بازار وغیرہ کا ہے، تعلیم یافتہ اشخاص کو ایسی کتابوں سے تمام تر وحشت پیدا ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انشاپردازان فارس مطلق مذاق صحیح سے بہرہ مند نہ تھے، اُن کے قصے اور کہانی کی تصنیفیں بھی نیچرل رنگ سے علیحدہ معلوم ہوتی ہیں، حتیٰ کہ انوار سہیلی ایسی کتاب بھی بہت مقاموں میں خوش مذاقی سے مُبرا معلوم ہوتی ہے ؛

چونکہ فارسی اور اُردو کی شاعریاں واحد المذاق ہیں تو اُن کے اصناف میں بھی کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ دونوں کی معروف صنفیں ذیل میں درج ہوتی ہیں :-

فارسی اور اُردو کے اصناف شاعری، غزل[1]۔ قصیدہ[2]۔ قطعہ[3]

رباعی۔ مخمس۔ مسدس۔ مثنوی۔ واضح ہو کر تقسیم بالا عروضی ترکیب پر مبنی ہے۔ مگر مضامین کی رو سے شاعری کی حقیقت ہر صنف کے بیان سے ظاہر ہوگی اصناف مختلفہ کے وضع کئے جانے کی وجہ پر جب غور کیا جاتا ہے تو یہ سوال ہوتا ہے، کہ اتنے اصناف کے ایجاد کئے جانے کا باعث کون سا امر ہوا۔ اگر سب اصناف کا تقاضا ایک ہی تھا تو اتنی صنفوں کے وضع کرنے کی حاجت کیا تھی، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر صنف کا ایک تقاضائے خاص ہے، ضرور کوئی امر ایسا ہے کہ ہر صنف کے برتنے میں شاعر کو اس کا ملحوظ رکھنا واجبات سے ہے' ورنہ اصناف شاعری کا مضمون باطل ہو جائے گا، اب ذیل میں ہر صنف سے بحث کی جاتی ہے، حضرات ناظرین سے توجہ فرمانے کی خواستگاری ہے ؛

غزل یہ وہ صنف شاعری ہے کہ فارسی اور اُردو کے سوا کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں بانوں کے سوا کسی زبان کی ایسی ترکیب بھی نہیں واقع ہوئی ہے۔ جو اس صنف شاعری کے حقوق کو پورے طور پر ادا کر سکے، عربی میں غزل گوئی بمشکل امکان رکھتی ہے مگر کسی اہل زبان نے غزل گوئی نہیں کی۔ عجمی شاعروں نے جو زبان عربی میں کچھ غزلیں لکھی ہیں وہ صرف اُن کا ایجاد۔۔۔۔ ہی ایجاد ہے حقیقت یہ ہے کہ عربی کو غزل گوئی کے ساتھ پوری مناسبت بھی نہیں ہے، اس صنف شاعری کے ساتھ فارسی ایک خصوصیت رکھتی ہے اور چونکہ اُردو کو فارسی کے ساتھ ترکیب زبان و سلسلۂ خیال کے اعتبار سے مشارکت حاصل ہے اس زبان میں بھی غزل گوئی کا لطف بخوبی اٹھتا ہے زبان انگریزی میں شاعری کی

ایک صنف ہے جسے سانٹ (SONNET) کہتے ہیں یہ صنف غزل
گوئی سے مشابہت رکھتی ہے۔ مگر اس پر غزل گوئی کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا ہے
کس واسطے کہ سانٹ کو جو کچھ مشابہت غزل کے ساتھ ہے وہ اسی قدر
ہے کہ مضامین ذہنیہ از قسم واردات قلبیہ وغیرہ اُس میں قلم بند کئے جاتے
ہیں، مگر اس کا پیرایہ غزل سے علیحدہ ہوا کرتا ہے، سانٹ کی ترکیب کچھ
عشقیہ مثنوی کی ہو جاتی ہے، کس واسطے کہ التزام قطعہ بندی غزلیت کی
ترکیب ظاہری قائم رہنے نہیں دیتا۔ خیر اب دیکھنا چاہیئے کہ خود غزل گوئی کیا
شے ہے اور اس صنف شاعری کے کیا کیا تقاضے ہیں ؎

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے کلام کرنا ہے مگر اصطلاح میں اس سے
وہ صنف شاعری مُراد ہے جس میں ایسے مضامین جو اعلیٰ درجہ کے واردات
قلبیہ اور ارفع درجہ کے امور ذہنیہ سے خبر دیتے ہیں۔ حوالۂ قلم کیے جاتے ہیں
یہ صنف شاعری تمام تر داخلی پہلو (SUBJECTIVE) رکھتی ہے۔
اسی لئے اس کا احاطہ بہت محدود ہوتا ہے چونکہ اس صنف کا یہی تقاضا ہے ذرا سی
لغزش سے غزلیت کا رنگ   کلام قصیدہ نما ہو جاتا ہے یا مبتلائے پست
خیالی ہو کر احاطۂ شاعری سے نکل جاتا ہے۔ غزل گو کی شان سے ہے کہ وہ اعلیٰ قسم
کا دل و دماغ رکھتا ہو۔ اور خلقت کی رو سے آزاد طبیعت پاک طینت شوخ
مزاج نازک خیال گداختہ دل اور برشتہ جگر ہو، امور ذیل غزل گوئی کیلئے ہدایت
نامہ متصور ہیں ؎

نمبر (۱) ادائے مطلب کے لئے غزل گو کی زبان کو سلیس ہونا چاہیئے *

کس واسطے کہ واردات قلبیہ کے بیانات مغلقات سے بے تاثیر ہو جاتے ہیں؛

نمبر (۲) جس قدر ممکن ہو زبان کی سادگی ملحوظ رہے، غزل گوئی میں صنائع بدائع کی حاجت نہیں ہوتی ؛

نمبر (۳) حتی الامکان تشبیہ استعارہ دخل نہ پائیں یہ چیزیں شاعر عجز طبیعت سے خبر دیتی ہیں ؛

نمبر (۴) مبالغہ پردازی سے جس قدر اجتناب ممکن ہو عمل میں لایا جائے۔ اسی مبالغہ پردازی سے فارسی اور اُردو کی شاعری حقیر اور ذلیل ہوگئی ہے ؛

نمبر (۵) اگر تشبیہ استعارہ اور مبالغہ سے بھی کام لیا جائے تو اُن کا استعمال فطری خوبیوں کا مخل واقع نہ ہو ؛

نمبر (۶) پھبتی ضلع جگت وغیرہ سے اجتناب واجبات سے ہے؛

نمبر (۷) رعایت لفظی یا نادر ہو یا محض طبعی انداز رکھتی ہو ایسا نہ معلوم ہو کہ رعایت لفظی کا کوئی التزام کیا گیا ہے۔ اگر فطری انداز بیان کے ساتھ بلا آورد رعایت لفظی کی شکل پیدا ہو جائے تو کوئی مضایقہ نہیں ؛

نمبر (۸) غزل کے جتنے مضامین ہوں داخل ہوں، مگر ایسے رفیع درجہ کے ہوں جس سے انسان کے عالم باطنی کا شرف ظاہر ہو سکے، جن سے انسان کی بزرگی اور عظمت ہویدا ہو سکے، جن سے انسان کا دل عرش اللہ تعالیٰ ثابت ہو سکے، جن سے انسان نمونہ قدرتِ خداوندی سمجھا جائے، جن سے انسان کے قوائے اخلاقیہ کی خوبیوں کا انکشاف مقصود ہو۔ جن سے انسان کی وسعت ادراک کا پتہ مل سکے۔ جن سے عرفان حق کی راہ سجھائی دے سکے، جن سے

عالم روحانی کا اندازہ حسبِ قوت بشریہ ہا سکے ۔

نمبر (۹) مضامین عشقیہ ایسے نہ ہوں کہ معشوقان بازاری کی طرف محمول کیے جا سکیں۔ فسق و فجور سے تمام تر پسے لگاؤ ہوں عشق پیرایہ فسق میں نہ دکھایا جائے، بلکہ اس عظمت اور بزرگی کی شان سے بندش پائے جو اُس کی شان ہے ۔ تعالےٰ العشق عن فھم الرجال. اسی طرح وہ مضامین جو حسن سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے انداز ایسے عالی ہوں کہ فوراً خیال سامع معشوقِ حقیقی کی طرف کھنچ جائے ۔

جاننا چاہیئے کہ حسن و عشق بہ تغیر الفاظ صفات خداوندی سے ہیں اس لئے کہ حسن و جمال شئے واحد ہے اور عشق و محبت بھی متحد ہیں جمال کی نسبت حدیث میں وارد ہے ۔ اِنَّ اللہَ جَمِیۡلٌ یُحِبُّ الجَمَالَ اور محبت کے متعلق متعدد آیات قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں. مثلاً یُحِبُّھُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗ المختصر جو کچھ حسن و عشق کے مفہوم میں شامل و دیگر غیر محدود صفات خداوندی کے عین ذات خداوندی ہیں اور ذاتِ خداوندی کی طرح قدیم میں، کس واسطے کہ اگر صفات خداوندی عین ذاتِ خداوندی نہیں ہیں تو تعدد قدما لازم آتا ہے. خیر اپنا مذہب یہی ہے ۔ بلکہ حسن و عشق کے معاملے میں خیال راقم یہ ہے کہ حسن و عشق شئے واحد ہیں اور لبصورت وحدانیت خود خدا ہیں اور تمام ذات و صفات اُنہی سے مراد ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی چیزیں ہیں لاریب وہ بڑا پوچ شاعر ہے جو مضامین حسن و عشق کو ان کے تقاضے کے مطابق نہ باندھے اور اپنی ترکیب بندش سے انہیں ایسے درجۂ ابتذال کو پہنچا دے ۔

کہ سامع کا ذہن معشوقانِ بازاری کی طرف منتقل ہو جائے، اس عہد میں ایسے غزل گویوں کی کمی نہیں ہے، کمتر ایسے طبیعت دار ہیں جو مضامین حسن و عشق کو اُن کے تقاضوں کے مطابق باندھتے ہیں بلکہ بعض تو ایسے بد مذاق غزل گو ہیں کہ اُن کی دماغی اور روحی بدترکیبی پورے طور پر ان کی کم بینی، خیرہ چشمی بیحیائی بدخلقی بدنفسی اور فرومایگی کا اظہار کرتی ہے ؛

نمبر(۱۰) وصال و فراق کے مضامین فطرت کے احاطہ سے باہر نہ جائیں، وصال و فراق کی فطری کیفیتیں کیا کم لذت خیز ہیں جو غیر فطری اعانتوں کی محتاج قیاس کی جاسکتی ہیں۔

نمبر(۱۱) وصال و فراق کے بیانات بے حیائی کے ساتھ رقم نہ ہوں۔ کہ جس سے طبیعت کو اکراہ لاحق ہو ؛

نمبر(۱۲) ہوا۔ ہوس۔ حسرت۔ رنج۔ ملال، عداوت۔ رشک، جنوں وحشت۔ رغبت۔ نفرت۔ حسد۔ غرور وغیرہ کی بندشیں ایسی نہ ہوں کہ مذاق صحیح سے خارج پائی جائیں (مذاق صحیح عبارت ہے تبعیت فطرت سے)

نمبر(۱۳) کوئی خیال پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ غزل گو کو لازم ہے کہ ہمیشہ عالی مضامین پر نظر رکھے اور جس قدر بلند پروازی احاطۂ امکان میں ہو اُسے اپنا شیوہ جانے ؛

نمبر(۱۴) شوخی ضروریات کلام سے ہے، مگر شوخی سے مراد بے حیائی نہیں ہے۔ دیوانِ حافظ شوخی کلام سے بھرا ہوا ہے، مگر حافظ کی شوخی سے مراد بے حیائی نہیں جو مرکوز عوام ہو رہی ہے بعض شعرا نے شوخی اور بیحیائی کو امر واحد سمجھ لیا ہے اور بے تکلف بیحیائی کے مضامین منظوم فرما گئے ہیں اور

طرہ یہ ہے کہ اُن کے مداحین ان کی بے حیائیوں کو شوخی سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور واہ واہ کی صدا بلند رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کلام میں شوخی نہیں ہوتی ہے وہ کلام تمامتر بے لطف ہوتا ہے۔ مگر شوخی چیزے دیگر بے حیائی چیزے دیگر۔ سعدی کے مقطع ذیل میں شوخی ہے بے حیائی نہیں ہے ؎

سعدیا نوبت امشب دہل صبح نکوفت | یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

اسی طرح اُستادوں کے کلاموں میں کم و بیش طور پر شوخیاں بھی جاتی ہیں لیکن ایسی شوخیاں فحش و بے حیائی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ فحش و بے حیائی کی مثالیں ایسے ایسے مضامین ہیں، جیساکہ ایک شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے ؎

رات کا خواب الہیٰ توبہ | آپ سنئے گا تو شرمایئے گا

خدارا یہ کیسی شوخی ہے، اگر یہ بے حیائی نہیں ہے تو پھر بے حیائی اور کیسی ہوتی ہے، اس پر طرفہ یہ ہے کہ فقیر نے بعض دعوےداران سخن کو اس نامراد شعر پر وجد کرتے دیکھا ہے۔ لاحول ثم لاحول۔ اسی طرح اور بھی بہت شعر ہیں جو فحش و بے حیائی کے نمونے ہیں، مثالاً ایک اور شعر کا مضمون یہاں ذکر کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یار ہم سے اس قدر بدگمان ہے کہ اُس نے ہمیں اپنی پوری تصویر نہیں بھیجی، جو تصویر بھیجی ہے وہ صرف اوپر کے دھڑ کی ہے، استغفراللہ، کس قدر بد مذاقی نے ترقی کی ہے کہ مذاق صحیح معرض خطر میں جا پڑا ہے۔ المختصر شوخی کو شوخی کی حد میں رہنا چاہیے۔ اگر شوخی درجہ اعتدال سے گزر جائے تو پھر شوخی نہیں رہتی، بے حیائی ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر عوام جسے شوخی سمجھتے ہیں، وہ اقسام بے حیائی سے ہوتی ہے۔ بلاشبہ مرزا غالب

میں بڑی شوخی ہے مگر اُن کی شوخی کو بازاری شوخی سے کیا علاقہ۔ بعض شعرا کے کلام ایسے بھی ہوتے ہیں کہ سرسری طور پر دیکھنے میں شوخ نظر آتے ہیں، مگر اُن پر جب نظر ڈالئے تو عیاں ہو جاتا ہے کہ اُن میں صرف نمائشی شوخی ہے، سچی شوخی جو لوازم خوش خیالی سے ہے، اس کا نام و نشان بھی اُن کے کلام میں نہیں پایا جاتا ہے، ایسے شعرا زمرہ عوام الناس سے ہوتے ہیں۔ محصّل شخص اُنھیں نہ شاعر نہ حکیم مان سکتا ہے، البتہ بازاری اشخاص انھیں شاعر جانتے ہیں اور ان کے جاہلانہ کلام سے حظ اٹھاتے ہیں ؛

نمبر (۱۵) مکروہ مضامین سے اجتناب واجبات سے ہے، اسی طرح ان الفاظ سے بھی احتیاط درکار ہے جو مکروہ مفہومات کے لئے موضوع کئے گئے ہیں ؛

نمبر (۱۶) غزل گوئی کی سرسبزی کے لئے اس کی حاجت ہے کہ جو واردات قلبیہ قلم بند ہوں۔ انھیں مجرد شاعر ہی کی زبان سے تعلق نہ ہو، ضرور ہے کہ وہ مضامین فی الواقع دلی انداز بھی رکھتے ہوں۔ تاکہ سامعین کے دلوں میں جگہ کر سکیں ؛

جاننا چاہیئے کہ جس قدر واردات قلبیہ کی بندش شاعر کے قلبی تقاضے کے ساتھ ہو گی، اُسی قدر سامع کے دل میں اس کا اثر پیدا ہو گا ؎ "انچہ از دل خیزد، بر دل ریزد" ایک نہایت منفعم اور راست قول ہے۔ اگر کسی شاعر میں سوز و گداز درد خستگی کی کیفیتیں موجود نہیں ہیں تو مجرد اُس کی مضمون بندی حسب مراد تاثیر نہیں پیدا کر سکتی، اُستاد غالب نے خوب فرمایا ہے ؎

حسن فروغ شمع سخن دُور ہے اسد　　پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

نمبر (۱۷) جس قدر ممکن ہو غزل گو کو چاہیئے کہ تبعیت فطرت کو ہمیشہ ملحوظ رکھے، بعض غزل گو حضرات ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ خلاق سخن تو ہیں مگر سخن سنجی ہیں فطرت کی پیروی کمتر کرتے ہیں تبعیت فطرت کی ضرورت صرف غزل گوئی ہی میں نہیں ہے بلکہ جمیع اصناف شاعری کو اس ضرورت ہے اہل یورپ کی شاعری اسی تبعیت فطرت کی بدولت فروغ عظیم پکڑا ہے۔

نمبر (۱۸) غزل گوئی کی شان سے ہے کہ مضامین حکمت آگیں شاعری کے پردے میں قلم بند کیئے جائیں، اگر کوئی غزل گو حکیم طبیعت نہیں ہے تو اُس کی غزلیں محض عوام پسند ہوں گی اور اہل مذاق کو زینہار پسند نہ آئیں گی، حافظ علیہ الرحمہ کا دیوان کا دیوان اخلاقی فلسفہ ہے۔ اسی لئے کسی کی تاب نہیں ہے کہ خواجہ کے کمالات کا منکر ہو۔ تمام دنیا میں خواجہ کی خوش کلامی کی شہرت ہے۔ خواجہ کو لندن اور پیرس کے علماء اُسی طرح جانتے ہیں، جتنا کہ شیراز و اصفہان کے اہل علم اُن سے واقفیت رکھتے ہیں ؛

نمبر (۱۹) غزل گو کو عاشق مزاج ہونا واجبات سے ہے، عاشق مزاجی سے یہ مراد نہیں ہے کہ کسی زن بازاری پر فریفتہ ہو کر کوچہ گردی کرنا اور اس کے وصال و فراق کے مضامین سے اپنے دفتر شاعری کو سیاہ کرنا، اکثر غزل گوی کے دعویدار شامت اعمال سے اس طرح کی بوالہوسی میں مبتلا دیکھے گئے ہیں۔ عاشق مزاجی اسے نہیں کہتے کہ چینی گنی، الڈن و ڈن کی صحبتوں میں اوقات ضائع کی جائے، یہ سب فسق و فجور

کی باتیں ہیں، اُن کو شاعری سے کیا علاقہ - جو غزل گو اس طرح کی بد اوقاتی میں مبتلا رہے گا وہ اعلیٰ درجہ کے مضامین عشقیہ کیونکر موزوں کر سکے گا، پست خیال سے عالی مذاقی کی امید نہیں کی جا سکتی - جاننا چاہیئے کہ عاشق مزاجی سے مراد ہے عالم فطرت کے حسن پر محبت کا پیدا ہونا، یہ محبت عشق مجازی ہے۔ لیکن جب وہی محبت حسن فطرت سے منتقل ہو کر سبب حسن فطرت کی طرف رجوع کر جاتی ہے تو درجہ عشق حقیقی کو پہنچ جاتی ہے - واضح ہو کہ حسن فطرت کے احاطۂ وسیع میں حسن انسانی بھی ہے، انسان کا عشق انسان کے ساتھ خلاف فطرت امر نہیں ہے، بخوبی مرد کو عورت کے ساتھ اور عورت کو مرد کے ساتھ عشق پیدا ہو سکتا ہے، انسان کا عشق صادق مصائب میں شمار ہوتے کے غرض پڑھنے حسن د اخلاق سے خبر دیتا ہے، سیپفو (SAPPHO) جو ملک یونان کی ایک مشہور شاعرہ ہے کسی جوان رعنا سے عشق صادق رکھتی تھی - عالم عشق میں غزل سرائیاں کیا کرتی تھی، تمام شعرائے یونان میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے کہ سوز و گداز و دردمندگی اور نشتریت میں اس کا جواب سمجھا جائے، اُس کے مضامین عشقیہ ایسے ہیں کہ جنھیں پڑھکر کلیجا منہ کو آتا ہے - ظاہر ہے کہ اس شاعرہ کے کلام میں اس قدر دلیری کا سبب اس کا عشق صادق تھا ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

نمبر ۱۰۲ ، غزل گو کا فرض منصبی ہے کہ قرب سلطانی سے تا مد امکان کنارہ کش رہے، کسی صنف شاعری کو قرب سلاطین اور اُمرا سے اس قدر ضرر

نہیں سمجھتا جس قدر غزل گوئی کو۔ حافظ اور میر تا حدامکان سلاطین و اُمرا سے کنارہ کش رہے اور اگر ملے بھی تو محض واجبی طور پر۔ خواجہ حافظ کے پاس شاہزادے اور امیرزادے آتے تھے، مگر ان کے ساتھ خواجہ اُس طور پر برتاؤ نہیں فرماتے تھے جیسا کہ درباری شعرا کا شیوہ ہُوا کرتا ہے۔ ایک بار خواجہ کو شاہِ دکن نے ہندوستان میں مدعو کیا تھا۔ خواجہ نہ آئے اور شاعرانہ عذر شاہ کو شعر ذیل کے ذریعہ سے لکھ بھیجا ؎

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیم خاکِ مصلےٰ و آب رکنا باد

اگر زر اندوزی کی ہوس خواجہ کو ہوتی تو سفر کی تکلیفوں کو گوارا کر کے داخل دکن ہو جاتے، بالمختصر یہ کہ خواجہ کی قناعت و رزی گوشہ گیری عزلت پسندی، آزاد مزاجی، بلند چشمی، بے غرضی، بے پروائی کا نتیجہ ہے کہ اُن کی غزل گوئی کا نظیر دنیا میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اگر خواجہ کو قربِ سلطانی کی ہوس ہوتی تو بلاشبہ اپنے حیرت انگیز کمالات سے محروم رہتے اور اُن کی غزل گوئی بھی عرفیؔ، ظہوریؔ، نعمت خاں عالیؔ کی غزل گوئیوں کی طرح بے تاثیر ہو جاتی، میر صاحب بھی سلاطین اور اُمرا کی صحبتوں کے طالب دل سے نہ تھے، چنانچہ جب بحالتِ مجبوری دہلی سے لکھنؤ آئے تو نواب آصف الدولہ کی درباری نہ کر سکے، ایک بار کا ذکر ہے کہ میر صاحب نواب وقت سے ناخوش ہو کر اپنے مسکن پر چلے آئے اور کثرت ملال سے مجموم ہو گئے، جب اُن کی بدمزگی کی خبر نواب کو ہوئی نواب عیادت کے لئے آئے۔ اور ساتھ ایک مرصع لیشب کی نادعلی بھی لاتے

جس بوریا پر میر صاحب پڑے ہوئے تھے، نواب بھی اُس کے ایک کنارے پر بیٹھ گئے۔ میر صاحب بخار سے آنکھیں بند کئے پڑے تھے، جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ نواب سامنے بیٹھے ہیں۔ مزاج پرسی کے بعد نواب نے اُس نادعلی کو میر صاحب کے گلے میں ڈال دیا، میر صاحب نے برجستہ یہ مطلع فرمایا ؎

دیوانہ پن ہمارا آخر کو رنگ لایا جو دیکھنے کو آیا مٹھی میں سنگ لایا

حضرات اہل دانش پر ہویدا ہے کہ دل کی عمدگی کو انسان کے اقوال و افعال سے بڑا تعلق ہے، غزل گوئی شکستہ جگر، گداختہ دل، آزاد مزاج عزلت نشین قناعت پیشہ الم کش اشخاص کا شیوہ ہے، ہوسناکی، جاہ طلبی، زر اندوزی وغیرہ سے اس شیوہ کو کیا علاقہ، پس تقرب سلطانی اور غزل گوئی کا انجام ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتا، چنانچہ فارس کے درباری شعرا کا حال ایسا ہی دیکھا جاتا ہے کہ اُن میں سے ایک شاعر بھی اس صنف شاعری میں حافظ یا سعدی کا جواب نظر نہیں آتا ہے، غزل گوئی کیلئے قابلیت علمی کی اس قدر حاجت نہیں ہے کہ جس قدر عمدگی دل کی۔ عمدگی دل عبارت ہے ان اوصاف حمیدہ سے جن سے انسان انسان کہلاتا ہے، عمدگی دل کا تقرب سلطانی کے ساتھ برقرار رہنا نہایت غیر متوقع امر ہے، حکیم قاآنی کو دیکھئے کہ کتنا بڑا شاعر تھا، کس قدر استعداد علمی رکھتا تھا اور کس قدر معمر ہو کر مرا، مگر اس حیرت افزا شاعر کی غزلوں کو جو پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتا تھا اُس کی وجہ اور نہ تھی، الا یہ کہ درباری شاعر ہونے کے باعث، اُسے آزادی قناعت ورزی، عزلت نشینی خودداری بے پروائی وغیرہ کی صفتوں کو برقرار

رکھنے کا کبھی موقع حاصل نہ تھا جس شاعر کی یہ اوقات ہو کہ بادشاہوں کی تقریبات
میں قصیدہ نگاری کی زحمت ہمیشہ گوارا کیا کرے وہ اپنی عمدگی دل سے کیا کام
لے سکتا ہے۔ ایسے شاعر کا غزل گو ہونا محال عقلی سے ہے، کہ ایسا شاعر نہ غزلگو
ہوا ہے نہ ہوگا۔ چنانچہ حکیم قاآنی کی غزل گوئی راقم کے اس دعویٰ کی پوری معین
معلوم ہوتی ہے۔ اوّل تو اس شاعر کی غزلیں بہت تھوڑی ہیں اور جو ہیں بھی،
اُن سے آشکارا ہے کہ اُسے واردات قلبیہ اور معاملات روحانیہ کی طرف
توجہ کرنے کی فرصت کم نصیب ہوئی ہے، ساری غزلوں میں شاعری کا خارجی پہلو
(OBJECTIVE) پایا جاتا ہے اسی لئے کمتر سوز و گداز درد و خستگی وغیرہ
کی کیفیتیں اُن میں درک ہوتی ہیں بخلاف حافظ کے کہ اُن کی تمام غزلیں داخلی
رنگ (SUBJECTIVE) میں ڈوبی ہوئی ہیں اور اس سبب سے حق
غزل گوئی کو دام دام ادا کر رہی ہیں، واضح ہو کہ فارس ہی کے درباری شعرا کی یہ
حالت نہیں ہے کہ غزل گوئی میں پھیکے نظر آتے ہیں بلکہ کم و بیش طور پر تمام
درباری غزل گویوں کا یہی حال دیکھا جاتا ہے، ایشیائی درباروں میں آزادی کہاں
اگر فردوسی بھی ہو تو اُسے پائے پیل سے پیسے جانے کے لئے مستعد رہنا چاہیئے
پس غزل گوئی جس کا مدار روح کی آزادی پر ہے، فردوسی سے بھی حسب مراد
انجام نہیں پا سکتی ہے۔ یورپین درباروں میں ایشیائی درباروں کے اعتبار
سے بہت زیادہ آزادی ہے، مگر درباری شاعر ہو کر پورے طور پر آزادی
کو قائم رکھنا بہت خلاف توقع ہے، انگلستان ایک بہت آزاد ملک ہے
مگر وہاں بھی ابھی تک ایک شخص تنخواہ دار دربار سے متعلق رہا کرتا ہے کہ جس

کی خدمت یہ ہے کہ بادشاہ وقت کے محل میں جو شادی اور غمی کی تقریبیں ہوں اُن کے متعلق اشعار تہنیت و تعزیت لکھا کرے، اس شخص کا لقب "پوئیٹ لاریٹ" ہے یہ اسی طرح کا کام ہے کہ جیسے مثلاً قاآنی فارس میں یا ذوق دہلی میں انجام کیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ اس پابندی کے ساتھ غزل گوئی نہ ہندوستان نہ انگلستان نہ ایران میں انجام پا سکتی ہے، یہ ممکن ہے کہ کسی خاص درباری شاعر کو اتفاق وقت سے غزل گوئی کی فطری صلاحیت حاصل ہو مگر درباری شاعری کا تقاضا ایسا نہیں ہے کہ اُس سے غزل گوئی کے حقوق پورے طور پر ادا ہو سکیں، بلاشبہہ درباری معاملات کبھی ایسے نہیں ہوتے کہ اُن میں سوز و گداز وغیرہ کو ذرا بھی دخل ہو۔ درباروں میں حافظ یا میر ایسے شاعروں کی کوئی ضرورت متصور نہیں ہے اور وہ بھی خاص کر ایشیائی درباروں جہاں آزادی حکم عنقا رکھتی ہے۔ جائے لحاظ ہے کہ جب انگلستان ایسے آزاد ملک میں شاعری پر درباری اثر پیدا ہوتا ہے تو لسے برحال اُن درباروں کے جہاں شاعر کی گردن جلّاد کی تلوار کے سائے تلے ہر دم رہا کرتی ہے، اہل اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ملک انگلستان میں کسی کو بے جرمی کی حالت میں سزائے مرگ یا کسی طرح کی سزا پانے کا خوف نہیں ہے۔ پس ایسے ملک کے درباری شاعر کو ضرور ہے کہ ایشیائی درباروں کے شاعروں سے بہت زیادہ آزادی اور عزت حاصل رہے، چنانچہ امر واقعی بھی یہی ہے کہ ٹینیس صاحب نے نہایت آزادی اور عزت کے ساتھ اپنی عمر بسر کی مگر اس آزادی اور عزت کے حاصل رہنے پر بھی اُن کو اپنے عہد کے تقاضوں سے مفر نہ تھا، لاریب اگر اُن کو درباری تعلق نہ ہوتا تو بہت سے اُن کے کلام جو اُن

کی عہدہ داری کے نتائج معلوم ہوتے ہیں وجود پذیر نہ ہوتے جائے لحاظ ہے کہ جب درباری اثر اس طور سے ٹینیس صاحب کی شاعری پر دیکھا جاتا ہے تو وائے برحال قاآنی کہ جو بیچارہ ایک ایسے دربار سے متعلق رہا کہ جس کی خوشی و ناخوشی پر اُس کی حیات و ممات موقوف تھی ایسے شاعر سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ سچی شاعری کی داد دے سکتا ہے یا دل کی عمدگی کا لطف دکھلا سکتا ہے،

جو کیفیت ایران کے درباری شاعروں کی دکھائی دیتی ہے، بجنسہٖ دہلی اور لکھنو کے شعرا کی بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً ذوق کہ جو دنیاوی ضرورتوں سے درباری شاعر بننا پڑا تو اُن کی غزل گوئی کو بہت سی مضرتیں لاحق ہوتی گئیں۔ اول تو اُن کی قابلیت کے مطابق اُن کا دیوان جمع نہ ہوسکا، دوم یہ کہ اُنھیں جو کبھی آزادی نصیب نہیں ہوئی تو اُن کی اکثر غزلوں میں غزلیت کا پورا امزا پیدا نہ ہوسکا ظاہر ہے کہ جس غزل گو کی یہ اوقات ہو کہ کبھی اُسے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونا پڑے اور کبھی نواب سے مصاحبت گرم رکھنی ہو وہ غزل گوئی کی داد کیونکر دے سکتا ہے، ذوق بیچارے کی یہ حالت تھی کہ کبھی حاضر ہو کر ظفر شاہ کی غزلیں بناتے تھے، کبھی نواب الٰہی بخش خان کے لیئے غزلیں تیار کرتے تھے۔ یہ دونوں حضرات کچھ بھی غزل گوئی پر قادر نہ تھے، بادشاہ صاحب کبھی ایک مصرع کبھی نصف مصرع اور کبھی ایک شعر موزوں فرما لیتے تھے، اور نواب صاحب تو اتنی بھی قدرت نہ رکھتے تھے، ذوق کو ان دونوں آقاؤں کے لیئے غزلیں درست کردینا پڑتی تھیں۔ ایسی صورت میں کہ شاعر کو آزادی حاصل نہ ہو۔ اغراض غزل گوئی کے پورا کرنے پر کیا قادر ہوسکتا ہے ایسے پریشان اوقات شاعر کی

غزلوں میں کیونکر آزادی، درد، سوز، گداز، خستگی کی صفتیں پائی جا سکتی ہیں ناممکن تھا کہ ذوقؔ کی غزل گوئی خواجہ میر دردؔ یا میر تقی میرؔ کا رنگ پیدا کر سکتی علاوہ اس مشغلہ کے کہ ذوقؔ ظفرؔ شاہ اور نواب الٰہی بخش کے لئے غزلیں بنایا کرتے تھے، تقریبات شاہی میں انھیں قصیدہ گوئی کی زحمت بھی اختیار کرنا پڑتی تھی۔ غزل گوئی ایسے پاک کام کو مدح گوئی کے جھوٹ سچ سے کیا علاقہ، رذیل دھندے کے ساتھ شریف دھندا چل نہیں سکتا، آخر کار کثرت دروغ برائی سے ضرور ہے کہ شاعر کی طبیعت کو بے حسی لاحق ہو جو تقاضائے غزل گوئی کا بہت منافی ہے۔ تقرب سلطانی سے متضرر ہونے کی دوسری مثال میر انشاء اللہ خاں کی ہے، سید صاحب جب تک نواب سعادت علی خان کی مصاحبت میں عمر ضائع کرتے رہے اُن کی غزلگوئی بے مزہ رہی مگر جب ترک خدمت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی تو اُن کے کلام میں فی الجملہ خستگی، سوز، درد، گداز کا مزہ آگیا۔ فقیر اِس امر کا زنہار قائل نہیں ہے کہ کوئی شاعر دربار داری بھی کرے اور غزلیت کا لُطف بھی دکھلائے، یہ کام گوشہ نشینان الم کش کا ہے، حریص طامع تنگ چشم اور پیٹ کے بندے سے غزل گوئی شکل امکان نہیں رکھتی، یوں تو اگلے زمانوں میں بڑے بڑے شعراء جو دولت فقر سے مالامال تھے گزرے ہیں مگر اس عاجز نے اپنے زمانہ میں بھی ایک ایسے شاعر کو دیکھا ہے کہ جن کی زیارت ثواب سے خالی نہ تھی، یہ ہمارے مولوی وحید الہ آبادی تھے، شاعر کے لیے جتنی صفتیں درکار ہیں اُن کی ذات بابرکات میں موجود تھیں۔ حضرت کو نہ لباس سے شوق تھا نہ کھانے سے

ذوق، دونوں سے نہایت بے پروا اور آزاد تھے، جہاں نیند آئی سو رہے۔
جہاں جی چاہا چلے گئے، دنیا میں کیا ہوتا ہے، اُس سے اُن کو کوئی بحث نہ
تھی، جن لوگوں سے احتراز مناسب سمجھا، بے ربطی رکھی، کسی کی بُرائی میں کبھی
زبان نہ کھولی، اگر کسی نے بُرا کہا تو اُس کا جواب نہ دیا، شکایت، غیبت، گلہ
وغیرہ کی فرصت اُنھیں افکار شاعری سے نہ تھی، سالہا سال کی ملاقات میں
اس عاجز نے اُنھیں کسی کو بد کہتے نہ سُنا۔ جس کا ذکر آگیا اس کو اچھا ہی کہا
ہر طرح کے حسد سے اُن کا سینہ پاک تھا حتیٰ کہ شاعرانہ حسد بھی اُن کے دل میں
نہ تھا، قناعت، سیر چشمی، عجز، صبر، تحمل، صدق و صفا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے
تھے، قلب اس قدر سوز و گداز سے بھرا پایا تھا کہ اُن کی صحبت میں طبیعت کو بےچینی
پیدا ہوتی تھی، طلب جاہ سے نہایت دُور تھے، اُن کے دماغ میں اس خیال کا
گذر ہی نہیں ہُوا تھا کہ حکام و امراء کے حضور میں حاضر ہو کر کسی طرح کا رسوخ پیدا
کیجیے وہ ایسے لوگوں کے مذاق سے خبر بھی نہیں رکھتے تھے کہ جو حکام وقت
کے درباروں کی شرکت پہ جان، مال و آبرو نثار کر دینے کو ہر وقت آمادہ رہتے
ہیں اور کمال بے حیائی اور نادانی سے اس طور کی گھس بیٹھ کو سرمایۂ عزت و
منزلت جانتے ہیں، مختصر یہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم تمام ایسی صفات سے
متصف تھے جو اعلیٰ درجہ کے پاک سرشت، پاک طینت شاعر کے لیے
درکار ہیں، پس لاریب انھیں صفات حمیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں
سوز و گداز و خستگی کی کیفیتیں اس درجہ پائی جاتی ہیں، اہل انصاف کے نزدیک
اُن کا کلام سرمایۂ ناز و افتخار ہے، زبان کی عمدگی سلاست اور روانی کے علاوہ

اُن کے کلام کی پُرتاثیری سے سوائے حاسد کے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اُن کا
کلام کہے دیتا ہے کہ ہم اس کے نتیجہ فکر ہیں کہ جس کی خلقت میں خدا نے سادگی
راستی، سیرچشمی، حلم، تحمل، صبر، رضا، سوز و گداز، درد، خستگی، آزادی، قناعت
مروت، حیا، صدق، صفا، عشق، محبت، عجز، انکسار وغیرہ وغیرہ کی صفتیں
کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ ایسے صافی طینت پاک خصلت شاعر کے ساتھ
اس ننگ شاعری کو کیا مقابلہ ہو سکتا ہے جو حکام وقت کے وقت مناقب
کے قصیدے بغل میں دابے درباروں اور حکاموں کے جلسوں میں پڑھتا پھرتا
ہے اور شاعری سی عزیز شے کے ذریعہ سے اپنے کو ذلیل و خوار بنائے رہتا ہے
بہ بین تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا ٭

ہمارے شہر پٹنہ میں ساٹھ ستر برس پہلے حضرت راسخ گزرے ہیں
جو جواب میر مانے جاتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے اُنھیں تمام صفات حمیدہ
سے متصف فرمایا تھا، جو سچے شاعر کے لئے درکار ہیں۔ راسخ نہ درباداری
کرتے تھے نہ حکام و امراء سے سروکار رکھتے تھے، فقر و قناعت میں عمر
بسر کر ڈالی۔ ارباب مذاق سے اُن کے دیکھنے والوں میں اب اس شہر میں
خواجہ محمد شاہ صاحب شہرت رہ گئے ہیں، خواجہ صاحب سے معلوم ہُوا کہ
حضرت راسخ مرحوم فقیر طبیعت اور فقیر دوست آدمی تھے۔ اکثر شاہ باقر
کے تکیہ پر قیام رکھتے تھے، اہل دولت سے کم ملتے تھے، صحبت فقرا میں
ہمیشہ رہتے تھے، تب ہی تو اُن کے کلام میں اس قدر مزا ہے، بے فقیر دل
ہوئے نہ کلام پرتاثیر ہُوا ہے نہ ہو گا۔ درباری شاعر ہی کیا، اور اس کی شاعری کیا

وہ پیٹ کا بندہ ہے، دروغ سرائی اس کا شیوہ ہے اسے کلام کے باتاثیر اور بے تاثیر ہونے سے کیا مطلب ایسے شاعر کی شاعری کو تعلق شکم سے ہوا کرتا ہے نہ دِل سے ٭

اب ذیل میں راقم کچھ شعرائے فارسی اور اُردو کا ذکر اس خیال سے حوالہ قلم کرتا ہے کہ جو جو امور غزل گوئی کی نسبت بیانات بالا میں چھوٹ رہے ہیں وہ بھی احاطۂ تحریر میں در آئیں اور بھی غزل گوئی کے تقاضوں کی مثالیں اُن کے کلاموں سے وضاحت پذیر ہوں۔ حضرات ناظرین کو ان یاددہی کے اعادہ کی حاجت نہیں ہے۔ کہ یہ کتاب بہ سبیل تذکرہ نہیں لکھی جاتی ہے اس کتاب کی جو غرض ہے وہ حقیقتِ شاعری کا بیان ہے نہ شاعروں کا شمار اس سے مطلب ہے اور نہ اُن کے حالات کی سیر اس سے مدعا ہے۔ اس لئے کہ حسبِ وسعت ضرورت کچھ شعرا کے کلاموں کی نسبت عاجز اپنے خیالات نذر ناظرین کرتا ہے ٭

فارسی شعرا کا عدد اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی اہل ہمت ان کا تذکرہ حسبِ مراد لکھنا چاہے تو اس کو اس کلام کے لئے انسان کی دو عمر طویل درکار ہوگی۔ مگر اس کثرت شعرا کے ساتھ بھی اچھے غزل گویوں کی تعداد بہت نظر نہیں آتی، راقم کی دانست میں سرآمد متغزلین خواجہ حافظ ہیں اور اُن کے بعد دس پانچ ہی نام ہیں جن کو غزل گو کے لقب سے یاد کر سکتے ہیں۔ فقیر کی دانست میں اس صنعتِ شاعری میں خواجہ کا جواب کوئی شاعر نہ فارس میں دیکھا جاتا ہے نہ ہندوستان میں۔ خواجہ کی غزل گوئی ایسی ہے کہ اُس کے ساتھ

فارسی یا اُردو کے کسی شاعر کی غزل گوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے' یہ وہ غزل گوئی ہے کہ برائے خود مصداق غزل گوئی ہے خواجہ کا دیوان غزلگوئی کا نمونہ ہے جہاں سے پڑھیے ہر غزل، ہر شعر، ہر مصرع غزلگوئی کی مثال ہے' ایسا کوئی غزل گو کسی زبان میں نہیں دیکھا جاتا ہے کہ اس کا دیوان کا دیوان پُورے طور سے غزل گوئی کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ بہر حال خواجہ کو مستثنیٰ کر کے جب دیگر متغزلین پر نگاہ ڈالیئے تو اغراض غزل گوئی کو مدِنظر رکھنے والے بس چند ہی حضرات دکھائی دیتے ہیں جیسے سعدی، جامی۔ فغانی میلی کلیم ہلالی، اہلی خسرو، حزیں، ان شعرائے متغزلین کے کچھ کلام درج ذیل کیے جاتے ہیں' اُن کے انداز کلام سے کم و بیش طور پر غزل سرائی کے تقاضے وضاحت پذیر ہوں گے۔

خواجہ حافظ

آپ کا نام شمس الدین محمد ہے' غزل سرائی میں حضرت خواجہ کا آج تک کوئی نظیر نہیں پایا جاتا حتیٰ کہ سعدی علیہ الرحمتہ بھی اس صنف شاعری میں خواجہ تک نہیں پہنچے ہیں، سعدی کو مذاق شاعری بطرز تنوع حاصل تھا۔ اور مختلف اصناف شاعری پر قدرت رکھتے تھے یہ تنوع کی کیفیت خواجہ میں موجود نہ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خواجہ فطرت کی رو سے شاعری کا تمام تر داخلی مذاق رکھتے تھے' برخلاف اس کے سعدی کو شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلو سے مناسبت حاصل تھی۔ مگر داخلی مذاق اُن کا حافظ کے داخلی مذاق کے برابر نہ تھا اس لئے غزلگوئی میں خواجہ کے برابر لطف کلام پیدا نہ کر سکے' حافظ اور سعدی کی طرح بجنسہٖ کیفیت میر اور مرزا کی معلوم ہے' مرزا رفیع سودا میں لُطف تنوع حاصل تھا۔ یہ بات میر تقی میں نہ تھی، مگر خاص غزل گوئی

ہیں مرزا رفیع سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے، جس طرح سعدی اصناف شاعری پر قادر تھے، سوداؔ کو بھی ویسی ہی قدرت حاصل تھی۔ ان دونوں شاعروں کو شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کے برتنے کی بڑی صلاحیت حاصل تھی۔ شیخ علیہ الرحمہ مثنوی، قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی وغیرہ یعنی اصناف شاعری کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں اور مجموعی حیثیت کے اعتبار سے اُن کا جواب کوئی شاعر نظر نہیں آتا ہے یہی کیفیت مرزا سوداؔ کی بھی معلوم ہوتی ہے مگر غزل گوئی میں نہ سعدی حافظ کے اور نہ مرزا میرؔ کے جواب معلوم ہوتے ہیں، گو سعدی اور مرزا اس صنف شاعری میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے، حافظ کی غزل گوئی کے ایسے کمالات ہیں کہ راقم کو ان کے بیان کی قدرت حاصل نہیں، حضرات ناظرین اوّل ان مضامین کو ملحوظ رکھیں جنھیں فقیر نے غزل گوئی تمام اُن مضامین کی مصداق ہے علاوہ اُن خوبیوں کے حافظ کا کلام ایک انداز کا ہے، دیوان کا دیوان اُن خوبیوں سے بھرا ہُوا ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی غزل گوئی کے لیئے درکار ہیں یوں تو غزل گوئی کے لیئے اعلیٰ درجہ کی واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ کی بندش کی بڑی حاجت ہے بغیر اس التزام کے غزل گوئی حسب مراد رنگ پیدا کر ہی نہیں سکتی ہے۔ مگر حافظ کے داخلی مضامین ایسے عالم سے خبر دیتے ہیں کہ جس کو ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتی ہیں، صرف دل کی آنکھ کا کام ہے کہ اس عالم کو معائنہ کر سکے، یہی وجہ ہے کہ صوفی مذہب والوں نے اپنے خیالات کے مطابق خواجہ کے دیوان کے دیوان کی شرح لکھی ہے، حضرات صوفی مذہب جو کچھ لُطف تاویلات دکھائیں، مگر ہم عوام الناس کے لیئے بھی خواجہ کا دیوان ایک

ذخیرہ حیرت ہے اور جو فہم معمولی انسان کو عطا ہوا ہے اس کے ذریعہ سے خواجہ کے کلام کا کچھ مزا نہیں اُٹھتا ہے اہل علم کے لئے خواجہ کا سارا کلام فلسفۂ اخلاق کا حکم رکھتا ہے۔ کچھ غزلیں ذیل میں نذر ناظرین ہوتی ہیں۔ سبحان اللہ کلام کا ہے کو ہے ملائک کی تسبیح و تہلیل ہے ؂

تا ز میخانہ و می نام و نشاں خواہد بود — سرِ من خاک رہ پیر مغاں خواہد بود

حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است — ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ — کہ زیارتگہ رنداں جہاں خواہد بود

بہ نبینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود — سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

برو اے زاہد خود بیں کہ ز چشم من و تو — راز ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود

ترک عاشق کش من مست برون رفت امروز — تا کرا خونِ دل امروز رواں خواہد بود

عیب مستاں مکن اے خواجہ کہ ایں کہنہ رباط — کس ندانست کہ رحلت بچساں خواہد بود

چشمم آندم کہ ز شوق تو نہد سر بہ لحد — تا دم صبح قیامت نگراں خواہد بود

بخت حافظ گر ازیں گونہ مدد خواہد کرد
زلف معشوق بدست دگراں خواہد بود

حضرات ناظرین خدا گواہ ہے کہ اس غزل کو درج نہ کر تا شروع کیا تھا کہ عجب حالت دیدۂ دل ہوگئی۔ چند منٹ تک کیا جان پر گزری، نہ زبان کو قدرت ہے نہ قلم کو یارا ہے کہ لکھے، سبحان اللہ! کلام ایسا تو ہو کہ دل کو ہلا دے ورنہ بے تاثیر مضمون بندی کا ماحصل کیا۔ اگر غزل گوئی صرف مضمون آفرینی کا نام ہو تو فردوسی عنصری۔ عسجدی۔ فرخی۔ ظہیر۔ خاقانی۔ عرفی۔ ظہوری۔ نعمت خاں، صائب

شوکت بخارائی۔ نظیری وغیرہ وغیرہ کو بھی فقیر غزل گو کو جانتا۔ یہ حضرات بڑے
بڑے شاعر تھے مگر غزل گو نہ تھے، فقیر پر ان شعرائے نامی کے تمام تصانیف،
کا اتنا اثر کبھی پیدا نہیں ہوا جتنا کہ اس وقت اِن چند اشعار کے کاپی کرنے
کے وقت محسوس ہوا ہے بہرحال دل پر اختیار کر کے خواجہ کی کچھ اور غزلیں
بھی نذر ناظرین کرتا ہے۔

غلام نرگسِ مستِ تو تاجدار انند — خراب بادۂ لعل تو ہوشیار انند
ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز — وگرنہ عاشق و معشوق رازدار انند
بزیر زلف دوتا چوں گزر کنی بہ نگر — کہ از یمین و یسارت چہ بیقرار انند
گزار کن چو صبا بنفشہ زار و ببین — کہ از تطاول زلفت چہ سوگوار انند
رقیب درگزر و بیش ازیں مکن نخوت — کہ ساکنان درِ دوست خاکسار انند
نصیب ماست بہشت اے خداشناس برو — کہ مستحق کرامت گناہ گار انند
نہ من بر آں گلِ عارض غزل سرایم و بس — کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند
تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من — پیادہ مے روم و ہمرہاں سوار انند
بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن — مرو بصومعہ کانجا سیاہ کار انند

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

نہایت جائے حیرت ہے کہ دس شعر کی غزل میں سارا اخلاقی فلسفہ مع الہیات
بھرا ہوا ہے فی الواقع خواجہ نے کوزہ میں دریا بھر دیا ہے اس پر سے لطف بالائے
لطف یہ ہے کہ کوئی مصرع کہیں سے غزلیت کے پایہ سے اُتر الغرض نہیں آتا

ہے ایسے ایسے حکیمانہ مضامین کو غزل سرائی کے پیرایہ میں اتنی آسانی کے ساتھ موزوں کرنا یہ خواجہ ہی کا کام ہے۔ بغیر موید من اللہ ہوئے، کوئی شاعر یہ لطف کلام پیدا نہیں کرسکتا، حقیقت یہ ہے کہ کوئی تعلیم غیبی خواجہ کو نصیب ہوئی تھی ورنہ یہ طرز بیان کہاں کسی کو آسکتا ہے، صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الہام کے ذریعے سے کلام فرماتے ہیں جیسا کہ خود اُن کا فرمودہ ہے ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — انچہ استادِ ازل گفت ہماں مے گویم

دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند — گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

شکر ایزد کہ میان من و اوصلح فتاد — حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

ساکنانِ حرمِ سرِ عفاف ملکوت — با منِ راہ نشین بادہ مستانہ زدند

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چون ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

نقطۂ عشق دلِ گوشہ نشینان خون کرد — ہمچو آن خال کہ بر عارضِ جانانہ زدند

ما بصد خرمنِ پندار زرہ چون بردیم — چون رہِ آدمِ خاکی بہ یکے دانہ زدند

آتش آن نیست کہ بر شعلہ او خندد شمع — آتش آن است کہ بر خرمنِ پروانہ زدند

کس چو حافظ نہ کشید از رخِ اندیشہ نقاب

تا سرِ زلفِ عروسانِ سخن شانہ زدند

غزل کا ہے کو ہے دونوں عالم کی سیر ہے، اخلاق تدبیر المنزل تمدن الٰہیات یعنی کہ تمام اقسام فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ درجہ کے مسائل اِن چند اشعار میں کمال خوبی و لطافت

کے ساتھ موزوں کر دیئے گئے ہیں، پھر طرز بیان مُلائی مذاق سے کس قدر دُور ہے شاعری ہے کہ ہر پہلو سے لپٹی پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چند شعرائے اُردو نے شعرائے فارس کی تتبع سے اُردو کو ایک معقول صورت بخشی ہے مگر جس قدر عمدگی خیالات کی کثرت خواجہ کے دیوان میں دیکھی جاتی ہے، اِس کا سولھواں حصہ کسی اُردو کے شاعر کے دیوان میں نہیں پایا جاتا، حافظ کے کلام کو بغور دیکھنے سے کسی اُردو کے شاعر کی غزل گوئی باوقار نظر نہیں آتی ہے، مقابلہ سے اُردو کی غزلگوئی ایسی محقر ہو جاتی ہے کہ جیسے کوہ ہمالیہ کے سامنے دہلی کی پہاڑی ؎

مژدہ ایدل کہ مسیحا نفسے مے آید — کہ ز انفاس خوشش بُوئے کسے مے آید
از غم و درد مکن نالہ و فریاد کہ دوش — زدہ ام فالی و فریاد رسے مے آید
ز آتش وادی ایمن نہ منم خرم و بس — موسیٰ اینجا بامید قبسے مے آید
ہیچکس نیست کہ در کوئے توش کارے نیست — ہر کس اینجا بامید ہوسے مے آید
کس ندانست کہ منزلگہ معشوق کجاست — اینقدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید
جرعۂ دہ کہ بہ میخانۂ ارباب کرم — ہر حریفے ز پئے ملتمسے مے آید
خبر بلبل ایں باغ مپرسید کہ من — نالۂ می شنوم کز قفسے مے آید
یار را گر سر پرسیدن بیمار غم است — گو بیا خوش کہ ہنوزش نفسے مے آید

یار دارد سر صید دل حافظ یاران
شاہبازے بہ شکار مگسے مے آید

خواجہ کا کلام فلسفہ و حکمت سے کہیں خالی تو ہوتا ہی نہیں ہے، مگر غزل بالا میں یہ شعر یعنی کس ندانست کہ منزلگہ الیٰ آخرہ کچھ ایسا قول ہے کہ دو ہزار شاعروں کا حوصلہ

ٹھنڈا کر دینے والا ہے، بہ شعر نہیں ہے، خدا جانے کیا ہے، بنی آدم میں جو محقق سے محقق شخص گذرا ہے اور جو آیندہ گزرے گا معرفت الٰہی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، تمام علوم انسانی کی مدد سے اسی قدر درک میں آسکتا ہے جتنا کہ خواجہ فرما گئے ہیں، کسی رتبہ کا کوئی عالم الہیات ہو اگر اُسے ذات باری تعالیٰ کی دریافت ہوگی تو اتنی ہی ہوگی کہ وہ ہے مگر کیا ہے۔ اور کہاں ہے اور کس طرف ہے اس کی حقیقت کا انکشاف امکان سے باہر ہے، پس جائے لحاظ ہے کہ خواجہ نے آدمی کی مجبوری عرفان کو کس خوبصورت پیرایہ میں بیان فرمایا ہے، ملٹن نے بھی مضمون عرفان کو لکھا ہے اور کوئی شک نہیں خوب لکھا ہے، مگر خواجہ کا بیان ملٹن کے بیان پر بہت غالب نظر آتا ہے۔" اس شعر کی غزلیت عجب لُطف رکھتی ہے اور اعلیٰ مضمون کے تقاضے کے مطابق طرزِ بیان کس قدر پُروقار دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ وہ شاعر ہیں کہ ہر چند اصنافِ شاعری سے صرف ایک صنف شاعری یعنی غزل گوئی کے برتنے والے ہیں، مگر اس ایک صنف میں اُنھوں نے دونوں عالم کی سیر دکھائی ہے، لاریب اگر خواجہ نہ ہوتے تو فارسی کی شاعری کو اس قدر بلند پائگی نصیب نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ حافظؔ اور سعدیؔ فارسی شاعری کی جان ہیں، یا وہ آنکھیں ہیں، جن سے شاعری کا چہرہ بازی گاہِ نظر اہلِ نظر ہو رہا ہے راقم کی کیا طاقت ہے کہ خس برابر بھی خواجہ کی ثنا خوانی کر سکے۔ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تو پر عمل پیرا ہو کر اب حضرت سعدی کی غزل گوئی کی طرف حضرات ناظرین کی توجہ کا طالب ہے

سعدی :- مصلح الدین نام نامی ہے اور سعدی تخلص، آپ بھی خواجہ

وہ پیٹ کا بندہ ہے، دروغ سرائی اس کا شیوہ ہے اسے کلام کے باتاثیر اور بے تاثیر ہونے سے کیا مطلب ایسے شاعر کی شاعری کو تعلق شکم سے ہوا کرتا ہے نہ دل سے ٭

اب ذیل میں راقم کچھ شعرائے فارسی اور اُردو کا ذکر اس خیال سے حوالہ قلم کرتا ہے کہ جو جو امور غزل گوئی کی نسبت بیانات بالا میں چھوٹ رہے ہیں وہ بھی احاطۂ تحریر میں در آئیں اور بھی غزل گوئی کے تقاضوں کی مثالیں اُن کے کلاموں سے وضاحت پذیر ہوں۔ حضرات ناظرین کو ان یاد دہی کے اعادہ کی حاجت نہیں ہے۔ کہ یہ کتاب بہ سبیل تذکرہ نہیں لکھی جاتی ہے اس کتاب کی جو غرض ہے وہ حقیقتِ شاعری کا بیان ہے نہ شاعروں کا شمار اس سے مطلب ہے اور نہ اُن کے حالات کی سیر اس سے مدعا ہے۔ اس لئے کہ حسبِ وسعت ضرورت کچھ شعرا کے کلاموں کی نسبت عاجز اپنے خیالات نذر ناظرین کرتا ہے ٭

فارسی شعرا کا عدد اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی اہلِ ہمت ان کا تذکرہ حسبِ مراد لکھنا چاہے تو اس کو اس کلام کے لئے انسان کی دو عمرِ طویل درکار ہوگی۔ مگر اس کثرت شعرا کے ساتھ بھی اچھے غزل گویوں کی تعداد بہت نظر نہیں آتی، راقم کی دانست میں سرآمد متغزلین خواجہ حافظ ہیں اور اُن کے بعد دس پانچ ہی نام ہیں جن کو غزل گو کے لقب سے یاد کر سکتے ہیں، فقیر کی دانست میں اس صنعتِ شاعری میں خواجہ کا جواب کوئی شاعر نہ فارس میں دیکھا جاتا ہے نہ ہندوستان میں، خواجہ کی غزل گوئی ایسی ہے کہ اُس کے ساتھ

فارسی یا اُردو کے کسی شاعر کی غزل گوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے، یہ وہ غزل گوئی ہے کہ برائے خود مصداق غزل گوئی ہے خواجہ کا دیوان غزلگوئی کا نمونہ ہے جہاں سے پڑھئے ہر غزل، ہر شعر، ہر مصرع غزلگوئی کی مثال ہے، ایسا کوئی غزل گو کسی زبان میں نہیں دیکھا جاتا ہے کہ اس کا دیوان کا دیوان پُورے طور سے غزل گوئی کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ بہر حال خواجہ کو مستثنیٰ کر کے جب دیگر متغزلین پر نگاہ ڈالئے تو اغراض غزل گوئی کو مدِ نظر رکھنے والے بس چند ہی حضرات دکھائی دیتے ہیں جیسے سعدی، جامی۔ فغانی، میلی، کلیم، ہلالی، اہلی خسرو، حزیں، ان شعرائے متغزلین کے کچھ کلام درج ہذا کئے جاتے ہیں، اُن کے انداز کلام سے کم و بیش طور پر غزل سرائی کے تقاضے وضاحت پذیر ہوں گے۔

خواجہ حافظ

آپ کا نام شمس الدین محمد ہے، غزل سرائی میں حضرت خواجہ کا آج تک کوئی نظیر نہیں پایا جاتا حتیٰ کہ سعدی علیہ الرحمتہ بھی اس صنف شاعری میں خواجہ تک نہیں پہنچے ہیں، سعدی کو مذاق شاعری بطرز تنوع حاصل تھا۔ اور مختلف اصناف شاعری پر قدرت رکھتے تھے یہ تنوع کی کیفیت خواجہ میں موجود نہ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خواجہ فطرت کی رو سے شاعری کا تمامتر داخلی مذاق رکھتے تھے، برخلاف اس کے سعدی کو شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلو سے مناسبت حاصل تھی۔ مگر داخلی مذاق اُن کا حافظ کے داخلی مذاق کے برابر نہ تھا، اس لئے غزلگوئی میں خواجہ کے برابر لطف کلام پیدا نہ کر سکے، حافظ اور سعدی کی طرح بجنسہٖ کیفیت میر اور مرزا کی معلوم ہے، مرزا رفیع سودا میں لطفِ تنوع حاصل تھا، یہ بات میر تقی میں نہ تھی، مگر خاص غزل گوئی

ہیں مرزا رفیع سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے، جس طرح سعدی اصناف شاعری پر قادر تھے، سودا کو بھی ویسی ہی قدرت حاصل تھی۔ ان دونوں شاعروں کو شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کے برتنے کی بڑی صلاحیت حاصل تھی۔ شیخ علیہ الرحمہ مثنوی، قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی وغیرہ یعنی اصناف شاعری کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں اور مجموعی حیثیت کے اعتبار سے اُن کا جواب کوئی شاعر نظر نہیں آتا ہے یہی کیفیت مرزا سودا کی بھی معلوم ہوتی ہے مگر غزل گوئی میں نہ سعدی حافظ کے اور نہ مرزا میر کے جواب معلوم ہوتے ہیں، گو سعدی اور مرزا اس صنف شاعری میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے، حافظ کی غزل گوئی کے ایسے کمالات ہیں کہ راقم کو ان کے بیان کی قدرت حاصل نہیں حضرات ناظرین اوّل ان مضامین کو ملحوظ رکھیں جنھیں فقیر نے غزل گوئی تمام اُن مضامین کی مصداق ہے علاوہ اُن خوبیوں کے حافظ کا کلام ایک انداز کا ہے، دیوان کا دیوان اُن خوبیوں سے بھرا ہُوا ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی غزل گوئی کے لیئے درکار ہیں یوں تو غزل گوئی کے لیئے اعلیٰ درجہ کی واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ کی بندش کی بڑی حاجت ہے بغیر اس التزام کے غزل گوئی حسب مراد رنگ پیدا کر ہی نہیں سکتی ہے۔ مگر حافظ کے داخلی مضامین ایسے عالم سے خبر دیتے ہیں کہ جس کو ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتی ہیں، صرف دل کی آنکھ کا کام ہے کہ اس عالم کو معائنہ کرسکے، یہی وجہ ہے کہ صوفی مذہب والوں نے اپنے خیالات کے مطابق خواجہ کے دیوان کے دیوان کی شرح لکھی ہے، حضرات صوفی مذہب جو کچھ لُطف تاویلات دکھائیں، مگر ہم عوام الناس کے لیئے بھی خواجہ کا دیوان ایک

ذخیرہ حیرت ہے اور جو فہم معمولی انسان کو عطا ہوا ہے اس کے ذریعہ سے خواجہ کے کلام کا کچھ مزا نہیں اٹھتا ہے۔ اہل علم کے لئے خواجہ کا سارا کلام فلسفۂ اخلاق کا حکم رکھتا ہے، کچھ غزلیں ذیل میں نذر ناظرین ہوتی ہیں۔ سبحان اللہ کلام کا ہے کو ہے ملائک کی تسبیح و تہلیل ہے ؎

تا ز میخانہ و می نام و نشان خواہد بود | سر من خاک رہ پیر مغان خواہد بود
حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است | ما ہمانیم کہ بودیم و ہمان خواہد بود
بر سر تربت ما چوں گزری ہمت خواہ | کہ زیارتگہ رنداں جہان خواہد بود
بہ نبینے کہ نشان کف پائے تو بود | سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود
برو اے زاہد خود بین کہ ز چشم من و تو | راز ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود
ترک عاشق کش من مست برون رفت امروز | تا کرا خون دل امروز رواں خواہد بود
عیب مستاں مکن اے خواجہ کزیں کہنہ رباط | کس ندانست کہ رحلت بچساں خواہد بود
چشمم آندم کہ ز شوق تو نہد سر بہ لحد | تا دم صبح قیامت نگراں خواہد بود

بخت حافظ گر ازیں گونہ مدد خواہد کرد
زلف معشوق بدست دگراں خواہد بود

حضرات ناظرین خدا گواہ ہے کہ اس غزل کو درج نہ کر نا شروع کیا تھا کہ عجب حالت دیدۂ دل ہو گئی۔ چند منٹ تک کیا جان پر گزری، نہ زبان کو قدرت ہے نہ قلم کو یارا ہے کہ لکھے، سبحان اللہ! کلام ایسا تو ہو کہ دل کو ہلا دے ورنہ بے تاثیر مضمون بندی کا ماحصل کیا۔ اگر غزل گوئی صرف مضمون آفرینی کا نام ہو تو فردوسی عنصری۔ عسجدی۔ فرخی۔ ظہیر۔ خاقانی۔ عرفی۔ ظہوری۔ نعمت خاں، صائب۔

شوکت بخارائی۔ نظیری وغیرہ وغیرہ کو بھی فقیر غزل گو جانتا۔ یہ حضرات بڑے بڑے شاعر تھے مگر غزل گو نہ تھے، فقیر پر ان شعرائے نامی کے تمام تصانیف کا اتنا اثر کبھی پیدا نہیں ہُوا جتنا کہ اس وقت اِن چند اشعار کے کاپی کرنے کے وقت محسوس ہُوا ہے بہرحال دل پر اختیار کرکے خواجہ کی کچھ اور غزلیں بھی نذر ناظرین کرتا ہے۔

غلام نرگسِ مستِ تو تاجدار انند — خراب بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند
ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز — وگرنہ عاشق و معشوق رازدار انند
بزیر زلف دوتا چوں گزر کنی بہ نگر — کہ از یمین و یسارت چہ بیقرار انند
گزار کن چو صبا بنفشہ زار و ببین — کہ از تطاولِ زلفت چہ سوگوار انند
رقیب درگزر و بیش ازیں مکن نخوت — کہ ساکنانِ درِ دوست خاکسار انند
نصیب ماست بہشت اے خداشناس برو — کہ مستحق کرامت گناہ گار انند
نہ من برآن گلِ عارض غزل سرائم و بس — کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند
تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من — پیادہ مے روم و ہمرہان سوار انند
بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن — مرو بصومعہ کانجا سیاہ کار انند

خلاص حافظ ازان زلف تابدار مباد
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

نہایت جائے حیرت ہے کہ دس شعر کی غزل میں سارا اخلاقی فلسفہ مع الہیات بھرا ہُوا ہے فی الواقع خواجہ نے کوزہ میں دریا بھر دیا ہے اُس پر سے لُطف بالائے لطف یہ ہے کہ کوئی مصرع کہیں سے غزلیت کے پایہ سے اُتر الغرض نہیں آتا

ہے ایسے ایسے حکیمانہ مضامین کو غزل سرائی کے پیرایہ میں اتنی آسانی کے ساتھ موزوں کرنا یہ خواجہ ہی کا کام ہے بغیر مویدمن اللہ ہوئے کوئی شاعر یہ لطف کلام پیدا نہیں کرسکتا، حقیقت یہ ہے کہ کوئی تعلیم غیبی خواجہ کو نصیب ہوئی تھی ورنہ یہ طرز بیان کہاں کسی کو آسکتا ہے، صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الہام کے ذریعے سے کلام فرماتے ہیں جیسا کہ خود اُن کا فرمودہ ہے ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — انچہ استاد ازل گفت ہماں مے گویم

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند — گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

شکر ایزد کہ میان من و او صلح فتاد — حوران رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

ساکنان حرم سر عفاف ملکوت — با من راہ نشین بادۂ مستانہ زدند

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

آسمان بار امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

نقطۂ عشق دل گوشہ نشینان خون کرد — ہمچو آن خال کہ بر عارض جانانہ زدند

ما بصد خرمن پندار زرہ چون بردیم — چون رہِ آدم خاکی بہ یکے دانہ زدند

آتش آن نیست کہ بر شعلہ او خندد شمع — آتش آن است کہ بر خرمن پروانہ زدند

کس چو حافظ نہ کشید از رخ اندیشہ نقاب

تا سر زلف عروسان سخن شانہ زدند

غزل کا ہے کو ہے دونوں عالم کی سیر ہے، اخلاق تدبیر المنزل تمدن الہیات یعنی کہ تمام اقسام فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ درجہ کے مسائل اِن چند اشعار میں کمال خوبی لطافت

کے ساتھ موزوں کر دیئے گئے ہیں، پھر طرز بیان مُلائی مذاق سے کس قدر دُور ہے
شاعری ہے کہ ہر پہلو سے لپٹی پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چند شعرائے اُردو
نے شعرائے فارس کی تتبع سے اُردو کو ایک معقول صورت بخشی ہے مگر جس قدر عمدگی
خیالات کی کثرت خواجہ کے دیوان میں دیکھی جاتی ہے، اس کا سولھواں حصہ کسی
اُردو کے شاعر کے دیوان میں نہیں پایا جاتا، حافظ کے کلام کو بغور دیکھنے سے
کسی اُردو کے شاعر کی غزل گوئی باوقار نظر نہیں آتی ہے، مقابلہ سے اُردو کی
غزلگوئی ایسی محقر ہو جاتی ہے کہ جیسے کوہ ہمالیہ کے سامنے دہلی کی پہاڑی ؎

مژدہ ایدل کہ مسیحا نفسے مے آید — کہ ز انفاس خوشش بوئے کسے مے آید
از غم و درد مکن نالہ و فریاد کہ دوش — زدہ ام فالی و فریاد رسے مے آید
ز آتش وادی ایمن نہ منم خرم و بس — موسیٰ اینجا بامید قبسے مے آید
ہیچکس نیست کہ در کوئے تو اش کارے نیست — ہر کس اینجا بامید ہوسے مے آید
کس ندانست کہ منزلگہ معشوق کجا است — اینقدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید
جرعۂ دہ کہ بہ میخانۂ ارباب کرم — ہر حریفے ز پئے ملتمسے مے آید
خبر بلبل ایں باغ مپرسید کہ من — نالۂ می شنوم کز قفسے مے آید
یار را گر سر پرسیدن بیمار غم است — گو بیا خوش کہ ہنوزش نفسے مے آید

یار دارد سر صید دل حافظ یاران
شاہبازے بہ شکار مگسے مے آید

خواجہ کا کلام فلسفہ و حکمت سے کہیں خالی تو ہوتا ہی نہیں ہے، مگر غزل بالا میں یہ شعر
یعنی کس ندانست کہ منزلگہ الیٰ آخرہ کچھ ایسا قول ہے کہ دو ہزار شاعروں کا حوصلہ

ٹھنڈا کر دینے والا ہے۔ یہ شعر نہیں ہے خدا جانے کیا ہے، بنی آدم میں جو محقق سے محقق شخص گذرا ہے اور جو آیندہ گزرے گا معرفت الٰہی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، تمام علومِ انسانی کی مدد سے اسی قدر درک میں آسکتا ہے جتنا کہ خواجہ فرما گئے ہیں، کسی رتبہ کا کوئی عالم الہیات ہو اگر اسے ذات باری تعالیٰ کی دریافت ہوگی تو اتنی ہی ہوگی کہ وہ ہے مگر کیا ہے۔ اور کہاں ہے اور کس طرف ہے اس کی حقیقت کا انکشاف امکان سے باہر ہے، پس جائے لحاظ ہے کہ خواجہ نے آدمی کی مجبوری عرفان کو کس خوبصورت پیرایہ میں بیان فرمایا ہے، ملٹن نے بھی مضمون عرفان کو لکھا ہے اور کوئی شک نہیں خوب لکھا ہے، مگر خواجہ کا بیان ملٹن کے بیان پر بہت غالب نظر آتا ہے، اس شعر کی غزلیت عجب لطف رکھتی ہے اور اعلیٰ مضمون کے تقاضے کے مطابق طرزِ بیان کس قدر پُر وقار دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ وہ شاعر ہیں کہ ہر چند اصنافِ شاعری سے صرف ایک صنف شاعری یعنی غزل گوئی کے برتنے والے ہیں، مگر اس ایک صنف میں اُنھوں نے دونوں عالم کی سیر دکھائی ہے، لاریب اگر خواجہ نہ ہوتے تو فارسی کی شاعری کو اس قدر بلند پائگی نصیب نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ حافظؔ اور سعدیؔ فارسی شاعری کی جان ہیں، یا دو آنکھیں ہیں جن سے شاعری کا چہرہ بازی گاہِ نظر اہلِ نظر ہو رہا ہے راقم کی کیا طاقت ہے کہ خس برابر بھی خواجہ کی ثنا خوانی کر سکے۔ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تو پر عمل پیرا ہو کر اب حضرت سعدیؔ کی غزل گوئی کی طرف حضرات ناظرین کی توجہ کا طالب ہے۔

سعدی :- مصلح الدین نام نامی ہے اور سعدی تخلص، آپ بھی خواجہ

حافظ کی طرح شیراز وطن ہیں، سو برس خواجہ کی وفات کے قبل رحلت فرمائی، جیسا
کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی وفات ۶۹۱ھ ہجری میں واقع ہوئی اور حافظ
کی ۷۹۱ھ ہجری میں، سعدی کی نسبت بعض محققین ... لکھتے ہیں کہ غزل کے
موجد حضرت ہیں، مگر یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ مولانا روم ونظامی وبعض
دیگر شعرا کی غزلیں دیکھی جاتی ہیں اور یہ حضرات قبل شیخ کے رحلت فرما چکے
تھے۔ لیکن اگر غزل گوئی کے کسی خاص رنگ کے موجد حضرت قرار دیئے جائیں تو دور
از صحت نہ ہوگا۔ بہر حال غزل سرائی کی حیثیت سے حضرت سعدی حضرت
حافظ کو نہیں پہنچتے ہیں، ہر چند شیخ کے کلام میں شوخی، ملاحت وغیرہ ہے اور شیخ
فلسفۂ اخلاقی کے ماہر اور فلسفۂ اخلاقی کے بڑے معلم بھی گزرے ہیں مگر حضرت میں
خواجہ کے اعتبار سے غزلگوئی کا مادہ بہت کم موجود تھا، اس لئے اپنی اطلاع
فلسفہ وحکمت کو پیرایہ شاعری میں اُس خوبی کے ساتھ نہیں بیان فرما سکتے جیسا
کہ خواجہ اس امر پر قادر نظر آتے ہیں، بعض غزلیں حضرت سعدی کی نہایت حکیمانہ
رنگ کے ساتھ بڑی غزلیت سے معمور دیکھی جاتی ہیں۔ مگر دیوان کا دیوان خواجہ
کے دیوان کی طرح انتخاب کا حکم نہیں رکھتا ہے، بعض کلام تو ایسا ہے کہ اس
میں غزلیت کی تو بو بھی نہیں پائی جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی واعظ
صاف صاف نظم میں ارشاد فرما رہا ہے۔ خیر غزل گوئی میں جو کچھ شیخ خواجہ سے
کم ہوں مگر شیخ کا مذاق بہ حیثیت تنوع خواجہ کے مذاق پر ہزار درجہ زیادہ غالب
تھا، بلکہ خواجہ میں تنوع کا لطف گویا کچھ نہ تھا، خواجہ ایک فنی تھے اور شیخ
ہزار فنی، لیکن اُس کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ خواجہ کی ایک فنی

حوصلہ انسانی سے باہر معلوم ہوتی ہے۔ گو شیخ کی شاعری کا تنوع بھی ایک نہایت حیرت افزا امر ہے، فقیر کے خیال میں سعدی کے مقابلہ کا کثیر المذاق شاعر فارسی میں کوئی نہیں گزرا ہے۔ اس قدر صاف اور شفاف دماغ نہ فردوسی نہ نظامی نہ انوری نہ سنائی اور نہ فارس کے اور کسی نامی شاعر کا ہے، نظم و نثر دونوں کی یہ حالت ہے کہ اکثر قول ضرب المثل کا حکم رکھتا ہے ایسی مقبولیت کسی ناظم یا نثار کے کلام کو حاصل نہیں ہے، حق تو یہ ہے کہ سعدی تمام شعرا و نثاران عجم پر غالب ہیں لیکن غزل گوئی میں صرف خواجہ حافظ سے کم ہیں، ظاہرا یہ امر تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علم و فضل میں خواجہ سے کم نہ تھے، اور مذاق شاعری ہر قسم کا رکھتے تھے، علاوہ اس کے سیر و سفر سے وفور اطلاع کیصورت بھی پیدا کی تھی، اس پر بھی حافظ سے غزلگوئی میں کم کیونکر رہ سکے، اس کی وجہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ غزلگوئی کے لئے ایک خاص صلاحیت درکار ہے، علم و فضل کثیر المذاقی اور جہان گردی کو کوئی خصوصیت اس صنف شاعری کے ساتھ نہیں ہے، آدمی عالم سے عالم حکیم سے حکیم نہایت کثیر المذاق اور بڑا سیاح ہوسکتا ہے، اس کے یہ سب کمالات صلاحیت خلقی کی کمی کی حالت میں غزل گوئی کو مطلق نہیں ہو سکتے بلکہ غزلگوئی کے لئے سیر و سفر کی کوئی حاجت ہی نہیں ہے خواجہ نے خوب کیا کہ شاہِ دکن کی دعوت قبول نہ فرمائی، اس سفر ہندوستان سے اُن کی غزلگوئی کو کوئی فائدہ مترتب نہ ہوتا بلکہ یہ سفر اور شاہی تقرب بہت کچھ اُن کے کمالات کا حارج ہوتا۔ جاننا چاہیئے کہ غزل گوئی وہ صنف شاعری ہے کہ جس میں جہاں گشتی کی کوئی حاجت نہیں۔ اس سبب سے کہ غزلگوئی کو اُن

اُمور سے تعلق ہوتا ہے جو محض داخلی پہلو رکھتے ہیں غزل گو کا مطمح نظر اس کا درون ہی ہوتا ہے اُسے عالم خارج کے مشاہدہ کی کوئی محتاجی لاحق نہیں، یہی غزل گوئی عزلت نشین کا شیوہ ہے، جہانگردی اُس کے دائرہ احتیاج سے باہر ہے ؎

خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است　　　چوں روئے یار ہست بصحرا چہ حاجت است

لیکن چونکہ حضرت شیخ کو شاعری کا مذاق بطرز تنوع حاصل تھا، اگر سیر سفر سے تمتع کثیر حاصل نہ فرما لیتے تو مختلف اصناف شاعری پر قادر نہ ہو سکتے، جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

تمتع زہر گوشہ یافتم　　　زہر خرمنے خوشہ یافتم

حضرت شیخ علیہ الرحمہ کا ذکر ہر صنف شاعری کے ساتھ آئے گا، اس لیئے اس جگہ پر وہی باتیں عرض کی جاتی ہیں جو غزل سے تعلق رکھتی ہیں ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شیخ کے کلام میں عموماً دلفریبی تاثیر سوز و گداز شوخی نمکینی شیرینی بدرجہ کثیر پائی جاتی ہے پس ان صفتوں سے حضرت کی غزل گوئی بھی خالی نہیں دیکھی جاتی ہے۔ اُن کی غزل سرائی میں ان کی آزاد مزاجی سیر چشمی قناعت اخلاق بلند حوصلگی وغیرہ کا اثر بھی بین طور پر پایا جاتا ہے کہ بعد حضرت ہی کا درجہ نظر آتا ہے کچھ غزلیں نمونہ کے طور پر نذر ناظرین ہوتی ہیں:-

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے　　　صوفی نہ شود صافی تا در نہ کشد جامے
گر پیر مناجاتی ور رند خراباتی　　　ہر یک قلمی رفتہ است بروے بسر انجامے
فردا کہ خلائق را دیوان جزا باشد　　　ہر کس عملے دارد ما گوش بہ انعامے
اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم　　　تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے

سرو بلب جوئے گویند چہ خوش باشد — آنانکہ نہ پیوستند سروے بلب بامے

روزے دل ریش من جہرت چو برہاں در تن — آخر ز دُما گوئے یاد آر بہ دشنامے

باشد کہ تو خود روزے از ما خبرے پرسی — ورنہ کہ برد ہیہات از ما بتو پیغامے

گرچہ شب مشتاقاں تاریک بود اما — نومید نشاید بود از روشنیٔ بامے

سعدی بلب دریا دُر دانہ کجا یابی
در کام نہنگان رو گر میطلبی کامے

بلاشبہ یہ غزل غزلیت کی بہت خوبیاں رکھتی ہے مگر حافظ کی حیرت انگیز ترکیبوں کو نہیں پہنچتی ہے :-

خوبرویاں جفا پیشہ وفا نیز کنند — بہ کساں درد فرستند و دوا نیز کنند

بادشاہاں ملاحت چو بہ نخچیر روند — صید را پائے ببندید و رہا نیز کنند

نظرے کن بمن خستہ کہ ارباب کرم — بہ ضعیفاں نظر از بہر خدا نیز کنند

عاشقاں را ز در خویش مران تا بر تو — سر و زر بر فشانند و دعا نیز کنند

گر کند میل بخوباں دل من عیب مکن — کین گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

بوسہ زاں دہن تنگ بدہ یا بفروش — کین متاعیست کہ بخشند و بہا نیز کنند

تو ختائی بچہ از تو خطا نیست عجب — کانکہ از اہل صوابند خطا نیز کنند

گر بر آید بزباں نام منت باکے نیست — بادشاہاں بغلط یاد گدا نیز کنند

سعدیا گر نہ کند یاد تو آن ماہ مرنج
ما کہ باشیم کہ اندیشہ ما نیز کنند

یہ غزل غزل کا پورا علم رکھتی ہے، گو مذاق کلام حافظ سے علیحدہ ہے، ظاہر ہے

کہ اس لطف کی غزلیں سعدی کے دیوان میں سب ہی نہیں ہیں مگر یہ ایک غزل ایسی ہے کہ سعدی کے استاد غزلگوئی مانے جانے کو کافی ہے اس غزل میں غزل سابق کے اعتبار سے داخلی مضامین زیادہ ملحوظ رہے ہیں اسی لئے اس میں حسن مقبولیت بھی زیادہ ہے اب میں اور شعرائے متغزلین کی غزلیں مندرج ذیل کرتا ہوں کہ باوجود مختلف المذاق ہونے کے لطف تغزلیت سے خالی نہیں ہیں :-

غزل جاؔمی

اے ترک شوخ ایں ہمہ ناز و عتاب چیست
با دل شکستگان ستم بیحساب چیست

از مدرسہ بہ کعبہ روم یا بہ میکدہ
اے پیر رہ بگو سے طریق صواب چیست

خنجر کشیدہ از پئے قتلم شتافتی
خود کشتہ میشوم تراضطراب چیست

گفتی شبے بخواب تو آئیم دلے چہ سود
چوں من بعمر خویش ندانم کہ خواب چیست

بے تو ز ضعف قوت جنبید نم نماند
در حیرتم کہ در دلم ایں اضطراب چیست

جاؔمی چہ لاف میزنی از پاک دامنی
بر خرقہ تو ایں ہمہ داغ شراب چیست

ملّا جامی بھی مذاق غزل گوئی رکھتے ہیں اور اُن کے دیوان میں بہت اشعار ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ لطف غزلیت سے خالی نہیں ہیں مگر تمام دیوان کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ فقیر کی دانست میں جاؔمی کی غزل گوئی سے اُن کی مثنوی نگاری زیادہ خوبصورت ہے ؟

غزل فغانی

نخل قد است کز چمن جان بر آمده
شاخ گلے بصورتِ انساں بر آمدہ

از فرق تا قدم ہمہ جانست آن نہال
گویا ز آب چشمۂ حیوان بر آمدہ

اکنوں توئی جمیل جہاں گرچہ بیش ازیں
آوازۂ جمال ز کنعان بر آمدہ

بر ہر زمیں کہ جلوہ کنان رفتہ بہ ناز
آہ از نہاد کبک خراماں بر آمدہ

دز دیدہ چوں بہ شمع رخت کردہ ام نگاہ
از دل ہزار شعلۂ پنہاں بر آمدہ

بہر نظارۂ گل روئے تو در چمن
گل ہر طرف ز شاخ درختان بر آمدہ

مستِ مئ شبانۂ من ز خواب ناز
با آفتاب دست و گریبان بر آمدہ

در ہر چمن کہ گفت فغانی سرود غم
افغان ز بلبلان خوش الحان بر آمدہ

یہ غزل ایک عمدہ نمونہ غزل سرائی کا ہے' لاریب بابا فغانی نے اس غزل میں پوری داد عاشقانہ رنگ کی غزل سرائی کی دی ہے' سبحان اللہ کیا کہنا ہے

غزل خسرو

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

آشکارا سینہ ام بشگافتی
ہمچناں در سینہ پنہانی ہنوز

ملک دل کردی خراب از تیغ ناز
واندریں ویرانہ سلطانی ہنوز

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتہ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

خون کس یارب نگیرد دامنت | گرچہ درخونی ناپشیمانی ہنوز
ماز گریہ چون نمک بگداختیم | توز خندہ شکرستانی ہنوز
جان زبند کالبد آزاد گشت | دل بہ گیسوئے تو زندانی ہنوز

پیری و شاہد پرستی ناخوش است
خسروا تا کے پریشانی ہنوز

خسرو سعدی کے جواب سمجھے جاتے ہیں، کوئی شک نہیں کہ خسرو میں سعدی کا انداز ہے مگر اُن کی غزل سرائی سعدی تک نہیں پہنچتی ہے بہرحال کوئی شک نہیں کہ خسرو بہت اچھے غزل گو ہیں، گو اُن کا تمام دیوان حافظ کی طرح لطف غزلیت سے بھرا ہوا نہیں ہے، لوگ خسرو کو ہندی کہتے ہیں، مگر وہ ہندی مرزا بیدل اور قتیل کی طرح نہ تھے۔ ان کا شمار اہل زبان میں بخوبی کیا جاسکتا ہے کس واسطے کہ جس عہد میں وہ زندہ تھے، اُس میں فارسی کے سوا ہندوستان میں مسلمان کوئی دوسری زبان نہیں بولتے تھے، اور اہل زبان کی بڑی کثرت تھی +

غزل اہلی شیرازی

خوش آنکہ تو باز آئی و من پائے تو بوسم | در سجدۂ صنم خاک کف پائے تو بوسم
ہر جا کہ تو روزے نفسے جائے گرفتی | آنجا روم و گریہ کناں جائے تو بوسم
ہر جا کہ غزالیست چو مجنوں سر و چشمش | در آرزوئے نرگس شہلائے تو بوسم

من اہلی درویش و تو آن شاہ بتانی
دستیکہ ببوسم بہ تمنائے تو بوسم

یہ غزل نہایت عاشقانہ رنگ رکھتی ہے، گو حافظ کی حکمت آموزی کا حسن اس میں نہیں ہے تو بھی، اس کے ایک عمدہ نمونہ غزل گوئی ہونے میں کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی، اگر کسی شاعر میں غزل سرائی کی اتنی بھی صلاحیت نہیں ہے تو بہتر ہے کہ اور اصناف شاعری کو اختیار کرے ؛

غزل مرزا علی قلی خان میلیؔ

کو بخت آنکہ یار شکایت ز من کند	چند انکہ مدعی نہ تواند سخن کند
گر دو ہزار بارہ گرفتار نا امید	گر شکوۂ دلم ز تو پیمان شکن کند
گر بہم سرگرانی او نیست غیر را	متہم چرا ز ہمرہی خویشتن کند
آن ظالمم کجاست کہ از پہلوئے رقیب	قتل مرا بہانہ بر خاستن کند
او میکند سوال و مرا در جواب او	از اضطراب دل نہ تواند سخن کند

میلیؔ ہزار حیف کہ آن مے پرست را
ذوق شراب ساقی ہر انجمن کند

یہ غزل نہایت شوخ رنگ رکھتی ہے اور غزل گوئی کی اچھی مثال ہے اگر اتنا بھی کسی شاعر نے شوخ طبیعت نہیں پائی ہے تو اُسے لازم ہے کہ غزل گوئی کو خیرباد کہے ؛

غزل ابوطالب ہمدانی کلیم

نہ ہمیں مے مدان زو گل خنداں از من	می کشد خار درین بادیہ داماں از من

با من آمیزش او الفت موج است و کنار · روز و شب با من و پیوستہ گریزان از من
قمری ریختہ بالم بہ پناہ کہ روم · تا یکے سرکشی اے سرو خرامان از من
بہ تکلم بہ خموشی بہ تبسم بہ نگاہ · میتوں برد بہر شیوہ دل آسان از من
نیست پرہیز من از زہد کہ خاکم بر سر · ترسم آلودہ شود دامن عصیان از من
گرچہ مورم ولے آن حوصلہ با خود دارم · کہ بہ بخشم بود ار ملک سلیمان از من

اشک بیہودہ مریز این ہمہ از دیدہ کلیم
گرد غم را نتوان شست بطوفان از من

یہ غزل بھی غزل سرائی کا ایک عمدہ نمونہ ہے، کلام میں شوخی متانت طبیعت داری سب کچھ موجود ہے، حقیقت یہ ہے کہ کلام وہی ہے جس کی تاثیر دل پر پیدا ہو۔ ورنہ مجرد مضمون خیزی لطف غزلیت نہیں پیدا کر سکتی ؛

غزل ہلالی

این است کہ خون کردہ دل برد بسے را · بسم اللہ اگر تاب نگہ ہست کسے را
دیدیم ز یاران وفادار بسے را · لیکن چو سگان تو ندیدیم کسے را
قطع ہوس و ترک ہوا کن کہ درین راہ · چندان اثرے نیست ہما و ہوسے را
تا از آن لب شیرین نمکسان کام گرفتند · گیرند بہ از ان خیل ملائک مگسے را
گر از نظر افتاد رقیبے عجبے نیست · در دیدۂ خود در نتوان داد خسے را

پیش سگش این آہ و فغان چیست ہلالی
از خود مکن آزردہ چنین ہم نفسے را

ہلالی میں بھی غزل گوئی کا لطف پایا جاتا ہے اگر غزل میں غزلیت نہ ہو۔ تو پھر اُسے کوئی اور شئے کہیں گے۔ غزل نہیں کہیں گے، واضح ہو کہ ان تمام غزلہائے بالا میں مختلف المذاقی پائی جاتی ہے مگر کوئی غزل لطف غزلیت سے خالی نظر نہیں آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شعراء واردات قلبیہ اور امور ذہینیہ کو تمامتر تبعیت فطرت کے ساتھ اپنی غزلوں میں حوالۂ قلم فرماتے گئے ہیں اور جس قدر ممکن تھا تشبیہ استعارہ اور مبالغہ سے کنارہ کشی رہے ہیں ؏

شیخ محمدؐ علی حزیںؔ

دل درخم زلف او سودائے دگر دارد / یا سلسلۂ دیوانہ غوغائے دگر دارد

صحرائے طلب دارد بر سر قدمے طورے / ہر سنگ درین وادی موسائے دگر دارد

افلاک نگہبان عشق نونمے باشد / این بادہ زور آور مینائے دگر دارد

در مجلس ما یک کس ہشیار نہ می گردد / در جام مگر ساقی صہبائے دگر دارد

گر عشق نہاں بازد با خود عجبے نبود / در پردۂ دل مجنوں لیلائے دگر دارد

پیداست حزیںؔ ما را از دلق ہمے آلودش

کیں رند خراباتی تقوائے دگر دارد

حزیںؔ میں بھی غزلگوئی کا اچھا لطف پایا جاتا ہے، مذاق غزل گوئی ان کا تصوف آمیز ہے، مزاج میں فقر کی طرف بھی میلان بہت تھا، ہر چند اہل زبان سے ہیں مگر اہل ایران ان سے بالکل ناواقف ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وطن سے نکل کر ہندوستان میں چلے آئے تھے، اور ہندوستان میں رہ گئے، مزار شیخ کا شہر بنارس میں ہے، فقیر جب

عنفوانِ شباب میں وہاں کے کالج کا ایک طالب علم تھا تو اکثر شام کو غاطمان میں جہاں وہ آسودہ ہیں جایا کرتا تھا۔ زمانہ یاد آتا ہے اور عمرِ گذشتہ کی دل میں حسرت ہوتی ہے، عاجز نے شیخ کے دیوان کو اوّل اوّل اُسی زمانہ میں دیکھا تھا، اچھا نثر اُتنے ہیں انداز کلام حافظ اور سعدی سے مرکب معلوم ہوتا ہے، مگر اِن حضرات کی سخن سنجی تک اُن کی طبیعت داری نہیں پہنچتی ہے، قبل اس کے کہ شعرائے فارس کی غزل گوئی کی بحث اختتام کو پہنچائی جائے، کچھ اُن شاعروں کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو ہندی وطن ہو کر فارسی میں بھی نام برآوردہ نظر آتے ہیں، ان میں سے مشہور یہی حضرات ہیں، مرزا عبدالقادر بیدل، واقف پٹیالوی، مظہر جان جاناں سراج الدین علی خان آرزو، قتیل اور غالب

واقف پٹیالوی بیدل جان جاناں آرزو قتیل

واقف پٹیالوی نے حزیں کو دیکھا تھا اور مذاق غزلگوئی اچھا رکھتے تھے، مرزا بیدل ہندوستان میں ایک مشہور فارسی گو شاعر ہیں، ہر ہندوستانی وطن جو فارسی سے آشنائی رکھتا ہے اُن کے کلام سے کچھ نہ کچھ واقف ہے۔ مرزا بیدل کا فارسی دیوان چھپ بھی گیا ہے، مگر اُن کی غزل سرائی فقیر کو نہیں پسند ہے۔ علاوہ اس کے کہ زبان میں تصرفات کر جاتے ہیں، غزلوں میں ایسے ایسے استعارات اور نازک خیالیوں سے کام لیتے ہیں کہ غزل سرائی کا لُطف قائم نہیں رہتا۔ مظہر جان جاناں کا کلام اچھا ہے مگر اس درجہ کا نہیں ہے کہ اُن کا شمار ممتاز غزل گویوں میں کیا جائے، خان آرزو ایک محقق شخص ہیں، مگر شاعری کے لئے طبیعت پورے طور سے مناسب نہیں پائی تھی، قتیل میں

غزل سرائی کا مادہ ہے۔ مگر وہ اپنے اِس مادّے سے کام نہ لے سکے، غالبؔ تو اُن کے کچھ بھی معتقد نظر نہیں آتے ہیں بلکہ بڑی بے اعتنائی سے انھیں یاد کرتے ہیں جیساکہ اُن کا خود قول ہے۔ شعر

گرچہ بیدلؔ ز اہلِ ایران نیست　　　　لیک ہمچو قتیلؔ نادان نیست

خیر قتیلؔ جو کچھ ہوں۔ خود غالبؔ فارسی کے اچھے غزل سرا نظر نہیں آتے، شک نہیں کہ غالبؔ کو فارسی کی معلومات بہت ہے اور شاعری کا مادہ بھی بہت رکھتے تھے۔ مگر اُن کی فارسی کی غزل سرائی، غزل سرائی کا حکم نہیں رکھتی ہے۔

غالبؔ جس غزل کو دیکھئے اُن سے اُن کی مضمون آفرینی خلاقیِ سخن بلند پروازی نازک خیالی ندرت آوری وغیرہ عیاں ہے مگر اُن کی تمام فارسی غزلوں میں صرف دس پانچ ہی شعر ہوں گے، جو غزلیت کا لُطف رکھتے ہوں گے ورنہ دیوان کا دیوان حسنِ مقبولیت سے خالی نظر پڑتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ استعارات وغیرہ سے بہت کام لیتے ہیں جو سچی غزل گوئی کی شان سے بہت بعید ہے، فقیر حضرت کا بہت معتقد ہے یعنی اُن کو ایک بڑا شاعر گرامی جانتا ہے مگر افسوس ہے کہ اُن کی فارسی کی غزل سرائی کو اپنے دل پر تاثیر پیدا کرتے نہیں پاتا، حضرت کی غزلوں کے اشعار بیشتر قصیدہ ونما معلوم ہوتے ہیں اور کچھ ایسی خاص ترکیب رکھتے ہیں کہ اُن سے وہ حظ دل کو نصیب نہیں ہوتا ہے جو غزل سرائی کا تقاضا ہے، کچھ غزلیں حضرت کی نذرِ ناظرین ہوتی ہیں۔

غزل

لعلِ تو خستہ اثرِ التماس کیست
بختِ من از تو شکوہ گزارِ سپاس کیست

گیرم ز داغِ عشقِ تو طرفے بہ لپشتِ دل
اینم نہ بس بود کہ جگر روشناس کیست

لرزم بہ کوئے غیر نہ بے تابیِ نسیم
کاندر امیدواری بوئے لباس کیست

با او لبساز وصلے و با من بہ عزمِ قتل
آہ از امیدِ غیر کہ ہمچشمِ یاس کیست

از بیکساں شہرم و از ناکسانِ دہر
گر گشتہ سر تو سلامت ہراس کیست

از پرنیاں بعربدہ راضی نہ می شود
خارِ رہِ تو چشم براہِ پلاس کیست

لطفت بشکوہ از ہوسِ بیشمارِ من
شوقم بہ نالہ از ستمِ بے قیاس کیست

گیرم کہ رسمِ عشقِ من آوردہ ام بدہر
ظلم آفریدۂ دلِ ناحق شناس کیست

صحنِ چمن نمونہ بزمِ فراغِ تو
بادِ سحر علاقۂ ربطِ حواس کیست

غالب بُتِ مرا نگہ ناز قحط نیست
تا با منش مضائقہ چندیں بپاس کیست

غزل کی غزل پڑھ جایئے کسی شعر یا مصرع میں اتنی قوت نہیں ہے کہ تڑپا دے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص ترکیب میں ایسے نازک مضامین موزوں کئے گئے ہیں کہ اُن کو دل آویزی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اِس بے تاثیری کی وجہ یہ ہے کہ اِن اشعار میں کوئی مضمون ایسا نہیں باندھا گیا ہے کہ جو انسان کے کسی بڑے معاملۂ قلبی سے خبر دیتا ہو، اور کوئی معاملہ قلبی بیان بھی ہُوا ہے تو تبعیت فطرت سے علیحدہ ہو کر اور ایسی ترکیب زبان کے ساتھ کہ جو بے ضرورت دشوار صورت

ہے ایسا کلام ضرب المثل کی تاثیر نہیں پیدا کر سکتا ہے اور نہ اس کے مضامین پڑھنے والے کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہ سکتے ہیں جتنے اشعار ہیں اُن کا یہی حال ہوتا ہے کہ فوراً پڑھنے کے بعد یاد سے جاتے رہتے ہیں، اور کوئی تاثیر دل پر چھوڑ نہیں جاتے۔ فقیر کے دل کا تو یہی حال ہے بہت بار اس عاجز نے اس غزل کو دیکھا ہے اور بے تاثیری کے اعتبار سے یہ ہر بار نئی معلوم ہوتی ہے برخلاف اس کے مسبوق الذکر شعرائے متغزلین کی غزلوں کی کیفیت دیکھی جاتی ہے کہ کم و بیش طور پر اُن کا اثر قلب پر رہ جاتا ہے اور اگر رہ نہ جائے تو آنی اثر تو ضرور ہوتا ہے۔ بخلاف اس غزل کے کہ اس میں پائدار یا غیر پائدار کسی طرح کا اثر پایا ہی نہیں جاتا، حضرت غالب کی اکثر فارسی غزلوں کا یہی طور ہے، بلکہ سب غزلوں کا یہی طور ہے۔ اِلّا صرف دس پانچ اشعار کہ غزلیت کا پورا رنگ رکھتے ہیں، جس کے باعث اُن کی پُر تاثیری معرضِ گفتگو میں نہیں آسکتی ہیں دو غزلیں اور بھی ذیل میں عرض کرتا ہوں، ایک حافظ کی زمین ہے اور دوسری سعدی کی ؎

غزل

بتانِ شہر ستم پیشہ شہر یار انند	کہ در ستم روشِ آموز روزگار انند
بہ بند دل بہ اداے کہ کس گمان نہ برد	فغان زپردہ نشینان کہ پردہ دار انند
بجنگ تا چہ بود خوے دلبراں کایں قوم	در آشتی نمک زخمِ دلِ فگار انند
نہ زاغ دکشت تناسند نے حدیقہ باغ	زبہر بادہ ہوا خواہ باد و بار انند

زوعدہ گشتہ پشیمان وبہر دفع ملال — امید وار بہ مرگ امیدوار انند
زرشکِ بے خویش دمنش نور دیدہ آتش — بہ رنگ بوئے جگر گوشۂ بہار انند
تو سرمہ بین و ورق در نورد و دم درکش — مبین کہ سحر نگاہان سیاہ کار انند
زدیدہ داد مزن حرف خرد سالانند — بہ گرد راہ منہ چشم نے سوار انند

زچشم زخم بدیں حیلہ کے رہی غالب
دگر مگو کہ چو من در جہان ہزار انند

بہ زمین خواجہ کی ہے' آپ فرماتے ہیں ؎

غلام نرگس مست تو تاجدار انند — خراب بادۂ لعلِ تو ہشیار انند

کہاں یہ مطلع اور کہاں یہ مطلع ،

بتاں شہر چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

اسی طرح اور بھی کچھ قافیے غزل بالا میں ہیں۔ جنھیں حافظ نے بھی باندھا ہے اُن قافیوں کے اشعار دونوں غزلوں میں سے موازنہ کی نظر سے درج ذیل ہوتے ہیں :

حافظ	غالب
ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز	برند دل بہ ادائے کہ کس گمان نبرد
دگرنہ عاشق و معشوق رازدار انند	فغانِ پردہ نشینان کہ پردہ دار انند

حافظ کی شعر کی خوبی آشکارا ہے' اوّل تو یہ شعر تبعیت فطرت سے خبر دیتا ہے' دوم یہ کہ اس کا مضمون ایسی خوش ترکیبی سے حوالۂ قلم ہوا ہے کہ اس کا سمجھنا زحمت خیز نہیں ہے' تیسری بات یہ ہے کہ ملاحت نمکینی شوخی شیرینی

ایسی ہے کہ دل یہی چاہتا ہے کہ سو بار اس شعر کو پڑھتے رہئے، بخلاف اس کے غالب کا شعر ہے کہ اس میں بہ سبب کوئی لطف نہیں ہے بلکہ دوسرے مصرع کو دو چار بار پڑھیئے تو بالکل بے مزہ ہو جاتا ہے، بڑا حسن اس شعر کا یہ ہے کہ پردہ نشینوں کو پردہ دار کر کے دکھایا ہے۔ اس میں کیا بڑی مضمون آفرینی ہے یا بڑی غزلیت ہے؟ ظاہرا کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے حکمت و فلسفہ سے تو اس شعر کو بحث نہیں ہے جیسا کہ اس غزل کے اور اشعار کو کوئی علاقہ نہیں ہے؛

غالب	حافظ
بجنگ تا چہ بود خوے دلبران کین توم	نصیب ما ست بہشت ای خدا شناس برو
در آشتی نمک زخم دلفگار اند	کہ مستحق کرامت، گناہ گاران اند

چونکہ گاران کا قافیہ دونوں شعر بالا میں بندھا ہے اس لیے راقم نے ان دونوں شعر کو مقابلہ میں لکھ دیا، خیر اب دونوں شعر کے لطف مضمون اور حسن بیان پر غور فرمائیے، حافظ کا شعر جیسا کہ عموماً فطری رنگ رکھتا ہے زیور سادگی سے آراستہ دیکھا جاتا ہے کسی مسئلہ حکمت و فلسفہ پر مبنی ہوتا ہے اور غزلیت میں ڈوبا رہتا ہے، ویسا یہ شعر بھی ہے بلکہ اس شعر میں خواجہ نے بہت سے مسائل دین و اخلاق کو بڑے آسان پیرایہ میں فرما دیا ہے، اس شعر کی کیفیت عرض کر کے غالب کے شعر کی طرف توجہ ہی فضول ہے، مسائل علمیہ سے تو کوئی بحث ہی نہیں ہے مضمون آفرینی کے اعتبار سے بھی چنداں تنکل امتیاز نہیں رکھتا ہے ؛

حافظ

بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن
مرو بصومعہ کانجا سیاہ کارانند
تو دستگیر شو اے خضر پے خجستہ کہ من
پیادہ مے روم و ہمرہان سوارانند

غالب

تو سرمہ بین دو ورق در نورد و دم درکش
مبین کہ سحر نگاہاں سیاہ کارانند
ز دید و داد مزن حرف خرد سالانند
بہ گرد راہ منہ چشم سنے سوارانند

اب موازنہ ہی فضول ہے۔ ناظرین موازنہ کی زحمت سے عاجز کو معاف فرمائیں۔ اسے حضرات نکتہ دان حافظ کی شہرت بے وجہ نہیں ہے اگر کوئی شاعر دماغ حکیمانہ نہ رکھتا ہو تو کبھی حافظ کی راہ میں قدم نہ رکھے۔ مجرد زبان دانی یا مسلمات سے حافظ کی سی شاعری نصیب نہیں ہو سکتی۔

غزل غالب

دلستانان تغافل از چہ جفا نیز کنند | از وفائے کہ نہ کردند حیا نیز کنند
چوں بہ بینند بہ ترسند و بہ یزداں گردند | رحم خود نیست کہ بر حال گدا نیز کنند
خستہ تا جاں نہ دہد وعدۂ دیدار دہند | عشوہ خواہند کہ در کار قضا نیز کنند
خوں ناکامی سی سالہ ہدر خواہد بود | مہر با ما اگر از بہر خدا نیز کنند
اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت | کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند
اندر حقائق خزاں دیدہ بیا شم کانہا | ناز بر تازگی برگ و نوا نیز کنند
گر بود کوتہی از عمر تو دانی و اجل | گفتہ کار بہ ہنگام روا نیز کنند
[illegible] رنداں بصبوحی کایں قوم | نفس باد سحر غالیہ سا نیز کنند

گفتہ باشی کہ ز ما خواہش دیدار خطاست — ایں خطائے ست کہ درد درد جزا نیز کنند
حلق غالب نگر و دشنۂ سعدی کہ سرود
خوبرویان جفا پیشہ وفا نیز کنند

سعدی کی غزل کے ساتھ اس غزل کا موازنہ ہی فضول ہے، کیوں حضرت غالب نے اس زمین میں غزل لکھی، اس کی ضرورت معلوم نہ ہوئی، اس غزل میں صرف ایک شعر قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے ؎

اندراں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گذشت — کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

اس شعر کے سوا جتنے اشعار ہیں زنہار اس قابل نہیں ہیں کہ سعدی کے اشعار کے ساتھ پڑھے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ غزل سرائی بہت دشوار چیز ہے یہ بڑے حکیم کا کام ہے اور وہ بھی وہ حکیم جس نے غزل سرائی کی خلقی صلاحیت پائی ہے اگر مجرد حکمت مآبی غزلگوئی کی متقاضی ہوتی تو ارسطو بوعلی سینا، ملا صدرا، یہ سب کے سب غزل گو ہوتے، غزل گوئی خاقانی، مولوی معنوی اور نوری کو تو نصیب ہی نہ ہوئی جو بڑے درجہ کے شعرا گذرے ہیں مگر حضرت غالب پر بہت تعجب گذرتا ہے کہ آپ اُردو کے نہایت اچھے غزل گو ہیں، اگر اُن کے دیوان سے وہ اشعار خارج کر دیئے جائیں جو کثرت استعارات کثرت اضافات و کثرت اغلاق سے بدنما نظر آتے ہیں تو اُن کے اُردو کے کلام منتخب کا جواب نہیں پایا جائے گا۔ بہت جائے حیرت ہے کہ اُن کی اُردو کی غزلیں سوز و گداز و خستگی دلشربت و دل گرفتگی و پرتاثیری کے مزے سے قریب قریب میر کی غزلوں کی طرح بھری ہوئی ہیں، مگر فارسی کی غزلیں ان

صفات سے جو غزلگوئی کی شان سے ہیں، تمامتر معرا نظر آتی ہیں، فقیر کی دانست میں مرزا غالب فارسی کی غزلگوئی کے اعتبار سے فارسی کی قصیدہ گوئی میں زیادہ دخل رکھتے ہیں جیساکہ آئندہ ظاہر ہو گا ؛

حضرات حقیقت آگاہ سے مخفی نہیں ہے کہ غزل گوئی کے لئے تمامتر داخلی مضامین درکار ہوتے ہیں مگر جن شاعروں نے خواہ فارسی اور اُردو میں شاعری کا خارجی پہلو اختیار کیا ہے' اُن کی غزل سرائی کبھی پرتاثیر نہیں پائی جاتی ہے۔ غزل سرائی خارجی پہلو کی متقاضی نہیں ہے' خارجی مضامین کا باندھنے والا غزل گو' گو کس قدر نازک خیال خلاق سخن زور آور اور بلند پرواز ہو، کبھی اپنے کلام سے دل پر حسب مراد اثر پیدا نہیں کر سکتا، چنانچہ فارسی میں مرزا صائب اور اُردو میں شیخ ناسخ باوجود بڑے پرگو شاعر ہونے کے کلام کے اُس حسن مقبولیت سے محروم ہیں، جو حافظ اور میر کو نصیب ہوا ہے۔ مرزا صائب کس قدر کثیر الکلام ہیں اور علاوہ بڑی طباعی کے نفاست خیالات اور نزاکت مضامین میں بے نظیر ہیں، مگر اُن کی سیکڑوں غزلیں پڑھ ڈالیئے تو بھی اس کا اثر حافظ کی ایک غزل کے برابر بھی نہیں ہوتا ہے۔ اُس کی اور کوئی وجہ نہیں ہے' اِلّا یہ کہ صائب غزل گوئی کے تقاضے کے خلاف کاربند رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ صائب کی سخن سنجی نے فارسی کے لٹریچر کے میدان کو بہت وسیع کر دیا، مگر اس توسیع سے خود غزل سرائی کو کوئی نفع نہ ہوا۔ یہ صنف شاعری جس درجہ کو حافظ کی طبیعت داری سے پہنچ چکی تھی' اُسی درجہ تک قائم رہی ہے' سرمو بھی اس سے ارفع نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ صائب اور ناسخ نے ایک ایسی صنف شاعری کی ایجاد

کی ہے جو غزل سرائی اور قصیدہ گوئی کے درمیان کی ہے، کاش یہ دونوں شاعر گرامی اور کسی صنف شاعری کو ترقی دیتے یا اور کسی صنف کے موجد ہوتے، تو شاعری کو اُن کی سخن سنجی سے زیادہ نفع پہنچتا، خیر جاننا چاہیئے کہ مرزا صائب کی غزل سرائی کا رنگ مرغوب نہیں ہے۔ کس واسطے کہ اُن کا رنگ غزل سرائی کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے، ذیل میں مرزا صائب کی غزلیں نذر ناظرین ہوتی ہیں :-

غزل

در سخن گفتن خطائے جاہلان پیدا شود — تیر کج چون از کمان بیرون رود رسوا شود

پردۂ پندار سد راہ وحدت گشتہ است — چون حباب از خود کند قالب تہی دریا شود

در مقام حیرت دیدار حرف و صوت نیست — طوطی از آئینہ حیرانم کہ چون گویا شود

دست بپائے باغبان بوسیدن از دل ہمتی است — سعی کن تا بیضۂ گنبد این دیر بدیت وا شود

مہر خاموشی چہ سازد با لب پرشور من — حلقۂ گرداب چون مہر لب دریا شود

گوہرے دارم کہ گر از جیب بیرون آورم — از فروغش پایۂ میزان ید بیضا شود

دست رد بر سینۂ دریا گزار و چون صدف
ہر کہ صائب آشنائے عالم بالا شود

دیگر

عشق یکساں جنس درویش و توانگر می کشد — این ترازو سنگ و گوہر را برابر می کشد

آفتاب روز محشر بیشتر می سوزدش ہر کہ اینجا درد و داغ عشق کمتر می کشد

تا بکام دل کند جولان سمند شوخ ما انتظار گرمی صحرائے محشر می کشد

آتشین روئے کہ من پروانۂ او گشتہ ام ہر شرار آتش رو غیرت از چشمم سمندر می کشد

بیمی از مردن ندارد شعلۂ بیباک ما شمع ما گردن بامید صبا بر می کشد

نیست بر ناشستہ رویان جہان ارزان اشک ایں رقم را عشق بر رخسار جوہر می کشد

سر ز جیب صبح بر می آورد چون آفتاب
ہر کہ صائب در دل خود میکدہ ساغر می کشد

ظاہر ہے کہ مرزا صائب غزل سرائی میں تمام تر شاعری کا خارجی پہلو برتتے ہیں ذیل میں اُن کی ایک اور غزل بھی عرض کی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ اُسی زمین کی حافظ کی بھی ایک غزل پیش کی جاتی ہے دونوں غزلوں کے معاینہ سے ظاہر ہوگا کہ جس قدر صائب غزل میں خارجی پہلو کو ملحوظ رکھتے ہیں اُسی قدر حافظ داخلی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں اس موازنہ سے یہ بات بھی عیاں ہوگی کہ غزل سرائی میں داخلی پہلو کیا لطف سخن پیدا کرتا ہے اور اس لئے اس صنف شاعری میں اس پہلو کی کس قدر ضرورت ہے ✢

غزل صائب

اے غنچہ لب کہ سر بہ گریبان کشیدۂ در پردہ و پردۂ عالم دریدۂ

برق سبک عنانی و کوہ گران رکاب در ہیچ جا نۂ و ہمہ جا رسیدۂ

تمکین نطق و معنی شوخیست در توجمع در جلوۂ و پائے بدامن کشیدۂ

بر پیر من غریب تر از یوسفی بحسن | در مصر ساکنی و بکنعان رسیدهٔ
چشم بد از تو دور که چون طفل فتنک من | هر کوچه که هست به عالم دویدهٔ
در پلهٔ غرور تو دل گرچه بے بہاست | ارزان بده ز دست که ارزان خریدهٔ

غیر از نگاه چشم که از دور میکنیم
ای سنگدل ز صاحب مسکین چه دیدهٔ

غزل حافظ

از من جدا مشو که توام نور دیدهٔ | آرام جان و مونس قلب رمیدهٔ
از دامن تو دست ندارند عاشقان | پیراهن صبوری ایشان دریدهٔ
از چشم بخم دهر مبادت گزند زانکه | در دلبری بغایت خوبی رسیدهٔ
منعم مکن ز عشق وی ای مفتی زمان | معذور دارمت که تو او را ندیدهٔ
پیام به پیرسد زمن دیگر از نشاید | تا سوئے من بچشم عنایت تو دیدهٔ
داری خیال پرسش عشاق بینوا | گویا که بوسهٔ صدق ز لبشان شنیدهٔ

این سرزنش که کرد ترا دوست حافظا
بیش از گلیم خویش مگر پا کشیدهٔ

فارسی اور اُردو کا مختصر بیان

واضح ہو کہ یہ مختصر بیان کتاب کا کسی زبان کی تحقیق نہیں ہے مگر چونکہ ہمارے ملک بہت اشخاص ایسے ہیں کہ فارسی اور اُردو کے تاریخی حالات سے مطلع نہیں ہیں اس لئے ان دونوں زبانوں کا مختصر بیان خالی از نفع نہ ہوگا

حقیقت حال یہ ہے کہ جو اس وقت مروج فارسی ہے یہ زبان کیانیوں کی نہیں
تھی اُن کے زمانہ میں جو زبان بولی جاتی تھی اُسی سے انقلابات کثیر کے بعد
حال کی فارسی پیدا ہو گئی ہے۔ اس موجودہ زبان کو بھی قائم ہوئے پندرہ سو سال
سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے، جو زبان کیانیوں میں اُن کے ابتدائی وقت میں جاری
تھی۔ وہ یا قوم آریہ کی زبان تھی، یا قوم آریہ کی زبان سے بہت مشابہت رکھتی
تھی، معلوم ہوتا ہے کہ قوم آریہ نسل ایرج سے تھی۔ اور لفظ ایران بھی ایرج ہی سے
مشتق معلوم ہوتا ہے اور یہ امر غلط نہیں ہے، اس واسطے کہ کیانیوں کے خاندان
کی اصل ایرج سے ثابت ہوتی ہے پس کوئی تعجب نہیں کہ جس ملک میں نسل
ایرج نے قرار لیا وہ ایران کہلایا، زردشت کے وقت کی زبان ابتدائی
کیانیوں کی زبان سے علحدہ نظر آتی ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ انقلابات قبول
کرکے وہ زبان پیدا ہو گئی جو زبان ژند کی اور فردوسی کی ہم لوگ پاتے ہیں
اور جسے زبان فارسی کہتے ہیں، قوم آریہ جس نے چار ہزار برس پہلے ہندوستان
کو فتح کرکے اس ملک میں توطن اختیار کیا تھا وہ آریہ زبان بولتی تھی، آریہ
زبان کیا تھی؟ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی سنسکرت زبان تھی، مگر جب
ہندوستان میں قوم آریہ نے وطن اختیار کیا اور اس ملک کے سکنائے مغلوب
سے آمیزش پیدا کی تو اُن کی شستگی زبان میں خلل لاحق ہونے لگا اور رفتہ رفتہ
اس آمیزش سے ایک زبان غیر سنسکرت جسے پراکرت کہتے ہیں، پیدا ہو گئی،
جب قوم آریہ نے دیکھا کہ سنسکرت کی شستگی اور صفائی میں بہت خلل واقع
ہوتا ہے تو قواعد صرف و نحو کے قائم کرکے اور الفاظ غیر سنسکرت کو دور

کرکے اپنی زبان کی پوری اصلاح کرڈالی اور یہ زبان خاص برہمنوں کی قرار
پائی، لیکن جو زبان پراکرت جاری ہوچکی تھی اس تصحیح و تحقیق سے اُس کا
انداس نہ ہوسکا، اسی پراکرت زبان کی ایک قسم بھاشا ہے اور بھی مختلف
دیسوں میں اسی طرح کی ممزوج زبانیں جاری ہیں جب برہمنوں کے مذہب
کو بُودھ نے مغلوب کرڈالا تو یہی پراکرت سنسکرت کے قائم مقام سمجھی جانے
لگی اور سنسکرت سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا، پندرہ سو برس کا عرصہ ہوتا ہے
کہ شنکر اچاریہ نے مذہب بُودھ کو شکست دی اور مذہب براہمہ کی تجدید کی
تو اس نے سرنو سے سنسکرت کو رواج دیا، مگر زبان پراکرت رواج پا چکی تھی۔
عوام الناس میں یہی زبان جاری تھی؛ لیکن جب اسلام نے ظہور فرمایا اور اہل
عرب شروع شروع سندھ میں پہنچے تو سندھیوں کی زبان جو پراکرت کی ایک
قسم تھی۔ عربی لفظوں سے مزاج پکڑنے لگی پھر مختلف اقوام کے شاہان اسلام
ہندوستان پر حملہ آور ہوتے گئے، حتیٰ کہ اسلامی سلطنت ہندوستان میں قائم ہوگئی اُس
وقت سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول زیادہ ہونے لگا، زبان بھاشا جو
ہندوؤں میں جاری تھی، اُس میں فارسی عربی کے اکثر الفاظ کثرت سے داخل ہو
گئے، خاص کر لشکروں میں ایک خاص زبان بولی جانے لگی، اس مرکب زبان کا نام اردو
ہوگیا، اُردو لشکر کو کہتے ہیں، پس وجہ تسمیہ اس کی یہی ہوئی کہ یہ زبان لشکریوں سے
شروع ہوئی، رفتہ رفتہ اس زبان نے شکل امتیاز پکڑی حتیٰ کہ عہد اکبر میں معلوم ہوتا
ہے کہ یہ زبان ایسے انداز کی ہوگئی تھی کہ اس وقت کے اُردو دان بھی اُس عہد کی
زبان بخوبی سمجھ سکتے ہیں، اکبر کی رباعی ذیل میں درج کی جاتی ہے، جس سے معلوم

ہوگا کہ اُردو عہدِ اکبر میں کتنی حیثیت کو پہنچ چکی تھی بلکہ اس رباعی کی نشستِ الفاظ
ترکیب نحوی ایسی معقول ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں کسی طرح کی کھنگی محسوس
ہوتی ہے ؎

پوچھے جو گھڑی مجھ سے براہ عادت | تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت | ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہر ساعت

جب اکبر کے وقت میں اُردو اتنی صورت پکڑ چکی تھی تو اس زبان کی پوری درستگی میں
کوئی بہت تردد کا امر باقی نہیں رہا تھا یوں تو کہتے ہیں کہ امیر خسرو کے وقت
سے اس زبان میں بطور تفنن شعراء شعر کہا کرتے تھے مگر اکبر کے عہد کی زبان تو خوب
ایسی ہو چکی تھی کہ اس میں اصناف شاعری کا برتنا دشوار نہ تھا لیکن چونکہ یہ زبان
فارسی کے مقابل میں پایۂ وقار نہیں رکھتی تھی اس زبان میں لوگ جو کچھ موزوں
کرتے تھے اسے کسی قسم کا اعتبار حاصل نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ جو اس زبان میں شاعری
کو رواج زیادہ ہوتا چلا۔ تو اس زبان کا پایۂ اعتبار حاصل ہو گیا پہلا شاعر جس نے اس
زبان کو شستہ کر دیا ولی دکنی تھا پھر میر و مرزا کے وقت میں یہ زبان پوست بطور
پر قابل توجہ ہو گئی۔ پھر لکھنؤ میں اس کو عروج ہوا۔ ناسخ نے اسے خراش تراش
کر کے ایک خوبصورت زبان کر ڈالی۔ آخر کو میر انیس نے اسے ایسا بنا دیا کہ
اس وقت بلاشبہ قریب قریب جواب فارسی ہو رہی ہے الغرض پہلے قوم آریہ
نے اپنی زبان قدیمی کو رواج دیا۔ بعد ازاں اس سے بھاشا پیدا ہوئی پھر اُس
بھاشا میں فارسی عربی کے لفظوں کی آمیزش ہو گئی اور پھر بہت سے انقلابات
کے بعد وہ زبان پیدا ہو گئی جسے اُردو کہتے ہیں۔ اب اس زبان میں مختلف زبانوں

کچھ لفظ داخل ہو گئے حتیٰ کہ انگریزی الفاظ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں مگر ابھی تک
اس زبان کو بہت الفاظ کی ضرورت ہے، اگر عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت کے
الفاظ کثرت کے ساتھ داخل کئے جائیں تو اس زبان کی کیفیت انگریزی زبان کی
ہو جائے گی۔ اور جیسی انگریزی زبان وسیع ہے اسی طرح اس کو بھی ہر طرح کے خیالات
علمیہ کے اظہار کی وسعت حاصل ہو جائے گی، فقیر نے کیمسٹری وغیرہ کی کتابوں میں
الفاظ انگریزی کو قائم رکھا ہے اور کوئی لفظ اپنی طرف سے ایجاد نہیں کیا ہے
ایجاد کرنے کا فائدہ کوئی نہیں ہے کس واسطے کہ الفاظ ایجاد شدہ اصلی الفاظ سے
کم وحشت خیز نہیں ہوتے ہیں جن صاحبوں نے الفاظ ایجاد کئے ہیں وہ
وحشت خیز ہونے کے علاوہ مضحک انگیز بھی ہیں مثلاً پیریلل لائنس یعنی خطوط
متوازیہ کا ترجمہ بیچ برابر نان یا روغن چراغ گرچہ گند۔ یہ ایجاد بندہ کا مزا دیتا ہے
فقیر کی دانست میں اردو ابھی تک لفظوں کی محتاج ہے علمی خیالات اس زبان
میں سنسکرت، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ کی مدد کے بغیر ادا نہیں کئے جا سکتے ہیں
پس لازم ہے کہ اس زبان کو ایشیائی اور یورپین زبانوں کے لفظوں سے اعانت
دی جائے، مگر راقم کے اس خیال کے ساتھ شاید کمتر اہل زبان اتفاق فرمائیں گے،
چنانچہ ایک صاحب نے جو اہل زبان ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، فقیر کے لفظ
مغربل کے استعمال کرنے پر اعتراض فرمایا تھا اس کی حقیقت یہ ہے کہ راقم
نے اپنی کتاب موسومہ بہ "کیمیائے زراعت" میں لفظ مغربل کو استعمال کیا ہے
معترض نے یہ فرمایا کہ لفظ غیر مانوس ہے اس کو اردو میں نہیں استعمال کرنا
چاہئے، اس اعتراض کی وجہ فقیر کی سمجھ میں نہ آئی یہ لفظ ارباب علم میں غیر مانوس

کیونکہ ہے اس کی تو وجہ معترض صاحب نے کچھ نہ فرمائی، شاید معترض صاحب کے
گوش مبارک تک یہ لفظ پہنچا ہی نہ تھا، ورنہ فقیر تو ہمیشہ نسخوں میں لکھتا چلا آیا
اور اُستادوں کو اپنی طرح لکھتے ہوئے دیکھا گیا، فرقہ اطبا میں یہ لفظ متعارف
حیثیت رکھتا ہے اور ہمیشہ استعمال میں لایا جاتا ہے علمی تصنیفوں میں اس کا
استعمال کیونکر معرض اعتراض ہو سکتا ہے راقم نے اس لفظ کو کسی غزل، خمسہ،
مثنوی واسوخت وغیرہ میں استعمال نہیں کیا تھا جس کتاب میں استعمال کیا ہے
وہ کتاب علم کیمسٹری سے بحث رکھتی ہے، علم کیمسٹری علم طب کا ایک جزو
ہے۔ پس یہ لفظ جو طبی حیثیت استعمال رکھتا ہے، اگر علم کیمسٹری کی کتاب میں
استعمال کیا جائے تو معترض کو زبان کھول لینے کا موقع کیا ہے، الختصر ہوا خواہان
اُردو کا فرض منصبی ہے کہ اس زبان کے وسیع کرنے میں ہر طرح کے اُمور کو ملحوظ
رکھیں اور حسب ضرورت مختلف زبانوں سے الفاظ کے اخذ کرنے میں مضائقہ نہ
فرمائیں، مگر اس سے مراد راقم یہ نہیں ہے کہ بلا ضرورت بھی کسی زبان سے الفاظ
لے لیے جائیں جیسا کہ اس زمانہ میں بدلحاظ اشخاص انگریزی لفظوں کو اُردو
میں نہایت بے ڈھنگی اور بدترکیبی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور درحقیقت
کوئی ایسی زبان بولتے ہیں کہ نہ وہ انگریزی ہے اور نہ اُردو، اس کی مثال یہ تقریر
ہے "جب ہم شام کو واک کر کے آئے تو بہت ٹائرڈ معلوم ہوئے فوراً ایک
چیئر پر بیٹھ گئے اس کے بعد طبیعت کو اسموک کرنے کی خواہش ہوئی، نیچر نے
بھی سیگار کو کینڈل سے لایٹ کر لیا، اس نے مائینڈ پر سوونگ ایفکٹ پیدا کیا۔"
ظاہر ہے کہ ان انگریزی لفظوں کے استعمال کی کوئی حاجت نہیں ہے اُردو زبان

بحالت موجودہ ایسی محتاج نہیں ہو رہی ہے کہ بلا ضرورت اس میں اس قسم کے الفاظ ٹھونسے
جائیں مگر فی زمانہ بدلحاظی اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ اشخاص خام و سیع و خام زبان اسی نہج سے اس میں
کو کرتے ہیں مختصر اردو اس وقت بھی محتاج وسعت معلوم ہوتی ہے اس کی طرف حضرات اہل زبان کی توجہ درکار
ہے ہر چند زمانہ خود مائل توسیع ہے مگر ظاہراً زمانہ کی اعانت بہی خواہان زبان کی جانب
سے کمتر دیکھی جاتی ہے جو حضرات اس عہد کے نقادان سخن ہیں اُن کو مجرد متروکات
وغیرہ کی فکر رہا کرتی ہے اس اصلاح سے زبان وسیع ہونے کے عوض اور بھی تنگ
ہو چلی ہے۔ فقیر کی دانست میں لفظ مت اُسی قدر فصیح ہے جتنا کہ لفظ نہ ہے یہی
طرح تک اور تلک فصاحت میں برابر ہیں اس طرح کی اصلاح سے درحقیقت
زبان کو کوئی فائدہ نہیں ہے ایسی اصلاحیں زیادہ بکار آمد نہیں ہو سکتیں بہت خوب
ہے نا گوار مت اور نہ جتک اور تلک واعظا اور اسے واعظ وغیرہ وغیرہ یہ سب کے
سب محاورے مانے جاتے' اہل انصاف غور فرمائیں کہ ان سب متروکات کو ملحوظ
رکھنا غزل سرائی میں تو کس قدر آسان معلوم ہوتا ہے مگر التزام متروکات کے ساتھ
رامائن یا مہابھارت کی سی ضخیم کتاب کو تصنیف کرنا خالی از دقت متصور نہیں ہے
ظاہراً متروکات پر حضرات اہل زبان کو اس توجہ بلیغ کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے
کہ اُردو کی شاعری زیادہ تر غزل سرائی وغیرہ میں محدود ہو رہی ہے اور چونکہ
غزل سرائی میں کوئی جدت کا پہلو باقی نہیں رہا ہے اس واسطے لفظی جدتوں کی طرف
ناچار مائل ہونا پڑا ہے ؛

اُردو کی نظم و نثر کی مختصر تاریخ

کب نظم و نثر نے اُردو میں رواج پکڑا۔ اِس کی نسبت کوئی محققانہ قول دکھائی نہیں دیتا، کہتے ہیں کہ اِس زبان میں انشا پردازی کی ابتدا عہدِ تیمور میں ہوئی، اِس بادشاہ کے ہندوستان پر تسلط کا زمانہ ۱۳۹۸ء ہے بعض مصنفین یہ بھی لکھتے ہیں کہ اُردو کی نظم و نثر اِس کے بہت پہلے رواج پا چکی تھی۔ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں مسعود بن سعد نے ایک دیوان بزبان اُردو ترتیب دیا تھا، علاوہ اِس کے سعدی اور خسرو نے بھی سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں اس زبان میں طبع آزمائیاں کی تھیں۔ ظاہرا یہ سب اقوال پایۂ تحقیق سے بہت بعید نظر آتے ہیں بہرحال ذیل میں وہ امور حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں جن کی صحت کتابی وسائل سے درجۂ یقین رکھتی ہے۔

جاننا چاہیئے کہ اُردو کی انشا پردازی کا مبداء ملک دکن۔ گولکنڈہ اور بیجاپور ہیں اس زبان نے ایک ممتاز صورت پیدا کی' ان دونوں مقاموں کے بادشاہوں کو اس زبان کی ترقی ملحوظ رہی، گولکنڈہ میں شجاع الدین نوری نے غزلیں لکھیں۔ ابن نشاطی نے دو مثنویاں معروف بہ طوطی نامہ و پھول بن تصنیف کیں۔ تحسین الدین نے بھی ایک مثنوی لکھی؛ اِس مثنوی میں کامروپ اور کیلا کی کہانی منظوم ہے۔ کامروپ، اودھ کا راجہ تھا اور کیلا سراندیپ کے راجہ کی بیٹی تھی۔ یہ ایک دلچسپ عشقیہ مثنوی ہے اور بڑے شاعرانہ مذاق سے خبر دیتی ہے اسی طرح بیجاپور میں نصرتی نے جو ایک برہمن تھا دو مثنویاں معروف بہ گلستان عشق

دعلی نامہ تصنیف کیں، یہ سب شعرا اورنگ زیب سے بہت پہلے گزرے ہیں۔ ان کے بعد ولی اور سراج نے اپنے حسن طبیعت سے اُردو کو زینت بخشی۔ ان دونوں شاعروں کے نشو و نما کا زمانہ سنہ ۱۶۸۰ء سے لے کر سنہ ۱۷۲۰ء تک معلوم ہوتا ہے مگر جب شاہان دکن کو اورنگ زیب نے زیر و زبر کر ڈالا تب اُردو نے اپنے مولد سے جلاوطنی اختیار کر کے دلی کو اپنا مسکن بنایا۔ ولی کا دیوان پہلے پہلے اس دار الخلافہ میں ۱۷۱۹ء میں پہنچا یہ سن محمد شاہ کے جلوس کا دوسرا سال تھا شاہ حاتم نے ولی کی تقلید شروع کی اردو دیوان لکھے، شاہ حاتم کے ہمعصر ناجی مضمون اور آبرو تھے، ان لوگوں نے بھی خوب خوب غزل سرائیاں کیں شاہ حاتم ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹۲ء میں رحلت فرمائی، دلی میں اُردو شاعری کے رواج دینے والے شاہ حاتم ہی گزرے ہیں ان کے نامی شاگردوں میں مرزا رفیع سودا ہیں اور ایسے شاگرد ہیں کہ بڑے بڑے استادوں کو اُن کی شاگردی پر ناز کرنا درست دیکھا ہے، پھر دلی کے نامی اُستادوں میں خان آرزو بھی تھے، ان کا سن پیدائش ۱۶۸۹ء اور سن ممات ۱۷۵۶ء ہے۔ میر تقی میر اُن کے شاگردوں میں تھے، گو غزل سرائی میں اپنا تمام ہندوستان میں جواب نہیں رکھتے تھے، حملہ نادر کے بعد خان آرزو لکھنو کو چلے گئے اور اسی شہر میں ودیعت حیات فرمائی، اسی طرح دلی کے پُرانے شاعروں میں انعام اللہ خان یقین تھے اُنھوں نے ۱۷۵۴ء میں بعہد احمد شاہ پچیس (۲۵) برس کے سن میں انتقال کیا۔

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

ان اساتذہ کے ہمعصر خواجہ میر درد بھی تھے اور ایسے صاحب کمال تھے کہ آج

تک اُن کا نام نامی السنۂ خلائق پر جاری ہے اور تا مرور دہور جاری رہے گا ؛
واضح ہو کہ دہلی کی بربادی کے بعد اُردو کے اکثر شعرائے نامی نے لکھنؤ میں آ کر
پناہ پکڑی، خان آرزو حملۂ نادر کے بعد ہی ۱۷۳۹ء میں لکھنؤ کو چلے آئے۔ اسی طرح
مرزا رفیع سودا۔ میر تقی میر۔ میر حسن۔ میر سوز۔ قلندر بخش جرأت بھی ترک وطن
کر کے وارد لکھنؤ ہوتے گئے اور علاقہ اودھ ہی میں رحلت فرماتے گئے۔ میر حسن
کی وفات ۱۷۸۶ء میں سوز کی ۱۸۰۰ء میں اور جرأت کی ۱۸۱۰ء میں واقع
ہوئی۔ میر حسن ایک اچھے غزل سرا تھے مگر اُن کی شاعری کی شہرت کی وجہ اُن کی
مثنوی معروف بہ سحر البیان ہے یہ وہ مثنوی ہے کہ اپنا جواب نہیں رکھتی ہے
اس کی خوبیوں کی بحث آئندہ آنے کو ہے۔ میر محمد سوز بڑے طباع تھے
اور تخیل میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ جرأت کی طبیعت نادری بھی مشہور دیار و
امصار ہے اور فی الواقع اُن کی شاعری قابل لحاظ ہے ان کاملین کے ترک
وطن کرنے سے البتہ دلی خالی ہو گئی مگر اُس سرزمین میں پھر نامی شعرا پیدا ہوتے
گئے ذوق نے سرے سے شاعری کو چمکا دیا۔ مومن خان نے ملک سخن میں خوب
ہی اپنا سکہ جمایا، غالب نے میر تقی میر کے زمانے کو زندہ کر ڈالا۔ مصحفی
نے بھی لکھنؤ سے آ کر دلی میں خوب خوب شاعری کے لطف دکھائے۔ اور
دلی ہی کے ہو کر رہ گئے۔ آخر شاعر دلی کے غالب ہیں انہیں کے ساتھ دلی کی
شاعری رخصت ہو گئی، اُن کی وفات کا سن ۱۸۶۹ء ہے۔ جاننا چاہیے کہ
جس وقت اُستادان دہلی لکھنؤ نہیں پہنچے تھے اس شہر میں اُردو کی شاعری کو
کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ تھا مگر ان حضرات کے آنے سے لکھنؤ میں ہر سمت دھومیں

مچ گئیں۔ طبیعت داروں نے سخن سنجی کے مشغلے اختیار کیئے، شاعری کی نئی روشیں ایجاد ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ دلی کی شاعری سے ایک علیٰحدہ رنگ کی شاعری ظہور ہوائی یعنی اُستاد ناسخ نے غزل سرائی کا ایک خاص رنگ پیدا کیا اور آتش بھی صنف شاعری کو دلی والوں سے الگ ہو کر برتنے لگے پھر اِن دونوں اُستادوں کے شاگردوں نے غزل سرائی کی مختلف راہیں نکالیں اور اپنے اپنے کمالات کی بدولت مشہور دیار و امصار ہوتے گئے، اِن دونوں اُستادوں کے مشہور شاگردوں میں خواجہ وزیر گویا مقبول برق سحر رند اور صبا ہیں ہر ایک اِن میں اُستاد کا درجہ رکھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ جیسے شاگرد ان نامی ان دونوں شاعران گرامی کو نصیب ہوئے، کمتر کسی اُردو کے شاعر کو نصیب ہوئے ہیں ؛

اہل انصاف سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر چند لکھنؤ میں اُردو کی غزل سرائی نے بہت کچھ فروغ پکڑا۔ مگر دلی والوں کی غزلیت کا لُطف غزل سرایاں لکھنؤ اپنی غزلوں میں پیدا نہ کر سکے، سچ یہ ہے کہ غزل سرائی دلی والے کر گئے، لیکن مسدس نگاری حضرات اہل لکھنؤ نے ایسی کی کہ دلی والے کیا اہل شیراز اور اہل اصفہان کو بھی خواب میں نصیب نہ ہوئی، اگر مشعل لے کر بھی کوئی شخص تمام دنیا میں میر انیس اور مرزا دبیر کی مسدس نگاری کا جواب ڈھونڈھیگا تو بالیقین کہیں نہیں پائے گا۔ میر انیس نے اردو کی شاعری کو اپنی مسدس نگاری سے اس درجہ تک پہنچا دیا ہے کہ اس کی ہوا بھی فارسی اور عربی کی شاعری کو نہیں لگی ہے آیندہ میر انیس کی مرثیہ نگاری کی بحث آنے کو ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ رزمی شاعری میں میر انیس ہومر۔ ورجل۔ ملٹن اور فردوسی پر غالب ہیں اور اگر اُن کا جواب کوئی شاعر ہے تو

بالمثل ہے یا بیاس ہے المختصر کوئی شک نہیں کہ اُردو کی رزمی شاعری درجۂ کمال کو لکھنؤ میں پہنچی اور الحق یہ امر حضرات اہل لکھنؤ کے لئے ایک بڑا سرمایہ ناز ہے اسی طرح مرزا دبیر نے شاعری کا رتبہ ایسا کر دیا کہ اور زبانوں کی شاعری اُسے دیدۂ حیرت سے نگراں ہے، ارباب حقیقت سے پوشیدہ ہے کہ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری اُس درجہ کمال کو پہنچ گئی ہے کہ خود کمال شاعری ہو رہی ہے، اگر شعرائے لکھنؤ رزمی شاعری میں ایسا کمال پیدا نہیں کرتے تو مجرد غزل سرائی اور مثنوی نگاری کی بنیاد پر اُن کو شعرائے دہلی پر کسی طرح کی ترجیح حاصل نہ ہوتی۔ اس صنف شاعری کے فروغ دینے والے میر مونس صاحب بھی تھے، پھر میر وحید صاحب نے میر انیس صاحب کے زمانہ کو زندہ کرنا شروع کیا تھا کہ اجل نے مہلت نہ دی، حیف صد حیف، افسوس صد افسوس۔

گلے برفت کہ ناید بعد بہار دگر

آخر میں میر نفیس صاحب نے مرثیہ نگاری کو رونق بخشی، واحسرتا و دردا کہ اب وہ بھی نہیں ہیں، خاندان مرزا دبیر صاحب میں صرف اُن کے بیٹے مرزا اوج صاحب نام آور نکلے، خدائے تعالیٰ انھیں فردوسی سعدی اور میر تقی کی حیات فرمائے، فن شاعری کے لئے درازی عمر کی بڑی حاجت ہے، شاعری تب ہی جوان ہوتی ہے جب شاعر عالم پیری کو پہنچتا ہے، یوں تو کوئی شک نہیں کہ اس وقت بھی مرزا اوج ایک بڑے نامی گرامی شاعر ہیں، اور اُن کی طباعی مشہور دیار و امصار ہے لیکن اُن سے بہت کچھ اُمیدیں کی جاتی ہیں اور حق یہ ہے کہ وہ اُمیدیں ایسی ہیں کہ شاعر کے معمر ہوئے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں، یہ امر قابل

مگر یہ کہ مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری بہت کچھ جدت سے خبر دیتی ہے۔ ان کی شاعری نقالی نہیں ہے، ہرگز ایسی نہیں ہے کہ سو پچاس عمدہ مراثی سے مرزا صاحب اقتباس مضامین کر کے ایک خاص مرثیہ بنا لیتے ہوں۔ اس پر خوبی یہ ہے کہ روایات صحیحہ کو منظوم فرماتے ہیں اور خود ایجاد اقوال سے امام و خاندان امام علیہ السلام پر اتہام نہیں لگاتے ہیں ؛

واضح ہو کہ جب دہلی اور لکھنؤ میں اُردو کی شاعری نے ممتاز شکل پیدا کی تو اور شہروں میں بھی حضرات طباع نے سخن سنجی کا مشغلہ اختیار فرمایا، چنانچہ میر ولی محمد نظیر اکبر آبادی نے علاوہ مسدسوں کے بہت سی مثنویاں اور غزلیں لکھیں یہ شاعر مشہور دیار و امصار ہے اس کے نیچرل بیانات بہت قابل توجہ ہیں اس طباع کے کلام ایسے ہیں کہ نیچرل شاعری کی بخوبی داد دیتے ہیں اس شاعر گرامی نے سنہ ۱۸۳۲ء میں رحلت فرمائی، اسی طرح راسخ نے اپنی مثنویوں اور غزلوں سے پٹنہ کے نام کو روشن کیا اور مولوی وحید الہ آبادی نے اپنے وطن کی عزت افزائی کی حقیقت یہ ہے کہ دونوں شاعر بڑے غزل سرا گذرے ہیں، راسخ تو پٹنہ کے میر تھے اور وحید امیر المتغزلین ؛

اب حضرات ناظرین اُردو کی نثر نگاری کے تاریخی حالات پر نظر فرمائیں ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اس انیسویں صدی کی ابتدا میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ صاحب نے اُردو کی نثر کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی۔ چنانچہ اُردو کی درسی کتابیں اُن کے وقت میں تصنیف ہوئی گئیں۔ اُنھوں نے بڑے بڑے نثاران وقت کو جمع فرمایا۔ اُن کے عہد علم پروری میں حضرات مندرج ذیل کلکتہ میں مجتمع تھے

نمبر (۱) سید محمد بخش حیدری۔ ان کے تصانیف سے طوطا کہانی آرائش محفل۔ دہ مجلس۔ گلزار دانش اور تاریخ نادری ہیں ان کی وفات کا سن ۱۸۲۳ء ہے ؛

نمبر (۲) میر بہادر علی حسینی ۔ ان کے تصانیف سے نثر بے نظیر اور اخلاق ہندی ہیں حسینی نے ۱۸۰۶ء میں وفات پائی ؛

نمبر (۳) میر امن لطف۔ ۱۸۰۲ء انھوں نے باغ و بہار تصنیف فرمائی۔ اسی سن میں انھوں نے نسخہ گنج خوبی کو بھی شائع کیا ؛

نمبر (۴) حافظ الدین احمد: انھوں نے ۱۸۰۳ء میں خرد افروز لکھی۔

نمبر (۵) شیر علی افسوس: ان کے تصانیف سے دو کتابیں ہیں ایک آرائش محفل اور دوسری باغ اردو۔ سن وفات ۱۸۰۹ء ہے ؛

نمبر (۶) نہال چند لاہوری: کتاب مذہب عشق جو گل بکاؤلی کا ترجمہ ہے، اُن کے تصانیف سے ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۴ء میں اتمام کو پہنچا ؛

نمبر (۷) کاظم علی جوان، سکنتلا کے مترجم ہیں علاوہ اس کے ایک کتاب معروف بہ بارہ ماسہ بھی لکھی، ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے ؛

نمبر (۸) للولال قوی: یہ گجراتی برہمن تھے اُنھوں نے چند ہندی کی کتابیں لکھیں، اُن کی اردو تصانیف سے لطائف ہندی ہے ؛

نمبر (۹) مظہر علی ولا، اُنھوں نے زبان اردو میں مادھونل کا قصہ ترجمہ فرمایا ؛

نمبر (۱۰۱) اکرام علی: اُن کی تصانیف سے اخوان الصفا ہے۔ اس کے اتمام کا سن ۱۸۱۰ء ہے اجماع شارانِ بالا سے ہویدا ہے کہ گلکرسٹ صاحب کو اردو کی نثر جو اس وقت میں دیکھی جاتی ہے اس کی ابتدائی ترقی صاحب موصوف کی کوششوں کا نتیجہ ہے، کوئی شک نہیں کہ اس وقت سے اُردو کی نثر نگاری میں بیّن ترقیاں ہوتی گئیں مگر انصاف یہی ہے کہ مصنفین بالا اُردو کی نثر کے راہ بتانے والے تھے، اُنھیں مصنفوں کی نثاریوں نے سکنائے ہندوستان کو نثر نگاری کی طرف مائل کر دیا۔ پھر تو کتنے اخبارات جاری ہوتے گئے، اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں تصنیف ہوتی گئیں۔ مرورِ ایام سے یورپین مذاقِ تحریر بھی پیدا ہوتا گیا اور چند ابھی تک بمقابلہ یورپین زبانوں کے اُردو ایک بے حقیقت زبان ہے، تو بھی اس سو برس کے اندر یہ زبان ترقی سے خالی نہیں رہی اس عہد کے نام آور نثر نگار سر سید احمد خان بہادر، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خان بہادر ہیں ان حضرات کی تحریریں شائستہ اقوام کے نثاروں کے انداز کی ہوتی ہیں نثر کی ممتاز کتابوں میں غالب کی اُردوئے معلیٰ بھی ہے مگر سوائے عمدگی زبان کے اس میں خیالات کا لطف کمتر ہے، یہ کتاب ایسی نہیں ہے کہ اڈیسن وغیرہ کی تحریروں کے ساتھ اس کو کسی طرح کا مقابلہ حاصل ہے

فارسی کے شعرائے متغزلین کے بیان کے بعد اب اُردو کے شعرائے متغزلین کی نسبت کچھ مضامین ذیل ہوتے ہیں جن سے اُردو کی غزل سرائی کی حالت موجودہ ظاہر ہوگی:

ہندوستان کے اُن حصوں میں جہاں اُردو بولی جاتی ہے، مستند غزل سرائی

صرف دو جگہوں کی سمجھی جاتی ہے، یعنی دہلی اور لکھنؤ ! ان دونوں شہروں کی صرف غزل سرائی ہی مستند مانی نہیں جاتی ہے بلکہ جمیع اصناف شاعری بھی۔ زبان کے اعتبار سے تو یہ خیال بہت صحیح ہے، کس واسطے کہ ان دونوں جگہوں کے برابر کہیں کی زبان نہیں مانی جا سکتی ہے، مگر امر شاعری ایسا ہے کہ اس کو کسی خاص مقام سے تعلق نہیں ہے، چنانچہ بعض دیگر دیار کے ایسے شعر نظر آتے ہیں کہ جو اہل زبان نہ تھے مگر نفس شاعری میں ان کو پایۂ امتیاز حاصل تھا مثلاً پٹنہ میں شیخ غلام علی راسخ گذرے ہیں کہ ان کی توقیر میر تقی صاحب میر نے بھی فرمائی تھی مگر چونکہ اہل زبان کی شاعری حکم سند رکھتی ہے۔ راقم لکھنؤ اور دہلی کے شعرائے متغزلین کی غزل سرائیوں پر اپنے خیالات کا اظہار موقوف رکھتا ہے ؛

یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ دہلی کے حضرات متغزلین اکثر اپنی غزل سرائیوں میں شاعری کا داخلی پہلو ملحوظ رکھتے گئے ہیں، اس سبب سے ان کی غزل سرائیاں تقاضائے تغزل کے مطابق پائی جاتی ہیں میر حسن، خواجہ میر درد۔ میر تقی میر، سودا۔ مومن، غالب یہ سب شعرائے متغزلین اسی داخلی رنگ کے برتنے والے گزرے ہیں البتہ ذوق پورے طور پر داخلی پہلو کے برتنے والے نہ تھے تو بھی وہ خارجی پہلو کی آمیزش داخلی پہلو کے ساتھ اس رنگ سے کرا دیتے ہیں۔ کہ ان کا کلام سیٹھے ہونے سے بچ جاتا ہے برخلاف اس کے لکھنؤ کی غزل گوئی کا رنگ نظر آتا ہے اس جگہ کے اکثر شعرائے نامی غزل سرائی میں خارجی پہلو اختیار فرماتے ہیں یعنی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی قید کے پابند نہیں رہے ہیں۔ بلکہ تقاضائے غزل گوئی کے خلاف خارجی مضامین کو اپنی غزل سرائیوں میں کثرت

سے جگہ دیتے گئے ہیں اس جدت سے احاطۂ غزلگوئی تو وسیع ہوگیا مگر غزل سرائی سے جو غرض منصور ہے فوت ہوگئی ظاہر اس صنف شاعری کی علت غائیہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ دل مضامین درد انگیز سے متاثر و متالم ہو۔ طبیعت شوخیٔ کلام سے مزا اٹھائے جان کو سرمایۂ سوز و گداز حاصل ہو، اخلاقی قویٰ ترقی کر جائیں پس جب ان باتوں سے کوئی بات حاصل نہیں ہوئی تو غزل سرائی سے کیا فائدہ۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شعرائے لکھنؤ نے غزل سرائی کی ترقی کو ملحوظ رکھا۔ چنانچہ ناسخ نے نہ صرف اُردو کو اپنے کلام معجز نظام سے ایک شستہ پاکیزہ اور باقاعدہ زبان بنا ڈالا، بلکہ اُردو کے لٹریچر کو بھی دولت عالی خیالی سے مالا مال کر دیا۔ فی الواقع جیسی ترقی اُردو کو ناسخ کی بدولت نصیب ہوئی ویسی کسی دوسرے شاعر کی بدولت ظہور میں نہیں آئی، بیشک اُردو پر ناسخ کا بڑا احسان ہے، اگر ناسخ نہ ہوتے تو جیسی لکھنؤ کی زبان نفیس، فصیح، شستہ اور پاکیزہ ہو رہی ہے یہ خوبیاں اس کو نصیب نہ ہوتیں اس زبان کا منظوم لٹریچر بھی شیخ کی توجہ فرمائی کا بہت ممنون ہے اگر ناسخ نہ ہوتے تو اُردو میں کوئی شاعر مرزا صائب کا جواب نہ نکلتا، لیکن زبان اور لٹریچر کی ترقیوں کے ساتھ لکھنؤ میں اُردو کے نفس غزلگوئی کو فائدہ حاصل نہ ہوا، کس واسطے کہ ان سب ترقیوں سے میر کی غزل سرائی پر ترقی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی، حقیقت یہ ہے کہ میر کی غزل سرائی اپنے حال پر رہ گئی یہی حال فارسی کا بھی دیکھا جاتا ہے کہ مرزا صائب کی طباعی سے فارسی کا منظوم لٹریچر تو ترقی کر گیا مگر زبان کے نفس غزل سرائی کو کوئی ترقی نصیب نہیں ہوئی اور حافظ کی غـزل سرائی اپنے

درجہ پر رہ گئی، خیر اب راقم اپنے خیالات اُردو کے شعرائے متغزلین کی نسبت عرض کرتا ہے، حضرات ناظرین سے توجہ فرمائی کی التجا ہے +

ولی دکنی شمس الدین ولی دکنی اُردو کی غزل گوئی کے اگر موجد نہیں ہیں تو اس زبان کی غزل گوئی کو درجہ امتیاز کے بخشنے والے ضرور ہیں کس واسطے کہ ولی اپنے عہد میں کہ عہد عالمگیر تھا، غزل گوئی کو اس درجہ تک پہنچا چکے تھے، کہ آج دنیا بھی اُن کے اشعار کو بڑے تعجب کی نظر سے دیکھتی ہے، اُن کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نہ صرف اپنے زمانہ کی زبان میں غزل سرائی کرتے تھے، بلکہ میر، مرزا مصحفی کی زبانوں کو بھی برتتے تھے، اس پر طُرّہ یہ ہے کہ اُن کے بہت کلام ایسے ہیں کہ جو ناسخ سے لے کر حال کے زمانہ تک کی زبان میں دکھائی دیتے ہیں۔ غزل گوئی کے اعتبار سے ولی اوّل درجہ کے شاعر تھے، جو غزلگوئی کے تقاضے ہیں اُن سے ولی کو پوری اطلاع حاصل تھی چنانچہ غزلگوئی میں بیشتر شاعری کا داخلی پہلو ملحوظ رکھتے تھے، اسی لئے اُن کی غزل سرائی پر تاثیر نظر آتی ہے۔ اُن کے متنوع کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مابعد کے جمیع متغزلین دہلی و لکھنو نے اُن کے کلام سے فیض حاصل کیا ہے، اور سب غزل سرایاں نامی نے حسب استعداد ذاتی اُن کی شاعری سے ہدایت پائی ہے ولی کے کلام میں درد۔ سودا۔ میر مصحفی۔ ذوق۔ ناسخ۔ آتش سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کس قدر قوی الدماغ شاعر تھے، جو ہر نوع کے کلام پر قدرت تامہ رکھتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ مابعد کے جتنے متغزلین موجد کسی طرز کے کھاتے ہیں درحقیقت اسی پیر طریقت کے مُرید

ہیں۔ ولی کے کلام بہت ہیں اور گوناگوں رنگ رکھتے ہیں مگر اصل رنگ اُن کا وہی ہے جیسے میر، مرزا اور درد نے اختیار کیا ہے ولی کے کچھ اشعار ذیل میں نذر ناظرین ہوتے ہیں ؎

صد حیف کہ وہ یار میرے پاس نہ آیا — میرا سخن راست اُسے راس نہ آیا
طاقت نہیں کسی کو کہ اک حرف سُن سکے — احوال گر کہوں میں دلِ بے قرار کا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی کا کیا مجازی کا
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا
اے ولی دل کو آب کرتی ہے — نگہ چشم سرمگین کی ادا
نشۂ سبزۂ خطِ خوبان — والی عالمِ خیال ہوا
باعث نشہ دو بالا ہے — حسن صورت کے ساتھ حسن ادا

سبحان اللہ کیا طرزِ کلام ہے غزل گوئی اسی سے عبارت ہے کوئی مصرع بھی دائرہ غزل گوئی سے باہر نہیں جاتا ہے ہر شعر غزلیت سے اس قدر معمور ہے کہ غزل و قصیدہ کا فرق دکھا رہا ہے افسوس ہے کہ ولی کے کلام سے کمتر اس عہد کے لوگ اطلاع رکھتے ہیں حال کے حضرات متغزلین کا فرض منصبی ہے کہ ولی کے کلام کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں تا کہ غزلگوئی کی لغزشوں سے مامون رہیں۔ صاحب آب حیات لکھتے ہیں کہ ولی کا دیوان لندن اور پیرس میں چھپ گیا ہے واقعی اہل یورپ کس قدر علم پروری کا مذاق رکھتے ہیں، کہاں ولی کا دیوان اور کہاں لندن اور پیرس، ایک اسی دیوان پر کیا موقوف ہے سینکڑوں عربی، فارسی وغیرہ کے دواوین یورپ میں

چھپ چکے ہیں اور دواوین ہی پر کیا موقوف ہے ہزاروں کتابیں مختلف ایشیائی علوم کی چھاپی گئی ہیں اور چھاپی جاری ہیں؛

مرزا رفیع سودا

مرزا رفیع سودا تمام انواع شاعری پر عجیب قدرت رکھتے تھے، غزلگوئی میں بھی انھیں اُستادی کا درجہ حاصل تھا۔ فی الواقع اُن کی قوت شاعری بہت حیرت نظر آتی ہے، مضامین داخلی اور خارجی دونوں کی بندش پر اُنھیں اچھی قدرت حاصل تھی۔ اسی لئے تمام اصناف شاعری میں ان کا کلام عجیب جلوہ دکھا رہا ہے اگر انھیں داخلی شاعری میں کچھ تھوڑی اور بھی قدرت ہوتی تو غزلگوئی میں میرؔ کے ہمسر مانے جاتے، یوں تو اور اصناف شاعری میں وہ میرؔ سے بہت بڑھے ہوئے تھے، میرؔ صاحب کو خارجی شاعری کی قوت بہت کم حاصل تھی۔ بلکہ سوداؔ کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ سوداؔ کی قابلیت کے دنیا میں دس پانچ شاعر سے زیادہ نہ گزرے ہوں، سوداؔ کی قوت شاعری ایسی ہے کہ اُس سے کسی ملک کے آدمی کو انکار نہیں ہو سکتا، میں اوپر لکھ چکا ہوں، کہ شاعری کے دو پہلو ہیں، ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ خارجی پہلو کو تو مرزا صاحب ایسا برتتے ہیں کہ زبان اُردو میں سوا میر انیسؔ کے کوئی اُن کا جواب نہیں ہے۔ مگر داخلی پہلو پر اُن کو ویسی قدرت حاصل نہ تھی، جس کے سبب سے وہ میر تقی صاحب میرؔ سے غزل سرائی میں پیچھے نظر آتے ہیں اگر مرزا سوداؔ انگلستان میں ہوتے تو دوسرے شکسپیر ہوتے، مرزا صاحب کی اطلاع ملکی بہت معلوم ہوتی ہے، اپنے ملک کے تمام معاملات کلی وجزوی سے باخبر تھے، یہی حال شکسپیر کا بھی نظر آتا ہے کہ معاملات یورپ سے اُسے پوری واقفیت حاصل تھی۔ خارجی پہلو کی شاعری

برتنے کے واسطے اطلاع عام کی بڑی حاجت ہے۔ برخلاف اس کے داخلی شاعری میں معاملات خارجیہ کے دانست کی بہت حاجت نہیں ہوتی، داخلی شاعر کا درون ہی اس کی کائنات ہے جو واردات ذہنیہ اور معاملات قلبیہ اس کے ادراک میں جگہ رکھتے ہیں، انھیں وہ موزوں کر دیتا ہے، آیندہ پھر ذکر مرزا سودا کا چند موقع پر آنے کو ہے جس سے مرزا صاحب کی بلند پائگی ظاہر ہوگی یہاں پر چونکہ غزل سرائی کی بحث پیش ہے اس لئے ان کی غزل سرائی کے مادے میں اس قدر عرض کرنا کافی ہوگا کہ ہرچند وہ اس صنف شاعری میں میر صاحب کے برابر نہیں ہیں اس پر بھی وہ اس صنف شاعری کے بھی ایک بڑے اُستاد ہیں اُن کا کلام درد، سوز و گداز خستگی سے خالی نہیں ہے اور یہ وہ صفتیں ہیں کہ جو غزل سرائی کی جان ہیں، مرزا صاحب کی طباعی طبیعت داری، شوخی، نازک خیالی، مضمون آفرینی بہت قابل لحاظ ہے، لاریب مرزا صاحب کا ایسا ہی درجہ ہے کہ اُستاد ناسخ اُن کی شان میں یوں فرما گئے ہیں ؎

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب	ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس مغفور کا

ذیل میں کچھ مرزا صاحب کے اشعار نذر ناظرین ہوتے ہیں ؎

بُلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا	ہم نے اُسے ہر خار بیابان میں دیکھا
روشن ہے ؤہ ہر ایک ستارے میں زلیخا	جس نور کو تو نے مہ کنعان میں دیکھا
برہم کرے جمعیت کونین جو پل میں	لٹکا وہ تری زلف پریشان میں دیکھا
واعظ تو ستی بو سے ہے جس روز کی باتیں	اُس روز کو ہم نے شب ہجران میں دیکھا
اے زخم جگر سودۂ الماس سے خو کر	کتنا وہ مزا تھا نمک دان میں دیکھا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

دامن صبا نہ چھو سکے جس شہسوار کا — پہنچے کب اُس کو ہاتھ ہمارے غبار کا
موجِ نسیم آج ہے آلودہ گرد سے — دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا

قطعہ

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

قطعہ

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا — دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا
بھٹکی پھرے ہے کب سے خدایا مری دعا — دروازہ کیا قبول کا معمور ہو گیا
سودا کو کہتے ہیں کہ ہے اس کو مصاحبت — کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا
اوروں کی نسبت ان دنوں کچھ لگ چلا تھا وہ — دو چار جھڑکیوں میں بدستور ہو گیا

قطعہ

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کی ان دنوں — تو بھی ٹک اُس کو جا کے ستم گار دیکھنا
نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن — نے سیر باغ و نے گل و گلزار دیکھنا
خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب — تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

یا جا کے اس گلی میں جہاں تھا ترا گذر
لے صبح تا بشام کئی بار دیکھنا

تسکین دل نہ اس میں بھی پائی تو پھر شغل
پڑھنا یہ شعر گر کبھی اشعار دیکھنا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجھ کو غیر پاس
پر جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا

عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کے ہم

کہتا تھا کل کسو سے کرے گا کسی کو قتل
اتنا تو کشتنی نہیں کوئی مگر کہ ہم

دیکھیں تو کس کی چشم سے گرتے ہیں لخت دل
تا اس طرح سے رو سکے اے ابر تر کہ ہم

بیٹھا نہ کوئی چھاؤں نہ پایا کسی نے پھل
بے برگ و بر نہیں کوئی ایسا شجر کہ ہم

قاصد کے ساتھ چلتے ہیں لیکن کہے ہے اٹک
دیکھیں تو پہلے پہنچے ہے واں نامہ بر کہ ہم

اتنا کہاں ہے سوز طبیعت دل پتنگ کا
رکھتی نہیں ہے شمع بھی ایسا جگر کہ ہم

سودا نہ کہتے تھے کہ کسی کو تو دل نہ دے
رسوا ہوا پھرے ہے تو اب دربدر کہ ہم

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانیے ورنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

سبحان اللہ کیا حسن کلام ہے سوز و گداز خستگی درد شوخی نازک خیالی بلند پروازی اور رنگینی کے ساتھ زور طبیعت کا ایسا خوبصورت اظہار ہے کہ فی الواقع سودا کی غزل سرائی کی تعریف کما حقہٗ کی نہیں جا سکتی ہے اول تو دیوان اس قدر ضخیم ہے۔ کہ جس سے انتخاب اشعار ایک سے بھی درد۔ مومن۔ غالب۔ ذوق کے دیوان سے

اُن کا دیوان منتخب زیادہ حجم نکل سکتا ہے۔ دوم یہ کہ غزل سرائی اِس اعلیٰ درجہ کی ہے کہ سوا میر اور درد کے اُن کا جواب کوئی نظر نہیں آتا، اگر تھوڑی خستگی اور بھی سودا کے کلام میں ہوتی تو اُن کا کلام میر اور درد کے کلام کے برابر ہو جاتا خدا جانے کہ سرزمین دہلی کی کیا تاثیر ہے کہ وہاں کے شعرائے متغزلین اکثر غزل سرائی کی داد خوب دیتے گئے ہیں۔ اس پر تاثیری کا سبب یہی ہے کہ غزل سرائی میں واردات قلبیہ اور امورِ ذہنیہ کے مضامین کو حوالۂ قلم کرتے گئے ہیں یعنی غزل سرائی میں ہمیشہ شاعری کے داخلی پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، برخلاف اس کے استادانِ لکھنؤ غزل سرائی میں بیشتر شاعری کے خارجی پہلو سے کام لیتے رہے ہیں جس کے سبب سے اُن کی غزل سرائی سے دل کو حسبِ مراد حظ نہیں اٹھتا ہے، مرزا غالب فرمایا کرتے تھے کہ اُردو زبان کو اہلِ لکھنؤ نے درست کیا مگر مضمون آفرینی میں دہلی والوں کے برابر نہ ہو سکے، مرزا غالب کا یہ قول مضمون آفرینی کے اعتبار سے تو صحیح نہیں ہے اِس لیے کہ ناسخ۔ آتش اور اِن اُستادوں کے شاگردوں نے مضمون آفرینی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے مگر بات یہ ہے کہ لکھنؤ کے حضرات متغزلین دہلی کے حضرات متغزلین کے برابر پر تاثیر مضمون آفرینی نہ کر سکے، اِس کا سبب یہی ہے کہ غزل سرائی میں حضرات لکھنؤ نے شاعری کے خارجی پہلو کو داخل کر دیا جو غزل سرائی کے تقاضے کے خلاف ہے پس یہ جدت مفید غزل سرائی کیونکر ہوتی؛

خواجہ میر درد

خواجہ میر آپکا نام ہے سودا اور میر کے ہمعصر تھے، گو پہلے ان ہر دو شاعرانِ گرامی سے رحلت فرمائی۔ اکثر مشاعروں میں یہ تینوں حضرات شریک رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کی غزل سرائی

نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے، سوز و گداز میں ان کے جواب یا تمیر تھے یا آپ اپنے جواب تھے، واردات قلبیہ کے مضامین ایسے باندھتے تھے کہ سودا اُن تک نہ پہنچے تھے، علاوہ اس کے خود طبیعت جو نہایت پر درد واقع ہوئی تھی اس کا اثر اُن کے کلام میں بدرجہ کثیر پایا جاتا ہے۔ ہرچند خواجہ کا دیوان مختصر سا ہے مگر قریب قریب انتخاب کا حکم رکھتا ہے اگر میر صاحب کے دواوین سے انتخابات کیئے جائیں، تو خواجہ صاحب کے دیوان سے اُن کے منتخب کا حجم بہت زیادہ نہ ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ دیوان کے حجیم ہونے پر شاعری کی قدرت موقوف نہیں رہتی کلام کی خوبی قابل توجہ سمجھی جاتی ہے نہ اس کے دیوان کا حجم خواجہ صاحب کی غزل سرائی تمام تر اس صنف شاعری کے تقاضوں کے مطابق پائی جاتی ہے علاوہ سوز و گداز، درد خستگی علو معانی اور سمو مضامین کے نظم کی شستگی راقم کی دانست میں میر صاحب کے کلام سے زیادہ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، خواجہ اپنے خیالات دلکش کو بڑی صفائی کے ساتھ سوائے قلم فرماتے ہیں، خواجہ کے کلام میں ایک امر اور بھی قابل لحاظ ہے کہ چونکہ خلقت کے رو سے صاف دل تھے، اور ریاضت نے اُن کی اس قلبی کیفیت کو ترقی بخشی تھی، اُن کے کلام میں عجب بے نفسی کی جلوہ گری پیدا ہے، المختصر غزل سرائی کے اعتبار سے خواجہ صاحب ایک بڑے شاعر تھے اور ان کا نظیر سوائے میر کے کوئی دوسرا نہیں دیکھا جاتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ درد کو حافظ کے ساتھ ہمسری ہے، حافظ کے ساتھ نہ تو فارسی اور نہ اُردو کے کسی شاعر کو ہمسری حاصل ہے، اس پر بھی درد کی غزل سرائی بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھے جانے کا استحقاق رکھتی ہے ذیل میں کچھ اشعار خواجہ کے نذر

ناظرین ہوتے ہیں سہ

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا — پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا — ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

بھول جا چپ رہ عبث نہ سب لقمت یاکر — درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا — میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر — میں نے تو در گزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

کی تو تھی تاثیرِ آہِ آتشیں نے اس کو بھی — جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

جفا سے غرضِ امتحانِ وفا ہے — تو کہہ کب تک آزماتا رہے گا

اُسنے قصداً ابھی میرے نالے کو — نہ سنا ہوگا گر سُنا ہوگا

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں — دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیجئے تو فرشتے وضو کریں

تو مجھ سے نہ رکھ غبار جی میں — آئینہ بھی اگر ہزار جی میں

ہرچند نہیں صبر تجھے درد و لیکن — اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں ہوں ستم دیدہ — گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ

کاش تا شمع نہ ہوتا گزر پروانہ — تم نے کیا قہر کیا بال و پرِ پروانہ

جوں خواب ہے وابستہ غفلت پہ تماشا — کھل جائے اگر آنکھ تو پھر کیا نظر آئے

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے لوحِ مزار بھی میری چھاتی پہ سنگ ہے

یارو مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اُس سے مذکور کسی طرح تو جا کیجئے اُس سے

تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

ایک بھی پرزانہ ہم لائے تھے ساتھ یاں سے سمجھانے کو اک دفتر چلے

شمع کے مانند ہم اُس بزم میں چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے جو سانس بھی نہ لے سکے سو آہ کیا کرے

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا کرے

کہ بیٹھیو نہ درد کہ اہلِ وفا ہوں میں اُس بے وفا کے آگے جو ذکر وفا چلے

یہی پیغام درد کا کہنا گر صبا کوئے یار میں گزرے

روندے ہے مثلِ نقشِ قدم خلق یاں مجھے اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

سبحان اللہ کیا غزل سرائی ہے کن کن باتوں کی تعریف کی جائے خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تو، واقعی خواجہ صاحب کی غزل سرائی الہامی شاعری کا نمونہ ہے علاوہ سوز و گداز وغیرہ کے اُن کے کلام میں نفاست، متانت، شیرینی ملاحت رنگینی بھی کس قدر پیدا ہے اور شوخی کس پاک درجہ کی آشکارا ہے۔ اِس شوخی کو اُس ناپاک شوخی سے کیا علاقہ جس پر جہال زمانہ وجد کرتے ہیں۔ جو شوخی مطبوع عوام ہو رہی ہے اُس کی جھلک بھی خواجہ صاحب کے کلام میں پائی نہیں جاتی ہے۔ واقعی اس زمانہ کے عوام کے خیالات جو شوخی کے مادے میں ہیں۔ بہت قابلِ اصلاح نظر آتے ہیں کس واسطے کہ اُن خیالات کی بنا محض بدتہذیبی پر ہے۔ اللھم احفظنا من ذالک ؏

میرؔ: نام نامی آپ کا میر محمد تقی ہے لاریب میر صاحب اُردو کے سُلطان المتغزلین ہیں اور استاد ناسخؔ کی عقیدت مندی اُن کی جناب میں بے سبب نہ تھی ؎

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

میرؔ صاحب کے چھ دیوان ہیں اس میں شک نہیں کہ ان میں بہت اشعار ایسے ہیں کہ ترک کر دینے کے قابل ہیں اس لئے کہ اُن میں یا پست خیالی کا نقصان لاحق ہے یا اُن کی شان اِس قدر کم ہے کہ اُن کو میر صاحب کے کلام ہونے کا رتبہ حاصل نہیں ہے اس پر بھی اگر اِن چھ دیوانوں سے انتخاب اشعار کیا جائے تو ایک نہایت حسب مراد دیوان مرتب ہو سکتا ہے خیر راقم اب اپنے خیالات میر صاحب کے منتخب کلام کی نسبت ظاہر کرتا ہے اور وہ یہ ہیں کہ اگر میر صاحب کے منتخب کلام پر نگاہ ڈالیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کلام سے زیادہ خوبصورت کلام زبان اُردو میں کہیں نہیں ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ خواجہ میر دردؔ کو مستثنیٰ کر کے کسی شاعر ریختہ گو کو آج تک اُن کے کلام کی ہوا بھی نہیں لگی ہے واقعی میرؔ صاحب کچھ ایسا کہہ جاتے ہیں کہ ویسا کہنا تو درکنار اُن کے وہ ایک مصرع کا چربہ بھی کسی سے نہیں اُتر سکتا ہے سارا دیوان ذوقؔ یا ناسخؔ کا پڑھ ڈالیے، ایک مصرع بھی کہیں نظر نہ آئے گا جس پر میر صاحب کے کلام کا دھوکا ہو سکے حالانکہ ناسخؔ یا ذوقؔ کے اُستاد الاستاد ہونے میں کسی صحیح الحواس کو عذر نہیں ہو سکتا۔ اِس حیرت افزا غزل سرائی کا سبب جو ڈھونڈھیے تو صرف اتنی باتوں میں محدود پایا جاتا ہے کہ میر صاحب غزل سرائی میں کبھی واردات قلبیہ امور ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے ہیں اور اُن کے وہی اشعار زیادہ دلآویز معلوم ہوتے ہیں۔ جو زیادہ واردات قلبیہ اور امور

ذہنیہ سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ میر صاحب کی غزل سرائی تمامتر شاعری کا داخلی پہلو رکھتی ہے تب ہی تو اُن کے کلام میں سوز وگداز خستگی نشتریت رنگینی ملاحت شیرینی شوخی وغیرہ کی کیفیتیں بدرجہ کثیر پائی جاتی ہیں ظاہر ہے کہ یہ وہ کیفیتیں ہیں جو دل کو بھاتی ہیں پس جس شاعر کے کلام میں یہ کیفیتیں موجود ہوں گی کیونکہ اُس کا کلام دل آویز اور دلکش نہ ہوگا یہ سب صفتیں خواجہ میر درد صاحب کے کلام میں بھی موجود ہیں مگر بدالست فقیر خواجہ صاحب کے کلام میں میر صاحب کے کلام اعتبار سے خستگی کم ہے لیکن سوز و درد خواجہ صاحب کا میر صاحب کے کلام سے بڑھا نظر آتا ہے علاوہ اس کے پاکیزگی اور لطافت خواجہ صاحب کے کلام کی بہت قابل توجہ ہے اسی طرح میر صاحب کے کلام میں دل گرفتگی محزونی اور نشتریت خواجہ صاحب کے کلام سے زیادہ پائی جاتی ہے خیر ان سب کیفیات قلبی میں بھی دونوں حضرات ایک دوسرے کے جواب نظر آتے ہیں مگر میر صاحب کو جو خواجہ صاحب پر غلبہ نظر آتا ہے وہ قوت شاعری کے اعتبار پر ہے کہ یہ قوت میر صاحب کو خواجہ صاحب سے زیادہ حاصل تھی امر موازانہ سے علیحدہ ہو کر گذارش راقم میر صاحب کی غزل سرائی کی نسبت یہ ہے کہ اُن کی سخن سنجی کا انداز ایسا ہے کہ کسی شاعر سے اس کا تتبع نہ ہو سکا، بلکہ میر صاحب کے حسن کلام تک پہونچے کی شعرا نے جس قدر کوششیں کیں، اسی قدر انھیں یاس پائی نصیب ہوئی، چنانچہ ذوق نے نہایت انصافانہ فرمایا ہے شعر

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب　　ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اسی ناکامیابی نے مختلف شعرا، کو مختلف غزل سرائی کی راہیں سوجھائیں مگر کوئی موصل الی المطلوب نہ نکلی - ذوق - ناسخ - آتش نے جس قدر منزلیں طے کیں میر صاحب

کی غزل سرائی کے دیار سے دور پڑتے گئے۔ مومن نے راہ راست اختیار کی بھی تو چند منزل چل کر رہ گئے، غالب کا بھی یہی حال ہوا کہ منزلوں راہ راست پر چل کر آخر کار انھیں راہ زنوں سے پالا پڑا اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ مختصر یہ ہے کہ جہاں میر صاحب جا کر منزل گزین ہوئے وہاں کوئی راہرو نہ پہنچ سکا۔ ذیل میں میر صاحب کے کچھ کلام نذر ناظرین ہوتے ہیں ؎

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا — پیدا ہر ایک نالہ سے شور نشور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا
ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر — اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

قطعہ

کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک — پلک تک گیا تو تلاطم کیا
اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اِس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا
شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں — جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

یاں کے سفید و سیہ میں ہمکو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

مُنہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تاب کس کو جو حال میر سُنے
حال ہے اور کچھ ہے مجلس کا

جب جنوں سے ہمیں توسل تھا
اپنی زنجیر پا ہی کا غل تھا

یک نگہ کو وفا نہ کی گویا
موسم گل صفیر بلبل تھا

اُن نے پہچان کر ہمیں مارا
مُنہ نہ کرنا دہر تجاہل تھا

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار
یاد ایام جب تحمل تھا

خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقت خوش میر نکہت گل تھا

مارا زمیں میں گاڑا اُس کو صبر آیا
اِس دل نے ہم کو آخر یوں خاک میں ملایا

موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو
جانے گا وقت مرگ کہ عالم حباب تھا

گل کو محبوب ہم قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

دل نے ہم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی ہے
کیا پتنگے نے التماس کیا

داغ فراق حسرت وصل آرزوئے شوق
میں ساتھ زیر خاک بھی ہنگامہ لے گیا

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہو گیا
قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

میر ہر ایک موج میں زلف ہی کا سا داغ
ہے جب سے وہ دریا پہ آ کر بال اپنے دھو گیا

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

سجدہ گردان ہی میر ہم تو رہے
دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

دور تجھ سے میر نے تعب کھینچا کہ شوخ
کل جو میں دیکھا اسے مطلق نہ پہچانا گیا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونس ہجراں
سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم
پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست
شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہو گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے روئیگا

اے گل نو دمیدہ کے مانند
ہے تو کس آفریدہ کے مانند

ہم امید وفا پہ تیری ہوئے
غنچۂ دیر چیدہ کے مانند

سر اُٹھاتے ہی ہو گئے پامال — سبزہ نودمیدہ کے مانند
ہم گرفتار حال ہیں اپنے — طائرِ پر بریدہ کے مانند
دِل تڑپتا ہے اشک خونیں میں — صیدِ خونِ طپیدہ کے مانند
میر صاحب بھی اسکے ہاں تھے لیک — بندۂ زر خریدہ کے مانند

اگر راہ میں اس کی رکھا ہے گام — گئے گذرے خضر علیہ السلام
حُسن یار کا دیکھ چپ لگ گئی — سخن یاں ہُوا ختم حاصل کلام

میرے سنگ مزار پر فرہاد — رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو — ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا — میر کا طور یاد ہے ہم کو

دیکھ تو، دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے
خانۂ دل سے زینہار نہ جا — کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے
یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم — جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو — وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے
فلک اے کاش ہمکو خاک ہی رکھتا کہ اِس میں ہم — غبار راہ ہوتے یا کسی کی خاک پا ہوتے

اپنی ہستی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اُسی خانہ خراب کی سی ہے
میر اُن نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

شمع صفت جب کبھی مر جائینگے ساتھ لئے داغ جگر جائیں گے

اب جو اک حسرت جوانی ہے عمر رفتہ کی اک نشانی ہے

ہم قفس زاد قیدی ہیں ورنہ تا چمن ایک پر فشانی ہے

چہرہ سے اٹھا برقع کو وہ بت اگر آوے اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے زمیں سخت اور آسمان دور ہے

دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے

تربت میر پر ہیں اہل سخن ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل بہ خدا واجب الزیارت ہے

کیا کروں شرح خستہ جانی کی میں نے مر مر کے زندگانی کی

حال بد گفتنی نہیں میرا تم نے پوچھا تو مہربانی کی

جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل ابتدا پھر وہی کہانی کی

اب کی بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی اپنی جگہ بہار میں کنج قفس رہی

میں پا شکستہ جا نہ سکا قافلے تلک آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی

دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے برسات ایکی شہر میں سارے برس رہی

جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کھل کے ہنس سکے فرصت رہی جو میر تو بس اک نفس رہی

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

منع گریہ نہ کر تو اے ناصح اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

نالے کریو سمجھ کے اے بلبل — باغ میں یک کنار ہیں ہم بھی
مدعی کو شراب ہم کو زہر — عاقبت دوستدار ہیں ہم بھی
گرز خود رفتہ ہیں ترے نزدیک — اپنے تو یادگار ہیں ہم بھی
میرؔ نام اک جواں سنا ہوگا — اُسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی
موت اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے منہ بھی چُھپا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا — ہمیں آپ سے بھی جُدا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ — جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے
کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں — کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی
مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

واضح ہو کہ اشعار بالا راقم نے نمونہ کے طور پر میرؔ صاحب کے دیوان اول سے انتخاب کر لئے ہیں اس انتخاب سے یہ مطلب نہیں ہے کہ اس دیوان میں اس کے علاوہ اور اشعار انتخاب کے قابل نہیں ہیں، بہرحال اتنے اشعار میرؔ صاحب کے انداز کلام کو دکھلانے کے واسطے کافی ہیں. حضرات اہل واقفیت سے مخفی نہیں ہے کہ اشعار بالا میں کیا کیا واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی کیفیتیں شاعری کے پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ یہ سب دشوار کیفیتیں جو مسائل علمیہ کا

حکم رکھتی ہیں، ایسی آسان اور سلیس زبان میں بیان کی گئی ہیں کہ اُس سے آسان اور سلیس تر زبان میں اُن کا بیان کیا جانا ممکن نہ تھا، واقعی کیا کیا دشوار مضامین کو جو محض قلب و ذہن سے متعلق ہیں، میر صاحب ایسی آسانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان فرما جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، اُن کی سادگی زبان کا عالم فی الحقیقت نرالا ہے، بیان مضامین بیشتر تشبیہہ استعارہ اور مبالغہ سے احتراز رکھتا ہے اور اگر کہیں ان صنعتوں کو بھی دیتے ہیں تو اس خوبصورتی سے کہ آورد کی کیفیت مطلق ظاہر نہیں ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ جب شاعر سخن سنجی میں قاصر آتا ہے تب ہی تشبیہہ استعارہ اور مبالغہ سے اپنے کلام میں اعانت لیتا ہے ورنہ منتج خوش اسلوب پُر تاثیر دلفریب جانفزا روح پرور نیچرل مضمون زنہار ایسی ایسی ترکیبوں کا محتاج نہیں ہوتا، چنانچہ بہت سے گیت دُہرے وغیرہ ایسے ہیں کہ تمام تر تشبیہہ استعارہ اور مبالغہ سے پاک ہیں، مگر اُن کے مضامین کی عمدگی ایسی ہے کہ بے اختیار دل پر عجب بامراد تاثیر پیدا کرتی ہے۔

مومن دہلوی

حکیم مومن خاں ذوق کے ہمعصر تھے، مگر ذوق سے غزل گوئی کا رنگ علیحدہ رکھتے تھے، غالب بھی اسی زمانہ میں تھے، گو مومن کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہے ہر چند مومن اور غالب دونوں شاعری کا داخلی پہلو برتتے تھے تو بھی ان دونوں کے مذاق شاعری جداگانہ تھے، اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مومن کی جتنی غزلیں ہیں ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مومن کی غزل سرائی دہلی کی غزل سرائی کا طور رکھتی ہے۔ غزل سرائی میں مومن بھی معاملات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین حوالۂ قلم کرتے ہیں گو اُن کے بیان میں خواجہ درد یا میر صاحب کے کلام کی پرتاثیری پائی نہیں جاتی ہے ان دونوں بزرگوار کے

کلام کی خوبی یہ ہے کہ جس طرح کمان سے تیر نکلے، ان کا کلام سامع کے دل پر فوراً جا بیٹھتا ہے برخلاف اس کے مومن کا انداز سخن ہے کہ جب تک بغور ان کے کلام پر نظر نہ ڈالیئے لطف کلام حاصل ہی نہیں ہوتا، اس لیے بعض بے مغزوں نے مومن کے دیوان کو مہمل قرار دیا ہے، اس میں شک نہیں کہ مومن ایک بڑے بلیغ شاعر ہیں، مگر میر صاحب کے کلام کی رفعت، جلالت، مکنت خستگی، برشتگی کو نہیں پہنچتے ہیں اور ہر چند وصل، فراق، غم، ملال، رنج، ضد، عداوت، حسد، رشک، اضطراب بیتابی، بیخوابی کے مضامین خوب باندھتے ہیں۔ مگر اُن کے کلام سے کبھی کبھی کوچہ گردی کی بو آجاتی ہے، اس پر بھی جوانانہ انداز کے ساتھ تہذیب کی عنان کبھی ہاتھ سے نہیں دیتے، بجز خواجہ اور میر کے معالات قلبیہ کے مضامین کی بندش میں مومن خاں جو کچھ کم سمجھے جائیں مگر حقیقت حال یہ ہے کہ وہ ایک ایسے بڑے غزل سرا ہیں کہ ان کی غزل سرائی پر اہل دہلی کو بلکہ ہر دیار کے مذاق کو ناز ہونا چاہیے۔ مومن خاں کی غزل سرائی تشبیہ سے اکثر پاک دیکھی جاتی ہے۔ استعارے بھی کثرت سے داخل کلام نہیں ہوتے اور مبالغے بامذاقی سے خالی نہیں دیکھے جاتے۔ ان کی شاعری میں جو کچھ نقصان ہے وہ نقصان بندش ہے، نقصان مضامین نہیں ہے مثلاً اگر تعقیدات کو اُن کے کلام میں دخل نہ ہوتا تو ان کی غزل سرائی ترکیب زبان کے عیب سے پاک ہوتی۔ راقم قبل میں عرض کرچکا ہے کہ اکثر شعرائے دہلی غزل سرائی میں شاعری کا داخلی پہلو برتتے ہیں برخلاف اس کے شعرائے لکھنؤ خارجی پہلو سے بیشتر سروکار رکھتے ہیں راقم ذیل میں دو غزلیں حوالۂ قلم کرتا ہے ایک مومن خاں کی ہے اور دوسری خواجہ آتش کی۔ اہل نظر پر روشن ہے کہ مومن اپنی اس تمام غزل میں تین شعر کے

سو داخلی پہلو کے متمسک رہے ہیں اور آتش ساری غزل میں خارجی پہلو سے کام لیا کئے ہیں :

غزل مومن

کرتا ہے قتل عام وہ اغیار کے لئے
دس بیس روز مرتے ہیں دو چار کے لئے

دیکھا عذاب رنج دل زار کے لئے
عاشق ہوئے ہیں وہ کسے آزار کے لئے

قتل اُس نے جرم صبر جفا پر کیا مجھے
یہ ہی سزا تھی ایسے گنہگار کے لئے

لے تو ہی بھیجدے کوئی پیغام تلخ اب
تجویز زہر ہے ترے بیمار کے لئے

آتا نہیں ہے تو تو نشانی ہی بھیج دے
تسکین اضطراب دل زار کے لئے

کیا دل دیا تھا اس لئے میں نے تمہیں کہ تم
ہو جاؤ یوں عدو کے اغیار کے لئے

چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم
طرز خرام و شوخی رفتار کے لئے

جی میں ہے موتیوں کی لڑی اُسکو بھیجدوں
اظہار حال چشم گہر بار کے لئے

دیتا ہوں اپنے لب کو بھی گلبرگ سے مثال
بوسے جو خواب میں ترے رخسار کے لئے

جیتا امید وصل پہ ہجراں میں سہل تھا
مرتا ہوں زندگانی دشوار کے لئے

مومن کو تو نہ لائے کہیں دام میں وہ بت
ڈھونڈھے ہے تار سبحہ کے زنار کے لئے

واضح ہو کہ گہر بار، رخسار اور زنار اشیائے خارجیہ سے ہیں ناچار ان اشعار کے مضامین بھی خارجی پہلو سے بند ہیے ، اگر مومن خاں کچھ استعادہ پردازی پر عمل کرجاتے تو یہ قافیے داخلی پہلو کے مضامین کے ساتھ بندھ جاتے ، غالب ہوتے تو ضرور یہی روش اختیار کرتے جیسا کہ اُن کی روش خاص کا تقاضا ہے ؞

غزل خواجہ آتش

نافہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لئے ‏— ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لئے

نور تجلی ہے ترے رخسار کے لئے ‏— آنکھیں مری کلیم ہیں دیدار کے لئے

قول اپنا ہے یہ سبحۂ زنار کے لئے ‏— دو پھندے ہیں یہ کافر و دیندار کے لئے

لطف چمن ہے بلبل گلزار کے لئے ‏— کیفیت شراب ہے میخوار کے لئے

سیری نہ ہوگی تشنۂ دیدار کے لئے ‏— پانی نہیں چہ ذقن یار کے لئے

اتنی ہی ہے نمود مرے یار کے لئے ‏— شہرہ ہے جس قدر مرے اشعار کے لئے

دشت عدم سے آئے ہیں باغ جہاں میں ہم ‏— بے داغ لالہ و گل بے خار کے لئے

شمشاد اپنے طرہ کو بیچے تو لیجیے ‏— اس لالہ رو کی لٹ ہے طرۂ دستار کے لئے

دو آنکھیں چہرے پہ نہیں تیرے فقیر کے ‏— دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لئے

سرمہ لگایا کیجیے آنکھوں میں مہربان ‏— اکسیر یہ سفوف ہے بیمار کے لئے

حلقہ ہیں زلف یار کے موتی پرو دیئے ‏— دنداں ضرور ہیں دہن یار کے لئے

گفت و شنید میں ہوں بسر دن بہار کے ‏— گل کے لئے ہے گوش زباں خار کے لئے

واضح ہو کر خواجہ کی یہ غزل چھبیس ۲۶ شعر کی ہے بطرز نمونہ ایک طرف سے بارہ ۱۲ شعر نقل کر لئے گئے ہیں، سوا مطلع کے کہ داخلی پہلو رکھتا ہے جمیع اشعار اس غزل کے خارجی مضامین سے متعلق ہیں، یہ ایک عمدہ مثال اس دعویٰ کی ہے کہ لکھنؤ کے استادان غزل بہت زیادہ خارجی مضامین برتتے ہیں، ساری غزل خواجہ کی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے یہ مراحل دور ہے جتنے امور عالم خارج

سے متعلق ہیں وہی احاطہ بندش میں در آئے ہیں برخلاف اس کے مومن کی غزل ہے کہ تین شعر کے سوا بقیہ اشعار غزل محض امور ذہنیہ ہیں اور ہرچند اعلیٰ درجہ کے واردات قلبیہ سے خبر نہیں دیتے ہیں تو بھی امور داخلی ہونے کے باعث غزلیت ہی کی تشکل قائم رکھنے والے ہیں۔ الحق غزل سرائی کے لئے داخلی پہلو کے مضامین نہایت مطبوع ہوتے ہیں چنانچہ خواجہ کا پہلا مطلع جو داخلی پہلو رکھتا ہے۔ بقیہ اشعار غزل سے زیادہ غزلیت کا لطف رکھتا ہے یہ تو خواجہ کی رنگینی طبیعت کی خوبی ہے کہ خارجی مضامین بھی اُن کی غزلوں میں کچھ مزا دے جاتے ہیں ورنہ اگر کوئی دوسرا شاعر خارجی رنگ میں غزل لکھتا تو یقیناً اس کی غزل میں سے خالی نہیں ہوتی۔ اہل مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مومن کی غزل کس قدر غزلیت کا مزا دے رہی ہے یہ لطف مجرد داخلی مضامین کی بدولت ہے ورنہ بندش و زبان میں خواجہ کے اشعار سے اشعار پر بدرجہا غالب ہیں۔ ذیل میں کچھ مومن کے کلام نمونہ کے طور پر منسلک ہذا کئے جاتے ہیں

مومن

رات کس کس طرح کہا نہ رہا — نہ رہا پردہ مہ لقا نہ رہا
غیر آ کر قریب خانہ رہا — شوق اب تیرے آنے کا نہ رہا
تیرے پڑنے نے کی یہ پردہ دری — تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا
غم مرا کس لئے کہ دنیا میں — نہ رہا میں مرا فسانہ رہا
مدعا غیر سے کہا تا وہ — سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا
غیر چھڑکے ہے زخم دل پہ نمک — شور الفت میں بھی مزا نہ رہا

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے　　جی بلا سے رہا رہا نہ رہا
تو فلک مرگ ہم سے سب غافل　　اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

مومن اُس بت کے نیم نازہی ہیں
تم کو دعوئے اتقا نہ رہا

ٹانکنے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا　　ہاتھ کٹواؤں جو ناصح ہے اب تار لگا
بسکہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا　　جو مریضوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا
تو کسی کا بھی خریدار نہیں پر ظالم　　سر فروشوں کا ترے کوچہ میں بازار لگا
کعبہ سے جانب بتخانہ پھر آیا مومن　　کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

میرے کوچہ میں عدو مضطر و ناشاد رہا　　شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا
اُس روانی سے ذرا خنجر بیداد رہا　　بار سے اک دم اثر نالہ و فریاد رہا
نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف　　خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا
لے چلا جوش جنوں جانب صحرا افسوس　　جب مرے کوچہ میں آ کر وہ پری زاد رہا
گھر غم حور گئے عشق بتاں اے مومن　　میں سدا سوختہ حسن خداداد رہا

وعدہ وصلت سے دل ہو شاد کیا　　تم سے دشمن کی مبارکباد کیا
کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی　　آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
نالہ ہیم سے یاں فرصت نہیں　　حضرت ناصح کریں ارشاد کیا
ہیں اسیر اسکے جو ہے اپنا اسیر　　ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا

شوخ بازاری تھی شیریں بھی مگر — ورنہ فرق خسرو فرہاد کیا
نشۂ الفت سے بھولے یار کو — سچ ہے ایسی بے خودی میں یاد کیا
نالہ اک دم میں اڑا ڈالے دھوئیں — چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا
جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو — بے وفا پھر حاصل بیداد کیا
پاؤں تک پہنچی وہ زلف خم بخم — سرو کو اب باندھیے آزاد کیا
کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر — ولولہ کیا نالہ کیا فریاد کیا
دلربائی زلف جاناں کی نہیں — پیچ و تاب طرّہ شمشاد کیا
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا
روز محشر کی توقع ہے عبث — ایسی باتوں سے ہو خاطر شاد کیا
گر بہائے خون عاشق ہو وصال — انتقام زحمت جلاد کیا
بتکدہ جنت ہے چلیے بے ہراس — لب پہ مومنؔ ہرچہ بادا باد کیا

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خون کا جواب تھا
عاشق ہوئے ہیں آپ کہیں گو اسی پہ ہوں — شب حال غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا
وقت وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے — یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا
کیا جی لگا ہے تذکرہ یار میں عبث — ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

روز جزا خدا اُبت جلّاد کو ملا
گویا کہ خون ناحق مومنؔ ثواب تھا

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

پوچھا کسی پہ مرتے ہو اور دم نکل گیا
ہم جان سے عنان بہ عنان صدا گئے

پھیلی وہ بو جو ہم میں نہاں مثلِ غنچہ تھی
جھونکے نسیم کے یہ نیا گل کھلا گئے

مجلس میں اس کے پان دیا اپنے ہاتھ سے
اغیار سبز بخت تھے ہم زہر کھا گئے

اُٹھا نہ ضعف سے تگِ داغِ جنوں کا بوجھ
قاروں کی طرح ہم بھی زمیں میں سما گئے

غیروں سے ہو وہ پردہ نشیں کیوں نہ بے حجاب
دھمائے بے اثر مرے پردہ اُٹھا گئے

تھی بدگمانی اب انہیں کیا عشقِ حور کی
جتا کے مرتے دم مجھے صورت دکھا گئے

تابندہ و جوان تو بخت رقیب تھے
ہم تیرہ روز کیوں غمِ ہجراں کو بھا گئے

بیزارِ زندگانی کا جینا محال تھا
وہ بھی ہماری لاش کو ٹھوکر لگا گئے

واعظ کے ذکرِ مہرِ قیامت کو کیا کہوں
عالمِ شبِ وصال کے آنکھوں میں چھپا گئے

اے مومنؔ آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں
بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آ گئے

ذوقؔ دہلوی

شیخ ابراہیم ذوقؔ، ظفرؔ شاہ کے اُستاد تھے، بادشاہ کے حضور سے خان بہادر اور خاقانیِ ہند کے خطابوں سے سرفراز بھی ہوئے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ ذوقؔ ایک بڑے ممتاز شاعر گزرے ہیں مگر ان کی غزل سرائی کے تقاضوں کے مطابق پورے طور پر نہ تھی، اسی لئے اس صنعت شاعری میں وہ خواجہ میر دردؔ یا میر تقی میرؔ کے برابر نہیں سمجھے جا سکتے ہیں۔ ذوقؔ غزل سرائی میں زیادہ خارجی مضامین باندھتے ہیں اور جو داخلی مضامین باندھتے ہیں تو ان میں دردؔ اور میرؔ کے کلام کے سوز و گداز خستگی وغیرہ کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ پس ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اُن کی غزل سرائی ان دونوں بزرگوار کی غزل سرائیوں کا لطف نہیں پیدا کر سکتی ہے۔ ذوقؔ کے تمام دیوان کو دیکھ کر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے ننانوے شعر میں

بیشتر شعر خارجی رنگ کے ہوتے ہیں اسی لئے اُن کی غزل سرائی حضرات اہل لکھنؤ کی غزل سرائی سے زیادہ مشابہ نظر آتی ہے اور اسی لئے اُن کا کلام ان کے معروف شعرائے ہم وطن کے کلاموں سے ایک علیٰحدہ انداز رکھتا ہے ؛

اگر مومن اور غالب سے ذوق کو ملایئے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذوق غزل سرائی میں اپنے ملکی مذاق کے پابند نہ تھے، بلکہ اُن کا مذاق غزل سرائی کا ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جس سے وہ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے ہم مذاق معلوم ہوتے ہیں، قوت شاعری کے اعتبار سے ذوق ایک زور آور شاعر تھے اُن کی خلاقی سخن بلند پروازی نازک خیالی نفیس مزاجی وغیرہ وغیرہ میں کسی کو مجال گفتگو نہیں ہے، مگر غزل سرائی میں وہ اس روش کے پابند نہیں رہے ہیں جو درد اور میر کی تھی، اسی لئے اُن کی غزلیں باوجود عالی خیالی وغیرہ کے وہ تاثیر قلبی پیدا نہیں کرتی ہیں جس کی متقاضی غزل سرائی ہے حضرت ذوق کے کچھ کلام بطرز نمونہ ذیل میں نذر ناظرین ہوتے ہیں جس سے اُن کی غزل سرائی کا رنگ ہویدا ہوگا ؛

ذوق کے خارجی مضامین کے اشعار

شوق نظارہ ہے جیسے اُس رُخ پرنور کا ہے مرامرغ نظر پروانہ شمع طور کا

واضح ہو کہ یہ غزل کی غزل جو شیخ ناسخ کی غزل پر لکھی گئی ہے. ناسخ کی غزل کی طرح تمام تر شاعری کا خارجی پہلو رکھتی ہے، ذوق کی اس غزل سرائی میں پچیس شعر ہیں اور سب کے سب کم وبیش طور پر خارجی مضامین سے مشتمل ہیں ؛

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

واہ کیا ہم ہم زخم دل بے تاب بنا آپ سے نشتر سر تیز کے تیزاب بنا

یوں تنِ خاکی میں دل روشن ہمارا ہو گیا — جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا
میرے نالوں سے جو پانی سنگ خارا ہو گیا — کوہ کے چشموں کا ہر آنسو شرارا ہو گیا

یاں تک عدو زمانہ ہے مردِ دلیر کا — جھلسے ہیں منہ شکار کئے پر بھی شیر کا
جس گھر میں ہو لڑائی وہاں آدمی نہیں — کانٹا ہے گھر میں ساہی کا بالِ کینر کا

دریائے اشک چشم سے جس آن بہ گیا — سُن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہ گیا

اِن سب غزلوں کے بھی اکثر اشعار تمام تر خارجی پہلو رکھتے ہیں ؛

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا — خوب طوطی بولتا ہے اِن دنوں صیاد کا
روزِ مرگ عاشقِ ناشاد ہے شادی کا دن — ہے بجائے شورِ ماتم غُل مبارک باد کا
آنچ سے تلوار کی ڈرتا نہیں یہ سخت جان — کشتہ کرنا سخت ہی مشکل ہے اس فولاد کا

یہ تینوں شعر اُس غزل کے ہیں جو ذوقؔ نے ناسخؔ کی غزل پر لکھی تھی ' یہ غزل بھی ناسخ کی غزل کی طرح اکثر خارجی مضامین سے مشتمل ہے اور کھلے ڈھلے طور سے ناسخؔ کا رنگ رکھتی ہے ؛

عالم ہے زندگی میں زمانہ شباب کا — گلشن میں برگ برگ ہے پھول آفتاب کا
جلوہ ہے کیونکہ خاک پہ تابِ عتاب کا — جلتا نہیں ہے برق سے دامن سحاب کا
اے گلرخو نہ چھیڑنا دامن سحاب کا — دیکھو چھلک رہا ہے کٹورا گلاب کا

اس غزل کے بھی تمام اشعار خارجی پہلو رکھتے ہیں یہ غزل بھی ناسخ کے رنگ کی ہے اور ناسخ کی زمین میں لکھی گئی ہے ؛

بھڑکا کیا کہوں سینہ میں اپنے آتشِ غم کا — کہ جائے پنبہ ہے ہر داغ پر شعلہ جہنم کا

جہاں میں عرصہ عشرت سے سوا دہ چند ہے غم کا　　کہ ہے گر عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا

یہ زمین بھی ناسخ کی ہے اور رنگ بھی شیخ ہی کا ہے ؛

برنگ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا　　کہ ہے باغ جہاں میں غنچہ تصویر دل میرا

مجنوں نے دی اگا جو سر خار زار پشت　　پشت اب ہجوم خار سے ہے لپشت خار پشت

ان دونوں غزلوں کے اشعار اکثر خارجی پہلو رکھتے ہیں ؛

تھی زلف تیری سنبل صحن چمن کی شاخ　　قطروں سے بر عرق کے بنی یاسمین کی شاخ

یہ ایک بڑی طولانی غزل ہے اور غزل کی غزل کا رنگ خارجی ہے ؛

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر　　ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

وہی خارجی رنگ اس غزل کا بھی ہے اسی طرح استاد ذوق کے صدہا اشعار ہیں کہ جو شاعری کا خارجی پہلو رکھتے ہیں۔ راقم عرض کر چکا ہے کہ خارجی مضامین غزل سرائی کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتے، پس جتنے حضرات غزل سرا کیا فارسی، اور کیا اردو کے جنھوں نے شاعری کا خارجی پہلو اختیار کیا ہے کبھی اغراض غزل سرائی کو پورا نہیں کر سکے، مگر حضرت ذوق کی نسبت اتنا عرض کر دینا ضرور ہے کہ آپ کا کلام اس درجہ پستی کو نہیں پہنچا ہُوا ہے کہ جو خارجی پہلو کی غزل سرائی سے عموماً نتیج ہوتا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چند عموماً غزل سرائی میں ذوق خارجی شاعری برتتے ہیں مگر اُن میں ایک خاص بات یہ ہے کہ خارجی مضامین کو کسی قدر قلبی اور ذہنی امور کے ساتھ ممزوج کر دیتے ہیں جس کے باعث اُن

کی غزل سرائی سیٹھے ہونے سے بچ جاتی ہے یہی اتنی بات ناسخ میں نہیں ہے ورنہ ناسخ خلاقی مضامین بلند پروازی اور صفائی بندش میں ذوق پر یقیناً غالب ہیں۔

ذوق کے داخلی مضامین کے اشعار

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام — خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا
سراغ عمر رفتہ ہاتھ کیا آئے — کبھی جس کا نشان پایا نہ پایا
رہ گم گشتگی میں ہم نے اپنا — غبار راہ بھی عنقا نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم — غرض خالی دل شیدا نہ پایا
مرے طالع کی وہ گردش ہے جس سے — فلک نے بھی قرار اصلا نہ پایا

واضح ہو کہ وہ غزل جس سے اشعار بالا انتخاب کر لیئے گئے ہیں، طولانی ہے مگر اُن کے علاوہ اس غزل کے جتنے اشعار ہیں خارجی پہلو رکھتے ہیں یہ اشعار بھی جو ہیں کچھ ایسا داخلی پہلو نہیں رکھتے کہ درد یا میر کے کلام کا لطف دکھا سکیں یوں تو اُستاد کے شعر ہیں خوش خیالی اور خوش ترکیبی سے خالی نہیں ہو سکتے ہے

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار — پر امید وصل پر برسوں گوارا ہو گیا

اس غزل میں تیرہ شعر ہیں مگر اُن میں یہی ایک شعر داخلی پہلو رکھتا ہے ؎

میں ہجر سے مرنے کے قرین ہو ہی چکا تھا — تم وقت پر آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا
جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا — حکم ازلی ذوق یوں ہی ہو ہی چکا تھا

سبحان اللہ کیا خوب اشعار ہیں مگر باقی اشعار غزل خارجی سے خبر دیتے ہیں ؎

بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی — جزو ضعیف محرم اسرار کل ہوا

پروازی طبیعت واری وغیرہ وغیرہ کی خوبیاں بیّن طور پر نمایاں ہیں مگر چونکہ مضمون بندی معاملات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے حسب مراد طور پر مشتمل نہیں معلوم ہوتی ہے اُن کی غزل سرائی دلچسپی نہیں پیدا کرتی ہے یعنی جو درد اور میر کی غزل سرائی سے لُطف اٹھتا ہے اُن کی غزل سرائی سے نہیں اُٹھتا ؛

منجملہ قابل لحاظ صفتوں کے اُستاد ذوقؔ میں ایک بڑا وصف یہ ہے کہ حضرت اُردو کے محاوروں کو ایسی آسانی اور روانی کے ساتھ اپنے اشعار غزل میں باندھ جاتے ہیں کہ اہل اطلاع کی طبیعت نہایت لذت یاب حیرت ہوتی ہے، لاریب فطری طور پر محاوروں کی بندشیں شاعر کے کلام کو بڑا حسن بخشتی ہے اور لغز گفتاری کو نہایت معین ہوا کرتی ہے کچھ اشعار ذیل میں ایسے درج کیے جاتے ہیں کہ محاورہ بندی کے نمونے ہیں ؎

نیمچہ یار نے جس وقت بغل میں مارا — جو چڑھا منہ اُسے میدان اجل میں مارا
اس نے جب مال بہت رد و بدل میں مارا — ہم نے دِل اپنا اُٹھا اپنی بغل میں مارا

نالہ اُس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا — اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

کھے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا — کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا — یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

کہا پتنگ نے یہ وار شمع پر چڑھ کر — عجب مزا ہے جو بیٹھے کسی کے سر چڑھ کر
مرے خیال میں وہ چشم فتنہ گر چڑھ کر — یہ خانہ جنگ بنی آئی لڑنے گھر چڑھ کر

تو کہے منچہ کہ اس لب پہ دھڑ خوب نہیں — چُپ کہ منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں

مشتے نمونہ از خروارے بہت ایسے اشعار ہیں جس میں اُستاد نے محاورہ بندی کا لطف دکھایا ہے۔ سب کے انتخاب کا یہاں موقع کہاں ہے جو درج ہذا کئے جائیں۔ البتہ ذوق مصلح زبان نہ ہوئے یہ دولت اُستاد ناسخ کے لئے اٹھا رکھی گئی تھی جو اپنے وقت پر اس یگانہ روزگار کو حوالہ کی گئی۔

غالب مرزا نوشہ نواب اسد اللہ خان۔ غالب فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے نامور شاعر ہیں اُن کی فارسی کی غزل سرائی کی نسبت راقم اظہار خیالات کر چکا ہے اب اُن کی اُردو کی غزل سرائی کی کیفیت عرض کرنے کو ہے غالب اُن شاعروں میں ہیں جو ہر صنف شاعری سے مناسبت رکھتے تھے مگر یہاں اُن کی اُردو کی غزل سرائی زیر بحث ہے۔ حضرت نے ذوق۔ مومن۔ ناسخ۔ آتش ان اُستادوں کے زمانے دیکھے اور ان سب اساتذہ کے بعد رحلت فرمائی۔ ذوق سے شاعرانہ سابقہ بھی ظہور میں آیا۔ مگر مومن سے کیا طور حضرت کا رہا۔ فقیر کو نہیں معلوم ناسخ سے لطف مراسلات حاصل تھا۔ آتش کے ساتھ موافقت یا مخالفت کی کوئی بات علم راقم میں نہیں ہے۔ اُردو کی غزل سرائی کے اعتبار سے مرزا نوشہ بہت قابل توجہ شاعر ہیں اپنی غزل سرائی کی نسبت حضرت فرماتے تھے کہ میری غزل گوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلے پہل پہنچا۔ شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی۔ میں نے اور مومن نے اُن کا متتبع ہونا چاہا۔ ہم لوگوں نے شیخ مرحوم کے رنگ میں مشق کلام کرنا شروع کیا۔ مگر شیخ کا رنگ ہم لوگوں میں نہ آیا۔ مومن مشق کے بعد ویسے ہو گئے جیسا کہ اُن کا رنگ دیکھا جاتا ہے اور ہم میر کے رنگ میں در آئے۔ اس جگہ پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مومن اور غالب کے عجز اور تتبع کا سبب اور کچھ نہ تھا۔ الا یہ کہ یہ دونوں شاعران نامی افتاد طبیعت سے داخلی شاعری کے

برتنے کی قابلیت رکھتے تھے پس ناسخ کی شاعری جو محض خارجی رنگ رکھتی ہے
کیونکہ ان کی خلقی صلاحیت کے ساتھ موافق پڑتی بہرحال غالب کا یہ فرمانا کہ ہم
میر کے رنگ میں در آئے۔ واقعات سے بہت بعید نہیں ہے حقیقت یہ ہے
کہ غالب کی غزل سرائی میں میر کی جھلک نمایاں ہے لاریب۔ واردات قلبیہ اور
امور ذہنیہ کے مضامین غالب قریب قریب، میر صاحب کی پرتاثیری کے
ساتھ باندھ جاتے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ ان کے مختصر دیوان میں بہت کم
شعر ہیں جو میر صاحب کی سادگی کلام کا لطف دکھاتے ہیں۔ زیادہ حصہ ان کے
کلام کا استعارات سے بھرا ہوا ہے۔ اضافتوں کی وہ بھرمار ہے کہ بعض وقت جی
گھبرا اٹھتا ہے کہ الٰہی اضافتوں کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ الفاظ فارسی کی وہ کثرت دیکھی
جاتی ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اردو کے اشعار زیر نظر ہیں یا فارسی کے، ان باتوں کے علاوہ
کبھی کبھی اغلاق مضامین کا وہ عالم دکھائی دیتا ہے کہ ادراک اپنے فعل میں قاصر ہونے
لگتا ہے بلاشبہ ان کے ایسے کلام کوئی لطف غرابت نہیں رکھتے اگر ان کے دیوان
کا کوئی انتخاب جدید کیا جائے تو لازم ہے کہ ایسے ایسے مغلق اشعار خارج از دیوان
کردیئے جائیں لیکن ان معائب سے گزر کر اگر اس یکتائے روزگار کے کلام کو انصاف
کی نگاہ سے دیکھئے تو پھر حسن کی کوئی انتہا بھی نظر نہیں آتی۔ واقعی جو سوز۔ گداز۔ خستگی
درد۔ برشتگی۔ نشتریت۔ بلند پروازی۔ نازک خیالی۔ ملکنت۔ متانت۔ جلالت۔ تہذیب
شوخی غالب کے کلام میں ہے۔ باستثنائے درد و میر کسی استاد کے کلام میں نہیں اپنی
ہے نشتریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام میں بھی اس سے زیادہ
نہ ہوگی پرتاثیری کا کیا کہنا۔ دل بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ غزل سرائی اسے
کہتے ہیں۔ شوخی کا وہ عالم ہے کہ طبیعت بے چین ہوئی جاتی ہے عالی مذاقی روح
کو عالم بالا کی سیر دکھاتی ہے۔ واردات قلبیہ کے مضامین کی خوبی جذباتی معاملات

کے تماشے پیش نظر کر دیتی ہے اور مختصر یہ ہے کہ حضرت کے کمالات گوناگوں کا وہی قائل نہ ہوگا جسے قلبی نعمتوں سے فطرت نے محروم رکھا ہے ذیل میں کچھ کلام معجز نظام نذر ناظرین ہوتا ہے ؂

غالب

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی ہوا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھکر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زود پشیمان کا پشیمان ہونا
حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑینگے پرزے — دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو　　اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے　　کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یا الہٰی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں　　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی امید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

واضح ہو کر اشعار بالا کے رنگ کے بہت اشعار دیوان غالب میں موجود ہیں سب کے انتخاب کا یہاں موقع نہیں ہے حضرات شائقین خود دیوان کو ملاحظہ فرمالیں لیکن چونکہ غزل سرائی حضرت غالب کی سوز و گداز درد محبت خستگی برشتگی نشتریت عالی خیالی، دل آویزی، خوش مذاقی، شیریں بیانی، نفیس پسندی، شوخی، رفعت تمکنت، جلالت متانت وغیرہ سے معمور ہیں۔ اس لئے چند پوری غزلیں ذیل میں درج

کی جاتی ہیں کہ حضرات ناظرین اُن سے حظ رُوحی اُٹھائیں اور ہر چند اُن میں میر صاحب کے کلام کے سادگی نہیں ہے۔ تو بھی اُن میں غزلیت کا ایسا لطف ہے کہ یہ لُطف کمتر استادوں کے کلام میں دیکھا جاتا ہے:

غزل نمبر ۱

درد منت کش دوا نہ ہُوا ۔۔۔ مَیں نہ اچھا ہُوا بُرا نہ ہُوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ۔۔۔ اک تماشا ہُوا گلا نہ ہُوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں ۔۔۔ تو ہی جب خنجر آزما نہ ہُوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ۔۔۔ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہُوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ۔۔۔ بندگی میں مرا بھلا نہ ہُوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی ۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما ۔۔۔ کام گر رک گیا روا نہ ہُوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے ۔۔۔ لے کے دل دلستاں روانہ ہُوا
کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں ۔۔۔ آج غالب غزل سرا نہ ہُوا

غزل نمبر ۲

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا ۔۔۔ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ۔۔۔ اُس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں ۔۔۔ کبھی فتراک میں تیری کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ۔۔۔ ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا ۔۔۔ بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعذیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں رکھیئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

ریختی کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غزل نمبر ۳

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایاں دست و بازوے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشت وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

غزل نمبر ۴

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

غزل نمبر ۵

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکش چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچہ کی ہوس
کیوں ہے گرد رہ جولان صبا ہو جانا

تا کہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

بخشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

غزل نمبر ۶

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
مری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

غزل نمبر ۷

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئینگے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں — بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز — آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ — تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم — اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع — راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی — جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

غزل نمبر ۸

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو — نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ — کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے — نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں — عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جسکے اسکا دشمن آسماں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

غزل نمبر ۹

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خوں کرنیکی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

غزل نمبر ۱۰

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ — تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں — بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا — کل تم گئے ہم پہ قیامت گذر گئی

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

غزل نمبر ١١

کوئی دِن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں — سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں — پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم — وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

غزل نمبر ۱۲

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
ساماں صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخون دل
سازِ چمن طرازی داماں کئے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذر دلفریبی عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

فقیر کی دانست میں اگر کوئی شاعر اپنی تمام عمر میں صرف بارہ غزلیں ایسی جو
بالا میں رقم ہوئیں۔ تصنیف کرے تو اُسے صاحبِ دیوان ضخیم ہونے کی حاجت
نہیں ہے۔ یہ غزلیں اعلیٰ درجہ کی غزل سرائی سے خبر دیتی ہیں۔ علاوہ ان کے اور بھی
غزلیں دیوان غالب میں موجود ہیں۔ جو انتخاب کا حکم رکھتی ہیں یہ بارہ غزلیں تو
صرف نمونہ کے طور پر مندرج کی گئی ہیں بہر حال یہ بارہ غزلیں اہل انصاف کو رائے
قائم کرنے کے واسطے کافی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُستاد غالب اُردو میں بڑے
غزل سرا گذرے ہیں۔ یوں تو بے عیب ذات خدا کی ہے مگر اس پر بھی اُن کی غزل
سرائی معائب غزل سرائی سے بہت کچھ پاک ہے، لاریب اُن کی غزل سرائی قریب
قریب غزل کے تقاضوں کے موافق ہے اگر غالب، درد یا میر تک اس صنعت
شاعری میں نہیں پہنچتے ہیں تو ان دونوں استادوں کے بعد انھیں کا درجہ ہے واقعی
باستثنائے خواجہ و میر کسی کی غزل سرائی ایسی نہیں دیکھی جاتی ہے، جو دل کو ہلا
دے یوں تو پر تاثیری سے اُستادوں کا کلام خالی نہیں ہوتا۔ اس جگہ فقیر اپنی ذاتی
کیفیت دلی کو عرض کر رہا ہے، نہیں معلوم کہ اس عاجز کا قول کلیہ کا حکم رکھتا ہے
یا نہیں مگر اکثر کیفیتیں جو احقر پر غالب کے شعروں سے گزری ہیں اُن سے اپنی
رائے وہی قائم ہوئی ہے جیسے تجربہ شخصی کے طور پر اس ہیچمدان نے بالا میں عرض کیا
خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے کلاموں کی پر تاثیری سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، مگر
غالب کی نسبت بھی فقیر کا یہی عقیدہ ہے کہ اُن کے کلام کی تاثیر عجب ڈھنگ رکھتی
ہے راقم بہت ایسی صحبتوں میں شریک رہا ہے، جہاں بہت اُستادوں کے کلام
پڑھے گئے ہیں مگر غالب کے کلام نے رنگِ جلسہ کو بدل دیا ہے ایک بار کی سرگزشت

ہے کہ بندہ سیر و شکار کی نظر سے ایک صحرا میں خیمہ زن تھا کچھ ارباب مذاق جو مدعو تھے شام کے بعد شعر خوانی فرمانے لگے بہت سے اُستادوں کے کلام پڑھے گئے اور سب حضرات تلذذ روحی اُٹھاتے گئے۔ آخر ایک طبیعت دار جوان رعنا نے یہ مقطع غالبؔ کا پڑھا ؎

زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ شعر غیر معروف نہ تھا مگر اس سے کچھ عجیب کیفیت قلبی پیدا ہوئی اُسی وقت سے تا سحر اس دل گرفتہ کو سخت بے قراری لاحق رہی فقیر کے دل سے اُس دن کی نماز صبح کا مزا نہیں جاتا۔ کاش ایسی صبح دولت خیز ہر روز نصیب ہوتی واقعی جس کلام میں تاثیر نہ ہو تو وہ کلام گو ہزار صنائع بدائع سے بھرا ہوا ہو۔ قابل نفرت ہے اسی طرح ایک بار شب کو ایک دوست نے خواجہ میر دردؔ کے یہ دو شعر پڑھے ؎

یہی پیغام دردؔ کا کہنا جب صبا کوئے یار میں گذرے

کون سی رات آن ملئے گا دن بہت انتظار میں گذرے

حالانکہ ان شعروں سے بھی عاجز کو سابق سے واقفیت حاصل تھی۔ مگر دل کا یہ عالم ہوا کہ خدایا تیری پناہ۔ وہ رات تو بُری گذری مگر ایک ہفتہ تک وحشت کی کیفیت قائم رہی میر صاحب کے نشتروں کی کیفیتوں کو بیان کرنا فضول ہے۔ کون شخص ایسا ہے کہ جو دل رکھتا ہے اور اُن کا زخم خوردہ نہیں ہے المختصر غزل سرائی ایک ایسی شے ہے کہ جس کو محض دل سے تعلق ہے اور ظاہر جیسی غالبؔ کی غزل سرائی نظر آتی ہے اُس سے اُنکا ایک بامراد غزل سرا ثابت ہونا العبید از انصاف نہیں ہے ؟

حضرت غالبؔ کے کچھ وہ اشعار جن سے لطفِ غزلیت نہیں اُٹھتا، نمونہ کے طور پر ذیل میں عرض کیے جاتے ہیں۔ مگر ایسے اشعار بہت نہیں ہیں؛

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ‏— تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے ‏— کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہری قاتل ‏— کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا ‏— بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا ‏— بمہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

ظاہر ہے کہ اِن اشعار میں غزلیت کا کوئی مزا نہیں ہے اِن سے پُرتاثیری کی کیا امید کی جاتی ہے اگر ایسے ایسے اشعار خارج از دیوان کر دیئے جائیں تو سوا فائدہ کے کوئی نقصان متصور نہیں ہے؛

ناسخ

ناسخؔ۔ شیخ امام بخش ناسخؔ، زبانِ اُردو کے مصلح گزرے ہیں اِس اعتبار سے اُن کا یہ تخلص نہایت حسبِ حال ہے۔ شیخ نے اُردو کو خراش تراش کر ایسا درست کر دیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ذوقؔ نے صرف مضمون آوری کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی اور اصلاحِ زبان پر مطلق مائل نہ ہوئے۔ مومنؔ کو بھی اِس جانب کچھ میلان نہ ہُوا۔ غالبؔ نے تو فارسی کی اِس قدر آمیزش کر دی کہ اُردو پر زبانِ فارسی کا شُبہ ہونے لگا۔ حضرت نے فارسی الفاظ یا فارسی جملوں کو اِس طرح باندھا کہ اُردو فارسی نما ہو گئی۔ اِس کے برخلاف شیخ نے گو الفاظِ فارسی سے اجتناب نہ کیا مگر ترکیب ایسی ملحوظ رکھی کہ اُردو اُردو رہ گئی، بلکہ اگر کسی فارسی جملہ کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی تو فارسی کو اُردو کر کے دکھا دیا۔ مثلاً شیخ

فرماتے ہیں ؎

سوالِ وصل پہ ہلنا پہ پردہ تیرے ابرو کا　　اشارہ ہے براتِ عاشقاں برشاخ آہو کا

لاریب زبانِ اردو شیخ کی کوششوں کی تمام تر ممنون ہے، اگر جناب شیخ کو اصلاحِ زبان کی طرف توجہ نہ ہوتی تو زبانِ حال کی صورت پیدا نہ ہوتی۔ بہر حال اب دیکھنا چاہیئے کہ شیخ کی طباعی سے غزل سرائی کو کس قدر فائدہ پہنچا۔ اہلِ واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ شیخ کی شاعری کی شہرت مجرد غزل سرائی کی بنیاد پر ہے، کس واسطے کہ اور اصنافِ شاعری میں شیخ کی کوئی تصنیف ممتاز شکل نظر نہیں آتی ہے، لیس شیخ کی غزل سرائی ہی اصنافِ شاعری سے ہے۔ جس کی نسبت رائے زنی کی حاجت ہے، واضح ہو کہ شیخ کے ہر دو دیوان کے معاینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بہ کثرت اپنی غزل سرائی میں شاعری کا خارجی پہلو برتا کیئے ہیں یعنی ایسے مضامین کو باندھا کیئے ہیں جن کو عالمِ خارج سے تعلق ہے۔ اسی وجہ سے شیخ کا رنگ درد۔ میر۔ مومن اور غالب سے تمامتر علیٰحدہ ہے شیخ کی غزل سرائی ذوق کے رنگ سے بھی مطابقت نہیں رکھتی ہے اس لئے کہ ذوق بیشتر داخلی اور خارجی شاعری کی آمیزش کے ساتھ غزل سرائی کرتے تھے۔ اُن کا رنگ خالص خارجی نہ تھا۔ شیخ کی غزل سرائی تو ایسے دکھائی دیتی ہے کہ سو شعر میں کہیں ایک شعر داخلی رنگ رکھتا ہے اور باقی اشعار پورے طور پر خارجی پہلو رکھتے ہیں یعنی باقی اشعار کے مضامین اشیائے موجودہ فی الخارج سے کہ عبارت عالمِ مادی سے ہے تعلق رکھتے ہیں اور واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے اس میں شک نہیں کہ خارجی پہلو کے اختیار کرنے سے شیخ کو شاعری کا ایک ایسا میدان وسیع ہاتھ آگیا جس میں غزل سرائی کی حیثیت سے درد۔ میر۔ مومن اور غالب نے

کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ پس شیخ کے سے بلند فکر، عالی دماغ شاعر نے جو ایسے میدان میں قدم رکھا تو غزل سرائی کا دائرہ تنگ، بہت وسیع ہو گیا۔ چنانچہ وہ خیالات شیخ کی بدولت بڑی کثرت کے ساتھ احاطۂ غزل سرائی میں داخل ہو گئے جو در حقیقت احاطۂ غزل سے باہر ہیں یعنی شیخ نے اُن خیالات کو زبردستی کے ساتھ احاطۂ غزل سرائی میں داخل کر دیا۔ جو قصیدہ و قطعہ وغیرہ کے لیئے مخصوص ہیں لیکن اس زور آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ واردات و جذبات قلبیہ اور دیگر امور ذہنیہ کے مضامین سے شیخ کی غزلیں معرا ہو گئیں اور غزل سرائی کا مطلب فوت ہو کر ایک ایسی قسم کی شاعری ایجاد ہو گئی جس پر نہ قصیدہ گوئی اور نہ غزل سرائی دو میں سے کوئی تعریف صادق نہیں آتی ہے۔ واقعی بہت خوب ہوتا اگر شیخ اپنی حیرت انگیز قوت شاعری کو اور کسی صنف شاعری میں صرف فرماتے اور غزل سرائی کے حدود کو درد۔ میر۔ مومن اور غالب کی حدود بندی پر قائم رہنے دیتے۔ بخیال راقم غزل سرائی کا احاطہ وسعت پذیر ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا ہے اس واسطے کہ اس صنف شاعری میں خارجی مضامین داخل نہیں کیئے جا سکتے۔ ایسے مضامین کے دخل پانے سے غزلیت جاتی رہتی ہے۔ کبھی خارجی مضامین سے حافظ یا میر کی غزل سرائی کا لطف پیدا نہیں ہو سکتا۔ خارجی پہلو کے اختیار کرنے سے ضرور ہے کہ کلام میں صائب یا ناسخ کا رنگ آ جائے۔ جو غزل سرائی کے اعتبار سے مرغوب و محبوب نہیں ہے یہی سبب ہے کہ اکثر با مذاق حضرات صائب اور ناسخ کی غزل سرائی کو بے لذت کہتے ہیں اور کھلے ڈھلے طور پر کہہ جاتے ہیں کہ ان دونوں کے کلام سیٹھے ہیں اور امر حق بھی یہی ہے کہ جب واردات و جذبات قلبیہ کے مضامین باندھے نہ جائیں گے تو کلام میں ضرور سیٹھ پن محسوس ہو گا اور یہ امر بین طور پر تقاضائے غزل گوئی

کے محض خلاف ہے۔ بہرکیف شاعری کے اعتبار سے لاریب شیخ بڑے طباع اور
خلاق سخن تھے۔ اُن کی نازک خیالی اور بلند پروازی نادر انداز رکھتی ہے۔ کلام میں بلاغت
فصاحت کے ساتھ شیر و شکر ہو رہی ہے دونوں دیوان جواہر مضامین کے معدن ہیں
علاوہ ان خوبیوں کے اُن کے کلام پُر از متانت و جلالت، شوکت حشمت تہذیب و
وقار نظر آتے ہیں۔ شیخ علی العموم غزلیں سیر لکھتے ہیں۔ دشوار دشوار مضامین کو آسانی کے
ساتھ باندھ جاتے ہیں ان کے لفظوں کی نشست عقد مروارید کا حکم رکھتی ہے مگر ان مضمون
کے ساتھ تشبیہہ کو اُسی افراط کے ساتھ کلام میں دخل دیتے ہیں جیسا کہ غالب کی غزلوں
میں استعارہ کی کثرت دیکھی جاتی ہے۔ ناسخ کی تشبیہیں اکثر بلند خیالی کی داد دیتی ہیں
اس پر بھی کبھی کبھی پھبتی کا انداز پیدا کرتی ہیں اول تو کثرت تشبیہہ سے اعلیٰ درجہ کی غزل
سرائی مستغنی ہے۔ پھر جب تشبیہہ پھبتی کی پستی کو پہنچ جاتی ہے تو اس سے اغراض
غزل سرائی میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی اسی طرح مبالغہ پردازی کی طرف بھی میلان شیخ
پایا جاتا ہے اور جب مبالغہ پردازی درجۂ اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے تو شیخ
سے فطرت کی راہ چھوٹ جاتی ہے اس وضع کے معائب غزل سرائی کے ساتھ شیخ
ناسخ بلا گفتگو اُستاذ الاُستاذ مانے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں، حضرت کے ایک
بڑے نامور شاعر ہونے میں کسی صاحب عقل و تمیز کو گفتگو نہیں ہو سکتی۔ شیخ کی ذات
پر لکھنؤ بلکہ تمام ہندوستان کا فخر و مباہات کرنا بجا ہے اور اہل فن جو کچھ اس یگانۂ روزگار
کو عزت و توقیر کے ساتھ یاد فرمائیں درست ہے۔ ذیل میں ایک غزل شیخ کی نمونہ کے
طور پر درج کی جاتی ہے:

غزل ناسخ

سبزۂ خط گورے گالوں پر نمایاں ہوگیا
یاسمن زار صباحت سنبلستاں ہوگیا

آگیا مجھ کو جو اس زلف پریشاں کا خیال
دم میں مجموعہ عناصر کا پریشاں ہوگیا

تنگیٔ محفل کی دولت بھڑ کے بیٹھا مجھ سے یار
رات اہل بزم کی کثرت کا احساں ہوگیا

منہ لگاتے ہی سنے قلیاں بنی ہے نے شکر
دود دندان کو نسیم باغ رضواں ہوگیا

ہو کے خم تسلیم کرتے ہی کیا مجھ کو شہید
قد ترا اے ظالم کمان تیر مژگاں ہوگیا

خود بخود ہوتا ہے پرزے آتے ہی فصل بہار
یاں گریباں اے جنوں گل کا گریباں ہوگیا

اس قدر مضمون ترے دست حنائی کے لکھے
جو قلمدان میں قلم تھا شاخ مرجاں ہوگیا

چاند چھپتا ہے جو دو دن ہوتی ہے مشتاق خلق
ہوگئی قدر اُس کی جو نظروں سے پنہاں ہوگیا

بعد مردن بھی ہے باقی مجھ سے خوش چشموں کو ضد
سبزۂ تربت چراگاہ غزالاں ہوگیا

پاؤں بھی اب اے جنوں کر دیجیے کانوں کے نذر
سر تو مدت سے نیاز سنگ طفلاں ہوگیا

ہوگیا وہ مصر ہے جس شہر میں تصویر یار
جس کنوئیں کو ہم نے جھانکا چاہ کنعاں ہوگیا

ہم وہ مجنوں ہیں کہ جو خورشید رو آیا نظر
صبح ساں اپنا دہن چاک گریباں ہوگیا

مشتعل ایسے ہیں اس کے دست نازک خود بخود
طائر رنگ حنا بھی مرغ بریاں ہوگیا

سر اٹھا کر جو چلا اس دشت وحشت خیز میں
پار تلووں سے وہیں خار مغیلاں ہوگیا

شمعیں کافوری جلاتے تھے سو انکی گور پر
دیدۂ غول بیاباں سے چراغاں ہوگیا

کوئی دم پیری بھی اپنی ہے بسان صبح دم
مثل شب عہد شباب آنکھوں سے پنہاں ہوگیا

کیوں سلاطین زمانہ سن گئے ہیں باد پھر
تختۂ تابوت جب تخت سلیماں ہوگیا

ہر سحر سُن کر ترے مجنوں کا غل کہتی ہے خلق
چاک کیا صبح قیامت کا گریباں ہو گیا

سرکشی کرتے ہیں مجھ سے جو کہ ہیں پامال خلق
شیر قالین بھی مجھے شیر نیستاں ہو گیا

یار کے جاتے ہی بھر آئے مری آنکھوں میں اشک
جوش تاروں کا ہوا خورشید پنہاں ہو گیا

رشک جو آتا ہے ناسخ بخت بلبل پر مجھے
جب کھلا غنچہ مرا ٹکڑے گریباں ہو گیا

اہل دانش پر ہویدا ہے کہ غزل بالا کے تمام اشعار خارجی پہلو کے ہیں۔ ایک شعر بھی داخلی رنگ نہیں رکھتا ہے۔ پس جس غزل میں داخلی رنگ کا فقدان ہو تو اُس میں واردات و جذبات قلبیہ کے مضامین موجود نہیں رہ سکتے۔ یہی طرح شیخ کی اکثر غزلیں تمام تر خارجی رنگ رکھتی ہیں اور درحقیقت یہ ہے کہ شیخ کی کوئی غزل نظر سے نہ گزری جو درد و میر۔ مومن یا غالب کے داخلی رنگ میں لکھی گئی ہو یہی سبب ہے، کہ وہ حضرات جو غزل سرائی کے نقاضوں سے واقفیت رکھتے ہیں شیخ کی غزل سرائی کو پسند نہیں فرماتے، ورنہ شاعری کے اعتبار سے شیخ کی شاعری بڑی خلاقی سخن نازک خیالی اور بلند پروازی سے خبر دیتی ہے۔ اور درحقیقت شیخ کی شاعری ایسی ہی رفیع و جلیل ہے کہ ہر قدر شناس سخن اس کو بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ فقیر کو اکثر یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش شیخ کی قابلیت شاعری اور کسی صنف شاعری میں صرف ہوئی ہوتی۔ جیسے اس کی کوئی حاجت نہ تھی نمونہ کے طور پر دو غزلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ اُن میں ایک شیخ کی ہے اور دوسری غالب کی۔ ان دونوں کے معاینہ اور موازنہ سے ظاہر ہو گا کہ کس کا رنگ خارجی اور کس کا داخلی ہے ؛

غزل ناسخ

ششدر سا رہ گیا ہوں دریار دیکھ کر — دیوار بن گیا ہوں میں دیوار دیکھ کر
اک برہمن کے عشق میں ہے آنسوؤں کا تار — سبحہ نکالی ہم نے بھی زنار دیکھ کر
کیفیتیں جو خم میں ہیں زمزم میں وہ کہاں — بھولا ہے کعبہ خانۂ خمار دیکھ کر
کیا اختلاط سادہ موسم گل میں بہاؤں میں — روؤں لہو وہ پھول سے رخسار دیکھ کر
سوکھا ہوں غم سے مثل عصائے کلیم میں — وہ اژدہا ہے گیسوئے خمدار دیکھ کر
زنجیر زلف یار کی تاثیر دیکھنا — دیوانے روز ہوتے ہیں دوچار دیکھ کر
پھینکا ہے دور تیر کو غصہ سے یار نے — رخسار کی طرف لب سوفار دیکھ کر
زلفیں نظر جو آئیں تو الجھن ہے نزع کی — جیتے سے تنگ ہوں دہن یار دیکھ کر
پریاں تمام تخت سلیمان کو بھول جائیں — اے جان جان ترا یہ ہوا دار دیکھ کر
زنجیر سمجھے سنبل پیچاں کو ہجر میں — وحشت زیادہ ہو گئی گلزار دیکھ کر

ناسخ ہو جائے سرمہ سیاہی حروف کی
روشن ہوں آنکھیں نامۂ دلدار دیکھ کر

غزل غالب

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے — سرگرم نالہائے شرر بار دیکھ کر
کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا — رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے ‏ — ‏ مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق ‏ — ‏ لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ‏ — ‏ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ ‏ — ‏ لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال ‏ — ‏ رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

اِن آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں ‏ — ‏ جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر ‏ — ‏ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

اربابِ رائے دونوں اُستادوں کے کلاموں کو موازنہ فرمائیں۔ تجویز ظاہر ہو جائے کہ غزل سرائی کے لئے داخلی شاعری کی کس قدر حاجت ہے۔ فقیر کی دانست میں خارجی شاعری سے غزل سرائی کے اغراض کا پورا ہونا ناممکنات سے ہے حضرت ناسخ حضرت غالب سے قابلیت شاعری میں کبھی کم نہیں ہیں۔ مگر خارجی پہلو برتنے کے باعث اُن کی غزل غزلیت کا مزہ نہیں دیتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خارجی رنگ کی غزل سرائی داخلی رنگ کی سرائی کی پُر تاثیری کا لُطف دکھائے۔ مثالاً راقم دو غزلیں اور بھی درج ہذا کرتا ہے اُن میں ایک اُستاد ذوق کی اور دوسری غالب کی۔ غزل سرائی میں داخلی رنگ کو خارجی رنگ پر کیا غلبہ ہوا کرتا ہے وقت موازنہ اہلِ انصاف پر روشن ہو جائے گا۔

غزل ذوقؔ

کہاں فلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

بجھا نہ گریہ ہے گر سوزِ دل کو آب تو دے
اور آگ میں یوں ہی دینا ہے گر عذاب تو دے

الٰہی چشم کے چشمہ کو اتنا آب تو دے
کہ سر پہ چرخ بھی دکھلائی جوں حباب تو دے

کھلے ہے ناز سے گلشن میں غنچۂ نرگس
ذرا دکھا اسے تو چشمِ نیم خواب تو دے

دلِ برشتہ کو میرے نہ چھوڑ اے میخوار
جو لذت اس میں ہے ایسا مزہ شراب تو دے

کہاں بجھی ہے تہِ خاک میری آتشِ دل
کہو ہوا سے ہلا دامنِ سحاب تو دے

تمہارے مطلعِ ابرو پہ خال کہتا ہے
کہ ایسا نقطہ کوئی وقتِ انتخاب تو دے

درِ قبول ہے درباں نہ بند کر درِ یار
دعائے خیر ذرا ہونے مستجاب تو دے

صبا بگولہ بنے کشتگانِ زلف کی خاک
کہ بعدِ مرگ بھی معلوم پیچ و تاب تو دے

شہید کرتا ہے قاتل تو پھر ہے جلدی کیا
ذرا ٹھہر سنے تہِ تیغ اضطراب تو دے

بلا سے آپ نہ آئیں پر آدمی اُن کا
تسلی آ کے مجھے وقتِ اضطراب تو دے

شکار بستہ فتراک کو ترسے مقدار
ہوا نہ یہ بھی کہ بوسہ سرِ رکاب تو دے

نشہ میں ہوش کسے جو گنے حساب کرے
جو تجھ کو دینے ہوں بوسہ بلا حساب تو دے

زبانِ خنجرِ قاتل نے کیا کہا تجھ سے
دلِ شہید تو چپ کیوں ہے کچھ جواب تو دے

ہماری آنکھ سے ہم چشم ہوگا کیا دریا
کسی کو بھر کے ذرا کاسۂ شراب تو دے

بلا سے کم نہ گریہ سے میرا سوزِ جگر
بجھا پر اُن کی ذرا آتشِ عتاب تو دے

خنک دلوں کی اگر مشتِ خاک دوزخ میں
پڑے تو واقعی اکبار آگ داب تو دے

کریگا قتل وہ اے ذوق تجھ کو سُرمہ سے   نگہ کی تیغ کو ہو نے سیاہ تاب تو دے

پہنچ رہوں گا سر منزل فنا اسے ذوق
مثال نقش قدم کر نے پا تراب تو دے

غزل غالب

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے   ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا   تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو   نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے   پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اہل انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ استاد ذوق کی غزل کس قدر طولانی ہے مگر چونکہ از مطلع تا مقطع خارجی رنگ رکھتی ہے کسی طرح کا حسب مراد اثر دل پر پیدا نہیں کرتی۔ برخلاف اس کے غالب کی غزل ہے کہ نہایت ہی مختصر ہے مگر داخلی رنگ رکھنے کے باعث کس قدر پُر اثر ہے اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ غزل سرائی میں شاعر کو داخلی پہلو برتنے کی کس قدر حاجت ہے بے داخلی پہلو برتے غزلیت کا لطف پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اُستاد ناسخ نے غزل سرائی میں خارجی پہلو کو اختیار کیا اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی غزلوں میں دلچسپی کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکی۔ لیکن کہیں کہیں اشعار داخلی رنگ کے شیخ کی غزلوں میں جو نظر آتے ہیں تو اُن سے طبیعت

کو حظ اُٹھاتا ہے۔ ایسے اشعار بہت نہیں ہیں۔ بہر حال کچھ ایسے اشعار ذیل نذر ناظرین ہوتے ہیں ؛

اشعارِ ناسخ

سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں
ہم سر زلف گرہ گیر لئے پھرتے ہیں

کون تھا صید وفادار کہ اب تک صیاد
بال و پر اس کے ترسے تیر لئے پھرتے ہیں

تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

دل میں پوشیدہ بت عشق بتاں رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کے مانند نہاں رکھتے ہیں

بزم جاناں میں کبھی بات نہ نکلی منہ سے
کہنے کو شمع کے مانند زباں رکھتے ہیں

مثل پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس
ہم فقط تجھ پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

طائر روح کو کر دیتے ہیں کیونکہ بسمل
تیر رکھتے ہیں پر ابرو نہ کماں رکھتے ہیں

ہو گیا زرد پڑی جب کہ حسینوں پہ نظر
یہ عجب گل ہیں کہ تاثیر خزاں رکھتے ہیں

بھاگئی کون سی وہ بات بتوں کی ورنہ
نہ کمر رکھتے ہیں کافر نہ دہاں رکھتے ہیں

عوض ملک جہاں ملک سخن ہے ناسخ
گو نہیں حکم رواں طبع رواں رکھتے ہیں

اُڑ کے ساتھ یہ مشت غبار لیتا جا
رہیں رکاب میں اے شہسوار لیتا جا

مقابل آپکی آنکھوں کے آہو ہو نہیں سکتا
انہیں کے آگے جادو گر سے جادوگر ہو نہیں سکتا

لہو سارے بدن کا کر دیا ہے خشک فرقت نے
مگر اے آہ تجھ سے خشک آنسو ہو نہیں سکتا

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

حضرات سخن داں پر روشن ہے کہ اشعار بالا کسی قدر داخلی [illegible]

جس کے باعث فی الجملہ ان میں دلچسپی پائی جاتی ہے مگر ان میں بہت اعلیٰ درجہ کے
واردات قلبیہ کے مضامین نہیں ہیں۔ درد یا میر کے انداز کلام تک نہیں پہنچتے ہیں
آخر میں شیخ کی غزل سرائی کی نسبت قابل لحاظ ایک اور بات بھی گزارش کی جاتی
ہے کہ علاوہ فصاحت و بلاغت کے شیخ کا کلام پیراز تہذیب دیکھا جاتا ہے کوئی
شعر ایسا نہیں پایا جاتا ہے جس سے کچھ بھی کوچہ گردی کی بو نکلتی ہو۔ شیخ کبھی فسق و
فجور کے مضامین نہیں باندھتے، کوئی مضمون عشق ایسا حوالہ قلم نہیں فرماتے جو محض
حسینان بازاری سے تعلق رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ حسینان بازاری زنہار اس
قابل نہیں ہیں کہ عشق ایسے پاک امر کے ساتھ یاد کیے جائیں کوئی صافی طینت
اور پاک فطرت، آدمی کسی حسین بازاری کے ساتھ تعلق عشق نہیں رکھ سکتا ہے
پس شیخ کا اجتناب ایسے مضامین کی بندش سے جو تقدس طہر پاکبازی کے خلاف
ہوں بہت کچھ قابل احترام ہے اس جگہ ایک مطلع حضرت کا عرض کیا جاتا ہے۔
جس میں ایک بڑی تعلیم ملحوظ رہی ہے، خاص کر حضرات نوجوان کو اسے گوش دل
سے سننا چاہیئے ؛

اہل ہمت بہ خود ہیں، بیت اُن کا خریدار نہ ہو — جو ہوس سودا کبھی اے دل سر بازار نہ ہو

واقعی اس شعر میں بڑی قومی اصلاح مدنظر رہی ہے یہ اُن اقسام اشعار سے
ہے۔ جو بیلے انتہا مفید معاشرت ہیں ؛

آتش

خواجہ حیدر علی آتش۔ شیخ ناسخ کے ہمعصر تھے، مگر چند سال
تک شیخ کے بعد زندہ رہے لکھنؤ میں آتش بھی ناسخ کی طرح
شاعر مسلم الثبوت مانے جاتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ کی غزل سرائی دونوں

شاعران گرامی کے اجتہادات کی ممنون ہے شیخ اور خواجہ کے وقت سے جتنے مسلم الثبوت غزل سرا لکھنؤ میں گزرے ہیں۔ یا ماشاءاللہ اس وقت موجود ہیں انھیں دونوں اُستادوں کی پیروی کرنیوالے نظر آتے ہیں دونوں استادوں کے بڑے بڑے نامی گرامی شاگرد گزرے ہیں۔ جن کے دواوین چھاپ ہوکر مختلف دیار میں شائع ہو گئے ہیں خواجہ اور شیخ میں شاعرانہ مقابلہ ہوا کرتا تھا اور بڑے بڑے مشاعرے ان دونوں بزرگواروں کے دم سے قائم ہوتے تھے۔ شہرت شاعری میں خواجہ شیخ سے کم نہیں ہیں۔ چنانچہ شیخ کے نام کے ساتھ خواجہ کا نام بھی آج تک السنۂ خلائق پر جاری ہے۔ خواجہ کے دونوں دیوانوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بھی شیخ کی طرح اکثر غزل سرائی میں شاعری کا خارجی پہلو برتتے تھے، یہ وہی رنگ ہے جس کے پابند جمیع متغزلین لکھنؤ نظر آتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی غزل سرائی کا فرق یہی ہے کہ اُستادان دہلی بیشتر غزل سرائی میں داخلی پہلو کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اُستادانِ لکھنؤ اس کے برخلاف کاربند ہوتے ہیں یہی ایک امر ایسا ہے جس نے ان دونوں جگہوں کی غزل سرائی کو دو شئے بنا رکھا ہے، جاننا چاہیئے کہ اس امر کی واقفیت پر سخن فہمی کا مدار ہے۔ بلے اس امر کی دانست کے نہ ان دونوں جگہوں کی غزل سرائی کا فرق سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ کسی غزل گو کے حسن و قبح کلام سے خبر ہوسکتی ہے ذیل میں ایک غزل خواجہ صاحب کی درج کی جاتی ہے جس سے خواجہ صاحب کا مذاق غزل سرائی ظاہر ہوگا۔ اسی زمین میں ایک غزل غالبؔ کی بھی ہے جو پہلے نذر ناظرین ہوچکی ہے وقت مقابلہ اہل بینش پر روشن ہو جائے گا کہ خواجہ کی غزل خارجی پہلو اور غالبؔ کی غزل داخلی پہلو رکھتی ہے +

غزل آتش

شگیں آنکھیں تمھاری آفت جاں ہو گئیں
برچھیاں عاشق کشی کرنیکو مژگاں ہو گئیں

ہو جا نکلے نسیم نوبہاری کی طرح
پھول کھل کھل کر گل لالہ کی کلیاں ہو گئیں

ے صبا دامن ہے، تیرا اور مجھ مجنوں کا ہاتھ
اس پری رو کی اگر زلفیں پریشاں ہو گئیں

ہنے سینے لگا رخسارۂ زیبا سے یار
صورت آئینہ آنکھیں اپنی حیراں ہو گئیں

ندی ہاتھوں میں ملی تو تے جو اسے دریاے حسن
انگلیاں رنگ حنا سے شاخ مرجاں ہو گئیں

تی سے نیزۂ مژگاں بنا بالائے یار
وہ بھویں اپنی کجی سے تیغ عریاں ہو گئیں

نہ دل میں تصور خوش جمالوں کا رہا
گاہ حوریں گاہ پریاں اپنی مہماں ہو گئیں

ہ گردی میں کھائی تیغ قاتل نے بہار
بسملوں سے شہر کی گلیاں گلستاں ہو گئیں

بر عاشق سے دیکھا جس نے دیوانہ ہوا
حسن سے پریاں بلائے جان انساں ہو گئیں

ے مراد دل ترے کوچہ میں رکھتے ہی قدم
حسرتیں جو کچھ کہ تھیں گرد پریشاں ہو گئیں

بہ کھلا آتش عناصر سے دل دیوانہ کہ
چار دیواریں اٹھی ہو کے زنداں ہو گئیں

دونوں غزلوں کے موازنہ سے ظاہر ہوگا کہ غزل سرائی کے لیے داخلی پہلو کی کس
رحاجت ہے۔ جناب آتش مرزا اسد اللہ خاں غالب سے قابلیت شاعری
بھی کم نہ تھے مگر خارجی پہلو اختیار کرنے سے خواجہ کی غزل حسب مراد تاثیر نہیں
کہ ہکی خیال راقم خواجہ کی نسبت یہ ہے کہ اگر وہ دہلی وطن ہوتے تو تقاضائے
ئی سے ان کی غزل سرائی بھی قرینہ غالب زیادہ داخلی رنگ کی ہوتی۔ پس ایسی

صورت میں وہ یا درد و دبیر کے جواب ہوتے یا مومن اور غالب کے ہمسر یا ان دونوں سے بھی بہتر غزل سرا نکلتے۔ خواجہ کی فطری صلاحیت بڑے اعلیٰ درجہ کی معلوم ہوتی ہے مگر چونکہ شیخ ناسخ اپنا رنگ جما چکے تھے، خواجہ کو تقاضائے زمانہ سے بہت کچھ ملکی رنگ کو اختیار کرنا پڑا۔ ہزار افسوس کہ خواجہ کو داخلی پہلو کے اختیار کرنے کا موقع نہ ملا۔ ورنہ غزل سرائی کا رتبہ بہت اعلیٰ ہو جاتا بہرکیف اس خارجی رنگ کے ساتھ بھی خواجہ کے کلام میں ایسی بات ہے کہ شیخ ناسخ کو باوجود بڑی طباعی اور خلاقیٔ سخن کے حاصل نہیں ہے۔ شیخ صاحب کے اکثر اشعار تشبیہ اور مبالغہ سے مملو ہیں اور اکثر استعارہ کی ترکیب یہی ہوتی ہے کہ پہلے مصرع میں دعویٰ ہوتا ہے اور دوسرے میں دلیل خواجہ صاحب بھی ملکی مذاق کے تقاضے سے بیشتر اسی رنگ کے اشعار فرما گئے ہیں مگر طبیعت کی رنگینی شوخی اور برجستگی سے ان کے اشعار میں شیخ کے اعتبار سے کچھ غزلیت کا ایسا انداز پیدا ہو جاتا ہے جس سے دل کو فی الجملہ غزل سرائی کی لذت نصیب ہو جاتی ہے لیکن شیخ کے رنگ سے علیحدہ ہو کر جب حضرت خواجہ آتش لطف طبیعت دکھاتے ہیں تو ان کی غزل سرائی احاطۂ تعریف سے باہر ہو جاتی ہے ذیل میں ایک غزل درج ہذا کی جاتی ہے جو خواجہ کے اصلی رنگ طبیعت سے خبر دیتی ہے۔

غزل آتش

تار تار پیرہن میں بس رہی ہے بوئے دوست	مثل تصویر نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست
چہرۂ رنگیں کوئی دیوان رنگین ہے مگر	حسن مطلع ہے جبیں مطلع ہے صاف ابروئے دوست
ہجر کی شب ہو چکی روز قیامت سے دراز	دوش سے نیچے نہیں اترے کبھی گیسوئے دوست

ڈرکر دل کی کدورت محو ہو د بدار کا
آئینہ کو سینہ صافی نے دکھایا روئے دوست

واہ ری خانہ کی قسمت کس کو یہ معلوم تھا
پنجۂ شل سے کھلیں گے عقدہ ہائے موئے دوست

اغ دل پر خیر گذرے تو غنیمت جانئے
دشمن جاں ہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں سوئے دوست

د مر یگئے زخم کاری سے تو حسرت ہے ہزار
چار تلوار وئیں قتل ہو جائے گا بازوئے دوست

رتیں گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب
خشت زیر سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست

دکر کے اپنی بربادی کو رو دیتے ہیں ہم
جب اڑ آتی ہے ہوائے تند خاک کوئے دوست

اُس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر بنے
دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

واقعی خواجہ صاحب جب داخلی رنگ اختیار فرماتے ہیں تو غضب کی طبیعت داری دکھا جاتے ہیں در حقیقت یہ غزل ایسی ہے کہ اغراض غزل سرائی کو پورا کرنے والی ہے سبحان اللہ! کیا کہنا ہے ایک غزل ہزار دیوان کا جواب ہے، ظاہر ہے کہ اس غزل کے اکثر اشعار ارفع درجہ کے واردات قلبیہ سے تعلق رکھتے ہیں بلا شبہ خواجہ کا اصل رنگ یہی ہے اور اسی رنگ کی بدولت خواجہ کی شہرت تمام اُن دیار میں ہے جہاں اُردو بولی جاتی ہے، حضرت خواجہ کی غزل سرائی پر نظر ڈالنے سے بہت سی خوبیاں بین طور پر عیاں ہوتی ہیں اوّل لطفِ زبان ایسا ہے کہ کس منہ سے کوئی اُس کی تعریف کرے۔ دوم۔ محاورہ بندی ایسی ہے کہ جواب نہیں رکھتی سوم اکثر اعلیٰ درجہ کے مضامین بندش پاتے ہیں چہارم مضامین شوخی اور بانکپن سے خالی نہیں ہوتے، پنجم اکثر مضامین فقر د آزاد مزاجی سے خبر دیتے ہیں کیوں نہ ہو خواجہ آدمی بڑے فقیر طبیعت تھے، مال و منال کی انھیں کوئی پروا نہ تھی، نہایت

بے طمعی لاپروائی اور سیر چشمی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، چنانچہ اپنے حسب حال فرماتے ہیں ؎

نہیں رکھتے ہیں امیری کی ہوس مرد فقیر شیر کی کھال بھی ہے قاقم و سنجاب مجھے

ششم کلام کا رنگ بہت مردانہ ہے۔ غزل گوئی کے لیئے اس رنگ کی بڑی حاجت ہے ورنہ اشعار میں جلالت و متانت کی صفتیں حاصل نہ ہوں گی حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب ایک وقت میں کسی لشکر سے متعلق تھے۔ جب پیشہ سپہگری کو چھوڑا راہ فقر اختیار کی۔ تارک دنیا ہو کر غزل سرائی کی طرف مائل ہوئے، پھر اپنی فطری صلاحیت کی بدولت اس صنف شاعری کے ایک مستند استاد ہو گئے المختصر خواجہ صاحب میں وہ سب خوبیاں موجود تھیں جو ایک بڑے شاعر کے لئے درکار ہیں بحضرت افعال اور اقوال سے تمامتر شریف تھے کوئی بات خواجہ میں ایسی نہ تھی۔ جو اُن کی عظمت و جلالت کی کمی کا سبب قیاس کی جا سکے، شجاعت سخاوت مروت۔ قناعت۔ سیر چشمی۔ خوش اخلاقی، پاکبازی کے مجمع تھے، نامشروع امور سے اجتناب رکھتے تھے اور تادم آخر ان صفات کے ساتھ متصف رہے حضرت کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر ذیل میں نذر ناظرین ہوتے ہیں ؎

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

یہ شعر تو ایسا شرح طلب ہے کہ اس کیلئے عالم سے عالم اور عارف سے عارف شارح کی ضرورت ہے۔ سبحان اللہ! کتنا بڑا مضمون کس آسانی کے ساتھ اور کیسے اچھے پیرایہ شاعری میں بیان ہوا ہے واقعی اگر خواجہ بہت بڑے طبیعت دار نہ ہوتے تو ایسے شعر کے موزوں کرنے پر قادر نہ ہو سکتے۔ اس شعر سے کس قدر نازک خیالی بلند

پردازی اور عالی مذاقی ظاہر ہے ؎

ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ مجھ کو یقین آیا
خدا آئے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
چمن میں شبکو جو وہ شوخ بے نقاب آیا
اسیر ہونے کا اللہ رے شوق بلبل کو
شبِ فراق میں مجھ کو سلانے آیا تھا
چکورِ حسنِ مہ چار دہ کو بھول گیا
ہماری قبر سے آئے گی یہ صدا تا حشر
عدم میں ہستی سے جا کر یہی کہوں گا میں
محبتِ مے و معشوق ترک کر آتش
غضب ہے رہ جانکو پہلو میں ہونا دل سے دشمن کا
جو سویا سانتھ بھی قاتل تو خنجر درمیاں رکھ کر
بہ خوش اسلوب جسیم اس نوجوان کا ہے جو نابیں تو
چھنی افشاں جو پیشانی پہ اس کے چاند نی چھٹکی
ڈراتا ہے کسے اے شیخ تو نار جہنم سے
وحشتِ دل نے کیا ہے وہ بیاباں پیدا
دل کے آئینہ میں کر جوہرِ پنہاں پیدا
فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک

تماشہ انجمن کا دیکھنے خلوت نشین آیا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا
یقین ہو گیا شبنم کو آفتاب آیا
جگا یا پانوں سے صیاد کو جو خواب آیا
جگا یا میں نے جو افسانہ گو کو خواب آیا
مراد پہ جو ترا عالمِ شباب آیا
یہ مردہ آیا کہ مجھ پر کوئی عذاب آیا
ہزاروں حسرت زندہ کو گاڑ دا ب آیا
سفید بال ہوئے موسمِ خضاب آیا
محل خوف ہے ہمسایہ قصابِ برہمن کا
ہمائے اس کے پہ ذرہ گیا دیوار آہن کا
برابر نکلے ڈورا اس کمر کا اور گردن کا
ملی مسی تو آئینہ میں پھولا تختہ سوسن کا
سمندر موج مارے گر نچوڑوں پاٹ دامن کا
سینکڑوں کو ہیں نہیں صورتِ انساں پیدا
در و دیوار سے ہو صورتِ جاناں پیدا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

عاشقِ شیدا علی مرتضیٰ کا ہو گیا
دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہو گیا

قربِ حق حاصل ہے اس کو جو مرا عارف ہے وہی
یا علی رہبر وہ جو تجھ سے پیشوا کا ہو گیا

ساختہ پرداختہ تیری ہے ساری کائنات
حکم حضرت سے وجودِ ارض و سما کا ہو گیا

وقتِ مشکل میں کہا جس وقت یا مشکل کشا
سہل چھٹکارا گرفتارِ بلا کا ہو گیا

کون تجھ سا ہے ولی اللہ اے مولا مرے
کعبہ پیدائش سے تیری گھر خدا کا ہو گیا

کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں
در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

اسے جاں کے برابر مرتے مرتے ہم نے رکھا ہے
ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں

برہمن آنکھوں کو ملتا ہے جو پائے بت پر
رشک آتا ہے مجھے سنگِ درِ یار نہ ہو

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

بہارِ لالہ و گل سے لگی ہے آگ گلشن میں
گریباں پھاڑ کر چل بیٹھیے صحرا کے دامن میں

باغِ جہاں میں گل کی قناعت ہی چاہیے رشک
عمرِ دو روزہ ایک قبا میں تمام کی

چلے تو سیر کو ہیں آپ مستی میں گلشن میں
اشارے کیسے کیسے ہونگے نافرماں سوسن میں

یہ شوقِ شہادت ہے ہمارے سر کو اے قاتل
تری تلوار کا دم بھرتی ہر رگ ہے گردن میں

نہیں روزن جو قصرِ یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

طریقِ عشق میں آتش قدم مجھ سا نہ گزرے گا
گریباں میں بجھی ہے جب لگی ہے آگ دامن میں

جنوں کے جوش میں یکجا نہیں دم بھر قرار آتا
کبھی گلشن سے صحرا میں کبھی صحرا سے گلشن میں

عذابِ گور کا واں سامنا یاں رنج دنیا کا
نہ گھر میں چین زندوں کو نہ مُردوں کو ہے مدفن میں

شریف کعبہ کو کعبہ مبارک ہم تو اے آتش
بتوں کے گھورنے کو جاتے ہیں دیر برہمن میں

خدا بخشے صنم یہ کہہ کے مجھ کو یاد کرتے ہیں •
دعائے مغفرت میرے لئے جلاد کرتے ہیں

قفس میں جسم کے مرغ دل اپنا سر ٹپکتا ہے
کسی پازیب کے نالے کہیں فریاد کرتے ہیں

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ آئینہ کو یاد کرتے ہیں

نہ خود آتے ہیں میت پر نہ اذن دفن دیتے ہیں
وہ گھر بیٹھے ہوئے مٹی مری برباد کرتے ہیں

عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے •
ہوائے گل میں ہم کس وادی پرخار میں آئے

اٹھائے بار عشق اس عالم غدار میں آئے
کہاں سے ہم کہاں پکڑے ہوئے بیگار میں آئے

شیشے شراب کے ہیں آٹھوں پہر کھلے •
ایسا گھر ہے کہ پھر نہ کبھی ابر تر کھلے

رنگریز کی دکاں میں بھرے ہوں ہزار رنگ
طرہ وہ ہے جو یار کی دستار پر کھلے

حیواں پر آدمی کو شرف نطق سے ہوا
شکر خدا کرے جو زبان بشر کھلے

کٹ جائے وہ زباں نہ ہو جس سے دعائے خیر
پھوٹے وہ آنکھ جو کہ نہ وقت سحر کھلے

کوتہ ہے اس قدر کے قد پر ردائے عیش
ڈھانکو جو پاؤں کو تو یقیں ہے کہ سر کھلے

فصل بہار آتی ہے چلتا ہے دور جام
مے کی دکان شام کھلے یا سحر کھلے

مطلب نہ سرنوشت کا سمجھا تو شکر کر
دیوانہ ہو جو حال قضا و قدر کھلے

چلنا پڑے گا یار کی خدمت میں سر کے بل
سمجھے ہو کیا جو بیٹھے ہو آتش کمر کھلے

اشعار بالا سے خواجہ صاحب کی غایت طبیعت داری کا اندازہ ہویدا ہے زبان کے اعتبار سے اُن کی زبان شیخ صاحب کی زبان سے زیادہ دلفریب ہے گو اصلاح زبان کی حیثیت سے شیخ صاحب کا درجہ ارفع اور اعلیٰ ہے، شیخ صاحب کو لغات

کی طرف بہت توجہ تھی حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب کی زبان، زبان سوقی سے خس بھر بھی تعلق نہیں رکھتی ہے۔ ان کی زبان میں غلط العام کا نشان نہیں ملتا ہے اور انصاف یہی ہے کہ خواجہ صاحب کی زبان صحت لغات کے اعتبار سے شیخ صاحب کی زبان کو نہیں پہنچتی ہے۔ مگر خواجہ کی زبان کا حسن ایسا ہے کہ چند غلط العام شکلیں جو اُن کی بعض غزلوں میں دیکھی جاتی ہیں وہ چہرۂ زیبا میں خال کا حکم رکھتی ہیں ؛

رندؔ : نواب سیّد محمد خان رندؔ حضرت آتشؔ کے شاگرد تھے، اُن کی غزل سرائی قابل لحاظ ہے شستگی زبان خوبی بندش صفائی کلام روانی طبع پختگی مضامین کی صفتیں اس درجہ تمامی دیوان میں آشکارا ہیں کہ جس غزل کو جہاں سے پڑھیئے یہ صفتیں اپنے جلوے دکھا رہی ہیں۔ شروع سے آخر تک دونوں دیوانوں کا ایک رنگ ہے ہر شعر یہ کہتا ہے کہ میں رندؔ کے نتائج افکار سے ہوں یہ بات تو خواجہ صاحب کی غزل سرائی میں بھی نہیں دیکھی جاتی ہے اِس واسطے کہ سیکڑوں شعر حضرت خواجہ کے ایسے ہیں جو شیخ صاحب کا رنگ رکھتے ہیں اور اُن کے ذاتی رنگ سے تمامتر علیحدہ ہیں ایک اور خوبی بھی رندؔ کی غزل سرائی میں یہ ہے کہ اُن کی غزلیں بہت سیر ہوا کرتی ہیں۔ واضح ہو کہ رند برخلاف اپنے ملکی رنگ کے بیشتر شاعری کا داخلی پہلو برتتے ہیں اسی لئے اُن کی غزلیں غزلیت کا مزہ دیتی ہیں اگر اُن کے کلام ختگی بہ شستگی سوز گداز نشتریت درد متانت جلالت وغیرہ کے مواد حسب مراد ہوتے تو اُن کو دردؔ۔ میرؔ۔ اور غالبؔ کے ساتھ ہمسری حاصل ہوتی۔ خیر اس پر بھی جیسی اُن کی غزل سرائی ہے نہایت غنیمت ہے۔ اور ارباب مذاق کی توجہ کے قابل ہے ذیل میں کچھ کلام حضرت رندؔ کے نذر ناظرین ہوتے ہیں :—

غزل نمبر ۱

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

شان ارفع ہے تری مرتبہ اعلیٰ تیرا
تو ہے یکتا کوئی ثانی نہیں حقا تیرا

عقل کیا دخل کرے کنہ حقیقت میں تری
حوصلہ پست مرا مرتبہ اعلا تیرا

راہ میں اس کی جو ثابت قدمی ہو تجھ سے
سجدہ گہ جانے ملک نقش کف پا تیرا

جستجو میں جو نہ دوڑیں تری ٹوٹیں وہ پاؤں
سر وہ کٹ جائے نہ ہو جس میں کہ سودا تیرا

تو ہی نے اس کو بنایا ہے ید قدرت سے
تو ہی چاہے گا تو بگڑے گا یہ پتلا تیرا

دید لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

ایک عالم کو ترے نام کا ہے ورد اے دوست
میں ہی کچھ ذکر نہیں کرتا ہوں تنہا تیرا

میں بھی دیکھوں گا دکھا مجھ کو تجلائے جمال
میں بھی شائق ہوں صنم صورت موسیٰ تیرا

آنکھ لا سکتی نہیں تاب تجلائے جمال
عالم نور ہے اے حور سراپا تیرا

بیٹھے تکیہ بھی لگا کر نہ کبھی اس دن سے
ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا

پاک داماں میں تیری نہیں پڑنے کا خلل
اپنے مشتاقوں سے ناحق ہے یہ پردا تیرا

تجھ سے بیزار ہوں جاتا ہوں سوئے ملک عدم
منہ نہ دکھلائے خدا پھر مجھے دنیا تیرا

عاشق روئے پری شیفتۂ حور نہیں
جان جاں رند ہے دیوانہ و شیدا تیرا

سبحان اللہ کیا حسنِ کلام ہے یہ حمد نگاری اور اس کے ساتھ یہ غزلیت آفرین صد آفرین، مرحبا صد مرحبا۔ کیا پر تاثیر کلام ہے، شاعر کی حقیقت دل کا آئینہ

اور حقیقت آگاہوں کے لیئے تماشا گاہ حیرت ہے ایسی لاجواب غزل ہے کہ اگر بزم عشق میں پڑھی جائے تو عاشقوں کی بے قراری کو بڑھا دے اور اگر مسجد میں سنائی جائے تو عابدوں کی توفیق عبادت میں ترقی پیدا کرے

غزل نمبر ۲

کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں جیتا
وحشتِ دل ترے اقبال سے میداں جیتا

رہ دُبستہ بھی اب کھل نہیں سکتی ہم سے
باندھ لاتے تجھے کبھی شیر نیستاں جیتا

گرد کلفت ہیں دبا جاتا ہے میرا تنِ زار
گاڑ دیگی مجھے کیا گردشِ دوراں جیتا

بندگی کرتا غلاموں کی طرح سے تیری
آج کے دن نہ رہا یوسفِ کنعاں جیتا

جس کی دعوت کی زمانے نے دیا زہر اُسے
اس کے گھر سے نہ پھرا ایک بھی مہماں جیتا

پیس ڈالے گی یہ اک ایک کو چکی کی طرح
کوئی رکھتے کی نہیں گردشِ دوراں جیتا

مرگِ خوباں ہر مری رو چکی ہو زیست جواب
تیری امید پہ ہوں عیسئ دوراں جیتا

آپ دانستہ کوئی کھوتا ہے نعمت اپنی
چھوٹ جاتا ہے کوئی توڑ کے زنداں جیتا

سخت جاں تھا جو رہا زندہ چمن سے چھٹ کر
میں تو دم بھر بھی نہ اے مرغِ گلستاں جیتا

چل کے اب عرض کرو حضرتِ آتش سے رند
معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستاں جیتا

غزل نمبر ۳

لالہ رویوں سے کب فراغ رہا
اک نہ اک گل کا دل پہ داغ رہا

ناز بے جا اُٹھائیے کس کے | اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا
کب مٹا عشق کا نشاں دل سے | زخم اچھا ہُوا تو داغ رہا
اک نظر جس نے تجھ کو دیکھ لیا | عمر بھر دَرپئے سراغ رہا
یاد ہیں کس کو زمزمے بلبل | مدتوں ہمنوائے زاغ رہا
کبھی نظارہ چمن نہ کیا | اپنے داغوں سے باغ باغ رہا

دل کو افسردگی سی ہے اے تند
سیر گل کا کسے دماغ رہا

غزل نمبر ۴

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد | میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
دکھائے گا نہ اگر سیر بوستاں صیاد | پھڑک پھڑک کے قفس ہی میں دونگا جاں صیاد
جہاں گیا میں گیا دام لے کے واں صیاد | پھرا تلاش میں میری کہاں کہاں صیاد
دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانہ نے | دگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد
اُجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا | الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پر آسماں صیاد
نہیں کھینچوں دام میں بلبل تو آشیانہ جلا | ہم یہ مشورہ کرتے ہیں باغباں صیاد
عجیب قصہ ہے دلچسپ اک حکایت ہے | سناؤں گا گل و بلبل کی داستاں صیاد
نہ گل کھلیں گے نہ چہکارے گا کوئی بلبل | بہار باغ کو ہونے تو دے خزاں صیاد
ہمائے زندہ گھسیٹے گا دام میں شاید | بچھائے دانہ بچھاتا ہے استخواں صیاد
خبر نہیں کسے کہتے ہیں گل چمن کیسا | قفس کو جانتے ہیں ہم تو آشیاں صیاد

اُداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
کئی برس میں ہُوا ہے مزا جداں صیاد

رہے نہ قابلِ پرواز بال و پر میرے
قفس سے اُڑ کے میں اب جاؤں گا کہاں صیاد

قفس کو شام سے لٹکا کے فرشِ خواب کے پاس
سُنا کیا مری تا صبح داستاں صیاد

کرے گا یاد مرے زمزموں کو بعد مرے
ہوں چند روز ترے گھر میں مہماں صیاد

سُناؤں واقعہ اپنا تجھے تمام و کمال
جو گوش دل سے سنے میری داستاں صیاد

ستم زیادہ نہ کر حکم دے رہائی کا
پُکارتے ہیں گرفتار" الاماں صیاد

چمن میں رکھا نہ بلبل کا نام تک باقی
خدا کرے یہیں ہو جائے بے نشاں صیاد

ہزار مُرغ خوش الحاں چہکتے ہیں ہر سو
بہ از چمن ہُوا اب تو ترا مکاں صیاد

میں جھانکتا نہیں چاکِ قفس سے بھی گل کو
نہ ہوئے تا مری جانب سے بدگماں صیاد

اسیرِ کُنجِ قفس کر بہ شوق دام میں کھینچ
قضا لے آئی ہے مجھ کو کشاں کشاں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد

نہ ہوں گا بنا قفس میں بھی میں وہ بلبل ہوں
ہزار تجھ کو سناؤں گا داستاں صیاد

درِ قفس بھی کھلے گا تو اب نہ جاؤں گا
یقیں نہ ہوئے تو کر میرا امتحاں صیاد

رہا بھی ہو کے نہ بھولوں گا حقِ خدمت کو
ادائے شکر کروں گا میں ہر زماں صیاد

چمن میں بلبل و قمری کا پر نہ چھوڑے گا
رہا جب آٹھ پہر گھات میں نہاں صیاد

قفس پہ رکھنے لگا اب تو ہار پھولوں کا
ہزار شکر ہُوا مجھ پہ مہرباں صیاد

عزیز رکھتا ہے کرتا ہے خاطریں میری
ملا ہے خوبیٔ قسمت سے قدرداں صیاد

نکالیو نہ قدم آشیاں سے اے بلبل
لگائے بیٹھے ہیں پھندے جہاں تہاں صیاد

وہ عندلیب ہوں جل کر کروں جو نالۂ گرم
قفس کے چاکوں سے اٹھنے لگے دھواں صیاد

مرے بیان کو سن کے کانپ کانپ اُٹھا — غضب یہ ہے کہ سمجھتا نہیں زباں صیاد

الٰہی دیکھیے کیونکر تباہ ہوتا ہے — زبان دراز ہوں میں اور بدزباں صیاد

سوائے شکر شکایت اگر کبھی کی ہو — الٰہی قطع ہو منقار سے زباں صیاد

فریب دانہ نہ کھاتا میں زینہار اسے رند
نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

غزل نمبر ۵

دید گل کے تجھے پڑ جائیں گے لالے بلبل — پڑ گئی جب کسی صیاد کے پالے بلبل

کان کھولے ہوئے گل گوش بر آواز ہے آج — دردِ دل جو تجھے کہنا ہو سنا لے بلبل

پھر وہی کنج قفس ہے وہی صیاد کا گھر — چار دن اور ہوا باغ کی کھا لے بلبل

پہلے گلشن کی ہوا دیکھ لے رکھ چند سے — آشیاں کی تو ابھی طرح نہ ڈالے بلبل

دست انداز نہ ہو گل پہ ابھی اے گلچیں — صبر کر صبر ذرا باغ سے جا لے بلبل

بے اجازت میں قدم باغ میں دھرتا نہیں — منتظر ہوں در گلزار پہ آ لے بلبل

ہاتھ اوراق گل آئیں تو بنا کر اجزا — لکھوں رنگیں مضامیں کے رسالے بلبل

کوئی ارمان نہیں لے کے چلے باغ سے ہم — دل کے جو حوصلے تجھے خوب نکالے بلبل

نہ رہی بوئے وفا ایک بھی گل میں باقی — اب تو اس باغ سے اللہ اٹھا لے بلبل

ہے یہ ویرانی گلشن تو عجب کیا اس کا — بچہ بوم جو بیضے سے نکالے بلبل

کس طرف جائے گی بردا شتہ خاطر ہو کر — باغ کیوں کرتی ہے گلچیں کے حوالے بلبل

باغ تک خانۂ صیاد سے اڑ کر آئی — یار سے پھر تو نے پر و بال نکالے بلبل

عہدِ طفلی سے وہ گل مائل عشاق رہا
طائروں کا جو ہوُا شوق تو پالے بُلبل

دعویٰ ملک تو اثبات کرے گلچیں پر
لاکے دکھلائے گلستاں کے قبالے بلبل

دام میں پھنس کے نکلنا ترا ناممکن ہے
تا بہ مقدور پر و بال ہلالے بلبل

درد آمیز پہنچتی نہیں کانوں میں صدا
بے اثر ہوگئے کیسے ترے نالے بلبل

دم بدم سینۂ سوزاں سے نہ کر نالہ گرم
پڑ نہ جائیں تری منقار میں چھالے بلبل

ایک دو گل سے جو تسکین نہ ہوئے اس کی
باغ کا باغ ہی سر پہ نہ اُٹھالے بلبل

جس شجر پر ترا جی چاہے نشیمن کرلے
پھٹ پڑینگے نہ ترے بوجھ سے ڈالے بُلبل

لنگے خالق سے دعا بہرِ بقائے گل کی
پہلے صیاد سے خیر اپنی منالے بلبل

نہ رہے گل ہی گلستاں میں جو تھے رتبہ شناس
اُڑ گئے سب تجھے پہچاننے والے بلبل

کسی غنچہ کو چھوا اور نہ کوئی گل توڑا
گھورتی کیوں ہے مجھے آنکھیں نکالے بُلبل

چہچہے بند کرے گا تو یہ ہو جائے گا بند
کہہ دو گلچیں کہ زباں اپنی سنبھالے بُلبل

غزل نمبر ۶

نہ ستا در پہ پڑا رہنے دے کیا لیتے ہیں
اے شہ حسن فقیروں کی دُعا لیتے ہیں

توسنِ عمر نے طے منزلِ ہستی کی ہے
ہم بھی یارانِ عدم رفتہ کو جا لیتے ہیں

میرے ہمراہی مجھے چھوڑ گئے یاں ورنہ
قافلے والے تو سوتوں کو جگا لیتے ہیں

بھیجیں گے پیک بنا کر ترے پاس اے شہ حسن
سر قاصد کے بیٹے بال ہما لیتے ہیں

سامنا لاکھ مصیبت کا پڑے پر کوئی
آسرا غیر کا مرزان خُدا لیتے ہیں

کوچۂ دوست میں رکھ پاؤں ادب سے غافل — سرکش اس راہ میں گردن کو جھکا لیتے ہیں

زلفِ پُرپیچ کا مضموں نہیں بندھ سکنے کا — کیوں وبال اپنے سروں پر شعرا لیتے ہیں

حق تو یہ ہے کہ عجب لوگ ہیں مردانِ خدا — اپنے سر غیر کی ناحق یہ بلا لیتے ہیں

شور وشر کرتے یہ ہیں ہستی دوروزہ پر — آسمان اہلِ زمیں سر پہ اٹھا لیتے ہیں

لب بلب رہتے ہیں جو شام وسحر دلبر سے — زندگانی کا وہی لوگ مزا لیتے ہیں

گرچہ درویش ہیں یہ لوگ مگر چاہیں تو — سلطنت مول ترے در کے گدا لیتے ہیں

میرے ویرانہ میں درویش بھی سلطاں ہو جائے — یاں بسیرا سرِ شام آکے ہُما لیتے ہیں

جامِ جم سے اُسے رتبہ میں سمجھتے ہیں زیاد — بھیک جس کاسے میں تیرے فقرا لیتے ہیں

جو گزر ہوتا ہے مدفن پہ حسینوں کے کبھی — واں کی ہم خاک کو آنکھوں سے لگا لیتے ہیں

عیب سے پاک و مبرا ہے کلام اُن کا رِند
جو غزل حضرتِ آتش کو دکھا لیتے ہیں

واضح ہو کہ اُن شعرائے غزل سرا کے علاوہ جن کے کلام نمونہ کے طور پر بالا میں درج اندا کیئے گئے اور بہت سے اُستادانِ فن گزرے ہیں اور ماشاء اللہ اس وقت بھی موجود ہیں، مگر چونکہ یہ کتاب بہ سبیل تذکرہ نہیں لکھی جاتی ہے، اُن حضرات کے ذکر کی ضرورت نہیں دیکھی گئی۔ اب غزل سرائی کے مادے میں آخر عرض راقم یہ ہے کہ اس زمانہ میں تقاضائے سلطنت سے انگریزیت نے ایسی تاثیر پھیلائی ہے کہ ہر شے جو ملکی وضع ترکیب ساخت روش وغیرہ کی ہے تنگ چشموں کی آنکھوں میں ذلیل اور خوار نظر آتی ہے جن حضرات نے علوم یورپ حاصل کیئے ہیں اُن کا انقلاب مذاق خیر اتنا حیرت انگیز نہیں ہے مگر تعجب اُن حضرات سے ہے جو نہ انگریزی جانتے ہیں۔ نہ

فرانسیسی مگر صحت، عدم صحت مذاق پر بحث کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں اور ہندوستانی
علوم و فنون کی مذمت بے دھڑک کرنے لگتے ہیں۔ ایسے حضرات کے نزدیک ہر
شے جو ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے لفظ تو اسے یقین مقدوح و مذموم ہے منجملہ دیگر اشیائے
ملکی کے ملکی شاعری بھی اُن کے خیال میں پُر از عیوب متصور ہے۔ اس میں شک نہیں
کہ ملکی شاعری میں معائب ہیں۔ مگر یوروپین شاعری بھی عیوب سے پاک نہیں ہے۔ یوروپین
شاعری کے عیوب ایسے حضرات کو سجھائی نہیں دیتے اور حقیقت یہ ہے کہ
انھیں یوروپین شاعری کے عیوب کیونکر نظر آئیں، جب اُن کی اطلاع کوٹ، پتلون،
کرسی، میز، چھری، کانٹے وغیرہ کے اندر محدود ہے۔ ایسے حضرات کو ہومر،
درجل، ہارس، ڈینٹی، شکسپیئر، ملٹن، شیلی، بیرن، ٹینس وغیرہم کے حسن و قبح سے
کیا خبر ہے۔ جو یوروپین شاعری کا دم بھرتے ہیں اور شاعری ایسے امر اہم میں رائے زنی
کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں۔ ایسے حضرات غزل سرائی کے مادے میں جو جو صورتیں
اصلاح کی بتاتے ہیں، اس کی نسبت یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے غزل سرائی
کی خوبیوں کو عجز طبیعت کے باعث درک نہیں کیا ہے یا اُن پر انگریزی کا جہل
مرکب ایسا سوار ہو رہا ہے کہ جب تک اُن کے خیال کے مطابق انگریزی مذاق
کے ساتھ غزل سرائی نہیں کی جائے، تب تک غزل سرائی مطبوع رنگ پیدا نہیں
کر سکتی۔ ان حضرات سے بعض فرماتے ہیں کہ غزل میں ہمیشہ عشقیہ مضامین باندھے
جاتے ہیں جو مخرب تہذیب ہُوا کرتے ہیں۔ لازم ہے کہ ایسے مضامین کے عوض وعظ
پند نصیحت، اخلاق، تمدن اور نیچرل سینریوں کی باتیں موزوں کی جائیں۔ نیچرل
سینریاں عبارت ہے جبال، بحور، صحرا، میدان، کشت زار، حیوانات، نباتات

ہُوا، برق باراں وغیرہ وغیرہ کی نمود سے ایسے معترضین کی خدمت میں عرض راقم یہ ہے کہ غزل وہ صنفِ شاعری ہے۔ جو مضامینِ عشقیہ کے لیئے موضوع کی گئی ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کے وارداتِ قلبیہ معاملاتِ روحیہ اور امورِ ذہنیہ حوالہ قلم کیئے جائیں۔ اگر واقعی کسی غزل سرا کو ایسے مضامین کی بندش کی قدرت ہے تو اس کی غزل سرائی مخرب تہذیب ہو نہیں سکتی بلکہ اس کی غزل سرائی سے بہت کچھ اصلاح قلب و روح کی اُمید کی جا سکتی ہے جیسا کہ حافظ کی غزل سرائی دیکھی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ اخلاق آموز کوئی کتاب فارسی زبان میں نہیں دیکھی جاتی ہے اسی طرح وعظ و پند کی نسبت یہ عرض ہے کہ غزل سرائی کو پند و موعظت سے عداوت نہیں ہے، البتہ بھونڈے طور کی پند گوئی اور وعظ فرمائی کو غزل ایسی نازک صنفِ شاعری سے کیا علاقہ۔ یہ میں نہیں کہتا کہ غزل سرائی کو پند و موعظت سے کوئی علاقہ ہی نہیں ہے مگر ہاں جو علاقہ ہے وہ نہایت نازک انداز کا ہے، یہ بڑے غزل سرا کا کام ہے کہ موعظت بھی کرے اور غزل کے رنگ کو بھی قائم رکھے۔ اس کام کو حافظ خوب کرتے ہیں اس کا پورا ڈھنگ سعدی کو بھی نہ تھا، کس واسطے کہ شیخ جب غزل میں پند و موعظت فرماتے ہیں تو غزل سرائی کے پیرایہ سے نکل جاتے ہیں، لیکن اگر کسی کو یہ منظور ہے کہ پند و نصیحت کھلے ڈلے طور پر داخلِ غزل کی جائے تو اُسے اس امر کو فی الذہن رکھنا چاہیئے کہ یہ صنفِ شاعری اس کام کے لیئے موضوع نہیں ہوئی ہے۔ اس کام کے لیئے اور اصنافِ شاعری درکار ہیں مثلاً مثنوی۔ قطعہ رباعی۔ قصیدہ اور مسدس جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ مشیرانِ اصلاحِ غزل اُس کی امید نہ رکھیں کہ کھلے ڈلے طور کے پند و موعظت غزل میں کوئی موثر رنگ پیدا کریں گے

کریمائے سعدی اور پند نامۂ عطار کی طرز مضمون بندی غزل کے لیئے زینہار درکار نہیں ہے۔ اسی طرح نیچرل سینیریوں کے بیان کے لیئے غزل موضوع نہیں ہوئی ہے' اس صنف شاعری کو مجرد عالم درونی کی سیر درکار ہے۔ غزل گو کو کوئی حاجت نہیں ہے کہ کوہ کوہ پتھروں کو یا دریا دریا موجوں کو گنتا پھرے۔ نیچرل سینیریوں کے لیئے مثنوی موضوع ہوئی ہے۔ یوروپین شاعریوں میں بھی نیچرل سینیریوں کا بیان لیرکس میں نہیں دیکھا جاتا ہے۔ ایسے مضامین کے لئے مثنوی کے رنگ کی شاعری عموماً کام میں لائی گئی ہے مثلاً سروالٹر کی وہ مثنوی جس کا نام لیڈی آف دی لیک (Lady of The Lake) ہے پس حضرات مشیران اصلاح کی خدمت میں عرض ہے کہ غزل جس کام کے لیئے ایجاد ہوئی ہے اس میں بے موقع دست اندازی نہ فرمائیں' اس کے عوض یوروپین مذاق ہائے شاعری کے لیئے یا کوئی صنف جدید اختراع فرمائیں یا موجودہ اصناف شاعری سے کسی صنف کو جس میں وسعت دیکھیں نہایت شوق سے اختیار فرمائیں۔ ظاہرا غزل میں کوئی اصلاح کی جگہ نہیں نظر آتی ہے کوئی طباع روئے زمین پر نہ ہے اور نہ ہوگا۔ جو حافظ کی غزل سرائی کی خوبیوں پر ایک جو کے برابر بھی کسی قسم کی افزائش کر سکتا ہے یا کر سکے گا۔ نامربوط امور کو غزل میں داخل کرنے کی مثال ایسی معلوم ہوتی ہے۔ کہ کسی خاص پز سے کوئی امیر یہ فرمائش کرے کہ تو ایک فیرنی پکا لا جس میں خاگینہ گریل مرغ مسلم مربے چٹنی اور آچار کی لذتیں موجود ہیں۔ واضح ہو۔ کہ بعض مشیران اصلاح غزل نے جو اصلاح میں عملی طور پر کوشش کی ہے وہ نہایت ناکامیاب رہے ہیں اُن کی غزل سرائی از اں سو راندہ و ازیں سو درماندہ کی پوری تصویر نظر آتی ہے دوسرا امر جو مشیران اصلاح غزل سرائی کے مادے میں فرماتے

ہیں وہ یہ ہے کہ غزل میں معشوق کو غزل سرایان اُردو مذکر باندھتے ہیں اور یہ امر خلاف نیچر یعنی خلاف فطرت ہے اس کی بحث راقم اہل عرب کی شاعری کے بیان میں کر چکا ہے یہاں اُس کے اعادہ کی کوئی حاجت نہیں ہے تیسرا امر جو مشیران اصلاح ارشاد فرماتے ہیں یہ ہے کہ غزل کو قطعہ بند ہونا چاہئے ظاہر ہے کہ اس التزام کی صلاح کا سبب اہل یورپ کی تقلید کورانہ کے سوا دوسرا امر نہیں وائے بر مشیران اصلاح جو اہل یورپ کے تتبع پر امر ناحق میں جان دیتے ہیں اہل انصاف تجویز فرمائیں کہ غزل سرائی میں اس التزام کی کیا ضرورت ہے بلکہ جو غزل سرائی کا موجودہ طور ہے وہ بہت قابل لحاظ ہے۔ کس واسطے کہ سوا فارسی اور اُردو کے کوئی زبان روئے زمین پر نہیں ہے۔ جس میں نازک سے نازک اور دشوار سے دشوار مضامین صرف دو مصرع میں تمام ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ امر فارسی اور اُردو کے لیئے موجب امتیاز نہیں ہے واقعی کوئی۔ ہاں ان دونوں زبانوں کے سوا ایسی نہیں ہے کہ ادائے مطلب بر اس طور سے قادر ہو۔ خواجہ حافظ کے دیوان میں امور قلبیہ و اخلاق جس چستی بندش کے ساتھ حوالۂ قلم ہوئے ہیں یقیناً کسی اور زبان کی شاعری میں اس ترکیب خاص کے ساتھ نہیں پائے جاتے۔ پس جاننا چاہیئے کہ غزل سرائی میں التزام قطعہ بندی کی کوئی حاجت نہیں ہے اس عدم احتیاج کی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ خود تقاضائے غزل گوئی سے مضامین غزل ایسے ہوتے ہیں کہ ایک احاطۂ خاص سے باہر نہیں جاتے یعنی غزل سرائی کے مضامین واردات و جذبات قلبیہ و امور ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ پس یہ احاطہ یک گونہ خود حکم قطعہ بندی کا رکھتا ہے ایسی صورت میں مشیران اصلاح کی صلاح بیکار معلوم ہوتی ہے بلکہ جس طرح کے التزام کی صلاح

یہ حضرات دیتے ہیں وہ لطفِ غزل سرائی کو فوت کر دینے والا نظر آتا ہے کس واسطے کہ حسنِ غزل یہی ہے کہ غزلیت کی خوبیوں کے ساتھ مختلف انداز کے داخلی مضامین شاملِ غزل رہیں۔ راقم کو اس سے انکار نہیں ہے کہ قطعہ بند غزلیں بھی ہوتی ہیں مگر جو التزام کی صلاح دیجاتی ہے وہ مفید غزل سرائی نہیں ہے اور درحقیقت اہلِ یورپ کی کورانہ تقلید پر مبنی ہے۔ چوتھا امر جو بہ سبیلِ مشورہ حضرات جدّت پسند ارشاد فرماتے ہیں۔ عروضی قواعد سے تعلق ہے مشیرانِ اصلاح فرماتے ہیں کہ غزل سرائی میں ردیف کی کیا حاجت ہے صرف قافیہ کا التزام کافی ہے۔ اربابِ مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ردیف غزل سرائی کے لطف کو بڑھا دیتی ہے اس کا متروک ہو جانا غزل کے نصف لطف کو ضائع کر دے گا، ہر زبان کے عروض کا ایک خاص تقاضا ہے چونکہ انگریزی میں ردیف کا مضمون کمتر ہے اس لیئے مقلدانِ اہلِ یورپ کو راضی کرنے کے واسطے کوئی ضرور نہیں کہ اُردو میں بھی انگریزی نظم کا طور اختیار کیا جائے۔ بعض مشیرانِ اصلاح ردیف تو ردیف قافیہ کے بھی نذار د کر دینے پر برسرِ اصرار نظر آتے ہیں یعنی جس طرح انگریزی میں بے قافیہ اور ردیف کے اشعار جنھیں بلنیک ورس
کہتے ہیں۔ لکھے جاتے ہیں اُردو میں بھی لکھے جائیں ایسی صلاح وہی حضرات دیں گے جو اقسامِ ذیل کے اشخاص ہوں گے۔

نمبر ۱ :۔ وہ جو علومِ یورپ سے بے خبر ہیں۔ مگر بہت سی یوروپین چیزوں کو جو اچھی طرح دیکھتے آئے ہیں تو اس سے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ جتنی یوروپین چیزیں ہیں سب کی سب اچھی ہیں۔ خذ ما صفا اور دع ما کدر کے مضمون سے یہ بیچارے بالکل ناواقف ہیں یہ تنگ چشم حضرات یورپ کی ہر چیز کو را جس (

رہی کی دکان کی بنی ہوئی جانتے ہیں۔ جیسا کہ ایک نادان نے کسی جلسہ میں ایک کتاب کی جلد کی نسبت کہا تھا کہ اس کی جلد رہی کی دکان کی بندھی معلوم ہوتی ہے' اس زمرہ کے وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے ترجمۂ وغیرہ کے ذریعہ سے کچھ انگریزی اشعار کے مضامین خبط بے ربط طور سے دریافت کر لئے ہیں اور اس دریافت کی بنیاد پر رائے زنی کیا کرتے ہیں ؛

نمبر ۲ : وہ جو نہیں جانتے کہ انگریزی و دیگر یوروپین زبانوں میں بلینک ورس کے مروج ہونے کا سبب کیا ہوا حقیقت حال یہ ہے کہ یوروپین زبانوں میں الفاظ مقفا بہت کم ہیں بس ایسی زبان میں جب منظوم ضخیم کتابیں لکھی جائیں گی تو کمی قوافی کی حالت میں بلینک ورس ہی لکھی جائیں گی۔ ہومر س کی ایلیڈ ورجل کی انیڈ اور ملٹن کی پیریڈ ایز لاسٹ اگر بلینک ورس میں نہیں لکھی جاتیں تو ایسی مبسوط اور پر مضمون تصانیف کے اتمام کی صورت یونانی لاطینی اور انگریزی زبانوں میں کیا ہوتی اُردو فارسی تو ایسی زبانیں ہیں۔ جن میں قوافی کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی ہے پس ان زبانوں میں بلینک ورس کی کیا حاجت متصور ہے ؛

نمبر ۳ : وہ جو شاعری کا دم بھرتے ہیں مگر انھیں درحقیقت موزونی طبع حاصل نہیں ہے۔ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ جب قافیہ اور ردیف کی پابندی باقی نہیں رہے گی تو حسب مراد طور پر غزل سرائی کر سکیں گے، یہ اُن کا گمان ہی گمان ہے بودی طبیعت کے لوگ بلینک ورس میں بھی طبع آزمائی نہیں کر سکتے برخلاف اس کے شخص طباع پابندی قوافی کے ساتھ اُردو اور فارسی میں غزل سرائی ہی نہیں کر سکتا ہے بلکہ ایلیڈ انیڈ اور پیریڈ ایز لاسٹ کی سی مبسوط کتابیں بھی موزون کر سکتا ہے ؛

نمبر ۴ :- وہ جو اپنے کو مصلح قوم سمجھتے ہیں اور قوم کی ہائے وائے سے صرف اپنی شہرت منظور رکھتے ہیں ایسے لوگوں سے قوم کو نہ کوئی نفع پہنچا ہے اور نہ پہنچے گا۔ البتہ ایسوں سے قوم کو ذلتیں نصیب ہوتی گئی ہیں ایسوں کی حقیقت یہ ہے کہ نفع ذاتی کے خیال سے قوم کی ہزاروں برائیاں بیان کیا کرتے ہیں یہ لوگ جلسہ ہائے عام میں کہا کرتے ہیں کہ میری قوم ایسی اور میری قوم ویسی ایسی تقریروں سے سوا قومی ذلت کے اور کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوتا، یہ تقریریں حب خودداری کے پہلو سے دور ہیں تو غیر اقوام کی آنکھ میں ضرور قومی سبکی بھی پیدا کریں گی۔ ان مصلحان قوم نے بہ سبیل عادت ہر قومی شئے کو برا سمجھ لیا ہے۔ قومی مذہب معاشرت، قومی عادات وغیرہ وغیرہ کو تو برا ہی جانتے ہیں۔ قومی شاعری بھی ان کی بدگوئی سے نہیں بچ سکتی ہے ؎

سہرا

واضح ہو کہ غزل کی صورت پر سہرا بھی لکھا جاتا ہے اس کی عروضی ترکیب تمام تر غزل کی ہوتی ہے اس سے اور غزل سے فرق یہ ہے کہ اس کے مضمون غزل کے اعتبار سے بہت محدود ہوتے ہیں۔ ہجر۔ فراق۔ درد۔ رنج۔ الم۔ حسرت۔ یاس حرمان۔ تمنا وغیرہ کے مضامین جو غزل کے لئے مختص ہیں سہرے میں نہیں باندھے جاتے ہیں۔ خوشی اور خرمی اور ہلکے پھلکے شادی بیاہ کے مضامین اس میں حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں سہرے کی تصنیف میں کبھی ایسے دشوار مضامین کو نہیں دخل دینا چاہئے کہ سامعین کے دماغ کو اس کے فہم میں ذرا بھی دقت لاحق ہو

غرض سہرے کی یہ ہے کہ شادی بیاہ کے مجمع میں اُسے ارباب رقص گائیں اور حاضرین محفل لطف اٹھائیں۔ مشہور سہروں میں دو سہرے ہیں ایک سہرا حضرت غالبؔ کا فرمایا ہوا ہے اور دوسرا اُستاد ذوقؔ کا۔ غالبؔ کا سہرا اُن کے مذاق غزل گوئی کا رنگ رکھتا ہے اور سہرے کے اعتبار سے اُس کا رنگ سہرے کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے برخلاف اِس کے ذوقؔ کا سہرا تمام تر ایسا ہے جیسا کہ سہرے کو ہونا چاہیئے۔ حضرت غالبؔ مضمون آوری کے کاربند ہوتے ہیں سہرے میں غزل کی مضمون آوری کی حاجت نہیں ہے اُستاد ذوقؔ نے معمولی مضامین کو شاعری کی خوبیوں کے ساتھ اس طرح موزوں فرمایا ہے کہ خاص و عام کو پسند آتا ہے جاننا چاہیئے کہ سہرا کوئی ایسی صنف شاعری نہیں ہے۔ جس میں داخلی مضامین دقیق اور نازک انداز کے باندھے جائیں اس میں اِس قسم کے مضامین کو دخل دینا سہرے کے تقاضے کے خلاف عامل ہونا ہے کوئی شک نہیں کہ جب ذوقؔ کا سہرا گایا گیا ہوگا تو حضار محفل کو بہت لطف حاصل ہُوا ہوگا۔ شاعری میں اس امر کا لحاظ واجبات سے ہے کہ جس صنف کی شاعری اختیار کی جائے اُس میں کوئی امر اُس کے تقاضے کے خلاف دخل نہ پائے۔ ہر سخن کے لئے موقع و محل ہے بے موقع اور بے محل کلام کبھی لذت بخش نہیں ہوسکتا ؎

غالبؔ کا سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا ۔۔۔ باندھ شہزادہ جوان بخت کے سر پہ سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے ۔۔۔ ہے ترے حُسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیئے ہوں گے موتی
تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دُولھا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رُک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مُقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھُولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار
لائے گا تاب گرانباری گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

ارباب مذاق پر ہویدا ہے کہ یہ سہرا کہے دیتا ہے کہ ہم نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نتائج افکار سے ہیں۔ داخلی پہلو کی مضمون آوری کی کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ہر شعر حضرت کی غزل سرائی کا رنگ لیئے ہوئے ہے الفاظ کی بندش کا انداز بھی وہی ہے جو حضرت کی غزلوں میں اکثر قائم رہتا ہے حسن دِل افروز **طرف کلاہ**۔ رگ ابر گہر بار۔ تاب گرانباری گوہر ایسے مرکبات ہیں کہ زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ اس سہرے کا مصنف کون ہے' لاریب سہرے کے واسطے یہ وقت شعاری خوش مذاقی سے بعید ہے اب نواب ابراہیم ذوقؔ کے سہرے پر توجہ فرما کر ناظرین صحت مذاق کی داد دیں ۔

ذوقؔ کا سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حُسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مُکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا نہ ہے اور ہنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دُھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئین ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اُوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پہ سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہِ خورشید فلک
کھول دے مُنہ کو جو تو منہ سے اُٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کی
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

فی الواقع کیا خوب سہرا ذوقؔ نے لکھا ہے سہرے کے تقاضوں کے مطابق یہ سہرا ہے۔ تعقیبات و تعقیدات کے نقصانات کو نظر انداز کر کے اسے جو صاحب

مذاق صحیح دیکھے گا۔ آفریں صد آفریں کہے گا۔ جن اشعار پر راقم نے خطوط کھینچ دیئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ زبانِ حال سے اس مصرع کو پڑھ رہے ہیں۔ مصرع

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

واضح ہو کہ راقم اپنے خیالات کے اظہار میں تا حد امکان انصاف و راست بازی کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہے دروغ سرائی کام بے ایمان کا ہے ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ ہے

راست میگویم و یزداں نہ پسند و جز راست　　　حرف ناراست بہ یزداں و شہ و ہر من ست

اس میں شک نہیں کہ فقیر اپنے خیال کے مطابق غالب کی اردو کی غزل سرائی کا بہت معتقد ہے مگر فقیر کے اعتقاد کا طوق اُن کی جناب میں گوارا نہیں ہے۔ امر حق جو راقم کو معلوم ہوا اُسے بالا میں عرض کیا اور آئندہ بھی اسی روش کا پابند رہے گا۔ خیر انصاف یہی ہے کہ ذوق نے غالب سے کہیں بہتر سہرا لکھا اور ایسا لکھا جیسا کہ سہرے کو ہونا چاہیئے۔ لیکن ذوق کے سہرا لکھنے کے بعد جو غالب نے قطعہ معذرت لکھا وہ ایسا لکھا کہ غالب کے عوض اگر ذوق کو اس کے لکھنے کی نوبت آتی تو اس کامیابی کے ساتھ قادر نہ ہوتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ذوق داخلی مضامین کی بندش پر پوری قدرت نہیں رکھتے تھے۔ اور اگر رکھتے ہوتے تو غزل سرائی اسی رنگ میں کی ہوتی جیسا کہ درد۔ میر۔ مومن۔ غالب وغیرہ کر گئے ہیں۔ غالب کا یہ قطعہ داخلی رنگ رکھتا ہے۔ کس واسطے کہ معذرت خواہی خود ایک داخلی امر ہے۔ اس کو وہی شاعر حسب مراد موزوں کرے گا۔ جو داخلی شاعری کی صلاحیت رکھے گا۔ اس قطعہ سے اور بھی قلبی اور ذہنی کیفیات عیاں ہیں جو اہل دانش سے پوشیدہ نہیں ہیں :

قطعہ

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سَو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

مَیں کون اور ریختہ، ہاں اِس سے مُدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

سلام

عروضی ترکیب کی رو سے غزل سہرا اور سلام تینوں واحد ہیں مگر اُن کے مضامین کے تقاضے ایک دوسرے سے علیحدہ انداز رکھتے ہیں۔ فارسی میں سہرا اِس واسطے

نہیں ہے کہ اِس ملک میں دولھا یا دولھن کو سہرا نہیں باندھتے۔ مگر سلام ہے، سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے ہیں مگر اُن میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے۔ سلام کی ترکیب کو رنگینی کے ساتھ بھی غزل سے علیحدہ ہونا چاہیے، سلام گوئی کا لطف یہی ہے کہ شوخی رنگینی اور طبیعت داری کے ساتھ بھی غزل سرائی سے جُدا نظر آئے۔ عموماً سلام میں واقعہ کربلا و شہادت امیرالمومنین و شہادت امام حسن و مصائب حضرت خاتون جنت و رحلت حضرت رسالت مآب صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم الی یوم القیام کے مضامین داخل رہتے ہیں۔ اور بھی دیگر امور الم انگیز و حسرت خیز جو خاندان پیغمبر خدا صلعم سے متعلق ہیں اندراج پاتے ہیں علاوہ ان کے اخلاقی و تمدنی و مذہبی و دیگر امور جلیلہ جن سے شاعری کی زینت مقصود ہے، منظوم کیئے جاتے ہیں۔ ایسے مضامین کبھی کبھی غزلوں میں بھی باندھے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سلام کے بعض اشعار ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ اگر غزلوں میں داخل کر دیئے جائیں تو بے موقع یا بے محل معلوم نہ ہوں گے، میر انیسؔ اور میر مونسؔ کے بہت ایسے اشعار سلام ہیں کہ اگر غزلوں میں داخل کر دیئے جائیں، تو غزلوں کا وقار ترقی کر جا سکتا ہے۔ ذیل میں کچھ سلام میر ضمیرؔ، مرزا دلگیرؔ، میر انیسؔ اور میر مونسؔ کے بطرز انتخاب درج کئے جاتے ہیں +

سلام میر ضمیرؔ رحمہ اللہ تعالیٰ

مجرئی شہ نے کہا میں جو نہ بے سر ہوتا	حشر کو تاج شفاعت نہ میسر ہوتا
شاہ کہتے تھے اگر تیر نہ لگتا دل پر	دیکھتے تم کہ جواں کیا علی اکبر ہوتا

شاہ نے حُر سے کہا آج جو کچھ تُو نے کیا — ایسا کرتا جو حسنؑ میرا برادر ہوتا
شاہ کہتے تھے یہ ہے وقتِ شہادت اے شمر — ہم تجھے دیتے جو تجھ پاس نہ خنجر ہوتا
ہوتی خاتونِ قیامت تو قیامت ہوتی — حشر ہو جاتا اگر شافعِ محشر ہوتا
سوچ کر تشنگیٔ شاہ کو بولے عباسؑ — نہر کیا پانی نہ ہم پیتے جو کوثر ہوتا
شاہ فرماتے تھے کچھ چیز نہیں آبِ فرات — ہم لٹا دیتے اگر چشمۂ کوثر ہوتا

سلام میاں دلگیر مرحوم و مغفور

اے سلامی وطنِ شاہ تو کچھ دُور نہ تھا — لیک شبیرؑ کو پھر جانا ہی منظور نہ تھا
ہائے اُس ملک میں پائی تھی سکینہ نے وفات — جہاں عابد کو کفن دینے کا مقدور نہ تھا
سر کھُلے قید میں لے جائیں کسی کے ناموس — پیشِ ازیں ملکِ عرب میں کبھی دستور نہ تھا
پاپیادہ کہیں بیمار بھی چلتا ہے بھلا — قابلِ فاقہ کشی عابدِ رنجور نہ تھا
علی اکبر سا ملا خاک میں جو نورِ نظر — جب تلک شاہ جئے آنکھوں میں پھر نور نہ تھا
کس طرح گنجِ شہیداں نہ بنا تے سجادؔ — کون سا لاشہ تھا زخموں سے جو چُور نہ تھا
تھی سکینہ سے خجالت نہ پھرے جو عباس — ورنہ میدان سے خیمہ تو بہت دور نہ تھا
بانو کہتی تھی کہ کیا جلد سدھارا اصغر — چھ مہینے کا بھی وہ لال تو بھرپور نہ تھا
بسکہ تھے نالۂ سوزانِ حرم شعلہ فشاں — خیمۂ آلِ محمدؐ بھی کم از طور نہ تھا
اور خاصانِ خدا پر بھی مصیبت گزری — پر سوا شہ کے کوئی درد میں مسرور نہ تھا
کچھ قیامت میں نہ باقی تھا دمِ قتلِ حسینؑ — حکم خالق کا مگر بہرِ ظہور نہ تھا
اُن کے ہر گام تلے چشمہ نکلتا دلگیرؔ — پانی پینا ہی مگر شاہ کو منظور نہ تھا

اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ دونوں سلام بالا کی بندش گو ویسی چُست نہیں ہے
جیسے ہر دو سلام ذیل کی ہے مگر مرثیت کا انداز حسب مُراد ہے ؛

سلام میر انیسؔ اعلیٰ اللہ مقامہ فی الجنۃ

گزر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا
مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا

نمود و بود بشر کیا محیطِ عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

فشار سے جو بچا میں ہوا زمیں کو عجب
صدا یہ قبر نے دی حکم بوتراب نہ تھا

اگر بہشت میں ہوتے نہ کوثر و تسنیم
تو رونے والوں کی آنکھوں کا پھر جواب نہ تھا

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

حسینؑ اور طلب آب اے معاذ اللہ
تمام کرنے تھے حجت سوال آب نہ تھا

جسے نبیؐ نے بلایا ہو وہ نخل نہال
ثمر اسے بھی دیئے جو کہ باریاب نہ تھا

علیؑ کے پائے مبارک نے جو ضیا پائی
وہ نور حضرت موسیٰؑ کو دستیاب نہ تھا

فقط حسینؑ کے بچوں پہ بند تھا پانی
بہت قریب تھی وہ نہر قحطِ آب نہ تھا

حضور شاہ پھر آیا کہاں سے حُر شہید
خطا کی راہ میں گر جادۂ صواب نہ تھا

انیسؔ عمر بسر کردو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلام ابوتراب نہ تھا

خوبیٔ زبان چُستی بندش، بلند پروازیٔ مضامین رنگینیٔ طبیعت محتاج بیان نہیں
ظاہراً ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ میر انیسؔ صاحب مرحوم جس عمدگی کے ساتھ مرثیہ نگاری فرماتے تھے اسی طرح سلام کے لکھنے پر ایک حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے :۔

سلام میر مونسؔ نور اللہ مرقدہٗ

مجرئی جلتا تھا شہ کا جسم بے سر دھوپ میں
شامیانہ تھا نہ لاشے پر نہ چادر دھوپ میں

جب کھنچا عطر گل رخسار سرور دھوپ میں
مجرئی کیا کیا بسی زلف معنبر دھوپ میں

اس قدر حدت تھی روز قتل سرور دھوپ میں
اے سلامی لال تھے میداں کے پتھر دھوپ میں

آگ سے بھی تھی سوا اس دن حرارت مہر کی
باہر آتا گر تو جل جاتا سمندر دھوپ میں

اڑتے تھے ذرے شرر کی طرح ریگ گرم کے
سنگریزے جل رہے تھے مثل اخگر دھوپ میں

واں تو ابن سعد کے سر پر لگا تھا چتر زر
یاں کھڑا تھا مہر تاباں پیمبرؐ دھوپ میں

سایہ میں ڈھالوں کے تھا راحت سے شمر روسیاہ
چھاؤں تلواروں کی تھی سرور کے سر پر دھوپ میں

واہ ری جرأت کہ تنہا لڑ رہا تھا فوج سے
تین دن کا بھوکا پیاسا میر کوثر دھوپ میں

بیقراری جس طرح آتش پہ ہو سیماب کو
گر کے تڑپے اسطرح ریتی پہ اکبر دھوپ میں

تھیں ردائیں بھی نہ لاشوں پہ عجب نیرنگ تھا
سوکھتے تھے باغ زہراؑ کے گل تر دھوپ میں

شہ نے اعدا سے کہا لازم ہے اسپر تم کو رحم
بوند پانی کے لیئے نکلا ہے اصغر دھوپ میں

کہتے تھے شہ اسکو دامن میں چھپا لے اے زمیں
جلتی ریتی پہ پڑی ہے لاش اکبر دھوپ میں

رکھ دیا شمر لعیں نے ایک سنگ گرم پر
کاٹ کر تن سے سر سبط پیمبرؐ دھوپ میں

بے کفن چہلم تک افتادہ رہا وہ آفتاب
رہنے دیتی تھی نہ زہراؑ اسکو دم بھر دھوپ میں

کیا مصیبت تھی اسیران ستم پر ہے ستم
اوس میں رہتے تھے ساری رات دن بھر دھوپ میں

سایۂ طوبیٰ میں پہنچائیں گے مونسؔ کو حسینؑ
حشر کے دن دیکھ کر نالان و مضطر دھوپ میں

خوش خیالی، خوبی زبان، چُستی بندش کے ساتھ جس قدر میر مونس مرحوم رنگین طبع تھے اظہر من الشمس ہے طبیعت کی رنگینی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ سلام گوئی میر مونس مرحوم پر ختم تھی۔ اگر میر انیس غفران مآب عالم وجود میں نہ آئے ہوتے تو یقیناً اس قول کی صحت میں کسی پہلو سے جائے گفتگو ممکن نہ تھی ؛

معلوم ہوتا ہے کہ اہل فارس کو سلام گوئی کا مذاق کم ہے کوئی دلخواہ سلام فارسی کا راقم الحروف کو دستیاب نہ ہوا اِس لئے داخل جلد ہذا نہ کر سکا ؛

قصیدہ

قصیدہ وہ صنف شاعری ہے کہ عروضی ترکیب میں غزل سے تمام تر مشابہت رکھتا ہے، اِلّا یہ کہ اس میں غزل سے بہت زیادہ اشعار ہوتے ہیں، جس طرح غزل پانچ شعر سے کم کی نہیں ہوتی، اُسی طرح قصیدہ اکیس شعر سے کم کا نہیں ہوتا۔ لیکن مضامین کے اعتبار سے قصیدہ اور غزل میں بڑا فرق ہے۔ یہ صنف شاعری داخلی اور خارجی دونوں پہلو کے مضامین سے تعلق رکھتی ہے اِس صنف میں شاعر اعلیٰ درجہ کے مضامین جو امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ سے متعلق ہوتے ہیں موزون کرتا ہے اِس سے ظاہر ہے کہ قصیدہ کا احاطہ مضامین غزل کے اعتبار سے وسیع تر ہے۔ قصیدہ کے لیئے علو مضامین کی بڑی ضرورت ہے اگر کوئی قصیدہ اس صنف سے متصف نہیں ہے۔ تو اس پر قصیدہ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اِس صنف شاعری کے لئے ضرور ہے کہ اُس میں امور ذہنیہ از قسم مسائل اخلاق، تدبیر المنزل و سیاست مدن و مذہب، شریعت، طریقت، عرفان، توحید، عدل، نبوت، امامت، معاد، قوانین الٰہی و انسانی وغیرہ اور معاملات خارجیہ از قسم مضامین مشاہدات اشیائے عالم واضعیہ دمابینہما احاطہ نظم میں در آئیں۔ المختصر قصیدہ گوئی شاعر حکمت مآب کا کام ہے۔

اس کے لئے وفور معلومات علمیہ کی حاجت ہے لیکن ہزار افسوس ہے کہ اس صنف شاعری سے بہت سے شعرائے اہل علم بھی وہ کام نہیں لیتے گئے ہیں جو اس کا تقاضا ہے راقم نے قصیدہ کی بحث متنبی کی قصیدہ گوئی کے ذکر میں کی ہے جس سے قصیدہ کے استعمال بد کی کیفیتیں ظاہر ہوچکی ہیں۔ اسی پر فارسی اور اردو کی قصیدہ گوئی کو بھی خیال کرنا چاہیئے کہ شعرائے درباری کی بدولت یہ صنف شاعری کس درجہ ابتذال کو پہنچ گئی ہے، جاننا چاہیئے کہ قصیدہ کی اصل غرض یہ ہے کہ شاعری کے پیرایہ میں مسائل اخلاقی و معاشرت و تمدن و معاش و معاد وغیرہ کی تعلیم دینی و دنیوی بنی آدم کو نصیب ہو یا حمد خدا و نعت محمد مصطفیٰ و منقبت علی مرتضیٰ ع و ائمہ با صفا سے شاعر کو ثواب عقبیٰ حاصل ہو اور سامعین کو ذکر خدا و رسول و ائمہ سے توفیق عبادت پیدا ہو لیکن شعرائے ناعاقبت اندیش اس صنف شاعری کو اس بدتمیزی سے استعمال کرتے گئے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں کہ عربی اور فارسی اور اردو کی قصیدہ گوئی ننگ شاعری ہو کر شائستہ مذاقوں میں ان زبانوں کی تفضیح کی صورت ہوگئی ہے، ذیل میں کچھ فارسی اور اردو کے شعرائے قصیدہ گو کے کلام درج کیئے جاتے ہیں اور ان کی نسبت جو راقم کے خیالات ہیں وہ بھی خدمت ناظرین میں گزارش ہوتے ہیں ؛

فارس کی قصیدہ گوئی

ظاہر ہے کہ فارس کے تمام شعرائے قصیدہ گو کا ذکر اس کتاب میں کیا نہیں جا سکتا کس واسطے کہ اس کی تصنیف بہ سبیل تذکرہ واقع نہیں ہوئی ہے اس لئے صرف چند مشاہیر حضرات قصیدہ گو اس کتاب میں یاد کیئے جاتے ہیں ان کے نمونہ ہائے کلام سے قصیدہ

گوئی کی حقیقت کم و بیش طور پر منکشف ہو جائے گی ؎

رودکی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص فارسی کا پہلا شاعر ہے۔ قصیدہ کا موجد تو کہا نہیں جا سکتا۔ اس واسطے کہ اس کے ظہور کے بہت سی صدیاں پہلے یہ صنف شاعری اہل عرب میں جاری تھی بہر حال، رودکی قدیم ترین شعرائے فارس سے ہے اور اس کا کلام فطری خوبیوں سے معمور ہے۔ اس کے ایک قصیدہ کے کچھ اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ان سے ظاہر ہوگا کہ یہ شاعر فطرت کی تبعیت کرنیوالا تھا، بے سر و پا طور کے مضامین کا باندھنے والا نہ تھا۔ یعنی اُس کی ترکیب ظہیر فاریابی وغیرہ کی نہ تھی ہر چند قصیدۂ ذیل بھی ایک درباری قصیدہ ہے مگر ظہیر کے اناپ شناپ درباری قصیدوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ رودکی کا کلام زیور سادگی سے آراستہ نظر آتا ہے اور فطری رنگ رکھنے کے باعث دلچسپی سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔ اُس قصیدہ کا کوئی شعر ایسا نہیں دکھائی دیتا۔ کہ سعدی علیہ الرحمہ کو یہ کہنے کی ضرورت پڑتی ؎

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان نہی زیر پائے قزل ارسلان

واقعی سعدی کیا ہی عمدہ مذاق کے شاعر تھے آخر ظہیر کے اس شعر نے ؎

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

شیخ سے شعر بالا کہلا ہی چھوڑا کیوں نہ ہو ہر راست باز راست پسند راست طبیعت راست خلقت آدمی کو دروغ سرائی سے وحشت ہوتی ہے، لاریب ایسی ہی مبالغہ پردازیوں نے فارسی کی شاعری کو عالم میں بدنام کر رکھا ہے۔ اگر فارسی شاعری سے مبالغہ پردازی کی بدمذاقی دور ہو جائے تو فارسی شاعری پُر بہار ہو جائے۔ غضب خدا کا

ہے کہ فارسی کے شعراء اپنے سلاطین و امراء کی تعریف ایسے نہج سے کرتے ہیں کہ اگر
ان کے اشعار حمد خدا و نعت محمد مصطفیٰ اور منقبت علی مرتضیٰ میں پڑھے جائیں تو نہایت
ہی حسب حال معلوم ہوں بیشتر شعرائے فارس کے قصائد مدحیہ کا یہی رنگ دیکھا جاتا
ہے۔ باستثنائے شعرائے قلیل متقدمین و متاخرین سب کے سب مرض مبالغہ پردازی کے
علیل نظر آتے ہیں اور افسوس ہے کہ مرور ایام سے یہ بیماری ترقی ہی کرتی گئی۔ چنانچہ
فخر المتاخرین حکیم قاآنی کو آزار مبالغہ میں متقدمین سے بھی زیادہ مبتلا پاتے ہیں۔ مثلاً
ایک شعر اُن کے ایک قصیدہ مدحیہ کا عرض کیا جاتا ہے۔ شعر

شہنشاہے کہ ہست از رالطلوع و طبع جان و دل قضا تابع قدر طالع ملک خادم فلک چاکر

کاش قاآنی نے اس شعر کو مرزا ناصر الدین شاہ کی مدح کے عوض نعت محمد مصطفیٰ و
منقبت علی مرتضیٰ میں کہا ہوتا اسی طرح اس شاعر نادر کے سیکڑوں اشعار ہیں جو حمد و نعت و
منقبت کے لئے موزون معلوم ہوتے ہیں۔ نہایت جائے حسرت ہے کہ مبالغہ پردازی
کی بیماری سے فارسی کی نظم و نثر دونوں بدحال ہو رہی ہیں۔ مگر ابھی تک اس کے
ازالہ کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ کاش اب بھی کوئی علاج کی صورت نکلے
کہ فارسی کی شاعری پنجہ اجل سے نجات پائے۔

واضح ہو کہ شاعری کو دروغ سرائی سے کوئی علاقہ نہیں ہے دروغ سرائی
شاعری کی پُر تاثیری کو کھو دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر فارسی کے قصائد تمام تر بے اثر
نظر آتے ہیں۔ انھیں پڑھ کر طبیعت کو کسی قسم کی فرحت نصیب نہیں ہوتی۔
بالیقین ایسے قصائد تعلیم یافتہ دماغوں میں جگہ نہیں کر سکتے، اُن سے متلذذ ہوتے
کے لیے ضرور ہے کہ پہلے انسان اُن کے مضمونوں کا مذاق پیدا کرلے۔ بلاشبہ

ایسا شخص جو شاعری کو سرمایۂ زندگی و قوت روح جانتا ہے ایسی شاعری سے جو در حقیقت سوہان جان ہو کسی طرح کی دلی یا دماغی خوشی حاصل نہیں کر سکتا ہے بہرحال رودکی کا وہ قصیدہ جس کے کچھ اشعار درج ذیل ہوتے ہیں اُن معائب سے پاک ہے جن سے فارسی کی شاعری انگشت نما ہو رہی ہے اس میں نہ معیوب طور کی مبالغہ پردازی ہے اور نہ نامطبوع انداز کی نازک خیالی۔ ظہیر۔ عرفی۔ قاآنی وغیرہم کے طریقۂ قصیدہ گوئی سے تمامتر علیحدہ ہے۔ معما۔ چیستان اور ہر طرح کے صنائع بدائع کے معائب سے تمامتر پاک ہے۔ نیچرل شاعری کا نمونہ ہے اور جس غرض سے لکھا گیا تھا اُس کا پورا کرنے والا نظر آتا ہے ہی لئے حسن تاثیر سے آراستہ دکھائی دیتا ہے "

اشعار از قصائد رودکی

یاد جوئے مولیاں آید ہمی	یاد یار مہربان آید ہمی
ریگ آمو با درشتیہاے او	زیر پایم پرنیان آید ہمی
آب جیحوں از نشاط روئے ما	خنگ مارا تا میان آید ہمی
اے بخارا شاد باش و دیر زی	میر زی تو شادمان آید ہمی
میر سرو است و بخارا بوستان	سرو سوے بوستان آید ہمی
میر ماہ است و بخارا آسمان	ماہ سوئے آسمان آید ہمی

صاحب تاریخ گزیدہ لکھتے ہیں کہ رودکی کو اس قصیدہ کے لکھنے کی یہ حاجت ہوئی کہ امیر نصر ۳۰۵ھ میں بخارا کو چھوڑ کر مع ارکان دولت ہرات میں قیام پذیر ہوا تھا۔ اس شہر سے اُسے ایسی دلبستگی پیدا ہوئی کہ وہ بخارا کو بھول بیٹھا اکثر عہدہ دارا

ہت اس کے کوتاں تھے کہ وہ وطن مراجعت کرتا مگر وہ کسی کی نہیں سنتا تھا
تب رودکی نے یہ قصیدہ لکھا اور یہ قصیدہ بحضور امیر گایا گیا۔ اس قصیدہ کا یہ اثر
ہُوا کہ امیر فوراً جلسہ سے اٹھا اور بلا سامان سفر امرا اور رفقا کو لے کر بخارا کو روانہ
ہو گیا۔ صاحب ذخیرہ دولت شاہی لکھتے ہیں کہ علما کو اس قصیدہ کی مقبولیت پر
تعجب ہوتا ہے۔ کس واسطے کہ یہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے اور
یورات شاعری سے تمامتر معرا ہے امیر نصر کے بعد کے سلاطین کے حضور میں اگر ایسا
قصیدہ پڑھا جاتا تو ضرور اُن کی ناپسندیدگی کا باعث ہوتا۔ واضح ہو کہ دولت شاہ کی
یہ تحریر مذاق شعرائے فارس کے تمامتر موافق ہے مگر راقم کو اس قصیدہ کی مقبولیت میں
کوئی تعجب نہیں گزرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ قصیدہ نہایت فطری رنگ رکھتا ہے فطری
انداز بیان میں اگر پُرتاثیری موجود نہ ہو تو پھر کہاں ہو سکتی ہے۔ حضرت غالب نے بھی ایک
قصیدہ اسی زمین میں تحریر فرمایا ہے۔ اُس کے عمدہ ہونے میں کوئی گفتگو نہیں مگر اس کا
انداز اس قدر فطری نہیں ہے اس لئے اس کو اس قدر حُسن قبول حاصل نہ ہُوا۔ علاوہ
اس کے جائے غور ہے کہ رودکی نے اپنا قصیدہ ایسے وقت میں لکھا تھا کہ تمام امرا و
وزرا اور رفقائے امیر پر حُبِّ وطن کا جوش غالب ہو رہا تھا۔ رودکی بھی دوریٔ وطن سے
پریشان تھا۔ ایسی حالت میں جو کچھ رودکی نے کہا۔ دل سے کہا

آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد

یہ موقع حضرت غالب کو کب نصیب ہُوا۔ پس حسب مراد مقبولیت کی
قدرت حضرت غالب کے قصیدہ کو کیونکر ہو سکتی تھی ؛

فردوسی طوسی ابوالقاسم نام نامی ہے اور فردوسی تخلص چونکہ وطن ملک طوس تھا

اس لیئے طوس کی نسبت کے ساتھ یاد کیئے جاتے اور درجہ حکمت حاصل رہنے کے باعث ملقب بہ حکیم ہیں اِس خدائے سخن کی شہرت قصیدہ گوئی کی بنیاد پر نہیں ہے جس بنیاد پر ہے اُس کی بحث آئندہ آئے گی۔ یہاں ذیل میں ایک قصیدہ جو اِس ہمایوں نہاد کی فکرِ پاک کا نتیجہ ہے۔ نذر ناظرین کیا جاتا ہے یہ قصیدہ منقبت سیدنا امیر المومنینؑ میں ہے اور دوستداران امام کے خلافِ مذاق نہیں ہے ؛

قصیدہ فردوسیؒ

اگر بری نجم زلف "تا بدار انگشت — ز زلف خویش برآری ز بہ نہار انگشت
بگر ستمارۂ زلف تو می کُند شانہ — کہ کردہ در خمِ زلف تو بے شمار انگشت
گرہ گرہ شدہ رگہاے جان خستہ دلان — چو کردہ زلف سیاہ تو تار "تار انگشت
بحرفِ قتل من انگشت کش نہادی دوش — سرم فدا ے تو زین حرف بر مدار انگشت
سزاے شہا شہادت شہید عشق برد — چو بار تیغ برآرد دلا برار انگشت
پئے نظارۂ مشکین ہلال او با ماہ — کشند مہ نواز ین نیلگوں حصار انگشت
بمستی آرزوے پائے بوس او کردم — نہادہ بر لب خون نوش خود نگار انگشت
؛ لا چو پیر شدی بگذر از ہوا و ہوس — ز بہر آرزوے نفس خود برآر انگشت
بگو کہ بود کہ شد فتح باب خیبر از و — کہ کرد بر در آن قلعہ استوار انگشت
کہ پارہ کرد کمندِ نفاق و رشتۂ کفر — بہ گاہوارہ کہ زد در دہان مار انگشت
علیؑ عالی اعلیٰ کہ دست ہمت او — ہزار نے زدہ بر چشم ذوالخمار انگشت
شہے کہ تا زد و انگشت در ز خیبر کند — برآمد از پئے اسلام صد ہزار انگشت

زدست تیغ تو جان برد روز جهاں ایمان | ہر آنکہ کرد بدیں تو استوار انگشت
کسے کہ حب تو اش نیست تا بروز شمار | بھرزہ گوئی تسبیح می شمار انگشت
کسے کہ دست بدامان حیدر و آلش | نزد بساکہ بدندان کند فگار انگشت
شہا ز اسد مسلم کرم کہ گاہ رکوع | کند برائے تو انگشتری نثار انگشت
کمینہ چاکر مداح تست فردوسی | ہمیشہ با قلمش گشتہ دستیار انگشت
بگیر دست خدایا بحق حیدر و آل | دران نفس کہ رود خلق رازکار انگشت
موالیان علی را ز روئے لطف و کرم | ز ہول روز جزا بر قرار دار انگشت

شہا غلام غلام توام مرا بہ گذار
برائے فاقہ برآرم بہ زینہار انگشت

سنائی مجد الدین نام نامی ہے۔ سنائی تخلص۔ اور حکیم لقب ہے۔ وطن اطراف غزنین میں تھا۔ ظہور اس حکیم نامی کا آل سبکتگین کے عہد میں ہوا اس خاندان کے جن جن بادشاہوں کو اس یکتائے روزگار کے دیکھنے کا اتفاق ہوا حلقہ بگوش عقیدت رہے۔ واقعی حکیم سنائی عجب بزرگ گذرے ہیں اہل سنت ان کو اولیاء و اتقیا سے جانتے ہیں حکماء ان کو حکیم مانتے ہیں۔ شعراء ان کو استاد باکمال کہتے ہیں۔ شیعہ ان کو عظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں ذیل میں ایک قصیدہ حکیم ممدوح کا بطرز نمونہ نذر ناظرین ہوتا ہے۔

قصیدہ سنائی نمبرا

مکن در جسم و جان منزل کہ این دون است و آن والا | قدم از ہر دو بیرون نہ نہ اینجا باش و نہ آنجا

بهرچه از راه باز افتی چه کفر آن حرف و چه ایمان
بهرچه از دوست وامانی چه زشت آن نقش و چه زیبا

گروه هر دوان بینی که مر دوشان بینی از دوزخ
نشانِ عاشق آن باشد که خشکش بینی از دریا

سخن کز راه دین گوئی چه عبرانی چه سریانی
مکان کز بهر حق جوئی چه جابلقا چه جابلسا

مگو مزدور عاقل را برائے امن او نکته
مده مجبور در جبا اهل راز بهر طبع او حرفا

نه حرف از بهر آن آمد که سوزی زهرهٔ زهرا
نه حرف از بهر آن باشد که دزدی چادر زهرا

تو علم آموختی از حرص آنگه ترس کاندر شب
چو دزدی با چراغ آید گزیده‌تر برد کالا!

چو علمت هست خدمت کن چو بے علماں که زشت آید
گرفته چینیان احرام و مکی خفته در بطحا

چو تن جان را مزین کن به علم دین که زشت آید
ازین سو شاه عریان و ازاں سو کوشک انے دیبا

ترا یزداں همی گوید که در دنیا مخور باده
ترا ترسا همی گوید که در صفرا مخور حلوا

ز بهر دین نه بگذاری حرام از حرمت یزداں
ولیک از بهر تن مانی حلال از گفتهٔ ترسا

مرا باری بحمد اللہ ز راه حکمت و همت
به سوئے خطهٔ وحدت برد عقل از خطهٔ اشیا

نخواهم لاجرم نعمت نه در دنیا نه در جنت
همی گویم به هر ساعت چه در سرا چه در ضرا

که یارب مر سنائی را سنائے ده تو در حکمت
چناں کز وے بر تنگ آید روانِ بو علی سینا

نگردان عمر من چوں گل که در طفلی شوم کشته
نگردان حرص من چوں مل که در پیری شوم برنا

مکن حرص از شر بستے خودم بگیر از من که بد کردم
بیا این بود و تابستان و آب سرد و استسقا

بهرچه از اولیا گفتند ارزقنی و وفقنی
بهرچه از انبیا گفتند آمنا و صدقنا

سبحان اللہ، واقعی سوا حکیم کے کون شاعر ایسے اشعار موزون کر سکتا ہے یہ شعر دفترِ حکمت ہے۔ تعلیم دین و دنیا کا خاتمہ ہے۔ کیسے کیسے مسائل منقح پیرائۂ شاعری میں بیان ہوئے ہیں یہ اشعار عالموں کو راہ ہدایت بتانے والے ہیں ان سے فلسفی کو فوائد

مطلبِ منتج ہو سکتے ہیں۔ اِن سے طالبِ حق دریافتِ حق کر سکتا ہے کیا کہنا ہے آفرین صد آفرین، لاریب جس زبان میں ایسے اشعار موجود ہوں وہ زبان اپنے وقار پر ناز کر سکتی ہے۔ کاش فارسی کے سب قصائد اِس انداز کے ہوتے۔ حیف صد حیف کہ درباری قصیدہ گویوں نے اِس زبان کو بے آبرو کر ڈالا ہے اِس زبان کے وقار پر بد مذاقی شعراء کا ابر ایسا چھا رہا ہے کہ یہ زبان مبتلائے تیرگی ہو رہی ہے واضح ہو کر برائے خود قصیدہ ایک نہایت اعلیٰ اور افضل اصنافِ شاعری سے ہے مگر اس کے استعمال بد نے اسے مقدوح بنا رکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ صنعت شاعری بڑے بڑے اہم مضامین کی بندش کے واسطے وضع کی گئی تھی جیسا کہ اس قصیدہ کے انداز سے ہویدا ہے راقم ایک اور بھی قصیدہ اِس حکیم عالی مقام کا درج ہذا کرتا ہے ؎

قصیدہ سنائی نمبر ۲

برگ بے برگی نداری لاف درویشی مزن ‫ ‫ رخ چو عیاران مبارا جان چو نامردان مکن

ہر چہ یابی جز ہوا آن دین بود در جان بکار ‫ ‫ ہر چہ بینی جز خدا آن بت بود درہم شکن

سر برآر از گلشن تحقیق تا در کوئے دین ‫ ‫ کشتگان زندہ بینی انجمن در انجمن

در یکے صف کشتگان بینی بہ تیغے چون حسینؓ ‫ ‫ در دگر صف خستگان بینی ز زہرے چون حسنؓ

در دو دین خوبوالعجب در دے ست کاندر وے چو شمع ‫ ‫ چون سوئی بپاد بہتر گردی از گردن زدن

ہر خسے از رنگ گفتارے باین رہ کے رسد ‫ ‫ درد باید صبر سوز و مرد باید گام زن

قرن ہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع ‫ ‫ عاقلے کامل شود یا فاضلے صاحب سخن

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب ‫ ‫ لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

ماه ہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش — صوفئی را خرقہ گردد یا حمارے را رسن
ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ زآب و گل — شاہدی را حلہ گردد یا شہیدے را کفن
روزہا باید کشیدن انتظار بے شمار — تا کہ در جوف صدف باراں شود درِ عدن
صدق و اخلاص درستے باید و عمر دراز — تا قرین حق شود صاحب قرآنے در قرن
باد و قبلہ در رہ توحید نتواں رفت راست — یا رضائے دوست باید یا ہوائے خویشتن

کس منہ سے اشعار بالا کی تعریف کی جائے سبحان اللہ وصل علی ہر شعر اعلیٰ درجہ کی تعلیم روحانی کا آلہ ہے کس قدر فطرت کے قرین ہے حق گوئی اور حق جوئی کا خاتمہ ہے کلام ایسا تو ہو کہ ضرب المثل کا حکم رکھتا ہو۔ فارسی کو جس قدر بد مذاق قصیدہ گویوں کی سخن سنجی سے سرمایۂ شرمساری مترتب ہوا ہے اسی قدر ایسے اشعار کی بدولت گنجینہ ناز بھی ہاتھ آیا ہے واقعی سنائی ایسے حکیم دین و دنیا گذرے ہیں کہ ہر مذہب و ملت کا آدمی ان کے شرف حکمت تابی کا قائل اگر نہ ہو تو آدمی نہیں ہے اس پر سے حضرت دلائے اہل بیت میں ایسے غرق معلوم ہوتے ہیں کہ خاندان نبوت کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے واقعی جب تک انسان کسی شئے کو محبوب نہیں رکھے گا اس کو گاہ و بیگاہ یاد نہیں کرے گا فرقہ شیعی مذہب کا حکیم سنائی کو نظر عظمت سے دیکھنا بے وجہ نہیں معلوم ہوتا ؛

انوری

حکیم اوحد الدین انوری قصیدہ گوئی میں مشہور آفاق ہیں۔ اطراف خراسان میں پیدا ہوئے سلطان سنجر سلجوقی کے عہد میں ان کی شاعری نے شہرت پکڑی واقعی انوری بڑے طباع تھے علم و فضل میں حکیم کا درجہ رکھتے تھے، مگر مؤلف کی دانست میں ان کی قصیدہ گوئی حکیم سنائی کی قصیدہ گوئی کی خوش مذاقی تک نہیں پہنچتی ہے انوری درباری شاعر تھے۔ مگر سنائی نے تقرب سلطانی سے اپنی شاعری کے دامن کو

آلودہ ہونے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سنائی کا کلام پاک اور مقدس نظر آتا ہے۔ ان دونوں حکیموں کے حالات زندگانی پر نظر ڈالنے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اہل کمال دو نہج کے آدمی تھے۔ انوری طالب جاہ و منال تھے۔ اور سنائی تارک دنیا انوری نے اپنے کمالات علم و فضل کی بدولت تقرب سلطانی حاصل کیا۔ مگر سنائی نے سلطانی تقرب سے اپنے کو علیحدہ رکھا۔ انوری کے حالات میں محققین نے لکھا ہے کہ ایک روز آپ مدرسہ کے دروازے پر بیٹھے تھے کہ ملک الشعراء حکیم ابوالفتح کی سواری نہایت جاہ و احتشام کے ساتھ سامنے سے گزری۔ انوری نے کہ مبتلائے افلاس ہو رہے تھے۔ پوچھا کہ یہ کون میر ہے کہ اس تزک سے جاتا ہے لوگوں نے کہا کہ یہ شاعر بارگاہ سلطانی ہے۔ انوری نے کہا کہ میں بھی اپنے کو سلسلہ شعراء میں داخل کروں گا۔ یہ ارادہ کر کے ایک قصیدہ مدحیہ خدمت شاہ میں پیش کیا۔ بادشاہ کو بہت پسند آیا سلطان بڑے اعزاز و احترام سے پیش آئے اور آخر کار انوری کو ملک الشعراء کا رتبہ بخشا۔ اس کے برخلاف حکیم سنائی کی سرگذشت نظر آتی ہے کہ سلطان وقت ابراہیم غزنوی نے اُن کا اپنی بہن سے بیاہ کر دینا چاہا، مگر سنائی کی آزاد مزاجی نے بادشاہ کی خواہش پوری ہونے نہ دی آپ نے فوراً سفر حجاز اختیار فرمایا اور حج و زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے واضح ہو کہ انسان کے اخلاق و اطوار کو اس کے علم و فضل میں تمام تر دخل ہوتا ہے پس جب سنائی کا انداز مزاج ایسا تھا تو ضرور ہے اس کے کلام میں بھی اس کے مزاج کا انداز پایا جائے۔ چنانچہ امر واقعی بھی ایسا ہی ہے کہ سنائی کا کلام بڑی حوصلہ مندی سے خبر دیتا ہے۔ دنیا سے دوں کی پستی کی طرف میلان نہیں رکھتا یہ بات درباری شاعر میں پائی نہیں جا سکتی

طالب جاہ و منال کہاں تک عالی خیال ہو سکتا ہے۔ نہایت جائے افسوس ہے کہ سلاطین اسلام کی بدولت شاعری درجۂ ابتذال کو پہنچ گئی۔ جائے غور ہے کہ حکیم انوری سے قابل شخص کو بھی اُس کام کو کرنا پڑتا تھا جو سچے شاعر کے لئے ایک بڑے ننگ کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً سلاطین نے شاعری کو اپنی مداحی کے واسطے مختص سمجھا تھا پس اُنھیں شعرار کی عزت و آبرو ہوتی تھی جو اپنے بادشاہوں کی مدح میں کوئی دقیقہ دروغ گوئی کا اٹھا نہیں رکھتے تھے انوری کے اکثر قصائد گو بڑی طباعی سے خبر دیتے ہیں مگر درباری شاعری کے معائب سے بھرے ہیں راقم ذیل میں ایک قصیدہ حکیم ممدوح کا درج کرتا ہے یہ نعتیہ قصیدہ ہے اور غرض قصیدہ گوئی کے موافق ہے حضرات ناظرین حصول ثواب فرمائیں اور اس کے مصنف عالی مقام کے لئے حق تعالیٰ سے خواستگار رحمت ہوں ؂

قصیدۂ انوری

اے شادیِ جانِ آفرینش	وے گوہرِ کانِ آفرینش
اے محرمِ خلوتی کہ آنجا	محو است نشانِ آفرینش
اے بلبلِ بوستانِ تجرید	در شورہ ستانِ آفرینش
در جلوہ کنیدِ کشف لطفت	اسرارِ نہانِ آفرینش
در بدو وجود گفت پیرت	کاے بخت جوانِ آفرینش
تا جستہ ز فکرِ تنت روانی تیر	تیرے ز کمانِ آفرینش
آزاد مراتبِ یقینت	ز آسیبِ گمانِ آفرینش
بے فاتحۂ ثنا نبردہ	نامِ تو نشانِ آفرینش

در شیوۂ اختراع ابداع — با تاب و توان آفرینش
کم کردہ گران رکابی تو — تیزی عنان آفرینش
در پے جہتی ہلال قدرت — فارغ ز ربستان آفرینش
در پے صفتی علو نعمت — برتر ز زبان آفرینش
تا بستہ نبود تا کہ بودہ — پیش تو میان آفرینش
ہیبت تو گرفتہ صدر ولایت — زان سوے جہان آفرینش
دہ یازدہ قبول داری — بر کل مرکان آفرینش،
بیش است زکات مایۂ تو — از سود و زیان آفرینش
سوگند بجان تو خورد عقل — یعنی کہ بجان آفرینش
ہر تو بہ مجلست بہاریست — در فصل خزان آفرینش
افتادہ بر آستانہ شمع — مست از تو روان آفرینش
بوزینہ استعارت تست — آرایش خوان آفرینش
نقد سخنت چو رائج افتاد — در داد دستان آفرینش
پرسید ز عقل کل کہ آن چیست — گفتا ہمہ این آفرینش
صراف سخن کہ نفس کل است — بر طرف دکان آفرینش
تا ابلق تند دہر رام است — اندر خم ران آفرینش
در خدمت دولتت باد — دوران زمان آفرینش
شیرین ز زبان شکر نیست — تا حشر دہان آفرینش

خاقانی حکیم افضل الدین شروانی حسان عجم کی شہرت شاعری اُن کی قصیدہ گوئی کی وجہ

سے ہے اِس صنعت شاعری میں اُنھیں بڑی دستگاہ حاصل تھی قصائد ان کے بہت پسند و لنظر آتے ہیں۔ اور ہر چند اکثر درباری شاعری کے عیوب سے پاک نہیں ہیں۔ اس پر بھی حکیمانہ مذاق رکھتے ہیں لاریب خاقانی کے کلام میں بڑی نازک خیالی اور بلند پروازی دیکھی جاتی ہے فقیر کی دانست میں حکیم قاآنی کے قصائد اس قدر حکیمانہ انداز نہیں رکھتے گو ان کی شوکت لفظی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ خاقانی کے کلام کے نقصانات یہ ہیں کہ محض آسان مضامین بھی دقت خیز ترکیبوں سے حوالۂ قلم کیئے گئے ہیں اور چونکہ عموماً بیان مضامین کا طور دشوار ہوا کرتا ہے پُر تاثیری اُن میں کمتر پائی جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاقانی کو دم سخن سنجی یہ یاد نہیں رہتا تھا کہ خوشخیالی لسانی کی محتاج نہیں ہے ظاہر ہے کہ خوب و مرغوب مضامین کچھ دکا داک بیان سے بے اثر ہو جاتے ہیں مسائل منقح کیلئے سادگی بیان ہی عمدہ ہوا کرتی ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ عالی اور نازک خیالات ایسی دقیق ترکیبوں سے حوالۂ قلم کیئے جائیں کہ معمے کی صورت پیدا کریں ذیل میں بطرز نمونہ کچھ اشعار قصیدہ نزہۃ الارواح و نزہتہ الاشباح سے نذر ناظرین ہوتے ہیں ؎

قصیدہ

شب رواں در صبح صادق کعبۂ جاں دیدہ اند
صبح را چوں محرمان کعبہ عریاں دیدہ اند

از لباس نفس عریاں ماندہ چوں ایمان صبح
ہم لبِ صبح از کعبۂ جاں روئے ایمان دیدہ اند

در شکر ریز ند زشکر خواں کہ گردوں داشت بہ صبح
ہمچو پستہ سبز و خوان آلوز خنداں دیدہ اند

وادی فکرت بریدہ محرم عشق آمدہ
موقف شوق ایستادہ کعبۂ جاں دیدہ اند

روز و شب دیدہ دوگا دلبستہ در قربانگہش
صبح از تیغ و شفق را خون قرباں دیدہ اند

خواندہ اند از لوح دل شرح مناسک بہر آنکہ	در دل از خط ید اللہ صدر دلبستان دیدہ اند

نام سلطان خواندہ ہم بہ پاسخ سلطان از آنکہ	دل علامتگاہ پاسخہائے سُلطان دیدہ اند

از کجا برداشتہ زاول ز بغداد طلب	در کجا در وادی تجرید امکان دیدہ اند

صبحدم راندہ ز منزل تشنگانِ ناآشنا	چاشت گہ ہم مقصد و ہم چشمہ ہم خوان دیدہ اند

در سجود کعبۂ جاں ساکنانِ سدر را	ہم چو عقل سارکان سرمست و حیراں دیدہ اند

در حریم کعبہ جاں محرماں الیاس وار	علم خضر و چشمۂ ماہی بریان دیدہ اند

در طریق کعبہ جان چرخ زریں کاسہ را	از پئے دریوزہ جاں کاسہ گردان دیدہ اند

گشتگان کز کعبہ جان باز جانور گشتہ اند	ماہی خضر اند گوئی کاب حیوان دیدہ اند

کعبہ جان زاں سوئے نُہ شہر چوبی ہفت دہ	کیں دو چار النفس ذمی طبع دہقان دیدہ اند

برگذشتہ زیں دہ و زاں شہر در اقلیم دل	کعبہ جان را بہ شہر عشق بنیان دیدہ اند

خاکیاں دانند راہ کعبہ جان کوفتن	کیں رہ دشوار مشتے خاک آساں دیدہ اند

کعبہ سنگین مثال کعبۂ جان کردہ اند	خاصگان ایں را طفیل دیدن آں دیدہ اند

ہر کبوتر کز حریم کعبہ جان آمد است	زیر پرش نامہ توفیق پنہان دیدہ اند

عاشقان اول طواف کعبۂ جان کردہ اند	پس طواف کعبۂ تن عرض فرمان دیدہ اند

مطلع ثانی

باخیال دیدہ نقش کعبہ جان دیدہ اند	دیدہ را از شوق کعبہ زمزم افشاں دیدہ اند

اشعار بالا سے خاقانی کی طباعی ہویدا ہے یہ اشعار تمام تر حکیمانہ مذاق رکھتے ہیں اس کی بلند پایگی معرض گفتگو میں نہیں آسکتی واضح ہو کہ خاقانی اکثر شاعری کا داخلی پہلو [illegible] پیش اُن کا کمتر کوئی قصیدہ ہے جو اس پہلو سے خالی نظر آتا ہے یہ ایک بڑا

فرق درمیان خاقانی اور قاآنی کے حائل ہے کما لا یخفیٰ علیٰ ارباب النظر والتحقیق۔

سعدی بحیثیت قصیدہ گو

شیخ علیہ الرحمہ کو قصیدہ گوئی سے بھی مناسبت حاصل تھی اور یہ مناسبت اس قسم کی نہ تھی جو قصیدہ گوئی کو بدنام کر ڈالنے والی ہوا کرتی ہے چونکہ حضرت کی طبیعت میں راست خیالی اور راست گفتاری داخل تھی آپ کے قلم سے ایسی باتیں نکل ہی نہیں سکتی تھیں جنھیں سن کر کسی حق گو یا حق جو کا دل پریشان ہو واقعی آپ قولاً و فعلاً مصداق راستی تھے اسی واسطے جب کوئی قصیدہ منظوم فرماتے تھے تو ظہیر فاریابی وغیرہ کی ترکیبوں سے تمامتر علیحدہ رہتے تھے عموماً آپ کا کلام بظاہر آسان اور بباطن دشوار نظر آتا ہے خیالات کی صفائی ایسی ہے کہ فردوسی۔ نظامی۔ انوری اور خاقانی کو بھی نصیب نہیں ہوئی جو بات زبان قلم پر آجاتی ہے ضرب المثل کا حکم رکھتی ہے حضرت کی قصیدہ گوئی بھی ان صفات سے خالی نہیں ہے۔ ذیل میں ایک قصیدہ موعظت اور دو قصیدے تعریف ربیع کے نذر ناظرین ہوتے ہیں یہ تینوں قصیدے اغراض قصیدہ گوئی کے تمامتر موافق ہیں پہلا قصیدہ موعظت کا ہے اور حسن بیان سے معمور ہے اس کی پر تاثیری غافلوں کو ہوشیار بنا دینے والی اور سوتوں کو جگا دینے والی ہے ہر مصرع تصویر عبرت ہے فصیح سے فصیح اور بلیغ سے بلیغ واعظ بھی اس سے بہتر طریقہ وعظ اختیار نہیں کر سکتا۔ اسی لئے مساجد میں سر منبر واعظین اس قصیدہ کو پڑھتے ہیں واقعی اس کی پر تاثیری ایسی ہے کہ اگر شخص دنیا دار غفلت کردار اس کو بہ توجہ سنا کرے تو اس کی آنکھ میں دنیا ہیچ دکھائی دینے لگے اور یقیناً آخر کار اسے دنیا سے تنفر پیدا ہو جائے گا واہ سعدی واہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے خوب اس قول کو سمجھا تھا کہ دنیا روزے چند آخر کار با خداوند۔ تب ہی تو آپ ایسی پر تاثیر زبان میں اس خیال کو نظم کر سکے حضرات حق آگاہ سے پنہاں نہیں ہے کہ

نیچرل شاعری کا کلام عموماً راستی سے مملو ہوتا ہے۔ مگر یہ کہ راستی کے ساتھ کلام کمال درجے کی شاعری کی صفت کے ساتھ بھی متصف ہو یہ بڑی ندرت سے خبر دیتا ہے سعدی کی شاعری بھی ندرت رکھتی ہے کہ راستی مضامین کے اعلیٰ درجہ کے شاعرانہ حسن سے مزین پائی جاتی ہے اس قصیدہ کو حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ شروع سے آخر تک نہ صرف مصداق راستی ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کی تصویر بھی ہے اس کے علاوہ جو اور دو قصیدے سے منسلک ابدا ہوتے ہیں وہ بھی اغراض قصیدہ گوئی کے تمامتر موافق ہیں۔ ان دونوں قصیدوں میں شیخ علیہ الرحمہ نے ربیع کی صفت بڑی عالی مذاقی کے ساتھ حوالۂ قلم فرمائی ہے اہل مذاق صحیح ان کو پڑھیں اور نیچرل شاعری کا لطف اٹھائیں ؎

واضح ہو کہ سعدی کے ان دونوں ربیع کے قصیدوں کو دیکھ کر ٹامسن (THOMSON) شاعر انگلستان یاد آتا ہے' اس با مذاق شاعر نے بھی فصلوں کی کیفیتیں منظوم کی ہیں اس کی اس تصنیف کا نام ٹامسنز سیزنس ہے ؎

قصیدہ سعدی نمبر ا

ترا ز کوس اجل کے فراغ خواہد بود	فراغ گاہ تو دار الفراغ خواہد بود
اگر تو ملک جہاں را بدست آوردی	مباش غرہ کہ ناپائدار خواہد بود
بمال غرہ چہ باشی کہ یک دو روزے چند	ہمہ نصیبہ میراث خوار خواہد بود
ترا بہ تختہ و تابوت در کشند از تخت	گرت خزانہ و لشکر ہزار خواہد بود
ترا بہ کنج لحد سالہا بباید خفت	تن تو طعمۂ ہم مور و مار خواہد بود
اگر تو در چمن روزگار ہیچو گلے	دمیدہ بر سر خاک تو خار خواہد بود

نیاز مندی یاران ندارد ت سود ے | مگر عمل کہ ترا یار یار خواہد بود
بسا سوار کہ آنجا پیادہ خواہد شد | بسا پیادہ کہ آنجا سوار خواہد بود
بسا امیر کہ آنجا اسیر خواہد شد | بسا اسیر کہ فرمان گزار خواہد بود
بسا امام ریائی و پیشوائے بزرگ | کہ روز حشر و جزا شرمسار خواہد بود
چرا ز حال قیامت دمے نیندیشی | کہ حال بے خبران سخت زار خواہد بود
بہشت می طلبی از گنہ نہ پرہیزی | بہشت منزل پرہیزگار خواہد بود
گزر ز باطل و مردانہ حق پرستی کن | ز حق پرستی بہتر چہ کار خواہد بود
بساز چارہ رفتن چو رہروان رفتند | کہ سعدی از تو سخن یادگار خواہد بود
بہ قطرہ قطرہ حرامت عذاب خواہد داد | بہ ذرہ ذرہ حلالت شمار خواہد بود

اے حضرات حقائق دستگاہ واقعی سعدی کا کلام کس قدر پُر تاثیر معلوم ہوتا ہے کون شخص دنیا میں ہے جو اِن اشعار کو پڑھ کر دنیا کی طرف سے افسردہ خاطر نہ ہوگا یہ وہ اشعار ہیں کہ سلطنت دولت حکومت حسن شباب ہوت زور اور دنیا کی تمام نعمتوں کے نشہ کو پھاڑ ڈالنے والے ہیں واہ کلام ہو تو ایسا پُر تاثیر ہو پر تاثیر کی امر اختیاری نہیں ہے۔ ہر شاعر سعدی نہیں ہو سکتا یہ تمام تر خدا کی دین ہے جسکو خدا دے وہی پائے ؎

این سعادت بزور بازو نیست | تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

قصیدہ نمبر ۲ در صفت ربیع

عَلَمِ دولت نوروز بصحرا برخاست | لشکرِ زحمتِ سرما ز سرِ ما برخاست
تا ریاد گلہ قاقم برفت از سرِ کوہ | یزکِ تابشِ خورشید بہ یغما برخاست

بر عروسان چمن بست صبا ہر گہرے
کہ بغوّاصی ابر از دل دریا برخاست

این چہ بوئے ست کہ از جانب خلّخ بدمید
وین چہ بادی است کہ از جانب صحرا برخاست

چہ ہوائے است کہ خلدش بتحیر بنشست
چہ زمینے است کہ چرخش بتولا برخاست

طارم اخضر از عکس چمن حمرا گشت
بسکہ از طرف چمن لولوے لالا برخاست

موسم نغمۂ چنگ است کہ در بزم صبوح
بلبلاں را ز چمن نالہ و غوغا برخاست

بوے آلودگی از خرقۂ صوفی آید
شور دیوانگی از سینۂ دانا برخاست

از زمین نالۂ عشاق بگردوں برسید
واز ثری نالۂ مستان بہ ثریا برخاست

بسکہ خوباں بہ تفرج سوے بستان رفتند
الغیاث از چمن و گلبن حمرا برخاست

عاشق امروز بذوقی بتماشا بنشست
کہ دل زاہد از اندیشۂ فردا برخاست

ہر کجا طلعت خورشید رخے سایہ فگند
بیدلے خستہ کمر بستہ چو جوزا برخاست

ہر کجا سرو قدے چہرہ چو یوسفؑ بنمود
عاشقے سوختہ خرمن چو زلیخا برخاست

ہر کسے را ہوس روے گلے در سر شد
نہ کہ این ولولہ از بلبل تنہا برخاست

بارخش لالہ ندانم بچہ رونق بشگفت
باقدش سرو ندانم بچہ یارا برخاست

سر ببالین عدم باز نہ ای نرگس مست
کہ ز خواب سحر آن نرگس شہلا برخاست

بسخن گفتن او عقل ز ہر دل برمید
عاشق آن قد سروم کہ چہ زیبا برخاست

روز رویش چو برانداخت نقاب سر زلف
گوئی از روز قیامت شب یلدا برخاست

ورق خوبی معشوق ز ہم بر گردید
قلم عافیت از عاشق شیدا برخاست

ترک عشقش بنۂ صبر چناں غارت کرد
کہ جہاں را ز حرم راز معما برخاست

سعدیا نامہ سیہ کردن سودا تا کے
کہ قلم را الم از دست تو سودا برخاست

قصیدہ سعدی نمبر ۳

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار — خوش بود دامن صحرا و تماشائے بہار

صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار — وقت آن نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

کوہ و دریا و درختاں ہمہ در تسبیح اند — نہ ہمہ مستمعاں فہم کنند این اسرار

بلبلاں وقت گل آمد کہ بنالند از شوق — نہ کم از بلبل مستی تو بنال اے ہشیار

آفرینش ہمہ تنبیہ خداوند دل است — دل ندارد کہ ندارد بخداوند اقرار

ایں ہمہ نقش عجب بر در و دیوار وجود — ہر کہ فکرت نہ کند نقش بود بر دیوار

خبرت نیست کہ مرغان چمن می گویند — کاخر اے خفتہ سر از بالش غفلت بردار

ہر کہ امروز نہ بیند اثر قدرت او — غالب آن است کہ فرداش نہ بیند دیدار

تا کے آخر چو بنفشہ سر غفلت در پیش — حیف باشد کہ تو در خوابی و نرگس بیدار

کہ تواند کہ دہد میوۂ رنگین از چوب — یا کہ داند کہ بر آرد گل صد برگ از خار

وقت آنست کہ داماد گل از حجلۂ غیب — بدر آید کہ درختاں ہمہ کردند نثار

آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب — سرو در باغ برقص آمدہ و بید و چنار

باش تا غنچۂ سیراب دہن باز کند — بامداداں چو سر نافۂ آہوئے تتار

مژدگانی کہ گل از غنچہ برون می آید — صد ہزار آ غنچہ ریزند عروسان بہار

باد گیسوئے عروساں چمن شانہ کند — بوئے نسرین و قرنفل ببرد در اقطار

ژالہ بر لالہ فرود آمدہ ہنگام سحر — راست چوں عارض گلگون عرق کردۂ یار

باد بوئے سمن آورد و گل و سنبل و بید — در دکان بچہ رونق بگشاید عطار

خیری و خطمی و نیلوفر و بستان افروز	نقشہائے کہ در و خیرہ بماند ابصار
ارغوان ریختہ بر درگہ خضرائے چمن	ہمچنان است کہ بر تختۂ دیبا دینار
این ہنوز اول آثار جہاں افروزی است	باش تا خیمہ زند دولت نیسان وایار
شاخہا دختر دوشیزۂ باغ اند ہنوز	باش تا حاملہ گردند بالوان شمار
حیف از عمر گرانمایہ کہ در لہو برفت	یارب از ہرچہ خطا رفت ہزار استغفار
درد پنہاں بہ تو گویم کہ خداوند منی	یا نہ گویم کہ تو خود مطلعی بر اسرار

مولانا جمال الدین عرفی شیرازی :-

یہ شاعر گرامی ہندوستان میں شہرت عظیم رکھتا ہے مگر اس سے اہل ایران بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ عرفی - حزین کی طرح ایران میں غیر معروف نہیں ہے شہرت عرفی کی قصیدہ گوئی کی بنیاد پر ہے اس کے قصائد درسیات میں داخل ہیں عرفی کی قصیدہ گوئی ایک ممتاز پایہ رکھتی ہے لیکن جو ایشیائی شاعری کے نقائص ہیں اس شاعر کے قصیدوں میں موجود ہیں عرفی کے قصائد کا مجموعہ جس کا معروف نام قصائد عرفی ہے ایسے قصیدوں پر مشتمل ہے جو علاوہ قصائد حمد و نعت و منقبت کے اکبر شاہنشاہ دہلی شاہزادہ سلیم و دیگر امرائے دربار کے مدحیہ قصائد ہیں اور تمامتر درباری رنگ رکھتے ہیں عرفی ایک ذی علم شاعر تھا - اور چونکہ اہل زبان سے ہے ضرور اسے وہ آسانی بیان کی حاصل تھی جو فارسی میں ہندی قصیدہ گو کو فطرت کی رو سے حاصل نہیں ہو سکتی ہے ۔ واضح رہو کہ اس کتاب میں راقم الحروف کو کسی ملک کی زبان سے بحث نہیں ہے اس لیے یہاں جو کچھ خیالات فقیر کے حوالہ قلم ہوتے ہیں۔ ان کو مجرد شاعری سے تعلق ہے اس پہلو سے عرفی کی نسبت یہ عرض اہم ہے کہ عرفی ایک ممتاز شاعر ہے کوئی تعجب

نہیں کہ عہد اکبر اعظم میں اس کی طباعی نے فروغ پکڑا اور آج تک اس کی شاعری کی شہرت قائم رہ گئی ہے لاریب یہ شاعر گرامی دشوار گو مضمون آفرین اور خوش خیال ہے مگر اپنے خیالات کو آسان ترکیبوں سے حوالۂ قلم نہیں کر سکتا ہے ہن کے کلام میں استعارات کی ایسی کثرت ہے کہ اکثر اوقات دم کو اُلجھن ہونے لگتی ہے تشبیہات بھی افراط کے ساتھ داخل کلام دیکھی جاتی ہیں مگر مبالغات درجۂ مبالغہ کو پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عرفی کی شاعری یورپین شاعری کے ساتھ کسی طرح کی مناسبت نہیں رکھتی ہے۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ ان کا ترجمہ کسی مغربی زبان میں حسبِ مُراد اچھے طور پر نہیں ہو سکتا ہے عرفی کو قصیدہ گوئی میں زیادہ تر داخلی شاعری کی طرف میلان معلوم ہوتا ہے برخلاف مرزا حبیب قاآنی کے جو اس صنف شاعری میں تمامتر خارجی پہلو کے پابند دکھائی دیتے ہیں۔ عرفی ہر چند ایک نامی شاعر ہے مگر اس کو نیچرل شاعری کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ کشمیر کی تعریف میں جو اس کے اشعار قصیدہ ہیں اُن کو فطرت نگاری سے کوئی علاقہ نہیں معلوم ہوتا ہے مطلع ہی اس قصیدہ کا ایشیائی مبالغہ نگاری کی پوری تصویر دکھائی دیتا ہے۔

ہر سوختہ جانیکہ بہ کشمیر در آید　　گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

سارا قصیدہ پڑھ جائیے کہیں بھی کسی سبزی کا بیان حوالۂ قلم نظر نہیں آتا ہے۔ البتہ ہر جگہ مبالغوں کی بھرمار ہے جس سے طبیعت کو شگفتگی خاطر کا نصیب ہونا معلوم کشمیر کے وصف میں اگر یہ قصیدہ لکھا گیا تھا تو ضرور تھا کہ کشمیر کا بیان فطری رنگ رکھتا۔ کشمیر ایک دلچسپ جگہ ہے اس کا سچا بیان ضرور ہے کہ مسرت خیز ہو۔ ہن کے جبال صحرا چشمے سبزہ زار۔ مرغزار لالہ زار جنگل وحوش طیور اور ہزاروں

اقسام کے اظہار و اتمام ایک نیچرل شاعر کے لئے سرمایۂ کثیر کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر مولانا عرفیؔ کو نیچرل شاعری کا مذاق ہوتا تو کشمیر کی تعریف میں ایسا کوڈھنگا قصیدہ تصنیف نہ فرمائے ہوتے۔ یورپ کا ایک نیچرل مذاق کا شاعر کشمیر کا ایک ایسا فوٹو تیار کر دیتا جس سے اہل مذاق کو کشمیر کی پوری سیر نصیب ہو جاتی۔ بہت جائے افسوس ہے کہ عموماً فارسی کے قصیدہ گو شعرا نیچرل مذاق سے محروم پائے جاتے ہیں لاریب جس شاعر کو نیچرل مذاق کی دولت نصیب نہیں ہے اس کا کلام دل میں جگہ نہیں کر سکتا۔ ذیل میں ایک قصیدہ اس شاعر گرامی کا داخل کتاب اںذاکیا جاتا ہے یہ قصیدہ حمد کا ہے جیسا کہ مولانا عرفیؔ کا دستور ہے نازک خیالیوں کی دستیابی کا سامان اس قصیدہ میں بھی کثرت استعارات کے ذریعہ سے عمل میں لایا گیا ہے اس پر بھی یہ قصیدہ بہت کچھ قابل توجہ ہے

قصیدہ عرفیؔ

اے متاع درد در بازار جان انداختہ
گوہر ہر سود در جیب زیان انداختہ

نور حیرت در شب اندیشۂ اوصاف تو
بس ہمایوں مرغ عقل از آشیان انداختہ

از کماں ناجستہ در چشم تحیر کردہ جا
معرفت کو تیر حکمی بر نشان انداختہ

اے بطبع باغ کون از بہر ریحان حدوث
طرح رنگ آمیزی از فصل خزان انداختہ

سرعت اندیشہ را افگندہ در دامان تیر
عادت خمیازہ در جیب کمان انداختہ

در چمن ہائے محبت ہر قدم چون کربلا
از نسیم عشوہ فرش ارغوان انداختہ

مرغ طبع اندر ہوائے معصیت بکشودہ بال
عفو تو شاہین رحمت را بران انداختہ

سایہ پرور دغمت در آفتاب رستخیز
فرش استبرق بزیر سایبان انداختہ

طعمۂ عشق ترا از مغز جان آوردہ ام
آں ہما تا سایہ برایں استخواں انداختہ

اے بذلت را روائی دادہ در بازار عشق
عزت و شانرا از اوج عزوشان انداختہ

ہر کجا با تیر غم را دادہ اذن عمودم
شادی راحت نشاں را ناتواں انداختہ

زیں خجالت چوں بروں آیم کہ از دو موج خوں
نو عروسان غمت را موکشاں انداختہ

فیض را نازم کہ ہر کس پا براہت ماندہ است
دل بدست آوردہ و جانرا از میاں انداختہ

صید دل را بہر آگاہی ز صیاد ازل
در کمند طرۂ عنبر فشان انداختہ

کردہ از عرفاں لباس عجز را دامن دراز
کوتہی در جیب عقل نکتہ داں انداختہ

طعمۂ کز خوان عشق افگندہ ام در کام دل
ریزۂ آنرا جحیم اندر دہان انداختہ

شرع گوید منع لب کن عشق گوید نعرہ زن
کاسے تو ہم در رہ عشق خود عنان انداختہ

دولت وصلت کہ دریابد کہ با آن محرمی
جوہر اول علم بر آستان انداختہ

حیرت حسن ترا نازم کہ در بزم وصال
جام آب زندگی از دست جاں انداختہ

وصف صنعت کز لب ہر ذرہ میریزد سخن
نطق را در معرض عقد اللسان انداختہ

در ثنایت چوں کشایم لب کہ برق ناکسی
منطقم را آتش اندر خان و ماں انداختہ

من کہ باشم عقل کل را نادکے از ادب
مرغ اوصاف تو از اوج بیاں انداختہ

مست ذوق عرفیم کز نغمۂ توحید تو
لذت آوازہ درکام جہاں انداختہ

قاآنی حکیم مرزا حبیب شیرازی مشہور بہ قاآنی۔ اطراف شیراز میں پیدا ہوئے والد بزرگوار ان کے مرزا ابوالحسن گلشن تخلص کو فن شاعری کے ساتھ بڑی شیفتگی پیدا تھی بیٹے کو اس کی طرف مائل پاکر چاہا کہ اس فن کی تعلیم دیں چنانچہ قاآنی کو نہایت

کم عمری میں خراسان کی جانب بھیج دیا۔ مشہد مقدس میں مرزا حبیب نے علوم مروجہ میں دستگاہ حاصل کر کے شاعری کا مشغلہ شروع کر دیا۔ چونکہ اس فن کے ساتھ طبیعت کو بڑی مناسبت حاصل تھی۔ سخن سنجی میں جلد مشہور دیار و امصار ہو گئے۔ کوئی شک نہیں کہ قاآنی کو شاعری کی بڑی قوت حاصل تھی۔ لیکن اگر اس شاعر کی فطری استعداد میں تقاضائے زمان و مکان کو دخل نہ ہوتا تو یہ وہ شاعر تھا کہ جودت طبع اور جدت فکر کی بدولت عالم میں اپنا ڈنکا بجا دیتا۔ مگر اس بڑے طباع کو بھی اُن ہی مکروہات کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کے مبتلا قبل ہیں عنصری۔ فرخیؔ عسجدیؔ، انوریؔ۔ عرفیؔ وغیرہ ہو چکے تھے۔ بہت جائے افسوس ہے کہ یہ شاعر کسی ایسے آزاد ملک میں پیدا نہ ہوا جہاں شاعری سے بھٹئی کا کام نہیں لیا جاتا ہے بلکہ جہاں شاعری دولت اور حکومت کے فکر و ذکر سے تمامتر لب بند اور خاموش رہا کرتی ہے بہت جائے حیرت ہے کہ اس انیسویں صدی میں زمانہ نے بہت کچھ ترقیاں کیں۔ مگر فارسی کی قصیدہ گوئی جس مبتذل حالت میں تھی رہ گئی، قاآنی کی قابلیتوں کو خیال کر کے اور بھی زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ یہ نادر روزگار۔ اسی صدی میں تھا جس میں اہل یورپ و اہل امریکہ نے انواع صورتوں کی ترقیاں نمایاں کیں مگر اس کی شاعری اُن بدحالیوں میں مبتلا رہی۔ جن میں اس کے قبل کی صدیوں کی شاعری علی الاتصال گرفتار چلی آئی۔ حالات قاآنی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اُس کی شاعری پر اُس کی ملکی بدمذاقیوں کا کیونکر اثر پڑا جس سے نہ اُسے اور نہ اس کی شاعری کو حافظؔ یا سعدیؔ کی عظمت و جلالت کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ المختصر جب قاآنی کا نام فن شاعری میں بلند ہوا اس کی شہرت نے اُسے

شاہزادہ حسن علی مرزا والئی خراسان کی خدمت میں پہنچایا۔ واضح ہو کہ قاآنی کے درباری شاعر ہونے کی ابتدا اسی وقت سے ظہور میں آئی۔ شروع شروع میں اس کی شاعری کی آزادی کو داغ اسی تقرب سے لگا۔ شاہزادہ نے قاآنی کو ایک قابل شاعر پاکر سلسلہ ندما میں داخل کیا۔ ظاہر ہے کہ شاعری کو سلاطین و امرا کی ندیمی سے کیا علاقہ لیکن جب یہ حکیم ندیم بنا تو ایشیائی درباروں کی بے عنوانیوں سے اس کا مامون رہنا محال تھا پس تقاضائے خدمت سے ندیموں کی طرح عمر بسر کرنے لگا اور اس تعلق کی حالت میں اس نے خدمت ندیمی کی مشق کو اس درجہ تک پہنچایا کہ تھوڑے عرصے کے بعد اسے فتح علی شاہ کی حضوری نصیب ہوئی تو بے تکلف ندمائے شاہنشاہی میں در آیا۔ یہ تقرب شاہی اسے تادم آخر نصیب رہا یعنی فتح علی شاہ جنت آرامگاہ کے بعد محمد شاہ بہشت آرام کی ندیمی کرتا رہا۔ پھر بھی خدمت مرزا ناصر الدین شاہ خلد مکان کے عہد میں برقرار رہی حتیٰ کہ ۱۲۷۰ھ میں راہی ملک بقا ہوا۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ درباری شاعر کی عمر بڑی امید و بیم میں بسر ہوتی ہے ہمیشہ اُسے بادشاہ اور امرا کی رضامندی کی فکر رہتی ہے امید نان و بیم جان کا مضمون پیش نظر رہتا ہے چنانچہ یہی حالت قاآنی کی تمام عمر رہی تادم آخر یہ شاعر کامل الغیا سلاطین و امرا کی خوشامدیں کرتا رہا۔ اور اپنے کمال شاعری سے شاعری میں داغ نقصان لگاتا رہا اس یکتائے روزگار کا دیوان کھول کر دیکھئے تو چند قصیدوں کے سوا جتنے قصیدے ہیں سب کے سب شاہان و اہل حکومت ہی کی مدح میں دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ تیری پناہ۔ جس شاعر کا یہی روزگار دھندا ہو کر طرح طرح کے جھوٹے اور غیر فطری مضامین دل سے گڑھ گڑھ کر حوالۂ قلم کیا کرے۔ تو اس کے دل میں

راست بازی اور فطرت پسندی کی کیا صلاحیت باقی رہ سکتی ہے پس ایسا شاعر سچی شاعری کی کیا داد دے سکتا ہے اور شاعری کی بلند پایگی کو قائم رکھ سکتا ہے راقم ذیل میں حکیم قاآنی کے دو قصیدے نذر ناظرین کرتا ہے ایک قصیدہ امام ہشتم علیہ السلام کی ثنا میں ہے اور دوسرا ویسا ہی مدحیہ ہے جیسا کہ امرا و سلاطین کے لئے لکھا جاتا ہے۔

اشعار از قصیدۂ منقبت در شان سید انام علیہ التحیۃ والثنا

بگردون تیرہ ابرے بامدادان برشد از دریا — جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا
چو چشم اہرمن خیرہ چو روی زنگیان تیرہ — شدہ گیتی ہمہ خیرہ بہ مغزش علت سودا
شبہ گون چون شب غاسق گرفتہ چون دل عاشق — بہ اشک دیدہ وامق برنگ طرۂ عذرا
تنش با قیر آلودہ دلش از شیر آمودہ — برون پر سرمہ سودہ درون پر لولوے لالا
بدل گلشن بہ تن زندان گہے گریان گہے خندان — چو در بزم طرب رندان ز شور نشہ صہبا
چو دیوے برہوا رفتہ چو دیوے مست آشفتہ — زدہ بس دُر ناسفتہ ز مستی خیرہ بر خارا
شدہ خورشید نور افشان بہ تار جسم او پنہان — چو شاہ مصر در زندان چو ماہ چرخ در ظلما
دیا در تیرہ چہہ شبرن نہفتہ چہرۂ روشن — دیا روشن گہر بہمن شدہ در کام اژدرہا
لب غنچہ رخ لالہ بر دن آوردہ تبخالہ — ز بس باران ازان رخ الہ بہ طرف گلشن و صحرا
ز فیض او دمیدہ گل شمیدہ طرۂ سنبل — کشیدہ از طرب بلبل بہ شاخ سرخ گل آوا
عذار گل خراشیدہ خط ریحان تراشیدہ — ز بس الماس پاشیدہ بہ باغ از ژالہ بیضا
از اطراف خارستان شدہ یکسر بہارستان — و زور شک نگارستان زمین از لالہ حمرا
فگندہ بر سمن سایہ دمن را دادہ سرمایہ — چمن زد عرق پیرایہ چو رنگین شاہد رعنا

زبیمش مرغ جان پرّد زسہمش زہرہا درّد   بچو او چوں اژدہا غرّد ویا چوں رعد کشد آوا

خرد شد سرہ دم از گردن کہ پوشد برتن ہاموں   زسنبل کسوت اکسوں ز ژالہ خلعتِ دیبا

فشاند بر چمن ژالہ و ماند از دمن لالہ   چناں از دل کشد نالہ کہ سعد از فرقتِ اسما

کنوں از فیض دبستان نماید از گل و ریحاں   برنگ چہرۂ غلمان بہ بوئے طرۂ حورا

چمن از سرو سیسنبر ہمال خلخ و کشمر   دمن از لالہ و عبہر طراز تبت و یغما

زبس گلہائے گوناگوں چمن چوں صحف انگلیوں   تو گوئی فرش سقلاطون صبا گسترده در مرعیٰ

زبس خوباں فرخ رخ گلستان غیرتِ خلّخ   ہمہ چوں [illegible] با سخ ہمہ چوں سیم در سیما

زبس لالہ زبس نسرین دمن رنگین چمن مشکین   زبوئے آں ز رنگ این ہوا دلکش زمیں زیبا

گل زبادو زاں لرزاں وزاں مشک ختن ارزاں   بلے نبود شگفت ارزاں کساد عنبر سارا

زفر لالہ و سوسن زنور دنار لستر دن   دمن چوں وادیٔ ایمن چمن چوں سینۂ سینا

چو در ہاموں چو در بستان صف اندر صف گل ریحاں   زیکسو لالۂ نعمان زیکسو نرگس شہلا

تو گوئی اہل این کشور برہنہ پا برہنہ سر   چماں در خشک سال اندر بہ ہاموں بہر استسقا

چمن از فر فروردین چناں نازاں بدشت چین   کہ طوس از فر شاہِ دیں برین نہ گنبد خضرا

واضح ہو کہ اس قصیدہ میں ۸۵ شعر ہیں اور سب اشعار آبدار ہیں بہ سبیل اختصار ان میں سے کچھ اشعار نقل کر لئے گئے۔ سبحان اللہ کیا سخن آوری ہے متاخرین کو یہ شاعری کیا نصیب ہوتی متقدمین میں بھی یہ طباعی خاقانی کے سوا کسی اور میں پائی نہیں جاتی قاآنی کی تشبیہوں کے مضامین اکثر خارجی رنگ رکھتے ہیں یہ رنگ قصیدہ گوئی کے لئے نہایت مناسب ہے بلکہ قصیدہ کے تشبیبی اشعار کا داخلی رنگ رکھنا قصیدہ کو غزل نما کر دیتا ہے واضح ہو کہ یہ بڑے عالی فکر اور با مادہ شاعر کا کام ہے کہ داخلی رنگ

ہیں قصیدہ لکھے اور قصیدہ کو غزل نما ہونے نہ دیے بہر حال قصیدہ بالا میں جو قاآنی کا رنگ ہے تمام تر قصیدہ گوئی کے حسب حال ہے کاش اس خلاق سخن کے تمام قصائد حمد و نعت و منقبت و مسائل علوم و فنون وغیرہ سے مشتمل ہوتے ہزار حیف کہ اتنی بڑی قابلیت کے شاعر کو مدح سرائی کا مبتذل کام انجام کرنا پڑا اور شاہان و امرا کی پابوسی میں اس کی عمر گرامی تمام ہوئی۔ خیر مقدرات سے کوئی چارہ نہیں ہے اب حضرات اہل انصاف اس شاعر کی خوبیوں پر نظر انصاف ڈالیں واضح ہو کہ یہ قصیدہ منقبت امام ضامن ثامن میں ہے یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی شخص آل محمدؐ کی ثنا خوانی حق ثنا خوانی کے مطابق انجام کر سکے تو بھی بحد طاقت بشریہ یہ ایسا قصیدہ منقبت لکھا گیا ہے کہ اگر اس کی ربع خوبیوں کے برابر کوئی شاعر اظہار فکر کرے تو اسے جس لقب گرامی سے دوستدار ان آل محمدؐ یاد کریں بجا و درست ہے اس قصیدہ کے اشعار تشبیب شوکت لفظی اور معنوی ایسے رکھتے ہیں کہ کم تر کسی قصیدہ کے اشعار تشبیب اس صفت خاص سے متصف دیکھے جاتے ہیں۔ فصاحت کا خاتمہ نظر آتا ہے فصاحت کے ساتھ بلاغت کی آمیزش شاعری کی ممتاز صورت دکھا رہی ہے رنگینی الفاظ کا یہ عالم ہے کہ مینا کاری کا حکم رکھتی ہے جو لفظ جہاں پر ہے ایک جڑاؤ جوہر ہے ان سب ندرتوں کے ساتھ عالی خیالی بلند پروازی نفاست پاکیزگی تمکنت اس درجہ کی ہے جس کی اعلیٰ درجہ کی شاعری متقاضی ہے ان محاسن کے علاوہ یہ اشعار نیچرل خوبیوں سے مملو ہیں قاآنی نے ملک ایران کی بہار کی تصویر ان اشعار میں کھینچی ہے۔ اشخاص ہندی وطن کے لئے ایسی بہار کو بغیر اس کے دیکھے سمجھنا خلاف توقع ہے ایران کی بہار ہندوستان کی بہار سے آسمان زمین کا فرق رکھتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں نہ

خزاں ہے نہ بہار ہے کوئی ایران کی بہار کو اپنی آنکھوں سے دیکھے تو سمجھے کہ بہار کیسے کیسے ہیں وہاں کی خزاں جیسی عبرت خیز ہوتی ہے ویسی ہی بہار بھی عشرت انگیز ہوتی ہے. تشبیب کے بعد گریز کیسی خوبصورت ہے پھر اشعار منقبت ایسے ہیں کہ درگاہ امام علیہ السلام میں ان کی مقبولیت مرتبہ یقین رکھتی ہے آفریں صد آفریں بروح قاآنی باد

قصیدہ قاآنی نمبر۲

واضح ہو کہ یہ قصیدہ کسی حاکم وقت کی مدح میں لکھا گیا ہے فقیر نے اُس میں سے صرف اشعار تشبیب انتخاب کر لیئے ہیں. بقیہ اشعار قصیدہ روٹی کیا کھانے لکھے ہیں جیساکہ درباری رنگ کے اشعار ہوا کرتے ہیں بہر حال اس کے اشعار تشبیب بہت کچھ قابل توجہ ہیں اور اس بات کے ثابت کرنے والے ہیں کہ قاآنی ان شاعروں میں سے ہے کہ جب آسمان سیکڑوں برس چکر کھاتا ہے تب ایسے شعرائے گرامی پیدا ہوتے ہیں اُس کی بھی تشبیب بہار یہ ہے اور بہار ایران کی تصویر ہے اسی لیئے اس کے جتنے اشعار ہیں محض خارجی رنگ رکھتے ہیں ؛

نسیم خلد می وزد مگر ز جویبار ہا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ بوئے مشک میدہد ہوائے مرغزار ہا
فراز خاک و خشتہا دمیدہ سبز کشتہا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چہ کشتہا بہشتہا نہ دہ نہ صد ہزار ہا
بہ چنگ بستہ چنگہا بہ تائے ہشتہ زنگہا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چہ کاد ہا کلنگہا تذروہا ہزار ہا
زنائی خویش ناختہ ز صد اصول ساختہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ترانہا نواختہ چو زیر و بم تار ہا
زخاک رستہ لالہا چہ بسدیں پیالہ ہا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ببرگ لالہ ژالہا چو در شفق ستارہا
فگندہ اند ہمہمہ کشیدہ اند زمزمہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بشاخ سرو بن ہمہ چہ کبکہا چہ سارہا

نسیم روضهٔ ارم جهد به مغز دمبدم ز بس دمیده پیش هم بطرف جویبارها
بهارها بنفشه ها شقیقها شگوفها شمامها خجسته ها اراکها عرارها
ز هر کرانه مستها پیالها بدستها ز مغز مے پرستها نشانده می خمارها
ز ریزش سحابها بر آبها حبابها چو جوے نقرہ آبها روان در آبشارها
فراز سرو بوستان نشسته اند قمریان چو مقریان نغز خوان بزمردین منارها
فگنده اند غلغله دو صد هزار یکدله به شاخ گل پے گله ز رنج انتظارها
درختهاے بارور چو اشتران باربر همی ز پشت یک دگر کشیده صف قطارها
مهارکش شمالشان سحابها رحالشان اصولشان عقالشان فروعشان مهارها
درین بهار دلنشین که گشته خاک عنبرین ز من ربوده عقل و دین نگارے از نگارها
رفیق بو شفیق خو عقیق لب شقیق رو رقیق دل دقیق مو چه موز مشک تارها
بطرہ کرده تعبیه هزار طبله غالیه به مژده بسته عار به برنده ذوالفقارها
مهی دو هفت سال و سواد دیده خال او شگفته از جمال او بهشتها بهارها
دو کوزه شهد در لبش دو چهر ماه نخشبش نهفته زلف چون شبش تبارها تبارها
سهیل حسن چهر او دو چشم من سپهر او مدام مست مهر او نبیذها عقارها
چه گویمت که دوش چون بناز و غمزه شد برون به حجره آمد اندرون بطرز مے کسارها
نگفته [illegible] ز سرخ مے که گر ازو چکد به نے همی ز بند بند وے برون جهد شرارها
دونده در دماغ و سر جهنده در دل و جگر چنانکه بر جهد شرر به خشک ریشه خارها
مرا العطش ده گفت مے تراست هیچ میل مے بگفتمش بیاد کے بنوشمش بیارها
خوش است مست کامت انجم خوریم مے بیاد جم که گشته دولت عجم قوی چو کوهسارها

زسعی صد نامور مہین امیر دادگر　　کز و کشودہ باب در رحصن و از حصار

اُردو کی قصیدہ گوئی

اُردو کی قصیدہ گوئی کا انداز تو وہی ہے جو فارسی کی قصیدہ گوئی کا ہے مگر اُردو میں قصیدہ گوئی کو فارسی کے برابر فروغ حاصل نہیں ہُوا ہے اِس کی چند وجہیں دیکھی جاتی ہیں اوّل یہ کہ فارسی اُردو کے اعتبار سے قدیم تر زبان ہے چند صدیاں اردو کے وجود کے پہلے فارسی میں قصیدہ گوئی بہت زور شور کے ساتھ رواج پکڑ چکی تھی سیکڑوں سلاطین گزر چکے تھے اور ہزاروں شعرا دفاتر سیاہ کر چکے تھے پس اُردو نے اتنا زمانہ ہی نہیں پایا کہ اِس صنف شاعری میں فارسی کے ساتھ برابری کا دعویٰ کر سکے دوم یہ کہ جس وقت میں اُردو کی قصیدہ گوئی نے صورت اختیار حاصل کرنا شروع کی اُس وقت سلاطین ہند مبتلائے ادبار ہو چکے تھے اُن کے اختیار میں اتنا بھی نہیں رہا تھا کہ اپنے مداحوں کی اوقات بسری کا کوئی معقول سامان کر سکیں اردو کے نامور قصیدہ گو شاعروں میں مرزا رفیع سودا اور شیخ ابراہیم ذوق ہیں ان دونوں کی حالت معاش کو ہی سے قیاس کرنا چاہیے کہ سودا تکلیف ۔ زری سے دہلی سے پایۂ تخت کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے ذوق جو دہلی میں رہے بھی تو مبتلائے افلاس رہے حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ذوق اور چار روپیہ ماہانہ کی نوکری اختیار کریں اور اِس تنخواہ سے رفتہ رفتہ بہ ہزار خرابی آخر عمر میں سو روپیہ ماہواری تک پہنچیں ، یہ دو مثالیں اِس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ ہندوستان میں جس وقت اُردو کی قصیدہ گوئی رواج میں آئی وہ وقت اِس صنف شاعری سے حصول مال و منال کا نہ تھا پس ایسی حالت میں اُردو کی قصیدہ گوئی کا فروغ فارسی کے

ادر کیونکر ہو سکتا تھا سوم یہ کہ فارسی میں ایسے درجہ کے شعرائے قصیدہ گو جو وفور علم و
انش کے باعث حکیم کا درجہ رکھتے تھے کثرت سے گزرے ہیں اُن کے فضل و کمال
کا ایک شاعر بھی اُردو زبان میں نظر نہیں آتا ہے اردو میں جو کچھ ہیں حضرت سودا ہیں
اگر سودا نہ ہوتے تو اردو کی قصیدہ گوئی کو زیر بحث لانا بھی فضول ہوتا المختصر اردو کی قصیدہ
گوئی کو فارسی کی قصیدہ گوئی کے ساتھ مقابلہ کی کوئی صورت حاصل نہیں ہے اُردو
میں نہ سعدی اور سنائی کے درجہ کا اخلاق آموز کوئی قصیدہ گو گزرا ہے اور نہ خاقانی و
انوری و قاآنی وغیرہ وغیرہ کی ترکیبوں کا برتنے والا پیدا ہوا ہے بہر حال جو کچھ حالت
موجودہ اُردو کی قصیدہ گوئی کی ہے ذیل کے بیانات سے منکشف ہوگی،

ظاہر ایہی معلوم ہوتا ہے کہ جتنے قصیدے اُردو زبان میں تصنیف ہوئے
ادرباری یا مذہبی اغراض سے لکھے گئے ہیں مذہبی اغراض کے قصائد درباری
اغراض کے قصائد سے بہت کم ہیں اس کی وجہ محتاج بیان نہیں ہے دنیاوی
ضرورتیں دینی ضرورتوں پر ہمیشہ غالب ہوا کرتی ہیں اس کے ثبوت میں راقم استاد
ذوق کے قصائد پر حوالہ کرتا ہے دیوان ذوق میں منجملہ ۲۴ قصیدوں کے ایک قصیدہ
بھی نہیں ہے جو حمد خدا یا نعت محمد مصطفیٰ یا منقبت علیؑ مرتضیٰ یا محامد ائمہ باصفا میں
میں لکھا گیا ہو صرف ایک قصیدہ ہے جو کسی درویش موسوم بہ عاشق نہال کی شان
میں ہے اسی سے سمجھنا چاہیئے کہ بیچارے ذوق کو درباری تعلقات سے اتنی فرصت
نہ تھی کہ بہ حیثیت شاعر پیغمبر کی خدمت کر سکتے البتہ سودا مومن غالب وغیرہ
نے درباری قصائد کے علاوہ کچھ مذہبی قصائد بھی لکھ کر سعادت عقبیٰ حاصل کی ہے
مختصر اُردو میں درباری قصیدوں کی تعداد مذہبی قصائد کے اعتبار سے بہت زیادہ

پائی جاتی ہے لیکن ان دونوں ترکیبوں کے قصائد کے سوا اور کسی ترکیب کا قصیدہ اُردو
میں پایا نہیں ہے۔ یا راقم کی نظر سے نہیں گزرا ہے راقم نے آج تک کوئی قصیدہ اردو
میں ایسا نہ دیکھا جو قصائد سبعہ معلقہ کی ترکیب لکھا ہو یا سعدی یا سنائی کے خلاق
آموز قصائد کا جواب سمجھا جائے۔ درحقیقت اُردو کے قصائد بیشتر ایک تنگ دائرہ
خیال میں محدود پائے جاتے ہیں خاص کر وہ قصائد جو درباری رنگ رکھتے ہیں ایسے
قصائد کے مضامین ہمیشہ اُن خیالات پر مشتمل ہیں۔ جن کو نہ کوئی راست باز صحیح
مزاج شریف آدمی زبان پر لا سکتا ہے اور نہ راست باز صحیح مزاج شریف آدمی سن سکتا
ہے اکثر ایسے قصائد کے مضامین اس طرح پر بندش پاتے ہیں کہ شاعر پہلے تشبیب کے
اشعار لکھتا ہے تشبیب میں یا زمانہ کی شکایت کرتا ہے اور اپنی بدحالیوں کو دکھاتا
ہے یا موسم بہار کی کیفیتوں کو رقم کرتا ہے یا اپنے جوہر ذاتی اور عالی صفاتی کو موزون کرتا ہے
اور بھی اسی طرح کے مضامین جن کو تشبیب سے مناسبت ہے حوالہ قلم کرتا ہے اس کے بعد
مضامین تشبیب سے گریز کر کے ممدوح کی تعریف کا کوئی درجہ اٹھا نہیں رکھتا ہے ممدوح کی
خوبصورتی وجاہت دولت جلالت عظمت شوکت، قدرت ہمت سخاوت وغیرہ
وغیرہ نہایت غیر فطری طریقوں سے کی جاتی ہے پھر اس کے ہاتھی گھوڑے تلوار وغیرہ
کی تعریفیں از بس نامربوط رنگ پر باندھی جاتی ہیں پھر اس کے طول عمر کیلئے اس وضع سے
دُعا کی جاتی ہے کہ اس کا قبول ہونا معلوم۔ آخر میں اس کے دشمن کے لئے بددعا بھی اسی بد قرینگی
کے ساتھ کی جاتی ہے۔ جس بد قرینگی کے ساتھ دعا کی جاتی ہے المختصر اکثر قصائد مدحیہ کا
یہی انداز ہوتا ہے جیسے راقم نے عرض کیا اب ارباب مذاق یہ فرمائیں کہ جس شاعری کا
یہ انداز ہے وہ شاعری کیا ہے، لاریب اردو کی قصیدہ گوئی بہت اصلاح طلب ہو رہی ہے

اقعی جو اس وقت کی قصیدہ گوئی ہے شاعری کو بدنام کرنے والی ہے ایسی قصیدہ گوئی
رف شاعر اور ان کے ممدوح کو ذلیل نہیں کرتی ہے بلکہ تمام ان اقوام کو جو اردو کو اپنی
دری زبان جانتے ہیں بہت جائے افسوس ہے کہ ابھی تک اردو کی قصیدہ گوئی نے
کسی قسم کی اصلاح کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ حاجت مند شعرا جو ریاستوں میں حصول رزق
کی ... پھرتے ہیں وہی پرانا راگ گایا کرتے ہیں۔ ممدوح کو سخاوت میں حاتم، شجاعت
میں رستم عدل میں نوشیروان حکمت میں لقمان لکھا کرتے ہیں، سپاہ ممدوح کو مور و ملخ
بتاتے ہیں۔ اس کے تابع فرمان آفتاب ماہتاب فلک ملک ابر باد آتش خاک
غبار قدر سب ہی کو کر دیتے ہیں اس کی تلوار کو برق ہاتھی کو کوہ اور گھوڑے کو ہوا
بنا کرتے ہیں۔ اس کی عمر کو خضر سے بھی طویل تر چاہا کرتے ہیں اور اسی طرح کے سیکڑوں
مربوط مضامین حوالہ قلم کیا کرتے ہیں ایسے شعرا سے اصلاح مذاق کی امید تو فضول
ہی فضول ہے لیکن مگر ان کے ممدوحین اظہار رضامندی کے عوض اظہار نارضامندی
فرمادیں تو شاعری کا یہ نامحسود طریقہ دور دفع ہو جائے اور واقعی حال کے مذاق کی
قصیدہ گوئی میں ایک انقلاب معقول پیدا ہو۔ لاریب حال کی قصیدہ گوئی نہایت
درجہ ابتذال کو پہنچ گئی ہے حتیٰ کہ گدائی کی صورتوں میں سے یہ بھی ایک صورت ہو رہی
ہے۔ کہتے: قصیدہ گو شعرا مالدار اشخاص کے پاس قصائد مدحیہ لے کر آیا کرتے ہیں
یہ بھی سوال کا ایک طریقہ ہو گیا ہے۔ یہ نکبتی شعرا صرف مالداروں پر نازل
نہیں ہوتے، ہم غربا اور مساکین کو بھی تنگ کرتے ہیں ایک بار ایک قصیدہ گو
صاحب فقیر کے گھر تشریف لائے عاجز نے انھیں مسافر سمجھ کر اپنے مقدور کے
مطابق کچھ سلوک کرنا چاہا، شاعر صاحب بہت برہم ہوئے اور فرمانے لگے کہ ایسے

قصیدہ غرا کا اس قدر انعام قلیل دیا جاتا ہے فقیر نے عرض کی کہ حضرت یہ آپ کے
قصیدہ کی اجرت نہیں ہے بہ حیثیت شاعر آپ مجھ سے کچھ بھی پانے کے مستحق نہیں
ہیں آپ کو مسافر سمجھ کر کچھ دیا چاہتا ہوں آپکا قصیدہ آپ کو مبارک ہو آپ اس کو کسی
ایسے احمق کے پاس پیش فرمائیے گا جو اپنے کو دارا کیکاؤس کیخسرو و فریدون رستم حاتم نوشیروان
لقمان ارسطو فلاطون وغیرہ وغیرہ سمجھے میں بیچارہ کہاں اور یہ مشاہیر عالم کہاں آپ ہی
انصاف فرمائیے کہ میں آپکو ایسی شے کی کیا اجرت دوں جو طومار دروغ گوئی ہو ہاں
پر بھی جب وہ اپنے احسانات مجھ پر دھرنے لگے تو ناچار ہو کر عاجز نے یہ عرض کی کہ
حضرت مجھ سے آپکے احسانات کی جزا ناممکن نہیں ہے آپ دو گھنٹہ کی مہلت دیں
میں ایک ایسا ہی قصیدہ آپ کی تعریف میں لکھ دیتا ہوں ہل جزاء الاحسان الا الاحسان
مختصر یہ ہے کہ قصیدہ گوئی ترقی زمانہ اس مذلت کو پہنچ گئی ہے کہ تمام تر گدائی ہو گئی ہے
اللہم احفظنا من ذلک لیکن اس بدحالی پر بھی اس طرح کی قصیدہ گوئی مذموم نہیں سمجھی جاتی
ہے۔ ملکی مذاق ابھی تک اس کے موافق ہے اور اہل دول اپنی مدح سرائی سے خوش
ہوتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ یہ مدح سرائی نہیں ہے اُن کی ہجو ہے فقیر کی نگاہ میں قصیدہ مدحیہ
ایسا ہی نظر آتا ہے اور عمل بھی فقیر کا اسی پر ہے چنانچہ ایک بار کا یہ ذکر ہے کہ کسی خاص وجہ
سے فقیر ایک بڑی ریاست میں گیا ہوا تھا وہاں احباب نے صلاح دی کہ عاجز ایک
قصیدہ تصنیف کر کے بحضور والی ریاست پیش کرے صلاح دوستانہ تھی مگر ایسے فعل
قبیح کا مرتکب ہونا طبیعت کو سخت ناگوار معلوم ہوا۔ احباب سے فقیر نے معذرت کی
اور جو حضرات صاحب مذاق صحیح تھے اُن سے اپنے خیالات کو ظاہر بھی کیا فرمانے
لگے واقعی قصیدہ گوئی لغو سرائی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے ارباب مذاق ایسے شیوہ

کیونکر پسند کر سکتے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ کثرت مدح سرائی سے قصیدہ گوئی کی غرض فوت ہوگئی ہے ناواقف اشخاص تو یہی سمجھتے ہیں کہ قصیدہ گوئی سے صرف اس قدر مراد ہے کہ شاعر شاہان و امراء و خوانین کی مدح لکھ کر رسوخ پیدا کرے یا روٹی کما کھائے حالانکہ غرض قصیدہ گوئی یہ زنہار نہیں ہے قصیدہ گوئی کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اعلیٰ درجہ کے مضامین داخلی اور خارجی کو پسندیدہ عنوان سے پیرایہ نظم میں بیان کرے یاد رہے کہ یہ صنعت شاعری غزل سے زیادہ وسیع دائرہ خیال رکھتی ہے قبل میں عرض کیا جاچکا ہے کہ غزل میں صرف مضامین داخلی بندش پاتے ہیں اور مضامین خارجی کو غزل سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا مگر قصیدہ کے لئے جو مضامین داخلی درکار ہوتے بھی ہیں وہ غزل کے مضامین داخلی سے تمامتر علیحدہ رنگ رکھتے ہیں قصیدہ کے مضامین داخلی کو تمامتر حکیمانہ رنگ رکھنا چاہیئے مثلاً یہ قصیدہ کی شان سے ہے کہ اس میں توحید عدل نبوت۔ امامت۔ معاد۔ تمدن۔ معاش معاشرت دیگر امور دینی و دنیوی کے مضامین جگہ پائیں یا اخلاقی معاملات از قسم صداقت و خلوص و شجاعت و ہمت و فتوت و مروت و سخاوت وغیرہ موزوں کیئے جائیں۔ یا اعلیٰ درجہ کے مضامین ذہنیہ جو اقسام جذبات قلبیہ سے ہیں۔ زور بیان کا لطف دکھائیں داخلی مضامین کے علاوہ جو خارجی مضامین باندھے جائیں ان کو تقاضائے فطرت سے خالی نہیں ہونا چاہیئے کہ قصیدہ میں بھی نیچرل مضامین کی حاجت ہے۔ گو اُس قدر وسعت بیان کے ساتھ نہیں جس کی محتاج مثنوی ہوا کرتی ہے ذیل میں کچھ اردو قصائد کے انتخابات نذر ناظرین ہوتے ہیں چونکہ یہ کتاب بسبیل تذکرہ نہیں لکھی جاتی ہے اس لئے صرف سودا اور ذوق کے قصائد سے اشعار انتخاب

کر لئے جاتے ہیں ورنہ سحر اور انشاء اللہ خان و دیگر حضرات کے قصائد بھی موجود ہیں اہلِ شوق انھیں ملاحظہ فرمالیں ؛

مرزا رفیع سودا بہ حیثیت قصیدہ گو

سودا اگر اردو کے سلطان المتغزلین نہیں ہیں تو کشور قصیدہ گوئی کے بادشاہ کامگار تو یقیناً ہیں اردو کے کسی قصیدہ گو شاعر کو سودا کی ذہانت اور طباعی کے ساتھ برابری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا میر ہر چند غزل سرائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں مگر قصیدہ گوئی میں سودا سے کوئی نسبت نہیں رکھتے، مومن خان نے بھی مذہبی قصائد لکھے ہیں اور اچھے لکھے ہیں اور غالب کے بھی دو مذہبی قصیدے اُن کے دیوان میں موجود ہیں سحر اور انشاء اللہ خاں بھی قصیدہ گوئی کی معقول صلاحیت رکھتے تھے اور ذوق کی شہرت تو زیادہ تر قصیدہ گوئی ہی کے باعث ہوئی مگر انصاف یہی ہے کہ ان حضرات میں کوئی صاحب بھی اس صنف شاعری میں سودا کو نہیں پہنچتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہر چند سودا قصیدہ گوئی میں سنائی، انوری، خاقانی اور قاآنی کے جواب نہیں سمجھے جا سکتے ہیں مگر شعرائے اردو میں اپنا جواب نہیں رکھتے، سودا کے قصائد جو ان کے دیوان میں دیکھے جاتے ہیں بیالیس ہیں ان میں چودہ قصیدے مذہبی ہیں اور بقیہ یا مدح میں ہیں یا ذم میں، تمام قصائد اعلیٰ درجہ کی سخن آفرینی اور طباعی سے خبر دیتے ہیں ذیل میں ان کے قصائد کے کچھ انتخابات نذر ناظرین ہوتے ہیں ؛

نمبر ا قصیدہ نعت ۳۰ اشعار

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی	نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی
ہنر پیدا کر دل ترک کیجیے تب لباس اپنا	نہ ہو جوں تیغ لے جوہر و گرنہ ننگ عریانی

فراہم زر کا کرنا باعث اندوہ دل ہووے	نہیں کچھ جمع سے غنچہ کو حاصل جز پریشانی
خوش آمد کب کرے ہیں عالی طبیعت اہل دولت کی	نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی
عروج دست ہمت کو نہیں کچھ قدر بیش و کم	سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زر افشانی
کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی	ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی
اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا	ہوئی ہے فیض تنہائی سے عمر خضر طولانی
اذیت وصل میں دونی جدائی سے ہے عاشق کو	بہت رہتا ہے نالاں فصل گل میں مرغ بستانی
موقر جان ارباب ہنر کو بے لباسی میں	کہ ہے جوہر تیغ پر جوہر اُسے عزت ہے عریانی
بزنگ کوہ رہ خاموش حرف ناسزا سُن کر	کہ تا بد گو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی
یہ روشن ہے بزنگ شمع ربط باد و آتش سے	موافق گر نہ ہووے دوست ہے وہ دشمن جانی
نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا	نفس جب تک ہے داغ دل سے فرصت کیونکہ ہو پانی
کرے ہے سرزنیت ظالموں پر تیرہ [illegible] کو	کہ زیب ترک چشم یار سُرمہ ہے صفاہانی
طلوع مہر ہو پامال حسرت آسمان اُوپر	لکھوں گر یہ غزل اس زمیں میں مطلع ثانی

مطلع

عجب ناداں ہیں وہ جن کو ہے عجب تاج سلطانی	فلک بال ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی
نہیں معلوم اُن نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا	کہ چشم نقش پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی
ہماری آہ تیرا دل نہ برماوے تو یا قسمت	دگرنہ دیکھ آئینہ کو پتھر ہو گئے پانی
تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا	کہ ہے جمعیت خاطر مجھے ان کی پریشانی
زمانہ میں نہیں کھلتا ہے کار بستہ حیراں ہوں	گرہ غنچوں کی کھولے ہے صبا کیونکہ بآسانی
جنوں کے ہاتھ سے سرتا قدم کاہیدہ اتنا ہوں	کہ اعضا بندۂ زنجیر کے کرتے ہیں مژگانی

نہ رکھی جگ میں رسم دوستی اندوہ روزی نے — مگر زانو سے اب باقی رکھا ہے ربط پیشانی
سیہ بختی میں اے سودا نہیں طول سخن لازم — نمط خامہ کی سر کٹوائے گی اپنی زباں دانی
سمجھ اے نا قباحت فہم کب تک یہ بیاں ہوگا — ادائے چین پیشانی و لطف زلف طولانی
خدا کیو اسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے — نہیں ہے اُن سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی
نظر رکھنے سے حاصل اُن سے چشم و زلف کے اوپر — مگر بیمار ہو وے صعب یا کھینچے پریشانی
نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے — برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیف مسلمانی
رہے دین محمد پر وہی ہیں اُن کی جو رہو ویں — رہے خاک قدم سے اس کی چشم عرش نورانی
ملک سجدہ نہ کرتے آدم خاکی کو گر اُس کی — امانت دار نور احمدی ہوتی نہ پیشانی
اُسی کو آدم و حوا کی خلقت سے کیا پیدا — مراد الفاظ سے معنی ہیں تا آیات قرآنی
خیال خلق اُس کا گر شفیع کافراں ہو وے — رکھیں بخشش کے سر منت یہودی و نصرانی

واہ کیا خوب قصیدہ ہے۔ سبحان اللہ قصیدہ کاہے کو ہے مرزا سودا کا توشۂ آخرت ہے بلکہ گوش ایمان سے سننے والوں کا پروانہ نجات بھی ہے لاریب۔ مذہبی قصیدہ کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے قصیدہ کیلئے جتنی باتیں ہیں اس میں موجود ہیں ؛

نمبر ۲۔ قصیدہ منقبت تا چہل و ہفت اشعار

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل — تیغ اُردی نے کیا ملک خزاں مستاصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمر دار ہر ایک — دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عز و جل
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض — ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل
واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیچ — آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی
عکس گلبن یہ نہیں پر ہے کہ جس کے آگے
تار بارش ہیں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
بار سے آب رواں عکس ہجوم گل کے
شاخ ہیں گل کے نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
جوش روئیدگی خاک سے کچھ دُور نہیں
دمِ عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
فکر رہتا ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی
حدِ ایام کے پیش از مدد نامیہ سے
سبز ہوتا ہے تصحیح کے سخن پر ہر بار
دست گل خوردہ شاخ گل و گلزار بہم
غنچہ پر کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ
اُڑ رہے ایک نظر لاکھ طرح کا وہ گل
یاسمیں رنگ جو رہتی ہے خزاں سے مانا
چشم نرگس کی بصارت کی نہیں ہے در پے
اس قدر مجھ کو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
آبجو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے
سایۂ برگ ہے ہر لطف سے ہر اک گل پر
فکر نے رتبۂ آئینہ کیا ہے پیدا
پوستش چھینٹ قلمکار بہر زینت و جبل
کار نقاشی مانی ہے دوم وہ اول
ہار پہناتے کو اشجار کے ہر سو بادل
لوٹتے ہے سبزہ پہ از بسکہ ہوا ہے بیکل
شمع ساگرمی نظارہ سے جاتی ہے پگھل
شاخ میں گاوزبیں کی بھی جو پھوٹی کونپل
دین میں قسم جمادات سے شاید ہو خلل
کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات و ہبل
بچۂ مرغ چمن تخم سے آتا ہے نکل
جو زباں سے سخن اب طوطی کے آتا ہے نکل
بجہاں نشو و نما کرنے ہیں ہیں غریب مثل
گل بہم پہنچے ہے عقدہ ہو کسی طرح کا حل
اُن نگلوں چھٹ جو نگہ کے ہیں سدا مستعمل
چاہتی ہے بساعت کہ سبزے سے بدل
غنچۂ لالہ نے سُرمہ سے بھری ہے مکحل
چشم بیدار گلستاں میں جھپکتی نہیں پل
خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول
ساغر لعل میں جوں کیجیے زمرد کو حل
تیغ کہسار ہوئی دست ہوا سے صیقل

برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے
گل کو دیکھو تو نگہ جا رہے سنبل پہ پھسل

لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پانوں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

اتنی ہے کثرت لغزش زمین ہر باغ
جو ثمر شاخ سے اُترا سو گرا سر کے بل

فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے
شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبور عسل

دانہ جس شور زمیں پر نہ پھیلا دہقاں سے
سبز واں دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل

کشت کرتے ہیں ہر اک تخم سے از فیض ہوا
گرتے گرتے بنہیں برگ بر آتا ہے نکل

سبز فام ان دنوں آتا ہے نظر ہر گلرو
خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فرزند مغل

جوہری کو چمنستان جہاں میں اس فصل
آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل

تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی
اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

نسبت اس فصل کو پر کیا ہے سخن سے میرے
ہے قضا اُس کی تو دو چار ہی دن میں فیصل

اور میرا سخن آفاق میں تا یوم قیام
رہے گا سبزۂ ہر مجمع و ہر یک دنگل

تا ابد طرز سخن کی ہے مری رنگینی
جلوۂ رنگ چمن جائے گا اک آن میں ڈھل

نام تلخی نہیں مجھ نطق میں جز شیرینی
یک طرف تار گلستاں میں ہے یکسو حنظل

ہیں برومند سخنور مرے ہر مصرع سے
مصرع سرو سے پایا ہے کسی نے بھی پھل

ہو جہاں کے شعرا کا مرے آگے سر سبز
نہ قصیدہ نہ مخمس نہ رباعی نہ غزل

ہے مجھے فیض سخن اُس کی ہی مداحی کا
ذات پر جس کی ہے مہر کنف عز و جل

مہر سے جس کے منور ہے دل جوں ہو خورشید
رو سیہ کینے سے جس کے ہے مانند زحل

بغض جس کا کرے جوں مور سلیمان کو ضعیف
مور کو حب سے ملے جس کی پیلوں کا سا بل

جائے وصلت نبی جس کو نہ دی غیر از عرش
فرش گلزار زمیں حق نے سمجھ مستعمل

شیر یزداں شہ مرداں علیؑ عالی قدر | وصی ختم رسل اور امام اوّل
خاک نعلین کی جس کی مدد طالع سے | پہنچے اُس شخص کو جو شخص ہوا عمائے ازل
وہ نظر آئے اُسے دہر کی بینائی سے | رہ گیا اور رہے گا جو ابد تک اوجھل
مدح غائب سے کھلے اُس کے نہ مداح کا دل | مطلع ایک شے دو نظر آتی ہے بہ چشم احول

بلاشبہ مرزا سوداؔ نے قصیدہ گوئی کا خاتمہ کر دیا ہے کیا تاب کہ کوئی شاعر منقبت میں ایسا لامیہ قصیدہ لکھ سکے طبیعت داری سخن آفرینی متانت جلالت شکوہ وقار بلند پردازی عالی خیالی ہر شعر میں جلوہ گر ہے حقیقت یہ ہے کہ ذہانت اور طباعی سوداؔ کی گھٹی میں پڑی تھی اُردو کے کسی قصیدہ گو شاعر میں خلاقی سخن کی ایسی قدرت نہیں دیکھی جاتی ہے اس منقبت کے علاوہ سوداؔ نے اور بھی منقبت کے قصائد لکھے ہیں اور اکثر ائمہ علیہم السلام کی شان میں قصائد نظم کیے ہیں. یہ سب کے سب قصائد قابل توجہ ہیں لاریب سوداؔ نے اپنی قوت شاعری سے یہ اچھا کام لیا کہ قصائد مذہبی رقم کر کے ثواب عقبیٰ حاصل کیا۔ قصیدہ نگاری کے اغراض سے یہ بھی ایک بھاری غرض ہے عربی میں بھی اس طرح کے قصائد ہیں جیسے قصیدہ بردہ و قصیدہ فرزدق وغیرہ جو مذہبی پہلو کی شاعری سے خبر دیتے ہیں ؎

نمبر ۳۔ تشبیب قصیدہ در مدح نظام الملک

صبح ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک | دی دہیں آ کے خوشی نے در دل پر دستک
پوچھا میں کون ہے بولی کہ [illegible] غافل | نہ لگے شوق میں جس کے کبھو شائق کی پلک

ہے خوشی نام مرا میں ہوں عزیز دلہا
کھول آغوش دل اور لے مجھے جلدی تا دال
سن کے یہ مژدہ جاں بخش جو میں کھولی آنکھ
آنکھیں مل کر کے جو دیکھوں تو تھا اک بادلہ پوش
حسن ایسا کہ جیسے ماہ شب چار دہم
چہرے میں ایسی ہے گرمی کہ شب روز جیسے
زلفیں یوں بکھری ہوئی چہرہ پہ ناگنیں تھیں دل
جعد وہ قہر کہ گندھنے میں ہو جس کی ہر لہر
ناگنی پیچ میں اُس کے نہ مانگے پانی
جبیں ایسی کہ جگر ماہ کا ہو جائے داغ
قتل کرنے کے یہ جوہر ہیں شمشیر کے بیچ
دست وہ تیز کہ عالم میں نہیں جس کی پناہ
فتنہ ہیں چشم کا ایسا کہ مژہ سے خونخوار
حسن سے کان کے آویزے ہیں وہ لطف کہ جوں
بحر خوبی کی گویا مچھلی ہے قلاب کے بیچ
نظر آیا نہ دہن بیچ کو تنگی کے سبب
مسی آلودہ لب احمر تھے تہ خاکستر
سلک گوہر کی صفا دام لے ان دانتوں سے
دونوں عارض گویا شیشے ہیں مے گلگوں کے

زندگانی کی حلاوت ہے، جہاں میں مجھ تک
پھر خدا جانے یہ دن کب مجھے دکھلائے فلک
شعلۂ نور کی سی مجھ کو نظر آئی جھلک
سر سے لے غرق جواہر میں وہ ہی پاؤں تلک
پلک بیک دیکھے تو پلکیں ہی رہ جائیں جھپک
یاد کرتی ہی رہے دامن مژگاں کی جھپک
جسطرح ایک کھلونے پہ پٹیں دو بالک
گھر با دینے کو عشاق کے دریائے ٹک
کھیل جاوے ہیں کالا جو ڈسے اُس کی لٹک
اس کی تشبیہ سے جب اس کو تجاوز دے فلک
اس کے ابرو سے مشابہ نہ بنا دیں جبتک
چشم وہ ترک کہ ہم قوم جنھوں کا ازبک
متصل جو نکلتے پا کر دیا کرتے ہیں تھپک
مستعد قطرۂ شبنم کہ پڑے گل سے ٹپک
نتھ کے حلقے میں جو دیکھے کوئی نتھنے کی پھڑک
منخریں اپنی سے گو ان نے تراشی عینک
کہ ہوا سے وہ سخن کرنے میں جاتے ہیں دہک
برق دریوزہ کرے موج تبسم کی چمک
زنخ ان دونوں میں یوں جیسے نمکداں میں نمک

وصف میں اُسکی ملاحت کے پڑھوں اک مطلع جس کے آگے نہ رکھے مطلع خورشید نمک

سبحان اللہ اس سے زیادہ خوبصورت تشبیب کیا ہو سکتی ہے ایسی ایک تشبیب انسان کے شاعر نامی ہونے کے واسطے کافی ہے اشعار بالا میں غزل کی پر تاثیری کے ساتھ قصیدہ کی متانت اور جلالت کس آن بان سے جلوہ گر ہے فی الواقع ایسے اشعار کوئی شخص بے شاعر پیدا ہوئے نہیں کہ سکتا ہے ان کو پڑھ کر طبیعت کو کیا شگفتگی پیدا ہوتی ہے حضرات ناظرین اپنے اپنے دل سے پوچھ لیں راقم اپنی کیفیت قلبی کیا عرض کرے بیشک یہ وہ اشعار ہیں کہ ہر ملک کے اہل مذاق کو اُن کا پسند آنا ایک امر مجبوری ہے کیا طرز بیان ہے کیا بندش مضامین ہے کیا خلاقی سخن ہے کیا مضمون آوری ہے کیا صورت نگاری ہے کیا مرقع سازی ہے مرحبا صد مرحبا آفرین صد آفرین اے سودا کن لفظوں سے تیری تعریف کروں کن حرفوں سے تیری ثنا لکھوں لاریب تو سچے شاعروں کی طرح الہامی قدرت رکھتا تھا ورنہ ہر ناظم کا یہ کام نہیں ہے کہ مضمون کے زور سے تسخیر دل کر سکے اے سودا تو نے اس تشبیب میں خوشی کی ایک ایسی تصویر کھینچی ہے کہ بہزاد و مانی کیا یورپ کے استادان مصوری بھی تیری قلمکاری پر قربان نظر آتے ہیں سچ یہ ہے کہ تو نے کمال صناعی سے شاعری اور مصوری کو شئے واحد کر کے دکھایا ہے تیرے حسن تقریر سے خوشی ایک معشوق مجسم دکھائی پڑتی ہے واقعی تو نے اپنے اعجاز بیان سے ایک بیجان چیز میں جان ڈالدی ہے اے سودا تیرا کیا کہنا یہ شاعری نہیں ہے سحر نگاری ہے؛

نمبر ۴۔ قصیدہ در تہنیت فتح

آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار دیکھا جسے نہ ترک فلک نے بروزگار

بے سر ہوئے ہیں آج یہ سرکش گر گر نہال
سر جنگ اس طرح کی نہ کھائی کہ تا بہ حشر
آتش غضب کی تونے یہ ان کی فسردہ کی
نام اس کا تیری تیغ نے معدوم یہ کیا
یک خم تھا دل انھوں کا پر از بادۂ غرور
تھا عزم یہ ہر ایک کا گاویں گے بیٹھ ہم
آئے تھے وہ چنانچہ اسی طرح روز جنگ
گاتے بجاتے ناچتے اور کودتے ہوئے
وہ جھنڈیاں نظر پڑیں اک دم میں اس طرح
پر حق بجانب انکے ہی تھا کچھ اس امر میں
جو غول تیرے سامنے آیا تو سمجھے یہ
جیسی ہی اس گروہ نے پی تھی شراب کبر
اسباب پر حریف کے آپس میں لگتے داؤں
حق ناشناس قوم یہ تھی غرہ اس قدر
لیکن خدا کے فضل سے یاں ناگرفتہ قرض
شمشیر دست و بازو کے ہیں یہ بہت بلی
پر وہ جو ہیں غلام غلام اس جناب کے
جرأت میں انکے حرف نہیں پر یہ کیا کریں
ان میں سے اس غلام کے تھے اکثر آشنا

خاک انکی پر ہو تو نہ تمر لاوے شاخسار
مدفون ہوں جو زمیں پہ تو واں اٹھ سکے غبار
تن میں نہیں ہے قطرۂ خوں صورت شرار
نہ عفت کرے ہے سگ ہے، نہ فان زاغ کوہسار
تن اس میں کر دیا نمک تیغ آبدار
تیغوں کو کھینچ کھینچ کے قلقاری مار مار
پایا تھا جوں دلوں میں خیال انکے نے قرار
سایہ میں جھنڈیوں کی صفیں باندھ بے شمار
گاوز بچھاویں پارچہ جوں نہر کے کنار
تیرے دلاوروں کا نہ دیکھا تھا کارزار
اک کھیت روبرو ہے ہمارے پر از خیار
کھینچا ہے اسکے نشہ نے دلیاہی کچھ خمار
لشکر میں اپنے بیٹھ کے جب کھیلتے قمار
غارت پہ ہر نبرد کے بیتے تھے سب ادھار
جو اائے تھے سو دے گئے رکھا نہ ایک تار
اپنا تو حرف حق سے گذرنا نہیں شعار
آگے قدم انھوں کے نہیں ان کا استوار
صحبت نہ دل سے ان کی تھہ دلے کی برار
میں نے کہا انھوں سے کہ تم جیسے جانگار

یک قوم ہو یک برادری و یک گروہ کے
ہو سامنے حریف کے بے حد و بے شمار

حافظ کی لاش ڈال گئے معرکہ میں تم
فتح و شکست مردوں کو ہے پر یہ اضطرار

ان میں سے ایک نے بدم سرد یہ کہا
خواہش خدا کی یوں ہے نہ تھا اپنا اختیار

لیکن جو کچھ کہ واقعی دیکھا سو ہم کہیں
آوے تجھے سخن کا ہمارے گر اعتبار

تھی سامنے ہمارے جو فوج ہر اولی
ہوں گے وہ دس ہزار تلک پیادہ و سوار

سنتے ہیں اب ہر ایک سے اس فوج کی یہی
سرکردہ تھے ہمیت فرنگی کے پانچ چار

محبوب اور بسنت و لطافت تھے یکطرف
یک سو تھا میر سید علی مستعد کار

لیکن انھوں کو آدمی کہیئے کہ دیو و دد
اُن کا قدم دغا میں یہ پایا ہم استوار

ایدھر سے بان ورہکلہ و توپ متصل
پڑتی تھی پر وہ بڑھتے ہی آتے تھے سر گزار

بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے توپیں داغنے
اُس پلے پر جہاں سے جزائر کی ہو سے مار

لیکن میں تجھ سے کیا کہوں اے یار اُس گھڑی
دکھلائی تھی اجل نے عجب طرح کی بہار

تھی گرتیاں تلنگوں کی مانند لالہ زار
تھا دود توپ ابر سیاہ تگرگ بار

توپیں جو داغنے تھے فتیلوں سے آن آن
رنجک مثال برق چمکتی تھی بار بار

گنجال مثل رعد کے کڑکے تھی دمبدم
آواز شتر نال تھی طاؤس کی چنگھار

بارود گولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی
جس نے کہ قوم عاد اڑائی تھی جوں غبار

فرصت کسو نے اتنی نہ پائی کہ وہ کرے
بندوق تیر و تیغ سے جا اُن میں کارزار

ہر ایک جا یہی نظر آیا ہر ایک کو
گھوڑا ادھر جو تڑپے ہے اودھر پڑا سوار

اُڑتے تھے یوں پیادہ کہ توڑے کو روئی کے
نداف کا کمانچہ جوں دے ہے انتشار

تھے ہاتھیوں پہ بیٹھے جو حافظ کے ہمنشین
ساتھ اُن کے ہم پیالہ و باہم نوالہ خوار

وہ بھاگے اس طرح کہ یہ کہتی تھی اُن کو خلق — بھاگا وہ دیکھو جاتا ہے میداں سے کوہسار
نے لڑنے کے حواس بجا تھے نے بھاگنے کا ہوش — نے سوچ جینے کا ہے نہ مرنے کا کچھ بچار
یاد رہی کبھو اس کو تو اے یار اس گھڑی — آیا جو کچھ عمل میں نہ تھا اس میں اختیار
جیدھر کو اس کا منہ اُٹھا اُدھر کو وہ چلا — سوجھے بغیر یہ کہ فلاں جا کروں قرار
ہو یہ غضب تو لاش کا حافظ کے ذکر کیا — بیٹا سکتا چھوڑ کیا باپ نے فرار
حافظ کی لاش ہم سے نہ اُٹھی تو نزد فہم — جا گہ نہیں ہے طعن و تعرض کی ہم پہ یار
لازم نہ تھا اسے کہ ہوا ایسے کے سامنے — ہمت بڑا ور کرم میں جو ہے طاق روزگار
سے زر سے تا جواہر از اسپ تا بہ فیل — جس کے ہمیشہ آگے نہ رکھے کچھ اعتبار
نہ رتبہ زر کو ہے نہ جواہر کو منزلت — نے قدر اسپ کی ہے نہ کچھ فیل کا وقار
خلعت کسی کو اسپ کسی کو کسی کو فیل — بخشے کسی کو لاکھ کسی کو دیے ہزار
حافظ یہ چاہے عہد سے اُسکے بر آوے ہیں — پیادہ کو دے کے تین روپیہ نو روپیہ سوار
کیا کیا کروں میں اس کی شجاعت کا اب بیان — ہمت کو اس کے کیا کروں اظہار بار بار
حافظ نے سر دیا نہ دیا زر ہوئی ہے یہ — تاریخ اس کی فوت کی کر کے عدد شمار
تاریخ فتح عرض کی سوداؔ نے یوں کہ ہو — یہ فتح نو مبارک نواب نامدار

واضح ہو کہ یہ قصیدہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور سوداؔ کے عہد کے معاملات ملکی سے خبر دیتا ہے اس قصیدہ کے لکھے جانے کا یہ سبب ہوا کہ حافظ رحمتؔ خاں روہیلہ اور نواب شجاع الدولہ نواب وزیر الممالک اودھ کے درمیان جنگ واقع ہوئی جس میں روہیلوں کو شکست ہوئی اور حافظ مارے بھی گئے نواب اودھ کو یہ فتح زینہار نصیب نہ ہوتی۔ اگر لشکر انگلشیہ مددپر نہ ہوتا۔ فوج انگلشیہ کی شرکت کی یہ وجہ ہوئی کہ مرہٹا

اودھ سے سرکار الیسٹ انڈیا کمپنی کو اتحاد تھا یہ اتحاد ملکی اصول پر اور تقاضائے وقت کے مطابق تھا۔ اس زمانہ کی تاریخ قابل سیر ہے اس وقت کے ہندوستان سے اس عہد کے ہندوستان کو کوئی مناسبت نہ تھی یہ ملک اس وقت طوائف الملوکی کی بلا میں مبتلا ہو رہا تھا۔ دہلی کی سلطنت پرزے پرزے ہو چکی تھی۔ ہر صوبہ دار بادشاہ وقت بن بیٹھا تھا چنانچہ اودھ بھی دلی سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد سرکار ہو گیا تھا اسی طرح روہیلوں نے کچھ ملک دبالیا تھا اور نہ نواب اودھ کا ماتحت اپنے کو سمجھتے تھے اور نہ دلی کے بادشاہ کو کوئی شے سمجھتے تھے اس وقت اہالیان کمپنی بڑی حکمت عملیوں سے کام لے رہے تھے جن ریاستوں سے موافقت کی ضرورت دیکھتے تھے موافقت کرتے تھے اور جس سے خلاف کی حاجت دیکھتے تھے مخالفانہ کاروائی عمل میں لاتے تھے اس لڑائی میں بھی انگریزوں کی شرکت اسی ملک داری اور ملک گیری کے قاعدہ کی بنیاد پر تھی یہ شرکت سودا کے کلام سے عیاں ہے۔ اب حضرات ناظرین سودا کی طباعی اور قابلیت کی طرف توجہ فرمائیں کہ قصیدہ بالا میں اس یکتائے روزگار نے کیا کیا شاعری کے تماشے دکھائے ہیں۔ یہ قصیدہ تہنیت فتح میں لکھا گیا ہے نواب کی تعریف کے بعد سودا روہیلوں کی آمد کو کس عمدگی سے لکھتے ہیں اس عہد کی فوجیں یوروپین فوجوں کی طرح باقاعدہ تو نہیں ہوتی تھیں ہندوستانی لشکروں کے انداز وہی ہوتے تھے جو اس وقت بھی بعض ریاستوں کے لشکروں کے دیکھے جاتے ہیں اب انگریزوں کی تقلید سے ریاستوں کے لشکروں کی کچھ ظاہری صورت درست ہوئی ہے ورنہ اکثر ریاستوں کے سپاہیوں کی وہی قطع ہے کہ اگر دگلا درست ہے تو موزا پھٹا ہوا ہے۔ تلوار صاف ہے تو بندوق زنگ آلودہ ہے یا دگلا موزا تلوار بندوق اور جمیع اسباب جنگ سب کا سب ہی مبتلا ئے نکبت

ہو رہا ہے۔ یہی حال حافظ کے لشکروں کا بھی تھا۔ کہ لیٹروں کی صورت پھٹا پرانا پہنے طرح طرح کے کہنہ آلات حرب لگائے غل شور مچاتے میدان جنگ میں آ گئے۔ نواب کے لشکریوں کی بھی حالت اس سے اچھی نہ تھی ادھر کی فوجیں نپولین (NAPOLEON) اور ولنگٹن (WILLINGTON) کی تعلیم کردہ نہ تھیں کچھ تھوڑا باقاعدہ جو لشکر نواب تھا بھی وہ پوری یوروپین تعلیم جنگ پائے ہوئے نہ تھا۔ اگر فوج انگریزی کمک نواب پر نہ ہوتی تو اس فتح کا نصیب نواب ہوتا کوئی امر یقینی نہ تھا۔ چنانچہ غنیم کی مستعدی کا ثبوت سوداؔ کے کلام سے ملتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

شمشیر و دست و بازو کے تھی یہ بہت بلی — اپنا تو حرف حق سے گزرنا نہیں شعار
پر وہ جو ہیں غلام اس جناب کے — آگے قدم انھوں کے نہیں اُن کا استوار
جرأت ہے ان کے حرف نہیں پر یہ کیا کریں — جمعیت نہ دل سے اُن کے تھوڑنے کی برا

خیر اس کے بعد سوداؔ جو میدان جنگ کی تصویر کھینچتے ہیں ایسی ہے کہ مصوری کا عالم دکھا رہی ہے اہل مذاق بیان جنگ کو پڑھیں اور لذت یاب سخن ہوں اس کی لڑائی کے آلات حرب اور طریقہ حرب پر توجہ فرمائیں وہ زمانہ ہنری مارٹینی اسنائیڈر اور کرپ گن کا نہ تھا یہی گجنال شترنال اور جزائر سے لڑائیاں لڑی جاتی تھیں لہٰذا یہ بیان جنگ مورخ کی توجہ فرمائی کے بھی قابل ہے اس سے اس عہد کی لشکر آرائی اور نبرد آزمائی کا پورا اندازہ ظاہر ہوتا ہے واہ سوداؔ واہ۔ شاعری واقعہ نگاری کا لطف دکھا رہی ہے شاعری کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ پھر تشبیہات کو ملاحظہ فرمائیے تو خوبیوں سے معمور نظر آتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان سے بہتر تشبیہات

ڈھونڈنے سے دستیاب نہیں ہو سکتی ہیں ان میں غیر فطری انداز کی کوئی تشبیہ نظر نہیں آتی ہے المختصر حضرت سودا نے اس قصیدہ میں بڑی خوش مذاقی کا اظہار کیا ہے اور فقیر کی دانست میں یہ قصیدہ نیچرل بیانات سے خالی نہیں ہے۔

نمبر ۵ - قصیدہ شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے | دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو | اللہ رے اللہ ہی کیا نظم بیاں ہے

آنا ہیں کیا عرض کہ فرمایئے حضرت | آرام سے کٹنے کی کوئی طرح بھی یاں ہے

سن کر یہ لگے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا | اس امر میں قاصر تو فرشتوں کی زباں ہے

کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانہ کی کئی شکل | ہے وجہ معاش ایسی سو جس کا یہ بیان ہے

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی | تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشان ہے

گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر | شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے

ثابت ہو جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال | تیروں میں ہے پر گیری تو بے چلہ کماں ہے

کہتا ہے نفر غرہ کو صراف سے جا کہ | بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے

یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ | شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضاں ہے

اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے | تنخواہ کا پھر بیٹنا اس شکل سے یاں ہے

لیتے ہیں یاں اردیہی وہ تو دو ماہہ | ٹک ہوش دھڑکے کی جنھیں تاب تواں ہے

قاضی کی جو مسجد ہے گدھا باندھ کے اس میں | بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے

ملا جو اذاں دیوے تو منہ موند کے اس کا | کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی کہاں ہے

بولا جو طبیب اس میں تو باری اسے اک ہول — ہاتھ آگیا واعظ تو ٹھہرا اور وہاں ہے
رہنگے ہے کہ معا آٹھ پہر گھر میں خدا کے — نے ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے
اور وہ جو ہیں کمزور وہاں آن کے بیٹھیں — زینہ کے ہو آگے کی یہ ہر ایک کی کال ہے
اٹھ اٹھ کے دکھاتے ہیں انھیں چال وہ اپنا — دربار رواس عہد میں جو خرد و کلاں ہے
یوں بھی نہ ہلا کچھ تو ہر اک پالکی آ گئے — اس سج سے رسائی کا رسالہ ہی رواں ہے
کوئی سر پہ کئے خاک گریباں کو کر چاک — کوئی روتے ہے منہ پیٹ کے کوئی نالہ کناں ہے
ہندو و مسلماں کو پھر اس پالکی اوپر — ارتھی کا تو ہم ہے جنازہ کا گماں ہے
یہ سنکر گئی دیکھ کے جا صاحب ارتھی — کرتا ہے جو واں عرض تو نہ نہ نہ ہاں ہے
گر سو جیئے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب — اس کی تو اذیت بڑی ہی آفت جاں ہے
وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو — کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے
بے وقت خورش اس کی جو ہوا اپنے تئیں بھوکھ — سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہے
گھڑیال کی چپ بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں — اور ریح خلا رو دو نہیں جوں اسپ دواں ہے
خمیازہ پہ خمیازہ ہے اور چرت اوپر چرت — منہ صورت سوفار کمر شکل کماں ہے
صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی تو کر — سو دو سو روپیہ کا جو کسی عمدہ کے یہاں ہے
صحبت ہے یہ اس سے اگر آقا کے تئیں چھینک — آوے تو وہ اس کو خشونت نگراں ہے
دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اس کے — ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے
اور ماحضر اوپر جو وہ نواب کو دیکھے — کھانا تو یہ کھاتے ہیں پر اس کو خفقان ہے
ملبوس تر میں ہے خربزہ اور خربزہ پر دودھ — ہے دودھ پہ مچھلی تس اوپر گاؤ زباں ہے
یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی سے ہو تسلی — اس سب پہ تلفن کیلئے بیسنی ناں ہے

ں ہیں جو کہیں وہ اُٹھا پریٹ ہیں اُن کے — پھر بو علی سینا ہے تو واں میچداں ہے
لکھتے ہیں غرض مرگ سے لڑنے کو سپاہی — گر نوکری سمجھو یہ طبابت کی کہاں ہے
سوداگری کیجیے تو ہے اس میں یہ مشقت — دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل — ہر شام بہ دل وسوسۂ سود و زیاں ہے
لے جا جو کسی عمدہ کی سرکار میں وے جنس — یہ درد جو سنیے تو عجب طرفہ بیاں ہے
بہت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ تا لث — سمجھے ہے فروشندہ یہ نزدیک گماں ہے
بب مِے ل مشخص ہو امرضی کے موافق — پھر پیسوں کے جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے
پروانہ لکھا کر گئے عامل کنے جس وقت — کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
ادھر سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لے جا — دیوان و بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس — ہر اک متصدی سے میاں اور رتیاں ہے
ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعہ کے آگے — جو پالکی نکلے ہے تو فریاد و فغاں ہے
دو بیل کی جا کر جو کہیں کیجیے کھیتی — اور مینہ بھی موافق ہی پڑے تو تو سماں ہے
ہیں خشکی و غرقی کے تفکر میں شب و روز — نہ امن ہے دلگی تئیں نے جیکو اماں ہے
گر خان و خوانین کی لے کوئی وکالت — اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے
ہر عمارہ کے دروازہ پہ زیں پوش پہ بیٹھا — پوچھے ہے اجی مر رہے نواب کہاں ہے
ہر گھر میں وہ چاہے کہ میں فوارہ سا چھوٹوں — ہر کوچہ میں جو آب چکا بو وہ رواں ہے
دیوان کے بخشی کی بیوتات کے حاضر — مانند کتھیا کے جہاں دیکھو تہاں ہے
ہر بات پلٹتا ہی رہے صبح سے تا شام — بیل کے بیتوتے کیطرح منہ میں زباں ہے
لاوے جو کچہری سے وہ داموں کا سیاہا — للپٹے موکل کو یہ کیا خوب مکاں ہے

سو ماہ یہ بیٹھے ہے روپے پانسو ہے خرچ
تُتّا دے غرض پیسے اُڑا کر ہوئے سفید پوش
جس وقت سنا یہ وہیں آواز بدل کر
پھر بد جو موکل سے کہیں راہ میں بیٹھا
عرضی یہ ہوا میم سیاہی پہ ہوا جیم
لکھے کی غرض عرضی ہے اور کس کا سیاہہ
انصاف جو کیجیے تو نہیں اس کی بھی تقصیر
شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
مشتاق ملاقات اُنھوں کا کس و ناکس
گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
ملائی اگر کیجئے ملا کی ہے یہ قدر
اور ماحضر اخوند کا اب کیا میں بتاؤں
دن کو تو بچارا وہ پڑھایا کرے لڑکے
تم پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اُس کی
بھاگے یہ عمل کر جو وہ شیطان کا لشکر
اب کیجئے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات
جس روز سے کاتب کا لکھا حال ہی تب سے

اور زر کے اجارے کی بھی اُردو میں دکاں ہے
گھر جا کے پکارے جو کوئی لالہ کہاں ہے
آپ ہی کہا گھر میں سے کشن چند کے یاں ہے
استاد کا جاگیر کے یہ اس سے بیاں ہے
پروانہ میں تم پہ ہوں تصدق مری جاں ہے
کیدھر کا وہ پروانہ دنا جاگیر کہاں ہے
سب ماحصل ان باتوں کا اکتا سچہ ناں ہے
دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
ملنا انھیں اُن سے جو فلاں ابن فلاں ہے
نیت قطعہ تہنیت خان زماں ہے
گر رحم میں بیگم کے ستے لطفہ خاں ہے
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے
ہوں نذر روپیے لے کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
یک کاسۂ دال عدس و جو کی دو ناں ہے
شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے
دیوالی کو لے ہاتھ تعاقب میں دواں ہے
آرام جو چاہے وہ کرے وقت کہاں ہے
ہر صفحہ کاغذ پہ قلم اشک فشاں ہے

وہ بیت ٹکے ٹکڑے لکھنے کو ہے محتاج

یہ بھی تکلف ہی سے کہتا ہوں وگرنہ

احیا ہو جو موتا کا زمانے میں نئے سر

ہدیہ ہو سوا پانچ ٹکے گذری میں آکر

دمڑی کو کتابت لکھیں دھیلے کو قبالہ

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت

دیتا ہے دُمِ خر سے کوئی شملہ کو نسبت

اور اس کو جو دیکھے کوئی وہ بہر معیشت

پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اٹھ کر

تحقیق ہوا عرس تو کر داڑھی کو کنگھی

ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب کو ہوا وجد

بے تالے ہوئے شیخ جو ٹک وجد میں آکر

گر تال سے پڑتا ہے قدم تو بھی ہنس ہنس

اور ماحصل اس رنج و مشقت کا جو پوچھو

سب پیشہ یہ سچ کر جو کوئی ہو متوکل

اور بیٹی کے دل کو ہے خرافت کا تیقن

پھر چوم کے جب لڑکے لگے بھوک سے مرنے

جب راہ خدا پیسے نکالے کوئی نواب

مضمون بھی رقعہ کا کہ کچھ دیجیے اس کو

خوبی میں خطاب جس کا بہ از خطبجاں ہے

آفاق میں ان چیزوں کی اب قدر کہاں ہے

خطلاط کی اُتنی ہی لیے ہے قدر جو یاں ہے

یا قورت پکارے جو بکاؤ یہ قرآں ہے

بیٹھے ہوئے واں میر علی چوک جہاں ہے

چھٹتی ہے تو شعرا کی وہ مطعون زباں ہے

گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے

اس فکر و تردد میں ہر ایک زباں ہے

ہے آج کدھر عرس کی شب روز کہاں ہے

لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے

کوڑے ہے کوئی رو دیکھے کی نعرہ زناں ہے

سرگوشیوں میں پھر بد اصولی کا بیاں ہے

کہتے ہیں کوئی حال ہی یہ رقص زناں ہے

دلا ہوا ماں دال نخود قلیہ و ناں ہے

جورو یہ سمجھتی ہے نکھٹو یہ میاں ہے

بیٹے کو جنوں ہونے کا باپ کے گماں ہے

ہر خان و خوانین کے ہمراہ رواں ہے

تب اس کی سفارش میں بھی اک رقعہ خاں ہے

مداح اماموں کا ہے اور مرثیہ خواں ہے

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری ۔۔۔ یہ شکل بھی مت سمجھیو تو راحت جاں ہے
ملک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال ۔۔۔ چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور تیر وہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام ۔۔۔ عنقا ہیں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سو اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے ۔۔۔ یہ بات بھی گوئندہ ہی کا محض گماں ہے
یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر ۔۔۔ آسودگی مرفیت نہ یاں ہے نہ وہاں ہے
آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال ۔۔۔ جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے

یہ شہر آشوب قصیدہ نہ صرف سودا کی بڑی طبیعت داری سے خبر دیتا ہے بلکہ اس امر کا بھی مثبت ہے کہ یہ شاعر ہمہ دانی کی صفت سے بھی متصف تھا سودا کا پورا دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے عہد کے معاملات کلی و جزی سے تمام تر باخبر تھا ہندوستان کے ملکی درباری شہری بازاری سب کے امور اس پر ہویدا تھے فرمانرواؤں کی کیا حالت تھی. لشکروں کا انتظام کیسا تھا وزرا اور امرا کے کیا طور تھے ان خلائق کی کیا صورت تھی پیشہ وروں کی کس طرح گذرتی تھی مساجد و مدارس اور خانقاہوں کی کیفیتیں کیا تھیں اطبا کی اوقات بسری کیونکر ہوتی تھی شعرا کا گذران کس ہنج پر ہوتا تھا ملاؤں کے مشاغل کس طرح کے تھے تاجروں کے کاروبار کیونکر چلتے تھے نوکری پیشوں کی کمائی کا کیا ڈھنگ تھا کاشتکاروں کی کیسی کٹتی تھی الغرض اسی طرح ہر طبقہ اور ہر درجہ کے آدمی کے حالات سے یہ یکتائے روزگار اطلاع کافی رکھتا تھا اس قصیدہ سے بھی اس کی اطلاع عام کا اظہار متصور ہے فی الواقع یہ قصیدہ بڑی طباعی اور واقف کاری سے خبر دیتا ہے کلام کی خوبی یہ ہے کہ اس کے بہت اشعار ضرب المثل کی طرح زبان زد خلائق ہو رہے ہیں:

نمبر ۶ - قصیدہ در ہجو اسپ

ہے چرخ جب سے ابلق ایّام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گھٹاتے ہیں وہ اُدھار

تنہا وہی نہ دہر سے عالم خراب ہے
خسّت سے اکثروں نے اٹھایا ہے ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہربان
پاوے سزا جو اُن کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپیہ کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو اتنا خراب و خوار

نہ دانہ و نہ کاہ و نہ تیمار نہ سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفلِ شیر خوار

ناطاقتی کا اُس کی کہاں تک کروں بیان
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانندِ نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اِس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اِس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
اُمیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

جس دن سے اس قصائی کی کھونٹی بندھا ہے وہ
گذرے ہے اس نمط اسے ہر لیل و ہر نہار

ہر روز اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا
چگنے کو آنکھیں موند کے دیتا ہے منہ پسار

خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے باربار

پیدا ہوئی ہے تپ سے اگن باد اس قدر
ہرگز دروغ اُس کو تو مت جان زینہار

گذرے وہ جس طرف سے کبھو اس طرف نسیم
بادِ سموم ہووے وہیں گر گرے گزار

دیکھے ہے جب وہ توبڑہ و تھان کی طرف
کھودے ہے اپنے سم سے کنوئیں ٹاپیں مار مار

ہے اس قدر ضعیف کہ اُڑ جائے باد سے
مینخیں گر اُس کے تھان کی ہوویں نہ استوار

نہ استخوان نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سُرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

یہ حال اس کے دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق
چنگل سے موذی کے تو چھڑا اسکو کردگار

ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اہل اعتبار

لے جاویں چور یا مرے یا ہو کہیں یہ گم
ان تین بات سے کوئی جلدی ہو آشکار

تنہا نہ اُس کے غم سے ہے دل تنگ زین کا
خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا
مشہور تھا جنھوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں ان کی میں نے کیا جا یہ التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار

فرمایا جب انھوں نے کہ اے مہربان من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار

لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکسار

صورت کا جس کی دیکھنا ہیگا گدھے کو ننگ
سیرت سے ہے بنت جسکی سگ خشمگین کو عار

بدرنگ جیسے لید ہو بدبو ہے جوں پیشاب
بدیُمن یہ کہ اصطبل اُجڑ کرے ہزار

مانند میخ چوکی لکڑ ان سے ہے تھان پر
لاجنبش وہ زمین سے ہے جوں میخ استوار

خنزری ہے اس قدر کہ یہ خنزر اُس کی پشت پر
دجال اپنے منہ کو سیہ کر کے ہو سوار

اتنا وہ سرنگوں ہے کہ سب اُڑ گئے ہیں دانت
جبڑے پہ لبسکہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہے مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لیکے ریگ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کی نعل کا
ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روز جنگ
مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
اک دن گیا تھا مانگنے یہ گھوڑا برات میں
سبزے سے خط سیاہ و سبہ سے ہوا سفید
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجوان
بیٹھا تو اس قدر ہے وہ جو کچھ کہ تم سنا
دلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ
مدت سے کوڑیوں کو اڑا لیے ہے گھر میں بیٹھ
ناچار ہو کے تب تو بندھا یا میں اس پہ زین
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں
چابک تھے دو تو ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
آگے سے توبڑہ اسے دکھلائے تھا سئیس
ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا روبرو
اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
پہیئے اسے لگاؤ کہ تا ہو دے یہ رواں
میں کیا کہوں غرض کہ ہر اک اس کی شکل دیکھ
کہتا تھا کوئی ہے شترگربہ نہیں یہ اسپ

شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار
لوہا منگا کے تیغ بناوے کبھو لوہار
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقت کارزار
جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار
دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار
تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ باردار
شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار
لیکن اب ایکدن کی حقیقت کہوں میں یار
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقت کار
ہو کر سوار اب کروں میدان کارزار
ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
تک تک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
ہلتا نہ تھا زمین سے مانند کوہسار
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
یا بادبان باندھ پون سے کے دو اختیار
تیغ زباں سے کاٹ کے کرتا تھا گل نثار
کہتا تھا کوئی ہوگا ولایت کا یہ حمار

کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

کہنے لگا بھرا اسی مجمع میں کوئی شخص
مرکب نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار

بھولوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈائن چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار

اس تخمصہ میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک روز
فتنہ کو آسماں نے کیا مجھ سے پھر دوچار

دھوبی کمہار کے گدھے اسدن ہوئے تھے گم
اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے واں گزار

ہراک نے اسکو اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان کھینچے تھا دم کمہار

دریائے کشمکش ہوا اس آن موج زن
تھا عنقریب ڈوبیے خفت سے ایکبار

بدبختی اس کی دیکھ کے کر خر کا خیال
لڑکے بھی واں تھے جمع تماشے کو بیشمار

رکھتا تھا کوئی لا کے سپاری کو منہ کے بیچ
مو اسکے تن سے کوئی اکھاڑے تھا بار بار

کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دوں گا ٹکا تجھے میں تو جب آئے آتوار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اسکے گرد و پیش
ساتھ اس سمند غریں نما کے ہو چشم چار

اس وقت میں نے اپنی مصیبت پہ کر نظر
کہنے لگا خدا سے یہ رو رو کے زار زار

جھگڑوں میں دھوبیوں کے کہ لڑکوں کے دوں جواب
کتوں سے یا لڑوں کہ مروں اپنا پیٹ مار

بارے دعا مری ہوئی اس وقت مستجاب
واں سے پھر لخط کیا جنگاہ تک گزار

دست دعا اٹھا کے میں پھر وقت جنگ کے
کہنے لگا جناب الہی میں یوں پکار

پہلے ہی گولا چھوٹتے اس گھوڑے کے لگے
ایسا لگے یہ تیر کہ ہووے جگر کے پار

یہ کہ کے میں خدا سے ہوا مستعد بہ جنگ
اتنے میں مرہٹا بھی ہوا مجھ سے آ دوچار

گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کارزار

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پہ
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل | لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا وال سے لڑتا ہوا شہر کی طرف | القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار
گھوڑے مرے کی شکل یہ ہے تم نے جو سنی | اس پہ بھی دل میں آئے تو اب ہو جیے سوار
سنکر تب ان سے میں نے یہ قصہ دیا جواب | اتنا بھی جھوٹ بولنا گیا ہے ضرور یار
گفتن ہمیں بس است کہ اسپ من ابلق است | سمجھوں گا دل میں اپنے اگر ہوں میں ہوشیار
سوداؔ نے تب قصید کہا سن یہ ماجرا | ہے نام اس قصیدہ کا "تضحیک روزگار"

ہرچند یہ قصیدہ ہجو کا ہے مگر سوداؔ کی قابلیت شاعری اس سے تمام تر آشکارا ہے کوئی مضحک بات گھوڑے اور سوار کی نسبت چھوٹ نہیں رہی ہے لیکن اس تضحیک کے ساتھ اس کی نتیجہ خیزی محل گفتگو نہیں ہے اکثر یہی ہوتا ہے کہ جو حضرات اپنے گھوڑے کو منگنی دینا نہیں چاہتے کچھ البسا لنگڑا عذر پیش کرتے ہیں کہ فی الفور یہ قصید خیال میں آجاتا ہے۔ اور خاصکر یہ شعر "گفتن ہمیں بس است کہ اسپ من ابلق است" خیر سوداؔ کی ہجو نگاری ایسی اعلیٰ درجہ کی ہے کہ اس کے ساتھ ناتوجہی کا برتاؤ نہیں کیا جا سکتا ہے اس طباع زمانہ کی ہجو گوئی میں جو نقصان ہے وہ یہ ہے کہ کلام کبھی کبھی فحش گوئی تک پہنچ جاتا ہے اگر یہ نقصان نہ ہوتا تو سوداؔ کی ہجو نگاری کسی طرح قابل گرفت نہ تھی بس واسطے کہ ہجو گوئی سے کسی ملک کی نظم یا نثر خالی نہیں دیکھی ہے۔ ہجو گوئی میں کہ یہ مضامین سے اجتناب کرنا واجبات سے ہے ہجو کو ایسا ہونا چاہیئے کہ مہذب سے مہذب آدمی بھی اس کے پڑھنے یا سننے سے احتراز نہ کرے۔ لاطینی شاعر جوینل اور انگریزی نثر نگار سوفٹ (SWIFT) بڑے ہجو گو گذرے ہیں ان کی تصنیفوں کو ہر تعلیم یافتہ آدمی نے دیکھا ہے ان کی تحریریں

کے اغراض قابلِ توجہ ہیں اُن کی تحریریں نتیجہ خیزی سے معرا نہیں ہیں لیکن کیونکہ ایسی تصنیفات قابلِ توجہ نہیں سمجھی جا سکتی ہیں البتہ ملا آنی کی نثر میں جو جواب گلستان کے طور پر لکھی گئی ہے جہاں جہاں فحش آرائیاں عمل میں آئی ہیں تعلیم یافتہ اشخاص کے تحمل سے باہر ہیں بہر حال اس قصیدہ میں صرف ایک شعر کہ یہ مضمون سے مشتمل تھا جو ترک کر دیا گیا اور اسی طرح اگر تمام کہ یہ ادر فحش مضامین سودا کی دیگر تصنیفات سے متروک کر دیئے جائیں تو اس یکتائے روزگار کے کلام کا حسن دوبالا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ سودا کی طباعی فحش گوئی کی محتاج نہیں ہے اسی قصیدہ کو ارباب انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ کس قدر طبیعت داری اور خلاقی سخن سے خبر دیتا ہے اور اسی سے سودا کی ہمہ دانی کس قدر نمایاں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دانائے روزگار کو اپنے ملک کے ہر کلی اور جزوی امر سے اطلاع کامل حاصل تھی۔ ایسا قصیدہ وہی لکھے گا جو اپنے ملک کے ہر طبقہ کے آدمی اور ان کی معاشرت اور ان کے رسم و رواج سے پورے طور پر باخبر ہوگا پھر اس قصیدہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دلی کے شاہی رسالے کا یہ حال ہو رہا تھا کہ گھر بیٹھے تنخواہ پایا کرتے تھے قواعد اور پریڈ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے جب غنیم نمودار ہوتا تھا تو نقیب انھیں لڑائی پر جانے کو کہہ آتا تھا سبحان اللہ کیا لشکر آرائی تھی۔ کوئی اس عہد کے سرکاری رسالوں کو دیکھے کہ گورے اور کالے سوار کس نہج سے رکھے جاتے ہیں اور کیونکر انجام خدمت کرتے ہیں۔ آخر میں عرض راقم یہ ہے کہ حضرات ناظرین اس قصیدہ کی ترکیب پر نظر فرمائیں کہ شاعر گھوڑے کی بدحالی کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کر کے مالک اسپ سے اس کی برائیوں کو افراط مبالغہ کے ساتھ کہلاتا ہے پھر مالک کو الزام دروغ گوئی دے کہ خود حقیقت حال کہہ دیتا ہے ۔ واقعی ذہانت

ذکاوت طبیعت داری سخن آفرینی ہمہ دانی سودا پر ختم ہے۔ ان صفات سے متصف یا فارس میں سعدی تھے یا انگلستان میں شکسپیئر۔ جب ہزار برس زمانہ چرخ کھاتا ہے تب دو چار شخص ایسی ترکیبوں کے وجود میں آتے ہیں ؛

ذوق بحیثیت قصیدہ گو

مرزا رفیع سودا کے بعد قصیدہ گوئی میں شیخ ابراہیم ذوق ہی کا نمبر ہے مگر ان دونوں شاعرانِ نامی میں پہاڑ اور ٹیلے کا فرق ہے ذوق میں ایک ربع بھی سودا کی طبیعت داری نہیں ہے سودا ایک نیچرل شاعر تھا ان کی فطرت نگاری کی ہوا بھی ذوق کو نہیں لگی تھی ذوق کی مضمون آفرینی کوئی شک نہیں کہ ایک ممتاز درجہ کی ہے مگر یہ مضمون آفرینی اس قسم کی ہے جو ایک درباری شاعر کے لئے درکار ہوا کرتی ہے حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ذوق کے جو بیس قصیدے ہیں مگر ایک بھی فطری شاعری کی داد نہیں دیتا ہے نہ سب کے سب مصنوعی ترکیبوں سے معمور نظر آتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ذوق کو درباری تعلق نہ ہوتا تو ان کی شاعری کچھ نہ کچھ نیچرل رنگ نکالتی مگر خدمت شاہی کے بکھیڑے سے انھیں اتنی بھی فرصت نہ مل سکی کہ ایک قصیدہ بھی اپنے پیشوائے دین صلعم کی شان میں یادگار چھوڑ جاتے حقیقت حال یہ ہے کہ جس وضع سے ذوق عمر بسر کرتے تھے وہ فطرت نگاری کی بہت منافی تھی بہت ہمارے افسوس ہے کہ ایک اتنے بڑے طباع کی زندگی ایسی بدحالی سے بسر ہوگئی با ایں ہمہ ذوق کو اگر آزادی حاصل رہتی اور فطرت نگاری کے سامان بہم رہتے تو نیچرل شاعری سے اُن کی قصیدہ نگاری کو اس قدر بے تعلقی نہ ہوتی۔ واضح ہو کہ راقم کو ذوق کی خلاقی سخن میں کوئی گفتگو نہیں ہے بلاشبہ اس شاعر گرامی کی فکر بہت عالی ہے بندش مضامین استادانہ ہے اور روش ادائے مطلب کی خوب د

مرغوب ہے مگر وہ دل آویزی جو نیچرل کلام کی ہوا کرتی ہے اس کا جلوہ کسی قصیدہ میں نمایاں نہیں ہے حضرات ناظرین پر ہویدا رہے کہ یہ رائے محض شخصی ہے ممکن ہے کہ راقم نے اس کے قائم کرنے میں دھوکا کھایا ہو کس واسطے کہ کسی اہل رائے کی تحریر یا تقریر سے راقم کو ان امور میں کسی قسم کی مدد نہیں ملی ہے یہ بھی ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہندوستان بلکہ فارس میں بھی شعرا کے کلاموں پر رائے زنی نہیں کی جاتی ہے اس وقت تک جو تذکرے فارسی یا اردو کے فقیر کی نظر سے گزرے ہیں ان سے کسی شاعر کے حسن و قبح کلام کا پتا نہیں لگتا مثلاً کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ خاقانی اور انوری کے قصائد کے امتیازی حسن و قبح کیا ہیں یا ہلالی اور میلی کی غزل سرائیوں میں کون شے تمیز کرنے والی ہے اسی طرح اردو کے شعرا کی نسبت کوئی تالیف یا تصنیف ایسی نہیں دیکھی جا سکتی ہے کہ مثلاً غالب اور مومن کی غزل سرائی کا فرق دکھلائے یا ان کے کلاموں کے حسن و قبح کو واضح طور پر بتلائے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فن جسے انگریزی میں کری ٹی سیزم (CRITICISM) کہتے ہیں۔ فارسی اور اردو میں نہیں مروج ہے یہ وہ فن ہے جو سخن سنجوں کی کیفیت کلام سے بحث رکھتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص دریافت کرنا چاہے کہ پوپ (POPE) جو ایک انگریزی شاعر ہے کس قابلیت کا سخن سنج تھا تو اس کی شاعری کا ایک پورا آزادانہ بیان انگریزی تصانیف میں ملے گا یہ کیفیت فارسی اور اردو کے تذکروں کی نہیں ہے ان ایشیائی تذکروں میں اگر دس نامی شاعروں کے کلاموں کی حقیقت کو دریافت کرنا چاہیے۔ تو سب کی تعریف کمال مبالغہ پردازی کے ساتھ ایسے انداز سے جو اکثر قلم نظر آئے گی کہ کچھ سمجھ میں نہ آئے گا کہ جامی کیا تھے اور نظامی کیا تھے یا ناسخ

یا تھے اور راسخ کیا تھے یہ تو تذکرہ نگاری کی حالت ہے تقریظ نگاری کی حالت پر
نظر ڈالیئے تو بہ بد مذاقی اور بے عنوانی تحریر کا دریا اُمڈا ہُوا دکھائی دیتا ہے اگر کسی طفل دبستان
نے بھی ایک جزو کا دیوان ترتیب دیا ہے یا چار ورق کی مثنوی لکھی ہے تو اُس کے تقریظ
نگار نے اسے فردوسی، سعدی، حافظ، انوری بنا چھوڑا ہے المختصر فارسی یا اُردو میں کوئی
ایسی تصنیف فقیر کی نظر سے نہیں گزری جو کسی شاعر کی سچی اور واقعی کیفیت شاعری
سے خبر دے، خدا جانے واقعہ نگاری میں ان دونوں زبانوں کے مصنفین کیوں پس پا
نظر آتے ہیں اور افسوس ہے کہ اب تک اس کی اصلاح کی طرف کسی صاحب علم و صاحب
رائے نے توجہ نہیں کی امر بالا کے متعلق فقیر ایک اپنی مایوسی کی سرگذشت عرض
کیا چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اس عاجز کو معلوم ہُوا کہ دیوان ذوق کو شمس العلمار
جناب محمد حسین صاحب آزاد نے کچھ اپنی تحریر کے ساتھ چھپوایا ہے، تو یہ امید ہوئی
کہ ضرور مولانائے ممدوح نے انگریزی ترکیب پر اس شاعر نامی کے کلام پر رائے زنی
بھی فرمائی ہوگی اس شوق میں ایک نسخہ اُس کا دستیاب کر کے شروع سے آخر
تک پڑھ ڈالا مگر کہیں سے یہ نہیں معلوم ہُوا کہ ذوق داخلی شاعر تھے یا خارجی۔
اُن کی غزل سرائی تقاضائے غزل سرائی کے مطابق ہے یا نہیں۔ اُن کی قصیدہ
گوئی مناسب رنگ رکھتی ہے یا نہیں۔ انھیں فطرت نگاری کی قدرت حاصل تھی یا
نہیں۔ اُن کی خلاقی سخن اعلیٰ درجہ کی تھی یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی نہیں معلوم ہُوا کہ ان
میں میر مومن غالب آتش ناسخ میں کیا فرق ہے۔ سودا اور دیگر قصیدہ گو
شعرار کو ان کے ساتھ کیا مناسبت ہے الغرض مولانا کا وہ مشرح دیوان کچھ اور
ہی مطلب کا نکلا۔ المختصر جب کوئی تصنیف راقم کے مفید مطلب نظر نہیں آتی ہے

توکچھ اس کتاب میں اظہار رائے کیا جاتا ہے وہ محض شخصی امر ہے اگر حضرات ناظرین اس عاجز کو برسرِ خطا پاویں تو اپنی کرمی سے درگذر فرمائیں۔ اس جگہ پر راقم اس امر کو بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس نے بہ سبیل رائے زنی حوالۂ قلم کیا ہے اس کا منشاء خوش نیتی کے سوا دوسرا نہیں ہے کبھی اس نے بدنیتی دل آزاری بدخواہی حق فراموشی حق تلفی حق پوشی کو دیدہ و دانستہ اپنی تحریر میں جگہ نہیں دی ہے اس معذرت کے ساتھ راقم ذیل میں قصائد ذوق کے انتخابات مع اپنی آزادانہ رائے کے نذر ناظرین کرتا ہے ؁

نمبر ا۔ تشبیب قصیدۂ مدح اکبر شاہ صفحہ ۲۹ دیوانِ ذوق

سحر جو گھر میں بہ شکل آئینہ تھا میں بیٹھا نزار و حیران
تو اک پری چہرہ حور طلعت بہ شکل بلقیس و ماہ کنعان

پری کی صورت چمن کی نگہت گُہر کا شیوہ تو پس کا جلوہ
زبان شیریں بیان رنگیں کلام رندل خرام مستان

انیس خلوت جلیس جلوت حریف حکمت ظریف صحبت
بہ بزم یاران بہ دل بہاراں بہ اہل عزلت لگے بداماں

جبیں بہ شکل مہ منور عرق کے قطرے ہیں اس میں اختر
ہلال ابرو نگاہ جادو خدنگ مژگاں و چشم فتاں

بڑے رنگین نگار بستان شگوفہ خنداں گل نہ خنداں
بموے پیچاں ہے عشق پیچاں بوے پریشاں ترا دل پریشان

وہ گوشِ پر زیب کج کلاہی، جو دیکھو بینی تو یا الٰہی
دہن میں غنچہ لبوں میں گلبرگ، رُخ روشن میں مہرِ تاباں

نگاہ ساغر کش تماشا، بیاض گردن صراحی آسا
وہ گول بازو وہ گورے ساعد، وہ پنجۂ رنگیں نگارِ جاناں

کمر نزاکت سے لچکی جائے، کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے
اور اس پہ سو نور لہر کھائے، پھر اس پہ ہیں دو قمر فروزاں

وہ ران روشن وہ ساق سیمیں، وہ پائے نازک حنا میں رنگیں
وہ قد قیامت وہ فتنہ قامت دلوں پہ شامت جو ہو خراماں

جو نام پوچھا کہا خوشی ہوں، جو وصف پوچھا تو دلبری ہوں
بہت جو پوچھا تو ہنس کے بولا کہ ذوقؔ تو بھی عجب ہے ناداں

وہ شاہ جو ہے محمد اکبر جہاں میں رشکِ جم و سکندر
جلوس جشن اس کا ہے فلک پہ اسی کے پرتو میں سب ہے ساماں

یہ سنتے ہی میں نے بالبداہت لکھا وہ مطلع شفق شباہت
کہ جس کو احسن کہے سخنور پڑھے یہ تحسین ہر اک سخنداں

اربابِ مذاق ملاحظہ فرمائیں کہ اس تشبیب میں ذوقؔ نے اسی مضمون خوشی کو موزوں کیا ہے جسے سوداؔ نے اپنے اُس قصیدے کی تشبیب میں نظم کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے

صبح ہوتے جو گئی آنکھ مری آج جھپک
دی خوشی نے دہن آ کر در دل پر دستک

اب اہلِ نظر منصفی فرمائیں کہ سوداؔ نے کس طباعی کے ساتھ اپنے اشعار تشبیب میں خوشی کی تصویر کھینچی ہے اس نے اپنے بیان سے خوشی کو ایک مجسم باجان تنے دکھایا ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوشی ایک معشوقۂ دلفریب ہے جو پیش نظر کھڑی ہے شاعری
اتنی بھی تو ہو کہ غیر مجسم کو مجسم اور بے جان کو جاندار کر کے دکھائے، ذوقؔ نے سوداؔ کے
اُسی خیال خوشی کو حوالۂ قلم کیا ہے مگر خوشی کی تصویر نہیں کھینچ سکے ہیں۔ اُس میں جان کا
داخل کرنا تو خارج از بحث ہے یہ دونوں تشبیبیں سوداؔ اور ذوقؔ کی شاعریوں کا خوب
فرق دکھاتی ہیں۔ ظاہرا ذوقؔ کے اشعار پر زور ہیں شوکت لفظی اعلیٰ درجہ کی رکھتے
ہیں بندش چست ہے ترکیب درست ہے یہ سب کچھ سہی مگر جو شے شاعری کی
جان ہے وہ سوداؔ کے اشعار میں ہے ذوقؔ کے اشعار میں نہیں ہے حقیقت یہ ہے
کہ جب تک شاعری مصوری کا تماشا نہیں دکھاتی ہے بلکہ جب تک جان آفرینی کا کمال اُس
سے نمایاں نہیں ہوتا ہے تب تک شاعری شاعری کا حکم نہیں رکھتی ہے ذوقؔ کا بیان
خوشی زنہار ایسا نہیں ہے کہ خوشی کو ایک مجسم اور ذی جان پیرایہ میں دکھاتا ہے۔
شاعر کامل کا یہ کام ہے کہ اگر غیر مجسم شے کو مجسم کر کے دکھانا چاہتا ہے تو مجسم کر کے
دکھائے اور بے جان کو باجان بنانا ہے تو اعجاز بیانی سے باجان بنادے ملٹن نے
گناہ اور موت کا بیان کیا ہے اُس کے بیان نے گناہ اور موت کو باجسم اور باجان
کر کے دکھایا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اور موت دو مجسم باجان شے ہیں شاعری
اس کو کہتے ہیں اسی طرح میر انیس کے اس مصرع سے " جب زلف کو کھولے ہوئے لیلا ئے
شب آئی " صاف درک ہوتا ہے کہ شب کوئی مجسم زندہ شے ہے حالانکہ شب نہ جسم رکھتی ہے نہ جان

نمبر ۲ تشبیب قصیدۂ غسل صحت صفحہ ۳۴۹ دیوان ذوقؔ

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا ‏ ‏ مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار ۔۔۔ بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دار الشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر ۔۔۔ شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق ۔۔۔ لالہ لے داغِ سیہ پالنے لگا نشو و نما

ہو گیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں ۔۔۔ بیدِ مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا

ہوتا ہے لطفِ ہوا سے اس قدر پیدا لہو ۔۔۔ برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگِ حنا

پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں ۔۔۔ زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا

ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خون ۔۔۔ چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا

تام کو اشیا میں نہ تلخی رہی نہ سمیت ۔۔۔ بن گئی تریاق افیون زہر میٹھا ہو گیا

کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم ۔۔۔ کیا عجب گر آبِ حنظل دیوے شربت کا مزا

نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں ۔۔۔ کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے اژدہا

راحت و آرام کا اس دہر میں ہے دور دور ۔۔۔ چاہیئے واقف نہ ہو دوران سر سے آسیا

موتیا بند آنکھ میں اپنے جو رکھتی تھی صدف ۔۔۔ اب رکھی ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا

آ گیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج ۔۔۔ تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا

نسخے پر لکھنے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب ۔۔۔ کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو ہے بالکل شفا

فرق جاتا یاں تک اعضائے بدن سے درد نے ۔۔۔ درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا

لاغروں کو ہو کمالِ تاب طاقت بہ شتاب ۔۔۔ کیسے وہ ہفتے ہلال اک شب میں ہو بدر الدجا

صبحِ صادق کے ہے گو سر میں سپیدی آگئی ۔۔۔ لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا

بھوک کی شدت سے اس کو اک نفس فرصت نہ ہو ۔۔۔ قرص سے خورشید کے جب تک نہ کر لے ناشتا

رات بھر ڈھونڈا کیا انجم کے دانے چرخِ پیر ۔۔۔ پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا

پہنچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانہ میں — لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا
کوس بھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے — جوں حباب اس کے نہیں مطلق شکم میں امتلا
ہضم کامل اس قدر معدے نے پہنچایا بہم — جیّد الکیموس ہے جو حلق سے اُتری غذا
ہے مزاج اہلِ عالم یہ قریب اعتدال — ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخط استوا
رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس — باغ عالم میں بھی عالم جو صحت کا رہا
دیگا اُس اپنے بالم پرنسے سارے نقش دھو — پھینک دیگی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا
اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج — نام گلشن میں نہیں ہے نرگسِ بیمار کا
واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو — جبکہ ہو اس کی نوید غسل صحت جانفزا
وہ ولی عہد زماں مرزا محمد بوظفر — اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنا دے اقویا

کوئی شک نہیں کہ اشعار بالا بہت خوب ہیں ذوق کی اطلاع عام سے خبر دیتے ہیں اور ہر چند نیچرل پیرایہ نہیں رکھتے اس پر بھی درباری مذاق کے اعتبار سے ایسے ہیں کہ بہت کچھ قابل تعریف و توصیف ہیں *

نمبر ۳ - قصیدہ مدح صفحہ ۳۵۲

جس کا مطلع یہ ہے ؎

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت — نشۂ علم میں سرمست غرور نخوت

واضح ہو کہ یہ قصیدہ بہت طولانی ہے اس کی گنجائش اس کتاب میں نہیں نظر آئی اس لیئے راقم صرف اپنے خیالات اس قصیدے کی نسبت ذیل میں عرض کر دیتا ہے کوئی شک نہیں کہ ذوق نے اچھی مضمون خیز طبیعت پائی تھی یہ قصیدہ ان کی انتہائے

قوتِ شاعری سے خبر دیتا ہے اِس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی درسی اطلاع
ایک ممتاز درجہ کی ہے واقعی علوم کی فہرست خوب تیار کی ہے گو اس میں اظہار شاعری
بہت نہیں ہے پھر اس علم شماری کا نتیجہ اِس قدر مستخرج ہوتا ہے کہ بے قسمت علم سے
کچھ فائدہ مترتب نہیں ہوتا یہاں پر ذوقؔ کی فکر نے لغزش کی ہے کاش ذوقؔ حصولِ علم
کا نتیجہ کچھ معقول طور پر دکھاتے ایسی تقریر سے انسان کو علم اندوزی کی طرف توجہ نہیں
ہوسکتی ایسی تقریر تو سراسر منافی علم اندوزی ہے مگر درباری شاعر ہونے کے باعث
ذوقؔ معذور تھے، اُن کو تو باوجود حاصل رہنے تمام علوم دنیا و دین کے بادشاہ کے ''وبرو تہی
قسمت اپنے کو دکھانا ایک امر مجبوری تھا لاریب آزاد شاعر علم کو محتاج قسمت نہیں دکھا سکتا
ہے صاحبِ علم ہونا خود ایک بڑی خوش قسمتی ہے جیسا کہ امیرالمومنین فرماتے ہیں ما الفضل
الا لاہل العلم انہم۔ علی الہدی لمن استہدی ادلا۔ ففز بعلم ولا تبغی لہ بدلا فالناس موتی واہل علم
احیاء۔ بہرحال تہی قسمتی کے بیان طویل کے بعد ذوقؔ جو نوید بہجت کا مضمون رقم فرماتے
ہیں وہی سوداؔ کا گڑھا ہوا مضمون ہے اس میں کوئی جدت کا پہلو نظر نہیں آتا جس طرح
سوداؔ کی آنکھ لگ گئی اور خوشی سامنے آ کھڑی ہوئی اُسی طرح ذوقؔ کی آنکھ بند ہوتے ہی
ذوقؔ کے روبرو نوید بہجت حاضر آئی، اِس نوید بہجت کو مجسم پیرایہ میں ذوقؔ نے بڑے
زوروں کے ساتھ بیان کیا ہے، بیان کیسا ہی ہو مگر سوداؔ کے تتبع سے خالی نہیں ہے
لیکن اس کے ساتھ انصاف یہی ہے کہ پھر ذوقؔ ہی کا کام تھا کہ سوداؔ کی راہ میں قدم مار
سکے اِس تتبع کی بدولت بے شک ذوقؔ نے نوید بہجت کو مجسم کرکے دکھایا مگر اتنی کسر رہ
گئی کہ جسم میں جان نہ دے سکے، بیان نوید بہجت کے بعد جو مدحیہ اشعار ہیں وہ درباری
شاعر کے حساب سے اچھے ہیں اربابِ مذاقِ صحیح پر اُن کا ملاحظہ بار ہو تو ہو؛

نمبر ۴ تشبیب قصیدۂ مدح صفحہ ۳۷۰ دیوان ذوق

ہے آج جو یوں خوشنما نورِ سحر رنگِ شفق
پرتو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق

یہ جوشِ نسرین و سمن یہ لالہ و گل کا چمن
گلشن میں گویا چھا گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر سرو قد غنچہ دہن زیبِ چمن شانِ چمن
ہر سیم بر گلگوں قبا نورِ سحر رنگِ شفق

لب پر تبسم سے کہ ہے جوشِ بہار و موجِ گل
دندانِ پان خوردہ ہیں یا نورِ سحر رنگِ شفق

افشاں جبیں پر سر بسر مہتاب و انجم جلوہ گر
اور گورے ہاتھوں میں حنا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر مجمعِ پیر و جوان اک طرفہ مشرق ہے کہ واں
روشن دلِ رنگیں ادا نورِ سحر رنگِ شفق

جامِ بلوریں میں ہے یوں عکسِ شرابِ لالہ گوں
ہو جیسے کیفیت فزا نورِ سحر رنگِ شفق

دیکھے چمن میں برگِ گل آلودۂ شبنم جو گل
خجلت سے پانی ہو گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہے شوق کو بالیدگی ہے لطف کو چسپیدگی
کس رنگ ہوں مل کر جدا نورِ سحر رنگِ شفق

ساقی مئے عشرت سے بھر ساغر کہ ہے اس رنگ پر
آب و ہوا جائے فضا نورِ سحر رنگِ شفق

جشنِ بہادر شاہ ہے روزِ علو جاہ ہے
ہے اس لئے بہجت فزا نورِ سحر رنگِ شفق

یہ قصیدہ ایشیائی خیالاتِ شاعری کے اعتبار سے جو کچھ پُر مضمون سمجھا جائے ورنہ حقیقت میں اس کو خوبی مضامین سے کوئی علاقہ نہیں ہے ردیف کی خوشنمائی نے جو کچھ اس کی شہرت پھیلائی ہو ورنہ اس میں مضمون آوری بہت کم ہے اس قصیدہ میں نہ کوئی حکمت آموز بات ہے اور نہ فطرت نگاری کا کوئی لطف ہے قصیدہ گوئی کی غرضیں تو تمام تر فوت ہیں الّا یہ کہ نا تعلیم یافتہ دماغوں کو خوش کرنے کا اچھا آلہ ہے اسی سے ایشیائی درباروں کے مذاقوں کو سمجھنا چاہیئے کہ وہاں شاعری سے کیا نتیجے مراد لی جاتی ہے،

اور وہ کیسی شاعری ہے جس کی قدر کی جاتی ہے۔

نمبر ۵ تشبیب قصیدہ مدح صفحہ ۲۸۴ دیوان ذوق

لاتا ہے نیرنگ سے ہر رنگ نئے چرخ محیل
واہ بگڑا ہے کچھ اس نظم میں عجب رنگ سے نیل

ڈر زمانہ سے وہ عیار ہے یہ ہوش ربا
لاکھ بہروپیوں سے جس کی بھری ہے زنبیل

ہے توکل کا احاطہ وہ عزیمت کا حصار
کہ بجز حفظ خدا جس کے نہ خندق نہ فصیل

گم ہوں ظاہر کی خرابی سے صفات اصلی
رنگ پیتل سے چھپا ہو سر شمشیر اصیل

پیش دشمن نہ گزند حق سے نہیں سانچ کو آنچ
بلکہ ہے آتش نمرود گلستان خلیل

ہوتے سیرت سے ہیں مردان دلاور ممتاز
ورنہ صورت میں تو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل

نہیں بے قید علائق کسی عالم میں بزرگ
رسم تحریر میں بھی چھوٹے فر زنجیر سے فیل

ہے تہ خاک بھی تاروں کو سفر حشر تلک
نہیں ماتحت ثری منزل آرام بخیل

عید اک روز جہاں میں رمضاں ہے یک ماہ
بعد ہے کثرت تکلیف کے یاں عیش قلیل

کشت سبز فلک مہ نو سے نہ رکھ چشم ثمر
خوشۂ فیض سے بے بہر ہے یہ مزرعۂ نیل

قابل انساں کی محبت کے ہے انسان نہ فلک
بن گیا پیش نبی صورت دحیہ جبریل

جتنا خورشید بنے اتنی ہی بارش ہو سوا
ہوئے کیونکر تپش عشق وحرمت کی دلیل

عشق کھینچوائے ہے اک ناز جفاکش سے بزور
بار صد کوہ الم لیے عمل جر ثقیل

نہ لگے چرخ کو گر نالۂ عاشق کی ہوا
دم میں اجزائے دخانی کی طرح ہوں تحلیل

شمع کشتہ کے لئے ہے دم عیسیٰ آتش
سوز غم عشق سے زندہ ہوں محبت کے قتیل

معتبر ہے جو کرے نالہ دل درد اظہار
نالہ ہے دل کی زباں دل ہے موکل یہ وکیل

دل کے ہے ایک ورق میں وہ حقیقت ساری | جس کا اجمال قضا اور قدر سے ہے تفصیل
یعنی ہیں ہے ورق پڑھوں ہیں کوئی مطلع ایسا | گوہر مخزن معنی سے ہو جس کی تاویل

اس قصیدے کے اشعار تشبیب ویسے ہیں کہ جیسا اشعار تشبیب کو ہونا چاہیے ان میں کچھ اقوال حکیمانہ اور محققانہ بھی ہیں پھر شاعری کا پیرایہ بھی اچھا رہا ہے مزید برآں کلام احاطہ غزلیت سے بھی نکلا ہوا ہے ان اشعار کا رنگ بعض عربی قصائد کے اشعار کا رنگ رکھتا ہے اکثر عربی قصائد کے اشعار تشبیب بیکار آمد مضامین سے مشتمل ہوتے ہیں حتیٰ کہ متنبی کے اشعار تشبیب بھی حکیمانہ اور محققانہ مضامین خالی نہیں ہونے فقیر کی دانست میں اتنے بیکار آمد مضامین ذوق کے اور کسی قصیدہ میں نظر نہیں آتے۔

واضح ہو کہ قصائد بالا کے علاوہ اور بھی چند قصائد ذوق کے ایسے ہیں کہ توجہ طلب ہیں البتہ اس مذاق کی رو سے تو لاریب ذوق کے یہ سب قصائد اس شاعر نامی کی بڑی خلاقی سخن طبیعت داری عالی پردازی اور بلند خیالی سے خبر دیتے ہیں مگر یہی شاعری کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر جو ان کا موازنہ کیجیے تو ان میں چند نقصانات پائے جاتے ہیں اوّلؔ یہ کہ شاعری کو جو آزادی خیالات درکار ہے ان میں نہیں ہے دوؔم یہ کہ ان میں معاملات فطرت کا جلوہ کہیں نظر نہیں آتا ہے سوؔم یہ کہ ان میں ایسے اقوال کہ مفید اخلاق و تمدن و معاشرت ہوں کمتر پائے جاتے ہیں چہارؔم یہ کہ ان میں ایسے مضامین مفقود ہیں جن سے مذاق شاعری کی اصلاح متصور ہو بہر حال ان سب نقصانات کی معذرت اُستاد ذوق کی طرف سے صرف ایک جملہ کے ذریعہ سے کی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت کو اتفاق وقت سے درباری شاعر بننا پڑا تھا ورنہ جو قابلیت شاعری حضرت کو مودعہ تھی اس قابلیت کا شاعر ایک آزاد ملک میں بہت کچھ

بکارآمد تصانیف سے شاعری کو زینت اور قوم کو عزت دے سکتا ہے۔ اس جگہ ایک امر بہت قابل لحاظ ہے کہ ہرچند تقرب شاہی سے حضرت کی شاعری کو بڑا نقصان پہنچا، مگر ان کے ذاتی معاملات اخلاق میں کوئی فسلہ واقع نہ ہوا۔ ذوق جس طرح کے سچے خوش نیت قانع خدا پرست آدمی تھے۔ تادم مرگ رہے۔ ان کی قناعت ایک ممتاز درجہ کی تھی ظاہر ہے کہ جس دربار سے ان کو تعلق تھا وہ غایت بدحالی میں مبتلا رہا تھا ناچار ان کو ایک قلیل رقم تنخواہ کے طور پہ وصول ہوا کرتی تھی اس پر بھی انھوں نے شاہ نصیر کی چال نہیں اختیار کی، کبھی ملک دکن کا منہ نہ دیکھا دہلی میں رہے اور دہلی میں مرے۔ اگر شاہ صاحب کی طرح جادۂ قناعت سے قدم باہر نکالتے تو شاہ صاحب سے زیادہ مال دنیا حاصل کر لیتے اس واسطے کہ درباری شاعری میں ان کو شاہ صاحب سے بہت زیادہ دخل تھا لیکن ذوق نے دامن قناعت کو نہ چھوڑا جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدر سخن کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

واضح ہو کہ شاہ نصیر کے متواتر سفر دکن اختیار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں ملک دکن ایک اچھا زرا اندوزی کا میدان تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جس وقت راجہ چندو لعل کی اولجلول فیاضی بر سر طغیانی تھی لیکن اس عہد میں بھی ملک دکن کچھ کم مرجع اہل حاجت نہیں ہے ہزاروں بے روزگار اب بھی بشکل امیدوار آتے جاتے ہیں اور ہزاروں بیرونی اشخاص سرکار دکن سے تعلق خدمت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے افلاس میں مسلمانان ہند مبتلا ہو رہے ہیں اگر یہ ریاست نہ ہوتی تو بہت سے ایسے نوکری پیشہ لوگوں کو جن کو انگریزی نوکری کا ملنا معدوم اوقات بسری کی صورت سخت دشوار ہو جاتی واقعی یہ ریاست بہت فیض رساں ہے مگر اس کی فیض رسانی سے

ہم مسلمانوں کی بدحالی کا پتا خوب لگتا ہے اس کی فیض رسانی کہہ رہی ہے کہ اے مسلمانان ہند تم اپنے دیاروں کے غیر اقوام سے قابلیت میں بہت پیچھے پڑ گئے ہو تب تو میرے ہاں روٹی ڈھونڈنے آتے ہو۔ خدایا! کاش وہ دن ہم کو نصیب ہو کہ ہم لوگ کافی طور پر سرمایہ قابلیت حاصل کر کے اکتساب معاش میں اپنے ہم وطن غیر اقوام کے برابر ہو جائیں۔ بلکہ ان سے بڑھ جائیں تاکہ ہم کو دکنیوں کے حقوق کو غصب کرنے کی محتاجی باقی نہیں رہے ؛

قطعہ موضوعی ترکیب اس صنعت شاعری کی وہی ہے جو قصیدہ کی ہے الا یہ کہ اس صنف شاعری میں ہمیشہ مطلع ندارد ہوتا ہے اور اشعار کے عدد چار سے کم نہیں ہوتے مضامین کے اعتبار سے یہ صنف شاعری ایک اعلیٰ درجہ رکھتی ہے اس کے مضامین کو مسائل اخلاق و حکمت پر مشتمل ہونا چاہیئے قطعہ نگاری کا تقاضا یہی ہے۔ مگر بعض شعرا نے اس صنعت شاعری کو پست مضامین کی بندش سے درجہ ابتذال کو پہنچا دیا ہے۔ واضح ہو کہ قطعہ نگاری کے لئے داخلی شاعری (NTERAL POETNY) درکار ہے چنانچہ فارسی اور اردو کے جتنے عمدہ قطعات ہیں اسی پہلو کے مضامین سے مزین نظر آتے ہیں مگر اس جگہ ایک امر قابل گزارش یہ ہے کہ قطعہ نگاری میں شاعر کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس کا کلام غزلیت کا رنگ پیدا نہ کرے الا اس حال میں کہ قطعہ بند اشعار وہ کسی غزل میں موزوں کرنے کو ہے ؛

فارسی کی قطعہ نگاری

راقم کی دانست میں اکثر فارسی شعرا کی قطعہ نگاری کا مذاق اچھا ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ صنف شاعری درباری شاعری کے اغراض کے لئے قصیدہ کے

برابر موزون و مناسب نہیں ہے اس لئے درباری اغراض میں کمتر صرف ہوئی ہے
اگر کسی شاعر نے اس میں مدح سرائی وغیرہ کی ہے تو اس کی مثال محض شاذ و اتفاقی ہے
واضح ہو کہ فارسی میں ابن یمین نے اچھے قطعات نظم فرمائے ہیں بلکہ اُن کے قطعات نے
مدّون ہو کر ایک مختصر دیوان کی صورت پیدا کی ہے۔ ابن یمین کی شہرت شاعری قطعات
نگاری کی بدولت ہے ہر کہ و مہ قطعات ابن یمین سے خبر رکھتا ہے حقیقت یہ
ہے کہ یہ کتاب منظوم از سرتاپا مسائل حکمت سے معمور ہے اور ارباب مذاق کے
قابل توجہ ہے ذیل میں کچھ ابن یمین کے قطعات نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

انتخاب قطعات ابن یمین

دانی چہ موجب است کہ فرزند از پدر (قطعہ ۱) منت نگیرد ارچہ فراواں دہد عطا
یعنی در این جہاں کہ محل حوادث است — در محنت وجود تو افگندۂ مرا

سائلے حال جہاں راز یکے کرد سوال (قطعہ ۲) آں شنیدی کہ چہ فرمود حکیمش بجواب
گفت دنیا و نعیمش چو بیابان سراب — یا خیالیست کہ صاحب نظرش دید بخواب
خواب را مردم بیدار دل اصلا ندہند — نہ شود اہل خرد غرہ بہ تمویہ سراب

مرد آزاد درمیان گروہ (قطعہ ۳) گرچہ خوش خو عاقل و دانا است
محترم آنگہے تواند بود — کہ از ایشاں بمالش استغنا است
وانکہ محتاج خلق شد خوار است — گرچہ در علم بوعلی سینا است

واضح ہو کہ یہ ترجمہ قول امیر المومنین علیہ السلام کا ہے

گر نوازد فلکت غرہ مشو از پے آں (قطعہ ۴) کہ صعودے نبود کش کہ سقوطے زپے است

گر بلندی دہدت بخت بروِ نیز مناز
کار تفاعے نبود کش کہ ہبوطے ز پے است

اگرچہ بے ہنرے را درم فزون باشد (قطعہ۵) گمان مبر تو کہ نادان برابر دانا ست
بہیچ حال ابوجہل چون محمدؐ نیست
اگرچہ طینت ہر دو ز آدم و حوا ست

کسے کز طریق تواضع رود (قطعہ۶) کند بر سریرِ شرف سلطنت
ولیکن محلش بدان و مکن
ملک سیرتی در گہ شلطنت
تواضع بود با بزرگان ادب
بود با فرومایگان مسکنت

یہ بھی قول امیر المومنین علیہ السلام کا ترجمہ ہے۔

ہر کہ موجود حقیقی را شناخت (قطعہ۷) ذات ایزد را بلا اشباہ گفت
رہ بہ یزدان ہیچ میدانی کہ برد
آنکہ لا موجود الا اللہ گفت

چو میدانی کہ احوال زمانہ (قطعہ۸) مبدل می شود ساعت بساعت
گرت باید کہ یابی لذت از عمر
و گر خواہی کہ یابی ذوق طاعت
ز دامِ حرص چون سیمرغ بگریز
نشیمن ساز بر قاف قناعت

ہر کہ دارد کفاف عیش جہاں (قطعہ۹) کہ نباشد دراں بکس محتاج
کلبۂ نیز بایدش کہ ازاں
نہ کند ہر دمش کسے اخراج
در جہاں بادشاہ وقت خود است
وین چنین کس نہ بنگرد سوے تاج
بشنو از من محو سے ابن یمین
تا بمانی مگر ازیں محتاج
کانچہ افزون ازین کنی حاصل
بہرہ دادنی است یا تاراج

مرد باید کہ ہر کجا باشد (قطعہ۱۰) عزت خویشتن نگہ دارد
خود پسندی دالبھی نہ کند
ہر چہ کبر و منی است بگزارد

بطریقے رود کہ مردم را | سر موسے زخود نیاز ارد
ہمہ کس راز خویش بہ داند | ہیچ کس را حقیر نہ شمارد
سر وزر در طلب نہد وانگہ | تا مگر دوستے بدست آرد

راقم نے قطعات بالا اس لئے انتخاب کئے ہیں کہ قطعہ نگاری کی غرض ظاہر ہو جتنے مضامین قطعات بالا کے ہیں تلے اور بچے ہوئے ہیں ارباب دانش سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اُن سے قطعہ نگاری کی غرض ہویدا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس رنگ کی قطعہ نگاری ایک بڑے حکمت مآب شاعر کا کام ہے، ہر شعر راستی کا مرقع ہے اور سچی شاعری کا نمونہ ہے اب ذیل میں کچھ قطعات سعدی علیہ الرحمہ کے عرض کئے جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اِس صنف شاعری میں بھی حضرت ایک بڑا ممتاز پایہ رکھتے ہیں بلکہ فقیر کی دانست میں کوئی فارسی کا شاعر قطعہ نگاری میں ان کا ہمسر نظر نہیں آتا ہے جو صفائی خیالات جدت مضامین حق پسندی راست گفتاری اثر انگیزی کا جلوہ حضرت کے کلام میں پایا جاتا ہے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں دیکھا جاتا حق یہ ہے کہ ہر چند ابن یمین بڑے قطعہ نگار ہیں مگر سعدی کے صفاء خیالات اور اثر انگیزی کو نہیں پہنچتے ہیں۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

انتخاب قطعاتِ سعدی

اے کریمی کہ از خزانۂ غیب | قطعہ | گبرو ترسا وظیفہ خور داری
دوستان را کجا کنی محروم | تو کہ با دشمنان نظر داری

ابر و باد و مه و خورشید و فلک در کار اند (قطعه ۲) تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
همه از بهر تو سرگشته و فرمان بردار — شرط انصاف نه باشد که تو فرمان نبری

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم (قطعه ۳) وز ہر چہ گفته اند شنیدیم و خوانده ایم
دفتر تمام گشت و بپایان رسید عمر — ما ہمچنان در اول وصف تو مانده ایم

گر کسے وصف او ز من پرسد (قطعه ۴) بیدل از بے نشاں چه گوید باز
عاشقان کشتگان معشوق اند — بر نیاید ز کشتگان آواز

اے مرغ سحر عشق ز پروانه بیاموز (قطعه) کان سوخته را جان شد و آواز نیامد
ایں مدعیان در طلبش بے خبر انند — کانرا که خبر شد خبرش باز نیامد

گلے خوشبوئے در حمام روزے (قطعه ۶) رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم که مشکی یا عبیری — که از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال همنشین در من اثر کرد — وگرنه من ہماں خاکم که ہستم

کنونت که امکان گفتار ہست (قطعه) بگو اے برادر به لطف و خوشی
که فردا اگر پیک اجل در رسد — به حکم ضرورت زبان درکشی

زبان در دہان خردمند چیست (قطعه) کلید در گنج صاحب ہنر
چو در بسته باشد چه داند کسے — که جوہر فروش است یا شیشه گیر

اگرچه پیش خردمند خامشی ادب است (قطعه ۹) بوقت مصلحت آن به که در سخن کوشی
دو چیز طیرهٔ عقل است دم فرو بستن — بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

بس نامور بزیر زمین دفن کرده اند (قطعه ۱۰) کز ہستیش بروئے زمین یک نشاں نماند

آں پیر لاشہ را کہ سپردند زیر خاک — خاکش چناں بخورد کزو استخوان نماند
زندہ است نام فرخ نوشیروان بخیر — گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند
خیرے کن اے فلان و غنیمت شمار عمر — زان پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

(قطعہ ۱۱) آں شنیدی کہ لاغرے دانا — گفت روزے باابلہے فربہ
اسپ تازی اگر ضعیف بود — ہمچناں از طویلۂ خر بہ

(قطعہ ۱۲) نیم نانے گر خورد مرد خدائے — بذل درویشاں کند نیمے دگر
ہفت اقلیم ار بگیرد بادشاہ — ہمچنان در بند اقلیمے دگر

(قطعہ ۱۳) ابر گر آب زندگی بارد — ہرگز از شاخ بید بر نخوری
با فرومایہ روزگار مبر — کز نئے بوریا شکر نخوری

(قطعہ ۱۴)

پسر نوح با بداں بنشست — خاندانِ نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند — پے نیکاں گرفت مردم شد

قطعہ ۱۵ شمشیر نیک ز آہن بد چوں کند کسے — ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس
باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

قطعہ ۱۶

زمین شور سنبل بر نیارد — درو تخم عمل ضائع مگردان
نکوئی با بداں کردن چنان است — کہ بد کردن بجائے نیک مردان

واضح ہو کہ یہ سب قطعات راقم نے کتاب "گلستان" سے داخل انتخاب کئے ہیں ظاہرا
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کتاب کے تمام قطعات اور بھی وہ قطعات جو کلیات

سعدیؔ میں مندرج ہیں مدون کر دیئے جائیں تو ایک عمدہ مجموعہ قطعات سعدیؔ کا ترتیب پا سکتا ہے فقیر کی دانست میں فارسی کا کوئی قطعہ نگار شاعر سعدیؔ کے حسن بیان، صفائی، پر تاثیری مضامین حق پسندی، حق آموزی، حق جوئی حق گوئی راست گفتاری راست کرداری کو نہیں پہنچتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو خوبیاں سعدیؔ کے قطعات میں ہیں۔ زنہار ابن یمینؔ کے قطعات میں نہیں ہیں، لاریب سعدیؔ قطعہ نگاری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ ذیل میں کچھ قطعات اُن کی کلیات سے بھی درج ذیل کئے جاتے ہیں ؛

قطعہ ١٧

ناگہاں بانگ در سرائے فتد　　　که فلاں را اجل وعده رسید

دوستان آمدند تا لب گور　　　قدمے چند و باز پس گردید

وانکه او دوست تر همی داری　　　مال و ملک و قباله برد و کلید

آنکه پیوسته با تو خواہد بود　　　عمل تست و نفس پاک و پلید

نیک در یاب و بد مکن زنہار　　　که بد و نیک باز خواہی دید

قطعہ ١٨

کسے بچشم و تماشے برادران عزیز　　　زعیب خویش نباید که بے خبر باشد

زدشمنان شنو ای دوست تا چه میگویند　　　که عیب در نظر دوستان ہنر باشد

قطعہ ١٩

پدر که جان عزیزش بلب رسید چه گفت　　　یکے نصیحت من گوش دار جان عزیز

بدوست گرچه عزیز است راز دل مکشای　　　که دوست نیز بگوید بدوستان عزیز

قطعہ ٢٠

ایکه وقت نطفه بودی بے خبر　　　وقت دیگر طفل بودی شیر خوار

مدتے بالا گرفتی تا بلوغ　　　سرو بالائے شدی سیمین عذار

ہمچناں تامرد نام آور شدی — فارسِ میدان و مرد کارزار
آنچہ دیدی بر قرار خود نماند — وانچہ بینی ہم نماند بر قرار
ایں ہمہ ہیچ است چوں می بگذرد — بخت و تخت و امر و نہی گیر و دار
نام نیک رفتگاں ضائع مکن — تا بماند نام نیکت یادگار

ذیل میں کچھ اور استادوں کے بھی ایسے قطعات جس سے قطعہ گوئی کی غرضیں ہویدا ہیں۔ عرض کئے جاتے ہیں۔

قطعۂ فردوسی

بیا بگو کہ پرویز از زمانہ چہ خورد — برو بہ پرس کہ کسریٰ ز روزگار چہ برد
گر او گرفت ممالک بدیگراں بگذاشت — در این نہاد خزائن بدیگراں بسپرد

قطعۂ نظامی

دوش رفتم بہ خرابات، مرا راہ نبود — میزدم نعرہ و فریاد کس از من نشنود
یا نہ بد ہیچکس از بادہ فروشاں بیدار — یا نہ من ہیچکسم ہیچکسم در نہ کشود
پاسے از شب چو بشد بیشتر ک یا کمتر — رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر است دریں وقت کرا میخواہی — لیے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگوے — کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود
ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند — کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش استی زود
ایں خرابات مغاں است درو رنداںند — شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

ہرچہ از جملۂ آفاق در انجا حاضر — مومن وارمنی و گبر و نصاری و یہود
گر تو خواہی کہ دل از صحبت ایناں بزنی — خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

واضح ہو کہ اس قطعہ کی عروضی ترکیب غزل کی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قطعہ میں مطلع بھی لکھتے ہیں مگر یہ بہ غزل نما ترکیب قلیل الوجود ہے لیکن غرض قطعہ نگاری سے قطعہ کو خالی نہیں ہونا چاہئے اس قطعہ کا مصراع آخر اس قطعہ کی غرض پر مشتمل ہے

قطعہ سنائی

گویند چو پیغمبر ما رفت ز دنیا — میراث خلافت بفلاں داد ز بیگان
نے نیست ملکے ملک بہ بیگانہ نداد است — رود فرشاہان جہاں جملہ تو برخوان
با دختر و ابن عم و داماد و دو فرزند — میراث بہ بیگانہ دہد ہیچ مسلمان
روزے ز سر سنگ عقابے بہوا خاست (قطعہ) — واندر طلب طعمہ پر و بال بیاراست
از کبر و منی ہا کہ در او بود ہمی گفت — امروز ہمہ ملک خدا زیر پر ماست
ناگہ ز کمین گاہ یکے سخت کمانے — تیرے بزہ آورد فرستاد بدو راست
بر بال عقاب آمدہ آں تیر جگر دوز — در سینہ برون رفت و پس پشت ہمی کاست
در حیرت آں بود زمانے بہ تفکر — کایں آہن و ایں چوب بریدن ز کجا خواست
چوں نیک نگہ کرد بر خویش در آن دید — گفتا بکہ نالیم کہ از ماست کہ بر ماست

قطعہ غالب دہلوی

فرصت اگرت دست دہد مغتنم آنکار — ساقی و مغنی و شرابی و سرودی

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند / حق را بہ سجودی و نبی را بہ درودی

ایضاً

بہ آدم زن بہ شیطان طوق لعنت / سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم / گراں تر آمد از طوق عزازیل

واضح ہو کہ قطعات بالا میں شوخی کا لطف ہے، غالب کے قطعات فارسی بہت ہیں مگر بیشتر درباری رنگ کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے قطعات بضرورت تصنیف ہوئے ہوں گے اور چونکہ اغراض قطعہ نگاری کے موافق نظر نہ آئے درج ہذا نہیں کیے گئے یہی حالت عرفی کے قطعات کی بھی نظر آتی ہے کہ حکیمانہ مضامین پر کمتر مشتمل ہیں۔

اُردو کی قطعہ نگاری

معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے شعرا نے قطعہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ فرمائی ہے اُردو کا شاعر اس صنعت شاعری میں نہ سعدی کا نظیر نظر آتا ہے نہ ابن یمین کا جواب دکھائی دیتا ہے ذیل میں اُردو کے کچھ قطعات بہ سبیل انتخاب عرض کیے جاتے ہیں

قطعاتِ ذوقؔ

یہ ایک تارک دنیا سے میں نے پوچھا ذوقؔ / کہ تو اکھڑ کے اِدھر سے اُدھر ہُوا پیوست
گزرتی ہوگی بہ آرام زندگی تیری / کہ تجھ کو اب نہ غم نیست ہے نہ شادی ہست
کہا یہ اُس نے کہ قید حیات میں انسان / کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گر ہو مست الست
اٹھائے ہاتھ جہاں سے لیک کیا امکان / کہ با فراغ کرے کنج عافیت میں نشست

چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی — تو سلسلہ میں فقیری کے وہ ہؤا پابست
رہا وہ خدمتِ مرشد کی قید میں برسوں — کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
گر ایک عمر میں پہنچا مقامِ عالی پر — کہا یہ شوق نے ہو ہمت بلند نہ پست
جو دستگاہ تصوف میں بھی ہوئی اس کو — تو یہ ارادہ ہؤا اور بھی ہوں بالادست
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلحِ کل کے بھی — کہ نفس دشمنِ سرکش ہے اس کو دیجیے شکست
جو ہوشیار ہے تو ہے وہ شرع کا پابند — پھنسا ہؤا ہے کیفیتوں میں گر ہے مست
نہیں ہے دامِ علائق سے مطلق آزادی — مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کر کے جست
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ — گیا زباں سے نکل اس کی جیسے تیر از شست
کہ کرد قطعِ تعلق کدام شد آزاد — بریدہ زہمہ با خدا گرفتار است

قطعہ

دیکھتے ہیں جلوۂ گلہائے زنگار رنگ ہم — مثل نرگس جب تلک ہے اس چمن میں چشم وا
آخرش ہوگا وہی اک دن خزاں کے ہاتھ سے — جو کہ عالم اپنا اس نشو ونما سے پہلے تھا
ہے غنیمت کوئی دم نظارۂ رنگ بہار — پھر کہاں یہ سبزۂ گل اور یہ ابر و ہوا
در عدم بودیم و دیگر در عدم خواہیم رفت — ایں تماشائے جہاں را مفت می بینیم ما

قطعہ

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال — غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے اُن کا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر — نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

قطعہ

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق — ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے — کیوں بُرا کہنے سے تو اس کے بُرا مانتا ہے

قطعاتِ غالبؔ

کلکتہ کا جو ذکر کیا تُو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

اس قطعہ میں صرف شوخی ہے کوئی شعر حکیمانہ مذاق نہیں رکھتا۔ اس قطعہ پہ کیا موقوف ہے، جتنے قطعات دیوانِ غالبؔ میں موجود ہیں کسی مسئلہ علمی سے علاقہ نہیں رکھتے ہیں۔

قطعہ

اے شہنشاہ آسماں اورنگ
اے جہاندار آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمند سینہ فگار

تُم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمی بازار

کہ ہُوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناس ثوابت و سیّار

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری
خود ہوں اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلام کارگزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر ! — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ زار

کچھ خریدا نہیں ہے ابکے سال — کچھ بنایا نہیں ہے ابکے بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل ونہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے — ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجیے — ہے قلم میرا ابر گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ | تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام | شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس | ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اس قطعہ میں جس قدر شوخی ہے محتاج بیان نہیں مگر راقم نے اس قطعہ کو اس لیے منتخب کیا کہ اس میں مرزا غالب نے بڑی واقعہ نگاری خرچ کی ہے، ہندوستانی سرکاروں کا بیشتر یہی طور ہے کہ بد انتظامیوں کے باعث تنخواہیں بڑی دشواریوں سے ملتی ہیں، ہندوستانی ریاستیں سرکار انگریزی نہیں ہوتیں کہ مشاہرہ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ ملازموں کو وصول ہو جایا کرے، یہ قطعہ بہت عبرت خیز ہے، ظاہر ہے کہ جن سرکاروں کی یہ حالت ہو کہ ملازموں کو مزد خدمت وقت پر نہ ملا کرے تو بالضرور یا وہ چوری کریں گے یا مارے تکلیف کے بھاگ کھڑے ہوں گے، ارباب مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ قطعہ ہجو کا ایک نہایت مطبوع پیرایہ رکھتا ہے گو ایسی نیت سے لکھا نہیں گیا۔

ایک قطعہ ذیل میں میر پرورش علی صاحب متخلص بہ سختی کا نذر ناظرین ہوتا ہے۔

ایک دن وہ لے کے کچھ لوگوں کو ساتھ | تربتیں یہ کہ کے دکھلاتے رہے
اس میں مجنوں ہے اور اس میں کوہکن | عاشقان ناز تھے جاتے رہے
بعد اس کے پھر ہماری قبر پر | دیر تک افسوس فرماتے رہے
پوچھا جب سب نے کہ اس میں کون ہے | آپ جو رو رو کے پچھتاتے رہے
بولے ہے ہے یہ سختی کا ہے مزار | جان دیدی لاکھ سمجھاتے رہے

رباعی وہ صنف شاعری ہے جس کے لیے حکیمانہ مضامین کی حاجت

ہے، شاعر کو لازم ہے کہ مسائل اخلاق و تمدن و معاشرت و مذہب و دیگر مضامین
جلیلہ سے اپنے کلام کو زینت دے۔ اگر پست خیالی کی طرف اس کے کلام کو میلان
ہوگا تو اس کی رباعی نگاری بامراد تاثیر پیدا نہ کر سکے گی۔ جاننا چاہیئے کہ جیسی عالی
خیالی قطعہ نگاری کے لیئے درکار ہے اس صنف شاعری کو بھی اسی قدر اس کی
حاجت ہے مگر فرق یہ ہے کہ قطعہ میں گنجائش مضامین زیادہ ہے اس لیئے
کہ قطعہ صرف چار مصرعوں میں محدود نہیں رہتا۔ اور رباعی کو چار مصرع کے سوا
چارہ نہیں ہے، چونکہ یہ صنف شاعری عروضی ترکیب کے رو سے بہت محدود
صورت ہے، شاعر کو لازم ہے کہ منقح مسائل کو اس طرح موزوں کرے کہ تھوڑی
لفظوں سے بہت معنی پیدا ہوں اور چوتھا مصرع بہت پُر مضمون اور پُر زور
ایسا ہو کہ گویا ہر سہ مصرا عہائے سابق کا خلاصہ یا نتیجہ ہو۔ اہل واقفیت سے
پوشیدہ نہیں ہے کہ صنعت شاعری کے لیئے زیادہ تر داخلی مضامین کی حاجت
ہے۔ مسائل اخلاق و تمدن و معاش و معاد کے علاوہ عشقیہ مضامین بھی اس میں موزوں
کیئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ایسے مضامین پست خیالی کے عیب سے پاک متصور ہوں۔

فارسی کی رُباعی نگاری

فقیر کی دانست میں فارسی کی رُباعی نگاری فارسی کی قطعہ نگاری کی طرح
ایک اعلیٰ درجہ کی شاعری سے خبر دیتی ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ فارسی
میں جو عمدہ رباعی نگار گزرے ہیں وہ عموماً حکمائے وقت سے بھی تھے ذیل میں
بعض شعرائے نامی کا ذکر رُباعی نگاری کے تعلق کے ساتھ حوالۂ قلم کیا جاتا ہے

اور اُن کے کلام کے نمونے بھی نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

فردوسی بہ حیثیت رُباعی نگار

فردوسی کی شہرت رُباعی کے ذریعہ سے نہیں ہے مگر اس شاعر گرامی کی رُباعی نگاری سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کے عہد میں بھی رُباعی نگاری فارسی میں مروّج ہو چکی تھی۔ یہ صنفِ شاعری اہلِ عرب کا ایجاد ہے جیسا کہ کتبِ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔

رُباعی فردوسی

تا چند نہی بر دل خود غصہ و درد — تا جمع کنی سیم سفید و زر زرد
زاں پیش کہ گردد نفس گرم تو سرد — با دوست بخور کہ دشمنت خواہد خورد

ظاہر ہے کہ رُباعی بالا اخلاق و تمدن اور معاشرت کے ایک بڑے مسئلہ سے خبر دیتی ہے۔ یہ رُباعی تمامتر اپنے تقاضوں کے مطابق ہے۔

مولانا جلال الدین رومی بہ حیثیت رُباعی نگار

مولانائے رومی کی شہرت رُباعی نگاری کی وجہ سے نہیں ہے۔ بہر حال دو رباعیاں مولانا کی درج ذیل ہوتی ہیں۔

نمبر ۱۔ رُباعی رومی

در مذہب عاشقاں قرارے دگر است — وین بادۂ ناب را خمارے دگر است
ہر علم کہ در مدرسہ حاصل کردیم — کارے دگر است و عشق کارے دگر است

نمبر ۲۔ رُباعی رومؔی

ہر دیدہ کہ در جمال جاناں نگرد　　شک نیست کہ در قدرت یزداں نگرد
بیزارم ازاں دیدہ کہ در وقت اجل　　ازیار فرو ماندو در جاں نگرد

واضح ہو کہ رباعیات بالا عشقیہ ہیں مگر بوالہوسوں کی عشق بازی کے مضامین سے تمامتر بلے لگاؤ ہیں یہ وہ عشق ہے جس کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ

تعالی العشق عن فہم الرجال

خاقانی بہ حیثیت رُباعی نگار

خاقانی کی شہرت قصیدہ نگاری کی بدولت ہے اس شاعر نامی کی ایک رُباعی ذیل میں عرض کی جاتی ہے۔

رُباعی خاقاؔنی

توفیق رفیق اہل تصدیق شود　　زندیق درین طریق صدیق شود
گر راز مرا نہ دانی انکار مکن　　تقلید کن آن قدر کہ تحقیق شود

انوؔری بہ حیثیت رُباعی نگار

انوری قصیدہ گو ہیں مگر اُن کی ایک رباعی ذیل میں نذر ناظرین ہوتی ہے

رباعی انوؔری

باگل گفتم ابر چرا می گرید　　ماتم زدہ نیست ہر کجا می گرید

گل گفت اگر راست ہمی باید گفت   برعمر من و عہد شما می گرید

پیرایہ شاعری میں تعلیم کا پہلو اچھا رہا ہے۔ غرض رباعی نگاری ہویدا ہے۔
اس شاعر کی شہرت مجرد رباعی نگاری کی بنیاد پر ہے جس طرح ابن یمین قطعہ نگاری کی بدولت مشہور دیار و امصار ہو رہے ہیں اسی طرح رباعی کی وجہ سے عمر خیامؔ کا نام شہرۂ آفاق ہو رہا ہے یورپ میں بھی رباعیات عمر خیام کی بڑی قدر کی جاتی ہے چنانچہ ملک انگلستان میں ایک کلب ((یعنی جلسہ) اس شاعر گرامی کے نام سے قائم ہے۔ ذیل میں خیامؔ کے کچھ حالات بہ سبیل تذکرہ عرض کئے جاتے ہیں۔
واضح ہو کہ اس مشہور عالم کا نام غیاث الدین ابوالفتح عمر بن ابراہیم الخیامؔ ہے اور وطن نیشاپور جو صوبہ خراسان کا ایک شہر ہے۔ عمر خیام سلطان سنجر کے عہد میں تھے اور اُن کی وفات کا سن ۵۱۷ ہجری صلعم معلوم ہوتا ہے نظام الملک جو الپ ارسلان اور ملک شاہ شاہان سلجوقیہ کے زمانوں میں وزیر رہے اپنی کتاب وصایا میں میں لکھتے ہیں کہ ہم اور خیام عہد طالب العلمی میں ہم سبق اور ہم اُستاد تھے بعد اختتام تعلیم کے ہم سیر و سفر کو چلے گئے اور بعد معاودت کے وزیر ہوئے، ہماری وزارت پالی کے بعد خیامؔ ہمارے پاس آئے ہم اُن کے ساتھ تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آئے اور اُن سے یہ کہا کہ آپ کی قابلیت کے آدمی کو خدمت سلطان میں در آنا چاہیے خیامؔ نے اس کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ مجھے علم اندوزی کے لئے چھوڑ دو مجھے گوشہ عافیت درکار ہے۔ جب ہم نے خیام کو اس خواہش پر مستحکم پایا تو شاہی خزانہ سے بارہ سو اشرفیاں سالانہ کفاف کے طور پر مقرر کر دیں، الپ ارسلان کے بعد جب ملک شاہ

تخت نشین ہوئے تب خیاؔم مرو میں آئے۔ اس وقت اُن کے علم وفضل کا شہرہ تھا
سلطان نے بڑی توقیر کی اور بڑے بڑے عہدے اُن کو بخشے ابوالفدا کی تحریر سے معلوم
ہوتا ہے کہ مرو میں جس عہدے پر خیاؔم کو سلطان نے سرفراز فرمایا تھا وہ علم الافلاک
کے شاہی سررشتہ کی افسری تھی۔ اس خدمت کے زمانے میں خیاؔم نے سرنو سے تقویم
سال فارسی کی اور بہت سے زیچ تیار کیے۔ جو زیچ ملک شاہی کے نام سے مشہور ہیں
اسی تقویم کو جلالی کہتے ہیں اور وجہ اس کی تسمیہ کی یہ ہوئی کہ سلطان وقت جلال الدین ملک شاہ
تھے اور انھیں کی توجہ فرمائی سے یہ کار دشوار انجام کو پہنچا۔ ابن خلدون کی تحریر سے یہ
بھی معلوم ہوتا ہے کہ خیاؔم کو علم جبر ومقابلہ میں بھی بڑا دخل تھا اور اس علم میں ان کی تصنیف
موجود ہے ایک کتاب ان کی تصنیف سے جس کا موضوع اقلیدس کی تعریفات کی
دشواریاں ہے لیڈن (LEGDEN) کے کتب خانہ میں ابھی تک موجود ہے
شہرستانی خیاؔم کی نسبت لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ کا یہ عالم ترین شخص تھا علم الافلاک اور
فلسفہ میں اس کا کوئی نظیر نہ تھا۔ مختصر یہ ہے کہ خیاؔم اُن علماء میں ہے جن کے تمام
نامی نامور وہو السنہ خلائق پر جاری رہ جائیں گے خیاؔم کے عقائد دین کی نسبت طوسی
لکھتے ہیں کہ اسے تدبیر کی طرف میلان تھا اور یہ میلان اس کے نہایت علمی کے باعث تھا۔ ابوالفدا
کی تحریر سے ہویدا ہوتا ہے کہ خیاؔم کو شاعری سے بڑی رغبت تھی مگر راقم کو اس یکتائے
روزگار کی رباعیات کے علاوہ اس کے اور اصناف کلام منظوم سے خبر نہیں ہے یہ
رباعیاں مختلف مضامین پر مشتمل نظر آتی ہیں کچھ تو شکایت روزگار میں ہیں اور کچھ
ہجو میں۔ پھر کچھ فراقیہ اور وصالیہ ہیں۔ تھوڑی بہاریہ بھی ہیں، علاوہ ان کے کفریہ اور
مناجاتیہ ہیں۔ یورپ میں خیاؔم کی رباعیوں کی بڑی قدر ہے اس کا سبب اور کوئی

نہیں معلوم ہوتا ہے الا یہ کہ خیام کے کفریہ مضامین مذاق یورپ کے قرین ہیں۔

انتخاب از رباعیات عمر خیام

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما نمبر۱ کاے رند خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے زان پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

برخیز و بیا بیا براۓ دل ما نمبر۲ حل کن بہ جمال خویشتن مشکل ما
یک کوزہ می بیار تا نوش کنیم زاں پیش کہ کوزہ کنند از گل ما

گر مے نخوری طعنہ مزن مستان را نمبر۳ گر دست دہد توبہ کنم یزدان را
تو فخر بدین کنی کہ من مے نخورم صد کار کنی کہ مے غلام است آن را

با بط می گفت ماہیۓ در تب و تاب نمبر۴ باشد کہ بجوے رفتہ باز آید آب
بط گفت چو من و تو بہ گشتیم کباب دنیا پس مرگ من چہ دریا چہ سراب

ایں کوزہ چو من عاشق زارے بود است نمبر۵ در بند سر زلف نگارے بود است
ایں دستہ کہ در گردن او می بینی دستیست کہ بر گردن یارے بود است

پیش از من و تو لیل و نہارے بود است نمبر۶ گردندہ فلک نیز بکارے بود است
زنہار قدم بہ خاک آہستہ نہی کان مردمک چشم نگارے بود است

پر خون ز فراغت جگرے نیست کہ نیست نمبر۷ شیدا اے تو صاحب نظرے نیست کہ نیست
با آنکہ نداری سر سوداۓ کسے سوداۓ تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

در فصل بہار اگر بتے حور سرشت نمبر۸ پر می قدحے دہد مرا بر لب کشت
ہر چند بہ نزد عام بد باشد این از سگ بترم اگر کنم یاد بہشت

مے نوش کہ عمر جاودانی این است نمبر۹ خود حاصلت از دور جوانی این است

هنگام گل و مل است و یاران سرمست — خوش باش دمے که زندگانی این است
چون جان بلب آمد چه نشاپور و چه بلخ — نمبر۱۰ پیمانه چو پر شود چه شیرین و چه تلخ
مے نوش که بعد از من و تو ماہ بسے — از سلخ به غرہ آید از غرہ به سلخ

این قافلۂ عمر عجب می گذرد — نمبر۱۱ دریاب دمے که از طرب می گذرد
ساقی غم فرداے حریفاں چه خوری — پیش آر پیالۂ که شب می گذرد

آن قوم که سجادہ پرستند خرند — نمبر۱۲ زیرا که به زیر بار سالوس
دین اند ہمہ طرفہ تر که در پردۂ زہد — اسلام فروشند وز کافر ترسند

افسوس که سرمایہ زکف بیرون شد — نمبر۱۳ وز دست اجل بسے جگرہا خون شد
کس نامد ازان جہاں که پرسم از وے — کاحوالِ مسافران عالم چون شد

از گردش روزگار بہرے برگیر — نمبر۱۴ بر تخت طرب نشین بکف ساغر گیر
از طاعت و معصیت خدا مستغنی ست — بارے تو مراد خود ز عالم برگیر

عمر تو چه دو صد و چه سه صد چه ہزار — نمبر۱۵ زین کہنہ سرا برون برندت ناچار
گر باد شہے و گر گداے بازار — این ہر دو به یک نرخ بود آخر کار

گر گوہر طاعتت نسفتم ہرگز — نمبر۱۶ گرد گنه از چہرہ نہ رُفتم ہرگز
نومید نیَم ز بارگاہ کرمت — زیرا که یکے را دو نہ گفتم ہرگز

از حادثۂ زمان آئندہ مپرس — نمبر۱۷ وز ہرچه رسد چو نیست پاینده مپرس
این یک دمہ نقد را غنیمت میدان — از رفته میندیش وز آئندہ مپرس

از آتش آخرت نمیداری باک — نمبر۱۸ در آب ندامت نشدے غرق
چوں باد اجل چراغ عمرت به کشد — ترسم کہ ترا ز ننگ نپذیرد خاک

ورت کون جملہ نقش است وخیال نمبر۱۹ عارف نبود ہر کہ ندارد این حال
ین قدح بادہ بنوش وخوش باش   فارغ شو ازیں نقش وخیالات محال
ن ہمیشہ در بر مردم چہ کنم نمبر۲۰ در کردۂ خویشتن بدردم چہ کنم
کر زمن بد گزرانی بہ کرم   زاں شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

سعدی علیہ الرحمہ سے رباعیاں بھی ہیں ذیل میں کچھ رباعیان سعدی کی نذر ناظرین ہیں۔

رباعیات سعدی

نادان ہمہ جا با ہمہ خلق آمیزد نمبر۱ چوں غرفہ بہر چہ دید دست آویزد
با مردم زشت نام ہمراہ مباش   کز صحبت دیگراں سیاہی خیزد

بشنو بہ ارادت سخن پیر کہن نمبر۲ تا فہم کنی کار جہاں را سر و بن
خواہی کہ کسے راز سد بہ تو سخن   بنگر تو و ہر چہ آں نہ نیکوست مکن

تا کے بجمال و مال دنیا نازی نمبر۳ وقت است کہ برگ راہ عقبیٰ سازی
اے در گزشتہ وقت آنست کہ چاہئے   یک چند بتوبہ خواستگان پردازی

زانگہ کہ ترا بر من مسکین نظر است نمبر۴ آثارم از آفتاب مشہور تر است
گر خود ہمہ عیبہا بدین بندہ در است   ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است

دانی کہ چہ گفت زال با رستم گرد نمبر۵ دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد
دیدیم بسے آب ز سرچشمہ خورد   چوں بیشتر آمد شتر و بار ببرد

خیزم چو نماند بیش ازیں تدبیرم نمبر۶ خصم ار ہمہ شمشیر زند یا تیرم
گر دست رسد کہ آستینش گیرم   ورنہ بروم بر آستانش میرم

اُردو کی رُباعی نگاری

اردو میں جس طرح کوئی مدون نسخہ قطعات ابن یمین کے رنگ کا نہیں۔
اُسی طرح رباعیات عمر خیام کے طور کی بھی کوئی کتاب نظر نہیں آتی معلوم ہو
کہ شعرائے اُردو نے شعرائے فارسی کے برابر رباعی نگاری میں ترقی نہیں کی ہے
شعراء میں کوئی شاعر رباعی نگار عمر خیام کے درجہ کا نظر نہیں آتا ہے مرزا سودا او
صاحب نے رباعیاں لکھی ہیں مگر اُن کی رباعیاں اعلیٰ درجہ کی شاعری سے کمتر
دیتی ہیں۔ ذوق نے تو جو کچھ رباعیاں لکھی ہیں اُن میں بادشاہ وقت کی خوشامد کے
کوئی ایسا مضمون نہیں پایا جاتا ہے کہ جس کو اخلاق تمدن معاشرت معاش معاد
وغیرہ سے کسی طرح کا تعلق حاصل ہو۔ قریب قریب یہی کیفیت غالب کی رُبا
کی بھی ہے۔ نہایت جائے افسوس ہے کہ ذوق اور غالب سے نامی شاعروں
بھی اس صنف شاعری کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ بلکہ خوشامدانہ انداز تحریر سے
کو درجہ ابتذال تک پہنچا ڈالا، سچ ہے کہ شاعری کو درباری تعلق سے ہمیشہ
مترتب ہوا ہے، اگر کاش ذوق اور غالب کو درباری تعلق نہ ہوتا تو اُن کے
قصائد، قطعات اور رباعیات سے شاعری کو اس قدر ذلت نصیب نہ ہو
تب یہ ہر دو شاعران نامی آزادی کے ساتھ تصانیف معقول سے شاعری کو زینت
دیتے، ذیل میں کچھ رباعیاں خواجہ میر درد صاحب اور مومن خان کی نذر ناظرین
جاتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو رباعی نگاری کا مذاق حاصل تھا، مگر مو
خاں اس صنف شاعری سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ بہرحال اُن کی

عیوں سے کچھ رباعیاں چُن لی جاتی ہیں آخر میں چند رباعیاں میر انیسؔ صاحب
زا دبیر صاحب کی منسلک ہذا کی جاتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ ہردو بزرگوار
نگاری کے اعتبار سے بھی بہت قابل قدر ہیں بلکہ اُردو شعرا میں یہی حضرات
ہوں نے رباعی نگاری کی شرم رکھ لی ہے ؎

رُباعیات خواجہ میرؔ درد

ہے ہر چند تقدس بندا نمبر۱ مشکل ہے کہ حرص سے ہو دل برکندا
ہیں بھی اگل و شرب سے کب ہے نجات دوزخ کا بہشت میں بھی ہوگا دھندا

ہے کبھی جام و سبو دیکھا تھا نمبر۲ جو کچھ کہ نہیں ہے روبرو دیکھا تھا
دل کو اب غور جو کرتے ہے اے دردؔ کچھ خواب سا تھا وہ کہ کبھو دیکھا تھا

نہ دن کو بیقراری کے سبب نمبر۳ نے رات کو چین آہ وزاری کے سبب
نہ تھے ہم ان بلاؤں سے کبھو یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

رُباعیات مومن خان

نے وہ یاں نہ لائے افسوس افسوس نمبر۱ مرتے دم بھی نہ آئے افسوس افسوس
رہ گئیں دل کی حسرتیں دل ہی میں افسوس افسوس ہائے افسوس افسوس

ے شوق گناہگاری کب تک نمبر۲ اے تیرہ دروں سیاہ کاری کب تک
اپنے خدا کو باز آ بہر خدا اے دشمن دین بتوں سے یاری کب تک

ہاتھی یہ بس مرے ستانے کے لئے نمبر۳ گرمی تھی یہ آگ پہ لٹانے کے لئے

دشمن پہ نگاہ سرد مہری کے سبب — تم آگ ہوئے مرے جلانے کے لئے

رُباعیات میر انیسؔ

نمبر ۱

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے — یے زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے
مر مر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک — یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

نمبر ۲

راہی طرف عالم بالا ہوں میں — دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں
یارب ترا نام پاک جپنے کے لئے — گویا اک ہڈیوں کا مالا ہوں میں

نمبر ۳

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے — رخ سب سے پھر اکے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر — میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

نمبر ۴

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لئے — جرأت واجب ہے کجکلاہی کے لئے
لازم ہے کہ ہو اہل سخن تیز زبان — تلوار ضرور ہے سپاہی کے لئے

نمبر ۵

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے — جو چیز ہے کم اسے سوا سمجھا ہے
ہے بحر جہاں میں عمر مانند حباب — غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

نمبر ۶

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہے — آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے
نہ دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد — مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

نمبر ۷

ہر برگ سے قدرت احد پیدا ہے — ہر پھول سے صنعت صمد پیدا ہے
سینہ ہے بشر کا وہ محیط زخار — ہر ایک نفس سے جزر و مد پیدا ہے

نمبر ۸

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں — یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے — حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا نمبر۹ جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہوئے گا انیسؔ ہم ہوئیں گے اور قبر کا کونا ہوگا

کھینچے ہوئے سر کو تو کہاں پھرتا ہے نمبر۱۰ پیری میں بہ شکل نوجواں پھرتا ہے
غم ہے جہاں کا اس قدر تنگ و حقیر خم ہو کے زمیں پہ آسماں پھرتا ہے

یارب کبھی جلد وہ زمانہ ہووے نمبر۱۱ بندہ سوئے کربلا روانہ ہووے
لیکن یہ دعا ہے یا مجیب الدعوات جانا ہووے تو پھر نہ آنا ہووے

یے جا ہر کوشش و طلب کو پایا نمبر۱۲ اپنی اپنی غرض کا سب کو پایا
مطلوب ملا ابن ابی طالبؓ سے جب شاہ عرب ملے تو رب کو پایا

دم الفت حیدر کا جو بھرتا ہوں میں نمبر۱۳ حال آتا ہے دل کو وجد کرتا ہوں میں
ممکن میں صفات واجب اللہ اللہ کیا آگے کہوں خدا سے ڈرتا ہوں میں

ناکام بھی کامیاب ہو جاتا ہے نمبر۱۴ بے قدر فلک جناب ہو جاتا ہے
گر اک نظر مہر سے دیکھیں حیدرؑ ذرہ ابھی آفتاب ہو جاتا ہے

گر صورتِ دریا ہمہ تن جوش ہوں میں نمبر۱۵ لب خشک ہیں چشم تر ہے خاموش ہوں میں
کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا مانند حباب خانہ بر دوش ہوں میں

آئینۂ خاطر کی جلا ہے رونا نمبر۱۶ اور دیدۂ مردم کی ضیا ہے رونا
پوچھا جو علاج دل مسیحا نے کہا ہر درد کی دنیا میں دوا ہے رونا

عزت رہے یار و آشنا کے آگے نمبر۱۷ محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں چلیں یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

آنکھ ابر بہاری سے لڑی رہتی ہے نمبر۱۸ اشکوں کی ردا منہ پہ پڑی رہتی ہے

دونوں آنکھیں ہیں میری ساون بھادوں | یاں سارے برس ایک جھڑی رہتی ہے

نمبر۱۹
افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے | اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں | وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

نمبر۲۰
دنیا میں نہ چین ایک ساعت دیکھا | برسوں نہ کبھی روز فراغت دیکھا
راحت کا مکاں اُن کا گھر خانۂ عیش | دیکھا تو جہاں میں کنج عزلت دیکھا

نمبر۲۱
جنس ملح سخن منہ سے کوئی کم نکلے | ہر دم سینے سے آہ پرنم نکلے
روحی بفداک یا حسینؑ ابن علیؑ | نکلے تو محبت میں تری دم نکلے

نمبر۲۲
پیری آئی عذار بے نور ہوئے | یاران شباب پاس سے دور ہوئے
لازم ہے کفن کی یاد ہر وقت انیس | جو مشک سے بال تھے وہ کافور ہوئے

نمبر۲۳
کس منہ سے کہوں لائق تحسیں میں ہوں | کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں میں ہوں
ہوتی ہے حلاوت سخن خود ظاہر | کہتی ہے کہیں شکر کہ شیریں میں ہوں

نمبر۲۴
آدم کو عجب خدا نے رتبا بخشا | ادنیٰ کے لئے مقام اعلا بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایمان | اس ایک کف خاک کو کیا کیا بخشا

نمبر۲۵
دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے | غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرّہ | ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

نمبر۲۶
جس شخص کو عقبیٰ کی طلبگاری ہے | دنیا سے ہمیشہ اُسے بیزاری ہے
اک چشم میں کس طرح سمائیں دونوں | غافل یہ خواب ہے وہ بیداری ہے

نمبر۲۷
پیری سے بدن زار ہوا زاری کر | دنیا سے انیس اب تو بیزاری کر
کہتے ہیں زبان حال سے موئے سپید | ہے صبح اجل کوچ کی تیاری کر

نمبر ۲۸
کیا کیا دنیا سے صاحب مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

نمبر ۲۹
دنیا کو نہ جانو کہ دل آرام ہے یہ
اے پختہ مزاج طمع خام ہے یہ
ہاں سوچ کے پاؤں اس زمیں پر رکھو
چھٹتا نہیں پھنس کے جس سے وہ دام ہے یہ

نمبر ۳۰
کیوں زر کی ہوس میں در بدر پھرتا ہے
جانا ہے تجھے کہاں کدھر پھرتا ہے
اللہ رے پیری میں ہوس دنیا کی
تھک جاتے ہیں جب پاؤں تو سر پھرتا ہے

نمبر ۳۱
راحت کا مزہ عدو سے جانی نکلا
دل سے نہ کبھی غم نہانی نکلا
پیاسے رہے آکے چاہ دنیا پہ انیس
نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

رباعیات مرزا دبیر

نمبر ۱
میزان سخن سنج میں تلتا ہوں میں
فکر گہر نظم میں گھلتا ہوں میں
دل رہتا ہے بند قفل ابجد کی طرح
جب حرف شناس ہو تو کھلتا ہوں میں

نمبر ۲
جو روضہ میں بار یاب ہو جاتا ہے
وہ اوج میں لا جواب ہو جاتا ہے
جلتا ہے جو شب کو قبر حیدر پہ چراغ
وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے

نمبر ۳
حیدر نے دم بذل نہ کیا کیا بخشا
قطرے کے طلب گار کو دریا بخشا
قرباں مروت علی وقت اخیر
قاتل کو بھی شربت گوارا بخشا

نمبر ۴
بن بن کے ہزار بار آئی دنیا
پر چشم علی میں نہ سمائی دنیا
جس طرح گرایا تھا در خیبر کو
نظروں سے اسی طرح گرائی دنیا

نمبر ۵
جو مجلس ماتم میں یہاں روتا ہے
ہر فرد گنہ اس کے خدا دھوتا ہے

ثابت ہے، حدیثوں سے کہ یہ قطرۂ اشک — ہر زخم حسینؑ کی دوا ہوتا ہے

ہر چند ہزار سال آدم روئے — نمبر ۶ — یعقوبؑ بھی فرزند کو پیہم روئے

جس دم کیا حاسبانِ قدرت نے حساب — سجادؑ کے رونے سے بہت کم روئے

اس بزم کو دعویٰ ہے کہ جنت میں ہوں — نمبر ۷ — آنسو ہیں رواں کہ بحرِ رحمت میں ہوں

کہتا ہے یہ دل سے درہمِ داغِ حسینؑ — گنجینۂ مغفرت کی قیمت میں ہوں

یارب خلاقِ ماہ و ماہی تُو ہے — نمبر ۸ — بخشندۂ تاج و تخت شاہی تُو ہے

بے منت و بے سوال و بے استحقاق — دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تُو ہے

زہراؑ کی ولا میں ہند صادق نکلی — نمبر ۹ — کیا معتقدِ نجب صادق نکلی

زنداں میں جو شب کبھی آئی تھا شام میں غل — کاذب کے محل سے صبح صادق نکلی

میداں میں جب آئے شہ عرش پناہ — نمبر ۱۰ — بولا ابن سعد کیجیے بیعت یا شاہ

منہ پھیر کے حضرت نے یہ غصہ سے کہا — لا حول و لا قوۃ الا باللہ

تکلیف دکھاتا ہے زمانہ ہم کو — نمبر ۱۱ — دیتا ہے نہ دولت نہ خزانہ ہم کو

او گردشِ چرخ ہم سمجھتے ہیں تجھے — تو پیستا ہے جان کے دانہ ہم کو

ہے کشورِ دل کو فوجِ غم نے لوٹا — نمبر ۱۲ — اور شیشۂ صبر سنگِ غم سے ٹوٹا

ہے یاد رجب وہ ہے کہ اس میں شرف — نانا کی لحد چھٹی مدینہ چھوٹا

مثنوی

یہ وہ صنف شاعری ہے کہ مقفا اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے واسطے اشعار کی تعداد معین نہیں ہے ممکن ہے کہ چار شعر کی مثنوی ہو یا چار لاکھ کی مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شاعری کو حاصل ہے کسی اور صنف کو نہیں ہے۔ ہر طرح کے داخلی اور خارجی مضامین اس میں گنجائش پاتے ہیں۔ تب ہی تو جسیم اور ضخیم کتابیں شاہنامہ۔ سکندرنامہ

یوسف زلیخا وغیرہ کی سی اس میں لکھی جا سکتی ہیں، لاریب یہ وہ صنف شاعری ہے جس میں شاعر شاعری کا کمال حسبِ مراد دکھلا سکتا ہے، چنانچہ اس صنف شاعری میں دنیا کی بڑی بڑی منظوم تصنیفیں انجام کو پہنچی گئی ہیں عروضی ترکیبوں کو نظر انداز کر کے دیکھئے تو ہر زبان میں شاعری کا کمال اسی صنف میں آشکارا ہے، ہومر۔ ورجل ملٹن۔ فردوسی۔ بالمکی اور بیاس نے اسی صنف میں اظہار کمال کیا ہے، ہاں میر انیس صاحب اس صنف کے پابند نہیں رہے ہیں، اگر مرثیہ نگاری کے لئے یہ صنف مروّج شعراء ہوتی تو حضرت بھی کوئی نہ کوئی تصنیف ایلیڈ انیلیڈ پیریڈائز لاسٹ، شاہنامہ، رامائن اور مہابھارت کے رنگ کی چھوڑ جاتے، حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کے کمال نے مسدس نگاری کو اس درجہ تک پہنچا دیا ہے جس تک شعرائے بالا کی بدولت مثنوی نگاری پہنچ گئی ہے اس پر بھی نہایت قرین خوش مذاقی ہوتا اگر کوئی تصنیف منظوم بہ شکل مثنوی کتب بالا کے رنگ کی یادگار حضرت رہتی، ایسی تصنیف میر صاحب کے لئے کچھ مشکل نہ تھی مگر اس جانب تقاضائے ملکی سے اُن کو توجہ فرمائی کا موقع نہ ملا۔

جاننا چاہیئے کہ مثنوی نگاری صرف اس شاعر سے حسبِ مراد انجام پا سکتی ہے جس کو امور ذہنی اور معاملات خارجی کو بھی موزون کرنے کی صلاحیت معقول حاصل رہتی ہے وہ شاعر جو صرف امور ذہنی کو یا صرف معاملات خارجی کو حوالۂ قلم کر سکتا ہے مثنوی نگاری کی داد نہیں دے سکتا، آئندہ معلوم ہو گا کہ بہت سے ایسے شعراء گذرے ہیں کہ انھوں نے مثنوی نگاری کی ہے مگر اُن سے یہ کام پورے طور پر انجام نہیں ہو سکا ہے، ہر زبان میں انھیں شعراء نے حسبِ مراد مثنویاں

لکھی ہیں۔ جو داخلی اور خارجی دونوں طرح کے مضامین کی بندش پر پوری قدرت رکھتے تھے، مثنوی نگاری کے لئے شاعر کو بڑی اطلاع عام کی حاجت ہے اُسے معاملات عالم سے بہ حدّ طاقت بشریہ پورے طور پر باخبر ہونا چاہیئے اس کے ساتھ اسے مصور عالم بھی ہونا درکار ہے، اگر بندش مضامین میں اسے مصوری کی قدرت نہیں ہے، تو اس کی مثنوی نگاری لطف کمال نہیں دکھلا سکے گی:

مثنوی میں کیسے کیسے مضامین کی گنجائش ہے، مدات ذیل سے اس کی حقیقت ظاہر ہوگی:

نمبر ا۔ رزمی مضامین :-

اس کی مثال فارسی میں "شاہنامہ" انگریزی میں "پیریڈائز لاسٹ" یونانی میں "ائیلیڈ" اور "اڈیسی" لاطینی میں "اینیڈ" اور سنسکرت میں "رامائن" اور "مہابھارت" ہیں، اُردو میں کوئی مثنوی ان کتابوں کے رنگ کی نہیں ہے واضح ہو کہ رزمی مثنوی کے لئے ضرور ہے کہ جو قصہ منظوم کیا جائے وہ ایسا ہو کہ اخلاقی، تمدنی اور مذہبی اعتبارات سے کسی خاص قوم یا اقوام دنیا کے عام اغراض سے متعلق ہو، یہ سب کتابیں اسی اہم شکل کی ہیں، اب کوئی واقعہ بزرگ جو بوضع کتب بالا رزمی شاعری کے برتنے کے قابل نظر آتا ہے، واقعہ کربلا ہے، اگر فارسی یا اُردو کا کوئی شاعر گرامی اس واقعہ کے متعلق کوئی رزمی مثنوی لکھے تو اس کی تصنیف "شاہنامہ" "ایلیڈ" "اینیڈ" "پیریڈائز لاسٹ" "مہابھارت" اور "رامائن" کا جواب نکلے گی، اگر وہ حضرات جو مرثیہ نگاری کا شغل رکھتے

ہیں اس کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائیں تو کامیابی کی حالت
میں اُن کی تصنیف خالی ندرت سے نہ ہوگی۔ فقیر کی دانست میں
اس وقت وہ حضرات جو شہرت شاعری کی غرض سے مرثیہ نگاری
میں انہماک رکھتے ہیں کسی طرح کا نفع شاعری کو نہیں پہنچاتے
ہیں، ابتک اس عاجز کی نظر سے کسی متتبع میر انیسؔ کا ایسا مرثیہ گزرا جو
میر صاحب کے باندھے ہوئے مضامین سے علٰحدہ ہو کر کسی قسم کا
لطف خاص رکھتا ہو۔ اکثر تو یہی دیکھا کہ جن صاحب نے کچھ ابیج کی لی
لے آلے سب سر سے ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب نے
مسدس نگاری کی شکل میں آئندہ کے شعرا کے واسطے کچھ نہیں چھوڑ رکھا
ہے اب جو کسی کا مرثیہ چمکیلا نظر آئے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے لکھنے
والے نے میر صاحب کے مراثی سے ضرور اقتباس نور کیا ہے اور
اگر اس کی تحقیق کی جائے گی تو یہ بات روشن ہو جائے گی کہ حضرت ہی
کے کلاموں کی شعاع اُس میں ہر طرف جلوہ گر ہے ظاہر ہے کہ ایسی
مرثیہ نگاری شاعری نہیں ہے، نقالی ہے پس ایسی نقالی سے کوئی
نقال میر صاحب کا ہمسر نہیں ہو جائے گا۔ حضرت پر فوق لے جانا
تو محالات سے ہے المختصر جب مسدس نگاری کی شکل میں میر صاحب
نے رزمی شاعری کا خاتمہ کر دیا تو اب ضرور ہے کہ جو حضرات رزمی شاعری
کی طرف توجہ فرمائیں اس عروضی صنف کو چھوڑ کر اور کسی عروضی صنعت
کو رزمی شاعری کے برتنے کے واسطے اختیار فرمائیں، ظاہر ہے

کہ مثنوی کے سوا کوئی اور عروضی صنف نہیں ہے جس میں رزمی شاعری برتی جا سکتی ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اس صنف میں دنیا کے تمام بڑے بڑے رزمی معاملے حوالۂ قلم ہوتے گئے ہیں ؛

نمبر ۲ - بزمی مضامین :-

اس کی مثال فارسی میں یوسف زلیخا، ولیلیٰ مجنوں و دیگر عشقیہ مثنویاں ہیں، ساقی نامے اور شکار نامے بھی اسی مد میں داخل ہیں، کوئی شک نہیں کہ بزمی مثنویاں شعرائے فارس نے خوب لکھی ہیں جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا، اُن کی شاعری کے نقصانات بھی حوالۂ قلم کئے جائیں گے اس مد کی مثنویاں ہر زبان میں موجود ہیں انگریزی میں لارڈ بائرن سر والٹر اسکاٹ - الگزینڈر پوپ - مور اور بھی دیگر شعراء نے خوب خوب مثنویاں لکھی ہیں ان شعرائے فرنگ کا کمال یہی ہے کہ بندش مضامین تبعیت فطرت کے ساتھ کرتے ہیں - یہ خوبی فارسی اور اُردو کے مثنوی نگاروں میں کمتر پائی جاتی ہے ؛

نمبر ۳ - حکمت آموز مضامین :-

اس کی مثال بوستان ہے اس مد کی مثنویاں اور زبانوں میں بھی ہیں جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا ؛

نمبر ۴ : تصوف آموز مضامین :-

اس کی مثال مثنوی ملائے روم ہے اس مد کی مثنویاں یورپین زبانوں میں کم ہیں لیکن اگر تصوف علم اخلاق کا مترادف سمجھا جائے اور

جیساکہ اس کو مترادف سمجھنا چاہیئے تو ایسی حالت میں ایسی مثنویوں کی
قلت یورپین زبانوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔

نمبر ۵۔ متفرق مضامین: — اس کی مثالیں آئندہ حوالہ قلم ہوں گی؛
واضح ہو کہ رزمی اور بزمی مثنویوں کا کمال یہ ہے کہ ان کی بندش مضامین
اس درجہ کی سلجھی ہو کہ قریب قریب ڈراما کا لطف پیدا کر سکے لاریب وہی
مثنوی ڈراما کا رنگ پیدا کر سکتی ہے جو فطری مضامین اور فطری ترکیبوں پر مشتمل ہوگی ہومر
کی اِلیَڈ کا یہی طور ہے کہ قریب قریب ڈراما کی خوبیوں کو پہنچ گئی ہے اور حقیقت
حال بھی یہی ہے کہ یونان میں ڈراما کا ایجاد اسی کتاب کی بنیاد پر ظہور میں آیا۔ راقم
قبل میں ایجاد ڈراما کے اسباب حوالۂ قلم کر چکا ہے مختصر رزمی اور بزمی مثنویوں
کو اس قدر نیچرل ہونا چاہیئے کہ اگر اُن کے مضامین ڈراما کی شکل میں بندش پائیں تو
صنف شاعری میں آسانی اور لطافت کے ساتھ در آسکیں، حکمت آموز اور تصوف
آموز مثنویوں کے لئے یہ امر درکار ہے کہ مسلم اور منقح مسائل حکمت و تصوف سے
اُن کا کوئی مضمون خلاف نہ ہو اور دلیل و استدلال میں جھول واقع نہ ہو، ان قسموں
کی مثنویوں میں بحد امکان شاعر کو مبالغہ پردازی سے تمامتر احتیاط لازم ہے علاوہ
اس کے طریقہ بیان ایسا ہو کہ سامع کے دل پر حسب مراد اثر پیدا کر سکے متفرق
مضامین کی مثنویوں کو بھی فطرتی بیانات سے خالی ہونا نہیں چاہیئے علاوہ اس کے
ان کے مضامین کو مفید عام ہونا ضروری ہے فحش گوئی اور ہذیان سرائی کو مثنوی نگاری
سے کوئی تعلق نہیں ہے ؛

فارسی کی مثنویاں

رزمی مثنویاں۔ فارسی میں رزمی مثنویاں بکثرت موجود ہیں۔ جیساکہ قبل ازیں بہت سی ایسی مثنویاں نام بنام مذکور ہو چکی ہیں لیکن ان سبھوں میں ممتاز ترین مثنوی شاہنامہ ہے پس اغراض کتاب ہٰذا کے لئے راقم اس کتاب مبسوط کی نسبت اپنے خیالات ذیل میں گزارش کرتا ہے۔

شاہنامہ فردوسی

حکیم ابوالقاسم فردوسی بہ حیثیت مثنوی نگار۔ فردوسی کی شہرت اس کے شاہنامہ کی بدولت ہے جس کا مذکور ہومر کی ایلیڈ ورجل کی انیڈ ملٹن کی پیریڈائز لاسٹ والمکی کی رامائن بیاس کی مہابھارت اور میر انیس کے مراثی کے ساتھ زبان اہل اطلاع پر آتا ہے۔ شاہنامہ اہل عجم کی ایک قومی رزمی کتاب ہے۔ شاہنامہ کی ساخت ایلیڈ انیڈ پیریڈائز لاسٹ مہابھارت اور مراثی میر انیس سے اس طور پر علیٰحدہ ہے کہ یہ سب رزمی تصنیفات علیٰحدہ علیٰحدہ خاص خاص واقعات سے تعلق رکھتی ہیں اور شاہنامہ ایک منظوم تاریخ کا رنگ رکھتا ہے یعنی اس میں کسی واقعہ خاص کا ذکر نہیں ہے۔ یہ کتاب ملک ایران کی ایک فسانہ نما تاریخ ہے۔ اس کتاب میں کیومرث سے کر عربوں کے ایران کو فتح کرنے تک کے حالات درج ہیں۔ لاریب پوری تاریخی حیثیت اس کتاب کو حاصل نہیں ہے اس لئے کہ اس میں غیر فطری امور بے حد داخل ہیں۔ مثلاً چند بادشاہوں اور پہلوانوں کی عمریں عمر بنی آدم سے دہ چند زیادہ درج پائی جاتی ہیں۔

ی طرح دیو وغیرہ کے افسانے حوالۂ قلم دیکھے جاتے ہیں، کوئی شک نہیں رستم ایک
پہلوان تھا مگر شاہنامہ کا رستم جو ہے بقول فردوسی وہ فردوسی کا رستم ہے

منش کردہ ام رستم داستان وگرنہ یلے بود در سیستان

مختصر یہ ہے کہ یہ کتاب بحیثیت مجموعی نہ اس کو تاریخی پایہ حاصل ہے اور نہ اس کا انداز رزمی
تصنیفات بالا کا ہے۔ اس کتاب میں بہت سے رزمی معاملات اس طور پر جگہ پاگئے
ہوئے ہیں کہ خاص تمام واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اور علیحدہ علیحدہ رزمی شاعری
کے برائے خود نمونے ہیں مثلاً نخستین جنگ رستم با افراسیاب، جنگ رستم با سہراب، جنگ
رستم با برزو، جنگ رستم با اسفندیار وغیرہ وغیرہ مگر خود معاملات فرداً فرداً ایسے واقعات
بزرگ نہیں ہیں کہ جو ایلیڈ، اینیڈ، پیریڈائز لاسٹ، راماین، مہابھارت اور مراثی انیس
کے معاملات سے اہم ہوں یہ افتاد خود ایک ایسی ہے کہ جو فردوسی کی رزم نگاری
و بلند پائیگی کا سرمایہ پورے طور پر نہیں بخش سکتی ہے ایسی حالت میں بمقابلہ ہومر
ورجل ملٹن والمکی بیاس اور میر انیس کے ان شعرائے فردوسی کا سبقت کا لے جانا
یا ان کا مدمقابل ہونا دشوار نظر آتا ہے ظاہر ہے کہ جس قدر کسی رزمی تصنیف کا
سرمایہ عمدہ ہوگا وہ تصنیف بھی اسی قدر عمدہ ہوگی بشرطیکہ شاعر بھی عمدگی سے سرمایہ سے
کام لینے کی عمدہ صلاحیت رکھتا ہو۔ واقعہ کربلا کا معاملہ ایک عمدہ سرمایہ ہے۔
لاریب رزمی تصنیف کے لئے اس سرمایہ سے بہتر دوسرا سرمایہ نصیب نہیں ہو سکتا
اور اس سرمایہ سے کام لینے کے لئے میر انیس ہی شاعر بھی درکار ہے بالمختصر فردوسی
کو سرمایہ حسب مراد کے نہیں حاصل رہنے سے شعرائے بالا سے مقابلہ کا اچھا
موقع نظر نہیں آتا ہے یہ تو حالت موجودگی سرمایہ کی ہے لیکن اگر تھوڑی دیر کے

لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ سرمایہ کلام فردوسی کا شعرائے بالا کے سرمایہ کلام کے برابر ہے تو بھی فردوسی کو شاعری کی حیثیت سے شعرائے بالا کے ساتھ ہمپائیگی نہیں حاصل ہے اور شعرائے بالا سے ہومر کو انتخاب کر کے اگر ہومر کے ساتھ فردوسی کا موازنہ اختیار کیا جائے تو ہومر کا پلہ گراں ثابت ہوگا۔ یہ صرف اس بنیاد پر کہ ہومر میں کیرکٹر نگاری کی طاقت فردوسی سے بہت زیادہ دیکھی جاتی ہے شاعر کیرکٹر نگار نہیں ہو سکتا. جب تک کہ جزئیات کے بیانات پر اس کو پوری قدرت نہ ہو۔ ہومر کو یہی قدرت فردوسی کے مقابل میں زیادہ تھی، میں اپنے بیان کی توضیح تحریر ذیل سے کرتا ہوں.

ہومر کی شاعری کی بحث جلد اول میں آچکی ہے اور اس جلد میں اس کی تصنیف جس کا نام ایلیڈ ہے مذکور ہو چکی ہے اس ایلیڈ میں بہت سے مرد و زن کے بیانات داخل ہو گئے ہیں اسی طرح پر شاہنامہ میں بھی بہت سے مرد و زن کے مذکور آتے گئے۔ مثلاً ایلیڈ میں ذکور طبقہ میں پیرآیم پیرس ہکٹر اکلیز وغیرہ وغیرہ اور اناث میں ہیکوبا ہلن انڈرومیکی وغیرہا وغیرہا۔ اسی طرح شاہنامہ میں سام نریمان زال رستم گودرز گیو بیژن طوس گستہم وغیرہ وغیرہ طبقہ ذکور میں اور رودابہ سودابہ تہمینہ فرنگیش منیژہ وغیرہا وغیرہا طبقہ اناث میں۔ ہومر نے اپنے بیانات مرد و زن میں ہر فرد کے کیرکٹر یعنی امور خاصہ کو اس خوبصورتی سے حوالہ قلم کیا ہے کہ ہر فرد ایک دوسرے سے اس کے مختصات کی وجہ سے صاف صاف علیحدہ معلوم ہوتا ہے یعنی خوبی بیان یہ ہے کہ ذکور طبقہ کا ہر شخص مثلاً پرایم پیرس ہکٹر اکلیز وغیرہ وغیرہ اپنے امور خاصہ کے باعث ایک دوسرے سے ممتاز طور پر ممیز ہوتا ہے اور اسی طرح اناث میں سے ہر عورت مثلاً ہیکوبا ہلن انڈرومیکی وغیرہا وغیرہا اپنے کیرکٹروں کی بدولت ایک دوسرے

سے علیحدہ نظر آتی ہے یہی چیز ہے جس کی کمی فردوسی کو ہومر کے برابر ہونے نہیں دیتی ہے اور یہی چیز ہے کہ جو میر انیس کو ہومر سے مرجح کیئے دیتی ہے۔ میر انیس کی کیرکٹر نگاری اُس مرحوم کی ڈرمی شاعری کے بیان میں ذکر پائے گی۔ بالمختصر جس وضاحت امتیازی کے ساتھ ہومر نے اپنے فسانہ کے افراد کا بیان حوالہ قلم کیا ہے فردوسی اپنی تصنیف کے افراد کو اس قدرت کے ساتھ احاطۂ تحریر میں نہیں لا سکتے ہیں۔ شاہنامہ کے پڑھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سام کی شجاعت سے نریمان کی شجاعت کس طور پر علیحدہ رنگ رکھتی ہے امور خاصہ طوس اور گستہم کے کیا تھے، گودرز اور سام میں کیا فرق تھا۔ پیل سُم اور گیو کس کس رنگ کے شجاع تھے، بہمن اور پشوتن میں کیا امتیازی بات تھی۔ فرامرز اور گیو کے امتیازی کیرکٹر کیا تھے خود رستم کے امور خاصہ بہت وضاحت کے ساتھ نہیں بیان ہو سکے ہیں روئین تنی کے مضمون سے علیحدہ ہو کر رستم اسفندیار سے کیونکر ممیز ہوتا ہے۔ سہراب اور برزو کے کیرکٹر کا فرق مطلق نہیں دکھلایا گیا ہے اسی طرح عورتوں کے امور خاصہ ممتاز طور پر حوالہ قلم نہیں کیئے گئے ہیں رودابہ اور تہمینہ یا منیژہ اور فرنگیش کیونکر ایک دوسری سے کیرکٹر کے اعتبار سے پورے طور پر ممیز کی جا سکتی ہیں، شاہنامہ سے کچھ پتا نہیں لگتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کو امور عامہ کے بیان کی بڑی قدرت تھی مگر امور خاصہ کے بیان میں اُسے حسب مراد دستگاہ نہ تھی جو شاعر امور خاصہ کے بیان پر قدرت رکھتا ہے وہی کیرکٹر نگار ہوتا ہے کیرکٹر نگاری ڈرمی شاعری کی جان ہوتی ہے، اس قدرت کی بدولت شاعر کی ڈرمی تصنیف ڈراما کا عالم پیدا کرتی ہے چنانچہ ہومر کی تصنیف ڈراما کے ایجاد کا وسیلہ ہوئی، جو شاعر کیرکٹر نگار نہیں ہے

ڈراما نگار نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کو امور عامہ کے بیان میں پوری صلاحیت دیکھی جاتی ہے مثلاً جب یہ شاعر گرامی مضمون شجاعت کو حوالۂ قلم کرتا ہے تو شجاعت کو پوری قابلیت کے ساتھ احاطۂ تحریر میں در لاتا ہے۔ مگر ہر شجاع کے انداز شجاعت کو علیحدہ علیحدہ نہیں دکھلا سکتا ہے یہی حال اور مضامین کا بھی ہے مثلاً اس شاعر کے حسن کا بیان بھی امر عام کی حیثیت سے لاجواب ہوتا ہے مگر افراد کے حسن کے مختصات کی تحریر کا انجام اس سے حسب مراد رنگ پر عمل میں نہیں آتا ہے۔ صاحب شاہنامہ تہمینہ کے حسن بیان میں یوں فرماتے ہیں ؛

دو ابرو کمان و دو گیسو کمند ۔ بقامت بکر دار سرو بلند

یہ ایسی عام تعریفیں حسن کی ہیں کہ ہر محبوب دلکش کی شان میں کہی جا سکتی ہیں یہ تعریف تہمینہ کو فرنگیش یا منیزہ سے ممیز نہیں کر سکتی ہے، لاریب فردوسی کو کیرکٹر نگاری کی بہت صلاحیت حاصل نہ تھی یہی لئے اس کے رزمی معاملات سب کے سب ایک ہی انداز کے نظر آتے ہیں اور اس عدم جدت کے باعث ہومر کے رزمی معاملات کے . . . . . اعتبار سے کمتر دل آویزی رکھتے ہیں فردوسی کا ایک بیان جنگ پڑھ کر طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔ دوسرا بیان جنگ چونکہ اول بیان جنگ کے طور کا ہوتا ہے۔ دوسرے کے پڑھنے سے کوئی لطف تازہ نہیں اٹھتا ہے اگر فردوسی کا شاہنامہ کیرکٹر نگاری کی خوبیاں رکھتا تو ایران میں ڈراما نگاری رواج پا جاتی۔ جاننا چاہیئے کہ فردوسی کا شاہنامہ وہ کتاب ہے جو فارسی کے اصناف شاعری کی جڑ ہے۔ جیسا کہ راقم الحروف سابق میں عرض کر چکا ہے لیکن ڈراما نے جو اس کتاب کے ذریعہ سے رواج نہیں پایا

اس کا سبب یہی ہے کہ یہ کتاب کیرکٹرنگاری کی خوبیوں سے بہت کچھ محروم ہے برخلاف اِس کے ایلیڈ کا معاملہ ہے کہ اس کیریکٹرنگاری کی بدولت ڈرامانگاری بھی دیگر اصناف شاعری کی طرح یونان میں وجود میں آئی ؎

نخستین جنگ رستم با افراسیاب

انتخاب از شاہنامہ فردوسی

چو رستم بدید آنکہ قارن چہ کرد
چہ گونہ بود ساز جنگ و نبرد

چہ پوشد کجا بر فراز درفش
کہ پیداست تابان درفش بنفش

نشاں دہ کہ بیکار سازم بدو
میان یلان سر فرازم بدو

بپیش پدر شد بپرسید ازوے
کہ بامن جہاں پہلوانا بگوے

کہ افراسیاب آں بداندیش مرد
کجا جائے گیرد بدشت نبرد

اگر یار باشد مرا ہور و ماہ
کشانش بیارم بہ نزدیک شاہ

مرا جز بدو نیست امروز جنگ
من و گرز و میداں و پور پشنگ

من امروز بیند کمرگاہ او
بگیرم کشانش بیارم برو

بفرمان جاں آفریں یک خدائے
اگر کوہ باشد برآرم ز جائے

بہ بندم بیارم بر کیقباد
مراں بد کنش مرد بیراہ و داد

بدو گفت زال اے پسر گوش دار
یک امروز با خویشتن ہوش دار

کہ آں ترک در جنگ نر اژدہا ست
دم آہنج و در کینہ ابر بلاست

درفشش سیاہ است و خفتاں سیاہ — ز آہنش ساعد ز آہن کلاہ
ہمہ روئے آہن گرفتہ بزر — درفشِ سیہ بستہ بر خود سر
بہمیجا کہ گرد و دلاور بود — بہ رزم اندرش دہ برابر بود
بہ یکجائے ساکن نباشد بجنگ — چنیں است آئین پور پشنگ
نہنگ او ز دریا برآرد بدم — نہ ہشتاد رش نیست بالاش کم
ازو خویشتن را نگہدار سخت — کہ مرد دلیر است پیروز بخت
شود کوہ آہن چو دریائے آب — اگر بشنود نام افراسیاب
بدو گفت رستم کہ اے پہلوان — تو از من مدارا ایچ رنجہ رواں
جہاں آفرینندہ یار من است — دل و تیغ و بازو حصار من است
اگر اژدہا باشد و دیو نر — بیارمش بگرفتہ بند کمر
بہ بینی کنوں در صف کارزار — کزاں شاہ جنگی برآرم دمار
بدانگونہ یادے برآیم بجنگ — کہ بر وے بگرید سیاہ پشنگ
برانگیخت آں رخش روئینہ سم — برآمد خروشیدن گاؤ دم
دماں رفت تا سوئے توران سپاہ — یکے نعرہ زد شیر لشکر پناہ
چو افراسیابش بہ ہاموں بدید — شگفتند زاں کودک نارسید
ز گردان بہ پرسید کیں اژدہا — بدیں گونہ از بند گشتہ رہا
کدام است کیں را ندانم بنام — یکے گفت ایں پور دستان سام
بود رستمش نام و بس سرکش است — گہ جنگ چوں آب و چوں آتش است
نہ بینی کہ با گرز سام آمد است — جوان است و جویائے نام است
بہ پیشش رسید آمد افراسیاب — چو کشتی کہ موجش برآرد در آب

چو رستم ورا دید بفشرد ران — بگردن بر آورد گرز گران
چو تنگ اندر آورد با او زمین — فرو کرد گرز گران را به زین
چو افراسیابش بدانگونه دید — بزد چنگ و تیغ از میاں بر کشید
زمانے بکوشید با پور زال — تهمتن برافراخته چنگ و بال
به بند کمرش اندر آویخت چنگ — جدا کردش از پشت زین پلنگ
همی خواست بردن به پیش قباد — وز آن جنگ روز نخستینش یاد
ز هنگ سپهدار و چنگ سوار — نیامد دوال کمر پایدار
گسست و بخاک اندر آمد سرش — سواران گرفتند گرد اندرش
تهمتن فرو برد چنگ دراز — ربوده از سرش تاج آں سرفراز
به یکدست رستم کمر مانده بود — بدست دگر تاج از سر ربود
سپهبد چو از چنگ رستم بجست — بخائید رستم همی پشت دست
چرا گفت نه گرفتمش زیر کش — همی بر کمر ساختم پنجه اش
چو گردان ایران همه تن بتن — برفتند نزدیک آں پیلتن
چو قارن چو گشواد و گردان همه — بر رستم شدند آفرین خواں همه
تهمتن یکے را بر خویش خواند — همه کار رفته بدو باز راند
بگفتا گرفتم کمربند شاه — بداں تا بیارم به ایران سپاه
گسسته شد از هم کمربند وے — بیفتاد از دست پیوند وے
چو بگسست از خاک آں پیکرش — چو خورشید رخشنده تاج سرش
ربودم به توفیق جان آفرین — بزودی برش نزد شاه گزین

که تا برکشم تیغ تیز از میان | کنم رستخیزے به تورانیان
چو آواز زنگ آمد از پشت پیل | خروشیدن کوس از چند میل
یکے مژده بردند نزدیک شاه | که رستم بدرید قلب سپاه
ببند سپهدار ترکان رسید | درفش سپهدار شد ناپدید
گرفتش کمربند و افگند خوار | خروشے برآمد ز ترکان نزار
گرفتند گردش دلاور سران | پیاده ببردندش آں سروران
سپهدار ترکان چو شد زیردست | بیکے بارۂ تیز تک اندر نشست
پس انگاه راه بیابان گرفت | سپه را رہا کرد و خود جان گرفت
چو ایں مژده بشنید از و کیقباد | بفرمود تا لشکرش ہمچو باد
بیک باره بر خیل توران زنند | برو بیخ الیشاں زبن بر کنند
زجاے اندر آمد چو آتش قباد | بجنبید لشکر چو دریا ز باد
ز دست دگر زال و مہراب شیر | برفتند بر خاش جو و دلیر
برآمد خروشیدن دار و گیر | درخشیدن خنجر و زخم تیر
بر آں ترگ زریں و زریں سپر | غبین شد سر از چاک چاک تبر
تو گفتی که ابرے برآمد ز گنج | ز شنجرف نیرنگ زد بر ترنج
دو لشکر بیک بارگی آویختند | تو گفتی بهم اندر آمیختند
غریویدن مرد و غرنده کوس | ہمی کرد بر رعد غراں فسوس
ز آسیب خنجران پولاد چنگ | دریده دل شیر و چرم پلنگ
زمیں کرده یدسرح رستم بجنگ | یکے گرزۂ گاو بیکر بچنگ

بہر سو کہ مرکب بر انگیختے — چو برگ خزاں سر فرو ریختے
بہ شمشیریان چو بگذاشتے دست — سر سر فرازاں ہمیکرد پست
اگر بر زدے بر سر آں سرفراز — بدو نیمہ گردیش با اسپ و ساز
چو شمشیر بر گردن افراختے — چو گواز سواران سر انداختے
ز خون دلیراں بدشت اندرون — چو دریا زمیں موج زن شد ز خون
ہمہ روئے صحرا سر و دست و پا — بزیر سم اسپ جنگ آزما
ز سم ستوراں دراں پہن دشت — زمیں شد شش و آسماں گشت ہشت
فرو رفت بر رفت روز نبرد — بماہی نم خوں و بر ماہ گرد
بزور نبرد آں یل ارجمند — بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
برید و درید و شکست و بہ بست — یلاں را سر و سینہ و پا و دست

بزمی مثنویاں:- اس قسم کی مثنویاں فارسی میں بہت ہیں۔ نظامی، امیر خسرو، خواجہ کرمانی۔ جامی، ہاتفی، مکتبی، ہلالی عرفی فیضی وغیرہ وغیرہ نے بہت سی بزمی مثنویاں لکھی ہیں ان سب شعراء کی مثنویاں پر ریویو کی گنجائش اس کتاب میں نہیں ہے راقم الحروف مولانا نظامی کی اس مثنوی سے جس کا نام خسرو شیریں ہے اور بھی جامی کی زلیخا سے کچھ ذیل میں درج کرتا ہے:

در بزم خسرو پرویز با شیریں وصف بہاری فرماید

چو پیر سبز پوش آسمانی — ز سبزہ بر کشد صبح جوانی
جوانا نرا و پیراں را دگر بار — بسر سبزی در آید سرخ گلنار

گل از گل تخت کاوسی بر آرد — بنفشه پر طاوسی بر آرد
بسا مرغا که عشق آوازه گردد — بسا عشق کهن کان تازه گردد
چو خرم شد به شیرین جان خسرو — جهان می کرد عهد خرمی نو
چو می خرم نهاده خرمی دوست — ز گلها بر درید از خرمی پوست
گل از شادی علم در باغ میزد — سپاه فاخته بر زاغ میزد
سمن ساقی و نرگس جام در دست — بنفشه در خمار و سرخ گل مست
صبا برقع کشاده ساوگان را — صلا در داده کار افتادگان را
شمال انگیخته هر سو خروشے — زده بر گاو چشمے پیل گوشے
زمین نطع شقائق پوش گشته — شقائق مهد مرزن گوش گشته
سهی سرو از چمن قامت کشیده — ز عشقش لاله پیراهن دریده
بنفشه تاب زلف افگنده بر دوش — کشاده یاد نسرین را بنا گوش
عروسان ریاحین دست بر روئے — شگرفان شگوفه شانه در موئے
نموده ناف خاک آبستنیها — ز ناف آورده بیرون رستنیها
هوا بر سبزه گوهر باگسسته — زمرد را به مروارید بسته
غزال و شیر مست از دلنوازی — به گرد سبزه با ما در ببازی
تذروان بر ریاحین پر فشانده — ریاحین بر تذروان سر فشانده
ز هر شاخے شگفته نو بهارے — گرفته هر گلے بر کف نثارے
صبا از سبزه در سر باغ در اغے — ز گل افروخته هر دم چراغے
گل از هر منظر نظاره کرده — قبائے سرخ را صد پاره کرده

درم ریزہ شدہ ہر شاخسارے　　ز سر ہر یک جدا کردہ نثارے
بطرف ہر چمن سروے چمانہ　　بہر جوے شدہ آبے روانہ
صنوبر بر سر سنبل نشستہ　　چو مستان در میان گل نشستہ
چنین فصلے بدیں عاشق نوازی　　خطا باشد خطا بے عشق بازی
خرامش خسرو و شیریں شب و روز　　بہر نزہت گہے شاد و دل افروز
گہے خوردند مے در مرغزارے　　گہے چیدند گل در کوہسارے

واضح ہو کہ مولانا نظامی ایک معروف مثنوی نگار ہیں اور بحیثیت مجموعی فارسی کے ایک مستند شاعر ہیں اس پر بھی بہت بڑے فطرت نگار شاعر نہیں معلوم ہوتے۔ اشعار بالا میں بہار کے وصف منظوم فرماتے ہیں نظم کا اسلوب کیا شک ہے کہ بہت اچھا ہے مگر عمدہ بیان کسی بہاری سینری کا حوالۂ قلم نظر نہیں آتا ہے وہی گل و صبا و سنبل کی بندش غیر فطری انداز کے ساتھ بالا میں پائی جاتی ہے، جیسا کہ اکثر فارسی کی مثنویوں میں دیکھی جاتی ہے۔ خارجی مضامین کی بندش ہم فطری ترکیب کے ساتھ جیسا کہ سر والٹر کی لیڈی آف دی لیک میں دیکھتے ہیں کسی فارسی کی مثنوی میں نہیں دیکھتے راقم الحروف کی دانست میں خارجی مضامین جس قدر فطری انداز کے ساتھ میر حسن کی مثنوی میں بندش پاتے گئے ہیں فارسی کی کوئی مثنوی یہ ترکیب بندش کی نہیں رکھتی فارسی کی تمام بڑی مثنویوں کے مقابل میں یہ اردو کی مثنوی بہت زیادہ نیچرل پیرایہ بیان رکھتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے مثنوی نگار شعرا عموماً فطرت نگاری کا کم مذاق رکھتے ہیں ان کی ساری تصنیفیں نیچرل معاملات سے کم و بیش طور پر علیحدگی دکھلاتی ہیں جہاں دیکھو مبالغوں کی بھرمار ہے یا اسی طرح کے مصنوعی اندازوں سے ان کے کلام بھرے ہوئے ہیں فارسی کی شاعریاں عام طور پر اس

نامطبوع پیرایہ سے بدنما ہورہی ہیں صرف مثنوی نگاری ہی کا یہ طور نہیں ہے اب کے شعراء اگر مصلح مذاق کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائیں تو فارسی کی شاعری ان کی اس توجہ فرمائی سے بہت کچھ فائدے اٹھا سکے گی۔ ذیل میں کچھ اشعار مولانا جامی کی زلیخا سے نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

خواب دیدن یوسف سجدۂ آفتاب و ماہتاب و یازدہ ستارہ و استماع اخوان و ازدیاد حسد ایشاں

خوش آں کہ بند صورت باز رستہ — ز سحر چشم بنداں چشم بستہ

دلش بیدار و چشمش در شکر خواب — ندیدہ کس چنیں بیدار و در خواب

بپوشیدہ ز ناپائندہ دیدہ — ولے پوشیدۂ آئندہ دیدہ

شبے یوسف بہ پیش چشم یعقوب — کہ پیش او ز چشمش بود محبوب

بخواب خوش نہادہ سر ببالیں — بخندہ لعل نوشین کرد شیریں

ز شیریں خندہ آں لعل شکر خند — بدل یعقوب را شورے در افگند

چو یوسف نرگس سیراب بکشاد — چو بخت خویش چشم از خواب بکشاد

پدر گفت اے شکر شرمندۂ تو — چہ موجب داشت شکر خندۂ تو

بگفتا خواب دیدم مہر و مہ را — درخشندہ کواکب یازدہ را

کہ یکسر داد تعظیمم بدادند — بسجدہ پیش رویم سر نہادند

پدر گفتا کہ بس کن ایں سخن بس — مگو ایں خواب را زنہار با کس

مباد این خواب را اخوان بدانند ‌ ‌ ‌ به بیداری صد آزارت رسانند
ز تو در دل هزاران غصّه دارند ‌ ‌ ‌ درین غصه کجیت فارغ گذارند
نیارند از حسد این خواب را تاب ‌ ‌ ‌ که بس روشن بود تعبیر این خواب
پدر کرد این وصیت لیک تقدیر ‌ ‌ ‌ بیاید بگسلد زنجیر تدبیر
بیک کس گفت یوسف آن فسانہ ‌ ‌ ‌ فتاد آن را با اخوان در میانہ
شنیدستی که هر سر کز دو بگذشت ‌ ‌ ‌ باندک وقت ورد هر زبان گشت
چه خوش گفت آن نکوگوی نکوکار ‌ ‌ ‌ که سر خواهی سلامت سر نگهدار
چو وحشی مرغ از قید قفس جست ‌ ‌ ‌ دگر نتوان بدستان پائے او بست
چو اخوان قصۂ یوسف شنیدند ‌ ‌ ‌ ز غصّه پیرهن بر خود دریدند
که یارب چیست در خاطر پدر را ‌ ‌ ‌ که نشناسد ز نفع خود ضرر را
نمی داند که از طفلے چہ آید ‌ ‌ ‌ که طفلی جز طفیلے را نشاید
بهر یک چند پا قدر دروغے ‌ ‌ ‌ دهد زان گوهر خود را فروغے
خورد آن پیر مسکین زان فریبے ‌ ‌ ‌ شود از صحبت آن نشکیبے
کند قطع نکو پیوندی ما ‌ ‌ ‌ برد مهر پدر فرزندی ما
پدر کر دست زینسان سربلندش ‌ ‌ ‌ ببیند این قدر حشمت پسندش
هوس دارد که ما از تیرگی پاک ‌ ‌ ‌ بسجده پیش او افتیم بر خاک
نه تنها ما که مادر با پدر هم ‌ ‌ ‌ نباید جاه جوئی این قدر هم
پدر را ما خریداریم نے او ‌ ‌ ‌ پدر را ما هوا داریم نے او
اگر روز است در صحرا شبانیم ‌ ‌ ‌ دگر شب خانہ اش را پاسبانیم

براعدا قوت بازو ولیش از ما است — براحباب آب روئے بیش از ماست
بجز جبلت گری انسے چہ و بد است — کز نسیاں بر سر ما بر گزید است
بیا تا کار خود با چارہ سازیم — سر راہش تواں آوارہ سازیم
چو با ما بر سر غمخوارگی نیست — دوا سے او بجز آوارگی نیست
بباید چارہ سازی امیال لبست — زرفتہ اختیار چارہ از دست
چو خارے بر دو بداز شو بختے — بباید کند ناگشتہ درختے
بقصد چارہ سازی عہد بستند — بعزم مشورت یکجا نشستند

اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ خواب حضرت یوسف علیہ السلام کا تورات میں اور بھی قرآن شریف میں مندرج ہے لاریب مولانا جامی نے اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ منظوم فرمایا ہے یہ مثنوی جامی کی ایک دلکش پیرایہ رکھتی ہے فردوسی کی یوسف زلیخا ہرگز اس کو نہیں پہنچتی ہے فردوسی نے اپنی مثنوی کے لئے وہی رزمی بحر اختیار کی ہے جو شاہنامہ کی ہے۔ اور خلاف تقاضائے قصہ یوسف زلیخا بیانات کا انداز بھی رزمی رکھا ہے فردوسی کے انداز بیان کی بدولت حضرت یوسف رستم نما معلوم ہوتے ہیں ؛

حکمت آموز مثنویاں۔ یہ مثنویاں ایک بکار آمد قسم شاعری کی ہیں اس میں مسائل علم الاخلاق، تدبیر المنزل اور سیاستہ المدن کے منظوم پیرایہ میں جوا کثر ہوتے ہیں مثال اس قسم کی مثنوی کی سعدی علیہ الرحمہ کی بوستان اور حضرت فریدالدین عطار کا پندنامہ ہے۔ انہیں دونوں کتابوں سے بہ سبیل انتخاب کچھ اشعار درج ہذا ہوتے ہیں واضح ہو کر بوستان سعدی میں ہر قسم کے حکمت آموز مضامین دیکھے جاتے

ہیں ہزارہا مسائل جو حکمت عملی سے تعلق رکھتے ہیں اس کتاب لاجواب میں حضرت مصنف نے داخل کیئے ہیں، تدوین مضامین کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ دس بابوں میں کی گئی ہے بلاشبہ یہ کتاب حضرت شیخ ممدوح کی بڑی پایہ رکھتی ہے دو چار حکایتوں کے سوا جتنی حکایتیں اس میں دیکھی جاتی ہیں نہ صرف حضرت کے وفور اطلاع سے خبر دیتی ہیں بلکہ ہر طرح پر ایسی حکمت آموز ہیں کہ اس کتاب گرامی میں تمامتر درج ہونے کا پورا استحقاق رکھتی ہیں۔ یہ سب حکایتیں ایک ہی بحر میں منظوم ہوئی ہیں اور حضرت مصنف کی حیرت انگیز قوت شاعری کا جلوہ دکھلاتی ہیں، جاننا چاہیئے کہ حکمت آموز مثنویاں اس قسم شاعری سے تعلق رکھتی ہیں جس کو انگریزی میں ڈائیڈ یکٹک شاعری کہتے ہیں ؛

حکایت اتابک مرحوم تکلہ بن سعد زنگی

سعدی بہ حیثیت مثنوی نگار

در اخبار شاہان پیشین ہست
کہ چوں تکلہ بر تخت زنگی نشست

بدورانش از کس نیازرد کس
سبق برد گر خود ہمیں بود و بس

چنیں گفت یکرہ بصاحبدلے
کہ عمرم بسر رفت بیجا صلے

چومی بگزرد ملک و جاہ و سریر
نبرد از جہاں دولت الا فقیر

بخواہم بہ کنج عبادت نشست
کہ دریابم ایں پنج روزے کہ ہست

چو بشنید دانائے روشن نفس
بہ تندی برآشفت کاے تکلہ بس

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

تو بر تخت سلطانی خویش باش ۔۔۔ به اخلاق پاکیزه درویش باش
ز صدق واردات کمر بسته دار ۔۔۔ ز طامات و دعویٰ زباں بسته دار
قدم باید اندر طریقت نہ دم ۔۔۔ کہ اصلے ندارد دم بے قدم
بزرگان کہ نقد صفا داشتند ۔۔۔ چنیں خرقہ زیر قبا داشتند

حضرت فریدالدین عطار علیہ الرحمۃ کا پندنامہ بھی نہایت توجہ طلب کتاب ہے کچھ کلام حضرت کا مندرج ذیل ہوتا ہے۔

در بیان عمل خالص

ہر کہ باشد اہل ایمان اے عزیز ۔۔۔ پاک دارد چار چیز از چار چیز
از حسد اول تو دل را پاک دار ۔۔۔ خویشتن را بعد ازاں مومن شمار
پاک دار از کذب و از غیبت زباں ۔۔۔ تا کہ ایمانت نیفتد در زیاں
پاک گرداری عمل را از ریا ۔۔۔ شمع ایمان ترا باشد ضیا
چوں شکم را پاک داری از حرام ۔۔۔ مرد ایماں دار باشی والسلام
ہر کہ دارد ایں صفت باشد شریف ۔۔۔ ورنہ او دارد ایماں ضعیف
ہر کہ باطن از حرامش پاک نیست ۔۔۔ روح او را رہ سوئے افلاک نیست
چوں نباشد پاک اعمال از ریا ۔۔۔ ہست بے حاصل چو نقش بوریا
ہر کرا اندر عمل اخلاص نیست ۔۔۔ در جہاں از بندگان خاص نیست
ہر کہ کارش از برائے حق بود ۔۔۔ کار او پیوستہ با رونق بود

ہر چند حضرت عطار کا پندنامہ حضرت سعدی کی شوخی تحریر سے مبرا ہے۔ اور

ترتیب قریب صرف نظم ہی نظم کا انداز رکھتا ہے تاہم بکار آمد مضامین سے مملو ہے اور
اس لئے بہت کچھ قابل تعریف ہے ؛

تصوّف آموز مثنویاں : جاننا چاہئے کہ تصوّف سے مُراد علم روحانیت ہے
یہ علم اہل ہند میں درجہ کمال کو پہنچ گیا تھا اور اب بھی ہندوستان میں بیشتر ہندو فقرا
اس سے باخبر ہیں اس زمانہ میں وہ ہندوستانی حضرات جنھوں نے یورپین تعلیم پائی
ہے اس علم کو تھیاسوفی کہتے ہیں یہ علم فی زمانہ جو مرکوز اہل ہند ہے امریکہ وغیرہ سے
ہندوستان میں بشکل جدید آیا ہے گویا خود اس کا وہی ہندوستان کا تصوف قدیم ہے۔
ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ علم پہلے زردشتیوں کے میل جول سے داخل
مذہب ہوا پھر جب مسلمان ہندوستان میں آئے ہندی تصوّف نے اُن کے دماغ
میں اچھے طور پر گھر کر لیا یہاں تک کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک زیادہ حصّہ کا مذہب
تصوف ہی دکھائی دیتا ہے۔ فقیر کا قول یہ ہے کہ اگر تصوف سے کلام خدا و رسولؐ
مراد ہے تو مجھے تصوف سے انکار نہیں ہے لیکن اگر تصوف سے مُراد کوئی اور شئے
ہے تو تصوف کو بات سلام۔ بہر حال فارسی تصوف آموز مثنویاں بہت ہیں مثلاً نان و حلوا
تصنیف حضرت بہائی آملی کی، اور من و سلویٰ جناب شمس العلماء مفتی سیّد محمد عباس
صاحب کی مگر سب سے زیادہ قابل لحاظ تصنیف اس فن کی مثنوی مولانا جلال الدین
رومی علیہ الرحمۃ کی ہے۔

مولانائے روم بہ حیثیت مثنوی نگار : مولانائے روم علیہ الرحمہ کی شہرت
حضرت کے علم و فضل کے علاوہ مثنوی نگاری کی بنیاد پر ہے اہل اسلام میں خاص کر
اہل سنت حضرت کی اس تصنیف منظوم کو جو مثنوی مولانائے روم کے نام سے

مشہور ہے بعد کتاب اللہ کے قابل قدر جانتے ہیں چنانچہ یہ شعر

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی

فقیر کے قول کی صحت پر دال ہے، اسی طرح اس تصنیف گرامی کی وجہ سے حضرت مولانا ایک بہت اعلیٰ درجہ کے بزرگ مانے جاتے ہیں حتیٰ کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :

من چہ گویم وصف آں عالیجناب نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

لاریب مولانائے روم بڑے پایہ کے بزرگ گزرے ہیں فرقہ امامیہ میں بھی حضرت بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اہل اسلام ۔ ایک پابند شریعت جماعت نے اس مثنوی کے چند اشعار کو تعلیم قرآنی اور اسلامی توحید کے مخالف قرار دیا ہے او ان اعتراضات کے جوابات مولانا کے معتقدین نے مثنوی کی شرح وغیرہ میں قلمبند کئے ہیں جنھیں حضرات معترضین محض تاویلات دور از کار کہتے ہیں بہر حال اس بحث سے اگر درگزر کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ مولانا ایسے ہی بزرگ ہیں کہ اسلام کے ہر فرقہ میں حضرت کی توقیر کی جائے حضرت کی مثنوی بہت سے قرآنی آیات کی تفسیر ہے، بہت سے احادیث نبوی کی شرح ہے اور بہت سے مسائل فلسفہ و حکمت کی توضیح ہے، تصوف کی عبارت ہے صفائی خیالات سے اس کتاب لاجواب میں عجب خوش جمالی کے ساتھ جلوہ گر ہے واردات قلبیہ اور جذبات روحیہ کے بیانات حیرت انگیز انداز رکھتے ہیں تعلیمات روحانیہ کا پیرایہ تمام بے نظیر نظر آتا ہے، تزکیہ روحی اور تصفیہ قلبی کے اعتبار سے کم کوئی کتاب مولانا کی اس مثنوی مبسوط کے برابر نکلے گی، نفس شاعری اس مثنوی کی بہت

ہے یہ مثنوی اپنے تعلیمات کے اعتبار سے انگریزی کی اُس صنف شاعری میں
ـب ہوتی ہے جس کو ڈائی ڈیکٹک کہتے ہیں ذیل میں کچھ اشعار نمونہ کلام کے طور
ـج کیے جاتے ہیں۔

بشنو از نے چوں حکایت میکند ۔۔۔ از جدائیہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند ۔۔۔ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق ۔۔۔ تا بگویم شرح درد اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش ۔۔۔ باز جوید روزگار وصل خویش
من بہر جمعیتی نالاں شدم ۔۔۔ جفت بدحالاں و خوشحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من ۔۔۔ از درون من نجست اسرار من
سر من از نالۂ من دور نیست ۔۔۔ لیک چشم و گوش را آں نور نیست
تن ز جان و جان ز تن مستور نیست ۔۔۔ لیک کس را دید جاں دستور نیست
آتش ہست ایں بانگ نائی نیست باد ۔۔۔ ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد
آتش عشق ہست کاندر نے فتاد ۔۔۔ جوشش عشق ہست کاندر مے فتاد
نے حریف ہر کہ از یارے برید ۔۔۔ پردہائش پردہائے ما درید
ہمچو نے زہرے و تریاقے کہ دید ۔۔۔ ہمچو نے دمساز و مشتاقے کہ دید
نے حدیث راہ پرخون می کند ۔۔۔ قصہائے عشق مجنوں می کند
محرم ایں ہوش جز بیہوش نیست ۔۔۔ مر زباں را مشتری جز گوش نیست
گر نبودے نالہ نے را ثمر ۔۔۔ نے جہاں را پر نکردی از شکر
در غم ما روزہا بیگاہ شد ۔۔۔ روزہا با سوزہا ہمراہ شد

روزہا گر رفت گو رو باک نیست — تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

ہر کہ جز ماہی ز آبش سیر شد — وانکہ بیروزی ست روزش دیر شد

در نیابد حال پختہ ہیچ خام — پس سخن کوتاہ باید والسلام

بند بگسل باش آزاد اے پسر — چند باشی بند سیم و بند زر

گر بریزی بحر را در کوزۂ — چند گنجد قسمت یک روزہ

کاسۂ چشم حریصاں پر نشد — تا صدف قانع نشد پر در نشد

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد — او ز حرص و عیب کلی پاک شد

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علتہائے ما!

اے دوائے نخوت و ناموس ما — اے تو افلاطون و جالینوس ما

جسم خاک از عشق بر افلاک شد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد

عشق جان طور آمد عاشقا — طور مست و خر موسیٰ صاعقا

متفرق مضامین کی مثنویاں: واضح ہو کہ مثنوی چار شعر کی بھی ہوتی ہے اور شعر سے زیادہ کی بھی، جیسا کہ بالا میں حوالۂ قلم ہو چکا ہے۔ مثنوی ہر بحر میں نہ جاتی ہے اس کے واسطے چند بحریں مخصوص کر دی گئی ہیں چونکہ کسی عروضی تذکر سے اس کتاب کو بحث نہیں ہے اس لئے ذکر مثنوی کی بحروں کا بیان نہیں جاتا ہے بہر حال جاننا چاہیئے کہ متفرق مضامین کی مثنویاں ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ کو رزمی کوئی بزمی کوئی حکمت آموز اور کوئی تصوف آمیز اور ان کا کبھی مرکب ا ہوتا ہے مگر بہر حال ہیں ان کے مضامین بدیع اور منقح ہوتے ہیں ذیل میں حضرت سـ کی کچھ متفرق مثنویاں درج ہذا ہوتی ہیں۔

این حکایت شنو که در بغداد — رایت و پرده را خلاف افتاد

رایت از گرد راه و رنج و رکاب — گفت با پرده از طریق عتاب

من و تو هر دو خواجه‌تاشانیم — بندهٔ بارگاه سلطانیم

من ز خدمت دمے نیاسودم — گاه و بیگاه در سفر بودم

تو نه رنج آزموده نه حصار — نه بیابان و باد و گرد و غبار

قدم من به سعی پیشتر است — پس چرا عزت تو بیشتر است

تو بر بندگان مه‌روئی — با کنیزان یاسمن‌بوئی

من فتاده بدست شاگردان — به سفر پایبند و سرگردان

گفت من سر بر آستان دارم — نه چو تو سر بر آسمان دارم

هر که بیهوده گردن افرازد — خویشتن را به گردن اندازد

الیضاً وله

دیدم گل تازه چند دسته — بر گنبدے از گیاه بسته

گفتم چه بود گیاه ناچیز — تا در صف گل نشیند او نیز

بگریست گیاه و گفت خاموش — صحبت نه کند کرم فراموش

گر نیست جمال و رنگ و بویم — آخر نه گیاه باغ اویم

من بندهٔ حضرت کریمم — پروردهٔ نعمت قدیمم

گر بے‌هنرم و گر هنرمند — لطف است امیدم از خداوند

با آنکه بضاعتے ندارم — سرمایهٔ طاعتے ندارم

او چارهٔ کار بنده داند — چون هیچ وسیلتش نماند

رسم است که مالکان تحریر — آزاد کنند بندهٔ پیر

اے بارِ خدائے عالم آرائے — بر سعدیِ پیر خود بہ بخشائے
سعدی رہِ کعبۂ رضا گیر — اے مردِ خدا رہِ خدا گیر
بدبخت کسے کہ سر بتابد — زین در کہ درِ دگر نیابد
درختے کہ اکنوں گرفتست پائے — الضاولہ بہ نیروے مردے بر آید ز جائے
ورش ہمچناں روزگارے ہلی — بگردونش از بیخ بر نگسلی
سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ میل — چو پُر شد نشاید گزشتن بہ پیل

اُردو کی مثنویاں

رزمی مثنویاں: اُردو میں کوئی رزمی مثنوی فردوسی کے شاہنامہ یا نظامی کے سکندر نامہ کے مدارج کی نظر نہیں آتی ہے جو رزمی مثنویاں ہیں وہ انھیں کتابوں کے مختصر ترجمے ہیں ابھی تک اُردو کے کسی شاعر نے اپنی فکر سے کوئی اصلی مثنوی جو کسی واقعہ بزرگ پر مشتمل ہو نہیں لکھی ہے بظاہر اُردو میں میر انیس یا مرزا دبیر کے سوا کوئی شاعر بھی فردوسی یا نظامی کی فکر و قابلیت کا نہیں گزرا ہے مگر ان بزرگوار نے مثنوی نگاری کی طرف کبھی اپنی توجہ مبذول نہیں فرمائی، اب بھی اگر شعرائے وقت سے کچھ حضرات اس قسم کی مثنوی نگاری کی جانب میلان فرمائیں تو اُردو سے رزمی مثنویوں کی ناداری کا داغ مٹ جائے بہ اسباب ظاہر واقعہ کربلا ایک ایسا معاملہ رزمی ہے کہ اگر اعلیٰ درجہ کی طباعی اور قابلیت کے ساتھ بشکل مثنوی منظوم کیا جائے تو ہومر. فردوسی. ورجل. ملٹن. بالمیکی اور ویاس کی تصانیف سے کم تماشائے سخن نہیں دکھلا سکتا ہے۔

بزمی مثنویاں: فارسی کی بعض عشقیہ مثنویوں کے ترجموں کے علاوہ شعرائے

اُردو نے برائے خود بہت عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بزمی مثنویوں کی طرف اکثر شعرا متوجہ ہوئے ہیں، ذیل میں بعض ان شعرائے نامی کی قابلیت تصنیف پر اظہار رائے کیا جاتا ہے جنھوں نے عشقیہ مثنویاں تحریر فرمائی ہیں ؏

میر تقی بہ حیثیت مثنوی نگار: میر تقی میرؔ میر لاریب سلطان المتغزلین تھے۔ مگر حضرت کی مثنوی نگاری سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو جو درجہ غزل سرائی میں حاصل ہے وہ مثنوی نگاری میں نہیں ہے اِس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو صرف مضامین داخلی کی بندش کی بڑی قابلیت حاصل تھی۔ لیکن مثنوی نگاری کی وہی شاعر داد دے سکتا ہے جو مضامین خارجی کی بندش پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے، یہ قدرت آپ کو بہت حاصل نہ تھی۔ اس لیئے آپ کی مثنویاں تمامتر داخلی پہلو کی شاعری سے خبر دیتی ہیں در حقیقت آپ کی مثنوی نگاری بھی مضامین کے اعتبار سے ایک قسم کی غزل سرائی نظر آتی ہے آپ کی مثنویوں میں خارجی مضامین گویا ندارد ہیں کہیں آپ صحرا، جنگل، جبال، شجر، خزاں، بہار، برق، باراں، سرما، گرما، طیور و حوش آب سراب غیرہ وغیرہ کے خوش آئند مضامین کو بیان نہیں فرماتے ہیں اس پر بھی جس قدر آپ کی مثنویاں ہیں قابل توجہ ہیں کس واسطے کہ روحانی اور قلبی معاملات کے بیانات سے مملو ہیں جتنی عاشقانہ کیفیتیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں اکثر بے حیائی کی ذلتوں سے بری دکھائی دیتی ہیں کمتر کوئی جزو تصنیف ایسا ہے کہ تہذیب کی آنکھیں اُسے دیکھ کر شرم اٹھائیں ذیل میں آپ کی عشقیہ مثنویوں کے اشعار نمونے کے طور پر درج کیئے جاتے ہیں:

انتخاب اشعار از مثنویات میرؔ

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا — کہیں سینے میں آہ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا

کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا

گہ نمک اُس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا

ایضاً و لہ

تا گہ اک کوچہ سے گزار ہوا — آفت تازہ سے دوچار ہوا

ایک غرفہ سے ایک مہ پارہ — تھی طرف اُس کے گرم نظارہ

پڑ گئی اس پہ اک نظر اُس کی — پھر نہ آئی اُسے خبر اس کی

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی — وہ نظر ہی وداع طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

بے قراری نے کچھ ادائی کی — تاب و طاقت نے بیوفائی کی

مُنہ جو اس کا طرف سے اُس کی پھرا — مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا

وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اُس کا — بے طرح ہووے گو کہ حال اُس کا

جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ — اُٹھ گئی سامنے سے یک بارہ

وہ گئی اُس کے سر بلا آئی — خاک میں مل گئی وہ رعنائی

دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز — رنگ چہرہ سے کر چلا پرواز

ہاتھ جانے لگا گریباں تک — چاک کے پھیلے پانو داماں تک

دیگر

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

محبت مسبب محبت سبب
محبت سے آتے ہیں کار عجب

محبت بن اس جا نہ آیا کوئی
محبت سے خالی نہ پایا کوئی

محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ
محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ

محبت اگر کار پرواز ہو
دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو

محبت ہے آب رخ کار دل
محبت ہے گرمی بازار دل

محبت عجب خواب خونریز ہے
محبت بلائے دل آویز ہے

محبت کی ہیں کار پردازیاں
کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں

محبت کی آتش سے اخگر ہے دل
محبت نہ ہووے تو پتھر ہے دل

محبت کو ہے گلستاں میں راہ
کلی کے دل تنگ میں ہے یہ چاہ

محبت ہی سے دل کو رو بیٹھیے
محبت میں جی مفت کھو بیٹھیے

محبت لگاتی ہے پانی میں آگ
محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ

محبت سے ہے انتظام جہاں
محبت سے گردش میں ہے آسماں

محبت سے روتے گئے یار خوں
محبت سے ہو ہو گیا ہے جنوں

محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو
محبت سے ہو جو وہ ہرگز نہ ہو

محبت سے پروانہ آتش بجاں
محبت سے بلبل ہے گرم فغاں

اسی آگ سے شمع کو ہے گداز
اسی کے لئے گل ہے سرگرم ناز

اشعار از ساقی نامہ

ہے قابلِ سجدہ سر انداز　　جو سب میں ہُوا ہے جلوہ پرواز

اُس کو مے حسن نے چکھایا　　ہستی کا نشہ اسی سے پایا

پی اُس نے شراب خود پرستی　　طاری ہوئی اس پہ زورِ مستی

وہ مستِ شرابِ ناز ہے فرد　　خورشید ہے اس کا جام پُر درد

ہے گردشِ چشم اس سے افسوں　　پھر جائے ہے جس کے ساتھ گردوں

ظلمت ہے دوئی کی تجھ سے احول　　آخر ہے وہی، وہی ہے اوّل

عالم ہے قرابۂ مئے خام　　ہے دورِ سپہر گردشِ خم

مشہورِ جہاں جو کیف و کم ہے　　بے نشہ جو ہو سکے تو ستم ہے

وہ مستِ نیاز ہے حرم میں　　وہ رفتۂ ناز ہے صنم میں

ہے آبِ رخِ زمانہ اُس سے　　روشن ہے تمام خانہ اُس سے

مینا میں جو سرکشی ہے وہ ہے　　صہبا میں جو دل کشی ہے وُہ ہے

شمشاد ہے سرفراز اُس سے　　گل دیدۂ نیم باز اُس سے

خوگر اسے ناز پیشگی ہے　　وہ ہے کہ جسے ہمیشگی ہے

جو عکس پڑا ہے جامِ مے میں　　آتی ہے صدا اُسی کی نے میں

ہر چند میر صاحب نے اچھا لطفِ سخن دکھلایا ہے مگر ظہوری کے ساقی نامہ کو نہیں پہنچتے ہیں، حق یہ ہے کہ اگر میر حسن کی مثنوی اُردو میں نہ ہوتی تو فارسی کے مقابل میں اُردو کی کوئی مثنوی قابلِ ذکر نہ ہوتی ؛

واضح ہو کہ منجملہ بزمی مثنویات کے میر صاحب نے ایک مثنوی لکھی ہے
جس میں نواب آصف الدولہ کی شکار افگنی کے حالات رقم فرماتے ہیں یہ مثنوی اُن
حضرات کو جو فن صید افگنی کے ماہر ہیں کسی طرح لذت بخش نہیں ہو سکتی صبا نے بھی
ایک ایسی ہی مثنوی لکھی ہے وہ بھی مذاق صحیح نہیں رکھتی حقیقت یہ ہے کہ نہ میر نہ صبا
دونوں کوئی صاحب بھی علم صید سے واقف نہ تھے پس اُن کی اس قسم کی مثنویاں کیا لطف
سخن پیدا کر سکتی ہیں ان دونوں اُستادوں کی شکاری مثنویاں غایت صید افگنی سے مطلق
خبر نہیں دیتی ہیں اور نہ اُن سے کسی علمی مسئلہ کی تحقیق ظہور میں آتی ہے اگر صید افگنی سے
مجرد شیر و شغال کی جان لینی مراد ہے تو یہ مثنویاں خوب ہیں مگر ارباب واقفیت سے
پوشیدہ نہیں ہے کہ شکار علمائے با مذاق کا کام ہے اس کام کے کرنے والے
سر سمویل بیکر سنڈرسن اسٹرنڈیل بالڈون کیمبل رالیس گوگس وغیرہ وغیرہ گذرے ہیں
یہ لوگ اعلیٰ درجہ کے صاحب علم اور صاحب تحقیق تھے بلاشبہ ان کی تصنیفات حضرات
اہل علم کے ملاحظہ کے قابل ہیں اور وفور فوائد سے معمور ہیں جس نے ان مصنفوں کی تصنیفوں
کو بغور پڑھا ہوگا اور ان کی ہدایتوں کے مطابق شغل صید افگنی کو ملحوظ رکھا ہوگا اسے میر
اور صبا کی شکاری مثنویوں سے کیا حظ حاصل ہو سکتا ہے ان مثنویوں میں علم ریاضی، علم
حیوانات، علم نباتات، علم معدنیات وغیرہ وغیرہ کا کوئی مسئلہ نظر نہیں آتا۔ جتنے
بیانات ہیں فطرت خداوندی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے، کوئی بات تعلیم تعلم کی کہیں
دکھائی نہیں دیتی، البتہ بد مذاقی کے ساتھ جگہ جگہ نواب اودھ کی تعریفیں پائی جاتی ہیں
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنویاں مجرد مدحت سرائی کی غرض سے لکھی گئی ہیں ان کو
تحقیق و تدقیق مسائل علمیہ سے کیا علاقہ۔ یہ بھی امر قابل لحاظ ہے کہ چونکہ یہ مثنویاں

درباری رنگ رکھتی ہیں ان میں وہ لطف کلام زنہار نہیں پایا جاتا ہے جو امرأ القیس کے قصیدہ لامیہ کے ان معدودہ اشعار سے اٹھتا ہے جن میں اپنی صبیہ فگنی کے حالات کو حوالہ قلم کرتا ہے حضرات ناظرین راقم کی تحریرات سابق کو ملاحظہ فرمائیں ان کے اعادہ کی یہاں حاجت نہیں ہے۔

مومن خاں بہ حیثیت مثنوی نگار: اُستاد مومن کی کلیات میں چھ مکمل مثنویاں دیکھی جاتی ہیں یہ سب کی سب مثنویاں تمامتر داخلی شاعری کا رنگ رکھتی ہیں اس اعتبار سے ان مثنویوں کو میر تقی صاحب کی مثنویوں کی قسم کے ساتھ اتحاد حاصل ہے مگر انداز کلام کا جو فرق ہے وہ وہی ہے جو اُن دونوں استادوں کی غزل سرائیوں میں محسوس ہوتا ہے مومن خاں کی مثنویاں دقّت انگیز پیرایہ رکھتی ہیں اس نامطبوع انداز سے میر صاحب کی مثنویاں تمامتر بری ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مومن خاں بالقصد مضامین داخلی کو ایسی دشوار بندش دیتے ہیں کہ فہم کو ابذا لاحق ہوتی ہے برخلاف اس کے میر صاحب اپنی دلی کیفیت سوز و گداز و خستگی کے ساتھ ادائے مضامین میں ایسی آسانی کی راہ اختیار فرماتے ہیں کہ اُن کے کلام کی پرتاثیری میں کسی قسم کا نقصان لاحق نہیں ہوتا ہے، خیر اب حضرات ناظرین مومن خاں کی مثنویوں کو بلا مقابلہ احد سے موازنہ فرمائیں، فقیر کی دانست میں اُستاد مومن کی مثنویاں ہرچند زور طبیعت اور سخن آفرینی سے خبر دیتی ہیں مگر اُن میں اخلاقی یا تمدنی یا مذہبی مضمون کا نشان نہیں پایا جاتا ہے اُن کی کوئی مثنوی ایسی نہیں دکھائی دیتی ہے جو خس برابر بھی مفید معاشرت ہو یا جس سے بال برابر بھی فائدہ ... مترتب ہو۔ اکثر مضامین عشقیہ ہیں مگر وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ جن سے یا کوچہ گردی کی بو آتی ہے یا ایسے ہیں کہ سوا نوجوانان غیر مقید کے اُن کا گزار کسی اہل

کے دماغ میں ہو ہی نہیں سکتا۔ المختصر فقیر کی دانست میں مومن خان کی کوئی مثنوی مفید بنی آدم نظر نہیں آتی ہے ذیل میں اُستاد مومن کی دو مثنویوں کی نسبت راقم اظہار خیالات کرتا ہے

مثنوی نمبرا جس کا سرنامہ یہ شعر ہے

این نامہ شد کایت ستم نام   با من خود گفت سال اتمام

واضح ہو کہ اس مثنوی میں اوّل مومن خاں اپنی عاشق مزاجی کو بیان کرتے ہیں، پھر ایک نوجوان عورت پر اپنے عاشق ہو جانے کو تحریر فرماتے ہیں پھر اپنے عشق کی بدحالیوں کا مرقع کھینچتے ہیں اس کے بعد اپنی محبوب سے اپنے ہی گھر میں ملاقات ہو جانے کی صورت دکھاتے ہیں اور وہ اس طور پر کہ اس کا آنا ان کے گھر ایک شادی کی تقریب سے ہُوا، تو ساری مثنوی غیر فطری اور بے سر پا ہے مگر اس مقام پر بہت کچھ خلاف قرائن ہے شادی کی تقریب میں کسی ناکتخدا عورت سے تنہائی میں ملاقات کا نصیب ہونا اس ملک ہندوستان میں خلاف قیاس ہے اس ملک میں ناکتخدا شریف زادیاں اس طور پر مطلق العنان نہیں رہتی ہیں کہ اُن سے کوئی شخص نامحرم شادی وغیرہ کی تقریب میں بحالت تنہائی عشق بازی کی باتیں کرے یہ بالکل رسم ملکی کے خلاف ہے اوّل تو اس ملک کی ناکتخدا لڑکی کیوں تقریب شادی میں عاشقانہ گفتگو کا محل ڈھونڈنے لگی دوم یہ کہ اگر وہ ناہمواری سے ڈھونڈے بھی تو اس کی رشتہ مندبی بیاں کب اُس کو ایسا موقع ہاتھ لگنے دیں گی۔ یہ قصہ عجب نامربوط سا معلوم ہوتا ہے صاف ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جس عورت کا مومن خاں تذکرہ کر رہے ہیں ہندوستان کی شریف زادی نہ تھی۔ اور اگر تھی بھی تو شریف زادیوں کے اس کے انداز نہ تھے اس جگہ آپ فرماتے ہیں:۔

ہوئی شادی ہمارے ہاں اک بار — آئی مہماں وہ دولت بیدار
شرکت محفل سراپا زیب — اس کے آنے کی ہوگئی تقریب
ایک خالی مکان میں آکر — مل گئی چپکے چپکے ڈھب پاکر
کیا ملاقات رشک تنہائی — دمبدم تازہ حسرت افزائی

اس ملاقات کی گفتگو کو طول دے کر آپ اُس کی رخصت کو بیان فرماتے ہیں پھر اُس کے مرجانے کا حال حوالۂ قلم پایا جاتا ہے اس سے صدمہ کا ملتبج ہونا امر طبعی ہے مگر آخر کار معشوق کے غم کا زائل ہوجانا چہ معنی دارد یہ وہ غم نہیں ہے جو کبھی زائل ہو معشوق کا بدل معشوق کے ساتھ ہو نہیں سکتا، انسان کو عشق دوبارہ نہیں ہوتا ہے معشوق کے مرنے کے بعد یا معشوق سے مفارقت کے بعد پھر عشق نہیں پیدا ہو سکتا ہے ایک دل ہے دو دلبر کی جگہ نہیں ہوتی خواہ آن واحد میں اور خواہ آن مختلف میں مومن خان کو معشوق اول کے مرنے کے بعد معشوق دوم ہاتھ لگ گیا، پھر معشوق اوّل کو ایسا بھول بیٹھے کہ گویا کوئی ایسا شخص کبھی وجود ہی میں نہ تھا، اس نئے معشوق کے ساتھ جو معاشرت کا طور بیان کیا جاتا ہے وہ ویسا نظر آتا ہے جیسا کہ عیش مزاج نوجوان کا ہُوا کرتا ہے مختصر یہ ہے کہ یہ مثنوی از ابتدا تا انتہا اخلاقی پایہ سے بہت گری ہوئی ہے اس کو میر تقی صاحب کی اُن مثنویوں کی روحانیت سے کیا علاقہ جن کے کچھ اشعار داخل کتاب ہذا کئے گئے ہیں۔

واضح ہو کہ مثنوی نگاری کے لئے داخلی شاعری کے ساتھ خارجی شاعری کی بھی بڑی حاجت ہے مومن خان خارجی شاعری سے کوئی بہرہ نہیں رکھتے تھے، اس لئے اُن کی مثنویاں امور خارجیہ سے تمام تر معرا ہیں، اُن کی مثنویوں میں کہیں بھی کوئی سینری

کا بیان نہیں دیکھا ہے کوئی بیان ایسا نہیں پایا جاتا ہے جس سے صبح شام سر ما گرما برق
باران جبال بحور صحرا دشت وغیرہ وغیرہ کی کچھ بھی کیفیت ظاہر ہوتی ہو میر حسن نے جس
قدر امور خارجیہ کو اپنی مثنوی میں حوالۂ قلم کیا ہے اس کا بیسواں حصہ بھی مومن خاں کی کسی
مثنوی میں نہیں پایا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ مجرد داخلی شاعری کا برتنے والا شاعر حسب مراد
مثنوی لکھ نہیں سکتا ہے ایسا شاعر اچھا غزل سرا ہو سکتا ہے چنانچہ مومن خاں ایک
اچھے غزل سرا ہیں، مگر اچھے مثنوی نگار نہیں ہیں ان کی مثنویاں صرف انھیں اشخاص کو
اچھی معلوم ہوں گی جو تقاضائے مثنوی نگاری سے واقفیت نہیں رکھتے ظاہرا ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ مومن خاں نے مضامین غزل اپنی مثنویوں میں بھر دئیے ہیں ایسے
مضامین غزل سرائی میں جو کچھ بھلے دکھائی دیں مثنوی نگاری میں تو یقیناً بے محل نظر
آتے ہیں کلام کے لئے موقع و محل کا لحاظ واجبات سے ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو فردوسی
کی یوسف و زلیخا جامی کی یوسف و زلیخا سے بہتر ہوتی، لاریب فردوسی طوسی ایک
بڑے رزمی شاعر تھے مگر یوسف و زلیخا سی عشقیہ مثنوی لکھنے کے واسطے وہ مخلوق نہیں
ہوئے تھے۔ المختصر مومن خاں بہ حیثیت مثنوی نگار بڑے شاعر نہ تھے۔ اُن کی
مثنویاں صرف داخلی مضامین سے بھری ہوئی ہیں جو نقصان مثنوی نگاری پر دال ہے
علاوہ اس کے جتنے داخلی مضامین اُن کی مثنویوں میں پائے جاتے ہیں ان کو حکمت
آموزی سے کوئی علاقہ نہیں آتا ہے، دس شعر بھی اُن کی ساری مثنوی میں ایسے دکھائی
نہیں دیتے ہیں جن میں کسی اعلیٰ قسم کے ذہنی مسائل حوالۂ قلم ہوئے ہوں۔ عموماً جتنے داخلی
مضامین منظوم کئے گئے ہیں وہ ایسے ہی ہیں کہ غیر محتمل درنا تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پسندیدگی
کے قابل ہیں کوئی مضمون ارفع درجہ کے واردات قلبیہ سے خبر نہیں دیتا ہے، ایسے

مضامین کسی حکیم کو کیا مطبوع ہو سکتے ہیں معمولی درجہ کے ارباب فہم و فراست بھی اُن کی طرف
رغبت نہیں کر سکتے، واقعی ایسی شاعری کہ جس سے تخریب اخلاق کا خوف ہو جس سے کوئی
اخلاقی نتیجہ نہیں نکل سکے نہ صرف ایک بیکار بلکہ قابل احتراز امر ہے اب راقم مومن خان
کی مثنوی نمبر ۲ کی نسبت ذیل میں اظہار خیالات کرتا ہے اِس کے سرنامہ کا شعر یہ ہے

نام ایں چند نالۂ بہم   ہمچو تاریخ گشت قصۂ غم

واضح ہو کہ اِس مثنوی کی نسبت بھی خیالات راقم وہی ہیں جو بالا میں عرض کئے گئے لیکن اِس
اجزا کی نسبت مختصر طور پر کچھ اور بھی رائے زنی کی جاتی ہے حضرات ناظرین سے توجہ
فرمائی کی امید ہے ؛

اِس مثنوی میں مومن خاں پہلے ساقی کی طرف مخاطب ہو کر طالب بادہ ہوتے ہیں
اور فصل کی خوبیوں کو ارشاد فرما کے ساقی کو خبر دیتے ہیں کہ پھر ولولۂ عشق پیدا ہوا ہے بعد
ازاں معشوقوں کی بیوفائی کا ذکر کر کے ایک عشقیہ داستان بیان فرماتے ہیں یہ مضامین بہت
طول و بسط کے ساتھ حوالۂ قلم ہوئے ہیں مگر فطری خوبیوں سے تمامتر معرا ہیں اِس مثنوی
میں فصل بہار کا بیان فطرت سے سروکار نہیں رکھتا، بقیہ مضامین جتنے ہیں اعلیٰ درجہ
کے واردات قلبیہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، حکیمانہ مضمون کا ایک شعر بھی دکھائی
نہیں دیتا، اخلاق آموز کلام کی جھلک بھی استے اشعار میں کہیں نظر نہیں آتی کوئی جزو
کلام روحانیت کی داد نہیں دیتا جتنے خیالات ہیں جو انانہ ہیں اور جو انانہ بھی ایسے کہ
کسی تعلیم یافتہ نوجوان کے دماغ میں گزر پا نہیں سکتے، ان سب [illegible] کیفیتوں کے
ساتھ بندش مضامین کی ترکیب کچھ ایسی دشوار ہے کہ دماغ کو اُن سے ایذا ہوتی ہے بلکہ
اس عدم سلاست سے اور بھی زیادہ طبیعت متاذی ہوتی ہے جب مضامین مفید

کی معدومی ہر شعر میں پائی جاتی ہے بہ سبب اشعار کو ہے کندیدن دکا ہے بر آوردن
کا حکم رکھتے ہیں خیر اب راقم مضمون داستان عرض کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دہلی میں
ایک نوجوان مومن نام عاشق مزاج تھا ہمیشہ حسینوں کی صحبت میں لطف عیش
اٹھایا کرتا تھا۔ مومن خاں لکھتے ہیں کہ ہم کو اس سے بہت محبت تھی، اتفاقاً وہ کسی عورت پر
مائل ہوا اس عورت نے بھی اس کی طرف میلان دکھایا۔ ایک زمانہ تک دونوں مشغول عیش و عشرت
رہے وہ نوجوان اُس عورت کا ایسا شیفتہ ہوگیا کہ اس نے ہم سے بھی ملاقات ترک کی اور باوجود
بڑی تلاش و تجسس کے کئی برس تک اس کا نشان ہمیں نہ ملا۔ ایک روز جی چاہا کہ سیر صحرا
کیجیے مگر وہاں کے سبزہ و لالہ و گل سے دل بستگی نہ ہوئی، وحشت ہمیں کشاں کشاں دشت کی
طرف لے گئی وہاں ایک شخص بدحال نظر آیا جو حالت غم میں اپنے عشق کی سرگذشت بک رہا تھا
دیکھا تو یہ وہی شخص مومن ہے جو ہمارا دوست تھا اور جس کی ہم کو تلاش تھی، قصہ اس مثنوی کا اسی قدر
ہے مگر اس کا شاعرانہ بیان طولانی ہے اور بلاشبہ مومن خان کے زور طبیعت اور خلاقی سخن
سے خبر دیتا ہے لیکن اسی کے ساتھ لطف تناسب سے سادہ بیان معرا ہے اور زیادہ قابل
افسوس امر یہ ہے کہ اس عدم تناسب کے ساتھ عدم تہذیب کی قباحت بھی اس میں لاحق ہے
مثالاً راقم ذیل میں کچھ اشعار درج کرتا ہے جس سے عدم تناسب اور عدم تہذیب دونوں
ظاہر ہوتے ہیں۔

وہ منہ میں زباں کی لذتیں ہائے / ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ / جی چاہا کچھ اس سے بھی زیادہ
پھر کیا ہی ادا سے کج ادائی / کس ناز سے کرتی ہاتھا پائی
وہ ہاتھ کو رکھ کے جوش انکار / واکرنے نہ دینا بند شلوار

وہ ہاتھ کو دم بدم جھٹکنا — وہ تکیہ پہ سر کو دے پٹکنا
آہستہ لگاتی آہ لاتیں — حیلہ کی وہ کیسی کیسی باتیں
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا — وہ ہو کے تنگ کاٹ کھانا
ہرجائی کی چٹکیاں وہ لینی — آزردہ ہو گالیاں وہ دینی
وہ نیچے پڑے ہی تلملانا — قابو سے تڑپ کے نکلے جانا
وہ جی سے بتنگ ہونے لگنا — کچھ بس نہ چلا تو رونے لگنا
وہ چین بہ جبیں ہو کے کہنا — کس بیکسیوں سے رو کے کہنا
ہے تم کو تو یہ ہی شغل دن رات — اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات
بھرتا ہی نہیں ہے تیرا جی بس — کرتا ہی نہیں ہے تو کبھی بس
اتنا تو نہ چاہیے ستانا — ہر شام سے صبح تک جگانا
اس ظلم کا کچھ ٹھکانا بھی ہے — آخر کسی اور کے بھی جی ہے
یہ ظلم اٹھائے کوئی کب تک — آ پہنچی ہے اب تو جان لب تک
کیا جان ہی لینے کی ہے جی میں — ہے فائدہ کچھ تمہیں اسی میں
منظور یہی ہے گر تو کہہ دو — گر جان ہی لینی ہے تو لے لو
ہاں ہاں تری بات اب میں سمجھی — ہے بات یہی قسم خدا کی
چاہے ہے تو یہ کہ اس کو موت آئے — مر جائے یہ اور مری بلا جائے
پھر اور کسی سے دل لگاؤں — آنکھ اور ہی شوخ سے لڑاؤں
ہیں کیا ہی سلوک عاشقانہ — یہ رہ گئی الفت زمانہ
بے رحم تو اب تو مجھ کو دے چھوڑ — بس چھوڑ خدا کے واسطے چھوڑ

اتنا نہ ستا کہ جی ہی جائے — فرصت دے کہ جاں میں جان آئے

بیزاری میں اس کا لطف کیا ہے — آسودہ ہیں وقت خواب کا ہے

حضرات ناظرین بانمکین راقم کو معاف فرمائیں اشعار بالا کے اعادہ کی مجبوری لاحق تھی لیسا اوقات اصلاح مذاق عوام کے خیال سے نامطبوع کلاموں کے اعادہ کی حاجت لاحق ہو جاتی ہے خیر یہ تو اخلاقی حالت ان اشعار کی ہے "عیاں راچہ بیان" اب اُن کے عدم تناسب پر غور فرمائیے افسوس ہے کہ اس مرض میں زیادہ تر الیشیائی مصنفین مبتلا دیکھے جاتے ہیں جائے لحاظ ہے کہ اِس مثنوی میں مومن خان تحریر فرماتے ہیں کہ اُن کا دوست مومن جو عرصہ سے بے نشان ہو رہا تھا انھیں ایک دشت میں ملا اور انھوں نے اُسے آہ و نالہ کرتے پایا، جب کان دھر کر سُنا تو بدشواری معلوم ہوا کہ ایام گزشتہ کا بیان کر رہا ہے یہ ایام گزشتہ کا بیان سلسلہ اری کے ساتھ طولانی ہے۔ زینہار ایسے بیان پر ایک ایسا شخص جو از خود رفتہ ہو اور غایت وحشت عشق سے دشت گزیں ہو گیا ہو، قادر نہیں ہو سکتا اس پر طرہ یہ ہے کہ اس کی زبان سے ایسی باتیں کہلائی گئی ہیں جو اشعار بالا میں منظوم ہیں ممکن نہیں ایسا شخص جو مبتلائے مصائب عشق ہو کر دشت میں جا بیٹھے، وہ بند شلوار کو یاد کرے اور ایسے خیالات کو دل میں جگہ دے ؎

میر حسن دہلوی بہ حیثیت مثنوی نگار: - اس شاعر گرامی کی شہرت اس کی مثنوی کی بدولت ہے گو اس کی غزل سرائی بھی براز مذاق اور قابل لحاظ ہے میر حسن سادات کرام سے تھے، اور فصاحت و بلاغت میں جو ائمہ ہدیٰ کی خاص شان ہے اپنی قوم کے نمونہ تھے۔ ان کی مثنوی ایک بہت حیرت انگیز تصنیف ہے، اِس مثنوی میں شاعری کا خاتمہ نظر آتا ہے، اردو میں تو یقیناً ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی ہے، فارسی میں بھی اس کی

مجموعی خوبیوں کی کوئی مثنوی نظر نہیں آتی ہے۔ فقیر کی دانست میں فارسی اور اُردو کے کسی
مثنوی نگار نے میر حسن کے برابر فطرت نگاری کا لطف نہیں دکھلایا ہے حقیقت یہ ہے
کہ جس شخص نے اِس مثنوی کو حکیم کی نگاہ سے نہ دیکھا اُس نے گویا شاعری کا لطف ہی
نہیں اٹھایا۔ اِس مثنوی سے بے خبر رہنا ویسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص سب کتابیں
پڑھ ڈالے اور شکسپیر الف لیلہ اور گلستان سعدی کے مطالعہ اور ملاحظہ سے محروم رہ
جائے کوئی صاحب مذاق آدمی ایسا نہیں ہے جو اِس مثنوی سے لطف کثیر نہ اٹھائے اور
زبان اُردو سے باخبر ہو کر اس سے بے خبر رہنا پسند کرے یہ مثنوی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی
پہلوؤں سے پُر از فوائد ہے اِس مثنوی کی قدر داتی سو، حکیم کے کسی سے نہیں ہو سکتی اِس
کی خوبیاں قابل ذکر ہیں اوّل یہ کہ اس کی زبان فطری سلاست رکھتی ہے دوم یہ کہ جو قصہ
منظوم کیا گیا ہے اِس کے اجزا تناسب کے اعتبار سے خوب ہیں، سوم یہ کہ تشبیہات و استعارات
فطری انداز رکھنے کے باعث مخالف مذاق صحیح نہیں ہیں۔ چہارم یہ کہ مبالغہ اتنا پ
شتاب نہیں ہیں ان کا اعتدال ایسا ہے کہ سچی شاعری کا منافی نہیں ہے پنجم یہ کہ رسم و
رواج ملک کے بیانات بڑی صحت کے ساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں ششم یہ کہ جو سین
یعنی معاملہ خارجی بیان ہوا ہے تصویر کا حکم رکھتا ہے ہفتم یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور واردات
قلبیہ پیرایہ شاعری میں بڑی راستی اور پر تاثیری کے ساتھ زیب رقم ہوئے ہیں ہشتم یہ
کہ ہر جزو قصہ کچھ نہ کچھ اخلاقی یا تمدنی نتیجہ پیدا کرتا ہے نہم یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور
معاملات خارجیہ کے بیانات فطری اسلوب رکھتے ہیں جس کے باعث بے
اختیار دل اُن کی جانب کھنچتا ہے المختصر یہ مثنوی داخلی اور خارجی دونوں قسم شاعری
کا پورا لُطف دکھاتی ہے اور اپنے مصنف کی قابلیت عام کی بڑی مثبت ہے ہر چند یہ ممکن

نہیں کہ اِس کتاب میں اِس مثنوی کے تمام اشعار کی خوبیاں بیان کی جائیں تاہم اس مثنوی کی عمدگی کے دکھانے کے لیئے ضرور ہے کہ اِس کے بعض اجزا پر ریویو لکھا جائے، واضح ہو کہ دنیا میں کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے۔ جو نقصان سے تمامتر پاک ہو آدمی ناقص پیدا ہوا ہی ہے پس اِس ریویو میں اِس مثنوی کے جو عیب ہوں گے وہ بھی ظاہر کیئے جائیں گے اگر اِس مثنوی کے عیوب داغ ہائے آفتاب کی طرح نہ بہت ہیں اور نہ بدنما ہیں ؛

میر حسن کی مثنوی پر ریویو: میر حسن اپنی مثنوی کو حسب دستور مصنفین اہل اسلام حمد کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ یہ حمد ایسی لکھی گئی ہے کہ عالم سے عالم موحد کو بھی اس کی پسندیدگی سے چارہ نہیں، اسلامی حکمائے متالہین اس کی جو قدر فرمائیں بجا ہے اِس حمد کو دیکھ کر دل کو صاف اِس امر کا اعتراف ہوتا ہے کہ سچا شاعر صاحب الہام ہوتا ہے واقعی یہ حمد ایسی ہے کہ عبادت کا پورا حکم رکھتی ہے اور ورد و وظیفہ کے کام کی ہے کون شخص مقر ذات باری ایسا ہے۔ جو اس کو پڑھ کر روحانی لطف نہیں اٹھا سکتا ہے کون مذہبی آدمی ایسا ہے جو اِس حمد کو پڑھ کر دلولہ شوق کبریائی میں بیتاب نہیں ہو سکتا ہے اس حمد کا کوئی شعر ایسا نہیں ہے جو منتخب نہ ہو وقت انتخاب قوت انتخاب جواب دینے لگتی ہے نہیں معلوم ہوتا کہ کس شعر کو انتخاب کیجیئے اور کس کو ترک کیجیئے سلسلہ سخن ایسا خوب ہے، کہ اِس کی درہمی طبیعت گوارا نہیں کرتی ناچار چند شعر بلا قصد انتخاب ذیل میں عرض کیئے جاتے ہیں ؛

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؁

کروں پہلے توحید یزدان رقم	جھکا جس کے سجدے کو اوّل قلم
قلم پھر شہادت کی انگلی اٹھا	ہوا حرف زن یوں کہ رب العلا
نہیں تیرا کوئی نہ ہوگا شریک	تری ذات ہے وحدہٗ لاشریک

پرستش کے قابل ہے تو اے کریم ۔ کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم
رہ حمد میں تیری عز و جل ۔ تجھے سجدے کرتا چلوں سر کے بل
وہ الحق کہ ایسا ہی معبود ہے ۔ قلم جو لکھے اس سے افزود ہے
سبھوں کا وہی دین و ایمان ہے ۔ یہ ہیں دل تمام اور وہی جان ہے
وہ ظاہر ہیں ہر چند ظاہر نہیں ۔ یہ ظاہر کوئی اس سے باہر نہیں
نہیں اس سے خالی غرض کوئی شے ۔ وہ کچھ شے نہیں پر ہر اک شے میں ہے
نہ گوہر میں ہے وہ نہ ہے سنگ میں ۔ ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

ذیل میں کچھ اشعار نعت عرض کئے جاتے ہیں میر حسن نے نعت ایسی لکھی ہے کہ قوت انتخاب کو اس میں دخل نہیں ہے ؛

نبی کون یعنی رسولِ کریم ۔ نبوت کے دریا کا دُرِّ یتیم
ہُوا گو کہ ظاہر میں اُمّی لقب ۔ پہ علم لدُنی کھلا دل پہ سب
بغیر از لکھے اور کئے بے رقم ۔ چلے حکم پر اُس کے لوح و قلم
ہُوا علم دین اُس کا جو آشکار ۔ گذشتہ ہوئے حکم تقویم پار
اُٹھا کفر اسلام ظاہر کیا ۔ بتوں کو خدائی سے باہر کیا
محمدؐ کے مانند جگ میں نہیں ۔ ہُوا ہے نہ ایسا نہ ہوگا کہیں
یہ تھی رمز جو اس کے سایا نہ تھا ۔ کہ رنگ دوئی واں تک آیا نہ تھا

اس کے بعد میر حسن سایہ کے نہ ہونے کی اور وجہیں بھی لکھتے ہیں سبحان اللہ کیا قادر الکلامی ہے اہل شوق بقیہ اشعار کو ان کی مثنوی میں ملاحظہ فرمالیں حمد و نعت کے بعد منقبت امیر المومنین علیہ السلام کے اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

نہیں ہمسر اُس کا کوئی جز علیؓ
کہ بھائی کا بھائی وصی کا وصی

ہوئی جو نبوت نبی پہ تمام
ہوئی نعمت اس کی علی پہ تمام

جہاں فیض سے اس کے ہے کامیاب
نبیؐ آفتاب و علی ماہتاب

علیؓ دین و دنیا کا سردار ہے
کہ مختار کے گھر کا مختار ہے

دیار امامت کے گلشن کا گُل
بہارِ ولایت کا باغ سنبل

علی راز دار خدا و نبیؐ
خبر دار سر خفی و جلی

علیؓ بندہ خاص درگاہِ حق
علیؓ سالک و رہبر راہ حق

علیؓ ولی ابن عم رسولؐ
لقب شاہ مرداںؓ زوج بتولؓ

کسے یوں جو چاہے کوئی بیر سے
یہ نسبت علیؓ کو نہیں غیر سے

خدا نفس پیغمبرش خواندہ است
دگر را فضیلت کجا ماندہ است

یہاں بات کی اب سمائی نہیں
نبیؐ و علیؓ میں جدائی نہیں

نبیؐ و علیؓ ہر دو نسبت بہم
دو تا دیکھے چوں زبان قلم

علی کا عدو دوزخی دوزخی
علیؓ کا محب جنتی جنتی

نبیؐ و علیؓ فاطمہؓ اور حسنؓ
حسین ابن حیدر یہ ہیں پنجتن

ہوئی اُن پہ جگ کی خوبی تمام
انھوں پر درود اور انھوں پر سلام

علیؓ سے لگا تا بہ مہدی دین
یہ ہیں ایک نور خدا سے بریں

اُنھوں سے ہے قائم امامت کا گھر
کہ بارہ ستوں ہیں یہ اثنا عشر

صغیرہ کبیرہ سے یہ پاک ہیں
حسابِ عمل سے یہ بیباک ہیں

ہوا یاں سے ظاہر کمال رسولؐ
کہ بہتر ہوئی سب سے آلِ رسولؐ

واضح ہو کہ اشعار بالا کس قدر مبالغہ سے پاک ہیں دوستدار خاندان محمد صلعم کا جیسا عقیدہ ہونا چاہئے اس سے کوئی شعر ایک حرف برابر بھی کم و بیش نہیں ہے سبحان اللہ، کیا شاعری ہے کہ مبالغہ سے تمامتر پاک ہے درحقیقت میر حسن کی حمد و نعت و منقبت میں مبالغہ کی جھلک بھی نظر نہیں آتی ہے اس کے ساتھ شاعری کا جلوہ وہی ہے جیسا کہ ہونا چاہئے اس سے معلوم ہؤا کہ سچی شاعری مطلق مبالغہ پردازی کی محتاج نہیں ہے ۔

میر حسن نے اصحاب پاک رضوان اللہ علیہم کی تعریف بھی ایسی لکھی ہے کہ کیا کہنا اس سے زیادہ کیا سچی تعریف ہو سکتی ہے آپ فرماتے ہیں :-

سلام اُن پہ جو اس کے اصحاب ہیں	وہ اصحاب کیسے کہ احباب ہیں
خدا نے انھوں کو کہا مومنین	وہ ہیں زینت آسمان و زمین
خدا اُن سے راضی رسولؐ ان سے خوش	علیؓ ان سے راضی بتولؓ اُن سے خوش
ہوئی فرض ان کی ہمیں دوستی	کہ ہیں دل سے وہ جاں نثار نبیؐ

مناجات کے اشعار ورد رکھنے کے قابل ہیں اس سے بہتر مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات کیا ہو سکتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن جس شئے کو لکھتے ہیں اس کے مغز کو پہنچ جاتے ہیں پوست و استخوان و لغو و حشو سے تمامتر کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں ۔

اشعارِ مناجات

الٰہی بحق رسولؐ امیں	بحق علیؑ و باصحاب دیں
بحق بتولؑ و بہ آل رسولؐ	کروں عرض جو ئیں سو ہووے قبول
الٰہی میں بندہ گنہگار ہوں	گناہوں میں اپنے گرانبار ہوں
مجھے بخشیو میرے پروردگار	کہ تو ہے کریم اور آمرزگار

مری عرض ہے یہ کہ جبتک جیوں | شراب محبت کو تیری پیوں
سوا تیری الفت کے اور سب ہے ہیچ | یہی ہو۔ نہ ہو اور کچھ ایچ پیچ
جو غم ہو تو ہو آل احمد کا غم | سوا اس الم کے نہ ہو کچھ الم
رہے سب طرف سے مرے دل کو چین | بحق حسنؑ اور بحق حسینؑ
کسی سے نہ کرنی پڑے التجا | تو کر خود بخود میری حاجت روا
صحیح اور سالم سدا مجھ کو رکھ | خوشی سے ہمیشہ خدا مجھ کو رکھ
مری آل و اولاد کو شاد رکھ | مرے دوستوں کو تو آباد رکھ
مَیں کھاتا ہوں جس کا نمک اے کریم | سدا رحم کر اُن پہ تو اے رحیم
جیوں آبرو اور حرمت کے ساتھ | رہوں میں عزیزوں میں عزت کے ساتھ
بر آویں مرے دین و دنیا کے کام | بحق محمد علیہ السلام

واضح ہو کہ اس مناجات میں میر حسن نے اپنے آقا کو فراموش نہیں کیا بحضور خداوند دوجہاں بھی ادائے حق نمک میں پہلو تہی جائز نہ رکھی اس انداز کلام سے کس قدر اخلاقی تعلیم مترشح ہے پاس نمک کیا عظیم شے ہے آدمی کو ناسپاس نہیں ہونا چاہیئے ناسپاس دشمن خدا اور بدخواہ نبی آدم ہوتا ہے اسی لئے اسلام شکر گزاری کا موکد ہے ؛

حمد و نعت و منقبت و تعریف صحابہ و مناجات کے بعد میر حسن سخن کی تعریف زیب رقم فرماتے ہیں، بلا قصد انتخاب دو شعر ان کی تعریف سخن سے ذیل میں عرض کئے جاتے ہیں ؛

سخن کا سدا گرم بازار ہے | سخن سنج اُس کا خریدار ہے
رہے جب تلک داستان سخن | الٰہی رہیں قدردان سخن

اس کے بعد حضرت مصنف شاہ عالم بادشاہ کی مدح صرف چار شعروں میں ختم کر کے نواب

آصف الدولہ کی مدح میں بہت اشعار حوالۂ قلم فرمائے ہیں مگر اس مختصر مدح میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ شاہ عالم اور آصف الدولہ کے فرق مراتب کو دکھلا دیتے ہیں

وہ مہر منور یہ ماہِ منیر — اور اس کا یہ نجم سعادت وزیر

آصف الدولہ کی مدح ویسی ہے جیسی کہ الیشیائی شعراء لکھا کرتے ہیں مگر دو مقام اس میں قابل لحاظ ہیں ایک یہ کہ ممدوح کی سخاوت کے بیان میں میر حسن یوں لکھتے ہیں۔

سوا اس کے ہے اور یہ داستان — کہ ہو جس پہ قربان حاتم کی جان
ہوئی کم جو اک بار کچھ برشگال — گرانی سی ہونے لگی ایک سال
غریبوں کا دم سا نکلنے لگا — توکل کا بھی پانوں چلنے لگا
وزیر الممالک نے تدبیر کر — خدا کی دیا راہ میں مال و زر
محلہ محلہ کیا حکم یہ — کہ باڑی سے اس غم کے کھولیں گرہ
یہ چاہا کہ خلقت کسی ڈھب جیئے — کئی لاکھ لاکھ ایک دن میں دیئے
یہ لغزش پڑی ملک میں جو تمام — لیا ہاتھ نے اس کے گرتوں کو تھام

ان اشعار کی حکمت آموزی میں کیا گفتگو ہو سکتی ہے اس کی تمام خوبیاں محتاج بیان نہیں ہیں اس صدی کے شائستہ حکمران بھی اگر کریں گے تو اتنا ہی کریں گے ہوشیار سے ہوشیار گورنمنٹ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی ہے سخاوت کی تعریف میں کمتر کسی شاعر نے ایسا بکار آمد مضمون حوالۂ قلم کیا ہے دوسرا مقام قابل لحاظ یہ ہے کہ سخاوت کے بیان میں حضرت مصنف ممدوح کے مذاق شکار کا ذکر فرماتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ مذاق شکار بڑی سپاہی مزاجی سے خبر دیتا ہے افسوس ہے کہ ہم مسلمانان ہند خاص کر مسلمانان بہار سے اس کا مذاق بالکل جاتا رہا ہے۔ اگر یہ مذاق ہمارے ہم وطنوں کو باقی رہتا تو یہاں کے نوجوانوں کو ایسی مہمل چیزوں کی طرف میلان نہ ہوتا۔ جن سے

قوی غارت ہو جاتے ہیں خیالات پست ہو جاتے ہیں چستی اور چالاکی جاتی رہتی ہے اور ہر طرح کی کاہلیاں لاحق ہو جانے سے وہ نہ دنیا اور دین کے رہتے ہیں، اللھم احفظنا من شرور انفسنا و سیئات اعمالنا وارحمنا یا ارحم الراحمین ؁

مدح نواب کے بعد میر حسن اپنی مثنوی کو عجز و انکسار کے ساتھ پیشکش ممدوح فرماتے ہیں اور عذر تقصیر ایک خوش اسلوب پیرایۂ شاعری میں بجا لاتے ہیں مصنف کا عجز و انکسار و عذر سب کا سب فطری سلاست سے معمور ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت مصنف ایک بڑے نیچرل شاعر تھے، جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوتا جائے گا۔

اب راقم اس مثنوی کی ہر داستان پر علٰحدہ علٰحدہ ریویو تحریر کرتا ہے حضرات ناظرین باتمکین سے امید توجہ فرمائی ہے۔

آغازِ داستان

اس مثنوی کا قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ کسی شہر میں کوئی شہنشاہ تھا جس کے ماتحت کئی خراج گزار بادشاہ تھے اس کا ملک نہایت آباد تھا اور اس کی رعایا نہایت مرفہ حال تھی اسے لاولدی کے سوا کوئی غم نہ تھا اس غم سے وہ ایسا شکستہ ہو رہا تھا کہ آخر اس نے سلطنت چھوڑ کر فقیری اختیار کرنے کا قصد کیا وزیروں نے بہت سمجھایا اور یوں عرض کی کہ

فقیری جو کیجے تو دنیا کے ساتھ　　نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ

پھر اولاد کے غم کو دور کرنے کی نظر سے اس طرح عرض پرداز ہوئے

مگر ہاں یہ اولاد کا ہے جو غم　　سو اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم
عجب کیا کہ ہووے تمہارے خلف　　کرو تم نہ اوقات اپنی تلف
نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو　　کہ قرآں میں آیا ہے لاتقنطوا

بلاتے ہیں ہم اہلِ تنجیم کو — نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو

اس طرح بادشاہ کو تسلی دے کر وزراء نے نجومی، رمال اور برہمن بلائے ان سبھوں نے اپنے اپنے علم کی رو سے بادشاہ کو اولاد کی خوشخبری دی ان طالع شناسوں میں سے برہمن نے یوں گذارش کی

مقرر ترے چاہیئے ہو پسر — کہ دیتی ہے یوں اپنی پوتھی خبر
ولیکن مقدر ہے کچھ اور بھی — کہ ہیں اس بھلے میں بُرے طور بھی
یہ لڑکا تو ہوگا ولے کیا کہیں — خطر ہے اسے بارھویں سال میں
نہ اٹھے یہ خورشید بالائے بام — بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام
نہ نکلے یہ بارہ برس رشکِ مہ — رہے برج میں یہ مہ چاردہ

بادشاہ نے یہ کیفیت دریافت کر کے نہایت فطری انداز سے پوچھا کہ اس کی جان کا خطرہ تو نہیں ہے تس پر برہمن نے

کہا جان کی سب طرح خیر ہے — مگر دشتِ غربت کی کچھ سیر ہے

اس کے سننے سے

ہوئی کچھ خوشی شہ کو اور کچھ الم — کہ دنیا میں توام ہیں شادی و غم

اس سب گفتگو کے بعد اہلِ تنجیم رخصت ہوئے، بادشاہ نے بڑے اعتقاد کے ساتھ خدا سے اولاد کی دعا مانگنی شروع کی جو دعا دل سے کی جاتی ہے وہ قبول بھی ہوتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ خدا نے بادشاہ کو ایک صاحب جمال جیتا جاگتا بیٹا مرحمت فرمایا اس داستان کا خلاصہ اسی قدر ہے مگر میرحسن نے طول و بسط کے ساتھ مضامین بالا کو منظوم کیا ہے، لیکن بندش مضامین میں تناسب کلام کا بڑا لحاظ رکھا ہے اس داستان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمام مضامین ایک ایشیائی بلکہ ایک ہندوستانی مسلمان بادشاہ کے معاملات

ذاتی سے تعلق رکھتے ہیں لاولدی کے غم میں ترک سلطنت کا خیال کمتر کسی یوروپین بادشاہ کے
دماغ میں جگہ کرسکتا ہے اس کے علاوہ وزرا ارکا اہل تنجیم کو بلوانا اور ان سے طالع بادشاہ
کی کیفیت کو دریافت کرانا بھی ہندوستانی ریاستوں کے معمولات سے خبر دیتا ہے واضح ہو کہ
شاہان دہلی اور دیگر فرمانروایان ہندوستان کے درباروں سے ہمیشہ اہل تنجیم متعلق رہتے تھے
اور اکثر امور اہم انھیں طالع شناسوں کی ہدایتوں کے مطابق تکمیل پاتے تھے، اسلام کی رو
سے علم نجوم ورمل وغیرہ لاشئے متصوّر ہیں بلکہ ان پر کسی قسم کا اعتقاد رکھنا ممنوعات سے
ہے مگر چونکہ یہ سب علوم کہ درحقیقت علم کا حکم نہیں رکھتے ہیں ایک عرصہ دراز سے شاہان ہنود
کے زمانہ میں مروج تھے، اسلامی بادشاہوں نے بھی انھیں جاری رہنے دیا، یہاں میر حسن
نجومیوں کی طالع شناسی کے حالات کو لکھ کر بادشاہ کے اسلامی عقیدہ کی طرف فوراً رجوع
کرتے ہیں اگر کسی ہندو بادشاہ کا معاملہ بیان کرتے تو برہمن کی پوتھی کے خلاف میں یہ نہ کہتے

کہا شہ نے اس پہ نہیں اعتبار   جو چاہے کرے میرا پروردگار

سبحان اللہ حضرت مصنف چونکہ عجب شاعر واقعہ نگار ہیں ہر قدم پر تناسب کلام کو کس قدر ملحوظ
رکھتے ہیں اسی طرح حضرت کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی چند بیبیاں تھیں
ان میں سے ایک حاملہ ہوئیں یہ کثرت ازدواج برائے خود ایک ایشیائی معاملہ سے خبر دیتی ہے
المختصر اس داستان میں میر حسن نے ایک حسب مراد ایشیائی بادشاہ کی پوری تصویر کھینچی ہے
اجزائے داستان پر از تناسب ہیں اور حضرت مصنف کی بڑی قابلیت شاعری سے خبر دیتے
ہیں وہ جزو داستان جس میں نجومی رمال اور برہمن کے معاملات حوالہ قلم ہیں بہت قابل لحاظ
ہے یہ ایک پورا فوٹو ہندوستان کے مختلف طالع شناسوں کا ہے اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ حضرت مصنف کو ایسے فن والوں کے حالات سے کافی اطلاع تھی +

داستان تولّد ہونے شاہزادہ بے نظیر کی

اس داستان میں بادشاہ کے بیٹا ہونے کا بیان ہوا ہے' ایسی خوشی کی تقریب میں ہندوستانی سلاطین کے محلوں میں کیونکہ خوشی رچائی جاتی ہے اس کی پوری تصویر میر حسن نے کھینچی ہے ساقی نامہ کے رنگ کے دو شعر لکھ کر حضرت مصنف لکھتے ہیں کہ جب نو مہینے گزرے تو ایک فرزند صاحب جمال پیدا ہوا۔ خواصوں اور خواجہ سراؤں نے بحضورِ بادشاہ حاضر ہو کر نذریں گزرانیں اور وارث تاج و تخت پیدا ہونے کی مبارک بادیں دیں جب بادشاہ کو یہ مژدہ پہنچا، بادشاہ نے جانماز بچھا کر بہت کچھ سجدۂ شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ ؎

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

اس کے بعد خواصوں اور خوجوں کی نذریں قبول فرما کر انھیں خلعت و زر بخشا، بعد ازاں جشن کا حکم دیا ہر طرح کے ارباب نشاط حاضر ہوتے گئے اس جگہ حضرت مصنف تفصیل وار ہر قسم کے باجوں کا ذکر کرتے ہیں اور معاملات موسیقی سے پوری اطلاع دکھلاتے ہیں کوئی سامان طرب و نشاط اٹھا نہیں رکھا ہے' پھر خوشی کی تقریبوں میں جو سلاطین انعامات تقسیم کرتے ہیں اس کا مشرح بیان بڑی اسلوبی سے حوالۂ قلم کیا ہے آپ فرماتے ہیں :-

دیئے شاہ نے شاہزادے کے ناؤں مشائخ کو اور پیرزادوں کو گانوں
امیروں کو جاگیر لشکر کو زر وزیروں کو الماس و لعل و گہر
خواصوں کو خوجوں کو جوڑے دیئے پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دیئے
خوشی میں کیا یاں تلک زر نثار جسے ایک دینا تھا بخشے ہزار

المختصر اس داستان میں یہ خوشی کی تقریب ایسی قابلیت کے ساتھ حوالۂ قلم ہوئی ہے کہ کیا کہنا واقعی لطف بیان سے حضرت مصنف نے اس خوشی کا ایک نادر فوٹو کھینچا ہے کمال

شاعری یہ ہے کہ سارے بیانات مصوری کا حکم رکھتے ہیں واقعی میر حسن کی فطرت نگاری بڑے غضب کی ہے ایسی تقریبوں میں جو راگ رنگ اور دھوم دھام کی کیفیتیں ہندوستان میں ہوا کرتی ہیں، سبحان اللہ کس خوا صورتی کے ساتھ پیرایۂ نظم میں در آئی ہیں کہ ان کے پڑھنے سے غیر ملک کے آدمی کو ہر قسم کے رواج ملکی سے بڑی صحت کے ساتھ اطلاع پیدا ہو جا سکتی ہے یہی کیفیت "الف لیلہ" کی بھی ہے کہ ملک شام و مصر وغیرہ کے رسم و رواج اس میں بڑی عمدگی کے ساتھ ذکر پاتے ہیں۔ پیدائش مولود کی کیفیت لکھ کر میر حسن اس کی چھٹی کا ذکر کرتے ہیں، پھر اس کے دودھ بڑھانے کا حال رقم کرتے ہیں پھر جب اس نے اور زیادہ سن پایا، تب اس کے واسطے جو ایک باغ اس کے باپ نے تیار کیا اس کا بیان بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ داستان ذیل میں جو آگے قلم فرماتے ہیں، سبحان اللہ کیا حسن کلام اور تناسب بیان ہے:

داستان تیاری باغ کے بیان میں

حضرت مصنف اس داستان میں باغ و مکان کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں جس سے ایشیائی مذاق باغ و مکان کی پوری کیفیت نمایاں ہوتی ہے ایشیائی سلاطین و امرا کے باغات و مکانات ایسے ہی ہوتے ہیں اب البتہ ہندوستان میں ترتیب باغات و مکانات میں یورپین مذاق کو بڑا دخل ہو گیا ہے ورنہ پہلے عمائد کے باغات و مکانات اسی ڈھب سے آراستہ کئے جاتے تھے جس طرح یہ اس مثنوی میں زیب رقم ہوئے ہیں یہ بیانات میر حسن کی بڑی قوت شاعری سے خبر دیتے ہیں واقعی خارجی شاعری میں اس شاعر گرامی کو بڑی قوت حاصل تھی یہ وہ قوت ہے کہ میر صاحب اور مومن خان کو فطرت نے نہیں بخشی تھی جیسا کہ ان شاعران نامی کی مثنویوں سے ہویدا ہے۔ جاننا چاہئے

کہ مثنوی نگاری کے لئے خارجی شاعری پر بھی بڑی قوت کا حاصل رہنا واجبات سے ہے جس قوت کی عدم موجودگی سے مثنوی نگاری کے پورے حقوق ادا نہیں ہو سکتے، حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اشعار ذیل میں حضرت مصنف نے کس قدر اپنی اس قوت کا اظہار فرمایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایشیائی سلطان یا امیر کا مکان اور باغ پیش نظر ہو رہا ہے

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ — ہُوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہُوا — کوئی زہ بہ خوبی سے لٹکا ہُوا
وہ مقیش کی ڈوریاں سر بسر — کہ مہ کا بندھا جس میں تار نظر
چھتوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال — نگہ کو وہاں سے گزر نا محال
سنہری مغرق چھتیں ساریاں — وہ دیوار اور در کی گلکاریاں
ٹبے ہر طرف آئینے جو لگا — گیا چوگنا لطف اُس میں سما
وہ مخمل کا فرش اس کا ستھرا کہ بس — بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس
رہیں مخلیے اُس میں روشن مدام — معطر شب و روز جس سے مشام
چھپر کھٹ مرصع وہ دالان میں — چمکتا دمکتا تھا ہر آن میں
زمیں پر تھی اس طور اس کی جھمک — ستاروں کی جیسے فلک پہ چمک
زمیں کا کروں اس کی کیا میں بیاں — کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں
بنی سنگ مرمر کی چوپڑ کی نہر — گئی چار سو اس کے پانی کی لہر
قرینے سے گرد اس کے سرو سہی — ذرا دور دور اس سے سیب و بہی

کہوں کیا میں کیفیت دار لبست
لگائے رہیں تاک واں مے پرست

ہمائے بہاری سے کچھ لیلیے
چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے

زمرد کے مانند سبزے کا رنگ
روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

روش کی صفائی پہ بے اختیار
گل اشرفی نے کیا زر نثار

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن
کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن

چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا
کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشاں
مدن بان کی اور رہی آن بان

کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار
جدی اپنے موسم میں سب کی بہار

کہیں جعفری اور گیندا کہیں
سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار
ہر اک گل سفیدی سے مہتاب وار

کھڑے سرو کی طرح چنپا کے جھاڑ
کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

کہیں زرد نسرین کہیں نسترن
عجب رنگ کے زعفرانی چمن

پڑا آب جو ہر طرف کو بہے
کریں قمریاں سرو پر چہچہے

گلوں کا لب نہر پر جھومنا
اُسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پر
نشے کا سا عالم گلستاں پر

لیے ہاتھ میں بیلچے مالنیں
چمن کو لگیں دیکھنے بھالنے

کہیں تخم پاشی کریں گود کر
پنیری جما دیں کہیں کھود کر

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال

لب جو یہ آئینے میں دیکھ قد
اکڑ نا کھڑے سرو کا جد نہ تد

خراماں صبا صحن میں چار سو | دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو
کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے | بہے ساتھ مرغابیوں کے پرے
صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور | درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
چمن آتش گل سے دہکا ہوا | ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
صبا ہو گئی ڈھیریاں کر کے پھول | پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول
وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھاؤں | لگی جائیں آنکھیں لیے جس کا ناؤں
خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں | تعشق کی آپس میں باتیں کریں
درختوں نے برگوں کے کھولے ورق | کہ لیں طوطیاں بوستاں کا سبق
سماں قمریاں دیکھ اس آن کا | پڑھیں باب پنجم گلستان کا

یہاں تک باغ و مکان کا حال بیان کر کے میر حسن دوادائیاں مغلانیاں خواص وغیرہ کا ذکر جو اس باغ میں خدمت بے نظیر کے واسطے مقرر تھیں کرتے ہیں یہ بیان بھی تمام تر ایشیائی سلاطین و امراء کے محلوں کی تصویر ہے اس کے بعد بے نظیر کی تعلیم و تربیت کا مذکور ہے یہ بھی ایک ایشیائی شاہزادے یا امیر زادے کے طریقہ تعلیم کی تصویر ہے شاہان اسلام کے وقت میں جو اہل ثروت کی تعلیم کا طور تھا اس کا پورا فوٹو حضرت مصنف نے کھینچا ہے یہ بیان بھی خالی از نفع نہیں ہے میر حسن مختلف علوم و فنون کا ذکر کر کے بے نظیر کے نتیجہ اخلاقی تعلیم کے مضمون کو بھی نہیں فراموش کرتے ہیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

سوا ان کمالوں کے کتنے کمال | مروت کی خو آدمیت کی چال
رذالوں سے نفروں سے نفرت اسے | سدا قابلوں سے ہی صحبت اسے
گیا نام پر اپنے وہ دلپذیر | ہر اک فن میں یکتا ہوا بے نظیر

داستان سواری کی تیاری کے حکم میں

اس داستان میں بادشاہ کا یہ حکم صادر فرمانا مذکور ہے کہ کل شاہزادہ سیر باغ کو جائے گا اس سیر سے مطلب بادشاہ کا یہ تھا کہ شاہزادہ جب شہر سے ہو کر گزرے گا تو شہر کی رعایا کو وارث تاج و تخت کے دیکھنے کا موقع ملے گا اس کی پولٹیکل مصلحت محتاج بیان نہیں ہے بادشاہ کو سیر کی اجازت دینے کی یہ وجہ ہوئی کہ جو روز شاہزادہ سیر کو نکلنے کو تھا وہ شاہزادہ کی عمر کے بارھویں سال آخر دن کے بعد کا قیاس کیا گیا تھا یعنی اہل تنجیم کے قول کے مطابق وہ دن قرار دیا گیا تھا جس کے ایک دن پہلے خطرہ کی گرہ کٹ جا چکی تھی مگر آئندہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کے حساب سے غلطی سرزد ہوئی تھی جس سے نتیجہ بد مترتب ہوا اور اہل تنجیم کا قول راست آیا واضح ہو کہ اہل تنجیم کو ہر قوم میں دخل رہا ہے البتہ اس وقت کی علم پرور قومیں نجومیوں کے اقوال پر نہ کچھ اعتبار رکھتی ہیں اور نہ ان کے فن کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اقوام دنیا میں سب سے پہلے اہل اسلام نے نجومیوں کو جھوٹا سمجھا اور اس رو سے کہ ان کے پیشوا حضرت رسول اللہ صلعم نے اُن کی تکذیب فرمائی اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ فن تنجیم کو جسے اہل ہند جوتش کہتے ہیں علم ہیئت کا رتبہ حاصل نہیں ہے۔ عہد اسلام کے پہلے جتنی بت پرست قومیں تھیں اہل تنجیم کو قابل اعتبار مانتی تھیں اور اس وقت کی بت پرست قومیں بھی انھیں اسی عظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی اہل تنجیم کا قول صادق بھی آ جاتا ہے مگر ان کے اقوال ہرگز اس قابل نہیں ہوتے کہ اُن پر ہمیشہ تکیہ کیا جائے جس طرح اس کہانی میں میرحسن اہل تنجیم کے قول کا صادق آنا لکھتے ہیں اسی طرح ر جولیس [illegible] یعنی روم کے قیصر اول کی حکایت مندرج کتب تاریخ دیکھی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قیصر مذکور سے ایک

منجم نے کہا تھا کہ مارچ کی پندرھویں تاریخ سے ہوشیار رہنا، جب وہ تاریخ آئی قیصر کی اس منجم سے راہ میں ملاقات ہوئی۔ قیصر نے منجم سے کہا کہ کہو آج پندرھویں تاریخ مارچ کی ہے۔ منجم نے کہا ہاں وہ تاریخ آئی ہے مگر ابھی تک گزر نہیں گئی ہے، اس سے تھوڑی ہی دیر کے بعد قیصر مارا گیا اور منجم کا قول راست نکلا بہر حال اس داستان میں میر حسن نے "ساقی نامہ" کے اشعار ذیل خوب لکھے ہیں :-

پلا ساقیا مجھ کو اک جام مُل — جوانی پہ آیا ہے ایام گل
غنیمت شمر صحبت دوستاں — کہ گل پنج روز است در بوستاں
ثمر سے بھلائی کا گر ہو سکے — شتابی سے بو لے جو کچھ بو سکے
کہ رنگ چمن پر نہیں اعتبار — یہاں چرخ میں ہے خزاں و بہار

داستان حمام میں نہانے کی لطافت میں

اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب صبح ہوئی تو بادشاہ نے بیٹے سے فرمایا کہ بابا نہا دھو کر سیر کے لئے تیار ہو، حسب حکم شاہ بے نظیر حمام میں گیا اس کے بعد شاہی سواری بڑی تیاری سے نکلی جب سیر سے پھر کر بے نظیر واپس آیا تو اس نے شب ماہ میں کوٹھے پر آرام کرنے کی خواہش ظاہر کی بادشاہ نے اجازت دی مگر وہ رات عرصہ دوازدہ سال کے اندر پڑتی تھی لیکن حساب کی غلطی کے باعث اس کی خبر بادشاہ کو نہ تھی جب بنظیر نے کوٹھے پر آرام کیا، ہونے والی بات جو ہونے کو تھا ظہور میں آیا پہرا چوکی سے کوئی کام نہ نکلا۔ ومن المکتوب لامفر ولامهرب ؂

یوں تو میر حسن کا کوئی شعر لطف شاعری سے خالی نہیں ہوتا مگر اس داستان

کے دو جزو اس جگہ قابل داد ہیں، اول بے نظیر کا حمام میں غسل کرنا، دوم سواری کی تیاری یہ دونوں جزو خارجی شاعری کے بڑے کمال سے خبر دیتے ہیں آفرین صد آفرین حقیقت یہ ہے کہ جب تک خارجی شاعری پر اتنی قدرت نہ ہو شاعر کو مثنوی نگاری کا قصد نہیں کرنا چاہیے، واقعی میر حسن ہمارے ہندوستان کے شکسپیر ہیں جو خارجی اور داخلی دونوں شاعریوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اگر اردو میں ڈراما نگاری ہوتی تو ہندوستان میں میر حسن ہی کالیداس کے ہم پلہ اس صنف شاعری کے اعتبار سے نکلتے، بہرحال اب حضرات ناظرین پہلے کیفیت حمام کے بیان پر توجہ فرمائیں، حضرت مصنف فرماتے ہیں:-

ہوا جب کہ داخل وہ حمام میں — عرق آگیا اُس کے اندام میں
تن نازنیں نم ہوا اُس کا کُل — کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل
پرستارہ باندھے ہوئے لنگیاں — مہ و مہر سے طاس لے کر وہاں
لگے ملنے اُس گلبدن کا بدن — ہوا ڈہڈہا آب سے وہ چمن
نہانے میں یوں تھی بدن کی دمک — برسنے میں بجلی کی جیسے چمک
لبوں پر جو پانی پڑا سربسر — نظر آئے جیسے دو گلبرگ تر
ہوا قطرۂ آب یوں چشم بوس — کہے تو پڑی جیسے نرگس پہ اوس
لگا ہونے ظاہر یہ اعجاز حسن — ٹپکنے لگا اس سے انداز حسن
گیا حوض میں جب شہ بے نظیر — پڑا آب میں عکس ماہ منیر
وہ گورا بدن اور بال اُس کے تر — کہے تو کہ ساون کی شام و سحر
نمی سے تھا بالوں کا عالم عجب — نہ دیکھی کوئی خوب تب اُس سے شب
کہوں اس کی خوبی کی کیا تجھ سے بات — کہ جوں بھیگتی جائے صحبت میں رات

زمیں پر تھا اک موجۂ نور خیز — ہوا جب وہ فوارہ ساں آب ریز
زمرد کے لے ہاتھ میں سنگ پا — کیا خادموں نے وہ آہنگ پا
ہنسا کھلکھلا وہ گل نوبہار — لیا کھینچ پانوں کو بے اختیار
عجب عالم اس نازنیں کا ہوا — اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا
ہنسا اس ادا سے کہ سب ہنس پڑے — ہوئے جی سے قربان چھوٹے بڑے
دعائیں لگے دینے بے اختیار — کہا خوش رکھے تجھ کو پروردگار
کہ تیری خوشی سے ہے سب کی خوشی — مبارک تجھے روز و شب کی خوشی
نہ آوے کبھی تیری خاطر پہ میل — چمکتا رہے یہ فلک کا سہیل
کیا غسل جب اس لطافت کے ساتھ — اڑھا کھیس لائے اسے ہاتھوں ہاتھ
نہا دھو کے نکلا وہ گل اس طرح — کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

اہل انصاف جو کچھ اس فطری شاعری کی داد دیں بجا ہے بعد غسل کرنے کے بینظیر نے جو پوشاک پہنی اور جس طرح زیورات سے آراستہ کیا گیا اس کا بیان بھی ایک ایشیائی شاہزادہ کے تمامتر حسب حال ہے خوف طوالت سے راقم حضرت مصنف کے ان اشعار کو یہاں درج نہیں کرتا ہے دوسرا فوٹو جو حضرات ناظرین کے قابل توجہ ہے یہ ہے کہ میر حسن بڑی خوبی کے ساتھ بادشاہ اور بادشاہزادے کی سواری کی تیاری اور روانگی کو بیان فرماتے ہیں. یہ بیان ایسا ہے جس میں خس بھر بھی مبالغہ یا جھوٹ کو لگاؤ نہیں ہے لاریب میر حسن کے بیانات رسم و رواج ملکی سے نہایت صحت کے ساتھ خبر دیتے ہیں جس داستان میں دیکھئے کچھ نہ کچھ ملکی بیانات ایسے ہیں کہ تمامتر اہل مذاق کی پسندیدگی کے قابل ہیں یہی کیفیت کتاب "الف لیلہ" کی ہے کہ اس میں چند اسلامی

ملکوں کے مراسم وغیرہ نہایت عمدگی کے ساتھ اندراج پائے ہیں۔ اہل واقفیت "الف لیلہ" کی نسبت لکھتے ہیں کہ بہت سے مضامین رسم و رواج اس کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ درج پائے ہیں کہ سیاحوں کو بھی اُن سے ایسی صحت کے ساتھ مطلع ہونے کا موقع نہیں ملا ہے اسی طرح اس مثنوی میں بھی بہت ملکی معاملات ایسی عمدگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ان سے بہتر بیان صورت امکان نہیں رکھتا ہے بڑے بڑے شاہانِ دہلی کی سواریاں جس طور پر نکلتی تھیں اُس کی پوری تصویر اشعار ذیل میں نظر آتی ہے، فقیر کی دانست میں یہ بیان ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور ایسے سین کو پیش نظر کرتا ہے جس سے اکبر جہانگیر شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں :

نکل گھر سے جس دم ہُوا وہ سوار — کیئے خوانِ گوہر کے اُس پر نثار
زبس تھا سواری کا باہر ہجوم — ہُوا جبکہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم
برابر برابر کھڑے تھے سوار — ہزاروں ہی ہتی ہاتھیوں کی قطار

سواری شاہزادۂ بے نظیر جانب باغ

سنہری روپہلی وُہ عماریاں — شب و روز کی سی طرح داریاں
چمکتے ہوئے بادلے کے نشان — سواروں کے غٹ اور بالوں کی شان
ہزاروں ہی اطراف میں پالکی — جھلا بور کی جگمگی نالکی
کہاروں کی زربفت کی کرتیاں — اور ان کے ڈبے بانوں کی پھرتیاں
بندھیں پگڑیاں طاس کی سر اُوپر — چمکا چوند میں جس سے آوے نظر
وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے — جھلک جس کی ہر ہر قدم پر پڑے

وہ ماہی مراتب وہ سرو رواں
وہ نوبت کا دولہا کی جیسے سماں

وہ شہنائیوں کی صدا خوشنما
سہانی وہ نوبت کی آتی صدا

وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی
قدم با قدم بالباسِ زری

بجاتے ہوئے شادیانے تمام
چلے آگے آگے سلے شاد کام

سوار اور پیادے صغیر و کبیر
جلو میں تمامی امیر اور وزیر

وہ نذریں کہ جس جس نے تھیں ٹھانیاں
شہ و شاہزادے کو گذرانیاں

ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار
چلے سب قرینے سے باندھے قطار

بجے اور سجائے سبھی خاص و عام
لباس زری میں ملبّس تمام

طُرق کے طُرق اور پرے کے پرے
کچھ ادھر اُدھر کچھ ڈرے کچھ پرے

مرصع کے سازوں سے کوتل سمند
کہ خوبی میں روح القدس سے دوچند

وہ فیلوں کی اور میگ ڈمبر کی شان
جھلکتے وہ منقش کے سائبان

چلے پایۂ تخت کے ہو قریب
بدستور شاہانہ نیتی جریب

سواری کے آگے بپئے اہتمام
لئے سونے روپے کے عاصے تمام

نقیب اور جلودار اور چوب دار
بہ آلیس میں کہتے تھے ہر دم پکار

اُسی اپنے معمول و دستور سے
ادب سے تفاوت سے اور دور سے

بلانو جوالو بڑھے جایئو
دو جانب سے باگیں لیے آیئو

بڑھے جائے آگے سے چلتا قدم
بڑھے عمر و دولت قدم با قدم

غرض اس طرح سے سواری چلی
کہے تو کہ بادِ بہاری چلی

تماشائیوں کا جُدا تھا ہجوم
کہ ہر طرف تھی لاکھ عالم کی دھوم

لگا قلعے سے شہر کی حد تلک — دکانوں پہ تھی بادلے کی جھلک
منڈھے تھے تمامی سے دیوار و در — تمامی تھا وہ شہر سونے کا گھر
کیا تھا زبس شہر آئینہ بند — ہُوا چوک کا لُطف ازاں چار چند
رعیت کی کثرت ہجوم سپاہ — گذرتی تھی رک رک کے ہر جا نگاہ
ہوئے جمع کوٹھوں پہ جوں مرد و زن — ہر اک سطح تھی جوں زمین چمن
یہ خالق کی تھی قدرت کاملہ — تماشے کو نکلی زن حاملہ
لگا کُنج سے تا ضعیف و نحیف — تماشے کو نکلے وضیع و شریف
وحوش و طیور اُس گھڑی بر محل — پڑے آشیانوں سے اپنے نکل
نہ پہنچا جو اک مرغ قبلہ نما — سو وہ آشیانے میں تڑپا کیا

حضرت مصنف بادشاہ اور شاہزادے کی سیر سے واپس آنے اور شاہزادہ کے کوٹھے پر سونے کے حالات ختم کرنے کے بعد دنیا کی بے اعتباری پر جو اشعار لکھتے ہیں ذیل میں نذر ناظرین ہوتے ہیں واقعی یہ اشعار آب زر سے لکھے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں

قضا را وہ دن تھا اُسی سال کا — غلط وہم ماضی میں تھا حال کا
سخن مولوی کا یہ سچ ہے قدیم — کہ آگے قضا کے ہوا حمق حکیم
پڑے اپنے اپنے یہ سب عیش بیچ — نہ سمجھے زمانے کی کچھ اونچ نیچ
یہ جانا کہ یوں ہی رہے گا یہ دَور — نہ معلوم تھے اس زمانے کے طور
کہ اِس بوقلماں کی نئی ہے ترنگ — یہ گرگٹ بدلتا ہے ہر دم میں رنگ
کرا بادۂ عیش در جام ریخت — کہ بر فرق مجلس نہ صد شام ریخت
نداری تعجب ز نیرنگ دہر — کہ آرد ز یک حقہ تریاک و زہر

داستان شاہزادہ کے کوٹھے پر سونے کی اور پری کے اُڑا لے جانے کی

اس داستان میں اسی قدر بیان ہے کہ بے نظیر کوٹھے پر سوتا تھا کہ ایک پری اس کی مفتون ہو کر اُسے پرستان میں اُڑا لے گئی مگر اس داستان میں بھی حضرت مصنف نے شاعری کا خاتمہ کر دیا ہے پہلے تو "ساقی نامہ" کے اشعار آبدار لکھے ہیں اُن میں سے یہ شعر بہت قابل لحاظ ہے ؛

جوانی کہاں اور کہاں پھر یہ سن　　　مثل ہے کہ ہے چاندنی چار دن

بعد ازاں شاہزادہ کے پلنگ کا بیان صفتِ راستی کے باعث نہایت مطبوع معلوم ہوتا ہے۔ ایشیائی سلاطین و امراء کے پلنگ اسی ساز و سامان کے ہوتے ہیں ان اشعار میں سے پلنگ کی چادر کی تعریف کا یہ شعر نہایت قابل تحسین و آفرین ہے۔

کھنچی چادر اک اس پہ شبنم کی صاف　　　کہ ہو چاندنی جس صفا کی غلاف

خوف طوالت سے راقم اختصار پر اکتفا کرتا ہے ورنہ اور بھی اشعار اس جگہ درج کرنے کے قابل تھے واقعی حضرت مصنف کی شاعری کے کمالات کچھ ایسے نظر آتے ہیں کہ بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ہر شعر پر ریویو لکھئے بہر حال منجملہ بہت سے کمالات کے حضرت مصنف کے چند کمالات بہت کچھ قابلِ توجہ ہیں، اوّل یہ کہ جہاں صنعت تشبیہ کو دخل فرماتے ہیں وہاں تشبیہ کا ایسا انداز دیکھا جاتا ہے کہ دل کو تشبیہوں سے نفرت پیدا ہونے کے عوض ان کی طرف رغبت ہوتی ہے تشبیہوں کا استعمال خوش مذاقی کے ساتھ ہر شاعر کا کام نہیں ہے نہایت جائے تعجب ہے کہ میر حسن کثرت سے استعمال تشبیہات فرماتے ہیں اور ان کی سب تشبیہات

خوش آئند معلوم ہوتی ہیں بلکہ اکثر تشبیہات تو ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کی جدت خوش مذاقی لطافت اور صفائی کی تاثیر سے روح کو ایک حیرت انگیز تلذذ نصیب ہوتا ہے اُن کی تشبیہات کے اِس قدر مطبوع ہونے کا ظاہر اسبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تشبیہات میں بھی وہ فطرت کی راہ سے انحراف نہیں فرماتے ہیں یہ ایک خاص بات ہے جو ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتی۔ دوم یہ کہ اُن کے استعارات ان کی تشبیہات کی طرح فطری انداز کے ہوتے ہیں اور کبھی احاطۂ فطرت سے باہر نہیں جاتے سوم یہ کہ اُن کی مبالغہ پردازی جادۂ فطرت سے دور نہیں پڑتی ہے اِس لیئے اُن کے مبالغے مبالغہ کی طرح نفرت انگیز نہیں ہوتے چہارم یہ کہ سلسلۂ بیان ایسا فطری ہوتا ہے کہ نفس ذہن کو اُس سے آسائش نصیب ہوتی ہے پنجم یہ کہ کلام میں ہر جگہ تناسب موجود رہتا ہے یہ وہ صفت ہے کہ اس صفت کے بغیر نہ حسن ظاہری اور حسن باطنی کا وجود ممکن ہے ششم یہ کہ ان کا کوئی بیان بغیر کسی مارل یعنی نتیجہ اخلاقی کے نہیں ہوتا چنانچہ اِس داستان کا آخر شعر بھی مارل سے خالی نہیں ہے جیسا کہ فرماتے ہیں

کبھی خوش ہے دل اور کبھی دردمند — زمانے کا جیسے ہے پست و بلند

داستان حالت تباہ کرنے ماں باپ کی شاہزادے کے غائب ہونے سے

یہ داستان داخلی اور خارجی دونوں صنف شاعری پر مشتمل معلوم ہوتی ہے حضرت مصنف نے شاہزادے کے غائب ہونے سے جو کیفیت محل والوں کی ہوئی خوب منظوم فرمائی ہے لاریب ان کی خوبی بیان سے تحیر و غم کی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے اس بیان میں غم کرنے والوں کے ظاہری اور باطنی دونوں انداز بڑی تبعیت فطرت کے ساتھ حوالۂ قلم ہوئے ہیں بلاشبہ یہ بیان داخلی اور خارجی دونوں شاعریوں کا ایک عمدہ مجموعہ ہے اشعار

ذیل محل سرا کی حیرت زدہ اور غمزدہ عورتوں ایک پورا فوٹو دکھارہے ہیں سبحان اللہ، کیا قادر الکلامی ہے! آفریں صد آفریں ؛

کروں حال ہجراں زدوں کا رقم | کہ گزرا جدائی سے کیا اِن پہ غم
کُھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں | تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں
نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہرو | نہ وہ گل ہے اس جا نہ وہ اس کی بو
رہے دیکھ یہ حال حیران کار | کہ یہ کیا ہوا ہائے پروردگار
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی | کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلائی سی پھرنے لگی | کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دل گیر ہو | گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی | رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب | کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
کسی نے دیئے کھول سنبل سے بال | طمانچوں سے جوں گل کیئے سُرخ گال

اس کے بعد جب بادشاہ کو شاہزادہ کے گم ہونے کی خبر پہنچی تو بادشاہ اور بادشاہ بیگم کا کیا حال ہوا اس کی فطری تصویر حضرت مصنف یوں کھینچتے ہیں :-

سنی شہ نے القصہ جب یہ خبر | گرا خاک پر کہ کے ہائے پسر
کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی | کلی کی طرح سے بکس رہ گئی

اس جگہ پر باپ اور ماں کے غم کا فرق کس خوبصورتی کے ساتھ دکھلایا ہے سبحان اللہ! کیا فطرت نگاری ہے، حضرت مصنف اس کے بعد بادشاہ بیگم کا کوئی ذکر نہیں فرماتے ہیں ظاہر ہے کہ عورت میں اتنی قدرت کہاں کہ ایسی آفت میں تفتیش حالات کرسکے۔

بیٹے کے صدمہ سے اُسے عموماً چُپ لگ جاتی ہے یہ کام مرد کا ہے چنانچہ بادشاہ نے دریافت حقیقت کی طرف توجہ کی جیساکہ اشعار ذیل سے نمایاں ہے الحق یہی چیزیں ہیں کہ سچے شاعر کے سوا کسی کو نہیں آتیں :

ہُوا گم وہ یوسف پڑی یہ جو دھوم ۔۔۔ کیا خادمانِ محل نے ہجوم
کہا شہ نے واں کا مجھے دو پتا ۔۔۔ عزیزو جہاں سے وہ یوسف گیا
گئیں لے وہ شہ کو لب بام پر ۔۔۔ دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیمبر
یہی تھی جگہ وہ جہاں سے گیا ۔۔۔ کہا ہائے بیٹا تو یاں سے گیا
مرے نوجواں میں کدھر جاؤں پیر ۔۔۔ نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر
عجب بحر غم میں ڈبویا مجھے ۔۔۔ غرض جان سے تو نے کھویا مجھے
کروں اس قیامت کا کیا میں بیاں ۔۔۔ ترقی میں ہر دم تھا شور و فغاں

اس کے بعد اِس خبر کے شہر میں مشہور ہونے کا بیان ہے۔ پھر جس باغ میں بے نظیر رہا کرتا تھا اس کے بے رونق ہو جانے کی کیفیت نہایت شاعرانہ مذاق کے ساتھ تحریر ہے، ہر چند حضرت مصنف نے ویرانی باغ کے مضمون کو شاعرانہ پیرایہ میں طول دیا ہے، مگر کہیں پہ فطرت کی باگ ہاتھ سے نہیں چھوڑی ہے تشبیہات استعارات اور مبالغہ پردازیوں میں تمامتر فطرت کا رنگ عیاں ہے۔ لاریب بے رونقی باغ کا مضمون نہایت فطری انداز رکھتا ہے حالت غم میں مکان و باغ کی صورت ایسی ہی دکھائی دیتی ہے جیساکہ حضرت مصنف نے ضبط تحریر فرمایا ہے، مولانا حالی سلمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ؎

اُن کے جانے سے ہوئی اور ہی گھر کی صورت ۔۔۔ نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

حضرت آزل اعلی اللہ مقامہ فی الجنہ کا یہ مطلع بھی مطلع بالا کا فطری رنگ رکھتا ہے۔

بغیر یار ہر اک گل ہے خار آنکھوں میں   کھٹک رہی ہے چمن کی بہار آنکھوں میں

اس داستان کے آخر میں وزرا کا بادشاہ کو سمجھانا مذکور ہے اس فہمائش میں حضرت مصنف نے حسب معمول کچھ مارل اشعار حوالہ قلم فرمائے ہیں اور یہ بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ دکھا دیا ہے کہ کسی حال میں دنیا کے کام بند نہیں ہوتے' ہزار آفت کیوں نہ آئے' دنیا جس طرح پر چلا کی ہے چلا کرے گی **مولفہ**

خدا کی خدائی ہمیشہ رہے گی   جو ہوتا رہا ہے وہ ہوتا رہے گا

ذیل میں حضرت مصنف کے اشعار نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

وزیروں نے دیکھا جو احوال شاہ   کہ ہوتی ہے اب اس کی حالت تباہ
کہا گو جدائی گوارا نہیں   ولیکن خدائی سے چارا نہیں
نہیں خوب اتنا تمہیں اضطراب   نصیبوں سے تا پھر ملے وہ شتاب
خدا جانے اب اس میں کیا بھید ہے   یہ کہتے ہیں جیتوں کو امید ہے
خدا کی خدائی تو معمور ہے   غرض اس کے نزدیک کیا دور ہے
نہیں ایک صورت پہ کوئی مدام   اسی کی غرض ذات کو ہے قیام
بہ کُرہ اور شہ کو بٹھا تخت پر   بہر نوع رہنے لگے یک دگر
لٹایا بہت باپ نے مال و زر   ولیکن نہ پائی کچھ اس کی خبر

داستان پرستان میں لے جانے کی

واضح ہو کہ میر حسن اب ایک ایسا قصہ لکھتے ہیں جو ہمارے علم محسوسات سے باہر ہے یعنی اس داستان میں حضرت مصنف پری اور پرستان کا ذکر فرماتے ہیں یہ ظاہر ہے

کہ واقعات کے رو سے کوئی معاملہ کسی بنی آدم کو پیش نہیں آیا ہے تاریخ وسیر آثار و اخبار وغیرہ میں کہیں نہیں دیکھا جاتا ہے کہ کسی نے کبھی پری دیکھی ہو یا کوئی پری کبھی آدمی کو پرستان میں اڑا لے گئی ہو۔ اس طور کے غیر معمولی بیانات صرف فسانہ اور شاعری کی تصانیف میں دیکھے جاتے ہیں لیکن ایسے بیانات کو غایت شائستگی کی بنیاد پر مذموم نہیں سمجھنا چاہیئے یہ بیانات اس غرض سے حوالہ قلم نہیں کئے جاتے ہیں کہ لوگ انھیں قرین واقعات سمجھیں اُن سے مجرد فسانہ گوئی اور شاعری کی غرضیں متعلق رہتی ہیں ہر خواندہ آدمی جانتا ہے کہ ایسے بیانات فسانہ نگاروں اور شعرا کی قوتِ تخئیل کے نتائج ہوتے ہیں، کون آدمی ہے جو شکسپیر کے اس پلے کو پڑھ کر جس کا نام مڈسمر نائٹس ڈریم MIDE SUMMER- NIGHTS DREAM) ہے یہ نہیں سمجھتا ہے کہ اس میں پریوں کا جو ذکر ہے وہ مجرد اس شاعر عدیم المثال کی قوت تخیل کا نتیجہ نہیں ہے یا ہملٹ (HAMLET) میں جو بھوت کا ذکر مذکور ہے وہ شاعرانہ بیان نہیں ہے۔ یا ایلیڈ انیڈ وغیرہ میں جو کثرت کے ساتھ دیوتاؤں کی کاروائیاں اور دیگر عجائبات مندرج ہیں وہ سب کے سب ایسے ایجادات شاعرانہ نہیں ہیں کہ جن کو اس وقت میں کوئی شخص امور واقعی مانتا ہے اسی طرح "الف لیلہ" میں جو پریوں کی حکایات ہیں وہ تخئیلی بیانات نہیں ہیں۔ یا مُور (MOORE) شاعر انگریزی نے جو ایک پری کا فسانہ منظوم کیا ہے وہ فسانہ نہیں ہے پس مجرد اس بنیاد پر کہ ایسے قصے قرین واقعات نہیں ہیں اہل مذاق ان سے نفرت نہیں کر سکتے، ایسے قصے قابل گرفت تب ہی سمجھے جاتے ہیں جب ان کے بیانات میں تناسب کی خوبی نادارد ہوتی ہے یہ وہ خوبی ہے کہ جس کی عدم موجودگی سے ہر کلام ذلیل اور بے لطف معلوم ہوتا ہے پری دیو جنّات وغیرہ کے وہی قصے قابل تنفر

ہیں جن کے بیانات میں تناسب نہیں پایا جاتا ہے، شکسپیئر، ہومر، ورجل، متور، فردوسی بالمبکی، کالیداس صاحب "الف لیلہ" ایسے مصنفین ہیں کہ پہلے بھی اُن کی توقیر ہوا کی ہے، اور آئندہ بھی ہوا کرے گی۔ یہ محض تنگ چشمی کی بات ہے کہ کوئی شخص شکسپیئر یا ہومر یا صاحب "الف لیلہ" کو نیچی نظر سے دیکھے، حال کی شائستگی نہ اس کی اس کی مقتضی ہے نہ آئندہ کی شائستگی اس کی مقتضی ہوگی، ایسی تنگ چشمی کا عارضہ صرف انھیں حضرات کو لاحق دیکھا جاتا ہے جن کی وسعت نظر بہت کم ہے اور اس کمی وسعت نظر کے ساتھ اپنے کو بلند نگاہ مالا ہیں اور حقیقت آگاہ سمجھتے ہیں نعوذ باللہ، اس زمانہ میں شائستگی کا مرض ایسا پھیلا کہ خدایا تیری پناہ ایسے حضرات جہاں کچھ ادھوری یورپین وضع کے پابند ہو گئے اپنے کو شائستہ سمجھنے لگے، مگر ظاہری وضع نہ بھی بدلی تو اپنے نکمے خیالات کو عین حکما و علمائے یورپ کے خیالات جاننے لگے یہ مرض طاعون چیچک ہیضہ سیاہ بخار وغیرہ سے زیادہ مضر قوم ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ ایسے لوگ زبان و علوم یورپ سے بے بہرہ رہ کر فضل و کمالات یورپ کی راہ کے خضر اپنے کو تبلاتے ہیں۔

اذا کان الغراب دلیل قوم   سیھدیھم طریق الھالکین

المختصر ایسے قصے جن میں دیو پری وغیرہ کے بیانات مندرج پائے جاتے ہیں۔ تب ہی مذموم سمجھے جا سکتے ہیں جب ان میں تناسب کی خوبی نہیں پائی جاتی ہے، اب حضرات ناظرین میر حسن کے حسن بیان کی طرف توجہ فرمائیں اس شاعر لاجواب کا انداز سخن نہار ایسا نہیں ہے کہ اُس سے چشم پوشی کی جائے سبحان اللہ تناسب کلام ایسا ہے کہ اہل مذاق سے طلب داد میں کبھی ناکام نہیں رہتا۔ حضرت مصنف اس داستان میں اشعار ساقی نامہ کے بعد پہلے بے نظیر کو پرستان میں اُڑا لے جانے کے مضمون کو یوں رقم فرماتے ہیں۔

اُڑی جو پری واں سے لے کر اُسے	آتار اپرستاں کے اندر اُسے

اس کے بعد پرستان کی کیفیت بیان فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پرستان کو نہ میر حسن نے دیکھا تھا اور نہ آج تک کسی بنی آدم نے دیکھا ہے اس سے پرستان کا بیان سوا خیالی ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے مگر حضرت مصنف کا یہ بیان بھی قابلیت شاعرانہ سے خالی نہیں ہے ہر شعر اچھی فکر پروال ہے اور حسب مراد قوت تخیل سے خبر دیتا ہے کچھ شعر ذیل میں درج کیئے جاتے ہیں۔

وہاں ایک تھا سبز کا اُس کے باغ	کہ جس کے گلوں سے ہو تازہ دماغ
رہا جس کا گل اس میں انواع کے	طلسمات کل اس میں انواع کے
طلسمات کے سارے دیوار و در	نہ یاں کے سے کوٹھے نہ یاں کے سے در
نہ آتش کا خطرہ نہ بارش کا ڈر	نہ سردی نہ گرمی کا اس میں خطر
کسی کو ہو جس چیز کا اشتیاق	نظر آئے وہ چیز بالائے طاق
جواہر کے ذی روح وحش و طیور	خراماں پھریں صحن میں دور دور
پھریں دن کو سارے وہ حیوان ہو	کریں رات کو کام انسان ہو

اس خیالی بیان باغ کے بعد بنظیر کے پلنگ کا اُس باغ کے بنگلہ میں لایا جانا مذکور ہے وہ تو عالم خواب میں تھا جب بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہے اور کیا اُس پر گزرتی ہے اشعار ذیل سے ظاہر ہوگا۔

قضا را کھلی آنکھ اُس گل کی جو	نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بو
نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا	تعجب سے اک ایک کو تک رہا
اچنبھے کا یہ خواب دیکھا جو واں	لگا کہنے یا رب میں آیا کہاں
ذلبس تھا وہ لڑکا تو سہما بھی کچھ	ہوا کچھ دلیر اور حیراں بھی کچھ

اس فطرتی بیان کے بعد حضرت مصنف فرماتے ہیں

سرہانے جو دیکھی مہ چاردہ — کہ ہے اجنبی سی وہ اک رشک ماہ
کہا کون ہے تو یہ کس کا ہے گھر — لے آیا مجھے کون گھر سے ادھر
پھر اس نے منہ کو لے اور ادھر سے نقاب — دیا اس پری نے یہ ہنس کر جواب
خدا جانے تو کون میں کون ہوں — مجھے بھی تعجب ہے، میں کیا کہوں
پر اب تو تو مہمان ہے میرے گھر — لے آئے ہیں تجھ کو قضا و قدر
یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں — پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

اس کے بعد اخفا کو بے ضرورت سمجھ کر پری بے نظیر کو حقیقت حال سے یوں آگاہ کر دیتی ہے

ترے عشق نے مجھ کو شیدا کیا — ترا غم مرے دل میں پیدا کیا
چھڑا کر ترا تجھ سے شہر و دیار — یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر وار
پری ہوں میں اور یہ پرستان ہے — یہاں سب یہ قوم بنی جان ہے

اس کے بعد حضرت مصنف صحبت ناجنس کی کیفیت یوں رقم فرماتے ہیں :-

کہاں صورت جن کہاں شکل انس — غرض قہر ہے صحبت غیر جنس
پری کو ہوئی شادی اس مہ کو غم — یہ ناچار کیا کر سکے وہ صنم
کبھی یوں بھی ہے گردش روزگار — کہ معشوق عاشق کے ہو اختیار
غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں — کہا اس نے جو کچھ کہا اس کو ہاں
ولیکن نہ عقل رہی نہ ہوش و حواس — رہے وحشیوں کی طرح وہ اداس
کبھی اشک آنکھوں میں بھر لائے وہ — کبھی سانس سے کر کے ہائے وہ
وہ محلوں کی جھمکیں وہ گھر کا سماں — رہے رو برو دھیان میں ہر زماں

وہ شفقت جو ماں باپ کی یاد آئے — تو راتوں کو رو رو کے دریا بہائے
کبھی اپنی تنہائی کا غم کرے — کبھی اپنے اُوپر دُعا دم کرے
کرے یاد جب اپنے ناز و نعم — فغاں زیرِ لب وہ کرے دمبدم
بہانے سے دن رات سویا کرے — نہ ہو جب کوئی تب وہ رویا کرے
غرض اضطراب اس کو ہر حال میں — کہ جوں مرغ تڑپے نیا جال میں

اشعار بالا کی فطری خوبیاں محتاج بیان نہیں ہیں۔ واقعی حضرت مصنف نے اس جگہ شاعری کی اچھی داد دی ہے۔ اے حضرات ناظرین اس جگہ پر کیا موقوف ہے انصاف یہی ہے کہ ہر جگہ پر جہاں جس صنف شاعری کا موقع آیا ہے وہاں اپنے کمال شاعری کا جلوہ دکھلا جاتے ہیں داخلی اور بھی خارجی شاعری پر اس قسم کی قدرت صرف چند شاعران دنیا کے سوا کسی میں نہیں دیکھی جاتی ہے اتنے بیانات کے بعد اُس پری کی زندگانی کا طور یوں حوالۂ قلم پایا جاتا ہے کہ ماہ رُخ نے بے نظیر سے پوشیدہ طور پر تعلق پیدا کیا تھا اس لیئے باپ کے پاس بھی حاضری سے آیا کرتی تھی تا افشائے راز نہ ہو جائے اس حاضری سے جو وقت بچتا تھا اُسے بے نظیر کی صحبت میں بسر کرتی تھی مگر بے نظیر روز بروز یادِ وطن سے کاہیدہ ہوتا جاتا، ماہ رخ ہر طرح کی خاطر داری کرتی تھی اور اسباب آسائش کی فراہمی میں خس بھر کمی نہیں کرتی تھی لیکن ان سب کوششوں سے کوئی حسب مراد نتیجہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ پری پریوں میں نہایت ہوشیار، شعور مند اور فہیم تھی۔ بے نظیر کو اس طور مبتلائے رنج والم دیکھ کر سوچی کہ اس کی دل بستگی کا سامان کیجیئے، یہ سوچ کر کہ اہل غم کو سیر و ہوا خوری سے فائدہ عظیم مترتب ہوتا ہے ایک دن شاہزادہ سے یوں کہنے لگی:—

کہا ایک دن اس نے سُن بے نظیر مرے دام میں تو ہُوا ہے اسیر

تو اک کام کر اک پہر بھر کہیں کیا کر ٹک اک سیر روئے زمیں

تو دم رک کے دل کو نہ کر اپنے بند نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند

سر شام جاتی ہوں میں باپ پاس اکیلا تو رہتا ہے اس جا اُداس

یہ گھوڑا ابھی دیتی ہوں کل کا تجھے ولیکن یہ دے تو مچلکا مجھے

کہ گر شہر کی طرف جاوے کہیں دیا دل کسی سے لگا دے کہیں

تو پھر حال ہو جو گنہ گار کا وہی حال ہو تجھ سے دلدار کا

کہا کیونکہ میں تم کو جاؤں گا بھول مجھے جو کہا تم نے سب ہے قبول

کہا ماہ رخ نے کہ تھے تیرے بخت کہ بخشا تجھے میں سلیماں کا تخت

جو اُترے تو کل اس کی یوں جڑ لیو جو برعکس جائے تو وہ کل مروڑیو

زمیں سے لگا اور تا آسماں جہاں چاہیو جائیو تو وہاں

اشعار بالا کہانی کی مزہ داری کے ساتھ کیسی فطرتی خوبیوں سے مملو نظر آتے ہیں۔ ماہ رخ شاہزادہ کو اوّل مضمون اسیری یاد دلاتی ہے تا وہ خود اختیار ہو کر اس سے آزادی کی نہ لے بعد ازاں اُسے ایک پہر کی سیر کی اجازت دیتی ہے اور یہ اس لئے کہ معشوق کی صحبت میں خلل واقع نہ ہو۔ اور پھر سیر کا وقت بتاتی ہے کہ جب وہ مجبوراً باپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی ہے پھر گھوڑا دے کر اس سے مچلکا لیتی ہے پھر شاہزادہ بھی فرصت کو بھی غنیمت سمجھ کر ماہ رخ کی تشفی کر دیتا ہے اس کے بعد ماہ رخ شاہزادہ پر احسان جتاتی ہے اور احسان جتانے کے بعد گھوڑے سے کام لینے کی ترکیب بتاتی ہے۔ سبحان اللہ کیا انداز بیان ہے! لاریب حضرت مصنف اُردو کے شکسپیئر ہیں اس جگہ

ایک امر کل کے گھوڑے کی نسبت عرض کر دینے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ سابق پرستان کے بیان میں یہ مذکور آچکا ہے کہ وہاں طلسماتی چیزیں بہت تھیں پس طلسمی گھوڑے کا بھی ایسی جگہ میں موجود ہونا خلاف توقع نہیں ہے، حضرت مصنف کی شاعری کا یہ بڑا کمال ہے کہ کوئی بات بے وجہ حوالۂ قلم نہیں فرماتے ہیں، اکثر مثنوی میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی بات کسی جگہ پہلے فرما جاتے ہیں تو دس بیس سو پچاس شعر کے بعد اس بات کو کہنے کی وجہ ہویدا ہوتی ہے یہی کیفیت شکسپیر اور صاحب "الف لیلہ" کی ہے کہ دور جا کر پہلے کی کہی ہوئی باتوں کا سبب کھلتا ہے کل کے گھوڑے کا مضمون کتاب "الف لیلہ" میں بھی دیکھا جاتا ہے، یہ عجب نہیں ہے کہ میر حسن نے اس خیال کو اس کتاب سے حاصل کیا ہو، مگر پرستان میں کل کے گھوڑے کا موجود ہونا زیادہ قرین یا پایۂ نظر آتا ہے کہ جس طور پر "الف لیلہ" میں کل کے گھوڑے کا بیان ہے بجائے خود عجب فطرتی خوشنمائی کے ساتھ حوالۂ قلم ہوا ہے ؛

داستان گھوڑے کی تعریف میں

حضرت مصنف کی اطلاع عام بہت حیرت انگیز نظر آتی ہے اطلاع عام سے مراد راقم یہ ہے کہ اپنے ملک کے ہر قسم کے امور سے انھیں واقفیت تھی یہی کیفیت حضرت سوداؔ کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بے اس طرح کی اطلاع عام کے کوئی شاعر نہ میر حسن کی سی مثنوی لکھ سکتا ہے اور نہ سوداؔ کی طرح اصناف شاعری پر قادر ہو سکتا ہے شکسپیر کی بھی یہی رنگ کی اطلاع دکھائی دیتی ہے میر حسن اور سوداؔ کی اطلاع عام سے شکسپیر کی اطلاع عام کا فرق یہ ہے کہ یہ دونوں

ہندوستانی شاعر صرف ہندوستان کے معاملات اخلاق و تمدن و معاشرت وغیرہ سے خبر رکھتے تھے اور شکسپیر کو اس طرح کی اطلاع تمام معاملات یورپ سے حاصل تھی یہاں پر میر حسن گھوڑے کی تعریف میں ایسی باتیں رقم کرتے ہیں جو اہل ہند کے مذاق کے تمامتر موافق معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت مصنف کے اس جگہ کے اشعار جلد اوّل میں درج ہو چکے ہیں اس لئے یہاں پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ بہرکیف اس کل کے گھوڑے پر بے نظیر روز سیر کو نکلتا تھا جیسا کہ فرماتے ہیں :-

یہ گھوڑا جو اُس کل کی تھا بخش کا	فلک سیر تھا نام اس رخش کا
سر شام وہ بے نظیر جہاں	اُسی رخش پر ہو کے جلوہ کناں
ہر اک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ	وہی اک پہر سیر کرتا تھا وہ
پھر جبکہ بجتا تو پھر شتاب	کہ پھر قہر تھا ماہ رخ کا عتاب

داستان وارد ہونے میں بے نظیر کے باغ میں بدر منیر کے

یہ داستان "الف لیلہ" کے اس قصہ سے مشابہت رکھتی ہے جس میں فارس کے بادشاہزادہ کے کل کے گھوڑے کا بیان دیکھا جاتا ہے۔ اس قصہ میں فارس کے بادشاہزادہ بنگالہ کی بادشاہزادی کے پاس اسی کل کے گھوڑے کے ذریعہ سے پہنچا تھا جس طرح کہ بے نظیر کا بدر منیر کے باغ میں پہنچنا، اس داستان میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ الف لیلہ کے قصہ میں شاہزادہ فارس اتفاقاً بنگال کی شاہزادی کے محل کی چھت پر جا اُترا تھا، یہاں یہ کیفیت گذری کہ ہنگام سیر بے نظیر کو اتفاقاً ایک باغ نظر پڑا جس میں ایک عمارت بلند

اُس نے دیکھی اور بالقصہ اُس کے کوٹھے پر اس نے اپنے گھوڑے کو اُتارا اِس کے بعد بے نظیر کا بدر منیر سے ملنا بھی "الف لیلہ" کے قصّہ سے مشابہت رکھتا ہے مگر دونوں کا فرق جو ہے وہ اخلاقی پہلو کے اعتبار سے بہت قابل لحاظ ہے الف لیلہ کا قصہ بڑی عمدگی اخلاقی سے خبر دیتا ہے برعکس اس کے اس مثنوی کی کہانی جو بے نظیر اور بدر منیر کی ملاقات پر مشتمل ہے اخلاقی تنزل سے خبر دیتی ہے وہاں بنگال کی شاہزادی ایک شریف وضع مہمان نواز، خوش خلق، پاک خیال، پاک کردار، ناکتخدا عورت کے پیرایہ میں دکھلائی گئی ہے برعکس اس کے یہاں بدر منیر کا ایسا فوٹو کھینچا گیا ہے کہ شرفا کی ناکتخدا لڑکیاں یا شرفا کی عورتیں خدانخواستہ اس طرح کی ہو ہی نہیں سکتی ہیں ظاہرا یہ بڑے تعجب کی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ میر حسن ایک ایسے عمدہ شاعر نے اپنی کہانی کی ہیروئن (HEROINE) کے بیان کو ایسی بد ترکیبی کے ساتھ حوالۂ قلم کیا ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت مصنف نے اپنے اس طرح کے بیان کی رُو سے اُس اخلاقی تنزل کی تصویر کھینچی ہے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کی عیاشیوں کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے شاہی اخلاق کے تنزل کی مثالیں انگلستان کے بادشاہ جارج سوم و جارج چہارم کے زمانے میں بھی ہیں اِن بادشاہوں کے زمانوں میں کیا کیا اخلاقی بے عنوانیاں ظہور میں نہیں آئی تھیں اور اب وہی دربار ہے کہ حضرت ملکۂ معظمہ آنجمانی کی بدولت کس قدر دار التہذیب ہو رہا ہے المختصر میر حسن کے ایسے بیانات بے بنیاد نہیں ہیں جس طبقہ کے متعلق حضرت مصنف کا بیان ہے اس طبقہ کے اخلاقی معاملات اسی انداز کے ہو رہے تھے لاریب ہندوستان کا ایک ناواقف وضیع آدمی ایسے بیانات عیش و نشاط کو جو چند آئندہ کی داستانوں میں مندرج ہیں پڑھ کر منغص ہو

سکتا ہے اور واقعی بات بھی منغص ہونے کی ہے مگر جاننا چاہیئے کہ یہ بیانات ایک عہد کی اخلاقی حالتوں کو دکھاتے ہیں اور اس رو سے ناقابل توجہ نہیں ہیں :

واضح ہو کہ ہر چند ان چند داستان کے بہت ہی جوانانہ پیرایہ ہیں مگر جوانان صالح اُن سے فائدے بھی اٹھا سکتے ہیں اس لئے کہ حضرت مصنف بڑے نیچرل شاعر تھے اور اپنے بیانات کو مارل نتیجہ اخلاقی کے قرین کرنا خوب جانتے تھے اس داستان میں آپ باغ و محل کا بیان حوالہ قلم کر کے بے نظیر کی نسبت ایک مضمون لکھتے ہیں جو تمدنی پہلو کے مد سے اس وقت کے ہونہار نوجوانوں کو بہت مفید نظر آتا ہے آپ فرماتے ہیں :-

ملی جنس کی اپنی جو اُس کو بو   لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سو

اے حضرات نورسیدگان جوانی اگر آپ صاحبوں کی نظر سے اس مثنوی کا یہ جزو گزرے تو لنحور اس شعر کو ملاحظہ فرمایئے گا یہ عجب شعر ہے اس سے ایک بڑی تعلیم منتج ہوتی ہے آپ ملاحظہ فرمائیں کہ میر حسن پہلے بے نظیر کا پرستان میں گرفتار رہنا بیان کرتے ہیں پھر پرستان میں غیر جنسیت کے باعث بے نظیر کا دل برخاستہ رہنا تحریر کرتے ہیں پھر بے نظیر کا ایک ایسے باغ میں پہنچنا جو مسکن بنی آدم تھا۔ رقم کرتے ہیں جہاں پہنچ کر جو اسے ہم جنسوں کی بو ملی اُسے ذکر کرتے ہیں یہ ذکر تمدنی جدت سے بہت قابل لحاظ ہے حضرت مصنف کے آئندہ کے بیانات سے معلوم ہوگا کہ اس جنسیت کی بنیاد پر بے نظیر نے ایک ناجنس کے مقابلہ میں اپنی جنس اور اپنے رتبہ کی ایک معشوقہ کے ساتھ وصل و پیوند کر نا پسند کیا یعنی ہر چند ماہ رُخ جو اس کی عاشقہ تھی گو کسی طرح کی حسین ہوش مند فہیم اور سلیقہ مند تھی مگر اس نے اس سے دل نہ لگایا، جب اُس نے موقع پایا

اپنی ہی جنس سے اعلا۔ افسوس ہے اُن ہندی نوجوانوں پر جو غیر قوم کی عورتوں سے وصل و
پیوند کرتے ہیں اور آخر کار اپنے کیئے کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ اس زمانہ میں ہندی نوجوان تعلیم
کی نظر سے بہ کثرت انگلستان جاتے ہیں وہ ملک ہندیوں کے لیئے پرستان کا حکم
رکھتا ہے پس وہاں ہزاروں ماہ رخوں سے اُن کو سامنا پڑتا ہے، تجربہ سے معلوم ہوتا
ہے کہ جو بے نظیری کی روش اختیار کرتے ہیں ان کی بقیہ زندگی عافیت سے کٹ جاتی ہے
لاریب غیر جنس کے ساتھ مواصلت کبھی صورت عافیت نہیں ہوتی ایسی مواصلت
میں سوا نقصان کے کوئی فائدہ متصور نہیں ہے بر بنیاد تجربہ نہ فائدہ مواصلت کرنے
والے کو ہوتا ہے اور نہ اس کے خاندان کو اور نہ اس کی قوم کو ایسی مواصلت کے نتائج
یہ ہوتے ہیں کہ مواصلت کرنے والے کو ایک ناجنس ساتھی کی بدولت تمام عزیزو اقربا
سے علحدہ رہنا پڑتا ہے یعنی اکثر وہ باپ ماں بہن بھائی سب سے چھوٹ جاتا ہے
اور اس کی بقیہ زندگی خارج از خاندان کے طور پر بسر ہوتی ہے اس طرح کی مواصلت
خرچ کثیر کا سبب بھی ہوا کرتی ہے جو بہت سی حالتوں میں مالی مصالح کے خلاف
متصور ہے ذاتی نقصانات کے علاوہ خاندانی نقصانات بھی ایسی مواصلت میں بہت
ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے خرابی نسل واقع ہوتی ہے مجنسوں کا پیدا ہونا کبھی خاندان کو
مفید نہیں ہو سکتا یہ مجنس ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا وصل و پیوند اُن کے باپ اور ماں
دونوں کی قوم سے دشوار ہوتا ہے ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ اہل ہند فاتح قوم سے
مواصلت پیدا کریں اور اُن کی مجنس اولاد اپنی قوم یا فاتح سے بلا تکلف رشتہ و پیوند
کر سکیں، خاندانی نقصانات کے علاوہ قومی نقصانات بھی کثیر ہیں سرِ دست نقصان
بیّن تو یہی ہے کہ جب ایک قابل آدمی غیر جنس عورت سے بیاہ کرتا ہے تو اُس کی

قوم اس کی ذات سے میل جول پیوند کے اعتبار سے محروم رہ جاتی ہے یعنی اگر ایسا شخص اپنی قوم میں بیاہ کرتا تو اس کی قوم کی ایک لڑکی اُس کی مواصلت سے ایک قابل شوہر پاتی برخلاف اس کے اُس کے اچھے ہونے کا نفع ایک غیر جنس عورت اٹھاتی ہے علاوہ اس کے بسا اوقات ایسی مواصلت کے کرنے والے اطوار و عادات کے اعتبار سے اپنی قوم کے نفع و ضرر سے اس قدر علیحدہ ہو بیٹھتے ہیں کہ اُن کا شمار قوم میں فضول ہی فضول ہوتا ہے میں نہایت ہی خواہی سے اپنے ملک کے نوجوان حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ تعلیم ولایت کے بعد وہ جسٹس محمود صاحب کی روش اختیار فرمائیں محمود صاحب کو سب سے زیادہ موقع انگلستان میں مواصلت پیدا کرنے کا تھا اور ہند میں بھی ان کو اس قسم کی مواصلت کا موقع حاصل تھا، جوانی خوبروئی تعلیم یافتگی بلند پایگی نجابت شرافت عالی خاندانی سب ہی باتیں حسب مراد تھیں مگر مجلسوں کے پیدا کرنے کی طرف مطلق مائل نہ ہوئے المختصر حضرت مصنف نے مضمون جنسیت کو پیش نظر رکھ کر ایک عمدہ ہدایت نامہ اس عہد کے نوجوانوں کے لیے چھوڑا ہے۔ فقیر کی دانست میں یہ جنسیت کا مضمون ایسا قابل توقیر ہے کہ ہر باپ کا فرض منصبی ہے کہ لڑکے کو ولایت بھیجنے کے پہلے میر حسن کی مثنوی خوب پڑھائے واقعی یہ تصنیف ایک حکیمانہ رنگ رکھتی ہے جناب والد ماجد مرحوم نے راقم کو سترہ برس کی عمر میں درس کتاب کے طور پر اس مثنوی کو پڑھایا تھا۔ عنفوان شباب کا الطباع بہت قوی ہوتا ہے اس کتاب سے راقم نے آئندہ دن بہت فائدے اٹھائے۔ فقیر نے بھی اپنے لڑکوں کو اس کتاب کے بہت اجزا پڑھ کر سنائے ہیں اور الحمد للہ کہ وہ سب انگلستان سے بامراد واپس آکر اور داخلِ خاندان رہ کر عافیت تمام کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔

اِس داستان میں حضرت مصنف بدرِمنیر کے باغ و محل کا بیان اُسی فطرتی رنگ سے جو اُن کی شاعری کا طور ہے زیبِ رقم فرماتے ہیں یہاں ان کی تحریر کا اعادہ خوف طوالت سے ترک کیا جاتا ہے مگر آخر کے کچھ اشعار جو تصوف کا رنگ رکھتے ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

نظر جس طرف جائے نزدیک و دور — اُسی ایک مہ کا ہے ہر جا ظہور
نکل اپنی وحدت سے کثرت میں آ — وہی نور ہے جلوہ گر جا بجا
حقیقت کو لیکن بصارت بھی ہو — کہ دیکھے نہ اس کے سوا غیر کو

داستان تعریف بدرِمنیر اور عاشق ہونا بے نظیر کا

اس داستان میں حضرت مصنف پہلے بدرِمنیر کے حسن و جمال سج دھج لباس پوشاک زیور آراستگی وغیرہ کو نہایت فطری اور خوش اسلوب رنگ سے بیان کرتے ہیں بعد ازاں بدرِمنیر کا سراپا رقم کرتے ہیں یہ سراپا فحش وغیرہ سے تمامتر پاک ہے لاریب یہ سب مضامین اعلیٰ درجہ کی قوت شاعری سے خبر دیتے ہیں اور حضرت مصنف کی اطلاع عام کے مثبت ہیں۔ سراپا نگاری کے بعد کے مضامین یہ ہیں کہ بے نظیر بدرِمنیر کو دیکھ کر نہایت متعجب ہوا اسی حال میں اُسے کسی نے دیکھ لیا اور اُسے درختوں میں چھپا ہوا پاکر محل کی خواصیں وغیرہ کمال حیرت کے ساتھ آپس میں یہ گفت گو کرتے ہیں :-

کسی نے کہا کچھ نہ کچھ ہے بلا — کسی نے کہا چاند ہے یاں چھپا
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن — کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
لگی کہنے مانغا کوئی اپنا کوٹ — ستارہ پڑا ہے فلک سے ٹوٹ

ہوئی صبح شب کا گیا اُٹھ حجاب — درختوں میں نکلا ہے یہ آفتاب
کسی نے کہا دیکھیو اے بوا — کھڑا ہے کوئی صاف یہ مرد وا
کسی نے کہا کچھ یہ اسرار ہے — کسی نے کہا یہ تو دلدار ہے

اس کے بعد بدر منیر کو اس واقعہ عجیب سے خبر ہوئی وہ خود بے نظیر کو دیکھنے گئی دیکھتے ہی مبتلائے عشق ہو گئی۔ واضح ہو کہ انسان کو عشق دو طور ہوتا ہے ایک تو معشوق سے رفتہ رفتہ اور دوسرا معشوق کو دیکھ کر فی الفور اسے انگریزی میں فرسٹ سائٹ لو کہتے ہیں دونوں طور کے عشق بشرطیکہ ان میں نفسانیت کو دخل نہ ہو حکم عشق رکھتے ہیں بہر حال جب بے نظیر اور بدر منیر نے ایک دوسرے کو دیکھا غایت فریفتگی سے انھوں نے عشق کیا مگر وہاں نجم النساء دختر وزیر نے جو بدر منیر کی ایک ہم عمر رفیقہ تھی ان دونوں پر گلاب چھڑکا جس سے اُنھیں ہوش آ گیا، افاقہ کے بعد بے نظیر تو فرط حیرت سے وہاں ہی رہ گیا مگر بدر منیر شرم کھا کر اپنے محل کی طرف چلی گئی۔

واضح ہو کہ اس ملک میں رواج ملکی کے باعث کسی شریف مرد کو کسی شریف عورت کے دیکھنے کا اس طرح پر موقع نہیں مل سکتا ہے لیکن اہل یورپ کو ہمیشہ عورتوں سے ملنے کا موقع حاصل رہتا ہے وہ بغیر دیکھے کسی عورت سے دل د پیوند نہیں کرتے اس میں ظاہری مصلحتیں ہیں مگر تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دل و پیوند کے مبارک اور نامبارک ہونے میں دیکھ بھال کو دخل نہیں ہے خیر اس داستان کا جو سین ہے وہ اس ملک کی معاشرت شرفا کے مطابق نہیں ہے لیکن حضرت مصنف کے یہ سارے بیانات تناسب سے خالی نہیں ہیں اس لئے کہ جو سختی پردہ کی یہاں کے شرفاء کے درمیان ہے وہ دیگر بلاد اسلام میں پائی نہیں جاتی ہے علاوہ اس کے جس طبقہ کے افراد کا

ذکر اس داستان میں ہے نہ ان کے یہاں ایسا سخت پردہ ہے اور نہ ایسے برد کا التزام مناسب حال ہے اگر اس طرح کا سخت پردہ شاہان اسلام میں مروج ہوتا تو نور الدین جہانگیر بادشاہ دہلی کو نور جہاں کے دیکھ لینے کا کب موقع ملتا۔ یہ بیگم کتخدائی کے پہلے جلال الدین اکبر شاہ کے محل میں اپنی ماں کے ساتھ آیا جایا کرتی تھی ایام شاہزادگی میں جہانگیر کو اکثر اس کے دیکھنے کا موقع ملا کیا تھا اس واسطے وہ اس پر فریفتہ ہو رہا تھا اگر یہ موقع حاصل نہ رہتا تو نہ جہانگیر کو فریفتگی لاحق ہوتی اور نہ شیر افگن کی جان جاتی المختصر جس طبقہ کا ذکر حقیقت مصنف۔ اس داستان میں کر رہے ہیں اس سے ملک کے عامہ شرفا کو ذاتی اطلاع نہیں ہے پس حضرت مصنف کے ان بیانات کو غیر فطری یا بعید از قیاس یا خلاف رسم ملک نہیں سمجھنا چاہئے امر واقعی یہی ہے کہ حضرت مصنف نے کہیں بھی سلسلہ تناسب کلام کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے اور حق یہ ہے کہ حضرت مصنف ایک بڑے واقعہ نگار شاعر ہیں اور ان کی واقعہ نگاری حضرات اہل مذاق کی توجہ فرمائی کی تمام تر مستحق ہے +

داستان زلف اور چوٹی کی تعریف میں

حضرت مصنف زلف کی تعریف اس طرح پر حوالہ قلم کرتے ہیں کہ جس کی تعریف میں خامہ سو سو پیچ و تاب کھاتا ہے سبحان اللہ تشبیہات میں کیا کیا جدتیں نمایاں ہیں لیکن ایک شعر ایسا ہے جو فردوسی کے اس شعر کا "چو بر بست آں طرہ مشکناب + گرہ داد شب را ایس آفتاب + قریب قریب ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور وہ شعر یہ ہے

موباف زری نے کیا ہے غضب — دیا ہے گرہ دن کو دنبال شب

خبر زلف اور چوٹی کی تعریف کے بعد کہانی کا عنوان یہ ہے +

غرض وہ مڑی جب دکھا اپنے بال   تو گویا کہ مارا محبت کا جال
ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی   چھپا منہ کو اور مسکراتی چلی
غضب منہ پہ ظاہر لئے دل میں چاہ   نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ
یہ ہے کون کمبخت آیا یہاں   میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں   چھپی جا کے اپنے وہ دلان میں
دیا ہاتھ سے چھوڑ پردہ شتاب   چھپا ابر تاریک میں آفتاب

ظاہر ہے کہ یہ ترکیب اس ملک کی شریف عورتوں کی نہیں ہوتی، مگر ایک ایسی جوان عورت کی نسبت جو پوری آزادی اور مطلق العنانی کے ساتھ باپ اور ماں سے علیحدہ اور ایک پر تکلف باغ کے پر تکلف مکان میں ہم عمر رفقا اور خواصوں کے ساتھ قیام پذیر ہو کوئی ایسا بیان جیسا کہ اس داستان میں دیکھا جاتا ہے کبھی بے محل یا بے موقع نہیں قرار دیا جا سکتا ہے اس بیان میں حسن برابر بھی تناسب کلام میں نقصان لاحق نہیں ہے خیر جب بدرمنیر اس طرح بے نظیر کو چھوڑ کر اپنے مکان میں جا چھپی تب نجم النساء اسکے پاس پہنچ کر یوں کہنے لگی

مجھے جو چلے تو خوش آتے نہیں   ترے ناز بیجا تو بھاتے نہیں
مری سمت تک دیکھ تو ہائے ہائے   مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے
کیا ہے اگر تو نے گھائل اسے   تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اسے
تنک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو   مزا دیکھ اپنی جوانی کا تو
مئے عیش کا جام اب نوش کر   غم دین و دنیا فراموش کر
یہ حسن و جوانی یہ جوش و خروش   غفور است ایزد تو ساغر بنوش
کہاں یہ جوانی کہاں یہ بہار   یہ جوبن کا عالم رہے یادگار

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سبھی یوں تو دنیا کے ہیں کاروبار ولے حاصل عمر ہے وصل یار
خوشا وہ زمانہ کہ دو اک جگہ کریں ایک دگر جلوۂ مہر و مہ

ظاہر ہے کہ ایسی فہمائش سوا ایک نوجوان ہم عمر رفیق کے کون کر سکتا ہے مگر اس سلسلۂ تقریر کے چند اشعار تو ایسے ہیں کہ ایک سن رسیدہ فلسفی بھی اُن کی خوبی سے چشم پوشی نہیں کر سکتا ہے خیر اس تقریر کو سن کر بدر منیر نے جو کہا اور جو اس کا جواب نجم النساء نے دیا اس کا بیان کس قدر فطرتی رنگ رکھتا ہے حضرت مصنف فرماتے ہیں۔

یہ سن سن کے وہ نازنیں مسکرا لگی کہنے اچھا بھلا ری بھلا
میں سمجھی ترا دل گیا ہے اُدھر بہانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ دھر
لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہ وش ہوئی تھی اُسے دیکھ میں ہی تو غش
تمہیں نے تو چھڑکا تھا مجھ پر گلاب بھلا میری خاطر بلالو شتاب

اِس آپس کی رمزوں کی باتوں کے بعد نجم النساء بے نظیر کو بُلا لائی پھر بدر منیر کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بے نظیر کے پاس بٹھلایا اِس جگہ پر حضرت مصنف نے ایک ہم عمر اور شفیق رفیق کی کارروائی کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ حوالۂ قلم کیا ہے واقعی فطرت نگاری حضرت مصنف پر ختم ہے یہی شاعری فطرت کی بخشش کے بغیر نصیب نہیں ہوتی اور فطرت کی بخشش کے بغیر سمجھ میں نہیں آتی۔

داستان ملاقات کرنا بدر منیر کا بے نظیر سے

جب نجم النساء نے بدر منیر کو بے نظیر کے پاس بٹھلایا تو بدر منیر کے اُس وقت کے انداز نشست کو حضرت مصنف یوں زیب رقم فرماتے ہیں:۔

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے | بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے | لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن | کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن
گھڑی دو تلک وہ مہ آفتاب | رہے شرم سے پاسے بند حجاب

ظاہر ہے کہ یہ حجاب ایک فطری امر تھا اس کے دفع کرنے کے واسطے نجم النساء نے شیشہ و ساغر سامنے لاکر رکھا اور قسمیں دے کر بدر منیر سے کہا کہ بے نظیر کو مے پلا۔ جب بادہ نوشی کا شغل جاری ہوا تو سارا حجاب جاتا رہا، بے نظیر و بدر منیر باہم دگر تفتیش حال کرنے لگے، شراب کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے حجاب جاتا رہتا ہے اور راز پنہاں آشکار ہو جاتا ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے

کھلا جب کہ بند در گفت گو | جوان نے حقیقت کہی مو بہ مو
کہی ابتدا سے جو گزری تھی سب | بتایا سب اپنا حسب اور نسب
پری کا بھی احوال ظاہر کیا | چھپے راز سے اس کو ماہر کیا
کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے | زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے

اس گفتگو کو سن کر بدر منیر نے تقاضائے فطرت کے مطابق یوں جواب دیا

مرو تم پری پر وہ تم پر مرے | بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں | یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں
عبث تم سے کیوں دل لگائے کوئی | بھلے چنگے دل کو جلائے کوئی
ہے شمع ساں کیوں کوئی اشک سے | جلے کس لیے آتش رشک سے

یہ جواب پاکر بے نظیر کو بدر منیر کے پاؤں پر گر پڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، ذیل کا مین

نہایت فطری رنگ رکھتا ہے۔

یہ سن پاؤں پر گر پڑا بے نظیر　　کہا کیا کروں آہ بدر منیر
کوئی لاکھ جی سے ہو مجھ پر فدا　　میں تجھ پر فدا ہوں مجھے اس سے کیا
کہا چل سر اپنا قدم پر نہ دھر　　کسی کے مجھے دل کی ہے کیا خبر
یہ رمز و کنایہ جو ہونے لگے　　تو آپس میں ہنس ہنس کے رونے لگے
رہی دل ہی میں آخرش دل کی بات　　پہر بھر گئی اتنے عرصے میں رات
خبر رات کی سن اٹھا بے نظیر　　کہا اب میں جاتا ہوں بدر منیر
اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا　　تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا
یہ مت سمجھیو ہوں میں آرام میں　　کروں کیا پھنسا ہوں عجب دام میں
دل اس جا سے اٹھنے کو کرتا نہیں　　کوئی آپ سے جان مرتا نہیں
کرم مجھ پہ رکھیو ذرا میری جاں　　میں دل چھوڑے جاتا ہوں اپنا یہاں

بے نظیر یہ کہہ کر روانہ ہوا اور جدائی کا قلق ساتھ لیتا گیا بقیہ رات اس نے پری کے ساتھ بے چینی میں بسر کی ادھر بدر منیر بھی عذاب فراق میں مبتلا رہی جب صبح ہوئی تو بدر منیر کی اندرونی حالت یہ تھی۔

کچھ امید دل میں کچھ اک جی کو یاس　　لبوں پر ہنسی لیک چہرہ اداس

نجم النساء نے جو بدر منیر کی یہ کیفیت دیکھی تو باتوں میں لگا کر اس سے کہنے لگی کہ میرا یہ جی چاہتا ہے کہ تو آج خوب اپنا سنگار کرے اور اپنے حسن کی بہار مجھے دکھلائے بدر منیر کو تو یہ منظور ہی تھا مگر اس نے نجم النساء کو اس طرح پر ایک ناز آمیز جواب دیا۔

کروں کس کے لئے خاطر میں اپنا سنگار　　وہ ہے کون جس کو دکھاؤں بہار

اِس کے بعد اِس داستان میں بدرِ منیر کے سنگار اور مکان کی آرائش کے بیانات ہیں یہ بیانات ایک البیلی شاہزادی اور ایک البیلی محل شاہی کی آرائش کی پوری تصویر ہیں اور حضرت مصنف کی بڑی اطلاع عام سے خبر دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ کوئی شاعر جب تک کلیات و جزئیات سے بامراد طور پر باخبر نہ ہوگا اپنے بیانات میں مصوّری کا عالم نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ مثنوی نگار کیلئے اطلاع عام بڑی حاجت ہے ایسے شاعر کو امور خارجیہ اور معاملات ذہنیہ سے کافی طور پر مطلع رہنا چاہیئے ورنہ ہزاروں غلطیاں اس سے سرزد ہوں گی یہ ممکن ہے کہ ہر سے زبان کی کوئی غلطی سرزد نہ ہو مگر مضامین کی غلطیوں کا سرزد ہونا ایک امر یقینی ہے اسی عدم اطلاع کی وجہ سے حضرت غالب اپنی مثنوی میں یہ مصرع "خوک شد و بچہ ز دن ساز کرد" نظم فرما گئے ہیں اگر حضرت غفران مآب کو یہ معلوم ہوتا کہ خوک جانور سباعی نہیں ہے یعنی از قسم گر اور نہ از قسم سگ ہے، تو مرزا ناطق مکرانی کو موقع اعتراض کیا ملتا، اس واسطے کہ اس مصرع میں زبان کی گرفت کا کوئی موقع پایا نہیں جاتا ہے المختصر سچا مثنوی نگار وہی شاعر ہو سکتا ہے جو امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ کے کلیات و جزئیات سے حسب مراد واقفیت رکھتا ہے سعدی شیرازی اور صاحب "الف لیلہ" کی حیرت انگیز کامیابیوں کا سبب سوا اطلاع کے دوسرا نہیں ہے۔

داستان بے نظیر کے آنے کی اور باہم صحبت کرنے کی

اِس مثنوی کی داستانوں سے صرف نامطبوع داستان یہی ہے کاش میر حسن اِس داستان کو داخل مثنوی نہ کئے ہوتے یا اِس داستان میں اس طرح کے بے باکانہ وصل کے پہلو کو رقم نہ کرتے اس داستان کے مضامین کوئی روحانی جلوہ نہیں رکھتے، زنہار کسی مہذب ملک میں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہی صحبت کے بعد کوئی ناکتخدا عورت اپنے عاشق سے

اس طور پر ہم آغوش ہونا گوارا کر سکے یہ ایک اسلامی شاہزادہ اور شاہزادی کی کہانی ہے
وصل قبل از نکاح چہ معنی دارد، یہ طور زناں بازاری کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے کسی
شریف طبقہ کی ناکتخدا لڑکی تو اس طرح کا فوری وصل گوارا نہیں کر سکتی یہ داستان مثنوی
زہر عشق وغیرہ کا اخلاقی انداز رکھتی ہے فرق اسی قدر ہے کہ اس کے بیانات فطری
خوبیوں سے خالی نہیں ہیں. خوب ہوتا اگر میر حسن اس داستان میں انتظار وصل کو دکھاتے، اور
محبت کی پختگی کی تدریجی حالتوں کو بیان کرتے اس سے اس داستان کی وقعت بڑھ جاتی
اس فوری وصل نے تو بدر منیر و بے نظیر کو بے وقر کر دیا، لیکن اگر یہ دکھایا جاتا کہ بے نظیر
روز آیا کرتا تھا اور بدر منیر کی صحبت میں ایک پہر رہا کرتا تھا اور اس کا موقع ڈھونڈتا
تھا کہ کس طرح سے پری کی گرفتاری سے مخلصی حاصل کر کے بدر منیر سے دستور ملکی
کے مطابق مواصلت کی صورت پیدا کیجیئے تو یہ واقعی داستان مطبوع صورت ہو جاتی
اگر اس کی روزانہ کی حاضری اس داستان میں بیان کی جاتی تو بے شک اس کی یہ آمد و
شد وہ رنگ پیدا کرتی جیسا کہ اہل فرنگ کا طرہ عقد کے پہلے ہوا کرتا ہے. اسے
انگریزی زبان میں "کورٹ شپ" کہتے ہیں کورٹ شپ گو ملک ہندوستان کے رواج
کے خلاف ہے مگر اہل یورپ میں مذموم نہیں ہے بشرطیکہ کورٹ شپ کا زمانہ خیریت
سے گذر جائے. درحقیقت یہ زمانہ انتظار کشی کا زمانہ ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ اس
سے محبوب تر زمانہ اس رواج کے پابندوں کو میسر اُن کی تمام عمر میں نہیں آتا ہے

جو مزا انتظار میں دیکھا
نہ کبھی وصل یار میں دیکھا

خیر وصل کے بیان تک تو لاریب بڑی لغزش حضرت مصنف سے ظہور میں آئی ہے
لیکن اس کے بعد کے مضامین پھر وہی حسن لاجواب رکھتے ہیں جو نیچرل شاعری سے

منفک نہیں ہو سکتا۔ اشعار ذیل قابل توجہ ہیں۔

یہ بیٹھے تھے خوش ہو کے باہم اِدھر — کہ اتنے میں اُدھر سے باجا پھر
پھر کے وہ بجتے اٹھا بے نظیر — ہوئی غم کی تصویر بدر منیر
نہ بولی نہ کی بات نہ کچھ کہا — نہ دیکھا ادھر آنکھ اپنی اُٹھا
کہا مجھ سے پیاری نہ بیزار ہو — پھر آؤں گا بولی کہ مختار ہو
خفا اس کے ہونے سے وہ نوجوان — گیا تو وہ سے منہ پہ آنسو رواں

داستان خبر پانا ماہ رُخ کا زبانی دیو کے عشق بے نظیر و بدر مُنیر سے اور قید کرنا بے نظیر کو

یہ داستان داخلی شاعری کا خاتمہ نظر آتی ہے شکسپیئر بلا سخن داخلی شاعری کا مالک ہے، مگر قابلیت کے رو سے میر حسن بھی اُس یکتا ئے روزگار سے کم دکھائی نہیں دیتے اس داستان میں دو سین حوالہ قلم ہوئے ہیں ایک وہ جو بے نظیر سے متعلق اور دوسرا وہ جو بدر منیر سے تعلق رکھتا ہے دونوں سین نہایت اعلیٰ درجہ کے داخلی پہلو رکھتے ہیں ان کے مضامین کہے دیتے ہیں کہ میر حسن کو امور ذہنیہ کے بیان کی عجب حیرت انگیز قدرت حاصل تھی واقعی ان کے داخلی بیانات عالم دردنی کی تصویر ہیں حسب دستور پہلے حضرت مصنف ساقی نامہ کے چند آبدار اشعار رقم کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں :-

پلا جر کے ساقی مجھے بھر کے جام — کہ ہے چرخ بھی درپئے انتقام

یہ وہ دِل کو اک جا بٹھاتا نہیں ۔ کِسی کا اِسے وصل بھاتا نہیں
یہ ہے دشمن وصل و دلسوز ہجر ۔ کرے ہے شب وصل کو روز ہجر
جدائی بھنوں کی خوش آئی اُسے ۔ پھر اتنی بھی صحبت نہ بھائی اُسے

اُس کے بعد ماہ رُخ کے خبر پانے کے مضامین کو اِس طرح پر حوالۂ قلم کرتے ہیں:-

کسی دیو نے دی پری کو خبر ۔ کہ معشوق عاشق ہوا اور پر
یہ سُن کر وہ شعلہ بھبوکا ہوئی ۔ لگی کہنے ایں یہ بلا کیا ہوئی
قسم مجھ کو حضرت سلیمانؑ کی ۔ ہوئی دشمن اب اس کے مَیں جان کی
کہا دیو سے تُو نے مجھے تو بتا ۔ کہا وہ کسی باغ میں تھا کھڑا
کوئی نازنیں سی بھی اک اس کے ساتھ ۔ کھڑی تھی دیئے ہاتھ میں اس کے ہاتھ
قضا را اُڑا میں جو ہو کر اُدھر ۔ وہ دونوں مجھے واں پڑے تھے نظر
یہ اُڑتی سی اس کی خبر سُن پری ۔ کہا دیکھنے پاؤں اس کو ذری
تو کھا جاؤں کچا اُسے موت ہو ۔ لگی ہے مری وہ تو اب سوت ہو
وہ آئے تو آگے مرے نابکار ۔ گریباں کو اس کے کروں تار تار
یہی قول و اقرار تھا میرے ساتھ ۔ بھلا اس کا دامن ہے اور میرا ہاتھ
ہمارے بزرگوں نے سچ ہے کہا ۔ کہ ہیں آدمی زاد کل بے وفا

حضرات ناظرین اشعار بالا اس غضبناک عورت کی ایک پوری تصویر ہیں جس کو اپنے معشوق سے بے وفائی کے صدمہ کے اٹھانے کا اتفاق ہوا ہو۔ حضرت مصنف نے ایسی عورت کے معاملات درونی کی مختلف اور پے درپے کیفیتوں کو جس قابلیت کے ساتھ حوالۂ قلم کیا ہے بہت کچھ قابل قدر و لحاظ ہے واہ واہ کیا فطری طریقۂ بیان

ہے معشوق کے اُوپر عاشق ہونے کی خبر پاتے ہی بلا ور بافت حقیقت پری شعلہ بھبوکا ہوتی
ہے پھر فرطِ حیرت و غضب سے جو بولتی ہے تو اسی قدر بولتی ہے کہ اب یہ بلا کیا ہوئی پھر
تحقیقِ حال کی طرف مائل نہیں ہوتی ہے دفعتاً بے نظیر کی دشمنِ جاں ہونے کی قسم کھا
بیٹھتی ہے یہ اضطراری فعل کس قدر فطری انداز رکھتا ہے پھر جب پہلی کیفیت شدت
غضب کی کم ہوتی ہے تب مختصر طور سے دیو سے جو یائے حال ہوتی ہے اس کے
پوچھنے پر دیو جس کو نہ بے نظیر اور نہ پری کے معاملات عشقیہ کے ساتھ کسی قسم کا تعلق تھا
ایک بے لگاؤ شخص کی طرح بے نظیر اور بدرِ منیر کے دیکھنے کی سرگذشت بیان کر دیتا ہے
اس کی کیفیت کو سن کر پری کو بدرِ منیر کے ساتھ فی الفور سوتیا ڈاہ پیدا ہوتی ہے، اور
بدرِ منیر کی نسبت ایسے الفاظ زبان پہ لاتی ہے کہ ایک غضبناک سوتن کے سوا کسی کی زبان
پر وہ آنہیں سکتے اس اظہارِ عداوت کے ساتھ ہی پھر پری بے نظیر کو خیال میں لاتی ہے
اور اس سے انتقام کا ارادہ مصمم کرتی ہے اور اس انتقام کی وجہ معقول سابق کے قول و
اقرار کو ٹھہراتی ہے بالآخر ان سب پے در پے غضبناکی کیفیتوں کے بعد اپنے عشقی
تعلق پر اظہارِ ندامت کرتی ہے اور قولِ بزرگاں سے اپنی انحراف ورزی پر سخت پشیمان
ہوتی ہے آفرین صد آفرین میر حسن آپ کی شاعری آئینہ عالمِ درونی نظر آتی ہے اگر
آپ بان اردو کے شاعر نہ ہوتے تو اردو میں شکسپیئر کی شاعری کا انداز کہاں دکھائی دیتا
اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے معاملاتِ خارجیہ کے بیانات تک شکسپیئر نہیں پہنچے
ہیں مگر آپ کے امور ذہنیہ کے بیانات بھی ایسے ہیں کہ قریب قریب شکسپیئر کا مرائے
جاتے ہیں اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ آپ شکسپیئر کی شاعری پابندی قوافی و ردیف
کے ساتھ برتتے ہیں اور یہ وہ سخت پابندی ہے جس سے شکسپیئر کو تمام تر آزادی نصیب تھی

پری کی غضبناکی حالتوں کو بیان کر کے حضرت مصنف بے نظیر کا اس کی حالت غضبناکی میں سامنے آنا یوں ارشاد کرتے ہیں :-

غضبناک بیٹھی تھی یہ تو ادھر
کہ اتنے میں آیا وہ رشکِ قمر

اسے دیکھ غصے میں وہ ڈر گیا
کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

بلا سی وہ دیکھ اس کے پیچھے لگی
کہا سن تو اے موذی و مدعی

تجھے سبز کو مَیں نے گھوڑا دیا
کہ اس مال زادی کو جوڑا دیا

الگ ہم سے یوں رہنا اور چھوٹنا
یہ اُوپر ہی اوپر مزے لوٹنا

مچلکا دیا تھا نہ تو نے یہی
بھلا اس کا بدلا نہ لوں تو سہی

پھرا جیسے راتوں کو دل شاد تو
کرے گا دنوں کو بہت یاد تو

مزا چاہ کا دیکھ اپنے ذرا
جھکاتی ہوں کیسے کنویں رہ بھلا

تجھے جیسے ماروں تو کیا اے غریب
وے چاہتے ہیں یہ تیرے نصیب

کہ چاہ الم میں پھنساؤں تجھے
ہنسا ہے تو جیسا رلاؤں تجھے

اشعار بالا کی فطری خوبیاں حضرات اہل مذاق پر ہویدا ہیں رقم کہاں تک سمع خراشی کرے اس غضبناک اور انتقام طلب تقریر کے بعد پری ایک دیو کو بے نظیر کے کنویں میں بند کرنے کا حکم دیتی ہے بے نظیر کے کنویں میں بند ہونے کے مضامین بھی نہایت شاعرانہ خوبیاں رکھتے ہیں اور اس عاجز کی دانست میں ملا جامی علیہ الرحمہ کے بیان قید چاہ سے جو ان کی مثنوی یوسف زلیخا میں پایا جاتا ہے زیادہ حسن شاعرانہ رکھتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہاں تک کا سین بے نظیر سے متعلق ہے اب حضرات ناظرین سین ذیل پر توجہ فرمائیں جو بدر منیر کی درونی کیفیتوں سے تعلق رکھتا ہے حضرت مصنف فرماتے ہیں

پھنسا اس طرح سے جو وہ بے نظیر — پڑی بیقراری میں بدرِ منیر
بہم دو دلوں میں جو ہوتی ہے چاہ — تو ہوتی ہے دل کے تئیں دل سے راہ
قلق واں جو گذرا تو یاں غم ہوا — رکا جی وہاں یاں خفا دم ہوا
کئی دن جو آیا نہ وہ رشکِ ماہ — نظر میں ہوا اس کے عالم سیاہ
لگی کہنے نجم النسا سے بوا — خدا جانے اس شخص کو کیا ہوا

واضح ہو کہ یہ امر فطری ہے کہ جب دو دل میں راہ ہوتی ہے تو ان میں سے اگر ایک مبتلائے غم ہوتا ہے تو دوسرا بھی مبتلائے غم ہو جاتا ہے، اس کا ذاتی تجربہ اکثر اشخاص کو حاصل ہوا ہے حضرت مصنف نے یہاں دل را بدل رہیست کے مضمون کو خوش اسلوبی کے ساتھ حوالۂ قلم کیا ہے ظاہر ہے کہ بے نظیر کی مفارقت سے جو غم بدرِ منیر کو ہوا وہ نجم النسا کو ہو نہیں سکتا تھا، گو نجم النساء بدرِ منیر کی ایک بڑی دردمند و ستدار تھی، بدرِ منیر کا تعلق بے نظیر کے ساتھ عشق کی بنیاد پر بالاصل اور نجم النساء کا بالعرض تھا اس تعلق کو بدرِ منیر کے حضرت مصنف نے شعر آخر میں خوب دکھلایا ہے رفیق سے ایسا خطاب کہ خدا جانے اس شخص پر کیا ہوا وہی شخص کرے گا جس کا تعلق قلبی انتہا کو پہنچ گیا ہوگا، اللہ ری کلام کی بلاغت اللہ ری کیفیت درونی کی مصوری، اللہ ری واقعات نگاری، اللہ ری فطرت نگاری یہی چیزیں ہیں کہ تائیدِ غیبی کے بغیر نہیں آتی ہیں یہ محض عنایت ایزدی ہے اگر یہ نشے کسبی ہوتی وہبی نہ ہوتی تو ہر طالب مدرسہ سعدی شکسپیر اور میر حسن بن بیٹھتا، اس خطاب کا جواب جو نجم النساء نے دیا گو روکھا معلوم ہوتا ہے مگر مصلحت آمیز ہے اس کے جواب سے ہویدا ہوتا ہے کہ وہ ایک مدبرانہ مزاج کی عورت تھی جیسا کہ وزیر زادی کو باشعور اور دور اندیش ہونا چاہیئے وہ تمامتر ویسی تھی اشعار ذیل نجم النسا کے جواب پر مشتمل ہیں،

کہا اُس نے بی تم کو سودا ہے کچھ ‏ وہ معشوق ہے اس کو پروا ہے کچھ

خدا جانے کس شغل میں لگ گیا ‏ مری چڑھ ہے اتنا بھی ہونا فدا

وہ رہ رہ کے تم کو دلاتا ہے چاہ ‏ عبث آپ کو تم کرو مت تباہ

رکے جو کوئی اس سے رک جایئے ‏ جھکے آپ سے اس سے جھک جایئے

تفول بھلا کچھ نکالا کرو ‏ ذرا آپ کو تم سنبھالا کرو

یہ جواب پاکر بدر منیر چپ ہو رہی اس کی خاموشی تمامتر مقتضائے فطرت تھی ایسے جواب کے بعد کوئی مبتلائے غم پھر زبان کھول نہیں سکتا، بدر منیر کی خاموشی اس طور پر شعر ذیل میں حوالۂ قلم ہوتی ہے

یہ سن چپ ہی دل میں کھایا پیچ و تاب ‏ دیا پھر نہ اس بات کا کچھ جواب

سبحان اللہ حضرت مصنف انسان کے کوائف دردنی سے کس قدر باخبر تھے لاریب میرحسن اردو کے شکسپیر ہیں اسی باخبری کی بدولت شکسپیر کو الہامی شاعر دنیا نے مانا ہے اور بصورت اطلاع میرحسن کو بھی ویسا ہی مان سکتی ہے انصاف یہی ہے کہ میرحسن شکسپیر کی طرح الہامی شاعر مانے جانے کے تمامتر مستحق ہیں اگر میرحسن انگلستان ایسے قدرشناس ملک میں ہوتے تو بے شک ایسے ہی مانے جاتے ؏

القصہ جب کئی دن گزر گئے اور بے نظیر کی کوئی خبر بدر منیر نہ پا سکی تو اس سے اُس کی کیا حالت ہو چلی اس کی پوری کیفیت اشعار ذیل سے ہویدا ہوتی ہے سبحان اللہ کیا فطرت نگاری ہے شاعری عبارت اسی سے ہے ان اشعار میں امور قلبیہ کا بیان نہیں ہے امور قلبیہ کی تصویری ہے فی الواقع میرحسن کی نیچرل شاعری کو وہی سمجھے جس نے شکسپیر کی تحصیل میں برسوں جان کھپی کی ہو، نیچرل شاعری کا مذاق کھیل نہیں ہے بڑی مشقتوں سے یہ دولت نصیب ہوتی ہے ؏

گیے اس پہ جب دن کئی اور بھی ۔ بگڑنے لگے پھر تو کچھ طور بھی

دِوانی سی ہر طرف پھرنے لگی ۔ درختوں میں جا جا کے گرنے لگی

ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب ۔ لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

تب ہجر گھر دل میں کرنے لگی ۔ دُر اشک سے چشم بھرنے لگی

خفا زندگانی سے ہونے لگی ۔ بہانے سے جا جا کے سونے لگی

تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ ۔ اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ

نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا ۔ نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا

جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اُسے ۔ محبت میں دن رات گھٹنا اسے

کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو ۔ تو اٹھنا اُسے کہکے ہاں جی چلو

جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے ۔ تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے

کسی نے جو کچھ بات کی بات کی ۔ پہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے ۔ کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

کسی نے کہا سیر کیجیے ذرا ۔ کہا سیر سے دل ہے میرا بھرا

جو پانی پلانا تو پینا اُسے ۔ غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کا ہوش ۔ بھرا دل میں اُس کے محبت کا جوش

چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر ۔ وہی سامنے صورت آٹھوں پہر

نہفتہ اُسی سے سوال و جواب ۔ سدا روبرو اُس کے غم کی کتاب

جو آجائے کچھ ذکر شعر و سخن

تو پڑھنا یہ دو تین شعر حسنؔ

غزل

یہ کیا عشق آفت اٹھانے لگا — مرے دل کو مجھ سے چھڑانے لگا
ملا میرے دلبر کو مجھ سے خدا — نہیں تو مرا جی ٹھکانے لگا
گنہ چشم خونبار کا کچھ نہیں — مرا دل ہی مجھ کو ڈبانے لگا
فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا — کہ جس کے عوض یوں رُلانے لگا
نہیں مجھ کو دشمن سے شکوہ حسن — مرا دوست مجھ کو ستانے لگا

دیگر

غزل یا رباعی و یا کوئی فرد — اسی ڈھب سے پڑھنا کہ ہو جس میں درد
سو یہ بھی جو مذکور نکلے کہیں — نہیں تو کچھ اس کی بھی خواہش نہیں
سبب کیا کہ دل سے تعلق ہے سب — نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل — کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ایک مہجور غم دیدہ آفت رسیدہ رنج کشیدہ مضطرب مبتلائے ملال بیقرار بے آرام دل سوختہ جان باختہ کی اس سے بہتر کیا تصویر کھینچ سکتی ہے حق یہ ہے کہ اہل انصاف جس قدر داد سخن دیں بجا ہے اور اہل ہند جس قدر اس مثنوی کو سرمایہ ناز سمجھیں سزاوار ہے۔

داستان بدر منیر کے غم و اندوہ کی اور عیش باغ میں اس کے جانے کی

بدر منیر کی حالت ہجر بے نظیر سے جو ہو رہی تھی اُس کی کیفیت بالا میں لکھی جا چکی لیکن ایک دن کی سرگذشت یہ ہے کہ بدر منیر خواب روز سے سو کر جو اٹھی تو اس کا جی چاہا کہ سیر چمن کیجئے کہ شاید اس سے کچھ تفریح کی صورت پیدا ہو کثرت اندوہ و

ملال میں کبھی انسان کے دل کو سیر و تفریح کی طرف میلان ہوتا ہے یہ امر خلاف فطرت
نہیں ہے اس خواہش سے وہ محل سے برآمد ہو کر چمن میں ایک زمردی موڑھے پر جا
بیٹھی۔ حضرت مصنف اس کے انداز نشست اس کی حقہ نوشی اس کی خواصوں کی
حاضری اور چمن کے سماں کو جس قادر الکلامی کے ساتھ زیب رقم کرتے ہیں اس کی داد
راقم کے احاطۂ قدرت سے باہر ہے امور خارجیہ کا بیان اس ستھرے پن کے ساتھ
شکسپیر کے کسی پلے میں نظر نہیں آتا ہے صرف سر والٹر اسکاٹ کی لیڈی آف
دی لیک میں البتہ یہ مرقع نگاری دیکھی جاتی ہے بہر کیف اس بیان کے بعد حضرت
مصنف لکھتے ہیں کہ سیر چمن میں بدر منیر کو نغمہ کا خیال آگیا۔ یہ امر خلاف فطرت
نہیں ہے سیر چمن میں نغمہ کی طرف میلان مقتضائے طبیعت ہے ایسا میلان الم کش
کو بھی ہوتا ہے گو نغمہ سے اس کے اندوہ و ملال میں کمی نہیں ہوتی آپ فرماتے ہیں:۔

کہ اتنے میں کچھ جی میں جو آگیا	ادا سے لگی کہنے وہ دلربا
ارے ہے کوئی ہاں ذرا جائیو	مری عیش بائی کو لے آئیو
عجب وقت ہے اور عجب ہے سماں	کرے دو گھڑی آ کے مجرا یہاں
خفا ہوں مرا جی بھی مشغول ہو	کوئی دم تو داغ جگر بھول ہو
کسی طرح سے دل تو لگتا نہیں	جلے ہے جگر دل سلگتا نہیں

یہ حکم پاتے ایک خادمہ عیش بائی کو بلا لائی۔ وہ عیش بائی بھی شاہی مجرائی تھی اس کے
حسن و جمال لباس زیور آرائش ساز و سامان آداب لحاظ کا کیا کہنا تھا جب بدر منیر
کے حضور میں حاضر آئی وقت کے مطابق گوری کا حکم ہوا۔ اس نے گانا شروع کیا حضرت
مصنف اس صحبت رقص کے سماں کی تصویر یوں کھینچتے ہیں۔

ہُوا حکم گوری کا جو برملا
لیے ساز اپنے سبھوں نے اُٹھا

دیا آسماں پر جو طبلوں کو کھینچ
ہر اک تھا بیبں ول لبا سدب کا اینچ

لگی گانے ٹپہ وہ اس آن سے
نکلنے لگی جان ہر تان سے

عجب تان پڑتی تھی انداز سے
کہ بیکل تھی ہر تان آواز سے

وہ تھی گنگری یا لڑی نور کی
مسلسل تھی اک پھلجھڑی نور کی

گل و غنچہ کی طرح محبوب تھی
کھلی اور موندی دل کو مرغوب تھی

غرض کیا کہوں اس کا بیں ماجرا
عجب طرح کی بندھ گئی تھی ہوا

وہ گانے کا عالم وہ حسن بیاں
وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں

گھڑی چار دن باقی اس وقت تھا
سہانا ہر اک طرف سایہ ڈھلا

درختوں کی کچھ چھانو اور کچھ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

لپٹے ہوئے پستوں پر تمام
روپہلے سنہرے ورق صبح و شام

وہ لالے کا عالم وہ گرے کا رنگ
وہ آنکھوں کے ڈورے نشہ کی ترنگ

گلابی سا ہو جانا دیوار و در
درختوں سے آنا شفق کا نظر

وہ چادر کا چھٹنا وہ پانی کا زور
ہر اک جانور کا درختوں پہ شور

وہ سرو سہی اور آب رواں
وہ مستی سے پانی کا بہنا وہاں

وہ اُڑتی سی نوبت کی دھیمی صدا
کہیں دور سے گوش پڑتی تھی آ

وہ رقص بتاں اور بھتر الاپ
وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ

وہ دل لپٹنا ہاتھ پر ھر کے ہاتھ
اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ

نہ انساں ہی کا ہو دل اس میں بند
ہوئے محو سُن کر چرند و پرند

غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہ گئے ‏ ‏ اڑے جس جگہ کو اڑے رہ گئے
جو پیچھے تھے آگے نہ وہ چل سکے ‏ ‏ جو بیٹھے سو بیٹھے نہ پھر ہل سکے
لگی دیکھنے آنکھ نرگس اٹھا ‏ ‏ گلوں نے بھی ٹیکے کان اودھر لگا
لگے ہلنے اوجد میں سب درخت ‏ ‏ کھڑے رہ گئے سُن ہو کر کرخت
درختوں سے گرنے لگے جانور ‏ ‏ بنے مثل آئینہ دیوار و در
عجب راگ کو بھی دیا ہے اثر ‏ ‏ کہ ہو جائے پتھر کا پانی جگر
بندھا اس طرح کا جو اس جا سماں ‏ ‏ ہوا سب کے دل کا عجب حال واں

حضرت مصنف کی اطلاع عام بہت قابل لحاظ ہے جتنی باتیں رقص و نغمہ سے متعلق ہیں پوری واقفیت کے ساتھ حوالۂ قلم ہوئی ہیں تاثیر نغمہ کے بیانات عجب پرتاثیری کے ساتھ رقم ہوئے ہیں بہت کچھ تو ان میں واقعات ہی کی حیثیت رکھتے ہیں بقیہ استعارات قریب کے ساتھ اور فطری رنگ پر بندش پائے ہیں کہ دل کو ان کی جانب عجب طرح کی رغبت ہوتی ہے علاوہ اس کے مجمع خوباں صحبت رقص تازگی چمن کیفیت وقت ان سب کا سماں ایسی خوبی کے ساتھ دکھلایا گیا ہے کہ میرحسن کے سحر البیان ہونے میں ہر کہ شک آرد کافر گردد کا مضمون صادق آتا ہے تناسب کلام کی یہ خوبی ہے کہ اس سے زیادہ تناسب کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی جن صاحب نے اس شعر پر "درختوں کی کچھ چھاؤں وہ کچھ وہ دھوپ ٭ وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ" یہ اعتراض وارد فرمایا ہے کہ دھان اور سرسوں کا ایک وقت نہیں ہوتا ان کا یہ اعتراض یا فن باغبانی یا فن زراعت کے اصول پر وارد کیا جا سکتا ہے ان دو پہلو کے سوا اور کسی پہلو سے اس شعر پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا ہے اگر زبان کی بدترکیبی پر کوئی اعتراض وارد کیا جائے تو

راقم کو اُس میں مجالِ گفتگو نہیں ہے، کس واسطے کہ یہ ناچیز نہ زبان داں ہے نہ اہلِ زبان سے
ہے بہرکیف اگر فنِ باغبانی کے رو سے یہ اعتراض وارد کیا گیا ہے اور قرینہ بھی ایسا ہی
ہے کہ فنِ باغبانی کے رو سے یہ اعتراض وارد کیا گیا ہوگا، کس واسطے کہ یہ دھان اور سرسوں
بدرِ منیر کے باغ کے اندر واقع تھے جہاں وہ گانا سن رہی تھی ظاہر ہے کہ سیر گلگشتی کے
لیے زراعتی کھیتوں میں تو وہ نہیں گئی تھی پس اُس کا جواب باغبانی کے فن کے
رو سے یہ ہے کہ امرا کے باغوں میں مجرد سبزی کے خیال سے دھان اور جو بوئے
جاتے ہیں، ان سے پیداوار کی غرض متعلق نہیں ہوتی، جس فصل میں جو کوئی چاہے
سبزی کی غرض سے دھان یا جو بو کر دیکھ لے پس جب ہر وقت میں دھان یا جو کا
سبز تختہ تیار کیا جا سکتا ہے تو پھولی ہوئی سرسوں کے ساتھ دھان کے تختہ
کا موجود رہنا خلافِ امکان کیا ہے سرسوں بولنے کے وقت جب دھان بو یا جائے
گا اس میں ناکامیابی لاحق نہ ہوگی بشکل ثانی اگر اعتراض بالا زراعت کے اصول پر
وارد کیا گیا ہے تو بھی میر حسن کے کلام میں عدمِ تناسب کا نقصان پایا نہیں جاتا ہے، کس
واسطے کہ جن ملکوں میں دو فصلیں یا تین فصلیں دھان کی ہوا کرتی ہیں وہاں دھان کی
سبزی سرسوں کے پھولنے کے وقت میں پائی جاتی ہے، علاوہ اس کے ایک
قسم دھان کی ہوتی ہے جسے بورو کہتے ہیں یہ قسم سرسوں کے پھولنے کے وقت
نہایت سبز رہتی ہے یہ قسم دھان کے محاصل کے اعتبار سے فصل گرما میں تیار
ہوتی ہے اس وقت سے بہت پہلے سرسوں تیار ہو کر کٹ جاتی ہے، حضرت
معترض کے ایسے اعتراض وارد کرنے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر ملکوں
میں جب سرسوں پھولتی ہے تو دھان میں سبزی نہیں باقی رہتی ہے لیکن اگر

حضرت معترض کو پورے طور پر زراعتی معاملات سے اطلاع ہوتی تو ایسے اعتراض کے وارد کرنے پر جرأت نہیں فرماتے، ایسے دلیسوں میں بھی کبھی سرسوں کے پھولنے کے وقت دھانوں کے بعض کھیتوں میں کافی طور پر سبزی باقی رہتی ہے، اس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ جب دھان پچھات اور سرسوں اگات ہوتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ سرسوں کے بونے کے دو زمانے ہیں ایک ہتیا نچھتر کے بعد اور دوم عین سرما میں پہلی قسم جب سویرے سے بوئی جاتی ہے تو اس کے پھولنے کے وقت دیر کے بوئے ہوئے دھانوں کا سبز رہنا خلاف توقع نہیں ہے لہٰذا میر حسن کا شعر نیچرل شاعری کے خلاف نہیں ہے عام اس سے کہ باغبانی یا زراعتی نگاہ سے دیکھا جائے
القصہ ہر چند گانا بڑی خوبی کے ساتھ ہو رہا تھا مگر بدر منیر کو اس سے تفریح طبع کی صورت پیدا نہیں ہوئی، چوٹ کھایا ہوا دل کہیں گانے بجانے سے بہلتا ہے سماں و رقص سے تو غم و الم کی افزائش ہوتی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے :-

لگا تھا از بس عشق کا اس کو تیر | لگی کھینچنے آہ بدر منیر
بندھا اُس کو عاشق کا اپنے خیال | لگی رونے آنکھوں پہ دھر کر رومال
کہیں کا کہیں لے اڑا اس کو راگ | ہوا سے ہوئی اور گلزار آگ
لگی کہنے ہے ہے یہ دیکھوں میں سیر | نہ ہو پاس میرے وہ یا دش بخیر
دہی جانے ہر جس کے کچھ دل کو لاگ | کہ معشوق بن سب ہے گلزار آگ
بھلا کیونکہ جی اس کا خوش حال ہو | کہ ہجراں کا غم جس کے دنبال ہو
جگر میں اگر آہ کی سول ہو | لگے خار کیسا ہی گو پھول ہو

درختوں کے عالم سے کیا ہو نہال   جسے یادِ شمشاد کی ہو کمال
کرے گلشن و گل پہ کیا وہ نظر   جسے اپنے گل کی نہ ہووے خبر
یہ کہہ کر اُٹھی واں سے وہ دلربا   پھر کھٹ میں جا کر گری منہ چھپا
خوشی کا جو عالم تھا ماتم ہُوا   ورق کا ورق ہی وہ برہم ہُوا
سب اُٹھتے ہی بس اس کے جاتی رہیں   طوائف کہیں اور خواصیں کہیں

یہ سچی تصویر اس شخص کی ہے جو حالت غم میں جلسۂ رقص و سرود کا شریک ہوتا ہے نغمۂ و مے ان کے لیئے مسرت خیز ہے جن کے دل بندِ غم سے آزاد ہیں نہ البیوں کے واسطے جو قیدی رنج و محن ہیں۔ لمؤلفہ :

نغمۂ و مے کا ذکر مت چھیڑو   ہجر میں ناگوار ہیں دونوں

حضرت سودا نے خوب فرمایا ہے

جن کو وصل گل رخاں ہے اُن کو بھاتی ہے بہار   ہم سے مہجوروں کو لیکن کب خوش آتی ہے بہار
دیدِ گل کیا کیجئے بڑھتی ہے دونی بے کلی   خارِ ہجراں اور بھی دل میں چبھاتی ہے بہار

آخر میں حضرت مصنف تین شعر اخلاقی رنگ کے یوں حوالۂ قلم فرماتے ہیں

مری عقل اس جا پہ حیران ہے   کہ یارب یہ کیسا گلستان ہے
ہر اک وقت ہے اس کا عالم جُدا   جو چاہو یہ پھر ہو تو امکان کیا
کبھی ہے خزاں اور کبھی ہے بہار   نہیں اک روش سے یہ لیل و نہار

داستان بے نظیر کے غم ہجر سے بدر منیر کی بیقراری میں

حضرت مصنف نے اس داستان میں بدر منیر کی غمزدگی کا فوٹو اس طرح پر کھینچا ہے

زباں پر تو باتیں مُلے دل اُداس | پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر | نہ سر کی خبر نہ بدن کی خبر
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں | جو کُرتی ہے میلی تو محرم نہیں
جو مسّی ہے دو دن کی تو ہے وہی | جو کنگھی نہیں کی تو یوں ہی سہی
جو سینہ کھلا ہے تو دل چاک ہے | غم آلودہ صبح طرب ناک ہے
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام | نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام

اس کے بعد حضرت مصنف فرماتے ہیں کہ حسین بے آرائش بھی بھلے لگتے ہیں بلکہ بے آرائش اُن کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے یہ قول نہایت راست ہے اس میں مبالغہ کو خس برابر بھی دخل نہیں ہے' آپ فرماتے ہیں :-

ولیکن یہ خوبوں کا دیکھا سبھاؤ | کہ بگڑے سے دُونا ہو اُن کا بناؤ
نہیں حسن کی اس طرح بھی کمی | جو بگڑی ہے بیٹھی تو گویا بنی
غرض بے ادائی ہے یاں کی ادا | بھلوں کو سبھی کچھ لگے ہے بھلا
جو ماتھے پہ چین جبیں غم سے ہے | تو وہ بھی ہے اک موج دریا سے ہے
وہ آنکھیں جو روئی ہیں پھوٹ پھوٹ | تو گویا کہ موتی بھرے کوٹ کوٹ
تپ غم سے یوں تمتمائے ہیں گال | کہ جوں رنگ لالہ ہو وقت زوال
گریبان سینہ پہ ہے جو کھلا | تو گویا وہ ہے صبح عشرت فزا
نقاہت سے چہرہ اگر زرد ہے | دیا آہ ہونٹوں پہ کچھ سرد ہے
ادا سے نہیں یہ بھی عالم جدا | کہ ہے چاندنی اور ٹھنڈی ہوا

حضرت مصنف کی شاعری کا یہ بڑا کمال ہے کہ اکثر منقح مسائل بیان کر جاتے ہیں

واقعی حسن محتاج آرائش نہیں ہے جیساکہ حضرت سودا فرماتے ہیں :-

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
کہ جیسے خوشنما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

داستان بیقراری بدر منیر کی بے نظیر کے فراق میں اور نجم النساء کے تسلّی دینے میں

بدر منیر ہجر بے نظیر میں یوں تو برابر بے قرار تھی مگر جب پورا مہینہ گذر گیا اور بے نظیر نہ آیا تب اس کا قلق بڑھنے لگا عشق نے انداز جنوں کا پیدا کیا بقول حضرت مصنف :-

محبت کا سودا سا ہونے لگا
جنوں تخم وحشت کا بونے لگا

سرکنے لگا پاس ناموس و ننگ
لگی عقل اور عشق میں ہونے جنگ

خموشی اٹھانے لگی دل میں شور
جتلانے لگی ناتوانی بھی زور

واضح ہو کہ عشق ایک وسواسی مرض ہے اگر اس کا علاج وقت پر نہیں کیا جائے، تو جنوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے عشق کا بہترین علاج وصلِ معشوق ہے مگر یہ علاج دشوار صورت ہے ظاہر ہے کہ بحالت موجودہ اس طور پر بدر منیر کے علاج کی کوئی شکل نہ تھی اگر اس کے عشق سے آثار جنون نمایاں ہونے لگے تو یہ امر تمامتر قرین فطرت تھا واقعی حضرت مصنف بہت ہی اطلاع عام رکھتے تھے زینیاد ایسی شاعری ایک لاعلم شاعر سے انجام نہیں پا سکتی ہے القصہ جب بدر منیر کی یہ حالت پہنچی نجم النساء نے اس کے جوش کو مصلحت آمیز باتوں سے کم کر دینا

چاہا جیساکہ اشعار ذیل سے ظاہر ہو گا :-

یہ احوال دیکھ اُس کا دخت وزیر — لگی جل کے کہنے کہ بدر منیر
تو وہ ہے کہ سب کے تئیں بیوقوف — کدھر دل گیا تیرا اے بیوقوف
مسافر سے کرتا ہے کوئی پیت — مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت
ارے چار دن کے ہیں یہ آشنا — ملا دل کو آخر کریں ہیں جدا
گئے آسماں گر زمیں کے ہیں یہ — جہاں بیٹھے جا بس وہیں کے ہیں یہ
تو بھولی ہے کس بات پر اے بوا — خبر لے دیوانی تجھے کیا ہوا
ستو جان اپنے پہ کوئی مرے — تو دل پہلے اپنا بھی صدقہ کرے
اگر آپ پر کوئی شیدا نہ ہو — تو پھر چاہیئے اس کی پروا نہ ہو
وہ خوش ہو گا اپنی پری کو لیے — عبث اُس پہ بیٹھی ہو تم جی دیئے
تمہاری اسے چاہ ہوتی اگر — تو ابتک وہ تم کو نہ آتا نظر

علم النفس کی یہ تقریر بڑے طبعی اصول پر مبنی معلوم ہوتی ہے عشق کے علاج کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ معشوق کے حالات نفرت افزا اور خصائل زشت کو عاشق کے آگے بیان کرتے ہیں مگر یہ طریقہ افراط عشق کی حالت میں سُود مند نہیں ہوتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا جیساکہ اشعار ذیل سے ظاہر ہو گا :-

لگی کہنے تب اُس سے بدر منیر — کہ سنتی ہے اے میری دخت وزیر
کسی کی بدی تو نہ کر عیب ہے — کہ اُس کا خدا عالم الغیب ہے
وہ اپنے دلوں سے تو ہے نیک ذات — ہوئی اس پہ کیا جانے کیا وار دات
ہوا قید یا آسے پایا نہ ہو — گئے اتنے دن اب تک آیا نہ ہو

مجھے رات دن اس کا رہتا ہے ڈر　　پری نے سنی ہو نہ یاں کی خبر
نہ باندھا ہو اس کو کسی صبد میں　　کیا ہو نہ اُس کے تئیں قید میں
پری نے کہیں طیش کھا لاف میں　　دبا ہو نہ پھینک اُس کو قاف میں
پرستان سے بھی نکالا نہ ہو　　کسی دیو کے منہ میں ڈالا نہ ہو
نہ ملنے کے دکھ اس کے سب ہیں سہے　　بھلا اپنے جی سے وہ جیتا رہے
یہ کہہ حال دل اپنا رونے لگی　　گہر آنسوؤں کے پرونے لگی
گئی منڈکری مار آخر کو لیٹ　　چھپر کھٹ کے کونے میں سر منہ لپیٹ

اشعار بالا کس قدر فطری رنگ رکھتے ہیں اول تو معشوق کی برائی کا یقین ہی پیدا نہیں ہوتا ہے معشوق ہمیشہ خوش خصال ہی نظر آتا ہے جیسا کہ قول ارسطو ہے "العشق یعمی حس العاشق و یقمہ عن ادراک عیوب معشوقہ" ایسی صورت میں بلا منیر بے نظیر کی برائی کو کیونکر مان سکتی تھی لیں ضرور ہوا کہ نجم النساء کو بدگوئی سے روکے، اور نجم النساء کی تردید میں بے نظیر کو خوبی کے ساتھ یاد کرے پھر بے نظیر کی نسبت تعلق کے ساتھ اس کی غیر حاضری کے احتمالات کو گہ جائے سبحان اللہ کیا شاعری ہے اس کے بعد بے غرضی کی عاشقی کا اظہار کیا خوب حوالہ قلم ہوا ہے آخر میں بیکسی کا رو دینا کیا نیچرل رنگ رکھتا ہے اور رونے کے بعد منڈکری مار کر اور چھپر کھٹ کے کونے میں سر منہ لپیٹ کر سو جانا کیا ہی واقعہ نگاری ہے۔

خواب دیکھنا بدر منیر کا بے نظیر کو کوئیں میں اور جوگن بن کر نکلنا نجم النسا کا اُس کی تلاش میں

واضح ہو کہ تزکیۂ روح میں ریاضت کو بڑا دخل ہے تن پروری حجاب چہرۂ جان ہوتی ہے فقرا نفس کشی سے روح کی صفائی پیدا کرتے ہیں فقیر کا تو بڑا درجہ ہے اس کی متقیں اگر تصفیہ قلب و روح کی شکل پیدا کریں تو عجب کیا ہے ہم اہل دنیا بھی تکلیف دلی اٹھا کر کچھ نہ کچھ صاف دل ہو جاتے ہیں اس عاجز کا ذاتی تجربہ ہے کہ دلی مصائب کے زمانہ کے خواب نہایت حیرت انگیز ہوتے ہیں صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آلام قلبی کے اثر سے کچھ نہ کچھ دل کی اصلاح ہو جاتی ہے جس کے باعث روح میں بھی حسب استعداد قلبی کم و بیش طور پر صفائی آجاتی ہے پس قلبی تکلیفیں اُٹھا کر ایسا خواب جیسا کہ اس داستان میں حضرت مصنف نے حوالۂ قلم کیا ہے اگر بدر منیر نے دیکھا تو خلاف فطرت منصور نہیں ہے بلکہ علم ذہنیات کے رو سے اُس کا ایسا خواب دیکھنا نہایت قرین قیاس ہے کس واسطے کہ مضمون خواب قریب قریب وہی دکھائی دیتا ہے جو عالم بیداری میں اس کے ذہن میں موجود تھا اور جیسے بتلائے خواب ہونے کے قبل وہ نجم النسا سے اعادہ کر چکی تھی بہر کیف یہ خواب خالی از حیرت نہ تھا حیرت انگیز خواب بہت لوگوں نے دیکھے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ خواب جس کو ڈاکٹر ایبر کرامبی نے اپنی کتاب فلسفہ میں خواب کی بحث میں درج کتاب کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ لندن میں ایک شخص نے اپنے دوست کی نسبت جو پارلیمنٹ

کا ممبر تھا یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ فلاں کا کوٹ پہنے ہوئے ہوس آف کامنس میں اسپیچ دے
رہا ہے اسی حالت میں ایک شخص آیا اور اس نے اس ممبر پر چھری چلائی مگر وہ چھری
کی نوک اس ممبر کی کوٹ کے ایک بٹن پر جا لگی جس کے باعث وہ ممبر زخمی ہونے
سے بچ گیا، جب خواب دیکھنے والا بیدار ہوا تو فوراً اس ممبر کے پاس گیا اور سارا معاملہ
خواب کا کہہ سنایا اور تقاضائے دوستی سے التجا کی کہ اے دوست زنہار ہوس
آف کامنس میں نہ جانا مجھے تمہاری جان کا خطرہ نظر آتا ہے، مگر ملتجی کے دوست
نے کچھ توجہ نہ کی اور جواب میں یہ کہا کہ سب خواب و خیال کی باتیں ہیں بروز حاضری
جب وہ ممبر ہوس آف کامنس میں گیا اور جس وقت وہ اسپیچ دے رہا تھا ایک شخص
آیا اور اس نے چھری ماری چھری کی نوک کوٹ کے بٹن پر پڑ کے ٹوٹ گئی اور
قتل ہونے سے بچ گیا، اتفاق وقت سے وہ ممبر اُس وقت اسی رنگ کا کوٹ
بھی پہنے ہوئے تھا جیسا کہ اس کے دوست نے خواب میں دیکھا تھا، یہ ممکن تھا
کہ کیفیت خواب سن کر وہ ممبر کسی اور رنگ کا کوٹ پہن کر حاضر پارلیمنٹ ہوتا، مگر
چونکہ اس نے اپنے دوست کے خواب کو محض خیالی امر سمجھا تھا کوٹ کے پہننے کے
وقت اس ممبر کو کوٹ کے رنگ کا مضمون کچھ یاد نہ رہا ایسے خوابوں کی توجیہ ابھی تک
کسی ملک کے علمائے ظاہری سے نہیں ہو سکی ہے لاریب یہ ایسے خواب ہیں کہ
مجرد ہمارے اوہام اور خیالات کے نتائج نہیں ہیں کوئی شک نہیں کہ اُن کو ہمارے
معاملات سے تعلق ہے جس کو ہم اہل ظاہر کچھ نہیں جانتے۔ حضرات انبیاء کے
بعض خواب کتب سماویہ میں مندرج پائے جاتے ہیں ان کی صحت سے بے دین
کے سوا کون انکار کر سکتا ہے خوابوں میں وہ خواب بھی بہت کچھ قابل لحاظ ہے جس

کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے زندان مصر میں فرمائی تھی عوام بھی کبھی کبھی حیرت انگیز خواب تکلیفات قلبی کی حالت میں دیکھتے ہیں یہ شخص بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ محبوس زنداں تھا عجب نہیں کہ مصائب قلبی اُٹھاتے اٹھاتے اُس کی روح میں کچھ تزکیہ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہو جس کے باعث اُس نے یہ عجیب خواب دیکھا انبیاء علیہم السلام کے خواب رویائے صادقہ ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کی روح پر فتوح مصفّا و مزکّا ہوتی ہے لیکن کسی قسم کے تزکیہ کے باعث عوام بھی بعض اوقات ایسے خواب دیکھتے ہیں کہ حیرت سے خالی نہیں ہوتے بیشتر عوام الناس کے خواب ان کے خیالات کے نتائج ہوتے ہیں مثل مشہور ہے کہ مرغ کے خواب میں دانہ ایسے خواب احلام کا حکم رکھتے ہیں اور مطلق قابل توجہ متصور نہیں ہیں۔ اب حضرات ناظرین میر حسن کے اشعار پر جو بدر منیر کے مضامین خواب پر مشتمل ہیں توجہ فرمائیں :-

قضا نے دکھایا عجب اس کو خواب — کہ دشمن نہ دیکھے یہ حال خراب
جو دیکھا تو صحرا ہے اک لق و دق — کہ رستم بھی جسے دیکھ ہو جائے نق
نہ انساں ہے واں نہ حیوان ہے — فقط اک کف دست میدان ہے
مگر بیچ میں اس کے ہے اک کنواں — کہ اُٹھتا ہے آہوں کا واں سے دھواں
کنویں کا ہے منہ بند اور اس سے لگی — کئی لاکھ من کی ہے اک سل پڑی
صدا واں سے ہے یہ کہ بدرِ منیر — ترے چاہِ غم میں ہوا ہوں اسیر
میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان — کہوں کیا کہ ہے قید مجھ پر گراں
پر اس قید میں بھی ترا دھیان ہے — فقط تیرے ملنے کا ارمان ہے

تو اپنی جو صورت دکھائے مجھے	تو اس قید غم سے چھڑائے مجھے
نہیں مجھ کو مرنے سے کچھ اپنے ڈر	یہ غم ہے کہ تجھ کو نہ ہو وے خبر
تجھے کاش اس وقت میں دیکھ لوں	جیوں میں اگر تیرے آگے مروں
ولیکن یہ ہے خام میرا خیال	نہیں وصل ممکن بغیر از وصال
کوئی دم کا مہمان ہوں آج کل	ابھی چاہ میں جائے گا دم نکل

ان اشعار کے مضامین کی خستگی برشتگی سوز و گداز محتاج بیان نہیں ہے کلام کی خوبی ایسی ہے کہ ہر چند بے نظیر ایک فرضی شخص ہے مگر اس کی بے چارگی، بے کسی، رنج کشی مصیبت زدگی مایوسی پیش نظر ہو کر دل کو سخت چوٹ پہنچاتی ہے علاوہ اس کے عشق میں استقلال، بے غرضی محبت کی ثابت قدمی معشوق کی ایذا یابی کا خیال بے نظیر کی بڑی وقعت آنکھوں میں پیدا کرتی ہے سبحان اللہ کیا انداز بیان ہے خلاق سخن اسے کہتے ہیں یہی چیزیں ہیں کہ سیکھنے سے نہیں آتیں:

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

القصہ بے نظیر کو خواب میں اس طرح کلام کرتے دیکھ کر بدر منیر نے چاہا کہ کچھ بات کرے مگر اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی، یہ بیان بھی فطری ہے اکثر حالت خواب میں ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت مصنف نے انداز بیان رکھا ہے آنکھ کھلنے پر جو حالت بدر منیر کی ہوئی یہ کیفیت بھی بہت خوش اسلوبی کے ساتھ حوالہ قلم ہوئی ہے پہلے تو بدر منیر نے اپنی حالت غم کو چھپایا مگر جب راز غم پنہاں نہ رکھ سکی تو ہمراز خواصوں سے معاملہ خواب کو بیان کیا جب نجم النسا حقیقت حال سے مطلع ہوئی تو اس کو بڑی بیقراری لاحق ہوئی۔ اس جگہ کا سین زبان مصنف سے ذیل میں عرض کیا

جاتا ہے :-

لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا ترے واسطے میں نے اب دُکھ سہا
بس اب سر بصحرا نکلتی رہوں میں اسے ڈھونڈ لانے کو چلتی ہوں میں
جو باقی رہا کچھ مرے دم میں دم تو پھر آ کے یہ دیکھتی ہوں قدم
دگر مر گئی تو بلا سے موئی تو یوں جانیو مجھ پہ صدقہ ہوئی
کہا شاہزادی نے سن اے رفیق ہوئی میں تو اس چاہ غم میں غریق
بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو کہ وہ ہے پری اور انسان تو
رسائی تری ہوگی کیونکر وہاں مجھے بھی نہ دے ہاتھ سے میری جاں
میں جیتی ہوں اس آسرے پر فقط کہ ہوتا ہے تجھ سے مرا غم غلط
دگرنہ میں رک رک کے مر جاؤں گی اسی طرح جی سے گزر جاؤں گی
کہا اس نے کیا کیجیے پھر بھلا پڑی اب تو اپنے ہی سر یہ بلا
میں اس عشق کا یہ نہ سمجھی تھی ڈول ترے غم سے آنے لگا مجھ کو ہول
تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں اس اندوہ کا مجھ کو یارا نہیں
یہ کہہ اس نے زیور اتارا سنگار کیا اپنی پشواز کو تار تار
گریباں کو مثل گل چاک کر دیا خاک پر پھینک ادھر اودھر
پھر آئے جو کچھ اس کو ہوش و حواس سجا تن پہ جوگن کا اس نے لباس

اس کے بعد اس کے جوگن بننے کا فوٹو حضرت مصنف نے بڑی خوبصورتی اور بڑی دانست کے ساتھ کھینچا ہے جوگ کے بھیس میں تلاش معشوق میں نکلنے کا مضمون ملک ہندوستان سے خصوصیت رکھتا ہے بہت سے ہندی گیت دیکھے جاتے ہیں جن میں جوگی

اور جوگن کے مضمون بڑی لطافت کے ساتھ بندش پاتے گئے ہیں اِس بھیس کے اختیار
کرنے کا ظاہرا یہ سبب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جوگ ایک مروج امر ہے بہت سے
زن و مرد مذہبی خیالات کی پابندی سے یہ شیوہ اختیار کرتے ہیں پس اگر کوئی شخص جوگ کا
پیرایہ کسی خاص ضرورت سے بھی اختیار کرتا ہے تو اُس پر تفتیش کی آنکھ نہیں پڑتی ہے اور
صورت سے اس کی حقیقت حال پوشیدہ رہ جاسکتی ہے انگریزی شاعری میں جوگ کا
مضمون قریب قریب نادر معلوم ہوتا ہے فقیر کو صرف دو تین ایسی انگریزی نظم سے
اطلاع ہے جس میں فقیرانہ بھیس کا مضمون بندش پایا ہے اُن میں سے بہت پر درد اور
دلآویز وہ فسانہ ہے جسے گولڈ اسمتھ نے منظوم کیا ہے اور جو گولڈ اسمتھس ہرمٹ کے
نام سے معروف ہے لفظ ہرمٹ انگریزی ہے اس کے معنی تارک الدنیا اور فقیر ہے
مگر یہ لفظ پورے طور پر جوگی کا مترادف نظر نہیں آتا ہے انشاء اللہ تعالیٰ یہ قصہ اس
کتاب کا جلد رابع میں درج پائے گا ؕ

واضح ہو کہ نجم النساء کا جوگن بن کر بے نظیر کی تلاش میں نکلنا اس کی بڑی پختہ مزاجی
دردمندی اور دلسوزی سے خبر دیتا ہے ظاہر ہے کہ یہ عورت دختر وزیر تھی اور بلا گفتگو
عیش و آرام میں پالی گئی تھی مگر دوست پر برا وقت جو آپڑا تو ساری ذاتی راحتوں کو چھوڑ کر
بے دھڑک مصیبت کشی اور جانبازی کے لیے تیار ہو گئی اسی کو وفاداری کہتے ہیں البتہ بُرے
وقت ہی کام آنا دوستداری ہے ورنہ بھلے وقت میں دوست کہلانے کیلئے دنیا موجود رہتی ہے:۔

دوست مشمار آنکہ در نعمت زند — لاف یاری و برادر خواندگی
دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست — در پریشاں حالی و درماندگی

یہ قصہ بڑا اخلاق آموز پیرایہ رکھتا ہے واقعی نجم النساء کی یہ کارروائی اُس کی بڑی شرافت

نفسی سے خبر دیتی ہے۔ اگر ذاتی غرض سے یہ عورت جوگن کا بھیس اختیار کرتی تو اُس کی یہ کارروائی معمولی طور کی ہوتی کس واسطے کہ جوشِ عشق میں ایسی کارروائی اکثر زن و مرد کی نسبت بیان کی گئی ہے مگر دوست کی ہمدردی کے تقاضے سے ایسی دشوار کارروائی کو اختیار کرنا ایک قدرت خاص رکھتا ہے۔ خیر جب نجم النسا جوگن کا بھیس لے چکی اور تلاش بے نظیر میں جانے لگی اس وقت کا سین حضرت مصنف نے بڑی خوبیوں کے ساتھ حوالۂ قلم کیا ہے اس کی رخصت کی بندش نہایت نیچرل رنگ رکھتی ہے کلام کا عنوان ایسا نہیں ہے۔ جس سے دل نہ بھر آئے فقیر کی دانست میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اُس کی رخصت کو پڑھے اور متاثر و متالم نہ ہو حضرات ناظرین اشعار ذیل سے لذت یاب سوز و درد ہوں:

وہ رخصت جو اِس طرح ہونے لگی   تو وہ صاحبِ خانہ رونے لگی
وہ رو رو کے دو ابرِ غم یوں ملے   کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے
بیاں تک بندھا اُس کے رونے کا تار   بہے پھوٹ دیوار و در ایک بار
کھڑے تھے وہ جوگن کے جو گرد گل   وہ رو رو ہوئے شبنم آلودہ گل
نہ دیکھا کسی نے جو کچھ اختیار   کہا حق کو سونپا تجھے لے سدھار
چلی جس طرح پیٹھ اپنی دکھا   اسی طرح دکھلا ہمیں منہ پھرا
کسی نے کہا بھولیو مت مجھے   خدا کے تئیں میں نے سونپا تجھے
کہا اُس نے خیر اب تو جاتی ہوں میں   جو ملتا ہے تو اس کو لاتی ہوں میں
تمہیں بھی خدا کو میں سونپا سنا   مرا بخشیو تم کہا اور سنا

یہ رخصت پُر از درد و سوز ہونے کے علاوہ نسوانی پیرایہ کیا خوب رکھتی ہے طریقہ بیان ایسا ہے۔ جس سے تمامتر ایک عورت کی رخصت اپنی ہمجولیوں کے مجمع سے عیاں ہوتی

ہے یہاں بھی حضرت مصنف نے مصوّری کا عالم دکھلایا ہے لاریب خوش اسلوبی بیان ایسی ہی ہے کہ ایک عالم مصوّری اس کی مدد سے نجم النساء کی رخصت کی ایک سچی تصویر کھینچ لے سکتا ہے

بقیہ داستان نجم النساء کی صحرا نوردی کی کیفیتوں پر مشتمل ہے اشعار ذیل بڑی قوت شاعری سے خبر دیتے ہیں

جُدا ہو کے القصّہ دونوں کو چھوڑ — چلی اپنے گھربار سے منہ کو موڑ

نہ سُدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی — نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

لیے بین پھرتی تھی صحرا نورد — تن چاک چاک اور رخ گرد گرد

کہ شاید کوئی شخص ایسا ملے — کہ جس سے وہ شیدا کا شیدا ملے

جہاں بیٹھ کر وہ بجاتی تھی بین — تو سننے کو آتے تھے آہوئے چین

بجاتی وہ جوگن جہاں جوگیا — وہاں بیٹھی خلق دھونی لگا

اُسے سن کے آتا تھا صحرا کو جوش — صدا سے درختوں کو آتا خروش

گل نغمہ جو اُس سے گرتے ہزار — تو لیتا انہیں دشت دامن پسار

کہیں حلقہ کہیں لخت لخت — کھڑے ہو گئے گرد اس کے سنتے درخت

بجاتی تھی جوں جوں وہ بن بن کے بین — خس و خار سنتے تھے تن تن کے بین

زمرد کہ پڑتی تھی بوٹی جڑی — ہر اک عالم شوق میں تھی کھڑی

تماشا نہ دیکھا تھا جو یہ کبھی — وہ وہ شدت عشق ہو پڑے تھے سبھی

یہاں تک کہ رہ رہ جو تھے نقش پا — وہ بیٹھے تھے کان اپنے اُدھر لگا

گل نغمۂ تر کی تھی یہ بہار — کہ صحرا کے گل اُس کے آگے تھے خا

سُن آواز کی اس کی شان و شکوہ — نکلنے لگی دب کے آواز کوہ
نہ پانی رہی سُن شود اس کا چھلے — کنوئیں کے بھی دل میں اُٹھے ولولے
نہ چشمہ ہی کچھ آبدیدہ رہے — گریبان کر چاک دریا بہے
ہُوا بلبل و گل کا یاں تک ہجوم — کہ گرتی تھیں واں ڈالیاں جھوم جھوم
تحیر کا تھا واں ہر اک کو مقام — زباں کا نکلتا تھا ہاتھوں سے کام
چمن کرتی پھرتی تھی جنگل کے تئیں — بساتی تھی جنگل میں و گل کے تئیں
یہ ہر جا پہ تھا اُس کے دم سے طلسم — بندھا تھا اُسی دم قدم سے طلسم
شب و روز سرگشتہ مثلِ صبا — اسی طرح پھرتی تھی وہ جا بجا

واضح ہو کہ اِن اشعار میں حضرت مصنف نے مبالغوں کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا ہے ہر چند کثرت مبالغہ کلام میں بے تاثیری پیدا کرتی ہے مگر چونکہ یہاں ایسے مبالغوں سے کام لیا گیا ہے کہ فطری کیفیتوں سے علیٰحدگی نہیں رکھتے طبیعت کو اُن سے نفرت پیدا ہونے کے عوض رغبت پیدا ہوتی ہے واقعی یہ حضرت مصنف ہی کا کام ہے کہ استعمال مبالغہ میں بھی فطری شاعری کے لطف کو ہاتھ سے نہ دیں ؎

داستان فیروز شاہ جنوں کے بادشاہ کے بیٹے کا عاشق ہونا جوگن پر

جیسا کہ بالا میں ذکر ہُوا انجم النساء جوگن کے بھیس میں جا بجا پھرا کرتی تھی آخر کار اس کی نیل مرام کی صورت مسبب الاسباب نے پیدا کر دی :-

مسبب کے اسباب دیکھو ذرا — کہ قدرت میں اس کی ہے کیا کیا بھرا
سپید و سیہ اُس کے ہے اختیار — بنایا ہے اُس نے یہ لیل و نہار

جہاں میں ہے اندوہ و عشرت بہم ۔۔۔ کہیں صبح عیش اور کہیں شام غم
دو رنگی زمانے کی مشہور ہے ۔۔۔ کہیں سایہ ہے اور کہیں نور ہے

اشعار بالا آب زر سے لکھے جانے کے مستحق ہیں ان میں قدرت خداوندی کا بیان خوب ادا ہوا ہے واقعی مسبب الاسباب کے معاملات سمجھ میں نہیں آتے ع انچہ در وہمت نہ آید آں کند۔ بسا اوقات بے سروسامانی کی حالت میں لیسے ایسے سروسامان مہیا ہو جاتے ہیں کہ ان کے ظہور کا احتمال بھی نہیں ہوتا ہے اگر کوئی میر ساماں نہیں ہے تو ایسے سروسامان کہاں سے موجود ہو جاتے ہیں انسان کو چاہیئے کہ بے سروسامانی کی حالت میں پریشان نہ ہو خدا پر تکیہ رکھ کر ہمت نہ ہارے اپنی کوشش و فکر سے باز نہ آئے خداوند تعالیٰ محنت کی مزدوری دیتا ہے کسی نہ کسی صورت سے حصول مدعا کی شکل پیدا کر ہی دیتا ہے البتہ انہیں کو حرمانی نصیب ہوتی ہے ۔ جو جدوجہد سے جان چراتے ہیں اور اپنی کاہل وجودی کا نام توکل رکھتے ہیں ایسوں کو جو اپنے کو مدد نہیں دیتے کبھی خدا مدد نہیں دیتا اس کہانی میں جب نجم النساء نے کوشش کی مصیبت اختیار کی تب خدا نے اس کی بامرادی کا سامان بہم فرمایا حضرت مصنف اس سامان فرمائی کی سرگزشت اس طور پر ابتدا کرتے ہیں۔

قضارا سہانا سا اک دشت تھا ۔۔۔ کہ اک شب ہوا اس کا واں بسترا
وہ تھی اتفاقاً شب چار دہ ۔۔۔ ادا سے وہ بیٹھی وہاں رشک مہ
بچھی ہر طرف چادر نور تھی ۔۔۔ یہی چاندنی اس کو منظور تھی
بچھا مرگ چھالے کو اور لیکے بین ۔۔۔ دوزانو سنبھل کر وہ زہرہ جبین
کدارا بجانے لگی شوق میں ۔۔۔ لگی دست و پا مارنے ذوق میں
کدارا یہ بجنے لگا اس کے ہاتھ ۔۔۔ کہ مہ نے کیا دائرہ مے کے ساتھ

بندھا اُس جگہ اِس طرح کا سماں — صبا بھی لگی رقص کرنے وہاں
وہ سنسان جنگل وہ نور قمر — وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اُجلا سا میدان چمکتی سی ریت — اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے — خس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سایہ سے مہ کا ظہور — گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور
وبا یہ کہ جوگن کا منہ دیکھ کر — ہٹا نور و سایہ کا ٹکڑے جگر
گیا ہاتھ سے بن سن کر جو دل — گئے سایہ و نور آپس میں مل
وہ صورت خوش آئی جو اُس نور کی — دل اپنے پہ سایہ نے منظور کی
ہوا بند ہے گئی اس گھڑی اس اُصول — بسیرا گئے ہا نور اپنا بھول
درختوں سے آگ لگ کے بڑھیا — لگی وجد میں بہ لینے واہ واہ
کہ دائرے کا عالم یہ تھا اس گھڑی — کہ تھی چاندنی ہر طرف غش پڑی

سبحان اللہ ثم سبحان اللہ یہ سین عجب خوش اسلوبی اور راستی کے ساتھ حوالۂ قلم ہوا ہے۔ مگر اس کی حقیقت کو وہی سمجھ سکتا ہے کہ جسے ایسے سین کا ذاتی تجربہ حاصل ہوا ہے اس سین کے بیان میں خس برابر بھی حضرت مصنف نے واقعات سے انحراف نہیں کیا ہے، اگر بے دیکھے ایسے سین کو حوالۂ قلم کیا ہے تو معاملہ الہامی کے سوا اس کو کیا کہہ سکتے ہیں۔ فقیر کو اپنے ایک دورۂ تند کار نگستی میں پورے طور ایسے سین کے دیکھنے کا اتفاق پڑا ہے فرق اسی قدر ہے کہ اس وقت فقیر تنہا دشت نوردو نہ تھا۔ جمعیت کے ساتھ جس طرح سفر تندکارہ اختیار کیا کرتا ہے تیس چالیس آدمی شامل تھے، ورنہ سنسان جنگل شب چار وہ سہانا دشت اجلا سا میدان چمکتی سی ریت نور قمر درختوں کے پتے چمکتے خس و خار جھمکتے درختوں کے سایہ سے مہ کا ظہور،

یہ سب کیفیتیں حضرت مصنف کے بیان کے مطابق موجود تھیں ایسے سماں میں موسیقی کی جیسی
ضرورت متصور ہے محتاج بیان نہیں فقیر نے بین کار کو چاندنی راگ کی فرمائش کی (کدارا اور
چاندنی واحد راگ کا نام ہے) وقت کی چیز کا کیا کہنا ہے ایسی بین بجی کہ شاید و باید. سامعین
کے دل ہاتھوں سے جاتے رہے اس وقت فقیر نے اس بین کے دو تین شعر بھی پڑھے قول
راست کا عجب اثر ہوتا ہے احباب باذاق جنھوں نے دعوت شہ کار قبول فرمائی تھی۔ اور
غایت کرم فرمائی سے شریک حال ہو رہے تھے حالت انشراح میں یک زبان ہو کر حضرت
مصنف کی طباعی کی نسبت فرمانے لگے کہ یہ شاعری نہیں ہے یہ الہام غیبی ہے ۔ اور
حقیقت امر بھی یہی ہے کہ شاعری الہام غیبی سے خالی نہیں ہو سکتی جو شاعری الہام غیبی سے
خالی ہو وہ شاعری نہیں ہے تک بندی ہے القصہ ایسے سماں میں نجم النساء بین بجا رہی تھی کہ
اتفاق وقت سے فیروز شاہ جنوں کے بادشاہ کا بیٹا شب ماہ میں ہوا پر اپنا تخت اڑائے
ہوتے چلا جا رہا تھا بین کی صدا سن کر اپنے تخت کو زمین پر اُتار لایا اور نجم النسا کے حسن و جمال
کو دیکھ کر فریفتہ ہو گیا اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھا کہ حقیقت میں وہ کوئی جوگن نہیں ہے یہ
سب بناوٹ کا بھیس ہے یہ سمجھ کر اُس سے اس طور پر سوال کیا :-

پر اتم پر ایسا کہو کیا بجوگ — لیا واسطے کس کے تم نے یہ جوگ

کدھر سے تم آئے کدھر جاؤ گے — دیا اپنی ہم پر بھی فرماؤ گے

اس سوال سے وہ سمجھی کہ دل آئے بغیر یہ سوال نہیں ہوا ہے جیسا کہ حضرت مصنف فرماتے ہیں

وہ سمجھی کہ اس کا دل آیا ادھر — کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر

یہ تو عام حالت دل کی ہوتی ہے مگر قابل لحاظ امر یہ ہے کہ عورت کو ایک خاص صلاحیت
مودعہ ہے جس کے ذریعے سے وہ فوراً کیفیت عشق کو پہچان جاتی ہے گو کتنا ہی اُس کو

عاشق اخفائے عشق میں کوشاں ہو اس شعر کے بعد حضرت مصنف یہ دو شعر رقم کرتے ہیں جو محض امور فطری پر مشتمل ہیں اور جن کی خوبی بیان محتاج بیان نہیں ہے :-

خس و خار ہے عشق حسن آگ ہے   سدا حسن اور عشق میں لاگ ہے
ولے راگ ہے اور ان میں ہوا   کہ دونوں طرف آگ دے ہے لگا

یہاں دل آنے کے اسباب ہمہ وجوہ موجود ہیں کیونکر بے چارہ فیروز شاہ مبتلائے عشق نہ ہو اس جگہ پر راگ کا مضمون بہت قابل لحاظ ہے واقعی راگ سے حسن و عشق دونوں کا عالم بے انتہا ترقی کر جاتا ہے۔ اول تو حسن خود بلائے جان ہے اس پر سے راگ پس عشق کا سر چیا تک نہ چڑھ جائے وہی تعجب ہے ؛

فیروز شاہ کی کیفیت عشق کو سمجھ کر نجم النسا نے اس سے کہا کہ ہر لول ہر تو جدھر سے آیا ہے اُدھر ہی چلا جا، مگر یہ جو کہا ہنس کر کہا، اس کا مطلب وہی سمجھیں گے جو انداز خوباں سے واقفیت رکھتے ہیں واقعی اس ایک لفظ سے شاعر کے کلام نے اس سین میں جان ڈال دی ہے اگر نجم النساء ہنس کر فیروز شاہ کے سوال کا جواب نہ دیتی تو ایسے روکھے جواب سے فیروز شاہ کے دل پر چوٹ لگتی اور جو مطلب نجم النساء کا اپنی تقریر سے تھا ہرگز نہ نکلتا، فیروز شاہ نے گو روکھا جواب پایا مگر اس سے بیدل نہ ہوا اس واسطے کہ معشوق کا ہنس کر جواب دینا گو روکھا سہی بہت امید افزا ہوتا ہے، ظاہراً ایسا ترش اور باطناً ایسا شیریں جواب پاکر

کہا تب پریزاد نے واہ جی   بہت گرم ہیں آپ اللہ جی
نہ روکھے ہو اتنا بھلا جاؤں گا   ذرا بین سنکر چلا جاؤں گا

ایسے جواب کی متوقع تو نجم النساء تھی ہی یہ سن کر :-

کہا ہوتے ہو تے سے اپنے کہو   فقیروں کو چھیڑو نہ بیٹھے رہو

یہی تو فیروز شاہ کی مانگی مراد تھی ان آلیس کے لطیفوں کے بعد نجم النسا کے روبرو اُسی بیت میں
وہ آ بیٹھا حضرت مصنف ہر جگہ فیروز شاہ کی محویت کا فوٹو اس طور پر کھینچتے ہیں ؛

نظر حسن پہ گاہ گہ بین پر | سراپا دل اس نعمت چین پر
رہا تن بدن کا نہ کچھ اُس کو ہوش | بنا کل وہ جوں نقش پا چشم و گوش
وہ جوگن جو تھی درد و غم کی اسیر | ہوا غم میں جوگن کے یہ بھی فقیر
نہ سُدھ گھر کی لی اور نہ لی راہ کی | جب آئی ذرا سُدھ تو پھر آہ کی

نجم النسا صبح تک بین بجاتی رہی اور فیروز شاہ برابر زار زار روتا رہا۔ جب صبح ہوئی نجم النسا
نے کاندھے پر بین دھری اور انگڑائی لے کر اُٹھی مگر وہ کیا جانے پاتی :۔

پریزاد نے تب پکڑا اُس کا ہاتھ | تڑتا لی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ
زمیں سے اُڑا آسماں کے تئیں | وہ کہتا رہا کی نہیں رہے نہیں
نہ مانا اور اس نے اُڑایا اُسے | پرستان میں لا بٹھایا اُسے

فیروز شاہ کا ایک غیر قوم کی جوان عورت کو پرستان میں لانا کب اُس کے باپ سے چھپا
رہتا اس لیے نہایت خوش خوش باپ سے جا کر حقیقت حال یوں عرض کی :۔

یہ جوگی جو ہے ایک صاحب کمال | ذرا بین سنئے اور اس کے خیال
بہت آپ اس سے اٹھائیں گے حظ | بہت بین سے اس کی پائیں گے حظ

فیروز شاہ کا باپ بارہ عقل رکھتا تھا جوان بیٹے کی رضامندی ملحوظ رکھ کر

کہا اس نے بابا بہت خوب ہے | ہمیشہ سے راگ اپنا مرغوب ہے
کہا آؤ جوگی جی بیٹھو اِدھر | کرو روشن اپنے قدم سے یہ گھر
کھلے بخت بیٹے کے اور باپ کے | سر دل پہ ہمارے قدم آپ کے

الغرض اِس کے باپ نے مصلحت وقت کو خیال کر کے :-

بہت اِس کی تعظیم و تکریم کی — جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی

واضح ہو کہ یہ جزو داستان تدبیر المنزل کے ایک بڑے ضروری مسئلہ سے خبر دیتا ہے اکثر جو باپ اور بیٹے کے درمیان جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ باپ کمال نادانی سے جوان بیٹے کو مولود تازہ کے برابر بے اختیار اور مجبور سمجھتا ہے یہ ایک بڑی غلطی ہے اس نافہمی کا باعث عجب عجب طرح کے خانگی فسادات پیدا ہوتے ہیں۔ ہر باپ کا فرض منصبی ہے کہ جب بیٹا جوان ہو جائے تو اس کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو، فقیر نے اپنی آنکھوں سے چند ایسے قصے دیکھے ہیں جن میں باپ کی طرف سے حضرت مصنف کے بیان کے برعکس کارروائیاں ظہور میں آئی ہیں عموماً ایسی بدعقلی کی کارروائیوں کے نتائج آپس کی پھوٹ اور خانہ بربادی کے سبب ہوا کرتے ہیں

داستان فیروز شاہ کی مجلس آرائی اور جوگن کے بلانے میں

جب رات ہوئی نجم النساء کو فیروز شاہ کے باپ نے مجلس میں بلایا اور اُس کی بڑی خاطر داری کی۔ پری زادسارے جوگن کی بین سننے کو جمع ہوئے جب نجم النساء آکر مجلس میں بیٹھی، جنوں کے بادشاہ نے بڑی تمنا کے ساتھ اُس سے

کہا ہم ہیں مشتاق کچھ گائیے — سماں بین کا ہم کو دکھلائیے

نجم النساء نے بڑی بے پروائی مگر معقول انداز کے ساتھ

کہا کچھ بجانا نہیں اپنا کام — ہر اک طرح رہیں ہر کا نام

ہے بیزار فرمائشوں سے فقیر — ولے کیا کریں اب ہوئے ہیں اسیر

اِس جواب کو پاکر بادشاہ جن نے معذرت کے طور پر اور بڑی دلجوئی کے ساتھ

کہا جوگی صاحب یہ کیا بات ہے — کرم آپ کا ہم پہ دن رات ہے
جو مرضی ہو تو تم کو تکلیف دیں — نہیں جس میں راضی ہو تم سو کریں

نجم النساء نے ایسی نرمی کا جواب پاکر

کہا اِس طرح سے جو فرماؤ گے — تو ہاں بندگی ہی میں کچھ پاؤ گے

یہ کہ کر اُس نے بین کاندھے پر دھری اور ایسی خوبی کے ساتھ یہاں تک بجائی کہ اہل محفل کے دِل پگھل گئے اور سبھوں کی آنکھیں شمع محفل کی طرح اشکوں سے بھر آئیں مگر فیروز شاہ جو مبتلائے عشق ہو رہا تھا اُس کا حال اشعار ذیل ہی سے خوب عیاں ہوتا ہے :-

کبھی سامنے آکے کرتا نظر — کبھی دیکھتا چھپ کے ادھر اُدھر
ستونوں کی کبھی اوٹ میں ہو کے وہ — کھڑا دیکھتا اس کو رہ رہ کے وہ
کبھی ادھر اودھر سے پھر پھر کے آ — چھپے اُس کے مکھڑے کی لیتا بلا
وہ گو کچھ نہ سنتی نہ کہتی اُسے — کن انکھیوں سے پر دیکھ لیتی اسے
نظر اس کی جب آن پڑتی اِدھر — تو یہ اور کی طرف کرتی نظر
اِس آن و ادا پر وہ فیروز شاہ — دِل و جان سے کرتا تھا ہر لحظہ آہ
اگر کوئی جوگن کی کرتا ثنا — تو کھا رشک کہتا کہ پھر تم کو کیا

ایسی بے چینی محفل نغمہ میں سوا عاشق کے کس کو ہو سکتی ہے الغرض نجم النساء کی بین کاری نے جمیع سامعین کو محو کر ڈالا جیسا کہ اشعار ذیل سے اس صحبت کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔

بجی پہلی صحبت میں وال ایسی بین — کہ غش کر گئے وے جو تھے نکتہ چین
سراہا پری زاد کے باپ نے — کہا کی دیا جوگی جی آپ نے

اِسی طرح ہر شب کرم کیجئے — مری بزم رشک ارم کیجئے

مقدم ہمارا ار جھانا کرو — ہمیں اپنا مشتاق جانا کرو

یہ گھر بار ہے آپ ہی کا تمام — ہوئے آج سے ہم تمہارے غلام

تکلف کو موقوف کر دیجئے — جو کچھ تم کو درکار ہو لیجئے

کہا اُس نے مطلب نہیں کچھ ہمیں — تمہارا مبارک رہے گھر تمہیں

کہاں ہم کہاں تم ہوا یہ جو ساتھ — یہ تھی بات سب آب و دانہ کے ہاتھ

گانے بجانے کے بعد نجم النساء اپنی قیام گاہ میں چلی گئی مگر اس شب سے اس کا یہ معمول بندھا کہ وہ ہر شب بادشاہ جن کی خدمت میں جاتی اور اسے اپنے نغموں سے مسرور و ممنون کرتی اس درمیان میں فیروز شاہ کا جوش عشق ترقی کرتا گیا اس کی حالت روز بروز تباہ ہوتی گئی اس کی بدحالیوں کی کیفیت بڑی صراحت اور قابلیت کے ساتھ حضرت مصنف نے حوالۂ قلم کی ہے بخوف طوالت یہاں اس کا ذکر نہیں کیا جاتا یہ حصۂ داستان بھی دیدنی ہے ارباب شوق خود مثنوی میں ملاحظہ فرمائیں مختصر جب فیروز شاہ کے عشق کی حالت برداشت سے باہر ہو گئی تب اُس نے ایک روز موقع پا کر نجم النساء سے اظہار مدعا کیا نجم النساء نے بڑی رد و کد کے بعد وصل کی امید دلائی مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کی کہانی غور سے سن کر فیروز شاہ اُس کے برار مدعا میں کوشاں ہو فیروز شاہ نے وعدہ واثق کیا بس پھر نجم النساء نے ساری سرگزشت بدر منیر کے عشق اور اپنے جوگن کے بھیس اختیار کرنے کی کہہ سنائی جن کے شاہزادہ نے اپنی قوم کو بلا کر ان سے کہا کہ پرستان میں ایک آدمی قید ہے تم جاؤ اور اس کا پتا لگا لاؤ کامیابی کی صورت میں حسب دستور ملک انعام پاؤ گے پریزاد تلاش میں نکلے آخر ان میں سے ایک کا وہاں گذر ہوا جہاں ماہ رخ کا قیدی مبتلائے چاہ الم تھا نگہبان چاہ سے بھید لے کر وہ پریزاد شاہزادے

کے پاس واپس آیا اور اس سے حقیقت حال عرض کی پھر ادائے مجرا کے بعد انعام کا طالب ہوا حسب معمول شاہزادے نے انعام میں اُسے جواہر کے پر لگا دیئے' واضح ہو کہ سب مضامین اس داستان میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لیکن بخوفِ طوالت راقم اُن کے ریویو سے قلم کو روک لیتا ہے ؎

داستان پیغام بھیجنے میں فیروز شاہ کے ماہ رُخ کو

مخبر سے دریافت کر کے فیروز شاہ نے ماہ رخ کو ایک سخت حکم بھیجا' وہ دوڑی اور شاہزادے سے عذرِ تقصیر چاہا جیساکہ اشعارِ ذیل سے ظاہر ہوگا ؎

کہا مجھ سے تقصیر اب تو کوئی — کہا اس کو لے جائے یہاں سے کوئی
اگر اب میں لاگو ہوں اس کی کبھی — تو پھر پھونک دیجیو مجھے تم تبھی
پر اتنا یہ احسان مجھ پر کرد — کہ اس کا پرستان میں چرچا نہ ہو
مرے باپ کو یہ نہ ہووے خبر — کہ پھر میں نہ ایدھر کی ہوں نے اُدھر

یہ التجا بھی نہایت نیچرل رنگ رکھتی ہے اکثر اشخاص جو اس طرح کی بداطواری کے مرتکب ہوتے ہیں اپنے عیب کے پنہاں رہنے کے بڑے متمنی ہوتے ہیں، مگر اُن کے افعالِ قبیحہ کبھی پوشیدہ نہیں رہتے شیطان گھر گھر اُن بدفعلیوں کی منادی کراتا ہے' ماہ رخ کا جواب پاکر فیروز شاہ وہاں گیا، جہاں بے نظیر قید تھا، اُس کے حکم سے ایک دیو بے نظیر کو بڑی حفاظت کے ساتھ کنوئیں سے باہر نکال لایا، یہ سب مضامین بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ حضرت مصنف نے حوالۂ قلم کیے ہیں' سبحان اللہ! کیا سحر البیانی ہے، شاعری ہے کہ اعجاز ہے ؎

داستان کنوئیں سے نکلنے میں بے نظیر کے

جب بے نظیر کنوئیں سے نکلا تو اس طرح کی قید شدید سے جو اس کی حالت ہو رہی تھی، اس کی تصویر اشعار ذیل میں کھینچی ہے۔

وہ جیتا تو نکلا ولے اس طرح — کہ بیمار ہو نزع میں جس طرح
زبس اُوپر آنے کا تھا اس کو غم — کسے تو کہ بھرتا تھا اُوپر کا دم
جمی خاک تن پر برنگ زمین — گڑا جیسے نکلے ہے پتلا کہیں
نہ آنکھوں میں طاقت نہ تن میں تواں — کہ جوں خشک ہو نرگس بوستاں
وہ تن سُرخ جو تھا سو پیلا ہوا — وہ جوڑا جو تھا سبز نیلا ہوا
وہ سر میں جو تھے اُس کے سنبل سے بال — ہوئے لاغری سے بدن کی وبال
فقط پوست باقی تھا یا استخوان — نہ تھا خون کا رنگ موجی درمیان
بدن سے رگوں کی تھی اس ڈھب نمود — کہ الجھی ہو جیوں ریسماں کبود
بدن خشک و زرد اس طرح تھا وہ گل — خزاں دیدہ ہو جس طرح برگ گل
وہ ناخن جو تھے اُس کے مثل ہلال — سو وہ ہو گئے بڑھ کے بدر کمال

حسن بیان محتاج ستایش نہیں ہے میر حسن کے مبالغے بھی فطرت سے علیحدہ نہیں ہوتے، ایسے مبالغوں سے سچی شاعری میں بٹا نہیں لگتا، واقعی حضرت مصنف بڑے نیچرل شاعر ہیں یہی حال شکسپیر کا ہے کہ اس کے مبالغے خواہ تشبیہ اور خواہ استعارہ کی بنیاد پر ہوں کبھی فطرت سے بے لگاؤ نہیں ہوتے، القصہ جب بے نظیر اس طرح کنوئیں سے نکلا فیروز شاہ اس کی حالت دیکھ کر رونے لگا بعد ازاں بے نظیر کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھا کر وہاں لے آیا جہاں نجم النسا تھی مگر پہلے

فیروز شاہ نے اُسے کسی جگہ مصلحتاً چھپا رکھا پھر نجم النساء سے جا کر بے نظیر کے آنے کی خبر کی چونکہ وہ بے نظیر کے لیے بدحال ہو رہی تھی ایسی غیر متوقع خبر پاکر بڑے اضطراب کے ساتھ حقیقت حال دریافت کرنے لگی اور وہاں چلنے کے لیے جہاں بے نظیر تھا جلدی کرنے لگی فیروز شاہ نے اس امر کو خیال کر کے کہ خوشی میں بہت عاجلانہ کارروائی نہیں کرتے نجم النساء سے کہا کہ اس قدر عجلت کو راہ نہ دو پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اطمینان کے ساتھ اُسے وہاں لے آیا جہاں بے نظیر کو وہ تخت پر بیٹھا چھوڑ آیا تھا اس جگہ پر نجم النساء اور بدرمنیر کے آپس میں ملنے کا سین حضرت مصنف یوں رقم فرماتے ہیں:-

یہ اُس تخت کے گرد پھرنے لگی
بلا اس کی لے لے کے گرنے لگی

گلے لگ کے رونے لگی زار زار
کیا اپنے تن من کو اُس پر نثار

وہ دیکھے جو ٹک آنکھ اٹھا بے نظیر
تو نجم النساء ہے بہ رخصت وزیر

کہا تو کہاں اور کس کا یہ جوگ
کہاں یہ لباس اور کہاں تم یہ سوگ

کہا تیرے غم نے دیوانہ کیا
کہ عالم سے اپنے بیگانہ کیا

بغل کھول کر پھر تو آپس میں مل
وہ رو یا کئے دیر تک متصل

بیاں دونوں اپنا جو کرنے لگے
دُرِ اشک سے چشم بھرنے لگے

کہی سرگزشت اس نے اُس دم تلک
کہ اس طرح پہنچے ہو تم ہم تلک

اس کے بعد فیروز شاہ بے نظیر اور نجم النسا ایک روز وہاں مقام کر کے مرکب ہوائی یعنی تخت کے ذریعہ سے بدرمنیر کے باغ میں جا اترے بدرمنیر سے نجم النسا کے پھر ملنے کا سین ذیل بیان ہوا ہے

یکایک جو آ وہ قدم پر گری
تو جھجکی وہ شاہزادی اور کچھ ڈری

پھر آخر جو دیکھا تو جوگن ہے یہ
مرے دردِ غم کی بروگن ہے یہ

کہا میری نجم النسا تو ہے جان — ارے تیرے صدقے مری مہربان

ہمیں تیرے ملنے کی کب آس تھی — کہ جینے سے اپنے ہمیں یاس تھی

بہت اس نے چاہا کہ ہووے کھڑی — کھڑی ہوتے ہوتے وہیں گر پڑی

کہا بار غم سے افاقت نہیں — ارے کیا کروں مجھ میں طاقت نہیں

بلائیں لگی لینے نجم النساء — لگی گرد پھرنے برنگ صبا

ان اشعار کی قدر اہل مذاق صحیح کے سوا کون کر سکتا ہے واقعی ایسے اشعار کی قدردانی کے لیے بڑی تعلیم یافتگی کی حاجت ہے ناتعلیم یافتہ زمانوں میں فطرت نگاری کبھی اپنے حق کو نہیں پہنچتی ہے جس وقت میں شکسپیر نے اپنے حیرت انگیز پلے تصنیف کیے تھے اس وقت اس نادر روزگار کی کچھ بڑی قدر نہیں ہوئی تھی مگر جوں جوں تعلیم یافتگی دنیا میں پھیلتی گئی اس شاعر النامی کی قدر بڑھتی گئی اسی طرح ایک وقت آئے گا جب میر حسن کی مثنوی بھی دیدۂ حیرت سے دیکھی جائے گی اور اس کی نارسائی زائل ہو جائے گی۔

اس سین کے بعد حضرت مصنف بدر منیر اور تمام محل و باغ کی اس انقلابی حالت کو جو نجم النسا کی غیبت میں پیدا ہوئی تھی یوں رقم فرماتے ہیں:-

اسے شاہزادی کا تھا حال یاد — جو دیکھا تو یاں اس سے کچھ ہے زیاد

نہ گھر کی وہ رونق نہ اس کا وہ حال — گلوں سے لگا تا ملک پائمال

پڑے سارے بے داشت دیوار و در — محل کو جو دیکھا تو ٹوٹا سا گھر

خواصیں جو تھیں پاس وہ نازنین — سو میلی کچیلی کہیں کی کہیں

نہ چوٹی گندھی اور نہ کنگھی درست — جو چالاک تھی بن گئی وہ بھی سست

ہر اک اپنے عالم میں دیکھو تو دنگ — اڑا رنگ چہرے کا مثل پتنگ

نہ آپس کی چہلیں نہ وہ چہچہے   نہ گانا بجانا نہ وہ قہقہے
غم آلودہ ہر ایک زار و نزار   نہ آرام جی کو نہ دل کو قرار
جو بیٹھیں تو رونا جو اٹھیں تو غم   غرض بیٹھتے اٹھتے اُن پر ستم
چمن سارے ویراں سے ہیں پڑے   شجر گل کے اک جھاڑ سے ہیں کھڑے
جو خود ہے تو حیراں و بیمار سی   کہ جیوں زرد شیشے کی ہو آرسی
نہ تاب تواں اور نہ ہوش و حواس   ضعیف و نحیف و پریشان اداس
یہ دیکھ اُس کا احوال نجم النسا   جلی شمع کی طرح آنسو بہا

اِس کے بعد کا سین وہ ہے کہ جب نجم النسا کے آنے کی خبر محل کے رہنے والیوں کو معلوم ہوئی تو انھوں نے اُسے گھیر لیا، یہ سین نہ صرف فطری خوبی رکھتا ہے بلکہ اس زمانہ رسوم ملکی بھی خوب ادا ہوتے ہیں، اشعار ذیل قابل لحاظ ہیں:۔

ولیکن محل میں پڑی جب یہ دھوم   کیا مثل پروانہ اُس پر ہجوم
سنی ایک سے ایک نے یہ خبر   مبارک سلامت، ہوئی یک دگر
کوئی غنچہ کی طرح کھلنے لگی   کوئی دوڑ کر اُس سے ملنے لگی
ٹکے کوئی صدقے کو لانے لگی   کوئی سر سے روٹی چھوانے لگی
کوئی آئی باہر سے گھر سے کوئی   ادھر سے کوئی اور اُدھر سے کوئی
حقیقت لگی پوچھنے آ کوئی   لگی کرنے آپس میں چرچا کوئی
ہوا سر پہ اِس کے زبس اژدہام   لگی کرنے گھبرا کے سب کو سلام
کہا بیبیو کل کہوں گی میں حال   کہ اب راہ کی ماندگی ہے کمال

جب زناں محل کی بھیڑ چھٹی تب بڑی تمیز داری کے ساتھ نجم النسا، بدرمنیر کو خلوت میں لے گئی اور

بے نظیر کے آنے سے مطلع کیا یہ سن کر بدر منیر غایت مسرت سے غش کر گئی پھر افاقہ کے بعد افراط حیرت کی حالت میں اُس نے پوچھا کہ کیا یہ سچ مچ ہے یا اس سے کوئی چھیڑ مراد ہے نجم النساء نے بدر منیر کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ تشفی کردی بعد از اں ساری سرگزشت کہ سنائی علاوہ اس کے پری زاد کے آنے سے بھی خبر دی بدر منیر نے پوچھا کہ پھر وہ دونوں کہاں ہیں تب نجم النساء نے کہا کہ ہم نے انھیں درختوں میں چھپا رکھا ہے اب نجم النساء کی بقیہ گفتگو اور بقیہ کیفیتیں اس داستان کی ذیل میں بزبان حضرت مصنف عرض کی جاتی ہیں، :-

عجب وقت میں میں ہوئی تھی جدا — کہ دلبر کو تیرے دیا لا ملا
مگر ایک یہ آپڑی سب سے بیسی — کہ میں تیری خاطر بلا میں پھنسی
سو اب ایک کو تو لے آتی ہوں میں — ہوا دوسرے کو بتاتی ہوں میں
یہ سُن شاہزادی ہنسی کھلکھلا — کہا کیوں اُڑاتی ہے نجم النساء
ارے ایک ہے تو بڑی قہر ہے — کہیں تو ہے امرت کہیں زہر ہے
چل اب جو چلے بس زیادہ نہ کر — انھیں جا کے جلدی لے آ تو ادھر
کہا پھر پری زاد کے روبرو — بغیر ان کے کس طرح ہوگی تو
کہا وہ تو ایسا دیا نا نہیں — وہ اس بات کو کیا کہے گا نہیں
اگر دل میں کچھ تیرے وسواس ہے — نہیں دُور وہ بھی ترے پاس ہے
ذرا پوچھ لیجو تو اس بات کو — کہ وہ روبرو اس کے ہو یا نہ ہو
یہ سُن کہ شتابی گئی وہ نگار — لیا جا کے آہستہ ان کو پکار
چھپائے ہوئے لا بٹھایا وہاں — وہ خلوت کا جو تھا قدیمی مکاں
پھر اس سے یہ پوچھا کہ اے بے نظیر — کہے تو چلی آوے بدر منیر

پہلو بہت ترقی کر جاتا اور یہ مثنوی اخلاقی پایہ کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتی لیکن افسوس ہے کہ بدر منیر اور نجم النساء کی بے نظیر اور فیروز شاہ کے ساتھ ایسی مواصلت دکھائی گئی ہے کہ ان چاروں اشخاص نے اپنی حالتوں کو ناپسندیدہ سمجھ کر ان کی اصلاح کی طرف مائل ہونا ایک ضروری جانا چنانچہ ان سبھوں میں یہ رائے قائم ہوگئی کہ بدر منیر اور نجم النساء اپنے اپنے باپ کے گھر جائیں اور بے نظیر اور فیروز شاہ بھی طور سے بیاہ کے خواستگار ہوں.

نامہ بھیجنا بے نظیر کا مسعود شاہ کو خواستگاری میں بدر منیر کی

بے نظیر نے جو رقعہ لکھا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ صدی ہائے ماسبق کے بادشاہوں کی خواستگاری کے رقعے اکثر ہوتے تھے یہ رقعہ خواستگاری کا ہے کہ ہے یہ تو خاصا پیام جنگ ہے اگر مخاطب نافہم ہو تو لڑائی کے ٹھننے میں کیا باقی رہ جاتا ہے ہندو راجاؤں میں اکثر بیاہ لڑائیوں کے بعد انجام پائے ہیں اسی لیے ایک بیاہ ان کے یہاں ہوتا تھا کہ جسے رکشاس کہتے ہیں اس بیاہ کا یہ طور تھا کہ دولہا صاحب سسر سالے سب کو لڑائی میں قتل کر کے دلہن کو میدان جنگ سے روتی ہوئی اپنے ملک کو لے جاتے تھے.

جواب نامہ بے نظیر کا ملک مسعود شاہ سے

رقعہ خواستگاری کا جواب بھی ترکی بہ ترکی نظر آتا ہے بہرحال مسعود شاہ نے درخواست بے نظیر کی منظور کی، اور طرفین سے شادی کے سامان ہونے لگے ؎

داستان بے نظیر اور اُس کے تجمل میں

اس داستان میں حضرت مصنف نے ہندوستانی امیروں کی بارات کی ایسی سچی تصویر کھینچی ہے کہ کسی اور شاعر سے نہیں کھینچ سکتی ہے اسی طرح بارات کی محفل آرائی اور سارات کے معاملات کے بیانات اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں سبحان اللہ سبحان اللہ ملکی رسومات بڑی قوت شاعری کے ساتھ اس طور پر حوالہ قلم ہوئے ہیں کہ غیر ملک کا سیاح مجرد میر حسن کے بیانات کو پڑھ کر ہندوستانی بارات اور سارات کے جزوی معاملات کو آسانی کے ساتھ درک کر سکتا ہے کیا خوبی بیان ہے کہ اس داستان کو پڑھنے سے محسوس ہونے لگتا ہے کہ کوئی بھاری بارات بڑی تیاری کے ساتھ جا رہی ہے پھر بارات کی قیام گاہ میں ایک نہایت آراستہ و پیراستہ محفل ہو رہی ہے اسی طرح سارات میں جو کیفیتیں گذرتی ہیں وہ سب کی سب پیش نظر ہو رہی ہیں۔ واقعی میر حسن عجب حیرت انگیز شاعر گذرے ہیں کہ معاملات خارجی و داخلی دونوں کے بیان پر یکساں قدرت رکھتے ہیں لاریب شیکسپیر کو معاملات ذہنی کے بیان کی لاجواب قدرت ہے مگر معاملات خارجی کی مصوری میر حسن کے برابر یہ شاعر گرامی نہیں کر سکتا ہے راقم الحروف کی دانست میں اس قدرت کے اعتبار سے میر حسن کو شیکسپیر پر یقینی ترجیح ہے

نکاح ہونا بے نظیر کا بدر منیر سے اور شادی نجم النسا کی پری زاد سے اور رخصت ہونا آپس میں

یہ داستان بھی میر حسن کے کمال شاعری کا ایک نمونہ ہے اس میں حضرت مصنف پہلے بے نظیر کے نکاح کا ذکر فرماتے ہیں بعد ازاں اس کے محل میں دولھا بن کر جانے کو بیان کرتے ہیں ان امور کے ساتھ جو رسوم انجام پاتے ہیں وہ اس وفور اطلاع اور خوش اسلوبی

یسے ساتھ حوالۂ قلم ہوئے ہیں کہ پڑھنے والے کو حیرت دامن گیر ہوتی ہے پھر صبح کو رخصتی کا سین
بیان کیا گیا ہے اور اس کے متعلق کے رسوم جو احاطۂ تحریر میں در آئے ہیں نہایت ہی قابل
لحاظ ہیں اس کا سین کا داخلی (SUBJECTIVE) پہلو بھی کمال قابلیت کے ساتھ مذکور
ہوا ہے۔ دلھن کو اپنی عیش گاہ میں لانے کے بعد بے نظیر پری زاد کے بیاہ کا سامان کرتا
ہے اس کے بیاہ کی چوتھی کے ساتھ اسی دھوم دھام سے پری زاد اور نجم النسأ
کی شادی انجام پاتی ہے اس شادی کے انجام کے بعد پری زاد اور نجم النسا پرستان کو چلے
جاتے ہیں مگر بے نظیر سے اس کا اقرار کر جاتے ہیں کہ گو اس وقت کی مفارقت ایک
امر مجبوری ہے مگر آئندہ ہمیشہ آپس میں ملتے رہیں گے۔ پری زاد اور نجم النسا کی روانگی کے
بعد بے نظیر بدر منیر کے ساتھ اپنے باپ کے ملک کی طرف رُخ کرتا ہے تمام اجزا اس
داستان کے کس قدر نیچرل اور خوش اسلوب ہیں، سبحان اللہ، سبحان اللہ ٭

داستان بے نظیر کا بدر منیر کو اپنے وطن لے جانے اور ماں باپ سے ملاقات کرنے میں

باپ کے شہر کے نزدیک پہنچ کر بے نظیر نے ایک باغ کے کنارے قیام کیا جب لوگوں نے اُسے
دیکھا تو تمام شہر میں اس کے آنے کا شور مچ گیا اس کے ماں باپ کو بھی خبر ہوئی ایسی خبر سُن کر جو اُن کا
حال ہوا اس کو حضرت مصنف کن نیچرل خوبیوں کے ساتھ ذیل میں منظوم فرماتے ہیں :۔

خبر یہ ہوئی جبکہ ماں باپ کو ۔۔۔ کیا گم اُنھوں نے وہیں آپ کو
زبس دل تو تھا یاس ہی سے بھرا ۔۔۔ یہ سن ہاتھ اور پاؤں گئے تھرتھرا

لگے رونے آپس میں راز و نزار کہا ہائے ہم کو نہیں اعتبار
ملا دے گی ہم سے ہمارا حبیب یہ دشمن نہیں اپنے ایسے نصیب
یہ ہوگا کوئی دشمن ملک و مال سو ہیں کر دہ ہم کو گرفتار حال
کوئی اس کا وارث تو آخر نہیں وہی لے کے جائے یہ جھگڑا کہیں

ظاہر ہے کہ مصیبت زدگی میں اچھی خبر ایسا ہی حال پیدا کر دیتی ہے سبحان اللہ فطرت کی تبعیت حضرت مصنف کو کس قدر ملحوظ رہتی ہے اس جگہ داخلی پہلو کے حقوق کیا خوب ادا ہوئے ہیں کیا کہنا ہے کہیں حضرت مصنف شکسپئیر کی داخلی شاعری کا اور کہیں سر والٹر اسکاٹ کی خارجی شاعری کا تماشا دکھا رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہی شاعر مثنوی نگاری کی داد دے سکتا ہے جس کو بیان کی یہ دوہری قوت خدائے تعالیٰ کی جانب سے موہوب ہوئی ہے ظاہرا حضرت مصنف شکسپئیر اور سر والٹر اسکاٹ کی قوتوں کا مجموعہ معلوم ہوتے ہیں خیر جب لوگوں نے بے نظیر کے باپ کو بے نظیر کے آنے کا یقین دلایا اور مکرر بے نظیر کا نام اس کے آگے لیا گیا تب تو باپ صاحب ننگے پاؤں اس کی طرف دوڑے ادھر سے بیٹے صاحب بھی چلے ہی آتے تھے باپ پر جو نظر پڑی باپ کے پاؤں پر بے نظیر یہ کہہ کے کہ "خدا نے دکھائے قدم آپ کے" گر پڑا، اس کے بعد حضرت مصنف یوں فرماتے ہیں :-

سنی یہ صدا جوں ہی اس ماہ کی تو اس غم رسیدہ نے پھر آہ کی
اٹھا سر قدم پر سے چھاتی لگا لپٹ کے گھڑی دو تلک خوب سا
یہ رو با لشدت کہ غش کر چلا کہے تو کہ آنسو کا لشکر چلا
ملے پھر تو آپس میں وہ خوب سے کہ یوسف ملے جیسے یعقوب سے

پھر تو چھوٹے بڑے سب کو دلی مسرت ہوئی، اجڑا گھر سر نو سے آباد ہوا بے نظیر بدر منیر کی سواری کو محل سرا میں سے جا کر بدر منیر کو اتارا اسی عرصہ میں بے نظیر کی آنکھیں جو

نو قدموں پہ گر پڑا۔ دونوں تقاضائے فطرت سے خوب روئے۔ ماں نے بہو اور بیٹے
کو چھاتی سے لگایا۔ اس جگہ پر حضرت مصنف کا فرمودہ مندرج ذیل ہوتا ہے :۔

وہ ماں خوب بیٹے کے لگ کر گلے	یہ روئی کہ آنسو کے نالے چلے
بہو اور بیٹے کو چھاتی لگا	وہ دونوں کی لے ہاتھ سے وہ بلا
ہوئی جان اور جی سے اس پر نثار	پیا پانی ان دونوں پر وار وار

بعد حضرت مصنف اس کہانی کو اس طور پر تمام فرماتے ہیں کہ شاہی گھر والے
سب مل کر آپس میں رہنے لگے۔ بے نظیر کے باپ اور ماں نے بے نظیر کا سر نو سے
خوب حوصلے دل کے نکالے۔ ذیل میں خوشی اور بہبودی کے مضامین بزبان حضرت
درج پاتے ہیں :۔

محل میں عجائب ہوئے چہچہے	وہ مرجھائے گل پھر ہوئے لہلہے
وہ شہر پہ فضل پروردگار	وہی شاہزادہ وہی شہریار
وہی لوگ اور وہ ہی چرچے تمام	وہی ناز و انداز کے اپنے کام
وہی بلبلیں اور وہی بوستان	شگفتہ گل و مجمع دوستاں

باقی کے تمام پر حضرت مصنف کچھ دعائیہ مضامین یوں زیب رقم فرماتے ہیں :۔

انہوں کے جہاں میں پھرے جیسے دن	ہمارے تمہارے پھریں ویسے دن
ملیں سب کے بچھڑے الٰہی تمام	بحق محمد علیہ السلام
ہوئے جیسے وہ شاد ہوں شاد ہم	رہیں شہر میں اپنے آباد ہم
رہے شاد نواب عالی جناب	کہ ہے آصف الدولہ جس کا خطاب
دوستی اس کی ہے سرو باغ مراد	رہے اس کا روشن چراغ مراد

بحقِ حسین و بحقِ حسن — رہوں شاد میں بھی غلامِ حسن

حضرت مصنف کو جس طرح ہر قسم کے مضامین کی بندش پر قدرت ہے اسی طرح دعائیہ
کی بندش پر بھی اختیار حاصل ہے پہلے سب بنی آدم کی خیر چاہتے ہیں پھر آقا کے
دعا فرماتے ہیں اور آخر میں اپنی ذاتِ خاص کی نسبت دستِ بدعا ہوتے ہیں سبحان
کیا خوش مذاقی ہے کیا خوش کلامی ہے یہ خوش اسلوبی ایک امر مودع ہے سیکھنے سے
آسکتی ہے این سعادت بزور بازو نیست ؛ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ ؛ اس کے
حضرت مصنف اپنی اس مثنوی کی داد مانگتے ہیں اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اگر ایسی
کی داد نہ ملے تو اس سے بڑھ کر انصاف کشی اور کیا ہو سکتی ہے آپ فرماتے ہیں :۔

ذرا منصفو داد کی ہے یہ جا — کہ دریا سخن کا دیا ہے بہا
زبس عمر کی اس کہانی میں صرف — تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب بن گیا ہوں میں پیر — تب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر
نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجھڑی — مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان — نئی مثنوی ہے یہ سحر البیان
رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام — کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام
ہر اک بات پر دل کو میں خوں کیا — تب اس طرح رنگیں یہ مضمون کیا
اگر واقعی غور ٹک کیجئے — صلہ اس کا کم ہے جو کچھ دیجئے
غرض جس نے اس کو سنا یہ کہا — حسن آفریں مرحبا مرحبا
جو منصف سنیں گے کہیں گے یہی — نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی

انصاف یہی ہے کہ حضرت مصنف نے اپنی مثنوی کی تعریف بالا میں کوئی امر احاطۂ حق

یں ارشاد فرمایا ہے ۔ اشعار بالا میں خس برابر بھی مبالغہ نے جگہ نہیں پائی ہے ۔ بلاشبہ
نوی ایسی ہی ہے کہ " نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی " مرزا قتیل کا مصرعۂ تاریخ بھی جادۂ
ی سے باہر نہیں ہے آپ فرماتے ہیں کہ " بریں مثنوی باد ہر دل فدا " حقیقت حال
ہی ہے کہ وہ حضرات جو شاعری کا مذاق صحیح رکھتے ہیں اس مثنوی پر دل سے فدا ہیں ۔
رت مصحفی کا فرمانا کہ " یہ بتخانۂ چین ہے بے بدل " تمامتر قرین حق ہے واقعی یہ
ایک لاجواب بتخانۂ چین سے بھی زیادہ خوشنما اور دل آویز ہے ۔

ی گلزارِ نسیم

یہ مثنوی بھی بڑی شہرت رکھتی ہے اس کے مصنف حضرت نسیم ، خواجہ
حیدر علی آتش کے شاگرد تھے ، کہتے ہیں کہ خواجہ نے اس کی اشاعت
پہلے اس کی نظر ثانی فرمائی تھی ۔ خیر بحالت موجودہ یہ مثنوی بہت توجہ طلب ہے ، اس کی نظم
حیرت انگیز اختصار کا عالم رکھتی ہے اس پر بھی ادائے مطلب کا ایسا جلوہ دکھلاتی ہے کہ
بایہ زبان کی عمدگی اپنا جواب نہیں رکھتی یوں تو کوئی کلام بشری اعتراض سے پاک نہیں ہو سکتا
ی اس کی خوبی نظم اور عمدگی زبان بہت کچھ لائق تحسین ہے البتہ اس مثنوی میں میر حسن کی فطری
ب کم ہیں ۔ وہ تناسب خیالات جو مثنوی میر حسن میں دیکھا جاتا ہے اس مثنوی میں گویا نہیں ہے ۔
ن ایک نیچرل شاعر تھے ان کے امور ذہنیہ اور امور خارجیہ کے بیانات تناسب سے
ی بھی جدا نہیں دیکھے جاتے ہیں یہ خوبی اس مثنوی میں کمتر نظر آتی ہے ۔ میں مثالاً یہ عرض کرتا
، کہ تاج الملوک کے چاروں بیٹوں کا ذکر حضرت نسیم یوں فرماتے ہیں :-

خالق نے دیئے تھے چار فرزند　　عاقل دانا ذکی خردمند

ب زبان کیا خوب ہے اور نظم کیا چست ہے مگر کلام میں تناسب حسب مراد نہیں دکھائی
ہے حضرت نسیم کی ساری مثنوی پڑھ جانے کے بعد بھی کہیں سے ان چاروں صاحبزادوں

کی عقل مندی، دانائی، ذکاوت اور خرد مندی کا کوئی پتا نہیں لگتا ہے بلکہ حضرت نسیم کے آئنہ کے بیان حالات سے اُن کی بے وقوفیاں اور بدتر کیبیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے میر حسن کی مثنوی کا انداز ہے کہ ساری مثنوی میں سلسلۂ کلام ایسے تناسب کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ بے اختیار دل میر حسن کے حسن کلام کا معترف ہو جاتا ہے، جاننا چاہیئے کہ تناسب ہی حسن ہے، انسان بھی تناسب کے حاصل رہنے سے حسین کہلاتا ہے اور ہر شے جو تناسب رکھتی ہے دل آویز ہوتی ہے اگر یہ تناسب گلزار نسیم کو حاصل رہتا تو اس مثنوی کی دل آویزی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی بہر حال یہ مثنوی اپنے رنگ میں اچھی ہے۔ ذیل میں کچھ اشعار اس مثنوی کے عرض ہوتے ہیں:۔

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گلچین کی تلاش میں

گل کا جو عالم چمن چمن ہے — یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے — اُٹھی نکہت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

نرگس تو دکھا کدھر گیا گل ، سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لاتا شمشاد انھیں سولی پہ چڑھاتا
تھرائیں خواصیں صورتِ بید ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتّا بھی پتے کو جب نہ پایا کہنے لگیں کیا ہوا خدایا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا اُوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس غفلت سے یہ پھول پہ پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا پتلی وہی چشمِ روشن کا تھا
نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی ہَیں اُس گل کو ہوا نہ دیتی تھی ہَیں
گل چیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا خوشبو رہی سُنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لاریب زبان کی خوبی اور بندش کی چستی اپنا جواب نہیں رکھتی ہے مگر اشعار بالا کے مضامین
نہ جذبات قلبیہ کا کوئی زور دکھلاتے ہیں اور نہ کسی سین یا سینری کا تماشا پیش نظر کر
دیتے ہیں شاعری کے اعتبار سے یہ اشعار اعلیٰ درجہ کے داخلی یا خارجی مضامین کی کوئی
خوبیاں نہیں رکھتے، حکمت و فلسفہ سے تو اُن کو کوئی لگاؤ ہی نہیں ہے اور اخلاقی تعلیم کی

بھی ان کو ہوا نہیں لگی ہے۔ فطری شاعری کے نمونے یہ اشعار ہرگز نہیں مانے جا سکتے ہیں۔ ان کی جو خوبیاں ہیں مصنوعی انداز کی ہیں۔ فطرت پسندوں کے لیے اور ہی انداز کی شاعری درکار ہے۔ جو حضرات میر حسن اور شیکسپیئر کے کلاموں کے لذت یاب ہیں ان کو اس ترکیب کے مضامین سے بہجت قلبی کیوں کر نصیب ہو سکتی ہے۔ کلام کا فطری انداز کچھ عجب لطف رکھتا ہے' ذیل میں کچھ اشعار مثنوی کی ترکیب کے کتاب مذہبِ عشق معروف بہ گل بکاؤلی سے درج کیے جاتے ہیں۔ ہر چند یہ اشعار کوئی علمی مسئلہ سے خبر نہیں دیتے ہیں مگر چونکہ ان میں ایک امیر گھر کی ہندوستانی دلھن کا سچا فوٹو ہے یہ اشعار لطف سے خالی نہیں ہیں۔ یہ اشعار بکاؤلی کے عروس بننے سے تعلق رکھتے ہیں اور اہل مذاق کے قابل توجہ ہیں :-

پرستاروں نے یہ اس کو بنایا جہاں میں حورِ جنت کو دکھایا
عجب صورت سے کی بالوں میں کنگھی کہ بکھرا دیکھ کر ہر ایک کا جی
لپٹ آئی جو بوئے زلفوں کی یکبار ہوئی کافور بوئے مشک تاتار
گلوری گوندھی وہ پاکیزہ چوٹی کہ سب اہل نظر کی جان لوٹی
جب اس کی موتیوں سے مانگ بھر دی فلک نے کہکشاں قربان کر دی
جو ٹیکا اس کے ماتھے پر لگایا ٭ قمر نے اپنے دل پر داغ کھایا
برنگ مہر تاباں تھا جو چہرہ ہوا تار شعاعی منہ پہ سہرا
وہ آنکھیں بند کرنا بھی ادا تھی ٭ چھپی مژگاں میں پوشیدہ حیا تھی
جب اس کے کان میں پہنایا جھمکا پریشاں ہو گیا عقدِ ثریا

پہن کر نتھ خوشی سے رنگ دمکا — وہ مکھڑا چاند سا گھونگھٹ میں چمکا
مسی آلودہ دنداں پیارے پیارے — چمکتے تھے شب یلدا میں تارے
مسی مل کر جب اس نے پان کھایا — یہ مطلع پڑھ کے ناسخ کا سنایا
مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے — تماشا ہے نہ آتش نہ دھوؤاں ہے
بنایا خال کاجل سے ذقن پر — عجب جوبن تھا اس رشک چمن پر
چڑھی منہ پر دلھن کے ایسی شیریں — کہ پھیکی پڑ گئی نظروں سے شیریں
گلے میں پہنا جب موتی کا مالا — بنات النعش کو حیرت میں ڈالا
اگر ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے تھے — زر خالص کے زیب پا چھڑے تھے
بہت اس کے سوا بھی اور گہنا — مناسب جس جگہ تھا اُس نے پہنا

ظاہر ہے کہ یورپ کا کوئی آدمی جو ہندوستان کی رسمی اور رواجی باتوں سے واقف نہیں ہے اشعار بالا سے کوئی حظ نہیں اٹھا سکتا مگر ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی آدمی جو شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے ضرور ہے کہ بیانات بالا سے متلذذ ہو اس لئے کہ یہ اشعار واقعات سے تمامتر تعلق رکھتے ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ ہندوستان میں دلھنیں دولت مند گھروں کی اسی طور پر سنواری جاتی ہیں پس ایسا سچا بیان واقعات کا جو شاعرانہ انداز کے ساتھ ہو کیوں کر مطبوع اہل مذاق نہیں ہو سکتا ؛

حکمت آموز مثنویاں: اس ترکیب کی مثنوی اُردو میں "بوستان سعدی" اور "پند نامۂ عطار" کے پایہ کی کوئی نہیں ہے ؛

تصوف آموز مثنویاں: اس قسم کی مثنویاں بھی اُردو میں اعلیٰ درجہ کی نہیں ہیں کوئی ایسی نہیں ہے جو مولانائے روم کا جواب سمجھی جائے ؛

متفرق مضامین کی مثنویاں: اس انداز کی مثنویاں بہت ہیں سیکڑوں قصص و حکایات رنگ برنگ کے منظوم ہوتے گئے ہیں ذیل میں ایک مثنوی غالب کی جو آم کی تعریف میں ہے درج کی جاتی ہے:

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے — ثمر و شاخ گوی و میداں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارمان — آئے یہ گوے اور یہ چوگان
آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمھیں خبر کیا ہے — آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار — جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — کوہ کن باوجود غمگینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام — شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

دبلے ہے اُس سے جو کوئی ہے کج فہم — کہ اس کی طبع کو آنکس کرے وہم
بنا ہے پاک طینت اِس قدر وہ — قدم ہرگز نہ رکھے خاک پر وہ
سبک چلنا کوئی کیا اس کو بتلائے — جہاں تک ہجو کا غذ پر چلا جائے
کریں ہیں آفریں اس پر سو کیا ہے — گویا اس کی بِرہ آوازِ دَرا ہے
نہ لگوائے کبھی مستک پہ سیندور — بہت اس کی بزرگی سے ہے یہ دُور
ہوا کیا گر نہیں کرتا ہے تزئین — اُسے کہتے ہیں اہل طبع رنگین
نہ ہوشے قد و قامت میں وہ موجود — بلندی عرش سے ہے اس کی افزود
بھلا اِس شان کا ہاتھی کہیں ہے — کہ جس پر ہر کوئی ایسا تعیں ہے
جہاوت دل ہے نالہ بھالہ بردار — ہے چرخی پیچش آہ شرر بار
نہ کچھ پیوے کبھو نہ کچھ وہ کھاوے — لنغر بھی اس بندگی پر نہ آوے
کوئی ہاتھی کی ہوتی ہے یہ اوقات — نہیں دم مارنے کی اِس جگہ بات
غرض ہاتھی خدا دیوے تو ایسا — نہ فیل راجہ نرپت سنگھ جیسا

اس کے بعد اس ہاتھی کی ہجو ہے۔ ہاتھی سے جو باتیں متعلق ہیں ایک بھی نہیں اُٹھا رکھی گئی۔ افسوس کہ اس کتاب میں ہر پہلو سے اختصار ہی کی ضرورت ہے ورنہ ہجو کے اشعار کم ازکم دس بیس تو ضرور داخل کتاب ہذا کر دیئے جاتے۔ سبحان اللہ کیا شاعر گراہی سودا گذرا ہے حقیقت ہے کہ سوا حضرت سودا کے اس قابلیت کی مثنویاں کسی شاعر سے انجام نہیں پا سکتی ہیں۔

اشعار از مثنوی ہجو رشیدی کوتوال

قوت انتخاب جواب دینے لگتی ہے کیا کلام ہے سبحان اللہ مجبوراً ذیل میں کچھ اشعار

عرض کر دیئے جاتے ہیں ورنہ لطف کلام تو پوری مثنوی پڑھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا:

گشت جب اس کا پھر آتا ہے — یہی نرسنگیا بجاتا ہے
سن لو جو رو یہ مختصر قصہ — صبح کو بیج دیجیو حصہ
شہر کے بیچ کیا کہوں میں اب — روز محشر کی دھوم ہے ہر شب
شب ہے نرسنگیوں کی قال و قیل — گویا پھنکتی رہے ہے صور اسرافیل
کتے آہٹ سے ان کی بھونکتے ہیں — مردے خواب عدم سے چونکتے ہیں
آنکھ تو کس بشر کی لاگے ہے — چوروں کے ڈر سے فتنہ جاگے ہے
آسماں پر بھی منعدم ہے خواب — کھلا رہتا ہے دیدۂ مہتاب
بزم میں شب ہر ایک پیر و جواں — بیٹھے ہے کر کے رزم کا ساماں
نس پہ یہ ہے کہ ہر طرۂ زر — لگے ہے چور شمع سے آکر
طرۂ شمع یک طرف سے یار — گم ہے خورشید کی بھی شب دستار
شام سے صبح تک یہی ہے شور — دوڑیو گٹھڑی لے چلا ہے چور
صبح شبنم جو گل پہ ہوتی ہے — بقچہ کو غنچہ کے وہ روتی ہے

اس مثنوی میں کوئی بات جو کوتوال کے متعلق ہے اس شاعر نامی سے چھوٹ نہیں رہی ہے اپنی اطلاع عام سے کام لینا حضرت سودا ہی کا کام ہے اس زور کا شاعر جو اصناف شاعری پر اس قدر قادر ہو، اردو میں کوئی نہیں ہے حضرت سودا اپنے جواب آپ ہیں۔

اشعار از مثنوی ہجو امیر دولتمند بخیل

حضرت سودا اس مثنوی میں لکھتے ہیں کہ آپ کے ایک آشنا ایک امیر کی ملاقات کو

گئے اُن کے وہاں جانے ہی ابر گھِر آیا اور بارش ہونے لگی وہ امیر محل میں چلا گیا اور یہ انھیں وہ رات مجبوری سے اس کے گھر رہنا پڑا۔ بکاول سے حسب ہدایت امیر جو کھانے کے واسطے کہا تو اُس نے اس امیر کی بخالت کے حالات بہت کچھ بیان کیے یہ بیانات حضرت سودا کی بڑی طباعی اور مضمون آفرینی سے خبر دیتے ہیں آخر میں بکاول نے یہ باتیں کہیں اشعار ذیل میں منظوم ہیں :۔

ایک فرزند یہ رکھے تھا اولاغ　　سارے گھر کا تھا اُس کے چشم و چراغ
اُس نے اک روز یہ حماقت کی　　آشنا اپنے کی ضیافت کی
نہ ضیافت کہ جس میں ہو رنگ رس　　اک رکابی طعام نہ دیگچہ بس
تس پہ یوں پیش آیا یہ مردود　　یاد آیا اُسے چھٹی کا دود
چاہتا تھا کرے یہ اس کو عاق　　اور ماں کو بھی اس کے دیوے طلاق
بارے لوگوں نے آ کے سمجھایا　　تب یہ جورو کے حق میں فرمایا
یعنی یہ اس کے عوض یہ کیوں نہ جنی　　کاش بھینس مرتا وال یہ ناشدنی
یا وہ مجھ سے تو لاولد بہتر　　میرا بیٹا اور اس قدر ابتر
اس کا دادا بھی گرچہ تھا عیاش　　اس سلیقہ سے پر کرے تھا معاش
جو کوئی اس کے گھر میں نوکر تھے　　رات کو اس پہ یہ مقرر تھے
پھرتا وہ ٹکڑے مانگتا گھر گھر　　لاتا آقا کے آگے جھولی بھر
اچھے چن چن کے آپ کھاتے تھے　　برے تنخواہ میں لگاتے تھے
پیدا جو کر گئے تھے یوں اجداد　　سو یہ بد بخت دے ہے یوں برباد
جانتا تھا میں آپ ہی کو فضول　　پر یہ مجھ سے بھی نکلا نا معقول

گڑے پیسے یہ سب اُڑا دے گا
انیٹوں تک بیچ بیچ کھاوے گا

اس دادی کے باپ کا اک روز
آشنا تھا سودہ نیرٹ دل سوز

لایا کھچڑی پکا شراکت سے
دونوں کھانے لگے رفاقت سے

ان نے اک دو لیے نوالے بڑے
جد مرحوم وہیں ہو کے کھڑے

لگے کہنے نہیں شراکت نیک
میرے سو لقمے اور تیرا ایک

تھی بزرگوں کے اپنے تو یہ چال
کرتی ہیں یاں ضیافتیں پامال

خوب جو کچھ اُٹھا خزینہ سے
تو اتالیق کے مہینے سے

سنا اِس گھر کا بار تو نے حال
مجھ سے کھانے کا پھر یہ کیجو سوال

خوبی بیان کا کیا کہنا ہے، بکاول اپنے آقا کے حالات بیان کرتا ہے پھر بکاول خود کچھ نہیں کہتا ہے صرف اپنے آقا کے اقوال کا اعادہ کرتا ہے اس اعادہ میں آقا کی بی بی بیٹے دادا پردادا سب کی ہجو ہو جاتی ہے یہ ترکیبیں حضرت سودا کے سوا کس سے انجام پا سکتی ہیں۔ واہ ری طباعی واہ ری مضمون آفرینی واہ ری خوبیٔ اسلوبِ بیان کیا حیرت انگیز قدرت شاعری کی اس شاعر گرامی کو عطا ہوئی تھی۔ اہلِ اطلاع حضرت سودا کی جس قدر قدر فرمائیں بجا ہے۔

اشعار از مثنوی ہجو ضاحک

اس مثنوی میں میر ضاحک کی بسیار خواری کی ہجو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر ضاحک نے سودا کی ہجو کی تھی۔ یہ مثنوی اُن کی ہجو نگاری کی مکافات ہے، خلاقِ سخن حضرت سودا پر ختم ہے۔ ذیل میں کچھ اشعار

اس مثنوی کے درج ہوتے ہیں۔ پوری مثنوی دیدنی ہے۔ مگر اس کتاب میں اس کی گنجائش نہیں ہے ؎

جو اسے میہماں بلاوے ہے — آفت اپنے وہ گھر پہ لاوے ہے
یہی کہتا پھر اس کے گھر بیٹھے — اور کوئی نہ کھانے پر بیٹھے
بولتا آوے ہے قدم بہ قدم — کہو کھانے کو جلد دیویں دم
نہ سلام و علیک نہ کچھ بات — صاحبِ خانہ سے کرے بذات
بیٹھتے ہی نکالے ہے یہ ذکر — پیٹ کی میرے تم کو ہے کچھ فکر
بھوک کچھ اِن دنوں ہے کم میری — روٹیاں سو پچاس ادھ سیری
نان باکو کہو یہ بلوا کر — جلد اِن کو تنور لگوا کر
جب تلک کھانے پک چکیں سارے — ان ہی کو لا کے میرے سر مارے
جتنے دنیا کے بیچ ہیں اشکال — اشتہا ان میں تھامنا ہے محال
جب تلک کھانا آوے ہی آوے — اسی بک بک میں جان کھا جاوے
کھانا آوے تو اس طرح ٹوٹے — جیسے کوئی کسی کا گھر لوٹے
مارے لقمے تو اس طرح بدذات — جیسے جھاڑے کوئی پٹے کی بات
وہ جو کو کر کھڑے ہوں جس تس کے — منہ کو حیراں ہو تکتے ہیں اس کے
دیگچے جب یہ چاٹ کر چھوڑے — منہ کو کھانے سے موڑے تو موڑے

اشعار از مثنوی ہجو حکیم غوث

حضرت سودا کی بڑی اطلاع عام اور حیرت انگیز قابلیت شاعری کا ثبوت یہ

مثنوی بھی ہے واقعی مضمون آفرینی اس شاعر جادو نگار پر ختم ہے، کچھ اشعار اس مثنوی کے نذر ناظرین ہوتے ہیں :-

کتنے ہی بیمار تھے اور ایک گھر — سو ہی تو وہ گور سے تھا تنگ تر
آن کے بیٹھا وہ ستم گار جب — گرد ہوئے اس کے یہ بیمار سب
چھٹتے ہی اک شخص کی دیکھی جو نبض — کہنے لگا تجھ کو بشدت ہے قبض
کچھ نہیں کرنے کا بجز اس کے سُو — لکھ دیا یہ کر کے سفوف یہود
اور غذا اس کو یہ بتلائی دوست — ماش کی روٹی سے تو کھا ساگ پت
صاحبِ پیچس کو بتایا کٹڈل — واسطے ہیضہ کے لکھا اسپغول
لکھ دیا مجنون کو شیرِ شتر — کر دیا مستسقی کو جا فصد کر
پوچھا جو اُن نے کہ غذا کیا کہی — ساتھ کلتھی کے کہا کھا دہی
یہ کہا اس کو جسے تھی آتشک — موضع مخصوص پہ چھڑکو نمک
کہنے لگا دیکھ کے ایک اور کو — زخم کو ذبل کے کرا نا رفو
بیٹھ کے پھر پاس وہ اک ڈولی کے — نبض کہا دیکھوں میں لا ہاتھ دے
دیکھ چکا نبض کو جب بے تمیز — خادمہ سے اس کی کہا اے کنیز
درد کمر اس کو ہے یا دردِ سر — پر مجھے نقرس کا ہے ڈر بیشتر
کر کے پھر آخر کو مقرر صرع — کہنے لگا دو اسے ماء القرع
اور جو کھانے کی گئے اس کو لو — کچھ نہ اسے دیجیو جز آش جو
کہنے لگی سن کے یہ کیا قہر ہے — واسطے اس کے یہ دوا زہر ہے
لقوہ و فالج اسے ہے پر زُال — کرتے ہو کیوں قبض کا اس کے خیال

لقوہ و فالج ہو جیسے یا صرع — دیجیئے اس کے تئیں ماء القرع

یہ کمال ہجو نگاری ہے۔ مرض مشخص کے خلاف دوا و غذا کی تجویز کیا خوش اسلوبی کے ساتھ دکھلائی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت سودا کی طباعی اپنا جواب نہیں رکھتی ہے لاریب حضرت سودا ایک بڑے شاعر گذرے ہیں فطرت نے انھیں شاعری کی بے حد قابلیت بخشی تھی اپنی اطلاع عام سے جس قدر انھیں کام لینے کی صلاحیت حاصل تھی دنیا میں بہت تھوڑے سے شاعروں کو نصیب ہوئی ہے ؎

اشعار از مثنوی ہجو چیک مرزا فیضو

اہل اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اطلاع عام مرزا رفیع سودا کی ایک حیرت خیز انداز رکھتی ہے، ہندوستان کے ہر قسم کے معاملات سے اس شاعر گرامی کو خبر تھی حضرت سودا کی کلیات کی سیر سے صاف ہویدا ہوتا ہے کہ اپنی اطلاع عام کی بدولت حضرت سودا ہر قسم کی شاعری پر قدرت رکھتے تھے واقعی کون سی بات شاعری کی ایسی ہے جو حضرت کی کلیات میں نہیں ہے، اس مثنوی کے اشعار بھی حضرت کی بڑی اطلاع عام سے خبر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت میر شکاری کے فن سے بھی پوری اطلاع رکھتے تھے، ناواقف فن ہرگز اس خوبصورتی کے ساتھ ایسی مثنوی نہیں لکھ سکتا ہے۔ حضرت سودا نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ شاعر کو ہمہ دان ہونا چاہیئے۔ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اصناف شاعری پر قادر ہونے کے لئے اطلاع عام کی بڑی ضرورت ہے میری دانست میں حضرت سودا اطلاع عام کے اعتبار سے ہندوستان میں اپنے جواب آپ ہیں جیسا کہ

شکپیئر انگلستان ہیں ذیل میں کچھ اشعار اس مثنوی کے ہدیہ ناظرین ہوتے ہیں :-

آہ وداد بلا از دست روزگار
قوش خانوں میں ہے غم سے آشکار

سر سے ہر یک باز نے پٹکی کلاہ
رخصت ہر تنا ہیں نے پہنا سیاہ

ہو گئے جرّوں کے دل غم سے دو نیم
باشہ و باشین و لگڑی بھی یتیم

کیا ترمتی کیا کہی کیا بسیرا
یک بیک اُن سے زمانہ یوں پھرا

آہ کچھ مت پوچھو اب اِس کا سبب
کیا کہوں یارو میں تم سے ہے غضب

زافیفو کی چیچک مر گئی
قوش خانے جگ کے ویراں کر گئی

کس قدر ہے آسماں بے امتیاز
آہ کیا مارا ہے اس نے شاہباز

وضع دوراں سخت ناانصاف ہے
دیکھیو یارو یہ کیا انصاف ہے

میر زاغ گیں ہوں چڑیاں شاد ہوں
گھونسلے چیلوں کے یوں آباد ہوں

دیکھ تو سارو کو کیا خرسند ہے
ڈھڈو کو اس سے خوشی دو چند ہے

ہائے کیا تیتر کے گھر شادی ہے آج
پینکٹ و غوغائی کے گھر آیا ہے راج

کبک کیا کیا مارتی ہے قہقہے
کیسی در تیبر کر رہی ہے چہچہے

ہائے وہ مرزا کہ جس کا سن کے نام
آب ہو سیمرغ کا زہرہ تمام

سو کیا اس کو فلک نے یوں ذلیل
مرتے ہی چیچک سے بگڑا ہی یہ نیل

جب نکلتے گھر سے وہ بازار کو
تیز کرتے وال چھری کی دھار کو

دیکھ کر ان کے تئیں بنیئے تمام
بند کر آنکھوں کو کہتے رام رام

ان سے یہ کہتے اگر منظور دھرم
ہے تمھیں اور دھرم کی کچھ شرم

تو چھ او پھنگیوں کے جانور ‌ ‌ ‌ جتنے ہوں پیسے انھوں کے بیچ کر
بھیج دو جلدی نہ ہو ایسا کہیں ‌ ‌ ‌ کھولوں میں پتواز سے چپک کے تنبُں
اس سخن کو جس گھڑی سنتے تھے وہ ‌ ‌ ‌ دو ہیں کہتے تھے کہ جو چاہو سو لو
یہ تو پینے کیا ہیں کئی اک رو زمیں ‌ ‌ ‌ راجہ پتانہ سے آئیں رشوتیں
جب سے مرنا ہو گیا اس کا یقین ‌ ‌ ‌ ایک خرمہرہ کوئی دیتا نہیں

ذیل میں ایک حکایت منظوم بھی اس شاعر گرامی کی داخل کر دی جاتی ہے یہ ترکیب حضرت سعدی کی بوستان کی ہے اگر حضرت سودا نے اس صنف شاعری کی طرف توجہ فرمائی ہوتی تو اردو میں ایک کتاب بوستان کا جواب ہو جاتی ؛

حکایت

سنا ہے کہ اک مرد اہل طریق ‌ ‌ ‌ نہایت ہی واقع ہوا تھا خلیق
صفت سے تواضع کی موصوف تھا ‌ ‌ ‌ کریمی کے عالم میں معروف تھا
غرض چاہیئے آدمی میں جو چیز ‌ ‌ ‌ رکھے تھا سبھی خوبیاں وہ عزیز
قضا کار مجلس میں ہوتا کہیں ‌ ‌ ‌ اڑاتا نہ منہ سے مگس کے تئیں
کسی نے کیا اس سے اک دن سوال ‌ ‌ ‌ وضع سے کیا ہے تیرا مآل
جو ملنے میں ٹک ہاتھ کے ہووے کام ‌ ‌ ‌ تو حاصل اٹھانے سے تکلف نام
کہا راستی ہے جو تم نے کہا ‌ ‌ ‌ و لیے اس سے یہ ہے مرا مدعا
کہ جس حال میں دوں اس کو اڑا ‌ ‌ ‌ ہے ممکن کسی اور پہ بیٹھے جا
پس ہمت کے نزدیک ہے کیا بھلا ‌ ‌ ‌ کہ میں اور پہ ٹالوں اپنی بلا
غرض جتنے گزرے ہیں اہل کمال ‌ ‌ ‌ ہر اک کا سمجھتے تھے اپنا سا حال

تو کز محنت دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

مثلث و مخمس

یہ دونوں تضمینیں ہیں عام اس سے کہ شاعر خود اپنے کلام یا کسی دوسرے شاعر کے کلام پر تضمین کرے۔ مثلث عبارت ہے تین مصرعوں سے جس میں اول مصرع تضمین کا ہوتا ہے اسی طرح مخمس مراد ہے پانچ مصرعوں سے جس میں تین مصرعے تضمین کے ہوا کرتے ہیں یہ عروضی ترکیب مثلث اور مخمس کی ہے مگر نفس شاعری کے اعتبار سے مثلث اور خمسہ کو ایسا ہونا چاہیئے کہ تضمین کے مصرعے اصل مصرعوں سے ایسے دست و گریباں ہوں کہ سر مو بھی ان کے آپس میں کوئی امتیازی امر لاحق نہ ہو یعنی تینوں یا پانچوں مصرعوں میں ایسی چسپانی پیدا ہو کہ اصل مصرعوں سے تضمین کے مصرعے نام کو بھی جدا نہ معلوم ہوں اکثر غزلوں پر تضمین کی جاتی ہے مگر مثلث کے اعتبار سے مخمس تضمیں زیادہ دیکھی جاتی ہے سلاموں کی بھی تضمین ہوتی ہے اور زیادہ مخمس ہی ہوتی ہے

تضمین فارسی

ذیل میں حضرت حافظ علیہ الرحمہ کی ایک غزل کا خمسہ عرض ہوتا ہے

ہر کسے را در درون خلوت دل راہ نیست — ہر گدائے لائق قرب جوار شاہ نیست

حق شناسی کار ہر بد طینت گمراہ نیست — زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست

در حق ما ہر چہ گوید جائے ہیچ اکراہ نیست

ایکہ مارا دست مطلب خالی از ہر مدعاست — دامن ہمت عاری ز اندازۂ شال و قباست

بندہ پرور بار آلہا از تو نالیدن خطا ست　　ہر چہ ہست از قامت ناساز و بیحاند ام ماست

ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

جاہلاں در فکر شرب شاہد و نقل و شراب　　آنکہ دانا سینہ بریان و جگر خوں مثل کباب

فاش گویم بر ملا گو جرم باشد یا صواب　　صاحب دیوان ما گویا نمید اند حساب

کاندریں طغرا نشانے حسبۃً للہ نیست

از حریف حیلہ گر غافل کجا خواہیم ماند　　گرچہ با ما مہرہ ما بر تختہ حیلت نشاند

اسپ ما را پیل دولت کے جلو خواہد ستاند　　تا چہ بازی رخ نماید بیرقی خواہیم راند

عرصۂ شطرنج رندان را مجال شاہ نیست

یہ مصرعے جناب حضرت سید شاہ عبد الودود صاحب کے ہیں آپ کا شیراز وطن ہے ترک دنیا کر کے ۱۰۶۵ھ میں اپنے دیس سے ہندوستان تشریف لائے پٹنہ میں ۲۲ برس تک قیام پذیر رہے بہت ذی علم اور ظاہراً صوفی مشرب تھے، فقر کی ساری باتیں اُن کی ذات بابرکات میں موجود تھیں کیمیا گر ہونے کا شبہ اُن پر لوگ کرتے تھے، کہتے ہیں کہ کسی شخص نے انہیں دنیاوی غرض سے مسموم کر ڈالا، وقت رحلت اُن کی عمر ۹۶ برس کی تھی، نور اللہ مرقدہٗ ؛

تضمین غزل مرزا فاخر مکین از مرزا رفیع سودا

ما خانۂ کس بہر مدارات نرفتیم　　جائے پئے گزراندن اوقات نرفتیم

ایں ننگ بجود کردن اثبات نرفتیم　　در دیر و حرم بہر مناجات نرفتیم

جز کوئے تو اے قبلۂ حاجات نرفتیم

بستیم اگر بہر طواف حرم احرام | ماتوبہ نہ کردیم دلے از مے گلفام
درمیکدہ چوں ساختہ زنداں ہمہ ابد نام | صد بار گرفتیم رہ کعبہ و یک گام

بے مصلحت پیر خرابات نرفتیم

آں شوخ اماں روز کہ باما شدہ باغی | داریم دل غمزدہ چوں بلبل باغی
کو خرمی عید دریں سینۂ داغی | صد عید شد و رفت در آشفتہ دماغی

ہرگز بہ کسے بہر ملاقات نرفتیم

جستیم بہ آفاق ہمہ روئے زمیں را | دیدیم بہ زیر فلک استاد حزیں را
برخاک درش رفتہ بسائیم جبیں را | اشعار شنیدیم و ندیدیم مکیں را

مشغول صفاتیم و پئے ذات نرفتیم

تضمین اُردو

اُردو میں غزلوں اور سلاموں پہ زیادہ تضمینیں دیکھی جاتی ہیں اردو غزلوں اور سلاموں کے علاوہ فارسی غزلوں اور سلاموں پر بھی اُردو تضمینیں پائی جاتی ہیں، ذیل میں کچھ اُردو تضمینیں بشکل مثلث و مخمس ہدیۂ ناظرین ہوتی ہیں:۔

مثلث اُردو

یہ مثلث میر پرورش علی مرحوم کا ہے آپ کڑا مانک پور علاقہ فتح پور ہسوا کے ساکن تھے سخی تخلص فرماتے تھے آپ کا زمانہ اور خواجہ آتش صاحب کا زمانہ ایک تھا، اُستاد مصحفی کے تقاضائے شعر گوئی کا شغل شروع کیا تھا صاحب دیوان

ہیں مگر آخر عمر میں نوحے اور سلام کہا کرتے تھے موسیقی میں پورا دخل رکھتے تھے بے انتہا خوش آواز بھی تھے اکثر پوربی زبان میں پاتی یعنی نامے تصنیف کر کے بڑی خوش الحانی سے پڑھتے تھے اور رویا کرتے تھے، آپ سادات کرام سے تھے۔ اور مولوی وحید صاحب ممدوح بھی جن کا ذکر سابق میں آچکا ہے سندی سادات میں سے تھے۔ میر پرورش علی صاحب جس وقت پٹنہ میں تشریف لائے تھے اس تشریف اُن کا انسٹی سے متجاوز تھا آدمی بہت قدآور جسیم اور وجیہ تھے، ایک قطعہ آپ کا سابق میں درج ہذا ہو چکا ہے۔ اب ذیل میں آپ نے جو اپنی غزل کو مثلث فرمایا ہے یہ بھی نذر ناظرین ہوتا ہے ؎

مثالِ شمع ہم ثابت قدم ہیں سر کٹاتے ہیں مزا کیا ضربتِ شمشیرِ قاتل کا اٹھاتے ہیں
شہادت کی جو ہم کو ہوس ہے تلوار کھاتے ہیں

وہاں سے قاصد آتا ہے کہ عزرائیل آتے ہیں بڑا اندیشہ ہے دیکھیں کدھر فرقت میں جاتے ہیں
خدا پہلے بلاتا ہے کہ وہ پہلے بلاتے ہیں

کسی دن مہربانی اور عنایت پر جو آتے ہیں یہ فرماتے ہوئے کوٹھے سے وہ جلوہ دکھاتے ہیں
کلیجا تھام لو کھڑکی کا پردہ ہم اٹھاتے ہیں

تعالیٰ شانہ کیا وقت ہے اور کیا زمانہ ہے عجب اس عاشقی کا الٹا پلٹا کارخانہ ہے
ہمیں روٹھے ہیں اُن سے اور ہمیں اُن کو مناتے ہیں

ذرا سُننا کہ میرا ماجرا سننے کے قابل ہے جہاں تھا بیٹھنا مشکل وہاں سے اٹھنا مشکل ہے
کہ پاؤں کے انگوٹھے سے مراد اُن کو بلاتے ہیں

سنا جس نے بے تحاشا جو زمیں پر منہ کے بل آئے ابھی روکا تھا اشکوں کو مگر باہر نکل آئے

یہ لڑکے کیا کسی کی بات کچھ خاطر میں لاتے ہیں

یہ کوئی بات ہے اپنی نگاہوں میں سمائے گا　　فلک کیا چودھویں کا چاند تو ہم کو دکھائے گا

ہم ایسے طشت میں اک حسین کا منہ دھلاتے ہیں

کریں اہلِ زمیں تدبیر کچھ اپنے مکانوں کی　　فرشتوں سے کہو اب خیر مانگیں آسمانوں کی

وہ نالے کرتا ہوں جو عرش کے پائے ہلاتے ہیں

کوئی پوچھے تو ان سے اس میں کچھ میرا بھی ہے مقصد　　سنی ہے صید آہو کے لئے کس شوخ کی آمد

سنجی جو خارہائے دشت پر آنکھیں بچھاتے ہیں

اُردو میں غزل حافظ شیراز کی تجنیس

عنادلِ گل روئے تو گلعذار انند　　اسیر دامِ بلائے تو دل شکار انند

غبارِ راہ وفائے شہسوار انند　　غلامِ نرگسِ مست تو تاجدار انند

خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند

ہمارے مدِ نظر تھے بہت نشیب و فراز　　نہ کوئی واقفِ اسرار تھا نہ محرمِ راز

یہ کیا کریں کہ یہ ہے اقتضا سے راز و نیاز　　ترا جبا و مرا آبدیدہ شد غماز

وگرنہ عاشق و معشوق رازدار انند

خرامِ ناز سے پامال ہے جہاں یکسر　　ہے عاشقوں کا ترے ساتھ ساتھ اک لشکر

ڈرے نہیں تجھے احوال پر کسی کے نظر　　ززیرِ زلف دوتا چوں نگہ کنی بنگر

کہ در یمین و یسارت چہ بے قرار انند

کہے ہے پیرِ مغاں دیکھنا یہ رنگِ سخن　　ہے تازہ توبہ ابھی یاد کر شرابِ کہن

بکے ہے تیرہ درون واعظ اس کی بات نہ سن　　بیا بہ میکدہ و چہرہ ارغوانی کن
مرو بصومعہ کانجا سیاہ کارانند

سیاہ پوش ہے اک خلق اک جہاں غمگیں　　وہ کون ہے کہ پریشان و خستہ حال نہیں
ہمارے کہنے کا تجھ کو اگر نہ آئے یقیں　　گذار کن چو صبا بر بنفشہ زار و بہ بیں
کہ از تطاول زلفت چہ سوگوار انند

ہمیں امید رہائی نہ آرزوئے خلاص　　نہ عادتِ تگ و دو ہے نہ جستجوئے خلاص
ہے ناگوار بہت جی کو گفتگوئے خلاص　　ز دام زلف تو دل را مباد روئے خلاص
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

ہے سر پہ خاک کلہ گرد ہے لباس بدن　　کدورتِ دل غمگیں عبیر پیراہن
غبار فرق سے آئینہ جبیں روشن　　ز نقش چہرہ حافظ ہمی تواں دیدن
کہ ساکنان در دوست خاکسار انند

یہ تخمیس اُستاد مومن خاں کی ہے۔ حافظ علیہ الرحمہ کے شعروں پر اُردو کے مصرعے لگائے ہیں مطلع میں فارسی کی تضمین سے چارہ نہ تھا؛

تخمیس غزل رِندؔ از رِندؔ

جسے کہ یاد نہ ہو اپنا آشیاں صیاد　　بھلا وہ خاک کہے حال بوستاں صیاد
عبث عبث تو نہ ہو مجھ سے بدگماں صیاد　　کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

خراب تھا مرے ہمراہ سایہ ساں صیاد　　چمن میں تھا کبھی بن میں رواں دواں صیاد

غرض کہ ساتھ ہی پہنچا جہاں نہاں صیّاد   جہاں گیا میں گیا دام سے سکے واں صیّاد
پھر انتلاش میں میری کہاں کہاں صیّاد

تنگ کر دیا دنیا کے کارخانے نے   بٹھایا خاک مذلت پہ سر اٹھانے نے
پھنسایا لا کے کہاں حیف اِس زمانے نے   دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیّاد

کچھ اور مجھ کو شکایت نہیں پہ ہے یہ گلا   بہار کیا کہ خزاں میں چھوا نہ اک تنکا
عبث یہ او ستم ایجاد کیوں غضب توڑا   اُجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پر آسماں صیّاد

بیاں کر نہیں سکتا جو میری حالت ہے   حواس باختہ ہوں مجھ پر اک مصیبت ہے
ابھی ہوں تازہ گرفتار زور وحشت ہے   عجب قصہ ہے عجیب اک حکایت ہے
سناؤں گا گل و بلبل کی داستاں صیّاد

کلام کرتا ہے وہ دل جو خوش آتا ہے   حکایت گل و بلبل مجھے سناتا ہے
ہر ایک بات میں سو سو طرح لبھاتا ہے   اداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیّاد

خدا گواہ ہے تعریف ہو نہیں سکتی   زیادہ گھر سے ہے راحت مجھے قفس میں بھی
کب اس کی ذات سے اتنی مجھے توقع تھی   عزیز رکھتا ہے کرتا ہے خاطریں میری
ملا ہے خوبی قسمت سے قدر داں صیّاد

میں اس کے دام میں آتا نہ زینہار اے رندؔ   یہ کشمکش نہ اٹھاتا میں زینہار اے رندؔ
کبھی فریب نہ کھاتا میں زینہار اے رندؔ   فریب دانہ نہ کھاتا میں زینہار اے رندؔ

نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

حضرت رندؔ نے خود اپنی غزل کی تضمین حسب ارشاد امجد علی شاہ بہادر مرحوم کی ہے

میر تقی میر کی غزل کی تخمیس

میری وحشت کا جو کچھ حال سنائیے بعد　　ہو گیا جوش جنوں حد سے سوا میر سے بعد
سونا جنگل جو نظر اُس کو پڑا میر سے بعد　　آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میر سے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میر سے بعد

باغ عالم میں وہ بلبل ہوں کہ ہوں جان چمن　　میں نہ ہوں گا تو نہ ہوگا کوئی خواہان چمن
پھاڑ ڈالیں گے گریباں کو جوانان چمن　　منہ پہ رکھ دامنِ گل روئیں گے مرغان چمن
ہر روش خاک اڑائے گی میر سے بعد

کیا کہوں اس سے کہ وہ تو ہے نہایت کمسن　　یاد کیا ہے کو ہیں گے اسے طفلی کے دن
سب پہ ظاہر کیے دیتا ہوں میں حال باطن　　اب تو ہنس ہنس کے لگاتا ہے وہ مہندی لیکن
خوں رلائے گا اُسے رنگ حنا میر سے بعد

سنسناہٹ سی اک اٹھتی ہے بدن میں ہر صبح　　جان آ جاتی ہے گویا مرے تن میں ہر صبح
آہ بھر کر یہی کہتا ہوں کفن میں ہر صبح　　وہ ہوا خواہ چمن ہوں کہ چمن میں ہر صبح
پہلے میں جاتا تھا اور باد صبا میر سے بعد

میں ہی دیوانہ اکیلا نہیں صحرا میں زبوں　　بعد میرے ابھی ہوویں گے بہت سے مجنوں
کتنے تلووں کا ابھی تجھ کو بہانا ہے خوں　　تیز رکھنا سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میر سے بعد

مر گیا جبکہ امانت تو پھری کچھ تقدیر　　غم ہوا اس کو بہت ہوگئی حالت تغیر
جیتے جی تو نہ خبر لی نہ ذرا کی تدبیر　　بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ تبیر
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

مخمس سلام فصیح از مونس رحمہما اللہ تعالیٰ

السلام اے گہر معدنِ عالی النسبی　　السلام اے ثمرِ گلشنِ والا حسبی
السلام اے قمرِ برجِ رسولِ عربی　　السلام اے جگر فاطمہ و جانِ نبی
انت مولائی فافدیک بامی و ابی

خمسہ کون و مکاں حق نے تجھے کو لقب　　کس نے پایا ہے جہاں میں یہ حسب اور نسب
عابد و زاہد و معشوق خدا عاشق رب　　جگرِ شیرِ خدا جانِ شہنشاہِ عرب
فخرِ حمزہ شرفِ ہاشمی و مطلبی

کٹ گیا دشت مصیبت میں گلستانِ نبی　　چاک اس غم سے نہ کیونکر ہو گریبانِ نبی
کس طرح تر نہ ہو اشکوں سے دامانِ نبی　　جاں بقرباں لب خشک تو اے جانِ نبی
یا رب زیبِ لبِ کوثر و تو تشنہ لبی

لب رنگیں ترے اے بادشہ عالی جود　　رات دن جن پہ رہا ذکر خدا اے معبود
وا در لغا وہ ہوئے پیاس کی گرمی سے کبود　　آہ آن سینہ کہ آغوش نبی جائیش بود
پا نہد شمر بر اں سینہ بایں بے ادبی

قبلہ خلق سمجھتے ہیں تجھے کعبہ پرست　　عرش اعلیٰ بھی ترے پایہ رفعت سے ہے پست
ایک دن وہ تھا کہ تھی دوش محمد پہ نشست　　ایں چہ حال است کہ در خاک تنت عریاں ہست

کفن از خلد بیاورد رسول عربی

تیری توقیر سے آگاہ ہے دنیا ساری ہے رسولانِ سلف سے ترا پلہ بھاری
تو نے سر دے کے کیا دین کا سکہ جاری اللہ اللہ کہ عجب رتبۂ عالی داری

آنکہ با حمزۂ شاہِ شہدا ہم لقبی

کیا قیامت ہے کہ قبروں میں ہوئے دفن لعین رہ گئی لاش تری بے کفن اے سرورِ دین
تنِ نازک یہ ترا اپنے غضب اور گرم زمین مگر از حالِ تو آگاہ نشد روحِ امین

مہارِ جنبانِ تو مے بود در ایامِ صبی

دل لرز جائیں جدھر ہو تری آواز بلند سن کے تقریر تری نطق فصیحوں کے ہوں بند
اے شہنشاہ زماں چھیڑ کے میداں میں سمند رجز از بہرچہ خوانی ہمہ کس ؟ ؟ داند

خسرو ملک حجازی شہ والا حسبی

چاہتا تو جو سپاہ ستم آرا کی شکست جتنے سرکش تھے وہ اک آن میں ہو جاتے پست
لائے تاب او، نہ کچھ دل میں کوئی ظلم پرست راز در سجدہ بہ بردم خنجر ایں است

مغفرت بہر غلامان ز خدا می طلبی

کام لکھا تھا ترے نام پہ جو روزِ الست حق نے وہ ختم تجھی پر کیا اے حق پرست
جانتے ہیں یہ وہی جو ہوئے عرفاں سے ہیں مست بخششِ امتِ عاصی مہ بیت خون تو ہست

بہر آسائشِ امت تو بہ رنج و تعبی

فیض پاتا ہے ترے در سے ہر اک حاجتمند تیری ہر بات ہے اللہ و محمد کو پسند
مثلِ خورشید فلک بزمِ جہاں میں ہر چند چارہ نور بلا شبہ و شک یکساں اند

تو ازاں ہا مگر اے نورِ خدا منتجبی

ہے بجا روح محمدؐ جو ہو تجھ سے گلہ مند — گوشۂ قبر میں پہنچائے ہیں زہرا کو گزند
باغ فردوس ہے گھر حق کا وہ زنداں میں بند — آل لیلین بر سن آل زیاد آزاد اند

دادا اے چرخ جفا کار بایں بوالعجبی

چھوڑ مونس کی طرح الفت حیائے قبیح — در درکھتا ہے تو مولا تجھے کردیں گے صحیح
عرض کر مل سکے تمنائے ولی پیش ضریح — قدرداں تو امام حسینؑ است فصیح

پس چرا مطلب خود از دگراں می طلبی

مسدس

عروضی ترکیب مسدس کی یہ ہوتی ہے کہ ایک بند چھ مصرعوں کا ہوتا ہے۔ چار مصرعے تو ایک ہی قافیہ رکھتے ہیں مگر آخر کے دو مصرعے جو ٹیپ کے مصرعے کہلاتے ہیں پہلے چار مصرعوں سے علٰحدہ قافیہ رکھتے ہیں اُردو میں اس عروضی ترکیب کی پابندی کے ساتھ تین قسموں کی شاعریاں برتی جاتی ہیں۔ وہ یہ ہیں :-

(۱) واسوخت۔ جیسے واسوخت امانت۔ واسوخت مومن وغیرہ وغیرہ۔

(۲) مسدس حکمت آموز۔ جیسے مسدس کربیا۔ مسدس حالی مدظلہٗ وغیرہ وغیرہ۔

(۳) مراثی حال۔ جیسے مرثیہ ہائے میر ضمیر و مرزا دلگیر و میر انیس و مرزا دبیر و میر مونس وغیرہ وغیرہ۔

واضح ہو کہ فارسی میں یہ قسمیں شاعری کی اس عروضی ترکیب کے ساتھ کمتر دیکھی جاتی ہیں اور اگر ہیں تو حسب مراد تصنیفیں راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری ہیں اس لئے فارسی کی کوئی ایسی تصنیف درج ہذا نہیں کی جاتی ہے اب حضرات ناظرین صرف اردو کی

مسدس نگاریوں پر نظر توجہ ڈالیں :

نمبر(۱) واسوخت

یہ ایک عاشقانہ رنگ شاعری کا ہے اور مسلسل طور پر غزل سے زیادہ اس میں موقع جذبات قلبیہ اور واردات ذہنیہ کی بندش کا حاصل ہے مگر افسوس ہے کہ کوئی واسوخت آج تک حسب مراد تصنیف نہیں ہوا، اس وقت تک جتنے واسوخت اُردو میں دیکھے جاتے ہیں نہایت پوچ خیالات سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ اس قدر بے ربط خلاف فطرت اور پست مضمون ہیں کہ طبیعت اُن کے پڑھنے سے گریز کرتی ہے ایسے واسوخت کسی تعلیم یافتہ خوش مذاق شریف طبیعت پاک طینت شخص کو پسند نہیں آ سکتے، ایسے واسوخت کے وہی حضرات قدرداں ہو سکتے ہیں جن کے دل و دماغ خیالات فاسد سے خراب ہوئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر عشق کی تفضیح کی سیر کسی کو دیکھنا ہو تو اُردو کے واسوختوں کو دیکھئے فقیر کی دانست میں اُردو کا جو بہترین واسوخت سمجھا جاتا ہے وہ عشق کی تفضیح کا بڑا سے بڑا کارنامہ ہے جس واسوخت کو دیکھیے اس میں عشق تمام تر فسق کے پیرایہ میں دکھلایا گیا ہے۔ واسوخت میں عموماً اسی طرح کے مضامین باندھے جاتے ہیں جو قابل اعادہ منفصلہ نہیں ہیں مگر مثالاً اصلاح مذاق کے خیال سے مدرج ذیل ہوتے ہیں :

پہلے شاعر صاحب اپنے ایسے زمانہ کو بیان فرماتے ہیں جب انہیں عشق سے سروکار نہ تھا عشق کے نام سے انہیں حوشت ہوتی تھی، مگر اُن کا ایک دوست تھا جو مبتلائے عشق ہو رہا تھا اس شاعر صاحب نے پوچھا تو جو عاشق ہے تو

یہ بتا کہ عشق کیا چیز ہے۔ دوست صاحب نے فرمایا کہ نہایت تعجب کی بات ہے
کہ تو نے کبھی دل کسی کو نہیں دیا، شربت وصل نہیں پیا، کسی سے ہم بغل نہیں ہوا لذت بوس و
کنار سے واقف نہیں ہوا اپنے دوست سے ایسی تقریر سن کر شاعر صاحب کے دل میں عشق جگہ
کر گیا اسی کا سودا پیدا ہو گیا کہ عشق کرنے کے واسطے کسی خوبصورت کو ڈھونڈ نکا لیے
اب ہر مجمع شاعر صاحب تلاش معشوق کی نظر سے جانے لگے، کہاں گئے کہاں گئے۔ گھر
آخر ایک معشوق نظر آگیا اب اس کے وصل کی فکر میں اس کے کوچہ میں روز جانے لگے
اس کے دروازے کے سامنے کھڑے ہونے لگے پھر اشارہ بازی شروع کی پھر اس سے
اس کے گھر کے اندر جانے کی تمنا دکھلائی، وہ معشوق بھی چونکہ کسی اصول زندگی کا پابند نہ
تھا اس نے شاعر صاحب کو اندر گھر کے بلایا، گھر کے اندر کچھ بے سروپا گفتگو آپس میں ہوتی
گئی اس روز سے عاشق معشوق ساتھ بیٹھنے لگے شاعر صاحب نے اپنے معشوق کو معاشرت
کے طریقے بتلائے لباس و آرائش کے ڈھنگ سکھلائے جب کچھ روز اس طرز پر گذرے اور شاعر صاحب
کی بخشش سے گذرنے لگی تو ان کے معشوق نے پہلے پوشیدہ طور سے پھر کھلے رنگ
بر اغیار کے گھر جانا شروع کیا ایسے معشوق سے اور کس چیز کی امید ہو سکتی تھی ایسا معشوق
ایسا نہیں کرتا تو کیا کرتا، بہرحال بے چارے شاعر صاحب نے اس ادارہ مزاج معشوق
کو بہت سمجھایا اپنے احسانات جتائے، ذکر احسانات میں یہ بھی فرمایا کہ تو فن معاشرت
سے بالکل بے بہرہ تھا، تجھ کو لباس پہننا نہیں آتا تھا، جوتی کنگھی کے طریقہ سے تو
کچھ بھی واقف نہ تھا۔ تجھے مسی لگانا نہیں آتی تھی گفتگو کا طریقہ تجھے کچھ نہیں معلوم
تھا، یہ سب کمالات تجھ میں میری بدولت پیدا ہوئے جب تو سب کچھ مجھ سے سیکھ
چکا تو اب میرے پاس نہیں رہتا ہے۔ دس دس روز دن تک غیروں پر پڑا رہتا ہے خیر

شاگرد احسان فراموش کب اُستاد کی سنتا ہے بیچارے شاعر کی فہمائشیں کچھ کارگر نہیں ہوئیں اور وہ آوارہ مزاج معشوق مبتلائے بدحالی رہا۔ تب شاعر صاحب نے ایک اور معشوق پیدا کیا جس کے ساتھ شب و روز صحبت گرم رکھنے لگے، پھر حضرت نے معشوق سابق کو اپنے اس نئے معشوق کی خبر کی اور اس کے کمالات صوری و معنوی اس پہلے معشوق سابق پر ایک بیان طولانی کے ساتھ ظاہر کیے اس سے معشوق سابق کے دل میں رقابت کی آگ جو اٹھی، دوڑ کر شاعر صاحب کے گلے لگ گیا اور پوچھنے لگا کہ واقعی تم نے کوئی نیا معشوق پیدا کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ اب تم سے میں انحراف ورزی نہ کروں گا جب وہ قسم کھا چکا تو شاعر صاحب نے بھی قسم کھائی کہ صرف تجھ کو چھیڑنے کے لیے نئے معشوق کا قصہ گڑھا تھا اس روز سے معشوق سابق کے ساتھ شاعر کی پھر عیش سے گزرنے لگی ؛؛

حضرات اہل مذاق میری اس سمع خراشی کو معاف فرمائیں، ظاہر ہے کہ سارا قصہ بالا طومار خرافات ہے اس کے جتنے مضامین ہیں غیر فطری مہمل اور ناپاک ہیں اگر اسی کا نام واسوخت نگاری ہے تو ایسی شاعری پر سو سو نفرین، حضرات شاعری کوئی بیکار شئے نہیں ہے اس سے دنیا اور دین دونوں کو نفع پہنچ سکتا ہے یہ کون سی شاعری ہے۔ جس سے نہ دنیا کا فائدہ حاصل ہو اور نہ دین، کیا یہ شاعری کیا ہے یہ تو اوباشی کا ہدایت نامہ ہے اوباش سے اوباش شخص اس سے اور زیادہ کیا کر سکتا ہے۔ تعجب ہے، اُن اشخاص سے جو ایسے واسوخت ذوق شوق سے پڑھتے ہیں اور ایسی ہذیانی سرلیوں کو شاعری سمجھتے ہیں جب خدائے تعالیٰ کسی قوم پر ادبار نازل کرتا ہے تو پہلے اس کے اخلاقی انداز خراب ہو جاتے ہیں ایسی شاعریاں معاذ اللہ قوم کے کس درجہ ابتذال سے خبر دیتی ہیں رحم یا ارحم الراحمین اگر کاش صحت مذاق کے ساتھ کوئی واسوخت

لکھا گیا ہوتا تو اردو میں عاشقانہ شاعری کا عجیب تماشا نظر آتا، چونکہ غزل کے اعتبار سے واسوخت کا دائرہ وسیع تر ہے اس میں جذباتی مضامین زیادہ گنجائش کے ساتھ جگہ پا سکتے ہیں اگر شعرائے حال غیر فطری مہمل اور ناپاک مضامین سے بچ کر واسوخت نگاری مذاق صحیح کے ساتھ فرمائیں تو اردو کی شاعری کی بڑی ترقی متصور ہے یہ میدان عزات شعرائے باکمال کی توجہ کے قابل ہے داخلی (SUBJECTIVE) شاعری غزل سرائی کے اعتبار سے واسوخت نگاری کے طریقہ پر زیادہ وسعت کے ساتھ برتی جا سکتی ہے۔

نمبر ۲ مسدس حکمت آموز

اس عروضی ترکیب کے ساتھ دو تصنیفیں بہت قابل توجہ ہیں ایک تو مسدس کریما اور دوسرا حالی۔ کریما برائے خود شیخ سعدی کی ایک لاجواب تصنیف ہے اس کے اشعار کی تضمین جو نظیر اکبرآبادی سے ہے مضامین کے اعتبار سے اچھی ہے۔ اچھے شعر کا یہی تقاضا ہے کہ اس کی تضمین بھی اچھی ہو:

راقم الحروف کی دانست میں ہر شخص کو چاہیئے کہ ایک بار نظیر کے اس مسدس کو پڑھ لے اور لڑکوں کو ضرور پڑھائے۔ کریما کے پہلے شعر کی تضمین جو اس فطری شاعر کے افکار سے ہے درج ذیل ہوتی ہے :

صدا دل سے اے مومن پاکباز وضو کر کے پڑھ پنج وقتی نماز
بوقت مناجات با صد نیاز تو کہ اپنے ہاتھوں کو کر کے دراز
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

جس وقت میں تضمین بالا کو پڑھتا ہوں تو مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب مسلمانوں میں نماز

ایک ضروری فرض خداوندی سمجھی جاتی تھی اور بے نماز کو پیران اسلام گمراہ اور قابل احتراز سمجھتے تھے اور اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ نماز گزار ذلیل اور بے وقوف سمجھا جاتا ہے یورپین تعلیم کا یہی تقاضا ہے کہ نماز روزہ حج خمس اور زکوٰۃ کو نئی روشنی والے لایعنی فعل سمجھتے ہیں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لیے کہ یورپین تعلیم کا وہی اثر یورپین عیسائیوں پر ہوتا ہے جو مسلمانوں پر ہوتا ہے یعنی یورپین عیسائیت بھی اسی قدر ضعیف ہو جاتی ہے جیسا کہ یورپین تعلیم سے مسلمانوں کے اسلام میں ضعف آ جاتا ہے میں اس جگہ مسلمانان ہند کی نسبت عرض کر رہا ہوں ترک و ایران کے مسلمان یورپین تعلیم پا کر کیا ہو جاتے ہیں مجھے اس کی خبر نہیں ہے یورپین تعلیم کے سلمان سو میں ایک ہی دو ایسے نظر آتے ہیں جو پنج وقتی نماز کے پابند ہیں، ورنہ پنج وقتی نماز تو درکنار عید کے نمازی بھی ایسے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں قریب قریب ندارد ہیں، یورپین تعلیم جو عیسائی اور مسلمانوں دونوں کو اپنے اپنے مذہب میں ضعیف کر دیتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تعلیم خس برابر بھی روحانی انداز نہیں رکھتی ہے یہ تعلیم سراسر مادیات سے تعلق رکھتی ہے اس تعلیم کو معاد سے کوئی بحث ہی نہیں ہے۔ اس تعلیم کی غرض معاش ہی معاش ہے تعجب ہے کہ اس نقصان عظیم پر بھی یہ تعلیم بنی آدم کے لیے مفید سمجھی جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابنائے زمانہ کے نزدیک انسان بے روح بنا ہے اور جب بے روح اس کی خلقت واقع ہوئی ہے تو اس کو روحانی تعلیم کی کیا حاجت ہے میری دانست میں تمام یورپ کی حالت قابل گریہ ہے کہاں ہیں حضرت مسیحؑ، اپنی دنیا طلب امت پر نوحہ کیوں نہیں فرماتے، کہاں ان جنابؑ کی روحانی تعلیمات اور کہاں آپ کی امت کے تعلقات مادی مصرع " بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا "۔ اے نوجوان مسلمانو تم بالیقین جا گو کہ تمہاری تعلیم کی غایت میز کرسی چھری کانٹا کوٹ پتلون نہیں ہے افسوس ہے کہ تم

اپنے روحانی معاملات سے غافل بیٹھے ہو، تم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ تم کو دنیا اور دین دونوں سے یکساں تعلق ہے، صرف دنیا کے ہو رہنا بڑے خسارے کی بات ہے۔ فرائض خداوندی کی پابندی ایک ضروری امر ہے مرد آخر بین مبارک بندہ است۔

دوسرا حکمت آموز مسدس شمس العلماء مولانا حالی مدظلہ' کا ہے یہ مسدس مسلمانوں کے سابق اور موجودہ حالات کی تصویر ہے اور غرض اس تصنیف کی یہ ہے کہ مسلمانان حال جو مبتلائے بدحالی ہیں ترقیوں کی راہیں اختیار کریں جس سے دنیا کی سرابر آوردہ قوموں کی طرح ان کو بھی خوش حالی نصیب ہو، مسدس نامطبوع رنگینیوں سے تمامتر پاک ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ مولانا حالی کے سوا کوئی شاعر ایسا مسدس لکھ بھی نہیں سکتا تھا ایسے مسدس کے لکھنے کے واسطے شاعر کو تاریخی معاملات سے پورے طور پر باخبر ہونا ضروری ہے علاوہ اس کے اس کو مبالغہ تشبیہ استعارہ وغیرہ کی طرف فطری طور پر کم میلان ہونا چاہیئے، واقعی یہ مسدس "ایک ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن" ہے اور ایسا ہی ہے کہ ہر گھی پر بانی اور مرغ مسلّم پکانے والے طعام پز سے پک نہیں سکتا، میں اطمینان کے ساتھ عرض کر سکتا ہوں کہ میر مومن غالب آتش اور دیگر رنگین طبع شعرائے ہرگز ایسی مسدس نگاری پر قادر نہیں ہو سکتے تھے ان کی اعلیٰ رنگین مزاجی ایسی سادہ تصنیف پر ان کو نہیں قادر ہونے دے سکتی تھی حقیقت یہ ہے کہ ہر کار سے و ہر مردے اسی طرح مولانا حالی اگر اساتذہ بالا کے مقابلہ میں غزل سرائی کے میدان میں گوے سبقت لے جانا چاہتے تو ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ جیسا کہ میرے اس بیان کی تائید خود مولانا کا دیوان کرتا ہے۔

ذیل میں کچھ بند مسدس حالی کے نذر ناظرین ہوتے ہیں

بیان ملک عرب و بعثت آں صلعم

عرب جس کا مذکور ہے یہ وہ کیا تھا — جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند اس کا جدا تھا — نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا

تمدن کا آس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

نہ آب و ہوا ایسی تھی روح پرور — کہ قابل ہی پیدا ہوں خود جس سے جوہر
نہ کچھ ایسے ساماں تھے واں میسر — کنول جس سے کھل جائیں دل کے سراسر

نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی
بدقت بسر ہوتی تھی زندگانی

زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں — لوؤں کی لپٹ باد صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیاباں — کھجوروں کے جھنڈ اور خار مغیلاں

نہ صحرا میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کل کائنات اس کی یہ تھی

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی — نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبع بشر تھی — خدا کی زمیں بن جتی سر بسر تھی

پہاڑ اور صحرا میں ڈیرا تھا سب کا
تلے آسمان کے بسیرا تھا سب کا

کہیں آگ پجتی تھی واں بے محابا — کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا

بہت سے تھے تثلیث پر دل سے شیدا — بتوں کا عمل سو بسو جا بجا تھا
کرشموں کا راہب کے تھا صید کوئی
طلسموں میں کاہن کے تھا قید کوئی

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا — خلیلؑ ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا — کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدیٰ کا
وہ تیرتھ تھا اک بُت پرستوں کا گویا
جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا

قبیلہ قبیلہ کا بت اک جدا تھا — کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزّیٰ پہ وہ نائلہ پر فدا تھا — اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہرِ انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ — ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ — نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک ایسے

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے — سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے — تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی　　صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی　　تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا　　کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا　　کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یوں ہی روز ہوتی تھی تکرار اُن میں
یوں ہی چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر　　تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور　　کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اُس کو جا کر

وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جُوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی　　شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا غفلت تھی دیوانگی تھی　　غرض ہر طرح ان کی حالت بری تھی

بہت اس طرح گزری تھیں ان کو صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت　　بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت　　چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا

دعائے خلیلؑ و نوید مسیحاؑ

ہوئے محو عالم سے آثار ظلمت　　کہ طالع ہوا ماہِ برج سعادت
نہ چھلکی مگر چاندنی ایک مدت　　کہ تھا ابر میں ماہتاب رسالت
یہ چالیسویں سال لطف خدا سے
کیا چاند نے کھیت غار حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا　　اللھم صل علی محمد و آل محمد

نمبر ۳ ۔ مراثی

اس زمانہ میں مراثی بشکل مسدس لکھے جاتے ہیں۔ میر ضمیر مرحوم کے عہد کے پہلے اس کی عروضی ترکیب مربع اور مخمس کی ہوا کرتی تھی۔ جاننا چاہئے کہ عہد میر انیس سے اردو میں مرثیہ نگاری شاعری کی دشوار ترین صنعت شاعری ہوگئی ہے اور اس کا درجہ اس قدر رفیع ہوگیا ہے کہ اس کے ذکر کے ساتھ ہومر و رجل ملٹن و المکی بیاس اور فردوسی کی رزمی تصنیفات کا ذکر اتفاقاً نہایت قرین محل دکھلائی دیتا ہے فارسی میں یہ صنف شاعری

کی گویا نداردہے، اہل ایران کی مرثیہ نگاری اُردو کی مرثیہ نگاری کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے میر انیس کے مراثی معاملات محمد آل محمد سے تعلق رکھتے ہیں، ان معاملات کو مذہبی حیثیت کے ساتھ تاریخی حیثیت بھی حاصل ہے مصائب کشی کی بنیاد پر ممتاز ترین ان معاملات سے واقعہ کربلا ہے اس واقعہ کے سمجھنے کے لیے اسلام کے تاریخی معاملات تمدن و مذہب سے پوری واقفیت کا حاصل رہنا ایک امر ضروری ہے مگر یہاں ایسے معاملات کے درج کرنے کی گنجائش نہیں ہے پس جن حضرات کو اس واقعہ عظیمہ کے اسباب ماتیعلق پر نظر ڈالنا منظور ہو تو فقیر کی کتاب معروف بہ نذر آل محمد کو ملاحظہ فرمائیں۔

میر انیس صاحب کی شاعری

میر انیس صاحب ہندوستان کے اردو بولنے والے حصوں میں مرثیہ نگاری کی شہرت رکھتے ہیں، جاننا چاہیئے کہ میر صاحب کی مرثیہ نگاری ایک رزمی مرثیہ نگاری ہے یہ اس لیئے کہ واقعہ کربلا کی مرثیہ نگاری رزمی شاعری کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے پس حضرت کی شاعری کا شمار ہومر و رجل ملٹن فردوسی اور بیاس کی شاعروں کے ساتھ ایک ضروری امر ہے جس طرح یہ سب شعرائے نامی رزمی مضامین حوالہ قلم کرتے گئے ہیں میر صاحب بھی اسی طرح رزمی مضامین کو تقاضائے واقعہ کے باعث اپنے مراثی میں کثرت کے ساتھ جگہ دیتے گئے ہیں ایسی حالت میں میر صاحب کو شعرائے مسبوق الذکر کی طرح رزمی شاعر کہنا بے محل نہ ہوگا واضح ہو کہ انگریزی میں رزمی شاعری کو ایپک پوئٹری (EPIC POETRY) اور رزمی شاعر کو ایپک پوئیٹ (EPIC POET) کہتے ہیں پس میر صاحب اصطلاح انگریزی کے مطابق ایک ایپک پوئیٹ تھے مگر کس درجہ کے ایپک پوئٹ تھے اس کی حقیقت راقم کی آئندہ

کی تحریروں سے منکشف ہوگی ۔

راقم اس وقت تک صرف ہومر، ورجل اور فردوسی کی رزمی شاعریوں پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہے۔ ملٹن والمکی اور بیاس کی رزمی شاعریوں پر اسے رائے زنی کا ابھی تک موقع نہیں ملا ہے اگر حیات نے وفا کی ان شعرائے نامی کے کلام پر بھی انشاء اللہ تعالیٰ ریویو کی نوبت آہی جائے گی بہرحال ان تینوں شعرائے نامی یعنی ہومر، ورجل اور فردوسی میں صرف ابوالشعرا ہومر ہی ہے جس کے ساتھ میر صاحب کا موازنہ صورت رکھتا ہے ورنہ ورجل جو ہومر کا متبع ہے میر صاحب کا ہرگز ہم پایہ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے اور نہ اس ہم پائگی کا استحقاق فردوسی کو حاصل ہے میر صاحب کو فردوسی ہند کہنا بیشک میر صاحب کی ایک بڑی ناقدر شناسی ہے حضرات ناظرین راقم کے اس ریویو پر نظر غور ڈالیں جسے اس نے کتاب شاہنامہ پر سابق میں لکھا ہے تب طالبان تحقیق پر روشن ہو جائے گا کہ فردوسی میں اور میر صاحب میں کیا فرق حائل ہے۔ میری دانست میں ہومر ایک بڑا رزمی شاعر تھا لیکن اگر ہومر سیر تھا تو میر صاحب سوا سیر تھے اس افزونی کی وجہ یا یہ تھی کہ میر صاحب خود نفس فن شاعری میں ہومر سے زیادہ تھے یا یہ کہ میر صاحب کو سبجکٹ (SUBJECT) یعنی شاعری کا موضوع ایک ایسا واقعہ بزرگ ہاتھ لگا ہے جس کا جواب دنیا میں نظر نہیں آتا ہے اس واقعۂ عظیمہ کے ساتھ واقعہ ٹرائی کو کوئی نسبت نہیں ہے شاہزادہ ٹرائی کا قصہ ایک ناپاک قصہ ہے اور ہر گونہ قابل نفرین ہے یہ ہومر ہی کی قابلیت شاعری تھی جس نے اُسے قابل توجہ بنا دیا ہے ورنہ شاہزادہ ٹرائی کے قصہ میں کوئی ایسی عظمت کی بات نہیں پائی جاتی ہے جس کی طرف اہل مذاق کو کسی طرح کی رغبت خاص پیدا ہو سکے۔ برخلاف اس کے

کربلا کا معاملہ ہے کہ نہایت اعلیٰ درجہ کے امور دین اخلاق اور تدبیر المنزل اور امور سیاست مدن وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ایسے معاملات کی طرف توجہ کرنا ہر دانشمند اور ہر ذی علم ہر حکیم اور فلسفی کا کام ہے۔ یہ واقعہ معاملات عالم کی تمام خوبیوں کا خلاصہ ہے پس کچھ تعجب نہیں اگر میر صاحب کی شاعری کو اس طرح کے ارفع مضامین نے ایک بیقیاس مدد دی ہے جس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک عمدہ سبجکٹ کے دستیاب ہونے سے میر صاحب ہومر سے سوا سیر معلوم ہوتے ہیں لاریب یہ امر میر صاحب کے مرجح سمجھے جانے کا ایک بڑا سبب دکھائی دیتا ہے مگر نفس شاعری کے اعتبار سے بھی راقم کی دانست میں میر صاحب کی کیریکٹر نگاری ہومر کی کیریکٹر نگاری سے بڑھی معلوم ہوتی ہے اگر رائے راقم کی صحیح ہے تو ایسی صورت میں شاعر ہونے کی حیثیت سے میر انیس صاحب ہومر پر فوقیت رکھتے ہیں میر صاحب کی کیریکٹر نگاری کی بحث آئندہ آنے کو ہے ؎

میر انیس کے معاملات شاعری واقعہ کربلا ہر پہلو سے ایک اہم امر دکھائی دیتا ہے جس کو اپنا سبجکٹ بنانے کے لیے لاریب میر انیس صاحب شائستہ ترین شخص نظر آتے ہیں کوئی شک نہیں کہ میر صاحب نے رزمی شاعری کا خاتمہ کر دیا ہے میر صاحب کے مراثی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ایک فطری امر ہے زنہار کسبی نہیں ہے اگر کسبی ہوتا تو ہر شخص جو پڑھا لکھا ہے۔ میر صاحب کا کمال پیدا کر لیتا۔ بلا شبہ و شک میر صاحب وہ الہامی شاعر گرامی ہیں کہ تائید غیبی کے بغیر میر صاحب کا کمال کوئی بنی آدم پیدا نہیں کر سکتا ہے یہ امر راقم کے داخل عقیدہ ہے کہ شعراء خدا کے شاگرد ہوتے ہیں اور جو اُن میں زیادہ صلاحیت شاعری کی رکھتا ہے اس کے ساتھ زیادہ تائید غیبی شامل حال ہوتی ہے۔ ہر ملک میں شعرا مورد الہام ہوا کرتے ہیں شکسپیئر کی روح جو ارواح خوانی کے ذریعہ سے طلب کی گئی تو متشکل ہو کر اس نے

بیان کیا کہ فلاں فلاں ([illegible]) ہم نے محض الہامی طور پر حوالۂ قلم کئے ہیں ان پلے
کی تحریر کے وقت مجھے کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں البتہ مجھے ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ تائید غیبی میرا ساتھ دے رہی ہے اور میں لکھ رہا ہوں مگر کیا لکھ رہا ہوں اس کو
سمجھ نہیں سکتا تھا میرے خیال میں میر صاحب کا بھی حال وم مرثیہ نگاری ایسا ہی ہوتا ہوگا
کہ تائید غیبی جنبش قلم میں پیدا کرتی ہوگی اور میر صاحب بند پر بند لکھے جاتے ہوں گے، جو
حضرات تائید غیبی کے قائل نہیں ہیں لازم ہے کہ ارواح خوانی کا فن سیکھیں، میں بھی
ایک زمانہ میں الہام و تائید غیبی دعوت ارواح و استمداد ہمت سے انکار رکھتا تھا مگر
الحمد للہ کہ پہلے کے وہ سب ملحدانہ خیالات ائمہ معصومین کی روحانی تعلیمات کی بدولت
رفع دفع ہو گئے اب میں بدیہیات کی طرح مانتا ہوں کہ ائمہ معصومین اپنے غلاموں کی ہر طرح
پر تائید کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، میں اب شیخ نجدی کے اس خیال کا ہرگز شریک نہیں ہوں
جس کو اس نے اپنی غایت شامت سے قبر رسالتمآب پر ظاہر کیا تھا اہل اطلاع سے
پوشیدہ نہیں ہے کہ جب یہ ننگ حوصلہ ظاہر بین خود پرست قبر شاہنشاہ کونین پر گیا تو
اس نے نہایت بے ادبانہ انداز سے قبر پاک کی طرف رخ کر کے یہ کہا کہ "اے وہ شخص
جو اس میں مدفون ہے اس وقت تجھ سے میرا عصا بہتر ہے" اس راندۂ درگاہ کو نہیں معلوم ہو
سکا کہ انبیاء و اوصیا بعد وفات بھی احیاء کا حکم رکھتے ہیں اس کمبخت نجدی کے دماغ میں
یہ بات پوشیدہ تھی کہ سرور کائنات جب نعمت حیات فرما چکے تو خاک ہو گئے پس خاک ہو
کر اس جناب میں کیا باقی رہ گیا، پس آنحضرت سے اس شامتی نجدی کا عصا ضرور بہتر ہوگا معلوم
ہوتا ہے کہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب نے ایسے ہی نجدیوں میں تعلیم پائی ہے
جو رسول و آل رسول کے مقابلہ میں ایسی بے ادبیوں سے پیش آتے ہیں لاحول

ختم لاحول : یہ بات کوئی تعجب کی نہیں ہے جب میں بھی شیخ نجدی کے پیروان میں تھا، تو اسی طرح کی شرارت کی باتیں کیا کرتا تھا۔ خیر جاننا چاہیئے کہ شعراء کو تائید غیبی ضرور شامل حال ہوا کرتی ہے۔ میر انیس صاحب کا مؤید من اللہ ہونا ایک امر یقینی ہے اگر بلا تائید غیبی کوئی شخص میر صاحب کے برابر کا شاعر ہونا چاہیئے تو کوشاں ہو کر دیکھ لے میر صاحب کے کلام میں اس قدر خوبیاں ہیں کہ خود میر صاحب اپنے کلام کی تصنیف کے وقت اُن سے خبر نہیں ہوتے ہوں گے بعد تصنیف جب اپنے کلام معجز نظام پر نظر ڈالتے ہوں گے تو اس پر بھی بہت سی خوبیاں ان کے کلام کی ان سے مخفی رہ جاتی ہوں گی، الہامی کلام کا یہی حال ہوتا ہے کہ وقت تصنیف کہنے والا اُن کی تمام خوبیوں پر اطلاع نہیں پاتا ہے بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہنے والے کو تمام عمر اپنے کلام کی بہت سی خوبیوں سے بے خبری رہ جاتی ہے میں مثلاً ایک شعر میر صاحب کا اس موقع پر درج کرتا ہوں جس کی نسبت میرا گمان یہی ہے کہ میر صاحب خود اس کی تمام خوبیوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے وہ شعر یہ ہے ؎

طائر ہوا میں محو ہرن سبزہ زار میں ۔۔۔ جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہ شعر مضامین صبح سے تعلق رکھتا ہے مگر اس شعر سے وہی شخص حسب مراد متلذذ ہو سکتا ہے جو علم حیوانات سے باخبر ہے علم حیوانات سے مراد وہ علم ہے جس کو انگریزی میں (ZOOLOGY) کہتے ہیں اس علم کی دلالت سے انسان تمام حیوانات روئے زمین کی سچی کیفیتوں سے بحد طاقت بشریہ اطلاع پا سکتا ہے یہ علم کوئی ظنی یا خیالی نہیں ہے اس علم کی بنا تحقیق پر واقع ہوئی ہے اس لیے کہ اس کے مسائل تصفح اور استقرا کے ذریعہ سے تتبع پاتے گئے ہیں اور اس بنا پر یہ علم تمامتر علم کا حکم رکھتا ہے یہ علم مسلمانان

ہند سے بالکل جا تا رہا ہے، اس وقت اس علم کی کوئی حسبِ مراد کتاب عربی فارسی یا اُردو میں نہیں دکھائی دیتی ہے۔ عربی میں علامہ فخر الدین رازی کی کتاب موالید ثلثہ ہے جس میں علم حیوانات سے علامہ موصوف نے بحث کی ہے مگر وہ ایک ناکافی ہی تصنیف ہے اور اس عہد کے لیے کوئی بھاری سرمایہ تحقیق نہیں ہے، بلاشبہ حضرات علمائے ہند تمامتر اس علم سے ورہی صرف دور ہی نہیں ہیں بلکہ اس علم کو چنداں قابل توجہ نہیں سمجھتے ہیں صرف وہی اشخاص ہندی اس علم سے مناسبت رکھتے ہیں جنھوں نے ہندوستان یا انگلستان میں انگریزی یا اورکسی یورپین زبان کے ذریعہ سے اس علم کی تحصیل کی ہے اُردو میں جو کتاب عجائب المخلوقات دیکھی جاتی ہے وہ ایک لغو کتاب ہے اور علم حیوانات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ہے۔ خیر میر صاحب کے شعر بالا سے وہی شخص لذت یاب ہو سکتا ہے جس کو علمِ حیوانات سے بہرہ حاصل ہے۔ جاننا چاہیئے کہ صبح کے وقت طیور کو ہوا کے ساتھ محبوبت رہتی ہے، یہ محبوبت طیور کو ہوا کے ساتھ دوپہر یا شام کو نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صبح کو طیور کو اس کی حاجت نہیں ہوتی ہے کہ قبل اس کے کہ وہ تلاش رزق میں اُوڑیں اپنے بازوؤں کو پرواز کے قابل بنالیں شب بھر بیکار رہنے سے اُن کے بازو مشق تازہ کے محتاج ہو جاتے ہیں اس لیے کچھ طیور تو آسمان میں گھنٹے آدھے گھنٹے تک اِدھر اُدھر پَر مارتے پھرتے ہیں اور کچھ جنگلوں اور باغوں میں ورزش کی ترکیب سے جھاڑی جھاڑی اور درخت درخت اُڑتے پھرتے ہیں اس ریاضت کی محتاجی تمام ایسے طیور کو ہوتی ہے جن کو اپنی پرواز کے ذریعہ سے دن بھر سامان رزق بہم کرنا ہوتا ہے زیادہ طیور ایسے بھی دیکھے جاتے ہیں جن کی رزق یابی کا مدار ان کی پرواز ہے لہٰذا صبح کو طیور کا محو ہوا ہونا ایک فطری امر ہے اور کس قدر تحقیقات

علم حیوانات قرین ہے، ہرن کو صبح کے وقت سبزہ زار کے ساتھ محویت کی وجہ یہ ہوتی ہے
کہ جس قسم کے ہرن کو صبح کے وقت سبزہ زار کے ساتھ محویت ہوتی ہے بیشتر سبزہ
زار ہی میں رہتی ہے جنگلوں میں نہیں رہتی، چونکہ اس قسم کے ہرن شب کو چری نہیں کرتے ہیں
اور چری کے عوض شب بھر جگالی کیا کرتے ہیں، صبح ہوتے نہایت بھوکے ہو جاتے ہیں پس
صبح کے ہوتے چری میں مشغول ہو جاتے ہیں چونکہ صبح کو انھیں بھوک کی شدت پیدا ہو
ہو جاتی ہے، بھوک اُن کو سبزہ زار کے ساتھ محویت پیدا کر دیتی ہے یہ ہرن اقسام غزال
سے ہوتے ہیں ان کے نر کے صرف دو شاخیں خم بخم سر پر ہوتی ہیں اور بیشتر یہ ہرن صحرا
پسند ہوتے ہیں اور قسمیں ہرن کی یا پہاڑوں میں رہتی ہیں یا جنگلوں میں صبح کے وقت یہ قسمیں سبزہ
زار کی طرف نہیں رخ کرتی ہیں اس لیئے کہ شب کو چری کر کے آسودہ رہتی ہیں برخلاف غزالوں
کے جو شب کو چری نہیں کرتے اور جن سے مراد شاعر شعر بالا میں ہے دوسرے مصرع میں
میر صاحب جنگل کے شیر کے ہو نکلنے کا ذکر فرماتے ہیں اور اس کے ہو نکلنے کی جگہ کو کچھار قرار
دیتے ہیں، سبحان اللہ سبحان اللہ کیا تناسب کلام ہے عالم علم حیوانات کے سوا کون
شخص ایسا پیرایہ بیان اختیار کر سکتا ہے، جائے لحاظ ہے کہ اس شاعر گرامی نے صرف
شیر کا مذکور نہیں فرمایا، بلکہ "جنگل کے شیر" کی قید لگا دی۔ جاننا چاہیئے کہ شیر دو قسم کے
ہوتے ہیں، ایک کا مسکن پہاڑ ہوتا ہے اور دوسرے کا جنگل، عادات و خو اس میں بھی یہ
دونوں قسم کے شیر موافقت نہیں رکھتے، مزاج بھی دونوں کے دو طرح کے ہوتے ہیں اور
معاشرت کے طور بھی دونوں کے جداگانہ دکھائی دیتے ہیں، پہاڑی شیر رات بھر تلاش
رزق میں اِدھر اُدھر پھر کر صبح کو پہاڑ کے کسی غار میں جو اس کا مسکن ہوتا ہے، جا چھپتا
ہے اور شام کے قریب تک سوتا رہتا ہے، پھر شام ہوتے تلاش رزق میں نکلتا ہے

یہ شیر کچھار سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا، مگر جو جنگل کا شیر ہوتا ہے وہ دن کچھار ہی میں بسر کرتا ہے اور صبح کو بیشتر ہونکا کرتا ہے، راقم نے دونوں طرح کے شیر دیکھے ہیں اور شکار بھی کیے ہیں، لاریب علم حیوانات کی اطلاع اور ذاتی معلومات کے حاصل رہنے سے میر صاحب کا یہ شعر ان کے پڑھنے والے کو عجب لطف کلام بخشتا ہے راقم کو اس کی اطلاع نہیں ہے کہ میر صاحب علم حیوانات سے واقفیت رکھتے ہیں یا نہیں زیادہ قرینہ اسی کا ہے کہ اس علم کے غیر مروج ہونے کے باعث حضرت کو اس کی تحصیل کا موقع نہیں ملا تھا، یہ بھی راقم کو نہیں معلوم ہے کہ حضرت سفر شکار اختیار فرمایا کرتے تھے یا نہیں زیادہ تر اسی کا قرینہ ہے کہ سیر و شکار کی طرف توجہ فرمانے کا کم موقع رکھتے تھے مگر علم حیوانات کی بڑی اطلاع سے جو یہ شعر خبر دیتا ہے اس کی تاویل اس کے سوا اور کیا کی جا سکتی ہے کہ میر صاحب کو الہامی طور پر ایسے ایسے مضامین دستیاب ہوا کرتے تھے

کیریکٹر نگاری کی بحث راقم نے شاہنامہ کے اگاؤ میں کی ہے فردوسی کی کیریکٹر نگاری کا نقص دکھایا جا چکا ہے اسی کے ساتھ ہومر کی کیریکٹر نگاری کی خوبیاں بھی نہ صرف شاہنامہ کے رگاؤ سے دکھلائی جا چکی ہیں بلکہ خود ہومر کی شاعری کے بیان میں حوالہ قلم ہو چکی ہیں لاریب ہومر کی کیریکٹر نگاری بہت اعلیٰ درجہ کی ہے اور ایسی ہی ہے کہ اس کی کیریکٹر نگاری کی بنیاد پر ڈراما جیسی صنف شاعری کا ایجاد ظہور میں آیا، اب ہم میر انیس صاحب کی کیریکٹر کی خوبیوں کو عرض کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خوبیاں دشوار پیرایہ رکھتی ہیں۔ اور میر صاحب کی بڑی قابلیت شاعری سے خبر دیتی ہیں۔ یوں تو میر صاحب کی کیریکٹر نگاری بھی ایجاد ڈراما کی باعث ہو سکتی تھی۔ اگر دنیا میں ڈراما کو وجود نہیں ہوا ہوتا۔ مگر میر صاحب کی کیریکٹر نگاری کی

بڑی دشواری یہ ہے کہ میر صاحب کو اپنی کیریکٹر نگاری میں معاملات روحانیہ کو
پیشِ نظر رکھنا پڑا ہے معاملات روحانیہ کا التزام کوئی آسان کام نہیں ہے میر صاحب کے کیریکٹر میں
(CHARACTER) وہ اشخاص گرامی ہیں جو واقعہ کربلا سے تعلق رکھتے ہیں شاہنامہ
اور ایلیڈ کے رستم و گیو یا کیرٹو اکلیز نہیں ہیں یہ وہ حضرات ہیں کہ امام من جانب اللہ اور
عزیزان و پیروان امام من جانب اللہ ہیں یہ سب کے سب ایسے ہیں جو دنیا کو ایک ذلیل
شئے جانتے اور حیات و ثروت دنیا کو خس برابر بھی نہیں سمجھتے ہیں ان کے دل توحید و عدل و
معرفت کے انوار سے روشن ہیں اور کفر و ظلم و حرص و ہوا کی ظلمتوں سے تمام تر پاک ہیں۔ یہ
سب کے سب ایسے ہی ابرار ہیں کہ معاد و آخرت کے خیالات کے سوا کوئی اس دنیا کا خیال
ان کا مرکوز خاطر نہیں ہو سکتا، تمام صفات روحانیہ سے متصف ہیں اور ایسے ہی ہیں کہ اپنے
کمالات باطنی کے ذریعہ سے فعلاً و قولاً دین محمدی کو حق ثابت کرسکتے ہیں ملٹن کی رزمی
تصنیف جو پیراڈائز لاسٹ کے نام سے مشہور ہے ہر چند معاملات عالم بالا سے سراسر تعلق
رکھتی ہے مگر روحانی لغزشوں سے خالی نہیں ہے ملٹن تصنیف نامی میں دکھلایا ہے
کہ خدائے تعالیٰ سے شیطان نے کس طرح بغاوت کی اور اس نافرمانی سے کس طرح وہ لعین
قعر دوزخ میں ڈالا گیا پھر اپنی فدیات کو لے کر اس عاقبت برباد نے کیونکر خدائے تعا
کے لشکر ملائکہ سے مقابلہ کیا اور کس طرح بر لشکر خدا کو اس نے شکست دی مگر میری دانست
میں یہ شاعر نامی اپنی تصنیف گرامی میں شان خداوندی کو اس شکست کے بعد قائم نہیں رکھ
سکا ہے ملٹن لکھتے ہیں کہ شیطان نے زمین کے اندر بیٹھ کر لوہے نکالے اور توپیں ڈھالیں
اور بارود نت ترکیب دی جب لشکر ملائکہ سے صف آرائی ہوئی تو اس نے جبرئیل و میکائیل
و دیگر ملائکہ پر ایسی گولہ باری کی کہ سارے ملائکہ سخت زخمی ہوتے گئے اور لوگوں کے

صدمے سے یہ کیفیت گزری کہ غیر مقرب ملائکہ مقرب ملائکہ پر چوٹ کھا کھا کر گرے المختصر لشکر ملائکہ کو سخت ہزیمت نصیب ہوئی، جب اس شکست کی خبر خدائے تعالیٰ کو ہوئی تو خدائے تعالیٰ کو سخت تشویش دامنگیر ہوئی۔ جناب باری کو اس کا یقین ہوگیا کہ شیطان اس ذات پاک اور جمیع ملائکہ کو آسمانی مقامات سے نکال پھینکے گا' اس حالت بیچارگی میں خدائے تعالیٰ کو چین نہیں آتا تھا حضرت جل شانہ کو شیطان کے غضب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں سوجھی تھی بالآخر حالت پریشانی میں خدا صاحب اپنے اکلوتے بیٹے حضرت مسیح کے پاس تشریف لے گئے اور خدا زادے سے شکست فوج ملائکہ اور اپنی بے بسی کا معاملہ کہہ سنایا خدا زادے نے اپنے پدر محترم کی پریشانیوں کے حالات سن کر نہایت تشفی بخش کلمات فرمائے جس سے فی الجملہ خدا صاحب کو تسکین کی صورت پیدا ہوگئی اس کے بعد خدا زادے ایک تخت نور پر سوار ہو کر شیطان کے مقابلہ کو تشریف لے گئے اور شیطان کو شکست فاش دی۔ مصرع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند ؛ واضح ہو کہ ہر چند پیر یڈ ائز لاسٹ ایک ایسی تصنیف ہے جس کو تمامتر روحانیت سے تعلق ہے مگر بظاہر اس کتاب کے بعض معاملات روحانیہ کچھ ایسی بدترکیبی سے حوالہ قلم ہوئے ہیں کہ دل میں عظمت پیدا کرنے کے عوض طبیعت کو ان سے تنفر پیدا ہو آتا ہے۔ لاریب ملٹن کے بیانات بالا نہ صرف عزت و جبروت خداوندی کے کم کر دینے والے نظر آتے ہیں بلکہ اپنے ابتدائی انداز سے بیحد حقیر اور مضحک بھی دکھائی دیتے ہیں برخلاف اس کے میر صاحب کے بیانات ہیں ن سے خدائے تعالیٰ کی تمجید و تقدیس کی ایسی شکل قائم ہوتی ہے کہ شان کبریائی پیش نظر ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ رزمی شاعری جن جن زبانوں میں دیکھی جاتی ہے نہ صرف تمام دنیا میں انہیں بلند پایگی حاصل رہی ہے بلکہ قومی اعتبار سے ان زبانوں کے بولنے والوں کو بھی جاہت

اور ثروت حاصل رہی ہے، ہومر اہل یونان سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان یونانی ہے
ورجل اہل اطالیہ سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان لاطینی ہے ملٹن اہل انگلستان سے
تھا اور اس کی شاعری کی زبان انگریزی ہے فردوسی اہل عجم سے تھا اور اس کی شاعری کی
زبان فارسی ہے والمکی اہل ہند سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان سنسکرت ہے، ظاہر ہے
کہ یہ سب زبانیں پایۂ امتیاز رکھتی ہیں اور ان کے بولنے والے بھی قومی اعتبار سے اہل ثروت
سے شمار کیے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں مگر میر انیس صاحب نے بزمی شاعری کا جلوہ ایک ایسی
زبان میں دکھلایا ہے کہ نہ وہ زبان ابھی تک اعلیٰ درجہ کی سمجھی جاتی ہے اور نہ اس کے بولنے والے
کسی طرح کا دنیاوی امتیاز رکھتے ہیں ایسی حالت میں اگر میر انیس صاحب کے کمالات اہل دنیا
سے پوشیدہ رہ جائیں تو جائے تعجب نہیں ہے حقیقت حال یہ ہے کہ ابھی تک یورپ اور
امریکہ میر صاحب کے نام سے بھی واقف نہیں ۔ تعلیم یافتہ دنیا ابھی تک نہیں جانتی
ہے کہ بزمانۂ حال ہندوستان کی ایک ناپرساں اور مظلوم زبان میں ایک ایسے شاعر نے رزمی
شاعری کی اتنی برملی داد دی ہے کہ اگر ہومر اس وقت زندہ ہوتا تو اس ناپرساں شاعر کی طباعی
سے حیرت زدہ ہوتا، میر صاحب کو کم از کم عباس اعظم کے عہد میں پیدا ہونا اور فارسی زبان
میں اپنے کلام کا جلوہ دکھلانا تھا مگر ایسی مرضی الٰہی نہ تھی حیف صد حیف کہ میر صاحب نے
ایسے زمانہ میں نشوونما پکڑی جب مسلمانان ہند اخلاقی تمدنی اور تمام جہتوں سے انتہائی
ابتذال کو پہنچ چکے تھے لاریب یہ زمانہ میر صاحب کے ظہور کے لئے مناسب تھا۔
پس زبان اور قوم دونوں کی وجہوں سے میر صاحب کی طباعی کو دنیوی شہرت کے حاصل
کرنے کا موقع نہ مل سکا اب اس کی کم امید ہوتی ہے کہ میر صاحب کی شہرت اردو بولنے
والے صوبجات ہند سے باہر قدم رکھ سکے، اردو کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ سرکار انگلشیہ کی

مردود ہے اور اردو بولنے والے مسلمان ایسی پستی میں مبتلا ہیں کہ ممتاز اقوام دنیا سے ان کا کسی میں شمار نہیں ہے، اگر زبان کی حیثیت سے اردو کوئی ممتاز زبان ہوتی اور اس کے بولنے والے کسی طرح کا وقار دنیا میں رکھتے تو میر صاحب کی شہرت آپ ہی آپ تمام تعلیم یافتہ دنیا میں پھیل جاتی بحالت موجودہ باوجود حاصل رہنے ایک عدیم المثال قوت شاعری کے میر صاحب کی نسبت یہ ہرگز امید نہیں کی جا سکتی ہے کہ میر صاحب یورپ ایشیا اور امریکہ میں ہومر ورجل ملٹن فردوسی والمکی اور ویاس کی طرح ایک معروف رزمی شاعر مانے جائیں گے، کس قدر تعجب ہے کہ یورپ میں عمر خیام کے نام کے کلب قائم ہوتے گئے ہیں مگر ابھی تک کوئی انیس کلب قائم نہیں ہوا ہے اور نہ ایسے کلب کے قائم ہونے کی کوئی امید کی جا سکتی ہے، حالانکہ شاعری کے اعتبار سے میر صاحب عمر خیام سے کہیں ارفع درجہ کے شاعر ہیں، واقعی دنیا کے لئے یہ ایک ستم کی بات ہے کہ میر صاحب جیسا شاعر دنیا میں آیا اور دنیا اس سے بے خبر رہ گئی ہی کو افتاد زمانہ کہتے ہیں خیر اگر دنیا میر صاحب سے واقف نہ ہو سکی تو اس کا علاج ہی کیا ہے مگر زیادہ تر ستم کی یہ بات ہے کہ ہندوستان کے اردو بولنے والے صوبجات بھی میر صاحب کے کمالات سے حسب مراد طور پر اطلاع نہیں رکھتے ہیں پس ہندوستانیوں میں میر صاحب کی قدر شناسی کیونکر ہو سکتی ہے، مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ بھی شاعری کا مذاق صحیح بہت کم رکھتے ہیں کچھ مسلمانوں کو مذہبی اسباب میر صاحب کی شاعری کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے ہیں کچھ مسلمان حضرات مولویت کے تقاضا سے عموماً شاعری سے اجتناب رکھتے ہیں، غرض یہ کہ ہندوستان کے اردو بولنے والے صوبوں میں بھی میر صاحب قریب قریب ایک غیر معروف شخص ہو رہے ہیں۔ خدا بھلا کرے مولانا شبلی، مولانا اسشہری اور بعض دیگر اہل مذاق کا جو میر انیس

کو روشناس اہل ہند بنانے میں کوشاں ہوئے ہیں۔ کاش ایسے صاحبان علم وفضل اہل یورپ کو بھی میر صاحب کے کمالات سے باخبر کردینے میں سعی فرماتے۔ ایسی کارروائی سے نہ صرف اہل یورپ کی آنکھوں کے آگے ایک نیا اور بڑا میدان خیالات رفیع کا پیش ہوجاتا بلکہ خود اُردو بھی ایک غیر متوقع توقیر پیدا کرتی ؂

رزمی شاعری کی رفعت :-

اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ رزمی شاعری کا درجہ ہر زبان میں ارفع کھائی دیتا ہے۔ اس صنف شاعری کے برتنے میں شاعر کو داخلی (SUBJECTIVE) اور خارجی (OBJECTIVE) دونوں پہلو کے مضامین بندی پر یکساں حاصل رہنا چاہیئے جس شاعر کو ان دونوں پہلوؤں مضامین بندی پر اختیار حاصل نہیں ہے اس سے رزمی شاعری کا مرحلہ طے نہیں پاسکتا ہے۔ ہومر نے جہاں اندرونی معاملات کو حوالہ قلم کرتا ہے وہاں اندرونی معاملات کی تصویر پیش نظر کردیتا ہے اس کے بیان سے غضب، غصہ، رحم، محبت، عداوت، رشک وغیرہ وغیرہ جو اندرونی کیفیتیں ہیں سامع کی نظر میں متشکل ہوجاتی ہیں اسی طرح جب یہ شاعر نامی اشیائے خارجیہ کو زیب رقم کرتا ہے تو خارجی چیزیں تمام تر آنکھوں کے سامنے حاضر ہوجاتی ہیں اس کی صورت نگاری لڑائی کے میدانوں کو اور بہادران جنگ کی نبرد آزمائیوں کو فوٹو سے بھی زیادہ واضح طریقہ آنکھوں کے آگے قائم کردیتی ہے یہی حال میر انیس کی شاعری کا بھی ہے میر صاحب کے حسن بیان سے معاملات خواہ اندرونی ہوں خواہ بیرونی یکساں طور پر پیش نظر ہوجاتے ہیں اس کی توضیح آیندہ آئے گی، داخلی اور خارجی پہلوؤں پر قدرت رکھنے کے علاوہ رزمی شاعر کو ان دونوں پہلوؤں کی آمیزش پر بھی اختیار حاصل رہنا چاہیئے رزمی شاعر کو اس آمیزش کی اکثر حاجت ہوتی

ہے اس آمیزش کی صلاحیت حسب مراد طور پر نہیں حاصل رہنے سے شاعر کا کلام سیٹھا اور بدمزہ معلوم ہوتا ہے ہومر کو اس کی بڑی صلاحیت مودعہ تھی اور میر صاحب بھی اس کی بے حد قابلیت رکھتے تھے مثلاً ہر خیمہ گاہ کا مضمون خارجی پہلو کے سوا داخلی پہلو نہیں لکھ سکتا ہے اور جب کسی خیمہ گاہ کا بیان قابلیت کے ساتھ انجام پائے گا تو اُس خیمہ گاہ کا فوٹو پیش نظر ہو جائے گا مگر خیمہ گاہ امام حسین علیہ السلام کا بیان ایسا ہونا چاہیئے کہ مجرد ظاہری فوٹو کی کیفیت نہ پیدا کرے بلکہ ایسا ہو کہ رنج و ملال بے چارگی بےکسی مظلومیت وغیرہ کے داخلی پہلوؤں کو بھی لیے ہو جس سے امام حسینؓ کی خیمہ گاہ اور خیمہ گاہوں سے صرف ممیز نہ ہو سکے بلکہ دل پر حسب مراد حزن و نیت کا عالم بھی پیدا کر سکے

اب ہم ذیل میں کچھ خارجی اور کچھ داخلی مضامین کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ اس کتاب کے تنگ دائرہ میں تمام ایسے ایسے مضامین کو جگہ مل سکے جن کو میر صاحب حوالۂ قلم فرما گئے ہیں تاہم ذیل کی مثالوں سے کسی قدر اس کا اندازہ ہو سکے گا کہ آپ کو واہب العطایا نے کس درجہ کا شاعر بنایا تھا اور آپ کی قوتِ شاعری کیا عدیم المثال پیرایہ رکھتی ہے جو خارجی اور داخلی دونوں قسم کی مضمون بندی کا کمال یکساں طور پر دکھلاتی رہتی ہے ٭

خارجی مضامین کی مثالیں: پہلے راقم خارجی مضامین کی مثالیں پیش کرتا ہے

نمبر ۱:۔ شام سے عمر سعد کا کربلا میں آنا اور امام کے فوجی معاملات کا دریافت حال کرنا

آ پہنچا شام سے پسر سعد نحس و شوم — اس کثرتِ سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم
اکثر ہیں یکہ تاز جوانانِ شام و روم — جس کے جلو میں لاکھ سوار و پیادے ہیں ہجوم
بس کھل گیا نہ طور صفائی کا ہوئے گا

اب کل سے بندوبست لڑائی کا ہوئے گا

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوا نشاں   اُمڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بیکراں
موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں   لہراتے تھے ہوا سے علم مثل بادباں
ہلتا تھا دشت کیں دہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل   خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و بد شعار و دغا باز و پر دغل   شکلیں مہیب دیو سے تذابرُن پہ بل
بدخواہ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلوار کھینچے بڑھ کے چلے دو طرف سوار   غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
ڈنکے کی دمبدم تھی صدا آسماں کے پار   آگے بڑھے چلو یہ نقیبوں کی تھی پکار
گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زریں کمر جلو میں ہزاروں غلام تھے

اترا قریب خیمہ فرس سے وہ خیرہ سر   سر پہ لگایا دوڑ کے خادم نے چتر زر
پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر   بولا کسی سے پھر وہ سوئے نہر دیکھ کر
خیمہ ہے کس طرف کو خجستہ خصال کا
دریا پہ تو عمل نہیں زہرا کے لال کا

خولی نے تب کہا کہ ہماری طرف ہے نہر   آئے تھے یاں اتر نے خاطر امام دہر
فرماتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر   ہم نے اٹھا دیا انہیں لیکن بہ جبر و قہر

عباس مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو
شبیرؓ پھیر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

دھوپ میں ہے خیمۂ زنگاری حسینؓ — راحت نہ رات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین
پھروں علیؓ کی بیٹیاں روتی ہیں کر کے بین — آفت میں مبتلا ہے محمدؐ کا نور عین
بچوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے
خیمہ نہ سائے میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شقی کہ کتنی ہے فوج شہ امم — سنتے تھے واں سپاہ حسینی کی دھوم ہم
اس نے کہا حسینؓ کے یاور بہت ہیں کم — فاقوں کے مارے دم میں کسی کے نہیں ہے دم
ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گنا ہے اکاسی جوان ہیں

ہے اک علم یہ قلت لشکر کا ہے نشاں — یہ حال ہے لٹا ہوا جیسے ہو کارواں
اردو میں جنس غم کے سوا جنس ہے گراں — غلہ کی بھی کمی ہے کہ ہے قحط آب و ناں
اسوار بھی قلیل ہیں پیادے بھی تھوڑے ہیں
کل سترہ تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

بند ہائے بالا پر ریویو: بند ہائے بالا ارض کربلا میں عمر ابن سعد کی آمد کا سین پیش کرتے ہیں ابن سعد شام سے ایک لاکھ سوار لے کر میدان کربلا میں پہنچتا ہے اس کی فوج کے نشانات نمودار ہوتے ہیں اس کا لشکر عظیم پیکر ہے یا ظلم کا ایک موج زن سمندر جنگی باجے اس کے لشکر کے بادل کی طرح گرجتے ہیں اس کے لشکری رومی اور شامی ہیں یہ ایسے ہیں کہ نہ خدا سے ڈرتے ہیں اور نہ موت کی پروا کرتے ہیں اطوار ان کے نامحمود شکلیں ان کی مہیب اور قد ان کے

دلو کے سئے یہ سب کے سب خاندان پیمبر سے عداوت رکھنے والے ہیں جس وقت ابن سعد آ پہنچا اسلامی
کے باجے بجنے لگے، رئیسان شام گھوڑوں پر اس کے گرد و پیش تھے اور ہزاروں غلام زریں کمر جلو میں،
سبحان اللہ کیا سچی تصویر میر صاحب نے ایک ایشیائی میر لشکر کی کھینچی ہے خاص کر ایک ایسے میر لشکر
کی جو خلیفۂ وقت یعنی یزید کی طرف سے امام حسین کے انسداد اور مقابلہ کو بھیجا گیا ہے خیر اپنے خیمہ
کے قریب گھوڑے سے ابن سعد اترتا ہے حسب دستور خادم اس کے سر پر چتر زر لگاتا ہے چونکہ یہ
شخص میر لشکر ہے پہلے اپنی فوج کی طرف نظر کرتا ہے اس کے ساتھ ہی فرات کی طرف دیکھ کر کسی
سے پوچھتا ہے کہ امام حسین ؑ کا خیمہ کدھر ہے اور فرات پر تو ان کا کہیں قبضہ نہیں ہے یہاں میر صاحب
ایک ہوشیار جنرل کا فوٹو اپنے ناظرین مراثی کے سامنے پیش کرتے ہیں لاریب کیمپ پر پہنچ کر نپولین
اور ولینگٹن بھی غنیم کی نسبت اسی طرح پر دریافت حال کرتے ہوں گے جیسا کہ ابن سعد سے ظہور میں
آیا، المختصر حاضرین سے خولی نے فوراً ابن سعد کا اطمینان کر دیا کہ دریا لشکر یزید کے ہاتھ میں ہے
اس کے بعد اس نے خبر دی کہ امام علیہ السلام دریا کے کنارے اترا چاہتے تھے مگر اترنے نہیں پائے
اس پر عباس مستعد جنگ ہوئے مگر ان کے بھائی امام حسین انہیں سمجھا کر پھیر لے گئے اب خیمہ
امام حسین کا دھوپ میں استادہ ہے نہیں اور ان کے تمام لوگوں کو نہ دن کو راحت، اور نہ رات کو
چین نصیب ہے، ان کے بچوں کا پیاس سے برا حال ہے اُن کا خیمہ دھوپ میں ہے اور ان سے
دریا دور پر واقع ہے اس امر سے اطمینان پا کر کہ دریا امام حسین کے قبضہ میں نہیں ہے اب ابن سعد
لشکر امام علیہ السلام کا حال پوچھتا ہے کہ آپ کی فوج کتنی ہے شام میں تو فوج حسینی کی بڑی دھوم
سنتے ہیں، یہ سن کر خولی جواب میں کہتا ہے کہ امام علیہ السلام کے مددگار بہت تھوڑے ہیں وہ بھی
فاقوں سے تباہ حال ہو رہے ہیں نہ کچھ ایسی فوج ہے اور نہ کچھ ایسے نشان ہیں گنتی کے فقط کاسنی
جوان ہیں لشکر میں صرف ایک علم ہے جس سے مرید لب ہے کہ فوج کم ہے لشکر کا حال لے رہے

کارواں کا حال ہو رہا ہے کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں ہے سوا پیاسے بہت تھوڑے ہیں
سترہ اونٹ اور بیس گھوڑے ہیں سبحان اللہ کیا اسلوب کلام ہے میر صاحب کے تناسب کلام
کا کوئی جواب نہیں ہے یہی تناسب جو کسی مرثیہ نگار کو نصیب نہیں ہوا ہے یہ تناسب اگر
کہیں ہے تو پھر ہو مرہی کے کلام میں دیکھا جاتا ہے میر صاحب کے کسی پورے مرثیہ پر نظر ڈالئے
یا اس کے کسی جزو کو ملاحظہ کیجئے تو اس کے کل یا جزو کو تناسب سے خالی نہیں پائے گا یہ تناسب
کی خوبی میر صاحب کے حصہ کی ہے جاننا چاہیئے کہ دوسرا نام تناسب کا اعتدال ہے واقعی جو
اعتدال میر صاحب کے مراثی میں موجود ہے کسی شاعر کے مراثی میں نہیں ہے میر صاحب کی
تشبیہوں میں اعتدال ہے میر صاحب کے استعارات میں اعتدال ہے اور میر صاحب کے مبالغوں میں
اعتدال ہے یہی اعتدال ہے جس نے میر صاحب کو جمیع مرثیہ نگاران عالم سے علیحدہ کر رکھا ہے
جاننا چاہیئے کہ تمام عالم کا انتظام اعتدال پر موقوف ہے حکیم کی نظر سے دیکھئے تو معلوم ہو کہ
نظام شمسی اور جمیع نظام فلکی کا مدار اعتدال پر ہے یہ نظام شمسی جس سے ہم کو تمام تر تعلق ہے
اس کا مرکز آفتاب ہے اس کے گرد بہت سے سیارے گھوما کرتے ہیں اہل واقفیت سے پوشیدہ
نہیں ہے کہ آفتاب اور سیارات میں جسمی تناسب نہ ہوتا تو یہ نظام شمسی حالت موجودہ نہیں رہتا۔
آج جسامت آفتاب کی دونی ہو جائے تو سب سیارے کھنچ کر آفتاب سے چسپاں ہو جاتے ہیں
پھر یہ سال و ماہ کسوف و خسوف وغیرہ وغیرہ سب کو ندارد ہی سمجھے گا صرف یہ تناسب ہی ہے
جس سے روز آفتاب طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے چاند نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے اور جو کچھ
ہوتا رہا ہے ہوتا رہتا ہے یہ تناسب ہی ہے جس سے حسن کو وجود حاصل ہے یہ تناسب ہی ہے
جس سے ہر ذی حیات زندہ ہے اگر تناسب نہیں تو کچھ نہیں اسی طرح یہ تناسب ہی ہے
جس نے میر صاحب کے کلام کو لاجواب بنا رکھا ہے بند ہائے بالا از ابتدا تا انتہا سبحان اللہ

کس طرح زیبِ تناسب سے آراستہ ہیں کہ خط و خال کو بھی بے اعتدالی کہیں پر نظر نہیں آتی ہے بہ طرزِ بیان لاریب عین تناسب ہے، اور اسی لئے کمال حسن کا مظہرِ اتم ہے حضرات ناظرین آخر کے ٹیپ کے دونوں مصرعوں کو ملاحظہ فرمایئے کہ تناسب کے پورے نمونے اور بے تکلفی کی پوری تصویر ہیں۔

نمبر ۴:۔ لشکرِ اعدا سے حضرت قاسم علیہ السلام کی جنگ

کیونکر تمام فوج سے وہ تشنہ لب لڑے   اک اک لڑا نہ آہ بہم ہو کے سب لڑے
کھا کھا کے زخم مثلِ امیرِ عرب لڑے   جانبازیاں غضب کی دکھائیں غضب لڑے
جلوہ میانِ تشنہ ہانی دکھا دیا
بچپن میں لڑ کے زورِ جوانی دکھا دیا

للکارا جس نے بس وہیں گھوڑا ڈپٹ کے آئے   یوں آئے جیسے شیرِ دلاور جھپٹ کے آئے
بجلی گری ادھر کو جدھر کو پلٹ کے آئے   صف کو بچھا کے گئے پرے کو پلٹ کے آئے
منہ سرخ تھا کھلے ہوئے تھے زخم سینے کے
بن کر لہو ٹپکتے تھے قطرے پسینے کے

کاٹے رسالے تیغ سے کارِ قلم لیا   دستِ یمیں نے جنگ سے آرام کم لیا
پھر دستِ چپ میں تیغ دو سر کو بہم لیا   تیورائے سنبھلے منہ سے لہو پوچھا دم لیا
یاں بند ہو کے آنکھ کھلی جتنی دیر میں
سو تیر دل کو توڑ گئے اتنی دیر میں

آ گھرا سپاہ میں وہ چودھویں کا ماہ   روکے تھی فوج تیروں سے اور برچھیوں سے راہ
لشکر کے ساتھ تھا پسرِ سعد روسیاہ   تلوار چل رہی تھی کہ اللہ کی پناہ

غل تھا کہ روند ڈالا ہے لشکر کے باغ کو
ہاں غازیو بجھا دو حسن کے چراغ کو

تیغیں چڑھائی تھیں جو لعینوں نے سان پر | پڑتی تھیں وہ قریب سے اُس ناتوان پر
تیروں پہ تیر تھے تو کمانیں کمان پر | حملہ تمام فوج کا تھا ایک جان پر
یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

غش میں جھکا فرس پہ جو وہ غیرت قمر | مارا کسی نے فرق پہ اک گرز گا دسر
برچھی لگی جو سینہ پہ ٹکڑے ہوا جگر | گرتے تھے اسپ سے کہ کمر پہ پڑا تبر
طارق کی تیغ کھا کے پکارے امام کو
فریاد یا حسین بچاؤ غلام کو

بندہائے بالا پر ریویو: یہ بین دکھلا رہا ہے کہ حضرت قاسم علیہ السلام لشکر اعدا میں گھرے ہوئے ہیں اور تن تنہا بڑی بہادری کے ساتھ ایک فوج کثیر سے لڑ کر زخمی ہوئے ہیں اور آخر کار زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے زمین پر گرتے ہیں۔ لاریب یہاں بھی تناسب کلام وہی ہے جو میر انیس کی شان ہے تناسب سے تو آپ کا کلام کبھی خالی نہیں ہوتا ان بندوں میں بھی وہی اعتدال ملحوظ رہا ہے جس سے آپ کی شاعری ہمیشہ ممتاز نظر آتی ہے کوئی شک نہیں کہ تبعیت فطرت میر صاحب کا کام ہے یہی تبعیت فطرت آپکے کلام میں تناسب اور اعتدال پیدا کرتی ہے جس سے آپ کی شاعری مصوری کی داد دیتی ہے واضح رہے کہ میر صاحب کے مراثی کے بند ایسے نہیں ہیں کہ صرف فرداً فرداً خوب ہیں بلکہ اجمالی حیثیت سے ان کے تناسب اور اعتدال کا جلوہ اور بھی واضح طور پر دکھلائی رہتا ہے تناسب کی خوبی عجب

خوبی ہوتی ہے بغیر تناسب کے حسن کا وجود ناممکن ہے اگر کسی شخص کے جسم کے اعضا فرداً فرداً
خوبصورت ہوں مگر ان میں تناسب موجود نہ ہو تو ایسا شخص حسین نہیں کہا جا سکتا، تناسب کی
معدومی علیحدہ علیحدہ ہر جزو بدن کی خوبصورتی وہ اجمالی حیثیت نہیں پیدا کر سکتی ہے جس
کو حسن کہتے ہیں میر صاحب کا ہر مرثیہ جو اس قدر حسین انداز رکھتا ہے اس کا سبب یہی ہے
کہ حضرت کا مرثیہ مطلع سے مقطع تک تناسب کی خوبی سے خالی نہیں پایا جاتا ہے یہ وہ
خوبی ہے کہ ان کے صاحبزادے میر نفیس صاحب مرحوم کے مراثی میں بدرجہ اتم نہیں پائی جاتی
ہے اس لیے میر نفیس صاحب کے مراثی میر انیس صاحب کے مراثی کے درجہ کو نہیں پہنچتے ہیں۔
میر انیس صاحب کا اعتدال کلام ایک حیرت انگیز انداز رکھتا ہے سبحان اللہ آپ کے
مبالغے تشبیہات اور استعارے بھی اعتدال سے خالی نہیں ہوتے ہیں آپ بالا میں ایک
بند کی ٹیپ یوں رقم فرماتے ہیں ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے	جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

اس تشبیہ کا اعتدال قابل لحاظ ہے اور صنعت اس تشبیہ میں رکھی گئی ہے کہ یہ تشبیہ
اپنی ذاتی حیثیت سے مدح کا ایک نفس پہلو پیدا کرتی ہے لاریب میر صاحب کا کلام بے حد
بلیغ ہوا کرتا ہے یہ عوام کی لاعلمی ہے جو کہا کرتے ہیں کہ میر صاحب صرف فصیح تھے - بلیغ
نہ تھے کس قدر یہ قول بے معنی ہے فصاحت بلاغت سے جدا نہیں ہوتی چونکہ میر صاحب کی بلاغت
ہمیشہ احاطہ اعتدال میں رہتی ہے اس لئے آپ کا کلام بادی النظر میں بلیغ نہیں معلوم ہوتا ہے عوام
غیر معتدل بلاغت کو بلاغت جانتے ہیں اس لئے انہیں میر صاحب کے کلام کی بلاغت بلاغت
نہیں معلوم ہوتی ہے۔

نمبر ۲۳ :- تلوار کی تعریف :-

اک آگ سی تھی چار طرف شعلہ فشاں برق وہ برق کہ خود مانگتی ہے جس سے اماں برق
یاں موج تھی واں سیل جو یاں ابر تو واں برق منہ زہر بر تشن قہر بدن آگ زباں برق
سرکش تھا جو ناری یہ جلاتی تھی اُسی کو
لو ہے پہ بھی گرتی تھی تو کھاتی تھی اُسی کو

اُٹھ کر کبھی ٹھہری کبھی بیٹھی کبھی چمکی سر گر گئے گردن جدھر اُس تیغ نے خم کی
سیدھی صف دشمن کو ملی راہ عدم کی سیفی تھی کہ گویا دم شمشیر پہ دم کی
دم بھر میں صفیں صاف تھیں بیداد گروں کی
تھی ملینہ کی طرح خاک پہ بوچھار سروں کی

کس کے سر و گردن میں جدائی نہ دکھائی صف کون سی تھی جس کو صفائی نہ دکھائی
کس کو اسد حق کی لڑائی نہ دکھائی مقتل میں کسے عقدہ کشائی نہ دکھائی
ریلا جو ہوا ناریوں کا رول کے نکلی
شیرازۂ اجزائے بدن کھول کے نکلی

اک ضرب میں ہاتھ اس کے اڑائے تو سر اُسکا شاخیں کٹیں اس نخل ستم کی ثمر اس کا
دل اس کا دو پارہ کیا کاٹا جگر اُس کا دم ہو گیا آخر ادھر اُس کا اُدھر اس کا
جس جا پہ جھکے خون کی ندی وہیں بہ جائے
کیا دخل تھا اس کا کہ کسی بات پہ رہ جائے

تھا صورت آئینہ تمام اس کا بدن صاف خون پیتی تھی پر دیکھو تو منہ صاف دہن صاف
چلتی تھی جو رن میں یہ نکلتا تھا رن صاف ہوں ہیں تو وہ جا رہ گئے کردیتی تھی ہوں ان صاف
نا اہل ہیں نامراد ہیں ناپاک ہیں اعدا

میں برقِ غضب ہوں خس و خاشاک ہیں اعدا

چم خم سے ہلالِ فلک نیلوفری تھی مارا تھا ہزاروں کو مگر خوں سے بری تھی
شوخی بھی نئی اور نئی جلوہ گری تھی تھی یہ تیغ کہ قبضہ میں سلیماں کے پری تھی

اک آگ لگی وار جدھر چل گیا اس کا
جو آ گیا سایہ میں بدن جل گیا اس کا

ایک اور ٹیپ تلوار کی تعریف میں نہایت لاجواب ہے وہ یہ ہے :-

اشراف کا بانا ورئیسوں کی شان ہے شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

واقعی یہ کیا سچی تعریف تلوار کی ہے سچ یہ ہے کہ واقعہ نگاری میر صاحب پر ختم ہے بندہائے بالا پر ریویو۔ واضح ہو کہ کسی زبان میں تلوار کی تعریف ان ترکیبوں سے نہیں لکھی جاتی ہے اہل عرب ہمیشہ سے شمشیر دوست رہے ہیں مگر ذکر شمشیر کے سوا کوئی خاص تعریف شمشیر کی عربی زبان میں راقم کی نظر سے نہیں گزری ہے ہومر کی ایلیڈ اور ورجل کی اینیڈ بھی ایسی تعریفات سے معرا نظر آتی ہیں۔ خیر فطری حد تک ہر شئے کی تعریف وابی مضایقہ نہیں رکھتی، مگر جب تلوار کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں تو ایسی تعریفوں کا مطلق اثر دل پر نہیں ہوتا ہے بلکہ ایسی تعریفیں موجب نفرت ہو جاتی ہیں جو ممدوح کے ہاتھی گھوڑے اور تلوار کو عجائب المخلوقات بنا دیتی ہیں قصیدہ گو شعرا کا ایک خاص شیوہ ہے مگر بعض مرثیہ گویوں نے بھی وہی روش اختیار کی ہے نا رہیب یہ تتبع نہایت ناپسندیدہ ہے بہر حال میر انیس صاحب نے ہر چند تلوار اور گھوڑے کی تعریفیں اکثر نظم کی ہیں لیکن فطری انداز سے آپ کے بیانات چنداں علیحدہ نہیں رہتے ہیں اس لیے دل آویزی سے بھی چنداں خالی نہیں پائے جاتے ہیں

نمبر۴۔ گھوڑے کا بیان :۔ مضامین خارجیہ کی چوتھی مثال

لکھتا ہے ادہم قلم اب سرعت عقاب[۱۲] | نعل اس کی ماہ نو ہیں تو سم رشک آفتاب
پستی میں سیل ہے تو بلندی میں ہے سحاب | سُرعت میں برق گرم روانی میں جیسے آب
اُڑنے میں اس فرس کو پرندوں پہ اوج ہے
اک شوخ تھا قدم نہیں دریا کی موج ہے

افزوں ہے زلف حور سے خوشبو ایال کی | دیکھیں تو لیں بلائیں سدا بال بال کی
پریاں خرام ناز میں شاگرد چال کی | غصہ میں حسبت شیر کی شوخی غزال کی
وہ حسن تن پہ ساز کا جوبن یراق کا
دلدل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

نازک مزاج ونسترن اندام و تیز رو | گردوں مسیر بادیہ پیما و برق دو
اس کا نہ اک قدم نہ زغند ہرن کی سو | دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اُسے نہ جو
رفتار میں ہوا تھا اشارے میں برق تھا
سرعت میں کچھ کمی تھی نہ چھل بل میں فرق تھا

صرصر سے تند بو سے سبک رو ہوا سے تیز | چالاک فہم و فکر سے ذہن رسا سے تیز
طاؤس و کبک و نسر و عقاب و ہما سے تیز | جانے میں اُڑ کے ہدہد شہر سبا سے تیز
ذی جاہ تھا سعید تھا فیروز بخت تھا
رہوار کیا ہوا یہ سلیماں کا تخت تھا

سمٹا۔ جما۔ اُڑا۔ ادھر آیا۔ اُدھر گیا | چمکا۔ بڑھا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا
تیروں سے اُڑ کے برچھیوں میں بےخطر گیا | برہم کیا صفوں کو پروں سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اُس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

کوئی شک نہیں کہ گھوڑے کی تعریفیں شعرائے عرب کے کلام میں حسب مراد طور پر دیکھی جاتی ہیں جیسا کہ کچھ اشعار گھوڑے کی تعریف میں اس کتاب کی جلد اول میں جہاں امرء القیس کے قصیدہ لامیہ نے جگہ پائی ہے درج ہوتے ہوگئے ہیں میر صاحب کے اشعار بالا بھی قابل توجہ ہیں اس لیے کہ اُن میں بہت سے فطرتی مضامین پائے جاتے ہیں اور جہاں جہاں میر صاحب نے مبالغوں سے کام لیا ہے اُن کے اسلوب لطف سے خالی نہیں دکھائی دیتے ہیں عموماً فارسی گو اور اُردو گو شعراء جو قصیدہ نگاری کا پیشہ کرتے ہیں اُن کے ممدوح کے گھوڑے عجب حالات کے گھوڑے نظر آتے ہیں اس ابتذال سے تو یقیناً میر صاحب نے اپنے بیانات کو محفوظ رکھا ہے یہ کم قابل قدر بات نہیں ہے، ایشیائی بدمذاقی سے تھوڑا اجتناب بھی ایشیائی شاعر کے لیے ایک بڑا سرمایہ امتیاز متصور ہے ؎

بعد پیش کرنے خارجی مضامین کی مثالوں کے راقم ذیل میں داخلی مضامین کی مثالیں نذر ناظرین کرتا ہے :

نمبر ا:- میر انیس صاحب کی التجا درگاہ باری تعالیٰ میں واسطے بخشش مضامین اور حصول حسن کلام کے :-

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر
اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جبتک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے

اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری   بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری   پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

وہ گل ہوں عنایت چمنِ طبعِ نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

غواصِ طبیعت کو عطا کر وہ لآلی   ہو جن کی جگہ تاجِ سرِ عرش پہ خالی
ایک ایک لڑی نظم تریا سے ہو عالی   عالم کی نگاہوں سے گرے قطبِ شمالی

سب ہوں دُرِ یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر اُن کی یہ ہوں گے جنھیں رشتہ ہے نبی سے

بھر دے دُرِ مقصود سے اس درج دہاں کو   دریائے معانی سے بڑھا طبعِ رواں کو
آگاہ کر اندازِ تکلم سے زباں کو   عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے حسنِ بیاں کو

تحسیں کا سماوات سے غل تا بہ سمک ہو
ہر گوش سنے کان ملاحت وہ نمک ہو

ساقی کے کرم سے ہو وہ دورِ اور چلیں جام   جس میں عوضِ نشہ ہو کیفیتِ انجام
ہر مست فراموش کرے گردشِ ایام   صوفی کی زباں بھی نہ رہے فیض سے ناکام

ہاں بادہ کشو پوچھ لو میخانہ نشیں سے
کوثر کی یہ موج آ گئی ہے خلدِ بریں سے

اوّل طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم   خیبر کی خبر لائے مری طبعِ اولوالعزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم   دکھلائیے ہیں سب کو زباں معرکۂ رزم

جل جائیں عدد آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

ہو ایک زباں ماہ سے تا مسکن ماہی — عالم کو دکھادی برش سیف الٰہی
جرأت کا دھنی تو ہے یہ چلائیں سپاہی — لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی

ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار ہے اس طبل و علم کا

بند ہائے بالا پر ریویو: یہ مناجات طولانی ہے یہاں صرف چند بند ابتدائے مطلع سے نمونہ کے طور پر درج کیے گئے ہیں، لاریب شاعر کی مناجات اس سے زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ حوالۂ قلم نہیں ہو سکتی ہے یہ ایسی ہی مناجات ہے کہ یقیناً درگاہ مجیب الدعوات میں قرین اجابت ہوئی میر صاحب جس نعمت کے طالب ہوئے لاریب اُس سرکار واہب العطایا سے انھیں مل گئی ورنہ عنایت ایزدی کے بغیر ایسے کلام کا نصیب ہونا توقع سے باہر ہے۔ سبحان اللہ داخلی مضامین پر بھی میر صاحب کی طبیعت عالی کس قدر اقتدار رکھتی ہے۔ اس مناجات کے مضامین تمامتر داخلی پہلو رکھتے ہیں اور کس قدر حسن قبول کی شان اُن سے آشکارا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ کوئی شاعر رزمی شاعر نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُسے خارجی اور داخلی مضامین کی بندش پر یکساں قدرت حاصل نہیں رہتی ہے اب ذیل میں اور بھی دو مثالیں داخلی مضامین کی ہدیۂ ناظرین ہوتی ہیں:

نمبر ۲: حالت قلب امام حسین علیہ السلام حضرت بانوؓ کی بوقت رخصت علی اکبرؓ

مضامین داخلی کی دوسری مثال:

ہتھیار پسر سجتا ہے گھبراتے ہیں ماں باپ — سر تا بقدم بید سے تھراتے ہیں ماں باپ

زخم اُس نے نہیں کھائے پہ غم کھاتے ہیں ماں باپ　　اکبرؑ ابھی جیتے ہیں موئے جاتے ہیں ماں باپ
اللہ ری الفت پسر ماہ لقا کی
دل سینے میں کٹتا ہے دہائی ہے خدا کی

سر پیٹ کے جب گرد پسر پھرتی ہے مادر　　ہیں بال کھلے سر سے گری پڑتی ہے چادر
آہستہ اشارہ ہے کہ یا سبط پیمبرؐ　　روکو انھیں ہاتھوں سے چلے اب علی اکبرؓ
ہیں صاحب الفت انھیں رحم آئیگا تم پر
تم بیٹے کو روکو نہیں گرتی ہوں قدم پر

صاحب مرے فرزند کو چھاتی سے لگاؤ　　روٹھے ہوں جو مجھ سے علی اکبرؓ کو مناؤ
ماں ان کی ہیں زینب انھیں اس وقت بلاؤ　　اس داغ سے لونڈی کے کلیجے کو بچاؤ
اٹھارہ برس سامنے آنکھوں کے رہے ہیں
پالا ہے بڑے دکھ سے بڑے رنج سہے ہیں

بانو سے اشارے سے یہ فرماتے ہیں شبیرؓ　　اس وقت کلیجے پہ مرے چلتی ہے شمشیر
ہے ہے میں کروں کیا کوئی بنتی نہیں تدبیر　　بابا سے چھڑاتی ہے ترے لال کو تقدیر
کس طرح سے میں روک لوں اس ماہ لقا کو
تنہائی شبیرؓ ہے منظور خدا کو

اتنے میں کمر باندھ چکے اکبرؓ جرار　　سینے میں دھڑکنے لگا بانوؓ کا دل زار
فرزند کا منہ تکنے لگے سید ابرارؓ　　ہم شکل پیمبرؐ ہوئے رخصت کے طلبگار
ہاتھوں سے کلیجہ شہ دیں پر نے سنبھالا
گرنے جو لگی ماں علی اکبرؓ نے سنبھالا

فرمایا پدر صدقے ہو اے اکبر ذی شان کیا کہتے ہو رخصت کسے کہتے ہیں مری جان
دم کس میں ہے دے کون تمہیں رخصت میدان دنیا سے یہ شبیرؑ کی رحلت کا ہے سامان

ماں باپ چراغ سحری ہیں علی اکبرؑ
ہم تم سے بھی پہلے سفری ہیں علی اکبرؑ

کس طرح بھلا داغ جوانی ہو گوارا سہرا ابھی تو دیکھا نہیں بابا نے تمہارا
عباس سے قوت تھی وہ دنیا سے سدھارا اب کوئی نہیں ہے مری پیری کا سہارا

میدان بلا میں یہ دغا کرنے کے دن ہیں
بتلا علی اکبرؑ یہ ترے مرنے کے دن ہیں

اکبرؑ نے کہا شرم سے گردن کو جھکا کر میں قبلہ و کعبہ کی رضا سے نہیں باہر
ہے آپ سے انصاف طلب آپکا دلبر سب قتل ہوں اور جان بچائے علی اکبرؑ

فرزند حسن کی تو شجاعت کا بیاں ہو
اور جوہر شمشیر حسینی نہ عیاں ہو

جوہر ہمیں خالق نے شجاعت کا دیا ہے مردوں سے عوض خون عزیزاں کا لیا ہے
مولا کوئی دنیا میں ہمیشہ بھی جیا ہے دو روز سے پانی نہیں خادم نے پیا ہے

اب جانِ حزیں جسم میں گھبراتی ہے بابا
کوثر یہ ہمیں پیاس لئے جاتی ہے بابا

ٹکڑے ہوا تقریر پسر سے دل سرور کچھ بس نہ چلا رو دیئے گردن کو جھکا کر
فرمایا کہ پانی مجھے ہوتا جو میسر تم کاہے کو بابا سے بچھڑتے علی اکبرؑ

کوثر پہ چلے تشنہ دہاں باپ کے گھر سے

افسوس تمہیں پیاس چھڑاتی ہے پدر سے

اکبر نے کہا میں نے بہت پیاس کو مارا — حضرت کی قسم ہے نہیں اب ضبط کا یارا
شہ نے کہا یہ داغ بھی کرلیں گے گوارا — رونا تو ہے اس کا نہیں کوئی ہمارا
آفت کا کبھی دکھ میں نہ شکوا کیا ہم نے
عباس علی مر گئے تب کیا کیا ہم نے

تم ہوتے تو یہ ہوتا کہ لاشے کو اُٹھاتے — اور قبر ہماری اسی جنگل میں بناتے
ہم غسل و کفن ہاتھ سے فرزند کے پاتے — اس دشت میں مرتے تو جلاد و حوش کھاتے
مرضی جو تمہاری نہیں بس باپ کا کیا ہے
کچھ غم نہیں پر خیر ہمارا ابھی خدا ہے

بندہائے بالا پر ریویو: بندہائے بالا میں عجب درد انگیز سین میر انیس صاحب کی فطرت نگاری نے پیش نظر کر دیا ہے حضرت علی اکبرؓ لشکر یزید سے سامنا کرنے کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں امام حسین علیہ السلام دو بھانجوں حضرت عون و محمد بھائی حضرت عباس اور بھتیجے حضرت قاسم کے داغ غم اٹھا چکے ہیں اور اب آپ کے بیٹے علی اکبرؓ کی شہادت کی باری آرہی ہے حضرت شہربانو کے دم میں دم نہیں ہے حضرت امام علیہ السلام کے دل پر جو گذر رہی ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا، مادر و پدر کی جو حالت ایسے وقت میں تقاضائے فطرت سے ہو سکتی ہے اُسے میر صاحب کی قابلیت شاعری نے خوب دکھلایا ہے مادر و پدر کے فراق غم کی تصویر نہایت تبعیت فطرت کے ساتھ کھینچی گئی ہے اضطراب مادر اور استقلال پدر کے بیانات ایک حیرت انگیز انداز رکھتے ہیں' لاریب حضرت علی اکبرؓ کی رخصت کا سین بندہائے بالا میں اس قوت ڈراما نگاری کے ساتھ حوالہ

قلم ہوا ہے۔ جو شکسپیر اور کالی داس کو واہب المعطایا نے بخشی تھی ۔

نمبر ۲: حال استقلال حضرت زینب علیہا السلام وقت رخصت حضرت عون و محمد۔

مضامین داخلی کی تیسری مثال :-

ناگاہ ہوا شور مبارز طلبی کا — پھر قصد لعینوں نے کیا بے ادبی کا
منہ سرخ ہوا غیظ سے ہم شکل نبیؐ کا — رایت بھی بڑھا فوجِ رسولِ عربی کا
حیدرؑ کے نواسوں کے بھی ابرو پہ بل آیا
چھوٹا تو یہ بگڑا کہ پرے سے نکل آیا

گھبرا کے پکارے جو انھیں سیّد ابرار — بس پھر کے گرے پانوں پہ آقا کے وہ جرار
کی عرض بصد عجز کہ اے کل کے مددگار — ہم دونوں غلام اب ہیں اجازت کے طلبگار
بیتاب ہیں دل جان مصیبت میں پڑی ہے
اے نور خدا ذرہ نوازی کی گھڑی ہے

مرنے کو اگر پہلے گئے قاسمؑ و اکبرؑ — پاشاہ ہمیں دودھ نہ بخشیں گی مادر
شبرؑ کی وہ تصویر یہ ہم شکل پیمبرؐ — توقیر اسی میں ہے کہ ہم صدقہ ہوں اُن پر
مالک ہیں خداوند ہیں سردار ہیں دونوں
ہم اُن کے بزرگوں کے نمک خوار ہیں دونوں

بسمل جو ہوئے مسلم مظلوم کے پیارے — ہم خیمہ میں جا سکتے نہیں شرم کے مارے
اماں نے کہا ہو گا کہ ابتک نہ سدھارے — جانوں کو بچاتے ہیں جگر بند ہمارے
قاصر ہیں جو توقیر شہادت نہیں ملتی
کیا جانیں اسے وہ کہ اجازت نہیں ملتی

حضرت پہ ہے روشن جو ہمارا ہے ارادا　　سن کم ہیں پہ ہمت ہے جوانوں سے زیادا
نانا تو علیؑ جعفرؓ طیار ہے دادا　　ہم ڈھونڈتے ہیں صبح سے فردوس کا جادا
شیروں کی طرح بیشۂ حیدرؓ میں پلے ہیں
تلواروں سے ہم کھیل کے اس گھر میں پلے ہیں

وہ تیغ کے مالک ہیں تو مختار ہیں ہم بھی　　دادا کی طرح مرنے پہ تیار ہیں ہم بھی
نانا تھے جو کرار تو جرار ہیں ہم بھی　　سر دے کے شہادت کے طلبگار ہیں ہم بھی
ہے جوش وفا عمر کے پیمانے بھرے ہیں
ہم صبح سے سر نذر کو ہاتھوں پہ دھرے ہیں

ہم آپ سے مرنے کے لئے جا نہیں سکتے　　زخم تبر و تیر و سناں کھا نہیں سکتے
بے حکم جو مطلب ہے اسے پا نہیں سکتے　　آداب سے کچھ لب پہ سخن لا نہیں سکتے
ہم پیچھے رہیں سب سے یہ تقدیر ہماری
ہاتھ آپ کے ہے عزت و توقیر ہماری

ہم دونوں غلام اکبرؑ و اصغرؑ کے ہیں یا شاہ　　الفت کو بس اب دل سے اٹھا دیجیے للہ
اماں کا تو نازک ہے مزاج آپ ہیں آگاہ　　بنت اسدؑ حضرت باری ہیں وہ ذی جاہ
پوچھیں گی خفا ہو کے تو کیا ان سے کہیں گے
آزردہ رہیں وہ تو کہیں کے نہ رہیں گے

عورت ہیں پہ خو بو شہ مرداںؑ کی ہے ساری　　شب کو بھی یہ فرمایا تھا ہم سے کئی باری
تم یہ نہ سمجھیو کہ ہیں عاشق ہوں تمہاری　　بھائی سے مجھے جان نہ اولاد ہے پیاری
کس کام کے پھر سر جو تصدق نہ کرو گے

تب دودھ میں بخشوں گی جو عزت سے مر گئے

یہ کہہ کے جو رونے لگے زینب کے جگر بند   حضرت نے کہا میں ہوں بہر حال رضامند
کھوئے ہیں کسی بھائی نے ہمشیر کے فرزند   کس منہ سے کہوں آہ کہ ہو خاک کے پیوند

تنہائی کا دکھ فاطمہؑ کا لال سہے گا
لاشے کے اٹھانے کو بھی کوئی نہ رہے گا

اکبرؑ کو تو ہمشیر نے میں نے تمہیں پالا   ماموں سے جدا ہونے ہو جب ہوش سنبھالا
اب کون ہے غربت میں مرا ساتھ دینے والا   دل کا کوئی ارمان نہیں تم سے نکالا

دس سال بھی پورے نہیں دونوں کے سنوں میں
دنیا سے اجل لے چلی بچپن کے دنوں میں

دونوں سے یہ فرما کے ادھر روتے تھے شبیرؑ   جب بیٹھی تھی رانڈوں میں اُدھر شاہ کی ہمشیر
سر زانو پہ تھا فکر میں اور لب پہ یہ تقریر   مجبور کیا بیٹوں نے ہے ہے مری تقدیر

میں جانتی تھی پہلے اجازت وہی لیں گے
اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پہ دیں گے

آتا ہے دم صبح سے یاں لاشے پہ لاشا   ان کے لیے اعدوں کی لڑائی ہے تماشا
پائی نہ اجازت یہ سخن خوب تراشا   باتیں ہیں یہ ساری مجھے باور نہیں حاشا

رکتے ہیں دلاور کہیں روکے سے کسی کے
وہ سب بھی تو پیارے تھے حسینؑ ابن علیؑ کے

بانو نے کہا دونوں کی عمریں ہیں ابھی کیا   نہ گھر سے وہ نکلے نہ کوئی معرکہ دیکھا
میداں کی رضا دیتے نہ ہوں گے شہ والا   آزردہ نہ ہوں آپ یہ غصہ کی نہیں جا

سن لیجئے گا رن میں جو کچھ کام کریں گے
حیدر کے نواسے ہیں بڑا نام کریں گے

فرمایا کہ ہاں جو مجھے تقدیر دکھائے   جی جاؤں گی مر کر جو وہ میدان سے آئے
کیوں شاہ سے رخصت کا سخن لب پہ نہ لائے   کیا جانئے کس فکر میں ہیں وہ مرے جائے
جو چاہیں کریں بیٹوں کے قابل میں کہاں ہوں
اب وہ مرے فرزند نہ میں دونوں کی ماں ہوں

یہ ذکر تھا فضہ جو خبر لے کے یہ آئی   فرمایا کہ اب لٹتی ہے زینب کی کمائی
لو میرے خوزادوں نے رضا جنگ کی پائی   اے بنت علیؓ رو رہے ہیں آپکے بھائی
بچے بھی شریک شہدا ہوتے ہیں لوگو
دو بھانجے ماموں پہ فدا ہوتے ہیں لوگو

فضہ سے یہ سُننا تھا کہ بس رونے لگے سب   اور خاک پہ سجدے میں جھکیں حضرت زینبؑ
فرمایا کہ صد شکر بر آیا مرا مطلب   عزت مرے بچوں کی ترے ہاتھ ہے یارب
بہتر ہے جو لڑنے کو وہ پیارے گئے دونوں
یہ خوشخبری آئے کہ مارے گئے دونوں

بندہائے بالا پر ریویو: ۔ فطرت نگاری میر انیسؔ صاحب کا حصہ ہے بندہائے بالا تمام تر ڈراما کی خوبیوں کا انداز رکھتے ہیں حضرت زینبؑ کا کیریکٹر خوب ہی حوالۂ قلم ہوا ہے جو جو صفتیں شہنشاہ لافتیٰ کی بیٹی میں ہونی چاہیئں آپ میں موجود تھیں چونکہ بھائی کی فدائی تھیں بیٹوں کو بھی بھائی پر تصدق کر ڈالنا آسان سمجھی تھیں ظاہر میں تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ امام علیہ السلام کی محبت میں اپنے لڑکوں کا خیال بھی آپ کو باقی نہیں رہا تھا ۔ مگر اصل وجہ اس شیفتگی کی یہ تھی کہ بالیقین آپ

اپنے بھائی کو امام من جانب اللہ جانتی تھیں اس لیئے بیٹوں کی شہادت کی بھی آپ کو پروا نہیں رہی تھی، یہ بات آپ ہی کے ساتھ مختص نہ تھی جتنے ذکور واناث حضرت امام علیہ السلام کے شریک حال تھے ان سب افراد کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ امام علیہ السلام امام من جانب اللہ ہیں من جانب الناس نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زور عقیدہ کے ساتھ کون کمبخت ایسا ہو سکتا تھا کہ امام علیہ السلام کا فدائی نہ ہوتا۔ خاندان پیمبر کے حضرات اور ان کے تابعین جو شریک واقعۂ کربلا تھے یہ سب حضرات تو امام علیہ السلام کو امام من جانب اللہ جانتے ہی تھے مگر یہی سمجھ حضرت حر کو بھی لشکر یزید سے نکال لائی، ورنہ حضرت امام علیہ السلام کا طرفدار ہو جانا ایک ایسے شخص کا جس کو دنیاوی فائدہ کی ہوس برابر اب نہ ہو محض خلاف فطرت ہوتا لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ حر نے امام علیہ السلام کو امام من جانب اللہ مانا اور حضرت کے لیئے مر جانے کو ایک آسان امر جانا۔ ظاہر ہے کہ اس زور عقیدہ کے بغیر کوئی شخص اپنی ہلاکت گوارا نہیں کر سکتا ہے پس حضرت زینب اس یقین کے ساتھ کہ امام علیہ السلام امام من جانب اللہ ہیں کیونکہ اپنے بیٹوں کو حضرت پر تصدق کر ڈالنا ایک امر ضروری نہیں سمجھتیں، واضح ہو کہ حضرت زینب کے کیریکٹر کے علاوہ حضرت امام علیہ السلام حضرت بانوؓ حضرت عون حضرت محمد اور حضرت فضہؓ کے پارٹ (PART) یعنی ان کے قولی اور فعلی معاملات میر صاحب نے ڈرامانگاری کے اعلیٰ اصول کی پابندی کے ساتھ حسن نہج پر حوالۂ قلم فرمائے ہیں ہومر اور شکسپیر بھی اس سے زیادہ ڈرامانگاری کا جوہر نہیں دکھا سکتے تھے۔

میر صاحب کے مراثی کس طرح کے مضامین پر مشتمل ہیں، واضح ہو کہ میر صاحب کے مراثی عموماً ایسے ایسے مضامین ہیں جیسے حمد واحد کا ہم خداوند تعالیٰ جل شانہ، ثنا و کلام حضرت رسالتمآب صلعم مناقب و کلام حضرت امیر علیہ السلام۔ مدح و کلام حضرت خاتون جنت علیہا السلام مدح جناب امام حسنؓ

مدح جناب امام حسین علیہ السلام، مدح حضرت عباس علمدار علیہ السلام، مدح حضرت علی اکبرؑ حضرت قاسمؑ حضرت عون و حضرت محمد سلام اللہ علیہم، مدح حضرت زینب علیہا السلام، مدح حضرت شہربانو علیہا السلام۔ ذکر ولادت حضرت امام حسن علیہ السلام، ذکر ولادت امام حسینؑ وصایا و کرم و اخلاق و مناجات و کلمۂ صبر و رضائے آنحضرت، حال روانگی آنحضرت، از مدینہ منورہ جانب مکۂ معظمہ، حال روانگی آنحضرت جانب کوفہ از مکۂ معظمہ، حال زحمت سفر، ذکر انصار جناب امام حسین علیہ السلام، تیاری ہائے جنگ فریقین در مقام کربلا، رجز حضرت امام حسینؑ، مع کلمات وعظ و پند و جنگ امام علیہ السلام با اعدائے دین، رجز و جنگ علی اکبر علیہ السلام رجز و جنگ حضرت عباس علیہ السلام رجز و جنگ حضرت قاسم علیہ السلام، رجز و جنگ حضرت عون و محمد علیہما السلام رجز جنگ حضرت حر علیہ السلام، حالت قلب حضرت امام حسین علیہ السلام وقت رخصت و شہادت حضرت علی اکبر علیہ السلام حالت قلب آنحضرت وقت شہادت علی اصغر علیہ السلام حالت قلب آنحضرت وقت رخصت، شہادت حضرت عباس علیہ السلام حالت قلب آنحضرت وقت شہادت حضرت قاسم علیہ السلام، وفاداری حضرت عباسؑ جلال حضرت عباس علیہ السلام وفاداری و دینداری حضرت حُر علیہ السلام۔ قدردانی، عزت افزائی حضرت حر علیہ السلام از جانب امام حسین علیہ السلام سئوال حضرت زینب وقت رخصت حضرت عون و حضرت محمد علیہما السلام، اضطراب حضرت زینبؑ وقت روانگی امام حسین علیہ السلام جانب میدان جنگ، شہادت آنحضرت جنگ امام علیہ السلام با اعدائے دین و شہادت آنحضرت ہنگامہ میدان جنگ، صبر و استقلال حضرت امام زین العابدینؑ درحالت مصیبت، روانگی اہل حرم جانب شام، دربار یزید، زندان شام سامان مہمانداری از جانب شیرین (کنیز آزاد کردہ حضرت امام حسین علیہ السلام) بیانات مناظر قدرت۔

بیاناتِ صبح و شام، بیاناتِ امورِ خارجیہ، بیاناتِ امورِ ذہنیہ، تعریفِ اسپ، تعریفِ شمشیر، بیانِ لشکرِ یزید، بیانِ مبارزانِ لشکرِ یزید، بیاناتِ بے ثباتیٔ دنیا و انقلاباتِ عالم، ظاہر ہے کہ یہ ایک مختصر فہرست میر صاحب کے مضامینِ مراثی کی ہے، ان میں سے کچھ بند جو مضامینِ بالا سے تعلق رکھتے ہیں ذیل میں درج پاتے ہیں :-

نمبر ۱ :- حضرت عباس علمدار کی وفاداری ۔ (مضامینِ بالا کا پہلا نمونہ)

گھبرا کے بڑھا خود پسرِ سعدِ بد انجام — عباس سے کی عرض کہ اے صاحبِ صمصام
سن لیجئے کچھ شام کے حاکم کا ہے پیغام — پر آپ تک آتے ہوئے گھبراتا ہے اندام
جھنجھلائے ہوتے شبیر سے اندیشہ ہے جان کا
میں چند نفس آپ سے طالب ہوں اماں کا

کی چیں بہ جبیں ہو کے یہ عباس نے تقریر — پیغام مجھے بھیجے گا کیا حاکمِ بے پیر
بندہ ہوں میں حاکم ہیں مرے حضرت شبیرؑ — شیوہ ہے تمھیں لوگوں کا یہ حیلہ و تزویر
ہے کام وفا سے ہمیں اور ہم سے وفا کو
فرزندِ علیؑ ننگ سمجھتے ہیں دغا کو

وہ تم ہو جو کرتے ہو دغا اہلِ وفا سے — مطلب ہے محمدؐ سے تمھیں کچھ نہ خدا سے
سادات کا سر کاٹتے ہو تیغِ جفا سے — مہماں ہیں یہ کس کے جو ہیں دو روز سے پیاسے
کھا کھا کے قسم پھر گئے تم اپنے سخن سے
ہم وہ ہیں کہ لکھنے پہ چلے آئے وطن سے

گر صلح کا پیغام بھی لایا ہے تو بے کار — میں کہتا ہوں مانیں گے نہیں سیدِ ابرار
دو بھانجے مارے گئے اک بھائی کا دلدار — صدمہ یہ اٹھایا ہے کہ ہے زیست سے بیزار

کھل جائے گا شمشیر و سپر باندھ چکے ہیں
وہ دیر سے مرنے پہ کمر باندھ چکے ہیں

کچھ سوچ کے یہ کہنے لگا ظلم کا بانی — سچ ہے کہ بچے گا نہ ید اللہ کا جانی
پر آپ گنواتے ہیں عبث اپنی جوانی — کوئی تو رہے خلق میں حیدرؓ کی نشانی
غصہ کے نہ اندوہ کے نہ طیش کے دن ہیں
راتیں ہیں یہ آرام کی یہ عیش کے دن ہیں

کیوں کرتے ہو بے فائدہ جینے سے کنارا — چھوٹا ہے ابھی عمر میں فرزند ہمارا
جب آپ نے دی جان تو گویا اسے مارا — عباسؓ جدائی کرو بھائی کی گوارا
مابین لحد ساتھ برادر نہیں جاتا
بھائی کوئی بھائی کے لئے مر نہیں جاتا

یہ سنتے ہی تھرا گیا اس شیر کا اندام — غصہ کے سبب سرخ ہوئی چشم سیہ فام
قبضہ کو جو دیکھا تو اگلنے لگی صمصام — فرمایا کہ ظالم مجھے دیتا ہے یہ پیغام
شاید نہیں آگاہ مرے جد و پدر سے
ایسا ہوں کہ پھر جاؤں گا زہرا کے پسر سے

بس دور ہو آگے نہیں سننے کی مجھے تاب — سر تن سے اتاروں ترا او ظالم کذاب
میں بھائی کا دشمن ہوں یہ ہے کونسا آداب — کیا قدر پھر اس کی ہے جو موتی کی گئی آب
رتبہ ہے یہ سب شاہ ولایت کا تصدق
ہم جانتے ہیں جان کو عزت * تصدق

آگے مرے تو ذکر پسر کا مرے لایا — شبیرؓ کے بچوں پہ تجھے رحم نہ آیا

اصغر سے تو ہے سن میں زیادہ مرا جایا　　پانی تو کہاں دودھ بھی جس نے نہیں پایا
دل سینہ میں ٹکڑے ہو کہ صدمہ ہو جگر پر
سو بیٹے ہوں تو صدقہ کروں اُن کے پسر پر

ہوتا ہے چمن فاطمہؑ کا ظلم سے برباد　　موسم یہ مرے عیش کا ہے اے ستم ایجاد
مارا گیا بیوہ کا پسر قاسم ناشاد　　روتے ہیں نبیؐ شبرؑ حدا کرتے ہیں فریاد
ہم سے جنھیں الفت ہے وہ ماتم میں رہینگے
تا حشر اسے حشر کا دن لوگ کہیں گے

بھائی کے لئے جی سے گزر جاتا ہے بھائی　　جاتا ہے برادر بھی جدھر جاتا ہے بھائی
کیا بھائی ہو تیغوں میں تو ڈر جاتا ہے بھائی　　آنچ آتی ہے بھائی پہ تو مر جاتا ہے بھائی
نعشیں بھی بہم زیر زمیں ہوتی ہیں اکثر
قبریں بھی پس از مرگ قریں ہوتی ہیں اکثر

بھائی نے مرے کون سی کی مجھ سے برائی　　پالا ہے مجھے جانتی ہے ساری خدائی
کیا کچھ نہ ملا کون سی عزت نہیں پائی　　جان اُن پہ تصدق ہے اجل آئی تو آئی
ہم پائیں گے جو شرط محبت کی جزا ہے
نافہم اسی موت میں جینے کا مزا ہے

کافر ہوں کہ منہ قبلہ ایماں سے پھراؤں　　تو کوہ طلا دے تو میں لالچ میں نہ آؤں
فاقے ہوں تو بھائی کے عوض برچھیاں کھاؤں　　مقتل سے تڑپتا ہوا اُن تک میں پہ جاؤں
کس منہ سے کہوں میں کہ قرابت میں قریں ہوں
بھائی ہیں حسینؑ میں تو غلام شہ دیں ہوں

بلبل کو کبھی ہجر گل تر نہیں بھاتا — پروانہ کہیں شمع کو ہے چھوڑ کے جاتا
ہے موت جو معشوق کو عاشق نہیں پاتا — قمری کو سوا سرو کے کچھ خوش نہیں آتا
شبیر جہاں یہ دل فرزانہ وہیں ہے
محفل میں جہاں شمع ہے پروانہ وہیں ہے

کہنے پہ چلوں تجھ سے جفا جو کے نہ ہے فہم — دوں رنج میں دل کو ستم خو کے نہ ہے فہم
پہنچے انھیں دکھ ہاتھ سے بازو کے نہ ہے فہم — آنکھوں کی بدی سامنے ابرو کے نہ ہے فہم
ہٹ جا نہیں تیغ اب مری واللہ چلے گی
شیروں سے نہ یہ بازی روباہ چلے گی

جرأت کو جری نے کبھی چھوڑا ہو تو کہہ دے — آقا کو کسی نے کبھی چھوڑا ہو تو کہہ دے
شبر کو اخی نے کبھی چھوڑا ہو تو کہہ دے — احمد کو علیؑ نے کبھی چھوڑا ہو تو کہہ دے
وہ ہم نہیں کرتے جو زمانے کا چلن ہے
دنیا میں وفا اپنے گھرانے کا چلن ہے

بے حشمت دنیا کی تمنا نہیں رکھتا — قطرہ کی طمع فیض کا دریا نہیں رکھتا
اعلیٰ جو ہے ادنیٰ کی وہ پروا نہیں رکھتا — پتے سے علاقہ سر طوبیٰ نہیں رکھتا
کافر کی طرف صاحب ایماں نہیں جاتے
بتخانہ کو کعبے سے مسلماں نہیں جاتے

بند ہائے بالا پر ریویو: واضح ہو کہ بند ہائے بالا میں میر انیس صاحب نے داخلی شاعری کے پہلو کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ برتا ہے اور ڈرامانگاری کا لطف بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ دکھلایا ہے ہر چند میر صاحب رزمی شاعری برتتے ہیں مگر یہ امر محقق

ہے کہ اعلیٰ درجہ کی رزمی شاعری سے ڈرامانگاری نے وجود پکڑا ہے، پس کوئی جائے
تعجب نہیں ہے کہ میر صاحب کے مراثی اعلیٰ درجہ کے ڈراما کا حسن انداز رکھتے ہیں، ہومر
کی رزمی شاعری ڈرامانگاری کی موجد گزری ہے جیسا کہ سابق میں عرض ہو چکا ہے لاریب
میر صاحب کی رزمی شاعری سے بھی یہ صنف شاعری وجود پذیر ہو سکتی تھی اگر اس عہد
کے عوض میر صاحب ہومر یا ہومر کے پہلے کا زمانہ اپنے ظہور کے لئے پائے ہوتے، خیر
بحالت موجودہ میر صاحب کی رزمی شاعری بہت کچھ ڈراما کی اعلیٰ درجہ کی خوبیاں رکھتی ہے
اور اس پہلو سے بھی اہل مذاق صحیح کیلئے بہت کچھ قابل توجہ ہے، اہل واقفیت سے پوشیدہ
نہیں ہے کہ ڈرامانگاری کی کامیابی کے لئے شاعر میں نہ صرف داخلی اور خارجی امور کی
بندش کی بڑی صلاحیت درکار ہے بلکہ ان دونوں کی آمیزش کی بھی بڑی قدرت حاصل رہنی
چاہیئے، میر صاحب کو یہ قوت بھی واہب العطایا نے بہ درجہ اتم بخشی ہے، آپ کے تمام
مراثی آپ کی اس قوت کی شہادت دیتے ہیں، اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اس قوت کے
بغیر کوئی شاعر رزمی شاعری کی داد نہیں دے سکتا ہے کما لایخفی علی اہل التحقیق ؎

جاننا چاہیئے کہ بند ہائے بالا میں میر صاحب نے ابن سعد کی ترغیب دہی کے مضمون
کو حوالہ قلم فرمایا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ یزیدیوں کی طرف سے یہ کوشش عمل
میں لائی گئی تھی کہ آل مرتضیٰ سے کوئی آدمی بھی یزیدیوں کا ساتھ دیتا، یہ ایسی ترکیب تھی
کہ کوئی بھی آل مرتضیٰ سے ان کا ساتھ دے دیتا تو واقعہ کربلا کا اور ہی نقشہ پیدا ہو
جاتا، بالفرض اگر حضرت عباس علمدار عمر ابن سعد کے کہنے سے لشکر امام علیہ السلام
سے کنارہ کش ہو جاتے تو دنیا کو یہ کہنے کو ہو جاتا کہ یہ واقعہ العیاذ باللہ حسین علیہ السلام کے
مخالفوں اور خود حضرت کے بھائی بھی تھے، مگر حضرت عباسؑ کب امام علیہ السلام سے سکتے

مخالفت بن سکتے تھے یا کوئی بھی آل ہاشم سے حضرت کی مخالفت گوارا کر سکتا تھا اس وقت کے علویین کسی حالت میں اپنے خاندانی تعلقات سے علیحدہ نہیں ہو سکتے تھے اور خاندانی دینی اور دنیوی تعلقات سے علیحدہ ہونے کو ننگ جانتے تھے جیسا کہ کہا گیا ہے ۔

اذا العلوی تابع ناصبیاً　　　بمذھبه فما ھو من ابیه

وان الکلب خیر منه طبعاً　　　فان الکلب طبع ابیه فیه

یعنی جو علوی سید ناصبی کا مذہب اختیار کرتا ہے تو اس سے کتا بہتر ہے اس لیے کہ کتا اپنے باپ کا طور قائم رکھتا ہے اس وقت کے آل مصطفیٰؐ اور اولاد مرتضیٰؑ جو طریقۂ آبائی سے علیحدگی اختیار کرتے گئے ہیں ان چار مصرعوں پر نظر غور ڈال کر اپنی موجودہ حالت کا موازنہ فرمائیں۔ خیر۔ میر انیس صاحب اسی ترغیب دہی کو پیش نظر رکھ کر فرماتے ہیں کہ عمر ابن سعد ضرورت وقت دیکھ کر حضرت عباس سے کہتا ہے کہ کچھ حاکم شام کا پیام ہے سن لیجئے۔ مگر حضرت عباس اس کا پیام سننے کے متحمل نہیں ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حاکم شام مجھے کیا پیام بھیجے گا۔ میں حضرت شبیرؑ کا بندہ ہوں مجھ سے بے وفائی ممکن نہیں۔ تو اور تیری قوم کا شیوہ مکر اور بے وفائی ہے میں فرزند علی ہوں فرزند علی دغا کے مرتکب نہیں ہو سکتے بالفرض اگر تو صلح کا پیام بھی لایا ہے تو اب صلح کا وقت نہیں رہا حضرت شبیرؑ کے دو بھانجے اور ایک بھتیجا مارے جا چکے ہیں حضرت امام ہرگز صلح پر راضی نہ ہوں گے۔ حضرت والا شمشیر و سپر باندھ کر جنگ کے لئے مستعد ہو چکے ہیں۔ اس تقریر کو سنکر ابن سعد بولا کہ لڑائی میں شبیرؑ تو مارے ہی جائیں گے۔ آپ اپنے کو کیوں تباہ کرتے ہیں آپ جوان ہیں اور ابھی آپ کا لڑکا صغیر سن ہے آپ اپنی ہلاکت کیوں گوارا کرتے ہیں کوئی تو جہان میں حیدرؑ کی نشانی رہے آپ اپنی جان نہ کھوئیں۔

حضرت عباسؓ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ سراپا وفاشعاری سے مملو نظر آتا ہے، لاریب ان بند ہائے بالا میں حضرت عباسؓ کا کیریکٹر جس خوبصورتی کے ساتھ دکھلایا گیا ہے احاطۂ توصیف سے باہر ہے حضرت عباسؓ کی اخلاقی قوتیں از قسم شجاعت وفاداری، استقلال، خودداری، بے غرضی، انکسار وضعداری، آزادی، استغنا وغیرہ وغیرہ اس ندرت کے ساتھ دکھلائی گئی ہیں کہ اس کا جواب شاہنامہ تو کیا ایلیڈ کے کسی حصہ میں بھی نہیں پایا جاتا ہے، یہ چند بند حضرت عباس کے کیریکٹر کو اس صفائی کے ساتھ دکھلاتے ہیں کہ آپ دیگر شجاعان لشکر امام علیہ السلام سے ایک علیحدہ رنگ کے شجاع دکھائی دیتے ہیں آپ کے کردار سے آپ کا ایک خاص طرح کا جلال نمایاں ہے اور آپ کی گفتار سے آپ کا ایک خاص طرح پر حضرت امام علیہ السلام کے ساتھ متمسک ہونا ظاہر ہوتا ہے واہ کیا حسن بیان ہے آپ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے کو امام علیہ السلام کا بھائی بھی دکھلاتے ہیں پھر امام حسنؑ کے مقابلہ میں اپنے کو امام علیہ السلام کا ایک بندہ بھی قرار دیتے ہیں، یہ فرق مراتب کا مضمون نہایت عمدہ انداز سے حوالۂ قلم ہوا ہے مختصر یہ ہے کہ اپنے زور قلم سے میر صاحب نے حضرت عباس علمدار کی ایک ایسی سچی تصویر کھینچی ہے کہ دیکھنے والا ہزار شجاعوں میں آسانی کے ساتھ آپ کو پہچان لے سکتا ہے، اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہی کیریکٹر نگاری رزمی شاعری کی جان ہے اسی طرح ہومر بھی بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ بہادران ٹرائے و یونان کے مختلف انداز کی ایسی تصویریں کھینچتا ہے کہ ہر بہادر ایک دوسرے سے علیحدہ دکھائی دیتا ہے، مثلاً اس کے بیان سے اکیلیز اور ہکٹر ایسے دو بہادر نظر آتے ہیں۔ جن کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے کوئی بڑی صلاحیت درکار

نہیں ہے' اکیلیز ایک سفاک بے باک پر غیظ و غضب نبرد آزما کی تصویر پیش کرتا ہے اس کے برخلاف ہکٹر ایک متین، رحم دل مستقل مزاج اور مآل اندیش مرد میدان کا فوٹو سامنے لاکر رکھ دیتا ہے اس کیر یکٹر نگاری نے ہومر کو جس کا ذکر ابو الفدا مورخ اپنی کتاب المختصر فی احوال البشر میں پیش کرتا ہے' ابو الشعرا کہلایا ہے اور لاریب اب اس خطاب کے تمام تر مستحق میر صاحب ہیں کیا کسی کو معلوم تھا کہ زمانہ ہومر سے سیکڑوں صدیوں کے بعد ہندوستان میں پھر ایک ایسا شاعر گرامی اُردو زبان کا پیدا ہوگا جس کو ابو الشعرا نہیں کہنا ایک عظیم حق تلفی کا حکم رکھتا ہے' مگر افسوس ہے کہ جس قدر ہومر کی شہرت دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اسی قدر میر صاحب کی شہرت دنیا کے ایک تنگ دائرہ میں محدود ہو رہی ہے میر صاحب کی قوت شاعری سے یورپ کو بے خبر نہیں رہنا چاہیئے، مسلمانوں میں ماشاء اللہ اس وقت نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی صاحب بالقابہ ایک ایسے جوہر یکتا موجود ہیں کہ اگر نواب ممدوح میر صاحب کی قابلیت شاعری سے انگلستان کو باخبر کرنا چاہیں تو اُن صاحب سے یہ کار دشوار کسی حد تک انجام پا سکتا ہے' میں نواب ممدوح کی تخصیص اس لئے کرتا ہوں کہ وہ صاحب انگریزی زبان کے پورے ماہر ہیں' انگریزی میں جو ان کی نظمیں فقیر کی نظر سے گزری ہیں وہ اس کی شاہد ہیں کہ نواب ممدوح انگریزی زبان پر غیر معمولی طور سے قادر ہیں اور انگریزی شاعری کا عمدہ مذاق بھی رکھتے ہیں علاوہ عربی' فارسی وغیرہ کے اُردو ان کے لیے زبان مادری کا حکم رکھتی ہے اگر نواب ممدوح میر انیس کی روح کو خوش نہ کر سکیں تو پھر ہم مسلمانوں میں ظاہرا نواب ممدوح کے بعد مسٹر حامد علی خانصاحب بیرسٹر لکھنؤ کو مستثنیٰ کر کے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا ہے جو اردو اور

انگریزی پر یکساں قدرت اور اس کے ساتھ اچھا مذاق شاعری بھی رکھتا ہو۔

نمبر ۲:۔ صبح شب عاشورہ اور نماز صبح کا بیان :۔

مضامین بالا کا دوسرا نمونہ

جب رات عبادت میں بسر کی شہ دیں نے
سجدوں میں مہم عشق کی سر کی شہ دیں نے
دیکھا جو سپیدی کو سحر کی شہ دیں نے
مڑ کر رخ اکبرؓ پہ نظر کی شہ دیں نے
فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا
لو اٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا

دنیا میں ازل سے سحر ایسی نہیں آئی
یہ صبح دکھائے گی بھرے گھر کی صفائی
دولت نہ رہے گی نہ بضاعت نہ کمائی
بیٹے سے جدا ہو گا پدر بھائی سے بھائی
آج احمدؐ و حیدرؑ کے گریبان پھٹیں گے
اٹھارہ بنی فاطمہؓ کے حلق کٹیں گے

بندہ وہی جو دکھ میں رہے صابر و شاکر
اک جاں ہے سو موجود ہے اک سر ہے سو حاضر
بہتر ہے اٹھے جتنا سبک بار مسافر
یہ مرحلۂ عمر کی ہے منزل آخر
خلقت ہمیں سر پیٹے گی روئے گی جہاں میں
اب صبح کوئی ہم کو نہ ہووے گی جہاں میں

جو اہل حرم پردۂ عصمت میں ہیں مشہور
کھل جائیں گے انبوہ میں ان کے سر پر نور
حجلے سے نئی رانڈ نہ نکلے یہ ہے دستور
ان رانڈوں کا خیمہ بھی جلا دینگے یہ مقہور
غش ہو گی کبھی اور کبھی بستر سے گرے گی
زہراؓ کی بہو شام میں سر ننگے پھرے گی

مرنا ہے پدر جس کا اُسے دیتے ہیں پُرسا   ہوئے گی یتیموں پہ مرے قید کی ایذا
آزار میں عابد پہ ستم ہوئیں گے کیا کیا   لے جائیں گے تا شام اُسے کانٹوں پہ اعدا
اک حشر بپا تحت میں اور فوق میں ہوگا
بیڑی میں قدم ہوں گے گلا طوق میں ہوگا

یہ کہہ کے بڑھے بہر تیمم شہ صفدر   جنگل میں اذاں دینے لگا دلبر سرور
وہ صورت حسن اور خوش الحانی اکبرؓ   ہر شخص کو یاد آگئی آواز پیمبر
ہر نخل کو اک وجد تھا اس ظلم کے بن میں
تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

اکبرؑ کی صدا سنتے ہی زینبؑ یہ پکاری   تا حشر رہے خلق میں آواز تمہاری
قربان موذن کے نمازی کے میں واری   قائم یہ جماعت رہے یا حضرت باری
ہر شام یوں ہی طاعت معبود ادا ہو
ہر صبح کو اس دین کے ڈنکے کی صدا ہو

آگے تھا عبا اوڑھے ہوئے شاہ حجازی   پیچھے تھے صفیں باندھے ہوئے سارے نمازی
ابرار جہاں فخر زماں صفدر و غازی   تھی ان پہ خدا کو نظر بندہ نوازی
دنیا میں یہ رتبے نہ کبھی ہوں گے کسی کے
معراج میں تھے ساتھ حسینؑ ابن علی کے

وہ چاند سے چہرے وہ سپید اُنکی عبائیں   وہ خشک زبانوں پہ اثر دار دعائیں
لہجے وہ عرب کے وہ خوش آئند صدائیں   مشتاق تھیں حوریں کہ یہ جلدی ادھر آئیں
اک جوش محبت انھیں دکھلاتا تھا کوثر

گویا سب کی ملاقات پہ لہراتا تھا کوثر

تسبیح و وظائف سے ہوئی جبکہ فراغت — حضرت نے پڑھی اُٹھ کے محمدؐ کی زیارت
بس ہو گئی اک مجلس ماتم وہ جماعت — فرمانے یہ اُن سب سے گئے خیمہ میں حضرت
باہر علم فوج خدا لاتے ہیں جلدی
سب لوگ مسلح ہوں کہ ہم آتے ہیں جلدی

حضرات ناظرین میر انیس صاحب کے کن کن کلام کی داد دی جائے، جہاں سے جس مرثیہ کو پڑھئے اس کا ہر شعر ہر مصرع داد طلب ہے، بندہائے بالا صبح عاشورہ اور نماز صبح کی کیفیتوں سے خبر دیتے ہیں، ان بندوں میں مضامین کے خارجی اور داخلی (SUBJECTIVE AND OBJECTIVE) دونوں پہلو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حوالۂ قلم ہوتے گئے ہیں مگر اُن کی آمیزش نے اور بھی زیادہ مزہ پیدا کر دیا ہے مضامین بندہائے بالا یہ ہیں، کہ حضرت امام علیہ السلام رات عبادت میں بسر کر چکے ہیں، صبح ہوتی آتی ہے معلوم ہے کہ آج شہادت کا دن ہوگا حضرت علی اکبرؓ کی طرف مڑ کر ارشاد فرماتے ہیں کہ بیٹا اُٹھو اذان صبح دو، یہ کام کہ روز قتل کے پہلے کی رات اس اطلاع کے ساتھ کہ روز قتل آنے کو ہے، انسان عبادت میں بسر کرے، سوا اس کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے اپنی جانب سے شہ دین اور امام المومنین بنایا ہے، اللہ اکبر، خدایا، آپ کا یہ اطمینان اور تکیہ، اس طرح پر راضی برضا رہنے کی توفیق، پھر جب وقت فریضۂ سحری کا آتا ہے تو امام عالی مقام اپنے صاحبزادے کو اذان صبح کی ہدایت فرماتے ہیں، غرض کسی وقت عبادت کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں ہے، یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ صرف امام من جانب اللہ کے لیے مخصوص

کی گئی ہیں، امام کو جیسا ہونا چاہیئے اور امام کو جیسا کرنا چاہیئے، اس بات کو میر صاحب کا
بند اول نہایت خوش اسلوبی سے دکھا رہا ہے، پھر امام علیہ السلام بیٹے کو خبر دیتے ہیں کہ
یہ عاشورہ محرم کی سحر ہے، اولاد پیغمبر کے قتل کا دن ہے، اٹھارہ بنی فاطمہؑ کو پھر نماز سحر
نصیب نہ ہوگی ایسی سحر جو بھرے گھر کی صفائی دکھلائے گی، پھر دکھلائی نہ دے گی، مگر
بندہ کو صابر و شاکر رہنا چاہیئے، مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ، اس کے بعد آپ کے اہل حرم
کا کیا حال ہوگا اور کیا کیا مصیبتیں انہیں لاحق ہوں گی، ان باتوں کو ارشاد فرما کر حضرت
امام علیہ السلام تیمم کے لیے بڑھے، پانی تو بنا ہی تھا، وضو کس سے فرماتے ۔ خیر
علی اکبر اس صحرا میں اذان دینے لگے، خوش الحان بہت تھے ہر شخص کو آواز پیمبرؐ یاد آ
گئی، سامعین کا جو حال ہوا ہوگا محتاج بیان نہیں ہے حضرت علی اکبرؓ کی صدائے اذان
سن کر حضرت زینبؑ دعائیں دینے لگیں، یہ تعلق حضرت زینبؑ کا حضرت علی اکبرؓ کے
ساتھ ایک خاص وجہ رکھتا تھا وہ یہ کہ آپ نے انھیں پالا تھا، میر صاحب اپنی فطرت نگاری
سے کہیں چوکتے نہیں ہیں، اذان ہونے کے بعد امام علیہ السلام نے امامت فرمائی، نماز
جماعت کے ساتھ انجام پائی، امام اور نمازیوں کی تصویر جیسی میر صاحب نے کھینچی ہے
کب کسی سے کھنچ سکتی ہے، بعد نماز حضرت خیمہ اطہر میں یہ فرما کر تشریف لے گئے، کہ
سب لوگ مسلح ہو جائیں ہم خدا کا علم لے کر آتے ہیں، سبحان اللہ، سبحان اللہ کیا شاعری
کا انداز ہے، خیالات کا سلجھاؤ، بیانات کا بے ساختہ پن، مضامین کا ارتفاع ۔
فطرت کی تبعیت، طبیعت کی روانی، ادائے خیالات کا زور، کلام کا تناسب اور ان
خوبیوں کے ساتھ مرثیت کا قیام، یہ سب کی سب ایسی باتیں ہیں کہ غیر مؤید من اللہ شاعر
کا حوصلہ پست کر دینے والی ہیں، واضح ہو کہ بند ہائے بالا تمام تر مذہبی پہلو رکھتے ہیں

جو اشخاص نہ خدا کے قائل ہیں اور نہ عبادت خدا کی توفیق رکھتے ہیں اُن کو ایسے کلام سے کیا حظ نصیب ہو سکتا ہے، صبح کی نماز کیا دولت ہے اس کو وہ کیا جانے جس نے نہ پڑھی نہ قضا کی، افسوس ہے کہ نماز کی قید اُن حضرات میں نہیں دیکھی جاتی ہے جو ہندوستان میں اب تعلیم یافتہ مسلمانان کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں اس وقت شاید ہزار تعلیم یافتہ اشخاص میں ایک ایسا شخص نکلے گا جو فریضہ پنجگانہ کو ادا کیا کرتا ہوگا، یورپ کی تعلیم عجیب ملحد خیز انداز رکھتی ہے عیسائی عیسائیت سے آزاد اور مسلمان مسلمانیت سے دُور ہو جاتا ہے پھر کالے گورے سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں معاد کا مضمون ہی درمیان سے اٹھ جاتا ہے واہ ری تعلیم یورپ تیرا کیا کہنا ہے ؎

کفر و اسلام کے جلوے نے ترے ایک کیا ‏ ‏ ‏ ‏ ہاتھ پر ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا

مضامین بالا کا تیسرا نمونہ :-

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نُور ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور

پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور ‏ ‏ ‏ ‏ وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے

جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوائیں سبزہ صحرا کی وہ لہک ‏ ‏ ‏ ‏ شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک

وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ‏ ‏ ‏ ‏ ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ چمک

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے

پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قرباں صنعت قلم آفریدگار تھی ہر ورق پہ صنعت ترصیع آشکار
عاجز ہے فکر شعرائے ہنر شعار ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار
عالم تھا محو قدرت ربِّ عباد پر
مینا کیا تھا وادیِ مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا دراج و کبک و تیتر و طاؤس کی صدا
وہ جوش گل وہ نالۂ مرغان خوش نوا سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار پھولوں پہ جابجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زہر گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم کوکو کا شور نالۂ حق سرہٗ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیُّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیل کردگار
طائر ہوا میں محو ہرن سبزہ زار میں

جنگل کے شیر ہو نک رہے تھے کچھار میں

کانوں میں اک طرف تھے ریاض نبی کے پھول خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول
دنیا کی زیب و زینت کا شانۂ بتول وہ باغ تھا لگا گئے تھے خود حبیب رسولؐ

ماہ عزا کے عشرۂ اول میں لٹ گیا
وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں لٹ گیا

بند ہائے بالا پر ریویو:- اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مناظر قدرت کے بیانات فارسی کی شاعری میں گویا مفقود ہیں اس زبان کی شاعری کا مدار تشبیہ استعادہ اور مبالغہ پر معلوم ہوتا ہے خاقانی کو دیکھیے یا قاآنی کو پڑھیے کہیں بھی نہ صبح نہ شام نہ کسی سینری یا سین کا بیان فطرتی انداز پر دکھائی دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے شعراء کو بھی مناظر قدرت کی طرف میلان طبعی نہ تھا یا اُن کی شاعری کی ضرورتیں اُن کو ان دلاویز معاملات کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتی تھیں اُردو کے شعراء کا بھی یہی حال دیکھا جاتا ہے مگر مناظر قدرت کی طرف حسب مراد طور پر توجہ کرنے کی پہلی مثال میر انیس صاحب ہیں بند ہائے بالا میں میر صاحب نے صبح کی کیفیت کو صراحت کے ساتھ نہایت دلکش انداز پر زیب رقم فرمایا ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت نے صبح کی ایک لاجواب تصویر کھینچی ہے صبح کا نور ستاروں کی چھاؤں کلیوں کی نمود طیور کی تسبیح خوانی پھولوں کی بو سے جنگل کا بسنا، ہوا کی ٹھنڈک سبزہ صحرائی کی لہک درختوں کا جھومنا پھولوں کی مہک برگ گل پر قطرہ شبنم کی جھلک دشت کا سہانا پن دراج و کبک تیتر و طاؤس کی آوازیں کثرت وحوش مرغان خوش الحان کے بولے گلہائے گوناگوں کی کثرت جگر کو خنکی پہنچانے والی صبح کی ہوا پھولوں کے سبز سبز درخت ان پر لال لال پھول نسیم کے جھونکے سبزہ زار کا عالم شاخوں کا جھوم جھوم کر بار بار اٹھنا قمریوں کا شور اور ان کے

نالۂ حق سبزہ کی دھوم زبان حال سے صرف گلوں کا مدح خداوند تعالیٰ نہیں کرنا بلکہ خاروں کا بھی
نوکِ زبان سے خدمت حمد بجا لانا چیونٹی تک کا ہاتھ اٹھا اٹھا کر ادائے سپاس آلٰہی کرنا ہر
طرف سے تسبیح و تہلیل کی صدا طیور کی محویت ہوا کے ساتھ ہرن کی محویت سبزہ زار سے جنگل
کے شیروں کا چھاڑیں ہونکنا یہ سب کے سب صبح کے متعلق ایسے مضامین ہیں کہ کسی فارسی
یا اردو کے شاعر کو اِس خوش اسلوبی کے ساتھ خواب میں بھی نصیب نہیں ہوسکے ہیں واقعی
اِس جگہ میر صاحب نے اپنی خارجی شاعری کا کمال دکھلایا ہے پھر ان خارجی مضامین سے
داخلی اثر جو نفس ذہن پر پیدا ہوتا ہے وہ ایسا عالم رکھتا ہے جو بیان سے باہر ہے اگر کہیں
کمال فن نہیں کہیں گے تو کسے کہیں گے ایسی صبح فردوسی کو تو کیا ہومر کو بھی نصیب نہیں
نہیں ہوئی ہے واقعی میر صاحب ایک حیرت انگیز شاعر گزرے ہیں بتبعیت فطرت کے
ساتھ آپکے مضامین کی پرواز ہمیشہ اعلیٰ کی طرف ہوتی ہے پستی کی طرف تو طبیعت کبھی رخ ہی
نہیں کرتی اس شاعری کو اعجاز نہیں کہیں۔ تو کیا کہیں الحق میر صاحب کی شاعری ایک
الہامی شاعری ہے کیا کسی کی مجال ہے کہ اس دلآویزی کے ساتھ بڑے بڑے نازک اور بلیغ خیالات
کو اس رواں دواں طور پر سامعین کے گوشش قبول تک پہنچا سکے بنا ہائے بالا سے ظاہرا
یہی معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کو معاملات فطرت پر بڑی نظر حاصل تھی اور علم حیوانات وغیرہ
میں بھی پورا دخل تھا مگر کب حضرت دشت و صحرا میں قیام پذیر ہوئے صحرائی گل ولالہ کی
سیر کی وحوش و طیور پر محققانہ نظر ڈالی، یا کب آپ نے علم حیوانات کی تحصیل فرمائی
اس کا کوئی پتا راقم کو نہیں ملتا ہے، لاریب تائید غیبی کے بغیر ایسے اشعار کسی شاعر کے
قلم سے نہیں نکل سکتے ہیں، راقم کو تو میر صاحب کی نسبت پورا یہ عقیدہ ہے کہ آپ ملہم اور
موید من اللہ تھے؛

واضح ہو کہ بندہائے بالا سے پورے طور پر وہی شخص لذت یاب ہوگا جس نے
صحرا نشینی اور دشت نوردی میں اپنی عمر کا ایک کافی حصہ بسر کیا ہے خانہ نشین کیا جانے کہ صحرا
جنگل دشت وغیرہ کا کیا عالم ہوتا ہے، کیونکر گل صحرائی پھوٹتے ہیں، جنگل کی ہوا کیسی ہوتی ہے
طیور وحوش کیا عالم رکھتے ہیں اس طرح کی ہزاروں باتیں ہیں جنھیں صحرا نشین اور دشت نورد ہی
جانتے ہیں اور دوسرا نہیں جانتا، اس وقت میر صاحب کے ان بندوں نے راقم کو کیا کیا گذشتہ
سیریں یاد دلا دی ہیں کیا کیا دشت وصحرا دل کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں کیا کیا مناظر
قدرت جو اس وقت چشم ظاہر کے سامنے نہیں ہیں دیدہ باطن کے پیش نظر ہو رہے ہیں واہ
میر صاحب، کیا کہنا ہے، سبحان اللہ، آپ بڑے پُرتاثیر فطرت نگار ہیں مگر آپ کے کلام سے
لذت یاب ہونے کے لئے ضرور ہے کہ انسان خود بھی فطرت پسند اور فطرت فہم طبیعت رکھے
اور معاملات فطرت سے بقدر طاقت بشریہ خوب واقف بھی ہو۔ کوپر (COUPER) اور
ٹامسن (THOMPSON) یہ دو انگریزی شاعر ایسے تھے جو خلقت سے صحرا
پسند تھے اور آبادی سے ویرانہ کو زیادہ دوست رکھتے تھے، ان دونوں کے کلام ان کی اُفتادِ
طبیعت کا پورا رنگ دکھلاتے ہیں ظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر صحرا پسندی اُن کی سرشت
میں داخل نہیں ہوتی تو اُن کے کلام کا رنگ ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ دیکھا جاتا ہے۔ تعجب میر صاحب سے کہ
نہ جنگل میں رہے نہ صحرا میں، مگر جنگل صحرا وحوش وطیور سب کی تصویریں ہو بہو کھینچ لیں۔
کسی طرح کا مضمون ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے ذاتی متعلقات کے اندر ہے یہ الہامی
شاعری نہیں ہے تو کیا ہے، اگر یہ شاعری الہامی نہیں ہے اور اس حیثیت سے ہر شخص برت
سکتا ہے تو دنیا کے مولانا پیر فقیر عابد زاہد عالم فاضل ناظم نثار سے کیوں کوئی حضرت
چار بند میر صاحب کے انداز کے تحریر فرما کر سخن سنجی کا جلوہ نہیں دکھلاتے ہیں۔

نمبر ۴: رجز امام حسین علیہ السلام

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا
سرداری فردوس کا افسر ہمیں بخشا
اقبال علی خلق پیمبر ہمیں بخشا
قدرت ہمیں دی زور ہمیں زر ہمیں بخشا

ہم نور ہیں گھر طور تجلے ہے ہمارا
تخت بن داؤد مصلا ہے ہمارا

کس جنگ میں سینہ کو سپر کر کے نہ آئے
کس مرحلہ صعب کو سر کر کے نہ آئے
کس فوج کی صف زیر و زبر کر کے نہ آئے
تھی کون سی شب جس کو سحر کر کے نہ آئے

تھا کون جو ایمان نہ صمصام نہ لایا
اس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا

اصنام بھی کچھ کم تھے نہ کفار تھے تھوڑے
طاقت تھی کہ عزیٰ کو کوئی لات سے مارے
بارکبتوں نے سجدے بھی کیے ہاتھ بھی جوڑے
بلے توڑے وہ بت حیدر صفدر نے نہ چھوڑے

کعبہ کو صفا کر دیا خالق کے کرم سے
نکلے اسد اللہ اذاں دے کے حرم سے

دیکھو تو یہ ہے کون سے جرار کی تلوار
کس شیر کے قبضہ میں ہے کرار کی تلوار
دریا نے بھی دیکھی نہیں اس دھار کی تلوار
بجلی کی یہ بجلی ہے تو تلوار کی تلوار

قہر و غضب اللہ کا ہے کاٹ نہیں ہے
کہتے ہیں اسے موت کا گھر گھاٹ نہیں ہے

گر فیض ظہور شہ لولاک نہ ہوتا
بالائے زمیں گنبد افلاک نہ ہوتا
کچھ خاک کے طبقے میں بجز خاک نہ ہوتا
ہم پاک نہ کرتے تو جہاں پاک نہ ہوتا

یہ شور اذاں کا سحر و شام کہاں تھا
ہم عرش پہ جب بستے تو یہ اسلام کہاں تھا

حضرت عباسؓ کا رجز

روکے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو
لے تیغ میاں سے جو شجاعت کسی میں ہو
گرمائے رخش کو جو حرارت کسی میں ہو
آئے جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو
دو مانند میں علی کے پسر وار پار ہیں
دریا نہیں کہ رک گیا ہم ذوالفقار ہیں

تم کیا پہاڑ بیچ میں گر ہو تو ٹال دیں
شیروں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں
حدت نہ ایک کو دم جنگ و جدال دیں
پانی تو کیا ہے آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں
منہ دیکھتے ہیں جو ہیں نگہبان گھاٹ کے
لیجائیں گھر یہ تیغ سے دریا کو کاٹ کے

سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں سے زیر
دادا سا شجاع باپ سا جوانمرد ہم دلیر
جب رن پڑا ہے کر دیئے ہیں زخمیوں کے ڈھیر
لائے ہیں جا کے آگ سے پانی خدا کے شیر
عفریت بھاگتے ہیں جو چوٹیں ہماری ہیں
بیرالعلم میں کود کے تلواریں ماری ہیں

جرأت جلو میں رہتی ہے نصرت رکاب میں
سر کاٹتے ہیں پیر کے تیغوں کی آب میں
لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حملے کتاب میں
فیصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں
حاضر ہیں بارگاہ فلک بارگاہ کے
دفتر الٹ دیئے ہیں عرب کی سپاہ کے

بند ہائے بالا پر ریویو: واضح ہو کہ بہادران عرب کا یہ دستور تھا کہ میدان جنگ میں اپنے ہم نبرد کے آگے فخریہ کلام بشیر نظم کی شکل میں پڑھا کرتے تھے اور بعد ازاں مشغول پیکار ہوتے تھے اس خودستائی کو رجز کہتے ہیں۔ رجز خوانی کا دستور مومنین اور ملاعدہ دونوں میں تھا مثلاً میں خیبر کی جنگ کی مثال پیش کرتا ہوں اس جنگ کی سرگذشت یہ ہے کہ خیبر کا قلعہ یہودیوں کی ملکیت تھا اور اس کے سردار مرحب اور اس کا بھائی حارث تھے یہودیوں نے رسول اللہ کے ایلچی کو مار ڈالا تھا اس لیے آنحضرتؐ نے اُن پر لشکر کشی کی تھی۔ مدینہ سے رسول اللہ کی روانگی کے وقت علی علیہ السلام کی آنکھیں جوش کر گئی تھیں جس کے باعث آپ مجبوراً مدینہ میں رہ گئے تھے جب یہودیان خیبر سے مسلمانوں کا سامنا ہوا تو مرحب اور اس کے بھائی نے دو روز تک پیہم مسلمانوں کو شکست دی دو دن تک یہ حالت گذری کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جو لشکر اسلام کے تھے ان دونوں بھائیوں سے شکست کھاتے رہے اور وہ دونوں بھائی ان دونوں علمبرداران لشکر اسلام کا تعاقب خیمہ رسول تک کرتے رہے خیمہ عزل شاہ کے قریب پہنچکر مرحب اور اس کا بھائی سخنان ناسزا مسلمانوں کو سناتے تھے مگر لشکر اسلام میں کوئی ایسا بہادر نہ تھا کہ اُن ملعونوں کا سامنا کرتا ایسی نازک حالت میں علیؓ حضرت رسولؐ کی پیشین گوئی کے مطابق حضور رسالتمآب میں آپہنچے رسول اللہ نے لشکر اسلام کا علم علیؓ کو تفویض فرمایا ابھی تک فاتح خیبر کی آنکھوں کا جوش کم نہیں ہوا تھا۔ مگر رسول اللہ نے اپنا لعاب دہن علی مرتضیٰ کی آنکھوں پر لگا دیا جس سے وہ جوش چشم جاتا رہا علی مرتضیٰ نے قلعہ خیبر کے سامنے مرحب سے مقابلہ فرمایا۔ وقت مقابلہ مرحب نے یہ شعر رجز کا پڑھا:۔

قد علمتنی خیبر انی مرحب — شاکی السلاح بطل مجرب

اس پر علی مرتضےٰ نے جواب میں فرمایا:

انا الذی سمتنی امی حیدرہ — اکیلہم بالسیف کیل السندرہ

الحاصل ذوالفقار حیدر کرار نے دونوں بدبختوں کو فی النار کر دیا خیبر کا قلعہ فتح ہو گیا اور رسول اللہ نے کامیابی کے ساتھ مدینہ کو معاودت فرمائی معلوم ہوتا ہے کہ علی مرتضےٰ نصرت دین خدا کے واسطے مخصوص ہوتے تھے، لاریب اگر علی کی تلوار نہ ہوتی تو بدر خندق اور خیبر اور حنین کی فتحیں دین خدا کو نصیب نہیں ہوتیں (دیکھو جلد اول اس کتاب کی) اور بھی اسلام کو کسی طرح کا اسخہ کام حاصل نہیں ہو سکتا پیغمبر خدا کے زمانہ کا اسلام بلا شبہ بیشک بہت کچھ علی کی تلوار کا منت کش نظر آتا ہے:

شمس العلما مولانا محمد سعید صاحب حنفی رئیس عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مطلع کس قدر قرین حق ہے، آپ فرماتے ہیں ؎

جوہر نصرت عیاں از تیغ ابروے علی — شد قوی دین نبی از زور بازوے علی

بالمختصر رجز خوانی مبارزان عرب کا عام طریقہ تھا، فارس کے بہادروں میں اس کا رواج کمتر دیکھا جاتا ہے شاہنامہ فردوسی میں ایک مقام پر رجز خوانی کا انداز پایا جاتا ہے وہ اس طرح پر ہے کہ جب رستم نے گیو کو شاہزادہ کیخسرو کے ملک افراسیاب سے لے آنے کے لیے روانہ کیا تھا تو گیو اپنی تعریف میں اپنے دشمن کے مقابلہ میں کہتا ہے کہ میں رستم سے نبرد آزمائی میں کم نہیں ہوں میری قوت اور میری بہادری کا امتحان پہلے رستم لے کر لیا تھا تب مجھے اپنی بیٹی دی وغیرہ وغیرہ:

دونوں رجز بالا جو ایک منسوب امام علیہ السلام اور دوسرا حضرت عباس کی طرف ہے،

کیا خوب پیرایہ بیان رکھتے ہیں دونوں رجز کا بین فرق یہ ہے کہ ایک امام وقت کا رجز ہے اور دوسرا اُس بہادر کا جو قریب رشتہ مثل بہن اور جان نثار امام علیہ السلام کا ہے میر انیس صاحب کو کیریکٹر نگاری اور فرق مراتب کے دکھلانے میں ایک حیرت انگیز دستگاہ حاصل تھی ظاہر ہے کہ یہ باتیں رزمی شاعری کی جان ہیں انہیں باتوں نے ہومر کو ابو الشعرا کہلایا ہے اور انہیں باتوں سے ملٹن نے رزمی شاعری میں ایک بڑی شہرت حاصل کی ہے؛

نمبر ۵: شہربانو امام علیہ السلام کی آمد کی خبر پاکر مہمانی کا سامان کرتی ہے :-

یہ کہہ کے اُس نے فرش کیا گھر میں سر بسر | مومن کے دل کی طرح مصفا ہوا وہ گھر
مسند بچھائی بہر شہنشاہ بحر و بر | تکیوں کو صاف کر کے لگایا ادھر اُدھر

کہتی تھی سب سے گھر میں ابھی سے جو نور ہے
یہ آمد امام زمن کا ظہور ہے

دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے | یہ فرش ہے علی اکبر کے واسطے
جھولے کی جا یہ ہے علی اصغر کے واسطے | یہ گھر شاہ دین کے برادر کے واسطے

راحت سے شہ نشین پہ امام زمن رہیں
حجرہ یہ اس لیے ہے کہ دولہا دولھن رہیں

کرسی کو لا کے جلد کسی جا بچھاتی تھی | تحفوں کو کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
سجادے میں بہر شکر کبھی سر جھکاتی تھی | گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ جاتی تھی

چہرے پہ اک خوشی تھی پہ دل بے قرار تھا
فرزند فاطمہ کا اُسے انتظار تھا

جا کر کبھی خواصوں سے کرتی تھی یہ کلام | کھانا پکاؤ جلد کہ آتے ہیں اب امام

بھر بھر کے آبِ سرد کے رکھو ہوا میں جام — لبریز آبِ گرم کے کردو سبو تمام
پردیسیوں کو خیر سے جب گھر میں لاؤنگی
ہاتھوں سے اپنے پاؤں سبھوں کے دھلاؤں گی

ہمسائیوں سے کہتی تھی ہنس ہنس کے بار بار — اب کیجیو زیارت سلطان نامدار
ہے باغ فاطمہ پہ عجب حسن کی بہار — رشک ریاض خلد ہے ایک ایک گلعذار
سب نونہال گلشن دین لاجواب ہیں
قد سرو باغ حسن ہیں رخ آفتاب ہیں

شمشاد بوستان پیمبر کو دیکھیو — سرو ریاض حضرت شبر کو دیکھیو
کیا نوجوان ہیں شہ کے برادر کو دیکھیو — سب ایک سمت تم علی اکبر کو دیکھیو
ہوگا کبھی یہ حسن ملک کا نہ حور کا
جلوہ ہے اس جری میں محمد کے نور کا

خالق رکھے اسے صد سی سال برقرار — نام خدا ہے شادی کے قابل وہ گلعذار
بہنیں فدا ہیں باپ تصدق ہے ماں نثار — سر پر پھوپھی نے پیار سے گیسو رکھے ہیں چار
چہرے کے آگے نیر تاباں بھی ماند ہے
عالم کی روشنی ہے اندھیری کا چاند ہے

اب خیر سے گذر گیا اٹھارہواں بھی سال — شادی کرینگی بیٹے کی بانوئے خوشخصال
زینب کو اس کے بیاہ کا ارمان ہے کمال — ہر دم یہی دعا ہے کہ دولھا بنے یہ لال
آتی ہیں نسبتیں حلب و شام و روم سے
شادی خدا جو چاہے تو ہوگی دھوم سے

جب ڈھل گئی اسے انہیں باتوں میں دوپہر — شوہر سے پھر یہ کہنے لگی وہ نکوسیر
اب تک نہ آئے گھر میں شہنشاہ بحر و بر — اُترے کہاں کسی سے مفصل سنی خبر
بستی سے ساتھ لے کے ہر اک اپنے بھائی کو
جا پیشوا لے خلق کی تو پیشوائی کو

کہیو مری طرف سے یہ تو چوم کر قدم — لونڈی کو سرفراز کرو یا شہِ امم
کرتے ہیں اغنیا غربا پر سدا اکرم — اب بے حضور چین نہیں مجھ کو ایک دم
کچھ آج ہے طپش سی دل بے قرار میں
آنکھیں سپید ہو گئی ہیں انتظار میں

قربان ہو گئی مرا گھر کچھ نہیں ہے دُور — خاصہ تناول آن کے ہیں جا کریں حضور
ہم لوگ منت خاک ہیں حضرت خدا کے نور — ہوگا یہ کوہ آپ کے آنے سے رشکِ طور
کہنا حضور راہ ہدایت کی شمع ہیں
پروانے یاں سحر سے زیارت کو جمع ہیں

عرصہ ابھی ہے آپ کے آنے میں کچھ اگر — آنے میں کیوں حرم کے ہوئی دیر اس قدر
ڈیوڑھی پہ بندوبست ہے یا شاہ بحر و بر — گڑوا رکھی ہیں میں نے قناتیں اِدھر اُدھر
محمل میں گھٹتی ہوئیں گی زہرا کی پیاریاں
عباس لے کے آئیں زنانی سواریاں

عوام میں یہ قصہ مشہور ہے کہ جب اہلِ حرم میدانِ کربلا سے قید ہو کر شام کو روانہ ہوئے تو راہ میں ان حضرات کو قلعہ شیریں جو ایک کوہ پر واقع تھا ملا، وہاں شیریں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ شیریں ایک آزاد کردہ لونڈی حضرت امام علیہ السلام کی تھی، آزاد ہونے

بڑھی قلعہ دار سے اس کا بیاہ ہو گیا تھا۔ شیریں اپنے شوہر کے ساتھ نہایت آرام سے زندگی بسر کرتی تھی اور اس کو پوری خوش حالی نصیب تھی۔ حبیب اہل حرم کی آمد کی خبر شیریں کو ہوئی تو اس نے مہمانی کا سامان کیا، یہ خبر اسے نہیں پہنچی تھی کہ امام علیہ السلام مع علی اکبرؑ و قاسمؑ و عباسؑ و عونؑ و محمدؑ شہید ہو چکے ہیں، وہ سمجھ رہی تھی کہ امام علیہ السلام اپنے لوگوں کو لیئے ہوئے اس کی جانب تشریف لا رہے ہیں بنا برایں بالا شیریں کی مہمانداری کے مضامین سے تعلق رکھتے ہیں، میر انیس صاحب کے بیانات ہمیشہ فطرتی انداز کے ساتھ جو اُن کا قلم ہوتے ہیں کس قابلیت شاعرانہ کے ساتھ مہمانداری اور اس کے متعلقات کی تصویر کشی آپ نے فرمائی ہے، میر صاحب کس قادر الکلامی کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی مہمانداری کے سامان ایسے محترم مہمانوں کی آمد کی خوشی جو شیریں کو تھی ہمسائیوں سے اس کا اظہار پھر یہ کیسے مہمان ہیں اس کے پر جوش محبت آگیں اور عقیدت مندانہ بیانات پھر مہمانان عالی مقام کی تشریف آوری میں جو دیر ہوئی تو شیریں کا شوہر سے یہ کہنا کہ تو جا اور دیکھ کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اب تک کیوں نہیں تشریف لائے یہ انتظار اور اضطراب کا عالم پھر شوہر کو حضور امام علیہ السلام میں پیام لے جانے کی ہدایت وغیرہ وغیرہ ایسی ایسی خوبصورت مصوریاں ہیں کہ جن کا انجام میر صاحب ہی کے قلم کا کام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مرثیہ میں مرثیت کا قائم رکھنا تناسب کلام کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا اور ہر قدم پر فطرت کا پیرو رہنا یہ خاص انداز میر صاحب کا ہے ایسی خوبصورت تصویر کشیاں ہومر کی ایلیڈ میں دیکھی جاتی ہیں اور ورجل اور ملٹن نے بھی ہومر کے تتبع میں شاعرانہ مصوری کا کمال دکھلایا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ دونوں شاعروں نے اپنی اپنی تصنیف میں اس ابوالشعراء کی تبعیت سے بہت سی مددیں پائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے جہر تنہ ہے میر انیس کے کلام

پرکہ جو یقیناً ان تینوں شعرا کے ناموں سے مطلق خبر نہیں رکھتے تھے مگر فطرت نگاری اور شاعرانہ قوتوں میں کسی سے کم نہیں اپنی استعداد خاص کی بدولت خود ہومر کے ہم پلہ نکلے یا اس سے بھی گرامی تر ثابت ہو سکے

مرزا دبیر صاحب کے کمالات: واضح ہو کہ ایک مرثیہ سلطان الذاکرین جناب مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ مقامہٗ فی الجنۃ کا فقیر کی نظر سے گزرا ہے جو بنا ہائے بالا کے مضامین سے تعلق رکھتا ہے یعنی جب اہل حرم واقعہ کربلا کے بعد حالت اسیری میں دمشق کو جا رہے تھے تو قلعہ شیریں تک جس وقت پہونچے انشیریں اس کی امیدوار ہوئی کہ جناب امامؑ اس کے مہمان ہوں جناب مرزا صاحب غفران مآب کے مرثیہ کا پہلا مصراع یہ ہے کہ

جب حرم قلعہ شیریں کے برابر آئے

یہ مرثیہ لاجواب ہدیہ ہے اس مرثیہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی جناب ممدوح بڑے خلاق سخن اور عالی طبیعت تھے لاریب آپ سلطان الذاکرین تھے اور مرثیہ نگاری کا بڑا ہے اور کوئی شک نہیں یہ مرثیہ حضرت کا بہت مبکی ہے اسی طرح حضرت کے بہت سے اور بھی مراثی ہیں جو نہایت مبکی ہیں میری دانست میں حضرت کو سلطان الذاکرین نہیں کہنا ایک بڑی حق کشی ہے جناب غفران مآب ایک بڑے مذہبی شاعر تھے حضرت کو اس کی بھی بقدر استعداد پابندی تھی کہ بالکل وضعی روایات سلسلہ نظم میں خلل نہ پائیں لاریب میر انیس صاحب مرحوم ایک بڑے رزمی شاعر تھے اور رزمی شاعر ہونے کی حیثیت سے ہومر یا اور کسی رزمی شاعر کے ساتھ آپ کا موازنہ نامناسب نہیں سمجھا جا سکتا ہے اگر میر صاحب کا موازنہ مرزا صاحب کے ساتھ جبکہ یہ دونوں شاعری کے جداگانہ پہلوؤں کو برتتے ہیں کوئی معقول شکل نہیں رکھتا ہے رزمی شاعر کا موازنہ رزمی شاعر کے ساتھ اور

مذہبی شاعر کا موازنہ مذہبی شاعر کے ساتھ لطف سے خالی نہیں ہو سکتا مگر بے جوڑ موازنہ سے نہ کوئی معقول نتیجہ مترتب ہو سکتا ہے اور نہ اہل مذاق کو ایسے موازنہ سے کوئی حظ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے شاعری سے علیحدہ ہو کر جناب مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ فی الجنۃ کا درجہ جو صفائے انسانی کو پست کر دینے والا نظر آتا ہے آپ تمامتر صفات ملکوتی سے متصف اور لاریب خاصان خدا سے تھے اولیاء خدا کی خوبیاں واہب العطایا نے حضرت کو بخشی تھیں آپ کی سخاوت و ایثار شہرۂ آفاق ہے علم و فضل کے ساتھ توفیق عبادت بھی کچھ خدائے پاک نے عطا فرمائی تھی اخلاق محمدی کے آپ پورا نمونہ تھے جود و سخا بذل و عطا میں اپنے جواب آپ تھے طبیعت بے حد شریف اور غیور پائی تھی منکسر مزاجی خاکساری اور فروتنی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے خوش مزاجی، خوش اخلاقی خوش اوقاتی آپ پر ختم تھی عمر بھر کبھی کسی کی غیبت نہیں کی تا زیست کسی سے ترش ہو کر نہ بولے رفتار گفتار کردار سب میں یکتائے وقت تھے بالمختصر حضرت کی خوبیاں حضرات اہل بیت علیہم السلام کی خوبیوں کا تمامتر پرتو تھیں حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات کے آپ مداح تھے اُن کے تفصلات آپکے شامل حال تھے جناب ممدوح فقیر کے والد ماجد شمس العلما سید حمید الدین خاں بہادر مرحوم و مغفور کے بڑے دلی دوست تھے راقم الحروف کو بڑی عقیدت مندی جناب غفران مآب سے تھی اور آج تک ہے خدایا تو مجھ بندہ گنہگار کے جرائم کو اس سلطان الذاکرین کے صدقہ میں معاف فرما اور اس کے ممدوحین معصومین کے طفیل میں مجھ مبتلائے عصیان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔

نمونہ کلام مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ

بانو کا ہوا عقد جو سلطان امم سے
ہمراہ کنیزیں کئی آئی تھیں عجم سے

مالک ایک کو آزاد کیا فرطِ کرم سے
شیریں رہی خدمت کو پہ آزاد تھی غم سے
کیا بانوئے شبیر کی شیریں کو ولا تھی
دل اُن پہ تصدق تھا تو جاں اُن پہ فدا تھی

اک دن لبِ شیریں سے کہا شہ نے یہ ناگاہ
کیا چشم ہے شیریں کی زہے صنعت اللہ
آراستہ بانو نے کیا اس کو بصد جاہ
اور عرض کی لاریب یہ خوش چشم ہے یا شاہ
سب خاک ہیں تم فاطمہ کے نورِ بصر ہو
ہے عین خوشی میری جو منظورِ نظر ہو

شیریں تو ہے کیا چیز بھلا تم پہ ہیں واری
ہے جان جو شیریں وہیں آپ سے پیاری
شیریں مری لونڈی ہے میں لونڈی ہوں تمہاری
لو نذر میں کرتی ہوں یہ اے عاشقِ باری
مطلب تو ہے خوشنودی شاہِ دوجہاں سے
بخشا دل و جاں جسے اسے بخشا دل و جاں سے

شہ نے کہا تم دل سے خیال اور رکھو دور
کی مدح جو آنکھوں کی فقط مدح تھی منظور
ہے خلقِ پیمبر کے گھرانے کا تو مشہور
اور چشمِ کرم اپنے گھرانے کا ہے دستور
واللہ بدوں پر بھی مجھے نیک نظر ہے
دو آنکھیں ہیں پر سب پہ مری ایک نظر ہے

پھر پوچھا کہ بخشا اسے وہ بولی کہ بخشا
شہ بولے ہم آزاد اسے کرتے ہیں اچھا
کچھ خرچ دو اس کو نہ کرے راہ میں فاقا
پوشاک بھی پہنا دو کہ حق تم پہ ہے اس کا
شیریں کوئی چیز اُن کے اب ہم سے نہ لے گی
ایک روز وہ ہوگا کہ یہ چادر تمہیں دے گی

تب دوڑ کے بانو نے گلے اُس کو لگایا — شبیر کی بہنوں نے لباس اُس کو پہنایا
پھر اپنے برابر اُسے زینب نے بٹھایا — تعظیم کی تکریم کی اور ہنس کے سنایا
فطرس کا شرف آج تجھے حق نے دیا ہے
شہزادہ جبریل نے آزاد کیا ہے

شیریں نے تب اندوہ جدائی سے بھری آہ — اور شہ کے قدم چوم کے بولی وہ حق آگاہ
ہے عرض یہ مجھ کو کسی قابل کرے اللہ — تو ہدیۂ شبیر یہاں ہو قبول حرم تھا
بھیجوں اگر جو سوغات نہ رد کیجیو میری
مشکل میں پکاروں تو مدد کیجیو میری

تب حضرت سجاد پہ شیریں ہوئی قربان — اور بولی خوشنود سے ترا اللہ نگہبان
بابا سے سجاد کی مرتی تجھے ہیں آن — میں نے تمہیں پالا ہے فدا اسد کا ہے مجھ پہ احسان
عابد سے عجب طرح جدا ہوتی تھی شیریں
یاں روتے تھے سجاد وہاں روتی تھی شیریں

گہوارے سے شیریں نے تب اکبر کو اٹھایا — آنکھوں سے بہت ننھے سے تلووں کو لگایا
پھر جھولے کے اندر یہ دعا دے کے لٹایا — اللہ نبی کا سر شہزادے پہ سایا
دنیا کا تجھے سب حشم و جاہ ہو اکبر
اور سونے کے سہرے سے ترا بیاہ ہو اکبر

اب عرض ہے شیریں کی تم اقرار یہ فرماؤ — ایسا نہ ہو تم بیاہ میں لونڈی کو نہ بلواؤ
یہ خادمہ بھی دیکھے دلھن بیاہ کے تم لاؤ — آباد رہو چین کرو زیست کا پھل پاؤ
ہاتف کی ندا آئی یہ مظلوم ازل ہے

تقدیر میں اکبر کی فقط برچھی کا پھل ہے

الفضہ گئی شاہ کے حجرے کو جو شبیر
تب ہچکیاں لے لے کے یہ رونے شہ دیں
گہ وشتہ دیں پھر کے لگی کہنے وہ غمگیں
قربان گئی روتے ہو کیا دو مجھے تسکیں
باشاہ میں صدقے میں فدا پھر نہ ملو گے
اس طرح جو روتے ہو تو کیا پھر نہ ملو گے

اب دو مرے مقصد ہیں خدا اس کا ہے آگاہ
یا تو مجھے قبول سے لگا ہنسنے دو یا شاہ
یا گھر میں مرے آنے کا وعدہ کرو للہ
فرزند نبی کی میں ضیافت کروں دلخواہ
میراث نبی پائی ہے فرزند علی نے
فضہ کی ضیافت تو نہ رو کی تھی نبی نے

شبیر ہیں سے مخاطب ہوئے یوں سید ابرار
اچھا ترے گھر آنے کا میں کرتا ہوں اقرار
اس دن تجل نہ تجھے ہووے گا زنہار
عابد تو پیادہ ہمراہ ہوئے گا میں اسوار
پیاسا کئی دن کا ترے گھر آوے گا شبیر
پیاسا ہی ترے گھر سے چلا جاوے گا شبیر

وہ بولی بھلا جانے میں دوں گی تمھیں پیاسا
حضرت نے کہا خیر سمجھ لیں گے جو ہو گا
پہونچانے کو شبیر کے گئے دور تک آقا
رستے سے کہا لے تجھے اللہ کو سونپا
کیجو یہ دعا چین ملے غم سے ہمیں بھی
آزاد خدا کر دے جہنم سے ہمیں بھی

قاصد پئے شام کے تھا مسکن شبیر
ہمسایہ عزیزا ایک یہودی تھا خوش آئین
جس شب یہ ہو گئی سو تا تھا وہ بندہ حق بیں
پھر عقدہ کو شبیر ملی کیا [illegible] شبیر

دیدار پیمبر کا ملا دین خدا کا
روشن کیا شیریں نے گھر اس اہل وفا کا

شوہر سے وہ ذکر شہ دین کرتی تھی اکثر — پہونچانے تجھے دور تلک آئے تھے سرور
کہتی تھی کبھی دوسری بی بی کے ہیں دلبر — نام ایک کا سجاد ہے اور ایک کا اکبر
دونوں سے عیاں قدرت رب ازلی ہے
بس نام خدا ایک نبی اور ایک علی ہے

گاہے یہ بیاں کرتی تھی وہ عاشق مولا — مولا مرے آئیں تو ذرا شرم نہ کرنا
میں لونڈی ہوں ادنیٰ تو غلام ان کا ہے گویا — خدمت میں کمر بستہ سدا رہیو مہیا
وہ کہتا تھا تو ان کی ہیں ان کا یہ گھر ان کا
تقدیر یہ کہتی تھی کہ آئے گا سر ان کا

دن پوچھتا تھا آمد مولا کے جو شوہر — تب کہتی تھی شوہر سے یہ وہ عاشق شبر
یہ پوچھنا میں بھول گئی واسطے مقدر — تاریخ مقرر نہیں آنا ہے مقرر
کہتا ہے یہ دل آئیں گے مولا مرے گھر میں
یا ماہ محرم میں یا ماہ صفر میں

شیریں کو عجب الفت سلطان امم تھی — ہر دم شہ والا کی وہ مشتاق قدم تھی
آنکھ اس کی سوئے صورت بانوئے حرم تھی — پتلی صفت قبلہ نما سوئے حرم تھی
غش کرتی تھی اکثر امام دوجہاں پر
اس کی نہ خبر تھی کہ سر آئے گا سناں پر

ڈیوڑھی پہ سر انور کے [illegible] — اور شام کو [illegible]

گہ صبح سے مولیٰ کے لئے فرش بچھانا اور شام کے نزدیک بعد یاس اُٹھانا
شہ کے لیے تیار کبھی کرتی غذا کو
مولا جو نہ آتے تو کھلا دیتی گدا کو

ناگاہ ہوا شاہ سے برگشتہ زمانا جائز کیا فرزند پیمبر کا ستانا
مسلم کا مدینہ سے پر اکوفہ کو آنا آخر کو ہوئے شاہ بھی یثرب سے روانا
واں نکلے نبی قبر سے اور شاہ وطن سے
یاں روح نکلنے لگی شیریں کے بدن سے

تقدیر وہاں دربدر آقا کو پھراتی شیریں یہاں در پہ کبھی آتی کبھی جاتی
گھبرا کے کبھی کوہ کے نیچے اُتر آتی وہ گیسوں کو جا جا کے سرِ راہ سناتی
دنیا میں میں ہوں اور نہیں دنیا کی خبر ہے
لوگو تمہیں کچھ دلبر زہرا کی خبر ہے

پائی جو نہ اس نے خبر سبط پیمبر ذبح سے ہوئی تارک لذات وہ مضطر
کچھ پی لیا کچھ کھا لیا جو آیا میسر سوتے کے لیے فرش و زمیں دونوں برابر
اندیشوں نے بد حال کو تبدیل کیا تھا
پوشاک بدلنا بھی غم شہ میں چھوڑ دیا تھا

ہمسائیاں کہتی تھیں بتا لے یہ کیا حال پوشاک جو میلی ہے تو اُلجھے ہوئے ہیں بال
وہ کہتی کہتی غیر نگ نظر آتا ہے انساں دیافت مجھے کو نہیں ہوتا مرا احوال
پوشاک کی سی کچھ مجھ کو خبر ہے نہ ردا کی
الدٰبس اب خیر کرے آل عبا کی

بند ہائے بالا حضرت مصنف کے زور بیان خلاقی سخن اور عالی خیالی سے پورے طور پر خبر دیتے ہیں بلاشبہ جناب مرحوم اپنے جواب آپ تھے ؎

خاموشی ثنا ہے تو حمد ثنا ہے تو

الحمد للہ کہ یہ دوسری جلد بھی بہارستان سخن کی تمام ہوئی، مگر مرثیہ نگاری کے لگاؤ سے راقم کا فرض منصبی تھا کہ اُستاد فن جناب فضیلت مآب مرزا اوج صاحب ادام اللہ تعالیٰ فاداتہ کے نمونہ کلام سے بھی اپنی تصنیف کو زینت دیتا لیکن نہایت جائے حسرت ہے کہ حضرت ممدوح کا کوئی کلام اس ہیچمدان کو دستیاب نہ ہوسکا حالانکہ اس ناچیز کو حضرت کے کلام بلاغت نظام سے مشرف ہونے کا اتفاق بارہا ہوا ہے آپ جناب سلطان الذاکرین مرزا دبیر صاحب اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ کے ایسے خلف الصدق ہیں کہ ماشاء اللہ جنھوں نے اپنی حیرت انگیز قابلیت شاعری سے اپنے پدر بزرگوار کے نام نامی کو اوج بالا ئے اوج بخشا ہے پدر نامدار و پسر نامجو جناب اوج لاریب ایک بڑے رزمی شاعر ہیں آپ کا ندرِ کلام تناسب مضامین اور فلسفانہ انداز بیاں بہت کچھ قابل قدر ہے آپ جناب میر نفیس صاحب اور اپنے والد عالی مقام کی ترکیب شاعری سے بالکل ایک جُدا رنگ رکھتے ہیں اور یہ ایسا رنگ ہے کہ ہر ذی فہم اسے آسانی کے ساتھ تمیز کر لے سکتا ہے مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ کوئی نمونہ حضرت شاد مدظلہٗ کی مرثیہ نگاری کا عدم دستیابی کی وجہ سے فقیر کی اس تصنیف میں داخل نہیں کیا جاسکا، آپ کا کلام بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے اور نہایت قابل توجہ ہے۔ فقط

سید امداد امام اثرؔ مرحوم